العاقب

علامہ حضرت

فضلِ حق

خیرآبادی

و

جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء نمبر

بشمول متعدد حصے

- مدیر الفاضل مدیر الفاضل نمبر
- مدیر الشریعہ مدیر الشریعہ نمبر

خادم حسین رضوی

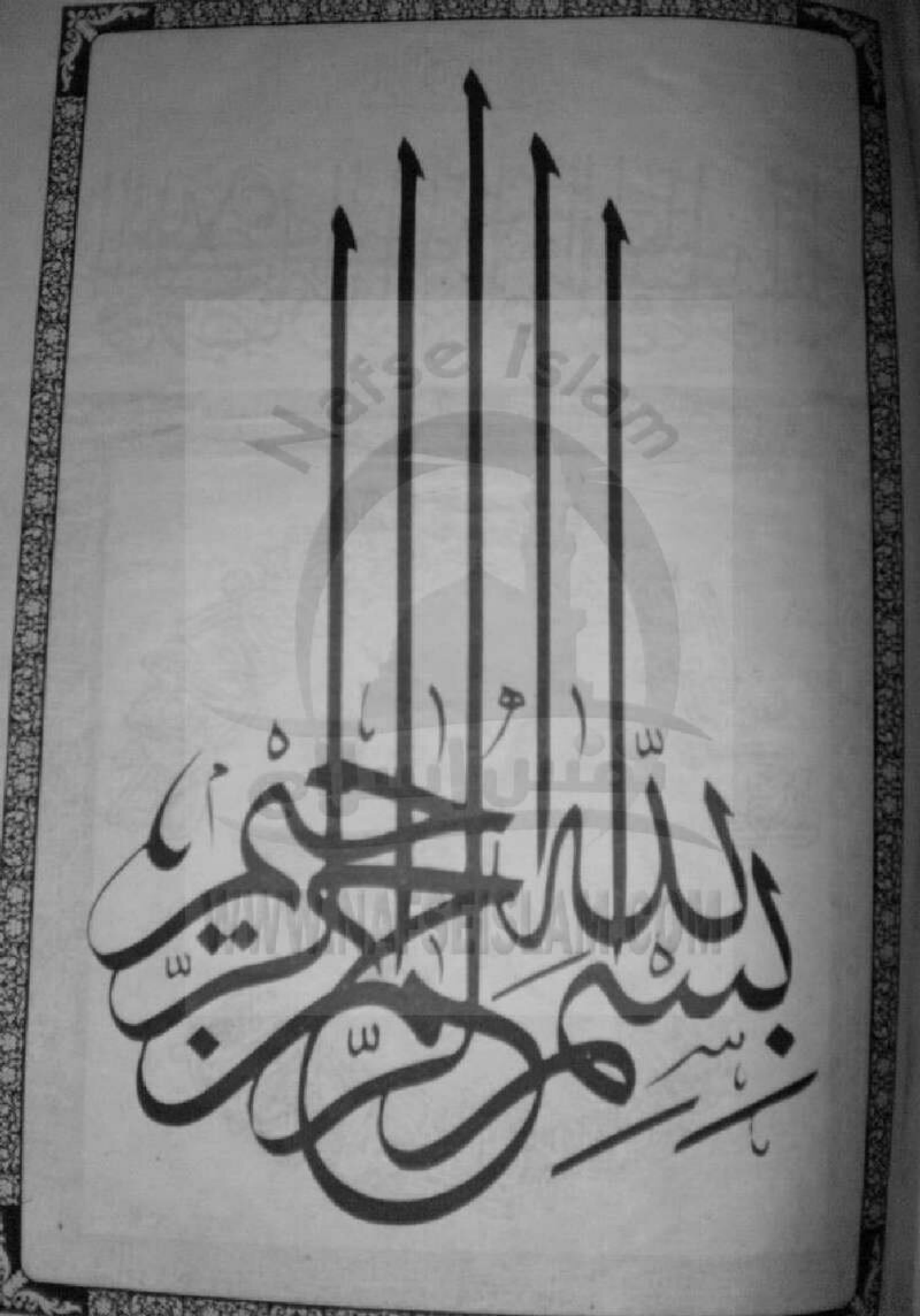
بسم الله الرحمن الرحيم

محمد
WWW.NAFSEISLAM.COM

خادم حسین
محمد وحید نور
حافظ محمد فرحان
ظہیر عباس
ظہیر بشیر
خاص نمبر 150 صفحات
سالانہ 240 روپے
0321
4370406

قائد اہلسنت حضرت علامہ شاہ احمد نورانی صدیقی

اور

نبیرہ محدث اعظم حضرت صوفی ایاز خان نیازی

کی قائم کردہ مجاہدین ختم نبوت پر مشتمل تنظیم

فدایانِ ختمِ نبوت

اشاعتِ اسلام خصوصاً تحفظ ختم نبوت کے لیے میدانِ عمل میں ہے۔ 1973ء میں قائم کردہ ''تنظیم فدایانِ ختم نبوت'' کی 1995ء میں ''تحریک فدایان ختم نبوت'' کے نام سے تنظیم نو کی گئی۔ 2000ء میں ''تحریک فدایان ختم نبوت'' اور ''تحریک تحفظ ختم نبوت'' کو ختم کر کے موجودہ تنظیم ''فدایانِ ختم نبوت'' کی بنیاد رکھی گئی۔

اس وقت فدایانِ ختم نبوت' پاکستان کے مرکزی امیر' شیخ الحدیث حضرت علامہ حافظ خادم حسین رضوی اور مرکزی ناظم اعلیٰ' خطیب پاکستان حضرت مولانا خان محمد قادری ہیں۔ ان حضرات کی باعلم و عمل اور متحرک قیادت نے فدایانِ ختم نبوت کو مقام ختم نبوت کے تحفظ کے لیے بہت جلد اہلسنت و جماعت کی مستند اور نمائندہ تنظیم بنایا ہے۔

فدایانِ ختم نبوت کے جملہ عہدیداران کی جانب سے تمام مومنین کو اس قافلہ عشق و مستی میں شمولیت کی دعوت ہے کہ آئیں اور اہلسنت کی چنیدہ و باعمل قیادت کے ساتھ تحفظ ختم نبوت کا علم تھام کر نبی آخر الزمان ﷺ کی بارگاہ اقدس میں سرخرو ہو جائیں۔

فہرست

حصہ اوّل

حمد باری تعالیٰ	14	امام احمد رضا خاں بریلوی
مدحت خاتم الانبیاء ﷺ	16	علامہ محمد فضل حق خیر آبادی
اداریہ	20	مدیر
قطعہ تاریخ برائے خصوصی اشاعت	29	سید عارف محمود مہجور رضوی
علامہ فضل حق خیر آبادی	32	پروفیسر ڈاکٹر مسعود احمد
سوانحی خاکہ	51	
کشور علم کے تاجدار، حکمت وکلام کے امام	54	علامہ محمد عبدالحکیم شرف قادری
منقولات ومعقولات کے ابن مولانا فضل امام خیر آبادی	84	علامہ حافظ خادم حسین رضوی
خاتم الحکماء امام فضل حق خیر آبادی	89	مولانا خان محمد قادری
مولانا فضل امام کا شہزادہ	93	علامہ فیض احمد اویسی
علامہ فضل حق ایک تحقیقی وتجزیاتی مطالعہ	98	ڈاکٹر شاہد حسن رضوی

علامہ فضل حق سراپا فضل، سراپا حق، سراپا خیر	113	ڈاکٹر سید محمد عبداللہ
خیر آبادی مرد قلندر	117	مولانا عبدالحکیم اختر شاہجہانپوری
شیر خدا، بطل حریت علامہ فضل حق	121	مولانا عبدالستار خاں نیازی
علامہ فضل حق تاریخ ساز شخصیت	141	مولانا محمد صدیق ہزاروی
مولانا فضل حق ایک عالم ایک مجاہد	146	سیدہ انیس فاطمہ بریلوی
علامہ فضل حق علم و فضل کے بحر بے کراں	148	میاں عبدالرشید
خانوادۂ علم و حکمت کا مہ کامل	152	مولانا مشتاق احمد نظامی
اساتذہ کرام علامہ فضل حق	165	
تلامذہ عظام علامہ فضل حق	167	
سلسلہ خیر آبادی کے خوشہ چیں	171	محمد وحید نور
علامہ کے معاصرین سے روابط	178	سلمہ سیہول
علامہ مشاہیر کی نظر میں	190	
تالیفات علامہ فضل حق	198	

علامہ فضل حق کی علمی، سیاسی اور مجاہدانہ زندگی کے چند گوشے	208	مولانا مشتاق احمد نظامی
علامہ فضل حق کی سیاسی بصیرت	216	مولانا محمد وسایا
علامہ فضل حق دنیا کے مختصر آئین کے بانی	221	
مجاہد آزادی کی خدمات کو مسخ کرنے کی ناکام کوششیں	225	اسد نظامی
علامہ فضل حق پر اتہام طرازی	232	میاں محمد صادق قصوری
جنگ آزادی میں مولانا فضل حق کی شرکت	239	ضیاء الدین لاہوری
علامہ فضل حق کا فتویٰ جہاد اور مجاہدانہ سرگرمیاں	254	مولانا محمد اختر کمال قادری
فتویٰ جہاد اور علامہ فضل حق	268	سلمہ سیہول
علامہ کا فتویٰ جہاد اور ان کے حامی علماء و مشائخ	270	محمد صادق رضا مصباحی
علامہ فضل حق اور فتویٰ جہاد	274	غلام رسول مہر
تقویۃ الایمان کا اولین رد	276	علامہ فضل حق خیر آبادی
خلاصہ فتویٰ	281	علامہ فضل حق خیر آبادی
مسئلہ امتناع النظیر میں غالب کو علامہ کی سرپرستی	284	

WWW.NAFSEISLAM.COM

مولانا فضل حق، حق پسند انسان	288	پروفیسر محمد بشیر احمد
بہادر شاہ ظفر کے معتمد مشیر علامہ فضل حق	290	مختار جاوید منہاس
حیات وخدمات علامہ فضل حق	310	علامہ یٰسین اختر مصباحی
خیر آباد کا لعل شب چراغ اور اس کی حویلی	321	سید رئیس احمد جعفری
مولانا فضل حق	325	شیخ محمد اسماعیل پانی پتی
مولانا فضل حق فرقی خیر آبادی	327	مفتی انتظام اللہ شہابی
علامہ فضل حق خیر آبادی	330	سید مصطفیٰ علی بریلوی
جامعۃ الازہر میں علامہ فضل حق کی شخصیت پر دو اہم مقالات	332	ڈاکٹر ممتاز احمد سدیدی
علامہ فضل حق کا نور نظر لخت جگر مولانا عبدالحق خیر آبادی	338	حافظ محمد فرحان علی رضوی
کتابیات مولانا فضل حق کی روشنی کے ماخذ	343	میاں محمد صادق قصوری

حصہ دوم

استغاثہ بحضور خاتم النبیین ﷺ	350	علامہ فضل حق خیر آبادی
جنگ آزادی کی کہانی مجاہد اعظم کی زبانی	354	علامہ فضل حق خیر آبادی

بہادر شاہ ظفر کی کہانی خود اپنی زبانی	375	بہادر شاہ ظفر
1857ء کا جہادی پہلو صحیح یا غلط	381	مولانا محمد شہباز عالم مصباحی
جنگ آزادی کے چند تاریخی حقائق	396	پروفیسر غلام یحییٰ انجم
انقلاب 1857ء کے بعد انگریزوں کی دہشت گردی	407	مولانا غلام مصطفی قادری
انقلاب 1857ء کے کچھ مضمرات و حقائق	411	مولانا مبارک حسین مصباحی
دہلی چھوڑ کر غریب الوطنی کی زندگی بسر کرنے والے	416	
جنگ آزادی کے بعد پھانسی پانے والے	417	
رنگون میں آخری مغل شہنشاہ	418	ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری
جنگ آزادی 1857ء اپنوں اور غیروں کے مظالم	423	مولانا عبد الحکیم اختر شاہجہانپوری
خاندان غلامان غداران وطن سے باغیان اسلام تک	451	محمد وحید نور
برطانوی عہد میں اسلام اور عیسائیت کے درمیان مناظرے	466	محمد قطب الدین رضا مصباحی
انقلاب 1857ء کے علمبردار اہلسنت و جماعت	472	مولانا یٰسین اختر مصباحی
جنگ آزادی میں علماء دیوبند کا کردار	477	مولانا محمد ادریس بستوی

WWW.NAFSEISLAM.COM

سید احمد اور شاہ اسماعیل کے "جہاد" کی حقیقت	484	شکیل احمد مصباحی
انقلاب 1857ء میں اہلسنت کا کردار	489	مولانا یٰسین اختر مصباحی
جنگ آزادی کے سُنی ادیب	499	اسد نظامی
جنگ آزادی کے سُنی شعراء	504	اسد نظامی
کتب و رسائل متعلقہ جنگ آزادی 1857ء	519	محمد عالم مختار حق

حصہ سوم

تضمین بر نعت امام احمد رضا بریلوی	526	بی بی سعید النساء حرماں
ہم از حق، فضل حق را با خواہم	528	مرزا اسد اللہ خاں غالب
عربی قصیدہ	529	مولانا فیض الحسن سہارنپوری
وہ امام فلسفہ و ہمنازش علم و سخن	530	امیر البیان سہروردی
وہ امام عاشقاں وہ صاحب روشن ضمیر	532	پروفیسر محمد اکرم رضا
کربلا ہند میں وہ سید الاحرار حق	533	
جیش فضل حق کی روحوں کو سلام زندگی	535	مذاق العیشی فیروزپوری

WWW.NAFSEISLAM.COM

اے شہید جنگ آزادی تجھے میرا سلام	536	سید عارف محمود مہجور رضوی
قائد تحریک آزادی علامہ فضل حق خیر آبادی	537	سید عارف محمود مہجور رضوی
امام لشکر احرار و اخیار	539	محمد عبدالقیوم طارق سلطانپوری
مادہائے تاریخ سال ولادت و وصال	541	محمد عبدالقیوم طارق سلطانپوری
قطعات وفات	542	مولانا محمد سعید حسرت

نفس اسلام
WWW.NAFSEISLAM.COM

تعارف العاقب

چند سال قبل کراچی کے احباب نے حضرت مفتی زرولی خان صاحب دامت برکاتہم کی سرپرستی میں ایک مجلے کے اجراء کا فیصلہ کیا۔ مجلے کے نام کو حدیث خاتم النبیین ﷺ "انا العاقب والعاقب الذی لیس بعدہ نبی" سے استخراج کرکے "العاقب" مقرر کیا۔ لیکن اللہ رب العزت کو کچھ اور ہی منظور تھا احباب کراچی تو اس مجلے کا اجراء نہ کرسکے اور یہ توفیق اہل لاہور کو نصیب ہوئی۔ ذالک فضل اللہ یؤتیہ من یشاء۔

مجلہ العاقب کی انتظامی ٹیم کی قیادت و سرپرستی استاذ العلماء حضرت علامہ حافظ محمد زاہد صاحب فرما رہے ہیں۔ حضرت استاذ العلماء اس وقت خدایان ختم نبوت پاکستان کے مرکزی لیڈر بھی ہیں۔ علمی تحقیقی میدان میں آپ جامعہ نظامیہ رضویہ لاہور کے شیخ الحدیث اور کئی کتب کے مصنف ہیں۔

مجلہ "العاقب" نسل نو میں اسلامی تعلیمات کے فروغ کا علم لیے میدان عمل میں حاضر خدمت ہے۔ ان شاء اللہ العاقب عملی میدان میں غفلت سے بیداری کی جانب تو اٹھا قدم ثابت ہوگا۔ رسالے کی پیشانی پر جن ستاروں کے نام چمک رہے ہیں یہ درخشندہ ماضی کی ادنیٰ جھلک ہے۔ مگر یہ تفصیل کہاں ممکن؟.....

"العاقب" کی پوری ٹیم کا عزم صمیم ہے کہ اس میں شائع ہونے والی تحریریں حتی الامکان با مقصد با معنی اور اشتہارات معیاری ہوں۔ تاہم مجلے کی مزید بہتری کے لیے آپ کی مثبت تنقید و تائید کا شدت سے انتظار رہے گا۔

(ادارہ "العاقب")

WWW.NAFSEISLAM.COM

حصہ اوّل

نابغہ روزگار، امام المتکلمین، قائد حریت

فضلِ حق خیرآبادی

حضرت علامہ مولانا

حمد باری تعالیٰ جل جلالہ

امام احمد رضا خاں بریلوی

یاالٰہی ہر جگہ تیری عطا کا ساتھ ہو
جب پڑے مشکل تو مشکل کشا کا ساتھ ہو

یاالٰہی بھول جاؤں نزع کی تکلیف کو
شاہدِ دیدار حسنِ مصطفیٰ ﷺ کا ساتھ ہو

یاالٰہی گور تیرہ کی جب آئے سخت رات
اُن کے پیارے منہ کی صبح جانفزا کا ساتھ ہو

یاالٰہی جب پڑے محشر میں شور دار و گیر
اُمتی دینے والے پیارے پیشوا کا ساتھ ہو

یاالٰہی جب زبانیں باہر آئیں پیاس سے
صاحبِ کوثر شہِ جود و عطا کا ساتھ ہو

یاالٰہی سر مہری پر ہو جب خورشید حشر
سیدِ بے سایہ کے ظلِ لوا کا ساتھ ہو

یاالٰہی گرمیِ محشر سے جب بھڑکیں بدن
دامنِ محبوب کی ٹھنڈی ہوا کا ساتھ ہو

یاالٰہی نامۂ اعمال جب کھلنے لگیں
عیب پوشِ خلق ستارِ خطا کا ساتھ ہو

WWW.NAFSEISLAM.COM

یاالٰہی جب بہیں آنکھیں حساب جرم میں
ان تبسم ریز ہونٹوں کی دعا کا ساتھ ہو

یاالٰہی جب حساب خندۂ بیجا رُلائے
چشم گریان شفیع غمزے کا ساتھ ہو

یاالٰہی رنگ لائیں جب مری بے باکیاں
اُن کی نیچی نیچی نظروں کی حیا کا ساتھ ہو

یاالٰہی جب چلوں میں تاریک راہ پل صراط
آفتاب ہاشمی نور الہدیٰ کا ساتھ ہو

یاالٰہی جب سر شمشیر پر چلنا پڑے
رتبہ سلم کہنے والے غمزدا کا ساتھ ہو

یاالٰہی جو دعائے نیک میں تجھ سے کروں
قدسیوں کے سے آمین رسا کا ساتھ ہو

یاالٰہی جب رضا خواب گراں سے سر اٹھائے
دولت بیدار عشق مصطفیٰ کا ساتھ ہو

WWW.NAFSEISLAM.COM

مدحت خاتم الانبیاء ﷺ

علامہ فضل حق خیرآبادی

هو اول النور الذی تلألأت — بضیائه فی العالم الأضواء

• وہ پہلا نور ہے جو دنیا میں چمکا اور اسی کی روشنی سے سارا عالم منور ہوا۔

هو اول الآباء اخرهم به — ختم النبوة وابتدا الابداء

• وہ اول و آخر نبی ہے انہیں پر نبوت ختم ہوئی اور انہیں سے اس کی ابتداء ہوئی۔

بدأ به ابدی المهیمن سرّه — فلاجله الابداء والابداء

• وہ بہترین سردار ہیں خدا نے اپنا بھید انہیں کے ذریعہ ظاہر کیا اور انہیں کی وجہ سے آفرینش وجود میں آئی۔

قد خصه الباری باوصاف علی — لم یعطها الاحداث والقدماء

• خدا نے انہیں ایسے بلند اوصاف کے ساتھ مختص کیا جو کسی جدید و قدیم کو نہ بخشے گئے۔

اعطاه فضلا لیس یمکن ان یکون — له شریک فیه او شرکاء

• انہیں ایسا فضل و علو مرتبہ عطا کیا کہ اس میں کوئی بھی ان کا شریک و سہیم نہیں۔

اسماء اذا سماه بالحسنی فمن — اسماء خالقه له اسماء

• ان کے اچھے اچھے نام ذکر کرنے والا خدا یا خالق کے ہی اسماء میں سے ان کے لئے اچھے نام ہیں۔

بر رحیم مفضل ذوقوة — هاد رؤف محسن معطاء

• نیکوکار رحمدل کثیر الفضل صاحب قوت ہادی نرم خو محسن کثیر العطا ان کے اوصاف و نام ہیں۔

قد زاد امکة رفعة ملاؤه — وتشرفت بوجوده البطحاء

• ان کی پیدائش نے مکہ کی شان دوبالا کردی اور بطحا نے ان کے وجود سے شرف پایا۔

قد طاب طیبة اذ لواها واعتلت — شرفا تسنم ماحها البعداء

• ان کے قیام سے طیبہ (مدینہ منورہ) پاک و بلند رتبہ ہوا دور دور سے لوگ اس کی زیارت کا قصد کر کے آتے ہیں۔

بشر بخير بشرت إخوته — من قبله البابه الأنبياء

● وہ خوشخبری سنانے والے انسان ہیں ان سے پہلے صحف آسمانی اور انبیاء کرام علیہم السلام ان کی بشارت دیتے آئے۔

انا بعثته المسيح وقبله — موسى كما البابه شعياء

● ان کی بعثت کی عیسیٰ علیہ السلام اور ان سے قبل موسیٰ علیہ السلام نے بشارت دی جیسے کہ شعیاء (ابن امصیا) نے عیسیٰ علیہ السلام کی بشارت دی تھی۔

جاءت بمئات الملئک صاحبة كما — انبا الزبور به وهن اماء

● ٹھٹھ در ٹھٹھ ان کے دربار میں کنواریاں بن کر حاضر ہوئیں اسی طرح صحیفہ آسمانی کی پیشگوئی تھی۔

اومى الى القمر المنير فشقه — وابانه فبقين ذا الايماء

● چمکنے اور چمکانے والے چاند کو انہوں نے اشارہ سے دیکھ کر کے دونوں کو جدا جدا کر دیا۔

والشمس اشفت للغروب فاوقفت — ليكون منه للشروق اداء

● سورج غروب ہونے کے قریب تھا کہ طلوع کے لیے ٹھہر گیا۔

حثه احجار واشجارو كم — نطقت له بفصاحة عجماء

● پتھروں اور درختوں نے انہیں سلام کیا اور بہت سے چوپائے ان سے فصاحت کے ساتھ ہم کلام ہوئے۔

اروى بماء من اصابعه جرى — عطشى فانهلهم روى وارواء

● انگلیوں سے پانی جاری کر کے انہوں نے پیاسوں کو سیراب و شاداب کیا۔

كم اشبع الفرقى الكثير بمدة — فزوده كم نال المقل ثراء

● ان کی برکت سے بہت لوگوں کا تھوڑی سی غذا نے پیٹ بھر دیا اور بہت تہی دامن مالدار بن گئے۔

قد حن جذع حين فارقه كما — تبكى المتيم فى النوى الترحاء

● ان کی جدائی پر کھجور کا تنا اس عاشق کی طرح رویا جس کو محبوب سے دوری کی سوز و تپش رلاتی ہے۔

انان انان بعلم حكمة — قد احكمت عن ذكرها الحكماء

● دو امین و معتمد ہیں انہی ہو کر ایسی حکمت کی تعلیم دیتے ہیں جس کے سمجھنے سے حکماء و عقلاء بھی عاجز ہیں۔

حكم لملاكر احكما احكمت — ابانه فيها هدى وضياء

● وہ حاکم ہیں ذکرِ حکیم کی تلاوت کرتے ہیں اس کی آیتیں محکم ہیں ان میں ہدایت وشفا ہے۔

ذکر احوی حکما واحکاما بها　　عقل العقول وعیت العقلاء

● وہ ذکر حکمتوں اور حکموں پر مشتمل ہے جن سے عقلیں دنگ اور اہل عقل ودانش عاجز ہیں۔

جلی سواد شرائع منسوخة　　بشریعة هی سمحة بیضاء

● انہوں نے اپنی اجلی وروشن شریعت کے ذریعے منسوخ شریعتوں کی سیاہی کو دور کردیا۔

فظهور ملته محا مللا کما　　تمحو الکواکب من ذکاء ذکاء

● ان کی ملت کے ظہور نے تمام ملتوں کو اس طرح مٹادیا جیسے تارے سورج کے چمکتے ہی محو ہو جاتے ہیں۔

یمحو ضیاء الشمس نور کواکب　　ویطم فوق کواکب دامداء

● سورج کی روشنی ستاروں کی چمک مٹادیتی ہے اور سمندر دریاؤں پر غالب آجاتا ہے۔

فالله اظهر دینه وادامه　　فله علی مرّ الابود بقاء

● اللہ نے ان کے دین کو غالب وباقی رکھا اور مرور دہور پر اسی کو بقا ہے۔

لا غروان جحد السفاه به ومَن　　فی قلبه داء العناد عَیاء

● اگر بے وقوف اور معاند دشمن ان کے ان کمالات کا انکار کرتے ہیں تو تعجب کی بات نہیں۔

ماضرّ عین الشمس ان جحدت به　　عین الضریر ومقلة عمیاء

● قرص خورشید کو اندھے کی آنکھ کی بے نوری ضرر نہیں پہنچا سکتی۔

الله اوجب ان ینوّه باسمه　　فی حین یُرفع للصلٰوة نداء

● اذان میں ان کے نام کو بلند آواز کے ساتھ پکارنا اللہ نے ضروری قرار دیا ہے۔

ان زاد ادم من بُنُوّته عُلًی　　فکم اعلی بنیهم الأباء

● اگر آدم کے مراتب اس فرزندِ سعید کی بدولت بلند ہو گئے تو تعجب کیوں ہے؟ بہت سے باپ بیٹوں کی وجہ سے بلند مرتبہ ہوئے ہیں۔

قد شاء رسل ان یکونوا اُمّة　　وسطا فاُعطی بعضهم ما شاء وا

● بہت سے رسولوں نے امتِ وسط ہونا چاہا ان میں سے بعض کی آرزو پوری کردی گئی۔ (جیسا کہ زمانہ امام مہدی میں عیسیٰ علیہ السلام یہ شرف حاصل کریں گے۔)

هو مَفْزع للنّاس اذا فزعوا اذا — خُنروا فليس لهم سواه رَجاء

● میدانِ حشر میں لوگوں کی سراسیمگی کے وقت وہ جائے پناہ ہیں' ان کے سوا اور کسی سے امید نہیں ہو سکتی۔

يأتون ادم ملتجين وغيره — مستشفعين فاحجم الشفعاء

● وہ سب حضرت آدم اور دوسرے رسل علیہم السلام کے پاس طلب گارِ شفاعت ہو کر پہنچیں گے مگر وہ سب خاموشی اختیار کر لیں گے۔

فاتوه حين استيئسوا فيمحهم — محا به الانجاح والانجاء

● ان سب سے مایوس ہو کر وہ سب' ان نبی داتا کی خدمت میں حاضر ہوں گے' یہ فلاح ونجات والی سفارت سے کام لیں گے۔

طلب الانام رضاء من مطلوبه — هوان يكون لمصطفاه رضاء

● انہوں نے مخلوق کے لیے خالق کی وہ خوشنودی چاہی' جو اس کے برگزیدہ بندے کی رضا تھی۔

ورضائه هو ان يكون يمحه — لمؤمنين من العذاب نجاء

● اور ان کی رضا اس کے سوا کچھ نہ تھی کہ ایمان والوں کو عذاب سے نجات ملے۔

اولاده غُرًّا ما جد سادةٌ — فوق الانام لهم سَنًا وسناء

● ان کی اولاد شریف بزرگ اور سردار ہے' مخلوق پر انہیں رفعت وبلندی حاصل ہے اور ان کی چمک دمک کے سامنے سب ماند ہیں۔

خُطر كبار سادة كَرَم — هم النُّلاء والنجاء والنقباء

● وہ عظیم وکریم اور نجیب ونقیب ہیں۔

فلهم مناقب لا يحيط بوصفها — من واصفٍ مدحٌ ولا اطراء[1]

● ان کے اوصاف ومناقب کا احاطہ کسی مدح کرنے والے کی مبالغہ آمیز مدح بھی نہیں کر سکتی۔

---

[1] درج بالا تمام نعتیہ اشعار مجاہد کبیر علامہ فضل حق خیرآبادی علیہ الرحمۃ کے تصنیف کردہ "قصیدہ ہمزیہ" سے لیے گئے ہیں۔

اداریہ

اللہ رب العزت کے ہم بہت ممنون ہیں کہ اس نے ہمیں ایک ایسی عظیم باکردار بزرگ کے متعلق ماہنامہ "العاقب" کا خاص نمبر شائع کرنے کی توفیق عطا فرمائی جو ہمارے آقا کریم ﷺ کا سچا "پکا" ادب غلام ہے۔ اس عظیم ہستی کا اسم گرامی علامہ محمد فضل حق خیرآبادی علیہ الرحمۃ ہے۔ علامہ فضل حق خیرآبادی علیہ الرحمۃ کی باکمال شخصیت کے کئی پہلو ہیں۔ مثلاً کہیں آپ منصب مدرسیں پر یوں براجمان ہیں کہ خود علم کو آپ پر ناز ہے اور آپ صدر العلماء واستاذ العلماء کہلائے۔ کہیں حکمت وکلام کے موتی یوں رول رہے ہیں کہ امام الکلام کہلائے۔ کہیں رسول اللہ ﷺ کی عزت وناموس اور منصب ختم نبوت کی پہریداری یوں کی کہ محافظ ناموس رسالت ﷺ کہلائے۔ کہیں اپنے وقت کے ممتاز ادباء وشعراء کی یوں اصلاح کی کہ ان کے مخدوم کہلائے۔ کہیں میدان سیاست میں یوں خدمات سرانجام دیں کہ مقتدر ترین آئین کے بانی کہلائے۔ کہیں فرنگی سامراج کی مکاریوں اور عیاریوں کو یوں طشت از بام کیا کہ محب وطن کہلائے۔ کہیں اعلیٰ ترین حکومتی عہدوں پر یوں فائض رہے کہ سیاسیات کے امام کہلائے۔ کہیں شاہ وقت کے یوں مشیر رہے کہ اس کے معتمد ترین ساتھی قرار پائے۔ کہیں فرنگی گماشتوں سے یوں مقابلہ کیا کہ بانی ہندوستان کہلائے۔ کہیں میدان جنگ میں یوں شامل ہوئے کہ مجاہد کبیر اور مجاہد آزادی کہلائے۔ کہیں کلمہ حق یوں بلند کیا کہ ابوحنیفہ ثانی کہلائے۔ الغرض ان تمام پہلوؤں کا مجموعہ کیا جائے تو علامہ محمد فضل حق خیرآبادی کی شخصیت سامنے آتی ہے۔

علامہ فضل حق خیرآبادی تاریخ کے مظلوم کرداروں میں سے ایک ایسا کردار ہے جس پر کہیں اپنوں نے ظلم ڈھائے ہیں تو کہیں غیروں نے غیروں سے کیا گلہ وشکوہ کرنا غیر تو غیر ہوتے ہیں ان سے یہ توقع رکھنا کہ وہ آپ کی یا آپ کے اکابر کی تعریف وتوصیف میں قصیدے کہیں تو یہ ہماری نادانی اور بے وقوفی ہی ہوگی۔ گلہ تو اپنوں سے ہے کہ جو سب جانتے ہوئے بھی آنکھیں بند کر لیتے ہیں۔ جو مسلک کلیک کی چھتری کے سائبان کو استعمال کرنے اور اس سے لطف اندوز ہونے کے لیے اپنے بچے اور بچے بزرگوں کو اپنے مفادات کی بھینٹ چڑھا دیتے ہیں۔

آج ہمارے اشاعتی ادارے اور مکتبے لہالہ ایسے لٹریچر سے اٹے پڑے ہیں جس کا "من حیث القوم" ہماری اصلاح وفلاح میں کوئی کردار نہیں۔ قوموں کی اصلاح ان کے ماضی کو مدنظر رکھ کر کی جاتی ہے اور ماضی جاننے کے لیے تاریخ کے دروازے پر دستک دینا پڑتی ہے۔ تاریخ کے دروازے پر جب ہم دستک دیتے ہیں تو شہر خموشاں کی طرح سناٹا سامنے آتا ہے۔ نتیجتاً جب ادھر اُدھر منہ مارا جاتا ہے تو ان کرم فرماؤں کی طرف سے ایسی تاریخ سازی سامنے آتی ہے کہ خود جھوٹ بھی شرما جائے۔

رواں برس خدا یان مفتم نبوت پاکستان کے مرکزی امیر شیخ الحدیث حضرت علامہ حافظ خادم حسین رضوی متعنا الله بطول حیاته نے خصوصی حکم فرمایا کہ اس سال مجاہد کبیر علامہ فضل حق خیرآبادی علیہ الرحمۃ کی حیات وخدمات پر ایک وقیع نمبر شائع کرنا ہے۔ استاذ مکرم وامیر محترم کے حکم کی تعمیل میں جب عملی قدم اٹھایا تو دو راستے نظر آئے۔ ایک یہ کہ علامہ کی حیات وخدمات پر اہل قلم سے نئے مقالہ جات لکھوائے جائیں اور دوسرا یہ کہ پہلے سے شائع شدہ مواد کو از سر نو تزئین وترتیب کے ساتھ منظر عام پر لایا جائے۔ پہلا راستہ خاصا وقت طلب اور دوسرا تعاون طلب تھا۔ یہ ساری صورتحال جب حضرت استاذ محترم کے سامنے پیش کی تو آپ نے حکم دیا کہ جو مواد شائع ہو چکا ہے اور اب لائبریریوں کی پرانی فائلوں میں ہے اسے تو لازمی منظر عام پر لایا جائے جبکہ اس کی کمپوزنگ ہونے تک جو لکھاری اپنے مقالے ارسال کر دیں انہیں بھی شامل اشاعت کر دیا جائے۔

مجاہد کبیر علامہ فضل حق خیرآبادی علیہ الرحمۃ کے حوالے سے قدیم خاص نمبروں کی جب تلاش شروع کی گئی تو ہفت روزہ الہام بہاولپور کے علامہ محمد فضل حق خیرآبادی نمبر کے علاوہ کوئی اور نمبر نہ مل سکا۔ چنانچہ ہفت روزہ الہام (جو اب ماہنامہ الہام ہو چکا ہے) کے روح رواں پروفیسر شاہد حسن رضوی صاحب سے رابطہ کیا اور انہیں اپنا مدعا بیان کیا۔ پروفیسر صاحب نے علم دوستی کا ثبوت دیتے ہوئے نہ صرف بخوشی اس نمبر کی دوبارہ اشاعت کی اجازت دے دی بلکہ اپنا ایک مقالہ بھی ہمارے نمبر کے لیے بھیج دیا۔ ہم نے اپنے اس نمبر میں ماہنامہ الہام کے شائع کردہ علامہ فضل حق خیرآبادی نمبر 28 اکتوبر 1985ء کا اکثر حصہ لیا ہے۔

علامہ فضل حق خیرآبادی پر نمبر کی ترتیب کے وقت اشد سے یہ خیال دامن گیر رہا کہ جنگ آزادی 1857ء کا بھی اگر ساتھ تذکرہ شامل ہو جائے تو اس نمبر کی افادیت دوبالا ہو جائے گی چنانچہ بعد از مشاورت جنگ آزادی 1857ء سے متعلقہ مواد کو بھی اس نمبر کی زینت بنایا گیا ہے۔ اس حصے کا بیشتر مواد ماہنامہ اشرفیہ مبارکپور انڈیا کے انقلاب 1857ء نمبر مطبوعہ اگست ستمبر 2008ء سے لیا گیا ہے۔ ادارہ العاقب ماہنامہ اشرفیہ کے مدیر اعلیٰ مولانا

زندہ ہو جاتے ہیں جو مرتے ہیں کربلا کے بعد

مبارک مصباحی اور ان کی پوری ٹیم کا بے حد مشکور ہے کہ انہوں نے ہمیں اس نمبر کا اکثر حصہ پاکستان میں شائع کرنے کی اجازت دی۔

اس کے علاوہ محترمہ ڈاکٹر قمر النساء دار العلوم انوار العلوم حیدر آباد دکن کے پی ایچ ڈی مقالہ العلامہ فضل حق الخیر آبادی مطبوعہ مکتبہ قادریہ لاہور اور محترمہ سلمہ سیول انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی اسلام آباد کے مقالہ علامہ محمد فضل حق خیر آبادی علیہ الرحمۃ مطبوعہ المتاز پبلی کیشنز لاہور سے بھرپور استفادہ کیا ہے۔

اس نمبر میں سہولت کے پیش نظر کتابت کی جدید طرز اپنائی گئی ہے اور اکثر مقامات پر ذیلی عنوانات کا اضافہ کر کے مواد کو احسن انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ بعض جگہ پر ایک ہی واقعہ یا بات مختلف انداز یا الفاظ سے تکرار سے آئی ہے اس تکرار و طوالت سے حتی الامکان بچنے کے لیے انہیں حذف کر دیا گیا ہے اور کہیں عبارت کے تسلسل یا اس نظر کی وجہ سے علی حالہ رکھا گیا ہے۔

اس نمبر کا اصل تصور علامہ فضل حق خیر آبادی علیہ الرحمۃ کی حیات و خدمات پر روشنی ڈالنا تھا۔ اس کے ضمن میں جنگ آزادی 1857ء کا ذکر ہوا ہے لہذا صرف نظم و قطعات کو علامہ فضل حق کے ساتھ ہی خاص رکھا گیا ہے تا کہ اصل تصور کی افادیت برقرار رہے۔ علاوہ ازیں علامہ فضل حق کے قتیل اس نمبر میں تقریباً 500 سے زائد افراد کا اجمالی اور 100 کے قریب افراد کا تفصیلی ذکر ہوا ہے۔

ہماری دلی خواہش و حسرت تھی کہ اس نمبر کے ذریعہ پاک و ہند میں پہلی مرتبہ علامہ کے مزار پر انوار کی تصویر شامل کی جائے لیکن پاک و ہند کے ممتاز علماء سے مسلسل اور بھرپور رابطے کے باوجود کامیابی نہ ہو سکی حتی کہ ایک مرحلے میں فقط مزار پر انوار پر حاضری و تصویر کے لیے جزائر انڈمان (2508 مرحٹ میل پر پہلے 204 جزائر کا مجموعہ) جانے کا قصد بھی کیا مگر حضرت استاذ گرامی علامہ غلام حسنین رضوی کے انتقال حادثاتی کی وجہ سے منسوخ کرنا پڑا۔ شاید قدرت حق کو یہ شاہکار کسی اور موزوں وقت پر منظر عام لانا ہو۔

علامہ کے مزار کے حوالے سے ہمیں فقط اتنی ہی معلومات تھیں کہ آپ کا مزار جزیرہ انڈمان میں سمندر کے کنارے ساڈھ تھ پائنٹ کی بستی میں واقع ہے۔ ساڈھ تھ پائنٹ عرف عام میں "ٹنک بھٹہ" کہلاتا ہے اور یہ بستی روس (Ross) جزیرے کے قریب ہے۔ علامہ کے مرقد انور کے ساتھ مولانا لیاقت علی صاحب کی قبر بھی ہے۔ خانوادہ مولانا شاہ فضل رسول بدایونی علیہ الرحمۃ کے چشم و چراغ مولانا نسید الحق قادری کے بقول ان کے والد صاحب پدرہ بیس سال قبل علامہ کے مزار پر حاضر ہوئے تھے۔ اس وقت علامہ کی مرقد کھلے آسمان تلے بغیر کسی

مزار و گنبد کے تھی البتہ قبر کے ارد گرد چار دیواری ضرور تھی۔ مولانا اسید الحق قادری کے پاس ہی علامہ کی مرقد انور کی دو تصاویر موجود تھیں جو تلاش بسیار اور انتظار طویل کے بعد بھی میسر نہ ہو سکیں۔

ابر رحمت ان کے مرقد پر گہر باری کرے
حشر میں شان کریمی ناز برداری کرے

آخر میں ادارہ العاقب اس نمبر میں دامے درمے قلمے تعاون کرنے والے تمام افراد کے لیے دعا گو ہے کہ اللہ رب العزت تمام احباب کو اس کی بہتر جزا اور اجر عظیم عطا فرمائے اور ہمیں اپنے اسلاف کے دامن سے وابستہ رہ کر خدمت دین کی توفیق عطا فرمائے۔

مفتی اعظم علیہ الرحمۃ کی اہلیہ محترمہ کا وصال پر ملال

10 جولائی بروز جمعہ تقریباً ساڑھے بارہ بجے مفتی اعظم پاکستان حضرت علامہ مفتی محمد عبدالقیوم ہزاروی علیہ الرحمۃ کی اہلیہ محترمہ اچانک وصال فرما گئیں۔ آپ کی پہلی نماز جنازہ بروز ہفتہ شام 5 بجے کے قریب جامع المعقول والمنقول، شیخ الحدیث حضرت علامہ حافظ عبدالستار سعیدی دامت برکاتہم کی اقتداء میں حضرت داتا گنج بخش علیہ الرحمۃ کے مزار کے زیر سایہ ادا کی گئی۔ دوسری نماز جنازہ شام 7 بجے کے قریب استاذ العلماء حضرت مولانا سید حسین الدین شاہ صاحب اللہ بطول حیاتہ کی اقتداء میں جامعہ نظامیہ رضویہ شیخوپورہ کے سبزہ زار میں ادا کی گئی۔ دونوں نماز جنازہ میں علماء کرام و مشائخ عظام سمیت کثیر تعداد میں خلق خدا بھی شامل ہوئی۔ بعد ازاں مرحومہ کی تدفین شیخوپورہ میں ہی کی گئی۔

مرحومہ ذاتی طور پر انتہائی رحمدل، سخی، شفیق اور سادہ طبیعت کی مالک تھیں۔ راتوں کو اٹھ کر اللہ رب العزت کے حضور گریہ وزاری اور تلاوت قرآن مجید آپ کی عادت ثانیہ بن چکی تھی۔ جمعیت کو حضرت صاحبزادیاں (یعنی بیوی "ماں") کی نسبت سے آپ کی زندگی کو دیکھا جائے تو "ماں جی" کی زندگی قابل رشک معلوم ہوتی ہے۔

سیدی و مرشدی قبلہ مفتی صاحب علیہ الرحمۃ نے اپنی پوری زندگی مجاہد میداں کی طرح مسلسل متحرک رہ کر بسر کی۔ درس و تدریس، تصنیف و تالیف، اہتمام و انصرام، اشاعت و تالیف اور حکومت سے گفت و شنید کی معروفیات سے بوجھل مفتی صاحب علیہ الرحمۃ جب نڈھال ہوئے گھر لوٹتے تو مرحومہ ہی مفتی صاحب علیہ الرحمۃ کی اس انداز میں خدمت کرتیں کہ مفتی صاحب علیہ الرحمۃ کو دن بھر کی تھکاوٹ کا ذرہ بھر احساس نہیں رہتا۔

مفتی اعظم علیہ الرحمۃ کی تمام خدمات کے پس منظر میں ہماری "ماں جی" کا ہاتھ ضرور رہتا تھا۔ مفتی صاحب علیہ الرحمۃ نے اپنے تعلیمی، تصنیفی و اشاعتی مشن پر خاندانی معاملات کو قربان کر دیا تو "ماں جی" ہی جنس لطیف خاندانی امور میں مفتی صاحب علیہ الرحمۃ کی نیابت فرماتیں۔

جامعہ نظامیہ رضویہ کا ابتدائی دور خاصا پُر آشوب تھا۔ اس وقت آج نظر آنے والی چمک دمک نہیں تھی۔ جامعہ ہر طرف سے مصائب میں گھرا ہوا تھا۔ جامعہ کی ترقی میں کبھی مالی معاملات آڑے آتے تو کبھی اہل محلہ۔ ان نامساعد حالات میں مفتی صاحب علیہ الرحمۃ کی رفیقہ حیات نے اپنی رفاقت کا حق ادا کر دیا۔ آپ نے اپنے آرام و سکون کو قربان کرتے ہوئے گرمی اور سردی میں صبح و شام کا فرق کیے بغیر سینکڑوں طلباء کا کھانا تیار کرنیں اور جس طرح ایک حقیقی ماں اپنے بچوں کا خیال رکھتی ہے اسی طرح "ماں جی" اطائے جامعہ کا خیال رکھتی تھیں۔

جامعہ نظامیہ رضویہ کی نمو و پرورش میں جہاں مفتی اعظم علیہ الرحمۃ کا بے مثال کردار عیاں ہے وہیں مفتی صاحب کی رفیقہ حیات کی روشن خدمات کسی سے اوجھل نہیں۔ جامعہ کی بنیادوں کو مضبوط و مستحکم رکھنے میں بلاشبہ آپ مفتی صاحب علیہ الرحمۃ کے دست راست کی مانند تھیں۔ مدرسۃ البنات شکوہ پورہ کی ترقی میں آپ بنیادی محرک تھیں۔ مدرسہ کی اکثر داخلہ پالیسی بھی آپ ہی نے وضع کی تھی۔ ہر سال تعلیمی سال کے اختتامی پروگرام میں آپ ہی صدر مجلس و جلسہ ہوتیں۔ اس کے علاوہ گاہے بگاہے مدرسۃ البنات کی معلمات کی تربیت کرتیں اور انہیں اپنی کامیاب عملی زندگی کے تجربات سے آگاہ کرتے ہوئے مستقبل کی منصوبہ بندی کی تلقین فرماتیں۔

ان تمام خدمات کے ساتھ ساتھ مرحومہ کی قابلیت کو داد نہ دینا ناانصافی ہوگی کہ طلباء کی گھداشت کی ذمہ داری کے ساتھ ساتھ مرحومہ نے اپنے بچوں کی پرورش میں بھی کوئی کوتاہی نہیں برتی۔ خود بھی شرعی پردے کی پابند تھیں اور اپنے گھر میں بھی شرعی پردے کا حتی الامکان اہتمام رکھا۔ بچوں کی تعلیم کو تربیت اس طرح پر کی کہ اولاد حافظ قرآن اور عالم دین ہے ہی ان کی نسل میں بھی تقریباً ہر گھر میں حافظ قرآن بچہ یا بچی موجود ہے۔ گویا آپ مفتی اعظم کی اہلیہ، علماء کی والدہ اور حفاظ کی دادی و نانی تھیں۔

۔۔۔ایں سعادت بزور بازو نیست

اہل محلہ کی خواتین کے لیے بھی آپ کی ذات ایک مشفق ماں کی مانند تھی۔ کئی غریب گھرانوں کی شادیوں میں مرحومہ نے بہ سبب غیب کی مانند ان کی مدد کی۔ اس امداد سے آپ کا مقصود تشہیر یا دکھلاوا نہیں ہوتا بلکہ آپ اس انداز سے ان سے تعاون کرتیں کہ دائیں ہاتھ سے دست تعاون بڑھاتیں تو بائیں ہاتھ کو بھی پتہ نہیں چلتا تھا۔ (ماں جی

کے وصال کے بعد خواتین محلہ نے آپ کی جدوجہد کے بڑے لطیف واقعات بیان کیے ہیں۔ جن کا یہاں ذکر طوالت کی وجہ سے نہیں کیا جارہا۔)

اللہ تبارک وتعالیٰ اپنے حبیب کریم ﷺ کے طفیل "ماں جی" کے روحانی درجات بلند فرمائے اور ان کے تمام پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ آمین بجاہ النبی الکریم ﷺ

مَوْتُ الْعَالِمِ مَوْتُ الْعَالَمِ

آہ! ڈاکٹر سرفراز احمد نعیمی شہید

12 جون 2009ء بروز جمعہ ملک عزیز پاکستان کے نامور عالم دین اور تنظیم المدارس اہلسنت پاکستان وجامعہ نعیمیہ لاہور کے اہم رکن حضرت مولانا ڈاکٹر سرفراز احمد نعیمی کو دن دیہاڑے شہید کردیا گیا۔

شہید ڈاکٹر سرفراز احمد نعیمی "صدر الافاضل مولانا نعیم الدین مرادآبادی علیہ الرحمۃ کے خلیفہ وشاگرد مفتی محمد حسین نعیمی علیہ الرحمۃ کے ہاں 16 فروری 1948ء کو دائگراں ہلنگ لاہور میں پیدا ہوئے۔ سابق وزیر اعظم میاں محمد نواز شریف آپ کے بچپن کے ساتھیوں میں سے ہیں۔ آپ نے دینی تعلیم جامعہ نعیمیہ دائگراں چوک سے حاصل کی۔ (یاد رہے کہ شہید کے والد گرامی مفتی محمد حسین نعیمی علیہ الرحمۃ نے 1953ء کی تحریک ختم نبوت سے قبل اسی مسجد دائگراں کے اندر اپنے مشفق ومحبوب استاد مولانا نعیم الدین مرادآبادی علیہ الرحمۃ کے اسم گرامی سے منسوب جامعہ نعیمیہ کی بنیاد رکھی۔ 1958ء میں علماء کی کثرت اور باہمی کی قلت کی بدولت جامعہ نعیمیہ دائگراں چوک سے موجودہ مقام گڑھی شاہو میں منتقل ہوگیا۔) اس کے علاوہ میٹرک تک عصری تعلیم گڑھی شاہو سکول سے حاصل کی اور پھر M.A 'B.A 'F.A اور M.O.L کے امتحانات پرائیویٹ طور پر پاس کیے۔ 1982ء میں پنجاب یونیورسٹی سے L.L.B کا امتحان پاس کیا اور پھر شہر آفاق دانشگاہ جامعہ ازہر مصر تشریف لے گئے۔ 1984ء میں مصر سے "شہادۃ الفراغ" کی سند لے کر ملک واپس لوٹے۔ یہاں پنجاب یونیورسٹی سے ڈاکٹر منظور احمد اظہر کی نگرانی میں ڈاکٹریٹ (P.H.D) کے مقالہ کی تکمیل کی اور یونیورسٹی کی طرف سے آپ کو ڈاکٹریٹ کی سند تفویض ہوئی۔

تعلیم سے فراغت کے بعد ڈاکٹر صاحب اپنے والد گرامی کا مدرسہ کے اہتمام میں ہاتھ بٹاتے۔ 1998ء میں

جب والد گرامی مفتی محمد حسین نعیمی علیہ الرحمۃ نے وصال فرمایا تو جامعہ نعیمیہ کی تمام تر انتظامی ذمہ داریاں آپ کے کندھوں پر آ گئیں۔ اسی سال آپ اسلامی نظریاتی کونسل کے رکن بھی منتخب ہوئے۔ 2002ء میں ٹی مدارس کی نمائندہ تنظیم "تنظیم المدارس اہلسنت" کے جب مفتی اعظم پاکستان مفتی محمد عبدالقیوم ہزاروی علیہ الرحمۃ صدر منتخب ہوئے تو ڈاکٹر سرفراز صاحب شہید ناظم اعلیٰ کے منصب پر سرفراز ہوئے۔

فدایانِ ختم نبوت پاکستان کے ساتھ ڈاکٹر صاحب شہید کے بہت گہرے تعلقات تھے۔ سال گذشتہ جب فدایان کے زیر اہتمام 7 ستمبر 1974ء کی مناسبت سے جامعہ رسولیہ شیرازیہ میں پروگرام منعقد کیا اور رمضان المبارک کی مصروفیات کے باوجود شہید نے صرف وقت مقررہ پر تشریف لائے بلکہ خلاف معمول پروگرام کے آخر تک تشریف فرما رہے۔ اس پروگرام میں عقیدہ ختم نبوت اور دور حاضر میں فتنہ قادیانیت پر آپ نے پُر مغز خطاب بھی فرمایا۔ ماہنامہ "العاقب" ان دنوں سہ ماہی تھا۔ جب حضرت شہید کو اس کے شمارے پیش کیے گئے تو آپ کھل کھلا اٹھے۔ جستہ جستہ مقامات سے اسی وقت مطالعہ فرمایا اور دل کھول کر داد دی "ساتھ ہی فرمایا" واقعی اس وقت اس قسم کے رسائل کی اشد ضرورت ہے"۔

فدایانِ ختم نبوت کی طرف سے قادیانیوں کے ساتھ تعلقات اور معاملات کے ضمن میں ایک استفتاء مرتب ہوا تو ملک بھر کے جید اور چنیدہ مفتیان کرام اور علماء دیوبند سے اس پر فتویٰ طلب کیا۔ راقم جب شہید مفتی صاحب کے پاس حاضر ہوا تو آپ نے موصول ہونے والے تو بیگر فتاویٰ کو ایک نظر دیکھا اور پھر فرمایا جامعہ نظامیہ رضویہ اندرون لوہاری گیٹ لاہور کی طرف سے جاری کیے گئے فتویٰ پر تائید و تصدیق کر دی۔ ساتھ ہی یہ تاکید بھی کی کہ "جامعہ نعیمیہ کے شعبہ دارالافتاء سے بھی مفتیان کرام کی تصدیق کروالو"۔ ان حضرات سے تائید و تصدیق کے بعد جب آپ کے پاس لوٹا تو آپ نے اس فتویٰ پر ہاتھ رکھا تبسم کیا اور فرمایا "بہت خوب اب ہمارا بھی اس فتویٰ میں حصہ ہو گیا"۔ خدا شاہد ہے کہ جامعہ نعیمیہ میں داخلے سے قبل میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ ڈاکٹر صاحب یوں کرم فرمائی کرتے ہوئے بصد خوشی اس فتویٰ پر دستخط کر دیں گے۔ دراصل اس سے قبل بھی میں کئی نامی گرامی مفتیان دین اور علمائے متین کے پاس تائید و تصدیق کے لیے حاضر ہوا تو انہوں نے حکم حتمی منصب اور نہ جانے کیا کیا عذر بیان کر کے پہلو تہی کی حالانکہ مفتی کا کام ہی مسئلہ کا شرعی حکم بتانا ہے پھر یہ دنیاوی مراتب و مناصب پر فائز ہو کر حکم شرعی سے پہلو تہی کرنا چہ معنی دارد؟

عقیدہ ختم نبوت کے تحفظ اور دروقادیانیت کے ضمن میں ایک ملاقات میں راقم نے عرض کیا کہ اس وقت ایسے

قلیل المدتی کو سزا کی اشد ضرورت ہے جن میں ہمیں کم وقت میں ان امور پر قابل قدر دسترس ہو۔ آپ نے فوراً فرمایا" آپ جا کر مولانا خادم حسین رضوی صاحب سے کہہ دیں کہ ایسے کو سزا کے لیے میرا مدرسہ ہر وقت حاضر ہے۔ آپ کوئی معیاد ناظم قائم کریں اور اس کی ابتداء یہاں سے کریں۔ حقیقۃً ختم نبوت کے تحفظ کے لیے میری خدمات ہمیشہ آپ کے ساتھ ہیں"۔

دور پرویز میں جب گستاخ رسول کی قانونی سزا کو ختم کرنے کے لیے حکومتی مشنری حرکت میں آئی تو ڈاکٹر صاحب علیہ الرحمۃ نے اس کا سختی سے نوٹس لیتے ہوئے تحریک تحفظ ناموس رسالت ﷺ کا آغاز کیا اور قیادت کا فریضہ خود سرانجام دیا۔ اسی طرح جب ڈنمارک نے گستاخانہ خاکے شائع کیے تو ڈاکٹر صاحب نے پاکستان میں تحفظ ناموس رسالت محاذ کے پلیٹ فارم سے اس تحریک کی قیادت کی۔

فدایان ختم نبوت کے مرکز کی امیر حضرت علامہ حافظ خادم حسین رضوی کے ساتھ مفتی صاحب شہید کا باہمی عقیدت و محبت کا رشتہ تھا۔ اس کا اندازہ یوں لگایا جا سکتا ہے کہ 30 اپریل 2009ء کو جب حضرت علامہ کے والد محترم کا وصال ہوا تو اگلے دن بعد المبارک کے باوجود ڈاکٹر سرفراز نعیمی علیہ الرحمۃ آٹھ دس گھنٹے کا طویل سفر کر کے نماز جنازہ میں شرکت کے لیے پہنچے اور مختصر خطاب بھی فرمایا۔

بہر کیف ڈاکٹر سرفراز احمد نعیمی جید عالم دین، مفتی اور بہترین مدرس و منتظم تھے۔ آپ نے اپنے والد گرامی کے نقش قدم پر چلتے ہوئے اپنے لیے سادہ طرز زندگی اختیار کی اور اسی سادگی میں تمام عمر بسر کر دی۔ بروز شہادت نماز جمعہ سے فراغت کے تھوڑی دیر بعد جامعہ نعیمیہ کے استقبالیہ دفتر میں ہمیشہ کی طرح لوگوں کے مسائل سننے اور ان کی مدد کے لیے تشریف فرما تھے کہ اتنے میں کوئی اجنبی بد بخت داخل دفتر ہوا۔ اس نے ڈاکٹر صاحب سے ہاتھ ملاتے ہوئے خود کو بم سے اڑا لیا۔ اس دھماکہ خیز حملے کی زد میں ڈاکٹر صاحب علیہ الرحمۃ اور کمرے میں موجود ان کے احباب بُری طرح زخمی ہو گئے۔ ان شدید زخمی افراد میں سے ڈاکٹر سرفراز احمد نعیمی، حافظ محمد عبدالرحمٰن، مولانا محمد اکمل، مولانا حافظ محمد ارشد اور مولانا قاری محمد اسماعیل منصب شہادت پر فائز ہو گئے جبکہ باقی افراد کافی عرصہ ہسپتال میں داخل رہے۔ جس کمرے میں ڈاکٹر صاحب علیہ الرحمۃ پر حملہ کیا گیا اس کے دروازے پر یہ شعر اور ڈاکٹر صاحب اور ان کے احباب کی شہادت اہل دل کو یاد دہانی کروا رہی تھی۔ شعر یہ ہے

در دل مسلم مقام مصطفیٰ ﷺ است
آبروئے ما زنام مصطفیٰ ﷺ است

اگلے دن بطور احتجاج ملک بھر کے سنی مدارس میں تعطیل اور 3 روزہ سوگ کا اعلان کیا گیا جبکہ حکومت پنجاب نے بھی اس اندوہناک اور سفاکانہ حملے پر سرکاری تعطیل کا نوٹس جاری کیا۔ نماز جنازہ شام ساڑھے چار بجے کے قریب شہید کے اکلوتے صاحبزادے مولانا راغب حسین نعیمی نے وسیع و عریض ناصر باغ میں پڑھائی جبکہ تدفین عصر کے وقت درود و سلام اور قصیدہ بردہ شریف کی گونج میں ہوئی۔ تدفین کے موقع پر اس شعر نے عجب سماں پیدا کر دیا تھا۔

۔ کروں تیرے نام پہ جاں فدا نہ بس ایک جہاں دو جہاں فدا
دو جہاں سے بھی جی نہیں بھرا کروں کیا کروڑوں جہاں نہیں

محکمہ اوقاف سے ریٹائرمنٹ کے بعد 6,970 روپے پنشن اور جامعہ نعیمیہ سے 9,300 روپے ماہانہ ملنے والے مشاہرہ پر گزر بسر کرنے والے عظیم سنی سیرت کی جیب سے بعد از شہادت 120 روپے نکلے۔ بقول صاحبزادہ مولانا راغب حسین نعیمی "شہادت کے بعد ابا جان کی جیب سے صرف 120 روپے نکلے"۔ شہید نے ساری زندگی جامعہ نعیمیہ سے ذاتی سواری کے لیے تیل لیا اور نہ ہی کھایا۔ بلکہ جس قدر شہید کی متحرک شخصیت تھی ان کی صرف آمد و رفت کا خرچہ پنشن اور ماہانہ مشاہرہ سے یقیناً زیادہ ہوتا ہوگا۔

بقول عرفان صدیقی "میں نے انہیں کبھی چمکتی دمکتی کسی عالی نسب گاڑی میں نہیں دیکھا ہمیشہ ہی پرانے طرز کی چھوٹی سی گاڑی پہ ہوتے جو کئی کئی ٹیکیاں لینے کے بعد اسٹارٹ ہوتی تھی۔ ہمارے جید علمائے کرام میں سے شاید ہی کوئی ایسی گاڑی میں بیٹھنے کی فجالت برداشت کرے۔ انہوں نے موٹر سائیکل رکھا ہوا تھا۔ میں نے خود ایک بار انہیں موٹر سائیکل پر سوار دیکھا۔ وہ ان فرخشوں سے بے نیاز تھے ان کے لباس میں بھی فقیرانہ سادگی تھی "نہ جبہ نہ کلاہ نہ دستار۔ کوئی واقف نہ ہو تو قیاس نہیں کر سکتا تھا کہ یہ مولانا ۱۳۲ اکبر سرفراز نعیمی ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ہمارے ہاں بڑے باپوں کی اولاد چھوٹی اور نکمی نکلتی مولانا معین نعیمی صاحب کی رائے ہے "میں ہوں کہ ان کا بیٹا سرفراز شہادت کے منصب پر سرفراز ہوا اور انہیں بھی سرفراز کر گیا"۔

اللہ رب العزت شہید کے تمام پسماندگان، اعزاء و اقرباء، اتباع نعیمیہ اور تمام اہلسنت کو یہ عظیم سانحہ برداشت کرنے کی توفیق عطا فرمائے اور شہید اکبر سرفراز نعیمی صاحب علیہ الرحمۃ سمیت تمام اکابرین کی قبور کو جنت نور بنا دے۔ آمین یارب العالمین

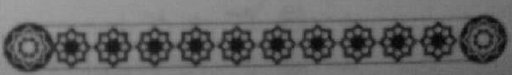

سید عارف محمود کوثر رضوی گجرات

قطعۂ تاریخ برائے خصوصی اشاعت

ماہنامہ العاقب

﴿اشاعت خاص زیب اقلیم ماہنامہ العاقب﴾

2009ء

﴿دلآویز امام المتکلمین مولانا خیر آبادی﴾

2009ء

ناظر تحریک آزادی ہیں الحق ، فضل حق

کاتب تاریخ کا یہ بر ملا اعلان ہے

آبروئے ملت اسلامیہ ان کا وجود

جذبۂ آزادی ملت کی ان میں جان ہے

کھل اٹھے تھے ان کے باعث نخچہ ہائے حریت

جنگ آزادی کی ان سے ڈھونڈھا پہچان ہے

روح پھونکی جنگ آزادی کی پورے ہند میں

کارنامہ آج بھی اُن کا عظیم الشان ہے

سینچ کر اپنے لہو سے گلشن دین مبین

اہل سنت کی بڑھائی تا قیامت آن ہے

WWW.NAFSEISLAM.COM

اہل حق کو زندگی بخشی ہر اک میدان میں
اہل باطل کا کیا ہر موڑ پر بطلان ہے

شاتمانِ مصطفیٰ ☆ کا کر دیا بند ناطقہ
عاشقانِ مصطفیٰ ☆ کا فضلِ حق سلطان ہے

ماضیٔ ہندوستان سے خوشنما تاریخ ہند
ذکرِ فضلِ حق سے بھی دین کا ایوان ہے

اللہ اللہ جنگِ آزادی کا ہر اک رہ نما
باعث اعزاز ملت، وجہِ عز و شان ہے

سب کا ایثار و تدبر مشعلِ راہِ حیات
سب نے ہی بخشا چمن کو زیست کا سامان ہے

سب کی عظمت، سب کی جرأت کو "العاقب" کا سلام
کر رہا جو آج ہم پر اک عظیم احسان ہے

زندگی بخشی ہے پھر سے گمشدہ تاریخ کو
پھر سے تازہ کر دیا سطوت کا اک عنوان ہے

شائع کر کے خاص نمبر سب کو بخشا ولولہ
ازسرِ نو روح پرور ہوگیا وجدان ہے

روح پھونکی جنگِ آزادی کی پورے ہند میں
کارنامہ آج بھی اُن کا عظیم الشان ہے

WWW.NAFSEISLAM.COM

جنگِ آزادی کی یادوں کو کیا پھر سے جواں
پھر وہ تاریخ چھیڑی، جس پہ ہم کو مان ہے
پھر سے کی کالی ظلمت، جھوٹ کے گھر بار کی
پھر سے بے بنیاد ٹھہرا ہر کوئی بہتان ہے

خادم ملت ہیں میرے محترم "خادم حسین"
ختمِ نبوت جن کا دینِ ایمان ہے
ترجماں ختمِ نبوت کا عطا کر کے ہمیں
کافی حد تک کر دیا کم، دین کا نقصان ہے
الغرض مجبور آزادی کا ہر اک رہ نما
"کردگارِ پاک کا فیضاں" علی الاعلان ہے

1430ھ

"ارمغانِ اہلِ ایماں" ہے سن شائع کہو
1430ھ

ہاتفِ غیبی کا یہ مجبور کو فرمان ہے

WWW.NAFSEISLAM.COM

علامہ فضل حق خیرآبادی

پروفیسر ڈاکٹر محمد مسعود احمد

ادارہ مسعودیہ کے بانی پروفیسر ڈاکٹر مسعود احمد ایک بلند پایہ مذہبی و علمی گھرانے کے چشم و چراغ تھے۔ آپ کے آباؤ اجداد دہلی کی جامع مسجد فتح پوری کے خطیب اور دہلی کی سنی قیادت کے علمبردار تھے۔ قدرت حق نے آپ کو نرالا انداز تحریر عطا فرمایا تھا۔ دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے کہ مصداق پروفیسر صاحب کا قلم عجیب تاثیر رکھتا تھا' مشکل سے مشکل بات آسان اور شگفتہ پیرائے میں بیان کرنا آپ کا خاصہ تھا۔ اسی عطاء ربی کو بروئے کار لاتے ہوئے جب آپ نے اپنی تحقیقات کا رخ اعلیٰ حضرت عظیم البرکت کی جانب کیا تو گرانقدر اور نادر تحقیقات وجود میں آئیں۔ ڈاکٹر صاحب کی رضویات کے متعلق پے در پے شستہ و شگفتہ اور مؤثر تحریروں نے آپ کو "ماہر رضویات" کے منصب پر لا کھڑا کیا ہے۔ کچھ عرصہ قبل مولانا اعجاز اعظم لطیفی نے آپ کی خدمات پر مقالہ لکھ کر پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کی ہے۔ پیرانہ سالی کے باوجود بھی آپ درجنوں محققین کی رہنمائی کرتے رہے اور کئی اسکالرز نے آپ کی نگرانی میں پی۔ ایچ۔ ڈی مقالہ جات کی تکمیل کی۔

پروفیسر صاحب نرے ماہر تعلیم اور مصنف ہی نہیں بلکہ سلسلہ نقشبندیہ کے پیر طریقت بھی تھے۔ اندرون و بیرون ملک آپ عقیدت مندوں کا وسیع حلقہ رکھتے تھے۔ کچھ عرصہ قبل آپ کے بعض ارادت مندوں نے عقیدت و احترام میں "غلو" کرتے ہوئے آپ کو "منصب مجدد" پر فائز کر دیا۔ آپ کی خدمات بلاشبہ روشن ہیں لیکن ہمیں "دامن اعتدال" کو ہرگز نہیں چھوڑنا چاہیے۔ آپ کا وصال پر ملال 28 اپریل 2008ء کو ہوا اور مزار کراچی میں ہے۔

علامہ فضل حق خیرآبادی ۱۲۱۲ھ/۱۷۹۷ء کو خیرآباد (یوپی۔ انڈیا) میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد ماجد علامہ فضل امام خیرآبادی (م ۱۲۴۴ھ/۱۸۲۸ء) عالم و فاضل اور صاحب تصنیف بزرگ تھے۔ مفتی صدر الدین آزردہ (م ۱۲۸۵ھ/۱۸۶۸ء) آپ ہی کے شاگرد تھے۔ علامہ فضل حق خیرآبادی اپنے والد ماجد علامہ فضل امام خیرآبادی' شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی (م ۱۲۳۹ھ/۱۸۲۳ء) اور شاہ عبدالقادر محدث دہلوی (م ۱۲۳۳ھ/۱۸۲۸ء) وغیرہ سے

۱۸۰۹ء میں ۱۳ سال کی عمر میں درسیات سے فارغ ہوئے اور پھر خود استاد کامل بن گئے۔ آپ کے حلقۂ میں شاہ عبد القادر بدایونی، مولانا خیر الدین دہلوی، مولانا ہدایت اللہ رامپوری، مولانا فیض الحسن سہارنپوری اور مولانا عبد الحق خیرآبادی جیسے فضلاء تھے۔ آپ سلسلۂ چشتیہ میں شاہ عبد العزیز دہلوی سے بیعت ہوئے۔

علامہ فضل حق خیرآبادی علم و فضل میں یگانۂ روزگار تھے۔ علوم عقلیہ کے مسلم الثبوت استاد بلکہ مجتہد و امام تھے۔ علامہ موصوف اپنے مشہور قصیدۂ ہمزیہ میں تجدیث لغت کے طور پر اپنے علم و فضل کا اس انداز سے ذکر کرتے ہیں:

اللہ اقانی علوما بقتنی منہا علوما جمۃ علماء ج

ترجمہ: اللہ تعالیٰ نے مجھے وہ علوم عطا کیے کہ ان میں سے بہت کچھ علماء نے حاصل کیے۔

معقولات و ادبیات کے بیک وقت امام:

علامہ فضل حق خیرآبادی معقولات کے استاد تھے ہی مگر حیرت کی بات یہ ہے کہ وہ عربی کے بے مثال ناظم و ناثر بھی تھے۔ آپ بیک وقت شعر کی نزاکتوں اور فلسفے کی باریکیوں اور گہرائیوں سے آگاہ تھے۔ شاعری میں عربی فارسی اور اردو ادب پر گہری نظر تھی۔ معقولات و ادبیات ایک دوسرے کی ضد ہیں لیکن یہ دونوں علوم حیرت انگیز طور پر علامہ فضل حق خیرآبادی میں جمع ہو گئے تھے۔ ادب میں وہ کمال حاصل تھا جسے آج تک ماہرین فن تسلیم کرتے چلے آئے ہیں۔ عبارت ایسی لکھتے جس کی مثال علمائے ہند میں حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی (م ۱۱۷۶ھ/۱۷۶۲ء) مولانا غلام علی آزاد بلگرامی (م ۱۲۰۰ھ/۱۷۸۶ء) اور امام احمد رضا محدث بریلوی (م ۱۳۴۰ھ/۱۹۲۱ء) کے بعد نظر نہیں آتی۔ اصحاب علم و فضل اور ارباب شعر و ادب دور دور سے اپنی تصنیفات اور منظومات اصلاح کے لیے ان کی خدمت میں ارسال کرتے تھے اور نامور علماء اپنی تصانیف پر تقاریظ لکھواتے تھے۔

علامہ نے فخریہ طور پر اپنی شعری نگارشات کا ذکر ایک جگہ یوں فرمایا ہے: وقد نظمت قصیدتین احداھما ھمزیۃ تحکی ھمزات الشیاطین والاخری دالیۃ دالۃ علی ما یعانی ھذا الحزین الزمین وکنت قد نظمت قبل قصیدۃ فی قوافی النون فریدۃ کالدر المکنون عند ابیاتھا للاحمانۃ او یزید ولم یتیسر لی اتمامھا ج ۳

ترجمہ: "وہ قصیدے لکھے ایک ہمزیہ دوسرا دالیہ۔ ایک اور نون کے قافیے میں لکھا تھا جو دُرِ یتیم کی طرح یگانہ ہے۔ اس کے تین سو سے زیادہ اشعار ہو گئے لیکن تکمیل کی نوبت نہ آئی"۔

علامہ فضل حق خیرآبادی نے ایام اسارت میں یہ قصائد قلم بند کیے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ شعر گوئی ان کی طبیعت

تاب بن گئی تھی۔ ان کی شاعری کا موضوع رسول کریم ﷺ کی مداح سرائی ہے۔ وہ حضرت کعب بن زبیر رضی اللہ عنہ اور حضرت امام بوصیری رحمۃ اللہ علیہ کے قصائد کی پیروی میں اپنے نعتیہ قصائد کا آغاز غزل سے کرتے ہیں۔ انہوں نے اس وقت عربی نعت لکھی جب عربی اور فارسی کی اہمیت گھٹانے کی کوشش کی جارہی تھی اور انگریزوں کے غلبے کی وجہ سے انگریزی زبان وادب کے گن گائے جانے لگے تھے۔

ترجمہ: حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی شان اس طرح بڑھائی جارہی تھی کہ حضور انور ﷺ کی شان معاذ اللہ گھٹتی نظر آئے۔ علامہ فضل حق خیر آبادی اپنے قصیدۂ دالیہ میں ایک جگہ ملکۂ وکٹوریہ کی طرف سے نصرانیت کی تبلیغ کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں:

همت بنصرهم فلاهو شبع　　من مسلمين ومن عبادا بغداد ۳

ترجمہ: "اس (ملکہ) نے پہلے تو مسلمانوں اور بت پرستوں کی جماعتوں کو نصرانی بنانے کا قصد کیا"۔

مولانا رحمٰن علی نے لکھا ہے کہ علامہ فضل حق خیر آبادی کا کلام چار ہزار سے زیادہ اشعار پر مشتمل ہے۔ ۴

علامہ فضل حق خیر آبادی اور مرزا اسد اللہ خاں غالب کے مراسم:

علامہ فضل حق خیر آبادی کے مرزا غالب سے بہت گہرے مراسم تھے۔ علامہ فضل حق خیر آبادی کے ہاں غالب کا بہت آنا جانا تھا اور غالب علامہ کے علم وفضل سے بہت ہی متاثر تھے۔ ایک خط میں انہوں نے علامہ کو "فاضل بے نظیر ویگانہ" کے خطاب سے یاد کیا ہے۔ ۵ پچیس سال کی عمر میں غالب علامہ فضل حق خیر آبادی کے حلقۂ اثر میں تھے اور غالب کی اردو شاعری میں جو پختہ پسندی بھی علامہ ہی کے اثرات کا نتیجہ معلوم ہوتی ہے۔ اس زمانے میں علامہ فضل حق خیر آبادی دہلی سول کورٹ میں ریڈر تھے۔ غالب پر علامہ کا اتنا اثر ہوا کہ علامہ کے تعلقات سے پہلے کہی ہوئی دو سو اڑسٹھ (268) غزلیات جو ایک ہزار چار سو اٹھاسی (1498) اشعار پر مشتمل تھیں قلم زد کردیں۔ ان غزلیات کو بعد میں مفتی انوار الحق نے دریافت کرکے ایڈٹ کیا۔ اس پر ڈاکٹر عبدالرحمان بجنوری نے مقدمہ لکھا۔ ابتدائی زمانے کے اس مجموعے کو نسخۂ حمیدیہ کہا جاتا ہے جو بھوپال کے نواب حمید اللہ خان کے نام پر معنون ہے۔ یہ نسخہ ۱۹۱۹ء میں پہلی بار شائع ہوا۔

مرزا غالب نے ۲۸ جنوری ۱۸۵۷ء کو علامہ کے ایماء پر نواب رامپور کے نام ایک قصیدہ بھی بھیجا تھا جو علامہ نے اپنی سفارش کے ساتھ نواب صاحب کو پیش کیا۔ پھر ۵ فروری ۱۸۵۷ء کو نواب صاحب نے اصلاح کے لیے اپنی

غزلیں غالب کو بھیجیں مگر انقلاب ۱۸۵۷ء کی وجہ سے تعلقات منقطع ہو گئے۔

علامہ فضل حق کا مسلک:

علامہ فضل حق خیرآبادی صحیح العقیدہ سنی حنفی تھے۔ ان کا مسلک مولوی اسماعیل دہلوی (م ۱۲۴۶ھ/۱۸۳۱ء) کے علمی تعاقب سے روز روشن کی طرح عیاں ہو جاتا ہے۔ مولوی اسماعیل دہلوی نے مسئلہ امکان کذب اور امتناع نظیر کی بحث چھیڑی تو علامہ نے تحریر اور تقریر کے ذریعے اس کا پوری زور رد کیا۔ مولوی اسماعیل کی مشہور کتاب تقویۃ الایمان (۱۲۴۰ھ/۱۸۲۵ء) کے جواب میں تحقیق الفتوی فی ابطال الطغوی (۱۲۴۰ھ/۱۸۲۵ء) لکھی اور مسئلہ شفاعت، امکان کذب اور امتناع نظیر پر مدلل بحث فرمائی۔ مقام اول میں شفاعت کا ذکر ہے، مقام ثانی میں تقویۃ الایمان کی گستاخانہ عبارات کا رد ہے، مقام ثالث میں تقویۃ الایمان کی عبارات تنقیص شان رسالت مآب کا رد ہے، مقام رابع میں بتایا ہے کہ نسبت مصطفےٰ ﷺ کے بغیر ایمان مکمل نہیں پھر خلاصہ فتوی ہے۔

علامہ فضل حق خیرآبادی نے تقویۃ الایمان کی بعض گستاخانہ عبارات پر تکفیر فرمائی اور یہ فتوی دیا: "اس بے ہودہ کلام کا قائل از روئے شریعت کافر و بے دین ہے اور شرعاً اس کا حکم قتل اور تکفیر ہے"۔ [۷]

سرسید احمد خاں نے مولوی سید احمد بریلوی، مولوی اسماعیل دہلوی کے لیے لفظ "وہابی" استعمال کیا اور لکھا ہے کہ "سکھوں اور مسلمانوں دونوں نے مل کر ان کو قتل کیا"۔ [۸] اس طرح ۱۸۳۵ء میں علامہ فضل حق خیرآبادی نے جو فتوی دیا تھا ۱۸۳۷ء میں اس پر عمل ہو گیا۔ [۹] علامہ فضل حق خیرآبادی کے مرزا غالب (م ۱۲۸۵ھ/۱۸۶۹ء) سے خصوصی مراسم تھے، علامہ کی فرمائش پر ہی مرزا غالب نے امتناع نظیر خاتم النبیین پر ایک مثنوی لکھی۔ یہ عجیب بات ہے کہ علامہ فضل حق خیرآبادی اور علامہ فضل رسول بدایونی (م ۱۲۸۹ھ/۱۸۷۲ء) مولوی اسماعیل دہلوی کے خلاف تھے لیکن انگریز نہ مولوی اسماعیل کے خلاف تھے اور نہ مولوی اسماعیل انگریزوں کے خلاف تھے۔

گو مشہور یہی کیا گیا کہ مولوی اسماعیل نے انگریزوں کے خلاف جہاد کیا۔ بقول حسین احمد دیوبندی (م ۱۳۷۷ھ/۱۹۵۷ء) "جنگ کی ضرورتوں کو مہیا کرنے میں انگریزوں نے سید صاحب کی مدد کی"۔ [۱۰] اور بقول محمد جعفر تھانیسری "انگریزوں کی دعوت میں مولوی اسماعیل گئے۔ دس ہزار مسلم صاحب اور صاحب لوگ آپ کے وعظ سننے کو جمع ہوئے۔" [۱۱] مولوی اسماعیل کے انگریزوں کے تعلق کی توثیق تقویۃ الایمان کے اس مطبوعہ انگریزی ترجمے سے ہوتی ہے جو مولوی اسماعیل کی ایماء سے شائع ہوا اور ۱۸۵۷ء سے پہلے رائل ایشیاٹک سوسائٹی نے شائع کیا۔ [۱۲]

جنگ آزادی سے قبل طرز زندگی:

جنگ آزادی میں حصہ لینے کے جرم کی پاداش میں سزا سے قبل علامہ فضل حق خیرآبادی کی زندگی خوشحال اور دیندار گھرانوں کی طرح گزری لباس بھی امیرانہ اور انداز بھی امیرانہ تھا۔ ضرورتاً دوستوں کے دست اور مددگار۔ اس زمانے کے رواج کے مطابق وہ حقہ [۱۳] بھی نوش فرماتے تھے اور تفریح طبع کے لیے شطرنج [۱۴] بھی کھیلتے تھے۔ [۱۵]

۱۲۶۳ھ/۱۸۴۷ء میں دیکھا گیا کہ علامہ ان مشاغل کے باوجود "الاتق الاتقین" کا درس دے رہے تھے۔ چونکہ علامہ کو شعر و سخن سے خاص لگاؤ تھا اس لیے حکیم مومن خاں مومنؔ، مرزا اسد غالبؔ، مصطفےٰ خاں شیفتہؔ، صدر الدین آزردہؔ جیسے باکمال شعراء کے ساتھ شعر و سخن کی محفلیں بھی رہتی تھیں۔

مختلف سرکاری عہدوں پر تقرر:

برصغیر میں ایسٹ انڈیا کمپنی کا تسلط قائم ہو چکا تھا اور علماء اعلیٰ عہدوں پر فائز ہوتے۔ علامہ فضل حق خیرآبادی بھی سررشتہ دار ہوئے اور بعد میں اعلیٰ قابلیت کی وجہ سے رجز ٹینٹ بنے۔ شاہ ولی اکبر شاہ ثانی آپ کا خاص خیال رکھتے تھے۔ الہ آباد میں سرکاری وکیل بھی ہوئے۔ نواب فیض محمد خاں رئیس جھجر نے اپنے پاس بلا لیا مگر مہاراجہ الور کے پاس چلے گئے اس کے بعد سہارنپور اور آخر میں لکھنؤ میں صدر الصدور کے عہدے پر فائز ہوئے۔ لکھنؤ سے نواب امیر نواب یوسف علی خان کی اتالیق مقرر ہوئے۔

نصاریٰ کی ملازمت وقت کی ایک ضرورت تھی۔ یہ ملازمت انگریزوں سے کسی خیر خواہی کی وجہ سے نہ تھی۔ علامہ فضل حق خیرآبادی کی تصانیف میں کسی جملے یا شعر سے انگریزوں کی خیر خواہی نہیں جھلکتی بلکہ ان کے عربی قصائد میں تو دشمنی اور نفرت صاف جھلک رہی ہے ملازمت چھوڑنے اور لوہارو کے ریاست دار بننے کا باعث بھی یہی نفرت اور دشمنی تھی۔ اس کے باوجود بعض مؤرخین یہ کوشش کرتے ہیں کہ آپ کو انگریزوں کا خیر خواہ ثابت کیا جائے یہ بات نہ علمی حیثیت سے صحیح نہیں اگر خیر خواہ ہوتے تو انگریز آپ کو کیوں سزا دیتا؟ اس نازک دور میں اس کو خیر خواہوں کی بڑی ضرورت تھی۔ لیکن المیہ یہ ہے کہ علامہ فضل حق خیرآبادی نے حضور پرنور ﷺ کی شان میں گستاخانہ تحریر کی بنا پر مولوی اسماعیل دہلوی کی تکفیر کی جس کی بیشتر مؤرخین کو خبر ہے اسی لیے وہ علامہ کے ساتھ انصاف نہ کر سکے۔ جس طرح ابن عبدالوہاب نجدی نے انگریزوں کی ایماء پر کتاب التوحید لکھ کر ایک طوفان کھڑا کیا اسی طرح مولوی اسماعیل نے بھی انگریزوں کی ایماء پر تقویۃ الایمان لکھ کر ایک طوفان کھڑا کر دیا۔ اس کے انگریزی ترجمے سے اس قیاس کی تائید ہوتی ہے۔

1857ء کی بغاوت کے اسباب علامہ کا فتویٰ جہاد:

انگریزوں کا عمل دخل تو پورے برصغیر میں ہو چکا تھا لیکن اُن کے خلاف ۱۸۵۷ء کی بغاوت کا سبب یہ بتایا جاتا ہے کہ انگریزوں نے بندوقوں کے کارتوسوں پر گائے اور سور کی چربی لگائی۔ ہندو مسلمانوں کے ہاں اور گائے ہندوؤں کے ہاں حرام ہے۔ یہ کارتوس منہ لگائے بغیر بندوقوں سے نہیں چلائے جا سکتے تھے اس لیے اس افواہ نے ہندو اور مسلمان فوجیوں کو چراغ پا کر دیا اور اچانک بغاوت بھڑک اٹھی۔ اس بغاوت کا مرکز دہلی بنا کیونکہ یہ بادشاہ کا پایۂ تخت تھا۔ عوام الناس انگریزوں کی عمل داری سے پہلے ہی تنگ آ چکے تھے لہٰذا وہ بھی فوجیوں کے ساتھ شریک ہو گئے۔ اس ہنگامی دور میں علامہ فضل حق خیرآبادی نے بہادر شاہ ظفر اور مجاہدین کو انگریزوں کے خلاف بھرپور جنگ کے لیے ابھارا۔ علماء نے جہاد کا فتویٰ جاری کیا اور اس فتوے سے ایک شورش برپا ہو گئی۔ فتویٰ جہاد ۲۶ جولائی ۱۸۵۷ء کو صادق الاخبار دہلی میں چھپا اور اس سے پہلے اخبار الظفر دہلی میں شائع ہو چکا تھا۔[۲۶]

اس فتویٰ میں راقم کے جد امجد کے ماموں علامہ محمد مصطفیٰ خاں ابن سید رشاد خاں عظیم آبادی کے دستخط بھی ہیں۔

جہادِ آزادی میں علامہ کا کردار:

اظہار سوستان کے جہادِ آزادی میں علامہ خیرآبادی نے بھرپور کردار ادا کیا جبکہ علامہ کے مخالفین اس حقیقت کے انکار پر مصر ہیں۔ بہادر شاہ ظفر کے دربار میں موجود غیر فرانسیسی مؤرخ گارساں دتاسی نے اپنی اطلاع دیا کرتے تھے۔ ایسے ہی ایک مخبر ذاب علی نے بتاریخ ۲۸ اگست ۱۸۵۷ء انگریزوں کو مطلع کرتے ہوئے لکھا: "مولوی فضل حق جب سے دہلی آیا ہے شوریوں اور فوج کو انگریزوں کے خلاف اکسانے میں مصروف ہے" وہ کہتا ہے کہ اس نے آگرہ گزٹ میں برطانوی پارلیمنٹ کا ایک اعلان پڑھا ہے جس میں انگریزی فوج کو دہلی کے تمام باشندوں کو قتل کر دینے اور پورے شہر کو مسمار کر دینے کے لیے کہا گیا ہے۔ آگے مالی تعاون کو ویہ بتانے کے لیے لکھتا ہے کہ یہاں دہلی کا شہر آباد تھا اور شاہی مسجد کا صرف ایک چبوترا باقی چھوڑا جائے گا"۔ [۲۷]

علامہ کے خلاف انگریزی کورٹ کا فیصلہ:

جہادِ آزادی میں علامہ خیرآبادی کی شرکت کے اور بھی کئی ٹھوس ثبوت موجود ہیں اور سب سے بڑا ثبوت انگریزی کورٹ کا وہ فیصلہ ہے جو ابھی تک حکومت ہند کی تحویل میں ہے اور قومی دفتر خانہ ہند نئی دہلی میں فارن پولیٹیکل نمبر ۱۸۶۰ء نمبر ۵۵۸ کے تحت محفوظ ہے۔ اس ریکارڈ تک عام لوگوں کی رسائی نہیں لیکن مالک رام جو ہندوستان کی

وزارت خارجہ میں اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے انہوں نے مذکورہ ریکارڈ ملاحظہ کیا اور مقدمے کی کارروائی کا انگریزی سے اردو میں ترجمہ کر کے ماہنامہ تحریک دہلی جون ۱۹۵۸ء میں شائع کیا۔ اس مضمون میں علامہ فضل حق خیرآبادی پر قائم ہونے والے مقدمے کی تفصیل دی گئی ہے اور آخر میں علامہ پر عائد ہونے والا الزام بھی ذکر کیا گیا ہے۔ آیئے اس حقیقت افروز اقتباس کے مطالعے سے اس سچائی تک پہنچنے کی کوشش کریں جسے چھپانے کے لیے طرح طرح کی جتن کیے گئے حتیٰ کہ خود مالک رام نے بھی مقدمے کی کارروائی پیش کرنے کے لیے نقل کی تھی کہ "پورے حالات کا بہ نظر غائر مطالعہ کرنے سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ مولانا فضل حق مرحوم نے ۱۸۵۷ء کی تحریک میں واقعی کوئی حصہ نہیں لیا انہوں نے اس سے پہلے لوگوں کو جو بھی تلقین کی ہو لیکن جب یہ ہنگامہ شروع ہوا تو وہ عملاً اس سے الگ تھلگ رہے نہ علمی پہلو سے اس میں شریک ہوئے نہ عملی لحاظ سے"۔

ادھر مالک رام کا یہ موقف ہے جبکہ دوسری طرف اودھ کے جوڈیشل کمشنر مسٹر جارج کیمبل اور خیرآباد ڈویژن کے قائم مقام کمشنر میجر بارو کی مشترکہ کچہری نے ۳ مارچ ۱۸۵۹ء کو علامہ فضل حق خیرآبادی کے خلاف درج ذیل فیصلہ صادر کیا۔

الزام: بغاوت اور قتل پر اکسانا۔

تشریح ❶: ۱۸۵۷ء اور ۱۸۵۸ء کے دوران بغاوت کا سرغنہ بنا اور دہلی، اودھ اور دوسرے مقامات پر اس نے لوگوں کو بغاوت اور قتل کی ترغیب دی۔

تشریح ❷: اس نے بوڑی کے مقام پر مئی ۱۸۵۸ء میں باغی سرغنے خونخوار کی مجلس مشاورت میں نمایاں حصہ لیا۔

تشریح ❸: اس نے بوڑی کے مقام پر مئی ۱۸۵۸ء میں ایک سرکاری ملازم عبدالحکیم کو قتل کرنے کی ترغیب دی' ملزم نے جرم سے انکار کیا اور سماعت شروع ہوئی۔ عدالت کے سامنے ملزم مستغیث اول اور دیگر اہل کار ثابت ہوا۔

● ۱۸۵۷ء اور ۱۸۵۸ء میں اس نے لوگوں کو بغاوت پر اکسایا۔

● ۱۸۵۸ء میں بوڑی کے مقام پر اس نے باغیوں کے جو وہاں پر اکٹھے ہوئے تھے اور بالخصوص باغی سرغنے محمد خان کے مشوروں میں خاص خاص سرگرمی دکھائی' ان ہی ایام میں اس نے ایسے فتوے دیے جن کا مقصد قتل کی ترغیب دینا تھا۔

۳ مارچ ۱۸۵۹ء کو اسے بطور شاہی قیدی تین حیات قید بعبور دریائے شور اور اس کی تمام جائیداد کی ضبطی کی سزا دی گئی۔

علامہ فضل حق زبان وقلم کی تلوار کے غازی:

علامہ فضل حق خیرآبادی کے عربی قصیدے سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ جنگ کے دوران (جو چار ماہ چلتی رہی) مجاہدین کو جہاد کی ترغیب دیتے رہے، مگر جہاد میں انگریز دشمنی کے باوجود ذاتی ہتھیار اٹھا کر حصہ نہیں لیا اور وہ اس میں کیسے حصہ لے سکتے تھے؟ جنگ تو ایک فن ہے اور علامہ شمشیر وسناں کے ماہر نہیں تھے بلکہ زبان وقلم کی تلوار کے غازی تھے۔ وہ اپنے قصیدۂ عزیہ میں خود فرماتے ہیں:

فقمت ازجی القاعدین الی الوغی وقعدت لما قامت الهيجاء ؕ

ترجمہ: "میں پیچھے والوں کو لڑائی میں لے کر آگے بڑھا تا رہا اور لڑائی شروع ہو جانے پر خود پیچھا رہا"۔

علامہ فضل حق خیرآبادی کو اپنے اس پیچھے رہنے پر قلق وافسوس رہا، کہتا ہے کہ علامہ کی خواہش تھی کہ وہ ہتھیار چلانے کے فن سے آگاہ ہوتے تو اسلام اور مسلمانوں کے دشمن انگریزوں کے خلاف جہاد میں دادِ شجاعت دیتے۔ یہی ایمانی غیرت کا تقاضا ہے اور اسی جذبے کے تحت علامہ اپنے آپ کو پیچھے رہنے والوں میں شمار کر رہے ہیں۔ علامہ نے بہادر شاہ ظفر اور مجاہدین کے حوصلے بڑھانے میں اہم کردار ادا کیا لیکن اس کے باوجود علامہ اپنے رب کی بارگاہ میں عرض کرتے ہیں:

رب اعف عنی ما اقترفت واغفر فرجائی صنک العفو والاعطاء ؕ

ترجمہ: "اے میرے مولا میرے قصور کو معاف کر اور جو کچھ خطا مجھ سے زد ہوئی اس سے درگزر کر"۔

علامہ کی دہلی سے روانگی:

علامہ فضل حق خیرآبادی کے تعاقب میں دشمن تھے، اس لیے اس دارو گیر کے زمانے میں وہ دہلی سے روانہ ہوئے۔ دہلی سے روانگی کا ذکر علامہ خود اس طرح کرتے ہیں: "وبعد ترک مالی فی الکتبی وانشی ومالی ما یکفی لنقل احمالی واحداث للسفر سبلا سهلا توکلا علی اللہ وکفی باللہ وکیلا" ؕ

ترجمہ: "مال واسباب چھوڑ کر بار برداری کا انتظام نہ ہو سکنے کی وجہ سے خدا پر بھروسہ کر کے اہل وعیال کو ساتھ لے کر نکل کھڑا ہوا"۔

علامہ فضل حق خیرآبادی کے عربی قصیدے کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ آزادی کی اس جنگ میں جس کو "بغاوت" کہا جاتا ہے بدانتظامی اور بعض اپنوں کی بے وفائیوں اور جھاڑیوں کی وجہ سے ناکامی ہوئی پھر انگریز دہلی میں ۱۴ ستمبر ۱۸۵۷ء کو داخل ہو گئے اور ظلم وستم کا وہ بازار گرم ہوا کہ الامان الحفیظ۔ علامہ اپنے قصیدۂ عزیہ میں

ایک جگہ لکھتے ہیں:

قد سلط الانصار فی امصارنا ان صار النصارا لهم سفهاء[21]

ترجمہ: ''نصاریٰ ہمارے شہروں پر مسلط کر دیے گئے' کیونکہ بےوقوف ہندوستانی ان کے مددگار بن گئے تھے''۔

انگریز کے مظالم:

بادشاہ کو تنگ و تاریک کوٹھڑی میں بند کر دیا گیا۔ شہزادہ مرزا مغل کو گولی کا نشانہ بنا کر سرکاٹ کر بادشاہ کے سامنے رکھا گیا پھر بگل کر پھینک دیا گیا۔ جب بادشاہ پر یہ آفت آئی تو علامہ پر کیا کچھ مصیبت نہ آئی ہوگی؟ وہ کہہ تاتے ہیں: ﴿ فان اعدائی یجدون فی ایذائی ویعون ایذائی واوذائی لا یستطیعون مدار ذدائی ولقد سخت فی قلوب العدی ضی احقاد حقائد کما توسع فی القلوب من الاحیان عقائد وقد شحت صدورهم الوغیمة بالشحناء والسغیمة لکنی ارجو رحمة ربی العزیز الرحیم ﴾[22]

ترجمہ: میرے دشمن میری ایذا رسانی میں اور کوشاں اور میری ہلاکت کے درپے رہتے ہیں۔ میرے دوست میرے عرض کے مداوے سے لاچار ہیں۔ دشمنوں کے دل میں میری طرف سے بغض و کینہ ذہبی عقائد کی طرح راسخ ہو گیا ہے۔ ان کے بلید سینے کینہ اور عداوت کے دفینے بن گئے ہیں۔

ملکہ وکٹوریہ کا عام معافی کا اعلان اور بدعہدی:

۱۲۷۵ھ/۱۸۵۸ء میں ملکہ وکٹوریہ نے عام معافی کا اعلان کیا۔ اس نے دھوکہ کھا کر علامہ دہلی سے اپنے گھر کے لیے روانہ ہوئے۔ وہ خود فرماتے ہیں: ''جنگ آزادی کے دوران میرے اکثر اہل وعیال دہلی میں تھے پھر جب نصاریٰ شہر پر قابض ہو گئے انگریزی دشمنی پائی۔ بیٹے پانچ تھے۔ دو بھوپال دو بیاس میں گزر کر گئے میں پھوڑ کر اہل وعیال کے ساتھ دہلی سے نکل گیا''۔

علامہ نے اپنے عربی قصیدے عمریہ میں ملکہ وکٹوریہ کی بدعہدی کا یوں ذکر کیا:

الی بلاتی خدعة امرؤ بلیٰ کید عظیم ما تید نساء

فدعت بان قد قهرت ان آمنت قومانست بهم الدیار و ناءوا

ترجمہ: مجھے ایک عورت کے مکر نے بلائے مصیبت کر دیا' عورتوں کا مکر بڑا زبردست مکر ہے اس نے یہ کہہ کر

شہرت دی جو لوگ گھروں سے دور پڑے ہیں انہیں امن دے دیا گیا۔

جرم بغاوت میں علامہ کو سزائیں:

بہر حال ۱۲۷۵ھ/۱۸۵۹ء میں علامہ پر لکھنؤ میں بغاوت کا مقدمہ چلا اور ۳ مارچ ۱۸۵۹ء کو فیصلہ میں حیات عیس دریائے شور اور تمام جائیداد کی ضبطی علامہ اس کا ذکر یوں کرتے ہیں: ﴿وقضی علی بتحلید حبسی وتعذیبی وجلاتی وتغریبی وغصب کل مالی من کسبی ونشبی ومالی وغصب دار اکانت لاهلی وعیالی﴾ [۳]

ترجمہ: اس ظالم حکمران نے میری جلاوطنی اور عمر قید کا فیصلہ صادر کر دیا اور میری کمائیں جائیداد، مال و متاع اور اہل و عیال کے رہنے کا مکان غرض ہر چیز پر غاصبانہ قبضہ کر لیا۔

بقول بعض لوگوں کے علامہ نے نواب رامپور کے نام فارسی خط [۴] میں جرم بغاوت سے اپنی برأت کا اظہار کیا ہے لیکن اس بے لکھ اس کتوب کا صرف متن ہی میسر آ سکا اصل مکتوب کا عکس نہیں مل سکا اس لیے اس کی تصدیق یا تردید نہیں کی جا سکتی۔ بہر حال علامہ کو جرم بغاوت کے الزام میں جزیرہ انڈمان بھیج دیا گیا جس کا ذکر علامہ نے اس طرح کیا:

والرسلونی مع الاسری علی جمل فاصل تسی دونه نوحا وقصاد [۵]

ترجمہ: اور مجھے ان قیدیوں کے ساتھ ایک دور دراز جزیرہ کی طرف روانہ کیا جہاں قصد کرنے والوں کا وہم و گمان بھی نہ پہنچتا تھا۔

علم کے تبادلہ کا وصال:

اسی جزیرے میں علامہ نے ۱۲ صفر المظفر ۱۲۷۸ھ/۱۹ اگست ۱۸۶۱ء کو داعی اجل کو لبیک کہا۔ علامہ نے انقلاب ۱۸۵۷ء کے واقعات قید و بند کے زمانے میں عربی نثر میں لکھے ہیں۔ جس میں سنہ ۱۸۵۷ء سے شروع ۱۸۵۸ء کے درمیان تقریروں اور مسلمانوں میں ہونے والی جنگ اور ہر گیر تباہی و بربادی کا ذکر کیا ہے۔ دلی سے ڈھیر مرزا کی اور وہاں پہنچنے کے بعد کرنل پیر مقدمہ اور فیصلے کا ذکر کیا ہے اور ظلم و ستم کی داستان سنائی ہے۔ اس طرح اپنے عربی قصیدہ دالیہ میں اپنے اسر اض و مصائب "جہاز اسباب، جلا وطنی، نصاریٰ کی عداوت، مدعیان اسلام کی طرف سے ان کی امداد، ساتھیوں پر حملے اور ظلم، جہاز میں سواری، جزیرے میں اترنے اور نصاریٰ کا اپنے ارسانی کے لیے اپنے دم ساز دغابازوں کو آمادہ کرنے کا ذکر کیا ہے۔ [۶]

امام المناظرہ کی گرفتاری کی وجوہات:

● ہمارے خیال میں علامہ کی گرفتاری کی ایک وجہ بعض نام نہاد مسلمانوں کی جاسوسیاں اور ریشہ دوانیاں بھی تھیں جس کا علامہ نے اس طرح ذکر فرمایا ہے: ﴿و المسلمین الذین ارتدوا بولاء النصاری بعد الایمان وباعوادینهم بابخس من الاثمان﴾ [۲۸]

ترجمہ: اور وہ مسلمان بھی جو ایمان کے بعد نصاریٰ کی محبت میں مرتد ہو کر اپنے دین کو چند ٹکوں کو عوض بیچ چکے تھے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے یہ لوگ علامہ کے تبحر علمی اور ایمان بچانے کے بعد بھی ایذا رسانی کی کوشش کرتے رہے جس کا ذکر علامہ نے یوں کیا ہے:

اغری النصاریٰ بتعذیبی زنادقة بطونهم وظهورهم لالحاد

غاظوا وجدوا لولوجوا فی معالیی عادوا وبادوا باطفان واحقاد

ترجمہ: مجھے تکلیف پہنچانے کے لیے ایسے زندیقوں کو آمادہ کیا جو ان کے مقرب ہیں اور وہ بھی جن سے ان کے الحاد کی وجہ سے محبت کرتے ہیں۔ وہ غصے میں آپے سے باہر ہو گئے اور میری اذیت رسانی میں ہر ممکن جدوجہد سے کام لیا مجھ پوری دشمنی برتی اور بغض و کینے کا کھلا مظاہرہ کیا۔

● علامہ کی گرفتاری کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ مئی ۱۸۵۸ء میں عبدالحکیم کو جو انگریزوں کی طرف سے دریا آباد (یوپی۔ بھارت) میں متعین تھا گرفتار کر کے مجسٹریٹ حسین نے بیگم حضرت محل کے پاس بھیج دیا۔ وہاں اس کو ممولخان اور علامہ فضل حق کے سامنے پیش کیا گیا۔ علامہ فضل حق نے اس کو سزائے موت کا مستحق قرار دیا اور منصور دیا کر فوراً موت کے گھاٹ اتار دیا جائے۔ [۲۹]

اس کی کچھ تصدیق علامہ کے اس بیان سے بھی ہوتی ہے ﴿و وشی علی عنده مرتدان اشدان الذان جاد لانی فی ایة من ای القرآن محکمة حکمت بان من یتولی النصاری نصران وهما علی تولیهم یصران فارتدا واستبدلا الکفر بالایمان﴾ [۳۰]

ترجمہ: اور میری چغلی ایسے دو مرتد جنگجو افتخار خواہ لوگوں نے کھائی جو مجھ سے قرآن کی محکم آیات میں مجادلہ کرتے تھے جس کا حکم یہ تھا کہ نصاریٰ کا دوست بھی نصرانی ہے وہ دونوں نصاریٰ کی مودت و محبت پر مُصر تھے۔ انہوں نے مرتد ہو کر کفر کو ایمان سے بدل لیا تھا۔

علامہ کی علمی یادگار "الثورۃ الہندیہ":

بہر حال علامہ کلکتہ سے بحری جہاز میں سوار ہو کر ۱۱۸ اکتوبر ۱۸۵۹ء کو پورٹ بلیئر پہنچے جہاں قیدیوں میں ان کا دفتری نمبر ۳۶۸۷ تھا۔ جزیرۂ انڈیمان میں علامہ نے عربی نظم و نثر میں جو کچھ قلم بند کیا وہ کسی نہ کسی طرح ہندوستان پہنچا' بعد میں اس مجموعہ کا نام "الثورۃ الہندیہ" رکھا گیا۔ اس میں قصیدہ خمریہ بھی ہے اور قصیدۂ دالیہ بھی۔ اس مجموعے کی نقل (بقول ابوالکلام آزاد) علامہ کے صاحبزادے علامہ عبدالحق علیہ الرحمہ ۳۳ (۱۳۱۲ھ/۱۸۹۹ء) نے آزاد کے والد علامہ خیرالدین کو کہ مطبع بھی تھی جو ان کے کتب خانہ میں محفوظ ہے۔ اس کی نقل عبدالشاہد شروانی (لائبریرین اورینٹل سیکشن انڈیا لائبریری) علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے تصحیح کے بعد اصل مجموعہ اور اس کا اردو ترجمہ پہلی بار ۱۹۴۷ء میں بکھور سے شائع کر لیا۔ پھر دوسری بار علامہ محمد عبدالحکیم شرف قادری کے فاضلانہ اور محققانہ مقدمے اور مفید اضافوں کے ساتھ ۱۳۷۳ھ/۱۹۹۴ء میں لاہور سے شائع ہوا۔

علامہ فضل حق اور جام شہادت:

علامہ فضل حق خیرآبادی نے ایک سال' نو ماہ' انیس دن جزیرہ انڈمان میں سیاسی قیدی رہ کر ۱۲ صفر المظفر ۱۲۷۸ھ/ ۲۰ اگست ۱۸۶۱ء کو وصال فرمایا یعنی جام شہادت نوش فرمایا۔

تحریک آزادی کے عظیم مجاہد پر بہتان:

المیوں سا المیہ تو یہ ہے کہ اس پر صرف کیا جاتا ہے کہ علامہ فضل حق جہاد آزادی میں شریک نہ تھے اور محض علما تھی کی علاوہ ان کو عرقہ ستانی کی ۳۳ جو محض پورے ملک میں جانا پہچانا ہو اور جس کو عام بھی اچھی طرح جانتا ہو اس کے متعلق علما تھی بعید از قیاس ہے۔ واقعات یہ ثابت کرتے ہیں کہ علامہ دل سے انگریزوں کے مخالف تھے۔ وہ جنگ آزادی کے زمانے میں انگریز کے دوست کو واجب القتل سمجھتے تھے۔ (جیسا کہ پچھلے حوالہ میں پیش کیا گیا) کیونکہ جو انگریز کا دوست ہوگا وہ یقیناً مجاہدین کا دشمن ہوگا۔ اصل بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ علامہ فضل حق خیرآبادی کو سنی حنفی سلفی ہونے کی وجہ سے ہدف بنایا گیا۔ یہ عجیب بات ہے کہ مورخین نے جہاد آزادی کے زمانے میں جس کے بارے میں انگریز دوستی کی ایک بھی شہادت نہیں اس کو انگریز دوست ثابت کیا اور جن کے بارے میں انگریز دوستی کی کئی شہادتیں موجود ہیں یعنی سید احمد بریلوی اور اسماعیل دہلوی وغیرہ ان کو جہاد آزادی کا قائد اور سلطنت اسلامیہ کا بیرو ثابت کیا اور مستقل ثابت کیا جا رہا ہے۔

انگریز دوست کون؟

انگریز دوستی کا جو الزام علامہ فضل حق خیرآبادی اور امام احمد رضا محدث بریلوی پر لگایا جاتا ہے وہ تاریخی طور پر ان دونوں کے مخالفین پر عائد ہوتا ہے مثلاً مولوی اسماعیل دہلوی سمیت ان کے ان سب مؤیدین پر یہ الزام عائد ہوتا ہے۔ سرسید احمد خاں (م۔۱۳۱۵ھ/۱۸۹۸ء)، رشید احمد گنگوہی (م۔۱۳۲۳ھ/۱۹۰۵ء)، نواب صدیق حسن خان (م۔۱۳۰۷ھ/۱۸۹۰ء)، نذیر حسین دہلوی (م۔۱۳۲۰ھ/۱۹۰۲ء)، اشرف علی تھانوی (م۔۱۳۶۲ھ/۱۹۴۳ء) اور شبلی نعمانی (م۔۱۳۳۲ھ/۱۹۱۴ء) وغیرہ۔

یہی نہیں یہ لوگ انگریزوں کے حامی و مددگار تھے مکہ بھی کسی کی بھی پذیرائی کرتے ہیں اس کا سلسلہ اگر اسماعیل دہلوی سے ملتا ہے جو ان عبدالوہاب نجدی (م۔۱۲۰۶ھ/۱۷۹۱ء) اور ابن تیمیہ (م۔۷۲۸ھ/۱۳۲۸ء) وغیرہ سے فیضیاب ہے۔ آل سعود کے یہ سب حامی و مددگار ہیں اور ایک جنرلی حقیقت ہے کہ عبدالعزیز بن عبدالرحمان بن فیصل السعود کے برطانیہ سے مراسم تھے۔ چنانچہ ۱۸ صفر المظفر ۱۳۳۳ھ/۲۶ نومبر ۱۹۱۵ء کو انگریزوں کی بالادستی کا معاہدہ ہوا۔ ابن سعود کو حکومت برطانیہ کی طرف سے ستارۂ ہند کا خطاب دیا گیا اور تمغہ لگایا گیا۔

الغرض تاریخی حیثیت سے یہ حقیقت روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ علامہ فضل حق خیرآبادی انگریزوں کے حامی و مددگار نہ تھے بلکہ ان کے حامیوں اور مددگاروں کو مرتد سمجھتے تھے۔ وہ علم و فضل کے پیکر بے مثال تھے۔ جہاد آزادی میں بحیثیت ایک متبحر عالم جو کر سکتے تھے انہوں نے کیا جبکہ ان کے مخالف علماء نے انگریزوں کا پورا پورا ساتھ دیا اور ہندوستان میں اس کے اقتدار کی راہ ہموار کی۔

معاصر اہل علم کے تاثرات:

علامہ فضل حق خیرآبادی کی علمی عظمت، جلالت علمی اور ان کے معاصرین اور قریب العہد علماء و فضلاء کے تاثرات سے بھی ہوتا ہے۔ ہم یہاں چند شخصیات کے تاثرات پیش کرتے ہیں۔

❶ مولوی عبدالقادر صدر الصدور: (م۔۱۲۳۳ھ/۱۸۱۹ء)

"(مولانا فضل حق) عربی ادب میں ابوالحسن اخفش جیسے ہیں ان کی نثر مقامات حریری سے اور نظم دیوان متنبی سے ممتاز ہے"۔

❷ مولوی کریم الدین پانی پتی: (م۔۱۲۸۶ھ/۱۸۶۹ء)

"واضح ہو کہ یہ فاضل اجل بڑا عالم ہندوستان میں ہے۔ اس سے صدہا لوگوں کو فیض ہوا ہے اور صدہا فاضل اس

کے شاگردوں میں ہیں۔ علوم عربیہ میں اس شخص کو بڑا رتبہ حاصل ہے"۔ [۵]

④ محمد حسین شاہجہاں پوری: (م۔ ۱۲۷۶ھ/۱۸۵۹ء)

"مولانا فضل حق بن فضل امام خیرآبادی بڑے عالموں میں سے تھے۔ اعلیٰ علوم ادب اور لغت میں بلاشبہ شیخ ارکیس (یعنی سینا) کی مثل تھے"۔ [۶]

⑤ محمد محسن بن یحییٰ ترہتی تلمیذ علامہ فضل حق خیرآبادی:

"علامہ فضل حق خیرآبادی عاقل زمن مناظر اور اپنے زمانے کے بڑے اصولی تھے۔ وہ اپنے دور کے اچھے شاعر اور عربی کے بڑے ادیب تھے"۔ [۷]

⑥ نواب صدیق حسن خاں: (م۔ ۱۳۰۷ھ/۱۸۸۹ء)

"ان کی نظم میں چار ہزار سے زیادہ اشعار ہیں بیشتر قصائد مدح رسول ﷺ میں اور بعض کفار و فجار کی ہجو میں۔ ان کی غزلیات تقاریظ اور ابیات کو شیخ الادب جمیل احمد نقاوی مرحوم نے ایک جگہ جمع کر دیا ہے اور ان کی شرح بھی کر دی ہے"۔ [۸]

⑦ سرسید احمد خان: (م۔ ۱۳۱۶ھ/۱۸۹۸ء)

"کمالات علم و ادب میں ایسا علم سرفرازی بلند کیا کہ فصاحت کے واسطے ان کی عبارت شستہ محضر عروج معارج ہے اور بلاغت کے واسطے ان کی طبع رسا دست آویز بلندی معارج ہے۔ سحبان کو ان کی فصاحت سے سرمایہ خوش چانی اور امرء القیس کو ان کے افکار بلند سے دست گاہ عروج سوانی"۔ [۹]

⑧ اسیر احمد بدایونی: (م۔ ۱۳۱۹ھ/۱۹۰۱ء)

"فن حکمیہ میں مرجع اجتہاد بڑے ادیب بڑے منطقی نہایت ذہین نہایت ذکی عقیق ۵۰ وذقیق انجائی صاحب تدقیق و تحقیق"۔ [۱۰]

⑨ فقیر محمد جہلمی: (م۔ ۱۳۴۳ھ/۱۹۱۶ء)

"عربی و فارسی میں نظم لائق نثر فائق کہتے تھے۔ چار ہزار اشعار آپ کے شمار کیے گئے ہیں اور اکثر قصائد آپ کے مدح آنحضرت ﷺ اور ہجو کفار میں ہیں۔ آپ کے اور استاذی مفتی صدر الدین خان الصدور دہلوی کے درمیان بڑی دوستی تھی"۔ [۱۱]

علامہ کی خدمات پر تحقیق کی نئی جہات:

علامہ فضل حق خیرآبادی پر بہت کچھ لکھا گیا جس سے اس مقالے میں استفادہ کیا گیا ہے مگر ابھی بہت کچھ لکھنا

باقی ہے۔ ۱۸۵۷ء کے بعد جدید علمی دنیا انگریزوں کے خیر خواہوں کے زیر اثر رہی اس لیے ان علماء و فضلاء پر کام نہ ہو سکا جو انگریزوں کے خیر خواہ نہ تھے اور ان کے حق میں حالات بھی سازگار نہ تھے۔ ان علماء میں خاص طور پر دو شخصیات قابل ذکر ہیں علامہ فضل حق خیر آبادی اور امام احمد رضا خاں محدث بریلوی۔ ۵۳

پروفیسر ڈاکٹر محمد عبدالستار خاں (صدر شعبہ عربی عثمانیہ یونیورسٹی حیدر آباد دکن) کی نگرانی میں ایک فاضلہ ڈاکٹر قمر النساء نے عربی زبان میں بعنوان "العلامہ فضل حق الخیر آبادی" (مطبوعہ: لاہور ۱۹۸۶ء) ڈاکٹریٹ کیا ہے اس مقالے میں فاضلہ موصوفہ نے علامہ فضل حق خیر آبادی کے عربی زبان میں مہارت بلکہ عربی فارسی اردو تینوں زبانوں میں یکساں مہارت کا ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ علامہ فضل حق خیر آبادی فرقی اور آزر تخلص فرماتے تھے۔ آپ نے مختلف اصناف سخن میں طبع آزمائی کی ہے مثلاً حمد، نعت، منقبت، قصیدہ، غزل، مثنویات وغیرہ۔ ان کا کلام صنائع و بدائع، لفظی و معنوی سے مالا مال ہے۔ فاضلہ موصوفہ نے علامہ فضل حق خیر آبادی کے قصائد میں رائیہ، عائیہ، دالیہ، سینیہ وغیرہ قصائد کا ذکر کیا ہے اور ساتھ ہی ادب و شاعری کے حوالے سے لکھے کی ضروریات پر زور دیا ہے۔

ضرورت تھی کہ عرب دنیا میں کوئی فاضل اس موضوع پر قلم اٹھاتا۔ فاضل محقق مولانا ممتاز احمد سدیدی قابل مبارکباد ہیں کہ انھوں نے علامہ فضل حق خیر آبادی پر ادب و شاعری کے حوالے سے مقالہ لکھنے کی ضرورت کو محسوس کیا اور الازہر یونیورسٹی قاہرہ مصر میں "العلامہ محمد فضل الحق الخیر آبادی حیاتہ و شعرہ العربی" کے عنوان سے ڈاکٹریٹ کیا۔ مولانا سدیدی کی عالمانہ فاضلانہ اور معتدل و متوازن شخصیت کا ہر کوئی معترف ہے۔ ان کی متعدد نگارشات شائع ہو چکی ہیں۔ مستقبل میں ان سے بڑی توقعات وابستہ ہیں۔ یہ مقالہ برصغیر میں عربی ادب کے حوالے سے ایک اہم مقالہ ہے۔ یقیناً اہل عرب میں اس مقالے کی پزیرائی ہوگی اور ممکن ہے کہ کوئی عربی ادیب و شاعر علامہ فضل حق خیر آبادی کی شخصیت اور علم و فن پر تحقیق کا کام کرے۔ اس مقالے میں علامہ کے مصری حالات، ذاتی حالات، ادبیات، اصناف سخن اور زبان و بیان کے اسلوب پر سیر حاصل گفتگو ہے۔ اس کے علاوہ الازہر یونیورسٹی سے ہی مولانا حافظ عبد الواحد، علامہ فضل حق خیر آبادی کے اعتقادی نظریات کے حوالے سے ڈاکٹریٹ کا مقالہ بعنوان "العلامہ فضل حق خیر آبادی و آراؤہ الکلامیہ" ترجمہ "علم الکلام میں فضل حق خیر آبادی کی آراء" لکھ چکے ہیں۔ ۵۴

﴿مصادر و حوالہ جات﴾

۱ بوقت عمر میں شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کی خدمت میں ملاقات کے لیے ایک عربی قصیدہ پیش کیا، شاہ صاحب نے ایک مقام پر اعتراض کیا، علامہ نے شعرائے حقدمین کے بیس اشعار سنا دیے اور شاہ صاحب نے اپنا

تسلیم کیا۔

۲ محمد فضل حق خیر آبادی، الثورۃ الہندیہ، مطبوعہ مکتبہ قادریہ لاہور، ص: ۳۰۷

۳ ایضاً، ص: ۲۹۷۔۲۹۸ ۴ ایضاً، ص: ۳۱۹

۵ رحمان علی مولوی: تذکرہ علمائے ہند، مطبوعہ کراچی ۱۹۶۱ء، ص: ۳۸۲۔۳

۶ ڈاکٹر محمد ایوب قادری: مولوی فضل حق خیر آبادی، بحوالہ علامہ فضل حق خیر آبادی اور جہاد آزادی، ص: ۹۵

۷ فضل حق خیر آبادی، تحقیق الفتوی فی ابطال الطغوی، طبع لاہور ۱۹۷۹ء، ص: ۳۳۷

۸ سر سید احمد خاں: مقالات سر سید، مطبوعہ لاہور، حصہ نجم، ص: ۱۳۹۔۱۴۰

۹ امام احمد رضا محدث بریلوی رحمۃ اللہ علیہ نے مولوی اسماعیل دہلوی کی توہین کی شہرت کی وجہ سے ان کی تکفیر نہیں فرمائی بلکہ سکوت کا حکم دیا۔ چنانچہ تحریر فرماتے ہیں: "وہم و احترام میں فرق ہے اقوال کا کفر ہونا اور بات اور قائل کو کافر جان لینا اور بات، ہم احتیاط پر عمل کریں گے سکوت کریں گے جب تک ضعیف سے ضعیف احتمال ملے گا حکم کفر جاری کرتے ڈریں گے"۔ (حسام الحرمین علی کفریات بابا النجدیہ) شہرت یہ ہوگئی تھی کہ "مولوی اسماعیل دہلوی نے اپنے انتقال کے وقت بہت سے آدمیوں کے روبرو بعض مسائل تقویۃ الایمان سے توبہ کر لی تھی"۔ (عبدالشاہد رامپوری: ایک مظلوم مفکر، مطبوعہ لاہور ۱۹۹۹ء، ص: ۶۳) مولوی رشید احمد گنگوہی نے اس توبہ کا انکار کیا چنانچہ وہ لکھتے ہیں "اور توبہ کہ ان کا بعض مسائل سے محض افترا اہل بدعت کا ہے۔" (فتاویٰ رشیدیہ، مطبوعہ دیوبند، ص: ۸۳) مولوی رشید احمد کے انکار کے باوجود امام احمد رضا محدث بریلوی علیہ الرحمہ نے اعتقاد کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا اور مولوی اسماعیل دہلوی کی تکفیر نہیں فرمائی۔ اکابرین اہل سنت و جماعت رحمہم اللہ تعالیٰ نے جو مسلک احتیاط کا یہی طریقہ اپنایا ہے اور یہی طریقہ ان کے مقام و کرامت کے اشتہار پر شاہد ہے۔

۱۰ حسین احمد دیوبندی: نقش حیات، مطبوعہ کراچی، جلد دوم، ص: ۲۶۹

۱۱ محمد جعفر تھانیسری: حیات سید احمد شہید، مطبوعہ کراچی، ص: ۱۳۲

۱۲ اسماعیل دہلوی: تقویۃ الایمان (انگریزی ترجمہ) (رائل ایشیاٹک سوسائٹی)

۱۳ مغلیہ دور سلطنت میں شاہی دربار میں علماء شرفا اور نوابین میں حقے کا عام رواج تھا۔ بادشاہوں کے حقے تو اب بھی عجائب خانوں کی زینت بنے ہوئے ہیں لیکن یہ حقے اور ان میں استعمال ہونے والا تمباکو آج کل کے دیہاتی حقوں اور اس کے تمباکو سے بالکل مختلف تھا۔ بڑے قیمتی، زرنگار اور خوبصورت حقے ہوتے تھے جلم شاندار، نقرئی یا

طلائی نے۔ کبھی یہ پائپ کی طرح اتنی لمبی ہوتی تھی کہ ایک کمرے میں حقہ دوسرے کمرے میں لے۔ پھر تمباکو کی چلم تمباکو خمیر تیار کیے جاتے تھے اور ان میں مشک وغیرہ وغیرہ کا بھی استعمال ہوتا تھا۔ جب حقہ تازہ کیا جاتا اور نوش جاں کیا جاتا تو دھوئیں سے خوشبوئیں پھوٹتیں اور پوری فضا معطر اور معمر ہو جاتی۔

۱۴ اس زمانے میں بادشاہ اور نوابین علماء اور حکماء میں یہ کھیل معیوب نہ تھا بلکہ اس کھیل کو زکاوت کی جلا کے لیے کھیلتے تھے۔ راقم نے بھی اپنے بچپن میں بعض متبحر علماء اور حاذق حکماء کو یہ کھیل کھیلتے دیکھا ہے۔

۱۵ نواب صدیق حسن خاں، تاریخ فتوح بھوپال، علامہ فضل حق خیرآبادی اور جہاد آزادی لاہور، ص: ۱۹۵

۱۶ سرسید احمد خاں نے اسباب سرکشی جلد دوم، ص: ۷ اور مولوی ذکاء اللہ نے تاریخ عروج سلطنت انگلیشیہ، ج ۹ ص: ۶۷۵ میں فتوائی جہاد کے بارے میں گول مول باتیں لکھیں۔

۱۷ غداروں کے خطوط، ص: ۲۰۳۔۲۰۴

۱۸ الثورۃ الہندیہ، ص: ۳۱۴

۱۹ ایضاً

۲۰ ایضاً، ص: ۲۶۷

۲۱ ایضاً، ص: ۳۰۷

۲۲ الثورۃ الہندیہ، ص: ۲۶۵

۲۳ ایضاً، ص: ۲۹۹

۲۴ ایضاً، ص: ۲۸۹

۲۵ مورخہ ۱۸ فروری ۱۸۵۹ء بنام نواب رامپور، مکتوب الیہ مکتوب، خانہ رامپور، نواب یوسف علی خاں بہادر (نوٹ: یہ مکتوب رامپور سے الہ آباد منتقل کر دیا گیا ہے۔)

۲۶ الثورۃ الہندیہ، ص: ۳۲۳

۲۷ ایضاً، ص: ۲۶۱

۲۸ ایضاً، ص: ۳۲۳

۲۹ ایضاً، ص: ۳۲۳

۳۰ مولانا فضل حق خیرآبادی از مالک رام بحوالہ علامہ فضل حق خیرآبادی اور جہاد آزادی، ص: ۲۳۱

۳۱ الثورۃ الہندیہ، ص: ۲۸۹

۳۲ علامہ محمد عبدالحق خیرآبادی حکیم باپ کے عظیم بیٹے تھے۔ ۱۲۳۳ھ/۱۸۲۸ء میں دہلی میں ولادت ہوئی۔ ۱۲ سال

کی عمر میں درسیات سے فارغ ہوئے، پھر مدرسہ عالیہ کلکتہ میں خدمات انجام دیں۔ اس کے بعد نواب رام پور نے بلا لیا اور وہاں ۱۲۸۱ھ/۱۸۶۴ء سے ۱۳۰۰ھ/۱۸۸۲ء تک حاکم مرافعہ اور مدرسہ عالیہ رام پور کے پرنسپل رہے۔ کچھ روز آصف جاہ نظام حیدرآباد کی دعوت پر حیدرآباد بھی رہے، پھر نواب حامد علی خان نے رام پور بلا لیا، ایک سال وہاں رہ کر خیرآباد آ گئے۔ علامہ عبدالحق خیرآبادی سلسلہ چشتیہ میں شاہ اللہ بخش تونسوی علیہ الرحمہ سے بیعت تھے۔ آخر میں تصوف کی طرف پوری طرح توجہ ہو گئی تھی۔ ۲۳ شوال المکرم ۱۳۱۶ھ/۱۸۹۹ء کو انتقال فرمایا۔

۳۳ علامہ فضل حق خیرآبادی پر مختلف علمی مقالات کا ایک مجموعہ بعنوان "فضل حق خیرآبادی اور جہاد آزادی" مرتب کیا گیا۔ یہ عنوان بظاہر دلپذیر معلوم ہوتا ہے۔ پھر یہ کتاب سہیل اکیڈمی لاہور کے نام سے شائع کروائی گئی تاکہ اثر کو وہابی نہ سمجھا جائے۔ پھر نفیس رقم کے شاگرد رشید حاشق نے اس کی کتابت کی اور اس کے نام کے آگے "قادری" لگا ہوا ہے تاکہ کوئی شک نہ رہے۔ تعجب ہے کہ نفیس رقم نے اس کتاب کا سرورق کتابت کیا، جبکہ نفیس رقم کا حال یہ تھا کہ فقیر کی کتابوں کے ناکمل نسخے سے اس لیے انکار کرتے تھے کہ فقیر نام احمد رضا محدث بریلوی علیہ الرحمہ پر کام کرتا ہے۔ افسوس دنیا نے وہابیت اور دیوبندیت دونوں ہی محدث بریلوی سے نالاں ہیں اور آپ کے بے مثل علم و فضل کا ان پر ذرہ برابر اثر نہیں۔ جس کتاب کا اوپر ذکر کیا گیا اسے خوبصورت عنوان کے باوجود اس میں علامہ فضل حق خیرآبادی کو جہاد آزادی سے الگ دکھایا گیا ہے۔

۳۴ اس الزام کی تردید میں راقم کا مقالہ "کتاب و کتابی" ملاحظہ کریں، "معلوم" کراچی ۱۴۱۹ھ/۱۹۹۸ء، مطالعہ فرمائیں۔

۳۵ (الف) الطاف حسین حالی: حیات جاوید، معلوم لاہور ۱۹۶۵ء، ص: ۱۷۵ (ب) سرسید احمد خان: مقالات سرسید، معلوم لاہور ۱۹۶۲ء، حصہ نہم، ص: ۲۱۲

۳۶ حاشق الٰہی میرٹھی: تذکرہ علمائے ہند، معلوم دہلی ۱۹۱۴ء، ص: ۸۰

۳۷ صدیق حسن خان: ترجمان وہابیہ، معلوم لاہور ۱۳۱۲ھ، ص: ۹۔۲۹

۳۸ فضل حسین بہاری: النجات بعد الممات، معلوم کراچی ۱۳۷۹ھ، ص: ۱۲۵۔۱۳۷

۳۹ (الف) رئیس احمد جعفری: اوراق گم گشتہ، معلوم کراچی، ص: ۳۳۳ (ب) محمد زکی دیوبندی: مکالمۃ الصدرین (۱۳۷۰ی الجو ۱۳۶۳ھ) دارالاشاعت دیوبند

۴۰ (الف) محمد اکرم شیخ: شبلی نامہ، ص: ۱۷۸۔۲۲۵ (ب) سلیمان ندوی: حیات شبلی، معلوم اعظم گڑھ ۱۹۴۳ء، ص: ۶۳۱۔۶۳۲

۳۱ تفصیل کے لیے دیکھیں: شیشے کے گھر: تالیف مولانا محمد عبدالحکیم شرف قادری۔ برطانوی مظالم کی کہانی، تالیف مولانا عبدالحکیم اختر شاہجہانپوری

۴۲ سرگزشت حجاز، مطبوعہ لکھنؤ، ۱۹۲۷ء، ص: ۴۲۔۴۳ ۴۳ ایضاً، عکس بالمقابل، ص: ۱۸

۴۴ وقائع عبدالقادر خانی، ص: ۲۵۸، بحوالہ علامہ فضل حق خیرآبادی اور جہادِ آزادی، ص: ۱۵۱

۴۵ تذکرہ فرائد الدرر، مطبوعہ دہلی ۱۸۴۷ء، ص: ۴۰۷، بحوالہ مذکور ص: ۱۵۵

۴۶ ریاض الفردوس، مطبوعہ لکھنؤ ۱۸۶۶ء، ص: ۱۴۰، بحوالہ مذکور ص: ۱۵۶

۴۷ الیانع الجنی فی اسانید الشیخ عبدالغنی مطبوعہ بریلی ۱۲۸۶ھ، ص: ۹۳، بحوالہ مذکور، ص: ۱۵۷

۴۸ ابجد العلوم، مطبوعہ بھوپال ۱۲۹۶ھ، ص: ۹۱۵، بحوالہ مذکور ص: ۱۶۳

۴۹ آثار الصنادید، مطبوعہ دہلی ۱۹۶۵ء، ص: ۶۳۔۵۶۲، بحوالہ مذکور ص: ۱۵۳

۵۰ امیر احمد مینائی نے علامہ فضل حق خیرآبادی کو "خلیق" لکھا ہے لیکن نواب صدیق حسن خاں نے "حسن اخلاق سے بہت دور" لکھا ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔ "اس قدر علم و کمال اور علم و حکمت اور فلسفہ و ریاضی، عربی ادب اور نحو میں اتنی دستگاہ ہونے کے باوجود حسن اخلاق اور عالمانہ تواضع سے بہت دور تھے (تاریخ فتوح ۱۲۷۸ھ، بحوالہ سرحد کراچی جون جولائی ۱۹۷۴ء، مقالہ محمد ایوب قادری ص: ۳۵) امیر احمد مینائی صحیح العقیدہ سُنی تھے جبکہ نواب صدیق حسن خان ابتدا میں بدعقیدہ تھے شاید اسی لیے ان سے اخلاق سے پیش نہ آئے ہوں گے۔ اس لیے انہوں نے جو دیکھا لکھ دیا لیکن اس سے علامہ فضل حق خیرآبادی کے عقیدے کی پختگی کا اندازہ ہوتا ہے۔

۵۱ انتخاب یادگار، مطبوعہ لکھنؤ ۱۲۹۷ھ، ص: ۲۹۲، ۲۹۱، بحوالہ مذکور، ص: ۱۵۹

۵۲ حدائق الحنفیہ، مطبوعہ لکھنؤ ۱۸۹۱ء، بحوالہ مذکور ص: ۱۶۷

۵۳ امام احمد رضا محدث بریلوی پر ہندوستان، پاکستان، امریکہ اور مصر وغیرہ میں گزشتہ ۲۳ سال میں بہت کام ہو چکا ہے جس کی تفصیلات راقم کی کتاب "امام احمد رضا اور عالمی جامعات" (مطبوعہ کراچی ۱۳۱۸ھ/۱۹۹۸ء) میں مطالعہ کی جا سکتی ہیں۔

۵۴ ان کے علاوہ ہندوستان کی کرناٹک یونیورسٹی میں مولانا محمد احمد نے علامہ فضل حق خیرآبادی کی حیات و خدمات پر اور پاکستان کی پنجاب یونیورسٹی میں محترمہ سلمہ سیہول نے علامہ فضل حق علیہ الرحمۃ پر ڈاکٹریٹ کا مقالہ قلمبند کیا ہے۔

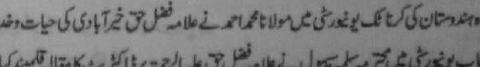

سوانحی خاکہ

تاریخ	واقعہ	تفصیل
1212ھ/1797ء	ولادت	خیرآباد
1225ھ/1810ء	تحصیل علوم سے فراغت	عمر 13 سال
1231ھ/1816ء	آغاز ملازمت کمپنی	عمر 19 سال بطور سررشتہ دار عدالت
1240ھ/1825ء	مسئلہ امتناع النظیر	مولوی اسماعیل دہلوی کی تقویۃ الایمان کا رد
1242ھ/1827ء	مولانا فضل امام کا استعفیٰ	دہلی میں صدر الصدور کی ملازمت سے
1243ھ/1828ء	ولادت فرزند	مولانا عبدالحق خیرآبادی
1244ھ/1829ء	وفات مولانا فضل امام	تب علامہ فضل حق کی عمر 32 سال تھی
1245ھ/1831ء	علامہ فضل حق کا استعفیٰ	ملازمت کمپنی سے، عمر 35 سال
1246ھ/1832ء	ریاست جھجر میں ملازمت	
	ریاست الور، سہارن پور اور ٹونک میں قیام	ریاست جھجر سے واپسی اور رام پور روانگی کے درمیانی عرصہ میں

WWW.NAFSEISLAM.COM

1256ھ/1840ء	ریاست رام پور میں ملازمت	حاکم الحکم نظامت دصدر الصدور
1263ھ/1847ء	دارالسلطنت لکھنؤ میں ملازمت	بطور صدر الصدور و مہتمم کچہری
1272ھ/1856ء	ریاست الور میں ملازمت	
10 مئی 1857ء	آغاز جنگ آزادی	علامہ ریاست الور میں ملازم
11 مئی 1857ء	دارالحکومت دہلی پر مجاہدین کا قبضہ	
15 جولائی 1857ء	الور کے راجہ بنے سنگھ کی وفات	علامہ الور میں موجود
16 اگست 1857ء	علامہ بہادر شاہ ظفر کے پاس اور منتظم جہاد و ملک	بادشاہ کی دعوت اور ترک ملازمت الور
19 ستمبر 1857ء	دہلی پر انگریزوں کا قبضہ	بادشاہ شہزادوں اور بخت خان وغیرہ کا قبضے سے پہلے خروج
24 ستمبر 1857ء	علامہ کی دہلی سے روانگی	5 دن گھر میں اہل وعیال کے ساتھ بھوکے پیاسے بند رہنے کے بعد
دسمبر 1857ء	خیرآباد میں ورود	علی گڑھ اور رامپور وغیرہ سے ہوتے ہوئے تقریباً 2 ماہ بعد
آغاز دسمبر 1857ء	لکھنؤ روانگی	آخر نومبر میں لکھنؤ میں آغاز جہاد
مارچ 1858ء	خیرآباد واپسی	14 مارچ کو انگریزوں کا لکھنؤ پر قبضہ
مارچ/اپریل مئی 1858ء	خیرآباد میں دو تین ماہ قیام	
جون تا دسمبر 1858ء	روپوشی 7 ماہ تک	مئی 1858ء میں ملکہ حضرت محل کا بسقام بوندی قیام مرکز جہاد بقول علامہ وہ کھیڑی، ہرگانوں، متھیل، سہسپور اور دریہ میں مقیم رہے اور راستے میں بوندی سے گزر ہوا۔

WWW.NAFSEISLAM.COM

نومبر 1858ء	ملکہ وکٹوریہ کا اعلانِ معافی	ہر طالبِ اقتدر ہندوستان پر میں 30 دسمبر 1858ء تک کی مہلت کے ساتھ اشاعت اعلان
وسط دسمبر 1858ء	علامہ کی خیر آباد واپسی	
دسمبر 1858ء	برگیڈیئر ٹروپ سے ملاقات	
26 دسمبر 1858ء	کرنل کلارک سے ملاقات	
30 دسمبر 1858ء	ایڈیشنر ضلع کے سامنے پیشی	
30 جنوری 1859ء	گرفتاری	
22 فروری تا 4 مارچ 1859ء	مقدمہ بغاوت و سزا	تاحیات جزائر انڈیمان میں جلاوطنی
8 اکتوبر 1859ء	کلکتہ سے انڈیمان کے پورٹ بلیئر آمد	
20 اگست 1861ء مطابق 12 صفر 1278ھ	وفات	جزائر انڈیمان میں مدفون

WWW.NAFSEISLAM.COM

سُبْحَانَ اللّٰہ

کشورِ علم کی تاجدار، حکمت و کلام کی امام

علامہ محمد عبد الحکیم شرف قادری

علامہ محمد فضل حق خیرآبادی

شیخ الحدیث والتفسیر حضرت علامہ محمد عبد الحکیم شرف قادری 24 شعبان المعظم 1323ھ / 15 اگست 1944ء کو مولوی اللہ دتہ صاحب المعروف "حافظ جی" کے ہاں مرزا پور ضلع ہوشیار پور پنجاب بھارت میں پیدا ہوئے۔ تقسیم برصغیر سے قبل آپ کا خاندان لاہور ہجرت کر آیا اور یہیں پر آپ نے ابتدائی تعلیم حاصل کی۔

تعلیمی مراحل جامعہ رضویہ فیصل آباد، دار العلوم ضیاء شمس الاسلام سیال شریف، جامعہ نظامیہ رضویہ لاہور اور جامعہ مظہریہ امدادیہ بندیال شریف میں طے کیے۔ آپ کے اساتذہ میں محدث اعظم پاکستان حضرت علامہ سردار احمد چشتی، امام المناظرہ حضرت علامہ عطاء محمد چشتی گولڑوی، محدث جلیل حضرت علامہ غلام رسول رضوی، مفتی اعظم پاکستان حضرت علامہ مفتی محمد عبد القیوم ہزاروی اور مولانا شمس الزمان قادری رحمۃ اللہ علیہم ایسی عظیم المرتبت شخصیات شامل تھیں۔

آپ مارچ 1965ء میں جامعہ نعیمیہ لاہور میں مسند تدریس پر رونق افروز ہوئے اور وقتاً فوقتاً جامعہ نظامیہ رضویہ لاہور، دار العلوم محمدیہ غوثیہ بھیرہ، دار العلوم اسلامیہ رحمانیہ ہری پور ہزارہ اور مدرسہ اسلامیہ اشاعت العلوم چکوال میں تدریسی خدمات سرانجام دیں۔ جامعہ نظامیہ رضویہ اندرون لوہاری گیٹ لاہور میں تقریباً دو عشرے تک طلباء کو مستفید کیا۔ علوم نبویہ کو نسل نو میں منتقل کرنے کی محنت شاقہ کا اندازہ آپ کے ان گنت تلامذہ سے ہوتا ہے۔

باطنی تربیت کے لیے آپ نے 25 مارچ 1970ء کو مفتی اعظم پاکستان حضرت علامہ ابو البرکات سید احمد قادری رحمۃ اللہ علیہ کے دست اقدس پر سلسلہ قادریہ میں بیعت کی۔ محرم 1402ھ / نومبر 1981ء میں خانوادہ اعلیٰ حضرت کے چشم و چراغ مولانا ریحان رضا خاں بریلوی رحمۃ اللہ علیہ نے آپ کو اجازت و خلافت سے سرفراز فرمایا۔

درس و تدریس اور اصلاح کی بے بہا خدمات کے ساتھ ساتھ قدرت حق نے آپ کے قلم سے بھی خوب کام لیا۔ اشعۃ اللمعات "تحقیق الفتویٰ فی ابطال الطغوی" "دلائل الخیرات" "مطالع المسرات" کے تراجم اور عقائد و نظریات، شیشے کے گھر، تذکرہ اکابر اہلسنت، نور نور چہرے، مقالات سیرت طیبہ، ندائے یا رسول اللہ اور

عقیدتوں کے پاسبان آپ کی لاجواب تصانیف ہیں۔ عمر عزیز کے آخری حصے میں آپ نے قرآن کریم کا ترجمہ "انوار القرآن فی ترجمۃ مفاھیم القرآن" کے نام سے مکمل فرمایا۔

المختصر آپ اہلسنت وجماعت کے عظیم محسن، مترجم اور ترجمان تھے۔ یکم ستمبر 2007ء کو آپ نے جہان فانی سے کوچ فرمایا۔ رد قادیانیت و مرزائیت کے ضمن میں آپ کی رائے تھی کہ "آج ضرورت ہے کہ اہل سنت کا کم از کم ایک ادارہ ایسا ضرور ہو جو رد قادیانیت کے لیے مختص ہو"۔

اسلاف کے زریں کارناموں کو منظر عام پر لانے کی کوشش کسی بھی قوم کی زندگی کی علامت سمجھی جاسکتی ہے۔ اسی سے قوت عمل میں اضافہ ہوتا ہے اور مجدد علمتوں میں تحریک کی برقی رو دوڑ جاتی ہے۔ غیر منصف مؤرخین اور اہل قلم نے نہ صرف اپنے اکابر کے جھوٹے سچے کارناموں کو پورے زور شور سے پھیلایا بلکہ اکابر اہل سنت کے قابل فخر کردار کو مشتبہ اور داغدار بنانے کے لیے زور قلم صرف کیا۔ حیرت ہے کہ مخالفین کے یک طرفہ جارحانہ حملوں کے باوجود ہمیں مجاہدین اہل سنت کی حمایت اور دفاع کی توفیق نصیب نہ ہوئی۔ اس وقت اشد ضرورت ہے کہ اہل علم وقلم حضرات کا بورڈ قائم کیا جائے جو ماحول کی ضروریات کے مطابق لٹریچر پیش کرے اور کامل تحقیق وجستجو کے بعد علمائے دین اہل سنت کی عالمانہ اور مجاہدانہ خدمات جلیلہ سے عوام وخواص کو روشناس کرائے۔

علم وفضل:

موافق ومخالف اس بات پر متفق ہیں کہ علامہ محمد فضل حق خیر آبادی کشور علم کے تاجدار اور دور آخر میں منطق وفلسفہ کے مسلم الثبوت امام تھے۔ تیرہ سال کی عمر میں اس دور کے تمام مروجہ علوم سے فارغ ہو کر مسند تدریس کو زینت بخشی۔ حافظہ اس غضب کا تھا کہ چار ماہ اور کچھ دنوں میں قرآن پاک حفظ کر لیا۔ اور علم وفضل میں وہ مقام حاصل کیا جہاں تک معاصرین میں سے کوئی نہ پہنچ سکا۔

سرسید لکھتے ہیں: "جمیع علوم وفنون میں یکتائے روزگار ہیں اور منطق وحکمت کی تو گویا انہیں کی فکر عالی نے بنا ڈالی ہے۔ علمائے عصر بل فضلائے دہر کو کیا طاقت ہے کہ اس سرگروہ اہل کمال کے حضور میں بساط مناظرہ آراستہ کر سکیں۔ بارہا دیکھا گیا کہ جو لوگ اپنے آپ کو یگانہ فن سمجھتے تھے جب ان کی زبان سے ایک حرف سنا بجوائے کمال کو فراموش کر کے نسبت شاگردی کو اپنا فخر سمجھے"۔ [2]

منشی محمد جعفر تھانیسری لکھتے ہیں: "مولوی فضل حق معقولی خیر آبادی جو اس زمانے میں حاکم اعلیٰ شہر دہلی کے سرشتہ دار اور علم منطق کے پتلے اور افلاطون وسقراط وبقراط کی غلطیوں کی تصحیح کرنے والے تھے"۔ [3]

علامہ محمد فضل حق خیرآبادی معقول و منقول میں تبحر و فضل ہونے کے ساتھ ساتھ باکمال شاعر بھی تھے عربی میں چار ہزار اشعار آپ سے یادگار ہیں۔ علامہ کے کلام کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں یا تو مرد کون و مکان ﷺ کی مدح و ثنا ہے یا کفار اور بدعتیوں کی مذمت۔ مولانا کا بلند پایہ کلام اس لائق ہے کہ اسے عربی ادب کے نصاب میں شامل کیا جائے۔

مولانا محمد امین لکھتے ہیں۔ "قصائد فراء آپ کے امرء القیس اور لبید کے قصائد پر فوقیت رکھتے ہیں۔ علم و ادب میں آپ کو اس قدر مہارت تھی کہ بڑا سے بڑا شاعر سطحی نظر میں پڑ جاتا ہے آپ کے ہم پلہ نہ ہوئے ہوں گے" ج

علامہ فضل حق اور غالب:

مرزا غالب دہلی اس کی نظر میں بڑے بڑے شعراء بھی ہیچ تھے۔ شعر و شاعری میں علامہ فضل حق خیرآبادی سے نہ صرف مشورہ کرتے تھے بلکہ ان کی اصلاح کو بھی بغیر حیل و حجت قبول کرتے تھے۔ علامہ ہی کے ایماء پر غالب نے مشکل پسندی کو ترک کیا تھا۔ مولف آب حیات کے مطابق مرزا غالب "علامہ" اور مرزا فضل حق کا انتخاب ہے۔ علامہ نے نہ صرف غالب کی ادبی راہنمائی کی بلکہ اقتصادی مشکلات حل کرنے میں بھی مرزا غالب کی حتی الوسع مدد فرمائی۔ علامہ کے احسانات کا اثر غالب کے دل پر بہت گہرا تھا اس لئے اور مرزا غالب کی آمدنی سے بآسانی لگایا جا سکتا ہے۔ علامہ کی خیانت کے بعد غالب نے شیخ لطیف اللہ کو ایک خط لکھا اس میں علامہ سے گہری عقیدت کی عکاسی اور جدائی پر کرب کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے۔

مظہر العجائب مولانا فضل حق (جن پر سدا سے مرجائے غالب ہم مرد عجم پایا ہے)۔

مرتے ہیں آرزو میں مرنے کی موت آتی ہے پر نہیں آتی

آگے آتی تھی حال دل پہ ہنسی اب کسی بات پر نہیں آتی

شیخ محمد اکرم غالب پر تبصرہ میں یہاں تک کہہ گئے "سچ ہے کہ مولوی فضل حق کی صحبت سے انہوں (مرزا غالب) کو کمالات تو ہوئے لیکن ادب اور حکمت کی جن باتوں میں مرزا پیچھے وہاں فضل حق پر شبہ کیسے ساتھ دے سکتے تھے۔" ج

پروفیسر یوسف سلیم چشتی نے اس کا تعاقب کیا ہے اور شیخ اکرم کی غلط فہمی کی نشاندہی کی چنانچہ لکھتے ہیں "آب شیخ محمد اکرم (مرتب آب حیات) سے سابق آئی۔ سی۔ ایس۔ حال ہی۔ ایس۔ پی) کو کوئی یہ کہہ سکتا ہے کہ ادب و حکمت کی جن باتوں میں مولانا فضل حق خیرآبادی پیچھے غالب ان کا قصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔ ان کی حیثیت مولانا کے سامنے مشکل طالب علم سے زیادہ نہیں ہے۔

بہ نسبت خاک را با عالم پاک

یہ شخص "نسوا" "نسوت" میں بھی امتیاز نہ کر سکے اسے خاتم الحکماء مولانا فضل حق مرحوم پر فضیلت دینا شیخ صاحب ہی کا حوصلہ ہے۔ اگر اکرام صاحب مولانا کا "حاشیہ برحاشیہ مبارک" پڑھ لیتے تو اس جسارت کا ارتکاب ہرگز نہ کرتے۔ کاش تو یہ ہے کہ "جب تک فضل حق شامل نہ ہو انسان مولانا فضل حق کے مرتبے سے آگاہ نہیں ہو سکتا۔" یہ مرزا حیرت کی غلط بیانی

حاشیہ کاشی کی بات آگے نہ بڑھوں ہم بیتی پوری مشہور "مکر خانی" مرزا حیرت دہلوی کا بھڑوا ہوا ایک شعر بھی ملاحظہ فرمائیے لکھتے ہیں "مجلوی میر احمد صاحب مرحوم نے مولوی فضل حق صاحب کی تصانیف (حواشی) اشعار وغیرہ پر اعتراض کیے ہیں اور اس رسالہ کا نام حجیہ وحمدی رکھا ہے۔ مولوی شبلی صاحب نعمانی نے ان کثیر اعتراضوں کا جواب بالتفصیل تحریر فرمایا ہے" ۵

پہلا سوال یہ کہ اصل علماء نے حاشیہ کاشی پر کیے اعتراض کیے تھے جنکا جواب علامہ نے ان اعتراضات کو دور افتادہ نہیں کہا۔ مولوی احمد رضا صاحب بریلوی (مصنف جد الممتار) لکھتے ہیں "مولانا فضل حق مرحوم مغفور کے حاشیہ کاشی پر بعض فضلاء وقت نے کچھ اعتراض لکھے تھے مولانا نے دیکھا اور ان کے ایسے دندان شکن جواب لکھے جو آپ نے دیکھے نہ لکھا اور پڑھا کہ اس کے جواب بھی حاشیہ کاشی کے حاشیہ میں ہیں" ۶

لطف یہ ہے کہ خود مرزا حیرت کی اخراج پر ہے اس سلسلہ میں پروفیسر محمد ایوب قادری کا ایک مکتوب بھی طرح حقیقت حال پر روشنی ڈالتا ہے لکھتے ہیں کہ "میں نے کتاب حیات طیبہ (سوانح شاہ اسماعیل دہلوی) دیکھی اور مرزا حیرت کا وہ حوالہ بھی پڑھا جس سلسلہ میں اعتراض ہے کہ میری نظر سے نہ تو "تحیر وحمدی" رسالہ گزرا اور نہ ہی اس پر مولانا کا حاشیہ۔ مولانا اس رسالہ کا کہیں ذکر نہ کرتے اور نہ ہی کوئی حوالہ دیتے کہ مرزا نے اس کے مرتب سید احمد رائے بریلوی اور مخالف امیر احمد (حاشیہ) قرار دیے ہیں۔ میں ان دونوں شخصیتوں سے بھی ناواقف ہوں اور نہ ہی یہ حوالہ کہیں نظر سے گزرا کہ علامہ شبلی مرحوم نے اس رسالہ کی جواب دہی کی کوشش کی۔

تذکرہ کاملان رائے بریلوی میرے سامنے ہے۔ اس میں سید احمد یا امیر احمد کوئی ایسے صاحب نہیں ہیں جو تحیر وحمدی رسالہ کے مرتب یا مؤلف ہوں۔ حیات شبلی کو بھی دیکھا وہاں بھی علامہ شبلی کے حال میں کوئی ایسا ذکر نہیں ہے کہ انہوں نے تحیر وحمدی رسالہ کا جواب لکھنے کی کوشش کی۔

میری رائے ہے کہ مرزا حیرت کی یہ سب اپنی اختراعات ہیں۔ مرزا حیرت نے حیات طیبہ میں چند اور کتابوں

مثلاً سیر دہلی' تذکرہ مشاہیر دہلی اور تواریخ علمائے دہلی کے بھی حوالے دیے ہیں۔ میرے خیال سے ان کتابوں کا بھی خارج میں کوئی وجود نہیں ہے۔

ویسے بھی مرزا کی یہ کتاب تاریخی ماخذ کے اعتبار سے بہت کمزور ہے۔ اسی طرح اسیر الروایات بھی میرے خیال سے غیر مستند ماخذ ہے۔ اس میں بھی اکثر نا قابل اعتبار روایتیں درج کر دی گئی ہیں"۔ ۱۰

تلامذہ:

علامہ محمد فضل حق خیرآبادی تحصیل تعلیم کے بعد یہ سلسلۂ ملازمت ابتداءً دہلی میں سررشتہ دار ہوئے بعد ازاں ریاست جھجر' الور' رام پور اور اودھ میں بہ حیثیت وزیر نائب ذمی وقار عہدوں پر کام کرتے رہے۔ اس کے ساتھ ساتھ درس و تدریس اور ہمارے مسلک اہل سنت کا سلسلہ بدستور جاری رہا۔ آپ کے ان گنت تلامذہ آسمان علم فضل کے مہر و ماہ بن کر چمکے اور آج تک آپ کا علمی فیض پاک و ہند کے مدارس کی فضاؤں کو منور و معطر کر رہا ہے۔ باغی ہندوستان میں علامہ کے گیارہ تلامذہ کے اسما درج ہیں۔ راقم کی جستجو کے مطابق چند مزید نام درج کیے جاتے ہیں:

1. مولانا عبدالعزیز سنبھلی (تذکرہ کاملان رامپور از امیر علی خاں شوق' ص: ۲۲۳)
2. مولانا عبدالعلی خاں ریاضی داں' متوفی 1303ھ/1885.6ء استاذ اعلیٰ حضرت مولانا شاہ احمد رضا خاں بریلوی۔ (ایضاً' ص: ۲۲۸)
3. مولانا حکیم محمد فیاض خاں' متوفی 25 رجب 1272ھ/1856ء (ایضاً' ص: ۲۶۷)
4. مولانا موسیٰ خاں' متوفی 1333ھ/1914.5ء (ایضاً' ص: ۳۰۳)
5. نواب' متوفی 1309ھ/1891ء (ایضاً' ص: ۲۲۲)
6. مولانا فخندعلی زیدی' استاذ مولانا عبدالحی فرنگی محلی' مصنف "مجموعۃ الفتاویٰ" و "الطیر الابابیل"
7. مولانا حکیم سید محمد حسن امروہوی' متوفی 1323ھ/1905.6ء (فرنگیوں کا چال از امداد صابری' ص: ۳۰۲)
8. مولانا دلاور بخش مانجانی (تذکرہ علمائے حال از امجد اور یس گجراتی' ص: ۸۵)
9. مولانا سید یار علی سہسوانی (ایضاً' ص: ۹۹)
10. نواب یوسف علی خاں رامپوری (باغی ہندوستان' ص: ۳۳)
11. نواب کلب علی خاں رامپوری (ایضاً' ص: ۳۵)
12. مولانا محمد احسن گیلانی' جد امجد مناظر احسن گیلانی' متوفی 1301ھ/1883.4ء (نزہۃ الخواطر' جلد ۸' ص: ۱۲

WWW.NAFSEISLAM.COM

حکیم عبدالحی لکھنوی، ص: ۴۰۸)

⑬ مولانا نور احمد بدایونی متوفی 1301ھ/1884ء (تذکرہ علمائے اہل سنت از شاہ محمود احمد قادری، ص: ۲۵۱)

⑭ مولانا نور الحسن کاندھلوی متوفی 1285ھ/1868.9ء (حاشیہ تذکرہ علمائے ہند اردو، ص: ۲۶۸)

تحریک آزادی 1857ء کے عوامل:

علامہ محمد فضل حق خیر آبادی راسخ العقیدہ مسلمان اور بیدار دل و دماغ کے مالک تھے۔ انہوں نے قیام دہلی کے دوران اور اس کے بعد گہری نظر سے ماحول کا جائزہ لیا اور اس نتیجے پر پہنچے کہ سفید چمڑی والے سیاہ چمڑی والے انگریز مسلمانوں کو معاشی طور پر مفلوج کر کے ان کی دینی حیثیت کو غیر مؤثر کرنا چاہتے ہیں۔ ذیل میں علامہ کے ایک نامکمل فارسی مکتوب کا ترجمہ پیش کیا جاتا ہے جس میں انگریزی حکومت کے ذہنی ہتھکنڈوں کو کسی قدر تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ یہ مکتوب غالباً خاندان مغلیہ کے آخری تاجدار بہادر شاہ ظفر کے نام ہے۔ اس سے اندازہ ہو سکے گا کہ اس وقت کا ایک عالم دین حالات حاضرہ سے کس قدر باخبر اور اقتصادیات پر کتنی گہری نظر رکھتا تھا۔

علامہ فرماتے ہیں: "اس ملک کے باشندے خواہ وہ ہندو ہوں یا مسلمان ان میں کچھ کسان اور کاشت کار ہیں، کچھ روزگار پیشہ، کچھ تاجر اور اہل حرف، کچھ لوگ لاخراجدار اور وظیفہ دار ہیں، کچھ کی معاش محض دریوزہ گری پر ہے۔ یہاں کے باشندے مسلمان بیشتر اور ہندو کتر ایسے ہیں جو اپنا اصلی وطن ترک کر کے کسی زمانے میں یہاں آ کر آباد ہوئے۔ جب تک ہندوستان کی حکومت بادشاہوں اور راجاؤں کے تصرف میں رہی اس ملک کے باشندوں کو معیشت کی کوئی تنگی نہ تھی کیونکہ ہر قسم کی سرکاری خدمات خواہ وہ سپاہ کی نوکری ہو یا دوسری خدمات اس ملک کے باشندوں کے واسطے مختص تھیں اور یہاں کے باشندوں میں ہر شخص اپنے حوصلے اور لیاقت کے موافق تجارت، حرفہ، سپاہ یا مناصب میں اپنا روزگار پاتا تھا۔

مگر جب سے انگریزوں کی عملداری ہوئی ہے اس وقت سے بتدریج معاش کی تنگی اور روزگار کا فقدان اس حد تک بڑھ گیا ہے کہ عوام کی حالت تباہ ہو گئی ہے۔ انگریز سرکار کے زمانے میں معاش کے سارے وسائل مفقود ہیں اور روزگار کے دروازے بند ہو گئے ہیں سوائے معدودے چند لوگوں کے جنہیں عدالت دیوانی، کلکٹری، فوجداری پرمٹ، تھانہ یا تحصیل کے محکمے میں معمولی سی تنخواہ کی نوکری مل جاتی ہے۔ وہ بھی اب دفتروں کے تبدیل ہونے اور سرکاری کام کا ڈھانچہ بدل جانے کے بعد ایسا نظر آ رہا ہے کہ ان لوگوں سے چھن جائے گی۔

چنانچہ اس شہر کے باشندوں کا حال اور یہاں کے تاجروں کی کیفیت یہ ہے کہ سرکار انگریز نے تجارت کے

سارے گر اپنے قبضے میں رکھے ہیں اور تمام اجناس مثلاً کپڑا، سوت، برتن، گھوڑے اور دوسرے مویشی وغیرہ ملک انگلستان سے لاتے ہیں اور اس ملک کے ہر ہر شہر اور گاؤں میں فروخت کر کے خود نفع کماتے ہیں اور یہاں کے باشندوں کو نفع اندوزی کا کوئی موقع نہیں دیتے، اس لیے ہمارے ملک کے تاجر اپنے پیشوں سے دستبردار ہو گئے ہیں۔

معافی داروں کا حال یہ ہے کہ 1803ء اور 1805ء کے قوانین کی رُو سے اگرچہ انگریز سرکار نے عہد و پیمان کیے تھے کہ ساری لاخراجی زمینیں جو یکم جنوری 1801ء اور یکم جنوری 1803ء سے پہلے لاخراجی دار کے تصرف میں ہوں گی، چاہے وہ ان کی سند رکھتا ہو یا نہ رکھتا ہو اور خواہ ان کے واہب کو عطا کا اختیار ہو یا نہ ہو ایسی زمینوں کو ضبط نہ کیا جائے گا۔ مگر اب بغیر کسی تحقیقات کے ہر ضلع میں معافیاں ضبط کر لی گئی ہیں اور معافی داروں کے لیے کوئی وجہ معاش باقی نہیں چھوڑی۔

کسانوں کا یہ حال ہے کسان پر اتنے محاصل واجب کر دیے گئے ہیں کہ ان میں ادا کرنے کی سکت نہیں ہے۔ ان کی بے استطاعتی اور بے مقدوری خود دفتر کلکٹر کے ریکارڈ سے ظاہر ہو جاتی ہے۔ پس جب کسی کے لیے اس ملک میں روزگار باقی نہ رہا تو اب اہل حرفہ کس کے لیے کام کریں جو ان کا پیٹ بھرے اور جب سارے ہی لوگ تنگیٔ معاش میں مبتلا ہوں تو بھیک منگے کو کون خیرات دے، یہ مختصری کیفیت رعایائے ہندوستان کی معاشی تنگی کی ہے۔

علاقہ شاہجہان آباد کی رعایا کا اقتصادی حال بطور اجمال یہ ہے کہ ابتدائے عمل سرکار انگریزی میں ہوڈل و تھین ونجف گڑھ و ساکلہ و فیروز آباد و ٹیک و دلوتا و پتاد و سامگرس و بجنور و سونی پت و گوہانہ و جر ستھو و کھر کھودہ و روہتک و بہم و ہانسی وحصار یہ سارے پرگنے جاگیر میں تھے اور جاگیرداروں کی سرکار میں ہزارہا آدمی نوج، انتظامیہ اور شاگرد پیشہ کی خدمات پر مامور تھے۔ ان میں اکثر دیہات معافی کے تھے۔ اب یہ سب پرگنے اور دیہات وار اضیات سرکار انگریز نے ضبط کر لی ہیں اور لاکھوں انسان یک لخت بے روزگار ہو گئے اور تمام عالم میں روزگار عنقا کی طرح ناپید ہو گیا۔ سینکڑوں بیوائیں اور محتاج اپنی روزی کا دار و مدار چرخہ کاتنے، رسیاں بٹنے یا چکی پیسنے پر موقوف کیے ہوئے تھے۔ اب ریسماں کی تجارت سرکار نے اپنے ہاتھ میں لے لی ہے اور ہاتھ کی چکیوں کی جگہ پن چکیاں لگ گئی ہیں، تو یہ ذریعہ معاش بھی جاتا رہا۔ اسی طرح اہل حرفہ اور ساہوکار عوام کی بے بضاعتی کے باعث نفع اندوزی سے محروم ہو گئے اور جو کچھ سرمایہ ان کے پاس تھا کھا پی کر برابر کر دیا اور اپنے دیوالے نکال دیے۔

ان ساری دشواریوں کے باوجود سر چارلس مٹکاف بہادر کی کوٹھی سے حکم ہوا کہ ہم غریب زر چوکیداری ادا کریں۔ اگرچہ کبھی سلاطین کے زمانے میں یہ رسم نہیں ہوئی مگر "حکم حاکم مرگ مفاجات" سمجھ کر اسے بھی قبول کیا

WWW.NAFSEISLAM.COM

اور اب تک ادا کرتے رہے۔ اب ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کا یہ حکم آیا ہے جس میں انہوں نے ہر گلی کوچہ میں پھاٹک تعمیر کرنے کا حکم دیا ہے جس کا فائدہ نہ پہلے کچھ تھا نہ آئندہ ہو سکتا ہے۔ ہم غریبوں نے فاقہ کشی کی مصیبت جھیل کر سامان گروی رکھ کر یا بیچ کھوچ کر ہزار بارہ سو روپیہ فراہم کیا اور اس حکم کی تعمیل بھی کر دی۔ اب ان تو تعمیر پھاٹکوں کے کھلنے اور بند ہونے کے اوقات پر چوکیدار کے تعین سے ہم لوگوں کو آئے دن تکلیف کا سامنا ہے مگر اسے بھی جھیل لیا۔ اس خبر کے علاوہ اب صاحب مجسٹریٹ بہادر نے ہر محلہ میں پانچ پانچ بیٹوں کے مقرر کرنے کا حکم دیا ہے۔" [۱۰]

اس طویل مگر مکمل مکتوب سے پتہ چلتا ہے کہ انگریزی حکومت نے اہل ہند کو بے اس اور لاچار بنانے کے لیے کیا کیا حربے اختیار کیے اور مجبور انسانوں کو کس طرح بے دست و پا بنایا۔ علامہ کے نزدیک تحریک آزادی 1857ء کے بنیادی اہداف جن کے حصول کی خاطر مجاہدین کفن بردوش میدان عمل میں نکل آئے تھے۔ علامہ نے اپنی داستان اسیری میں بڑے اختصار اور جامعیت سے ان اہداف کی نشاندہی کی ہے۔ فرماتے ہیں:

❶ انگریزوں نے یہاں کو اپنا دین اور اپنی زبان سکھانے کے لیے جگہ جگہ اسکول کھولے اور دینی مدارس کو ختم کرنے کے لیے پوری کوشش کی۔

❷ ملک کی تمام پیداوار غریب کسانوں کی قیمت اور سپلائی پر اجارہ داری قائم کر لی۔ اس سے ان کا مقصد یہ تھا کہ خلق خدا ہماری دست نگر ہو جائے اور بے چون و چرا ہمارے احکام کی تعمیل کرے۔

❸ مسلمانوں کو ملازمت کرانے سے روکنے اور پردہ نشین خواتین کا پردہ ختم کرانے کی کوشش کی۔

❹ مسلمانوں کو سور کی چربی والے اور ہندوؤں کو گائے کی چربی والے کارتوس دیے گئے جو منہ سے کاٹنے پڑتے تھے۔ ان کی نظر میں اپنی حکومت کو مستحکم بنانے کا یہی طریقہ تھا کہ مذہبی امتیازات ختم کر کے تمام رعایا کو ملت کفر والحاد پر متفق کر دیا جائے۔ [۱۱]

علامہ فضل حق کا تحریک آزادی میں حصہ:

اس تجزیے کے پیش نظر کون سا ایسا مسلمان ہوگا جو انگریزوں سے متنفر اور بیزار نہیں ہوگا۔ یہی وجہ تھی کہ علامہ کے دل کے کسی گوشے میں انگریزوں سے محبت اور ہمدردی کے لیے کوئی جگہ نہ تھی بلکہ علامہ "قصائد فتنۃ الہند" میں تو یہاں تک فرماتے ہیں: "نفس قرآنی سے ثابت ہے کہ ان کی محبت کفر ہے۔ کسی حق پرست انسان کو اس میں شبہ نہیں ہو سکتا۔ نصاریٰ سے محبت کس طرح جائز ہو سکتی ہے جب کہ یہ لوگ اس ذات اقدس ﷺ کے دشمن ہیں جن کے طفیل ارض و سما پیدا کیے گئے۔" [۱۲]

WWW.NAFSEISLAM.COM

جنگ آزادی کی ابتداء مئی 1857ء میں ہوئی۔ اس وقت علامہ محمد فضل حق خیرآبادی الور میں مقیم تھے انہیں خاص طور پر دہلی سے بلایا گیا۔ علامہ کے اپنے الفاظ یہ ہیں: ﴿واذ کان فی دھلی کثیر من عیالی واھلی ومع ذلک کنت مدعوا وکان الفلاح والافلاح مرجوا والفرح والفرح مظنونا﴾ [5] "چونکہ دہلی میں میرے بہت سارے اہل وعیال تھے اس کے باوجود مجھے بلایا بھی گیا تھا اور کامیابی وکامرانی کی قوی امید تھی"۔

بہادر شاہ ظفر کے علامہ کے ساتھ گہرے مراسم تھے اس لیے قرین قیاس یہی ہے کہ صلاح ومشورہ کے لیے انہوں نے ہی علامہ کو بلایا ہوگا۔ اس دور کے روزنامچوں سے پتہ چلتا ہے کہ علامہ شریک دربار ہوتے رہے اور اپنے مشوروں سے راہنمائی کرتے رہے۔ اس زمانے کی پوری تفصیل نہ تو روزنامچوں سے ملتی ہے اور نہ ہی علامہ نے اسے قلم بند کیا صرف اشارات ملتے ہیں مثلاً ایک جگہ علامہ فرماتے ہیں ﴿فوا شوت الی الناس بما اقضی رائی وقضی به عقلی فلم یاتمروا بما اشرت﴾ [6] "اپنی عقل اور فہم کے مطابق لوگوں کو اپنی رائے اور مشورہ سے آگاہ کیا لیکن انہوں نے میرا مشورہ قبول کیا اور نہ میری بات مانی"۔

ظاہر ہے کہ علامہ ایسا مشکل صحیح رائے اور فکر صائب ہی سے راہنمائی کر سکتا تھا اور یہ بھی مسلم ہے کہ میدان جنگ میں لڑنے والی فوج وہ کام نہیں کر سکتی جو ایک دانشور کی راہنمائی کر سکتی ہے۔ دوسری جگہ فرماتے ہیں: "میں پچھلے والوں کو لڑائی میں برابر آگے بڑھاتا رہا اور لڑائی شروع ہو جانے پر خود بیضا رہا میں اپنی سستی کی وجہ سے ایسے موقع پر باز رہا۔ یہ میں نے بڑا جرم کیا کہ جب تک بخت حضرات نے مجھے شہادت کے لیے پکارا تو میں حاضر نہ ہوا یا میں شہادت سے محروم رہا جب کہ سعادت مندوں نے جام شہادت نوش کیا"۔ [7]

اس اقتباس سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ علامہ کو صرف اس بات کا افسوس تھا کہ وہ عملی جہاد میں حصہ لے کر جام شہادت نوش نہ کر سکے ورنہ وہ تو غیب جہاد اور فکری جہاد میں کسی سے پیچھے نہ تھے۔ اسیری اور جلاوطنی کی موت نے شوق شہادت بھی پورا کر دیا۔

یہ بات قابل غور ہے کہ علامہ دہلی سے اپنے اہل وعیال کو لے کر چلے نہیں بنے بلکہ انگریزوں کے تسلط کے بعد بھی پانچ دن تک وہیں ٹھہرے رہے۔ اگر علامہ کا تحریک آزادی سے کوئی تعلق نہ ہوتا تو اتنی دیر وہاں ٹھہرنے کی کوئی وجہ نہ تھی اور انہیں فوراً کسی اور جگہ چلے جانا چاہیے تھا۔

سوء اتفاق کہ منظم تیاری نہ ہونے اور اپنوں کی غداری اور غفلت کی وجہ سے انگریز دہلی پر مسلط ہو گئے اور جی بھر کر خون ریزی کی اس دوران علامہ پانچ دن بھوکے پیاسے دہلی میں رہے پھر اہل وعیال سمیت چھپتے چھپاتے خیر

آباد بھاگ گئے۔ سقوط دہلی کے باوجود اودھ کی ملکہ حضرت محل نے کمال جرأت و ہمت کا مظاہرہ کیا اور بھاگ کر آنے والے فوجیوں کو پناہ دی۔ وہ شمالی علاقے میں اپنے ساتھیوں کے ہمراہ قیام پزیر ہو گئیں اور افواج کو علاقے کا انتظام کرنے اور دریا کے گھاٹوں پر حفاظت کے لیے معین کر دیا اور انہیں حکم دیا کہ اگر دشمن اس طرف رخ کرے تو اس کا ڈٹ کر مقابلہ کیا جائے۔ علامہ اس جگہ بھی مشیر خاص کے طور پر شریک ہوئے۔

علامہ پر قائم کردہ مقدمہ کی رپورٹ میں لکھا ہے: "یہ بات ان ایام میں عام طور پر مشہور تھی کہ چند آدمی بیگم (حضرت محل) کے مشیران خاص ہیں۔ باغی فوج میں ان کی "ابو شوزی" کے نام سے شہرت تھی بلکہ کبھی کبھی انہیں "کچہری پارلیمنٹ" کے نام سے بھی پکارا جاتا تھا۔ اس شوریٰ میں ملزم (علامہ فضل حق) بہت ممتاز تھا"۔ [۱۸]

فیصلے میں یہ بھی لکھا ہے: "وہ خطرناک ترین آدمی ہے جو کسی وقت بھی بے حد نقصان پہنچا سکتا ہے۔ اس لیے انصاف اور امن عامہ کا تقاضا ہے کہ اسے ملک بدر کر دیا جائے"۔ [۱۹]

علامہ پر الزام قائم کیا گیا کہ انہوں نے بیگم حضرت محل کے مشیر ہونے کی حیثیت سے بوندی میں دو ایسے شخصوں کے قتل کا فتویٰ دیا تھا جو انگریز کے وفادار تھے۔ چنانچہ ان میں سے ایک شخص عبدالحکیم نے بیان دیتے ہوئے کہا: "مجھے معافی اور مولوی فضل حق کے سامنے پیش کیا گیا۔ معافی نے مولانا فضل حق سے دریافت کیا کہ میرے ساتھ کیا سلوک کیا جائے؟ مولانا نے فتویٰ دیا کہ یہ شخص فرنگیوں کا ملازم ہے اس لیے سزائے موت کا مستحق ہے"۔ [۲۰]

خود علامہ نے صحیح صورت حال کا انکشاف ان الفاظ میں کیا ہے: "میری چچی ایسے دو مرتد" جعفر از نیتہ خواہ افراد (عبدالحکیم اور مرتضیٰ حسین) نے کھائی جو مجھ سے قرآن کی محکم آیت میں مجادلہ کرتے تھے۔ جس کا حکم یہ ہے کہ نصاریٰ کا دوست بھی نصرانی ہے۔ وہ دونوں نصاریٰ کی مودت و محبت پر مُصر تھے۔ انہوں نے مرتد ہو کر کفر کو ایمان سے بدل لیا تھا"۔ [۲۱]

علامہ فضل حق خیرآبادی نے اپنی تحریرات میں اپنے مجاہد انہ کارناموں کو اجاگر کرنے کی کوشش نہیں کی۔ یہ الگ بات ہے کہ جستہ جستہ اشارۃً کوئی بات آ گئی ہو۔ بوندی میں بیگم حضرت محل کے مشیر ہونے کی حیثیت سے اپنی کارروائی کا اشارۃً بھی ذکر نہیں کیا جب کہ قیام دہلی کے بارے میں کئی باتیں کہہ گئے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی سرگرمیاں بوندی کی نسبت دہلی میں زیادہ تھیں۔

مسٹر چارلز کمبل جو ڈپٹی کمشنر اودھ اور بعد ہارڈ قائم مقام کمشنر خیرآباد نے 4 مارچ 1859ء کو فیصلہ صادر کرتے ہوئے لکھا: "بغاوت شروع ہونے کے وقت وہ الور میں ملازم تھا۔ یہاں سے دیدہ و دانستہ دہلی آیا اور اس

کے بعد وہ باغیوں اور بغاوت کے قدم بہ قدم چلتا رہا۔ ایسے شخص کو سخت ترین سزا ملنا چاہیے اور اسے خاص طور پر ہندوستان سے خارج کر دینا چاہیے۔"[۳۲]

اپیلوں اور کوششوں کے باوجود جلاوطنی کا فیصلہ بحال رہا اور علامہ کو کلکتہ سے فائر کوئین نامی جہاز میں سوار کر کے انڈیمان بھیج دیا گیا یہ جہاز 8 اکتوبر 1859ء کو پورٹ بلیئر پہنچا۔[۳۳]

فتوائے جہاد:

علامہ فضل حق خیرآبادی جنگ آزادی 1857ء کے مایہ ناز مجاہد تھے۔ یہ وہ تاریخی حقیقت ہے جسے روکھیں کیا جا سکتا۔ ایک عرصہ تک ان کے فتوائے جہاد میں شریک ہونے کو بطور کسی اختلاف کے تسلیم کیا جاتا رہا ہے۔ تقریباً جس نے بھی علامہ کا ذکر کیا ہے اس فتوے کا ضرور ذکر کیا ہے۔ مثلاً عبدالشاہد خاں شروانی نے "باغی ہندوستان" ص: ۱۵۶، مولوی حسین احمد مدنی نے "نقش حیات" جلد دوم ص: ۳۶، معتی انتظام اللہ شہابی نے "ایسٹ انڈیا کمپنی اور باغی علماء" اور "مولوی فضل حق خیرآبادی اور پہلی جنگ آزادی 1857ء" ص: ۳۷، غلام رسول مہر نے "انقلاب سو سال پہلے کے مجاہد" ص: ۳۰۶، پروفیسر محمد ایوب قادری نے "مولانا فیض احمد بدایونی" ص: ۳۰-۳۲، ڈاکٹر سید عبداللہ نے اپنے ایک مضمون "مولانا فضل حق خیرآبادی۔ سرگزشت اور افکار" سرگزشت خیر (ہفت روزہ زندگی شمارہ ۱۳ نومبر 1972ء) میں "مولانا عبدالسلام ہندوی نے "تذکرہ اسلام" جلد دوم ص: ۳۳۳ میں اور مولانا ابوسلیمان علی نے ماہنامہ معارف اعظم گڑھ (اکتوبر 1947ء) ص: ۲۳۳ میں وغیرہ

لیکن ماضی قریب میں بعض لوگوں نے علامہ کے فتوائے جہاد کا انکار کیا ہے اور کہا ہے کہ علامہ کا دہلی آمد 16 اگست 1857ء سے پہلے ثابت نہیں جب کہ فتوائے جہاد جولائی 1857ء کی ابتدا میں جاری کیا گیا تھا۔ نیز صادق الاخبار دہلی مورخہ 26 جولائی 1857ء بحوالہ اخبار النظر دہلی جو فتوی شائع ہوا تھا اس میں علامہ کے دستخط نہیں ہیں۔[۳۴]

حالانکہ اس دور کے تاریخی روزنامچوں سے 16 اگست 1857ء کو علامہ کی بہادر شاہ ظفر کے دربار میں موجودگی کا ثبوت ملتا ہے۔ اس سے یہ یقین کیسے پیدا ہو گیا کہ علامہ اس سے پہلے دہلی میں نہیں تھے؟ پھر اپنے دعوے کو ثابت کرنے کے لیے مخالفین کو یہ بات ثابت کرنا پڑے گا کہ دہلی سے صرف ایک ہی فتوی جاری ہوا تھا جس کی نقل صادق الاخبار میں چھپی تھی۔

علامہ کے مخالفین کا تعصب:

علامہ فضل حق خیرآبادی کے ساتھ یہ ظلم ہوا ہے کہ اول تو ان کی حیات پر بہت کم کام کیا گیا اور جو کچھ کیا گیا وہ بھی

WWW.NAFSEISLAM.COM

تحقیق سنی سنائی باتوں پر مشتمل تھا۔ بہت سی غلط روایات ان سے منسوب کر دی گئیں جیسا کہ "باغی ہندوستان" کے جستہ جستہ حواشی سے معلوم ہوگا۔

دوسری طرف بعض مؤرخین نے مذہبی مخالفت کی بناء پر ان پر رکیک حملے کیے اور ان کے بلند کردار کو مجروح کرنے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ جناب نادم سیتاپوری نے بجا کہا ہے: "مولانا فضل حق خیر آبادی گذشتہ انقلابی صدی کا وہ بدنصیب کردار ہے جسے دشمنوں سے زیادہ دوستوں نے نقصان پہنچایا۔ انگریزوں اور ان کے ہوا خواہوں تو مولانا سے اس لیے ناراض تھے کہ انقلاب ۱۸۵۷ء کے سلسلہ میں کسی نہ کسی نوع سے ان کا نام آ گیا تھا لیکن خود مسلمانوں کا ایک "پڑھا لکھا متمدن گروپ" مولانا سے اس لیے بیزار تھا کہ وہ ان کے مذہبی نظریات کے خلاف عالمانہ مجاہدہ کر چکے تھے۔ یہ باوقار علمی ہتھیار کوئی ذاتی اور عامیانہ جنگ نہیں تھی جس کا سہارا لے کر مولانا خیر آبادی کے خلاف ایک مستقل محاذ قائم کر دیا جاتا لیکن ہوا یہی کچھ۔

مولانا کے اکثر سیرت نگاروں نے نادانستہ نہیں دانستہ مولانا کی مدح اس انداز میں کی کہ خود "مدح" اور "ممدوح" سر بگریباں ہو گئے چنانچہ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ آج جب ریسرچ اور تحقیق کی نگاہیں تاریخ کے ان اوراق تک پہنچیں تو دنیا ہی بدلی ہوئی نظر آئی۔[۲۹]

مولانا امتیاز علی عرشی رامپوری کا ایک مقالہ "مولانا فضل حق خیر آبادی اور 1857ء کا فتوائے جہاد" ماہنامہ تحریک دہلی میں اگست 1957ء میں شائع ہوا جس میں انہوں نے علماء کے فتوائے جہاد جاری کرنے "حج کے سامنے اقرار جرم کرنے اور حج کے بادل ناخواستہ عمل دوام کا فیصلہ کرنے کا تنقیدی جائزہ لیا۔ اس ضمن میں انہوں نے نواب یوسف علی خاں والیٔ رامپور کے نام علماء کا ایک مکتوب نقل کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا پر تین الزام قائم کیے گئے تھے

1. نواب خان بہادر خاں نبیرۂ حافظ رحمت خاں بہادر نے جب انگریزوں کے خلاف بریلی میں بغاوت کی تو مولانا نے ان کا ساتھ دیا اور ان کی طرف سے نظامت پیلی بھیت کا کام انجام دیا۔
2. جب انگریزوں نے بریلی فتح کر لی تو مولانا یہاں سے بھاگ کر اودھ پہنچے اور خان علی خاں کی طرف سے ریاست محمدی کے پنکلہ دار (بندوبست) مقرر ہوئے۔
3. مولانا نے اس کے بعد ایک باغی لشکر کی کمان اپنے ہاتھ میں لی۔[۳۰]

اس مکتوب کو تسلیم کر لیا جائے تو ماننا پڑے گا کہ علامہ کا تحریک آزادی سے کوئی تعلق نہ تھا بلکہ ایک دوسرے شخص

فضل حق شاہجہانپوری کے شعبے میں انہیں اسیری اور جلاوطنی کے مصائب برداشت کرنے پڑے جیسا کہ مولانا عرشی نے بھی تاثر دینے کی کوشش کی ہے۔ اس سلسلے میں چند امور قابل توجہ ہیں:

❶ علامہ فضل حق خیرآبادی کا جنگ آزادی میں حصہ لینا مسلمات سے ہے لہٰذا اسے جھٹلانے کے لیے اس مکتوب کا عکس شائع کرنا ضروری تھا۔

❷ جناب مالک رام نے علامہ کے مقدمے کی کاروائی ماہنامہ تحریک دہلی کے شمارہ جون 1960ء میں شائع کرادی ہے اس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ علامہ پر مذکورہ بالا الزامات میں سے کوئی الزام بھی قائم نہیں کیا گیا بلکہ مخبروں کے بیانات سے ثابت ہونے والے الزامات کی بناء پر ان کی جلاوطنی کا حکم صادر کیا گیا جن کا تعلق بوندی (اودھ) کے ساتھ تھا۔ بریلی یا محمدی کے واقعات سے نہ تھا۔

❸ مولانا عرشی نے علامہ کے شریک فتوی نہ ہونے کے ضمن میں کہا ہے: ”مولانا نے علماء زہاد اور ائمہ اجتہاد کے فتوے دینے کا تو ذکر کیا ہے مگر اپنا حوالہ بالکل نہیں دیا اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اگر وہ شریک فتویٰ بھی ہوتے تو جیسا کہ آگے چل کر ارباب حکومت کو اپنے مشورے دینے کا تذکرہ فرماتے ہیں۔ یہاں بھی فتوے کی طرف کچھ نہ کچھ اشارہ ضرور کرتے“۔ ۲۷

اسی طرح یہاں بھی کہا جاسکتا ہے کہ اگر علامہ تحریک آزادی سے علیحدہ ہوتے اور ان کے خلاف تمام کاروائی محض اشتباہ کی وجہ سے ہوئی ہوتی تو علامہ اپنی نجی خود نوشت الثورۃ الہندیہ میں ضرور اپنی ”بے گناہی“ کا تذکرہ کرتے حالانکہ انہوں نے ایسا نہیں کیا بلکہ انہوں نے قید و بند کی دو وجہیں بیان کی ہیں۔

● انگریزوں کو اس بات کا علم تھا کہ میں ایمان و اسلام میں راسخ العقیدہ ہوں اور علامہ وقت ہونے کی حیثیت سے شہرت رکھتا ہوں۔ مجھے سزا دینے کا مقصد یہ تھا کہ علوم دین کے آثار کو صفحات کتب سے مٹا دیا جائے۔ ۲۸

● حاکم نصرانی کے سامنے دو مرتد، سخت دل دشمنوں (عبدالحکیم اور مرتضیٰ حسین) نے چغلی کھائی۔ وہ دونوں قرآن پاک کی اس آیت مبارک کے بارے میں جھگڑا کرتے تھے جس کا حکم ہے کہ نصاریٰ کا دوست بھی نصرانی ہے۔ ان دونوں کو نصاریٰ کی دوستی پر اصرار تھا چنانچہ انہوں نے ایمان کے بدلے کفر اپنا لیا۔ ۲۹

❹ علامہ کا اشتباہ کی بنا پر اسیر ہونا اس اعتبار سے بھی محل نظر ہے کہ علامہ کوئی معمولی آدمی نہ تھے، دہلی وغیرہ میں ممتاز عہدوں پر فائز رہے تھے۔ مسٹر جارج کیمبل اور مسٹر بارو نے اپنے فیصلے میں لکھا: ”ایک زمانے میں وہ خود بھی سرکاری ملازمت ترک کر کے اودھ، رام پور اور وغیرہ متعدد دیسی ریاستوں میں معقول عہدوں پر ممتاز رہا ہے۔

اس کی ہمیشہ بہت شہرت رہی ہے۔ جن گواہوں نے اسے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا وہ بھی مولوی فضل حق کا نام اکثر سنتے آئے تھے"۔ ۳۰

بلکہ یہ بھی لکھا کہ: "اس نے مقدمے کے دوران ایک موقع پر یہ صفائی پیش کی تھی کہ اودھ میں دو مشہور فضل حق ہیں۔ لیکن یہ بات صاف ہوگئی کہ وہ دوسرا شخص (فضل حق شاہجہانپوری) ضلع بریلی کا تحصیل دار رہا ہے اور پچھلے دنوں چکلہ دار باغیوں کا سرغنہ رہا ہے۔ لیکن ملزم (علامہ فضل حق خیرآبادی) تو کبھی صاحب سیف رہا ہی نہیں بلکہ اس کی ہمیشہ صاحب رائے و مشورہ کی حیثیت سے شہرت رہی ہے"۔ ۳۱

جناب ڈاکٹر محمد ریاض اپنے ایک مضمون میں مالک رام پر تنقید کرتے ہوئے لکھتے ہیں: "مولوی فضل حق کیا اتنا مسکین آدمی تھا کہ اسے کسی دوسرے شخص کے بدلے میں عمر قید کی سزا دی جاتی اور اس کا کوئی پرسان حال نہ ہوتا؟ شاید انہیں (مالک رام وغیرہ کو) یہ معلوم نہیں کہ اس کا چھوٹا بھائی سردار فضل الرحمٰن ریاست پٹیالہ کا وزیر تھا اور نواب والا جاہ بہادر آف کرناٹک اس کا عزیز قریب تھا اور نواب سید برکت علی خاں بہادر جو انگریز سرکار میں بڑا معتمد رتھا اس کا بھانجا تھا۔ کیا یہ سب حضرات اتنے سنگدل ہو گئے تھے کہ اپنے خاص اثرات خاندان کے ایک بزرگ کو بے گناہ ثابت کرنے کے لیے استعمال نہیں کر سکتے تھے؟ ۳۲

انگریز حکومت اگر چاہتی تو مقدمہ چلائے بغیر علامہ کو کوئی بھی سزا دے سکتی تھی لیکن اس نے ایسا نہیں کیا بلکہ تحقیق و تفتیش کے بعد عائد کردہ الزامات کے ثابت ہو جانے اور اشتباہ کے صاف ہو جانے پر فیصلہ صادر کیا۔ ان امور کی بناء پر مولانا عرشی کے نقل کردہ مکتوب کی اصلیت مشکوک ہو جاتی ہے۔

❺ مولانا عرشی رامپوری نے فتوائے جہاد پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے: "اس وقت کے حالات کو بنظر غائر دیکھا جائے تو یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ دستخط کرنے والوں میں کچھ اہل علم ایسے بھی تھے جو دل و جان سے انگریزی تسلط کے مخالف تھے اور انگریزوں کے خلاف جنگ کو ندہا ضروری جانتے تھے۔ اس لیے انہوں نے یہ فتویٰ مرتب کیا اور اپنے اختیار اور رضامندی سے دستخط کیے اور بقیہ نے مجبوراً توثیق کی۔ شکست کے بعد جان بچانے کی صرف یہی ایک تدبیر تھی کہ جبر کی پناہ لی جائے' اس بناء پر جس سے باز پرس ہوئی اس نے اپنی مجبوری کا اظہار کیا"۔ ۳۳

حافظ الملک حافظ رحمت خاں شہید کے پوتے نواب خان بہادر خاں شہید' جنگ آزادی 1857ء کے ممتاز مجاہدین میں شمار ہوتے ہیں۔ جناب سید مصطفیٰ علی بریلوی نے اپنی تالیف "نواب خان بہادر خاں شہید" (طبع آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کراچی) میں ان کے مجاہدانہ کارناموں کا تفصیلی جائزہ پیش کیا ہے اور تفصیلاً بیان کیا ہے کہ

نواب خان بہادر خاں نے کس طرح افواج کو منظم کیا اور کس طرح انگریزی افواج کے مقابل داد شجاعت دی اور کیونکر گرفتار ہو کر تختۂ دار پر چڑھائے گئے۔

لیکن جب خاں بہادر شہید پر مقدمہ چلایا گیا تو انہوں نے جنگ آزادی سے اپنی برأت کا اظہار کیا۔ جناب نادم سیتاپوری نے لاہور کے قدیم اخبار کوہ نور کی فائل سے نواب خان بہادر شہید کے مقدمہ کا ایک حصہ نقل کیا ہے۔ نواب صاحب نے اپنے بیان میں کہا ہے: ''جب تک باغی فوج بریلی رہی' کسی نے اطاعت نہیں کی اور میرے پاس فوج نہ تھی کہ ان کو شرارت سے باز رکھتا۔ میں نے کسی صاحب بہادر کے مارے جانے کا حکم نہیں دیا بلکہ میں نے ملک کو بدمعاشوں کی یورشوں سے بچانے کے واسطے کوششیں کیں۔ میں بے کس تھا اور انتظام شریروں کا نہ کر سکا۔ انہوں نے میرے حکم کو نہیں مانا بلکہ سب مرضی خود (پر) کاربند رہے۔ مجھ کو معلوم ہے کہ ایک اشتہار بھی در باب قتل صاحبان انگریزی کے جاری ہوا تھا۔ وہ کہتے تھے کہ فرنگی اب نہیں آئیں گے۔ جب میں نے آمد آمد انگریزوں کی سنی تو میں فوراً بریلی سے نکل گیا اور فوج انگریزی سے صف آرا نہیں ہوا'' ۔ ۳۴

کیا نواب صاحب کے بارے میں بھی یہ کہا جائے گا کہ انہوں نے پہلی جنگ آزادی میں کوئی حصہ نہیں لیا؟ اور اگر نواب خان بہادر شہید نے اپنی جان بچانے کی خاطر یہ بیان دیا تھا تو علامہ کے بارے میں یہی توجیہ کیوں قابل قبول نہیں ہو سکتی؟

⑥ رشید احمد گنگوہی کو بھی تحریک آزادی 1857ء کے مجاہدین میں شمار کیا جاتا ہے۔ اگرچہ اس بارے میں مستند مواد دستیاب نہیں ہو سکا لیکن ان کے معتقدین جوش عقیدت کی بنا پر انہیں صف مجاہدین میں شامل کرنے پر مُصر ہیں۔ غلام رسول مہر لکھتے ہیں: ''ان بزرگوں (مولانا رشید احمد گنگوہی اور مولانا محمد قاسم نانوتوی) نے بھی 1857ء کے جہاد آزادی میں حصہ لیا تھا۔ افسوس کہ صحیح تفصیلات آج تک معلوم نہ ہو سکیں'' ۔ ۳۵

جہاں تک ان کے سوانح نگار عاشق الٰہی میرٹھی کا بیان ہے اس سے قطعاً یہ پتہ نہیں چلتا کہ گنگوہی صاحب جنگ آزادی میں شریک تھے بلکہ ان کے بیان سے تو ''خیر خواہ سرکار'' ہونا معلوم ہوتا ہے۔ عاشق الٰہی جنگ آزادی کا نقشہ پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ''بدنصیب' بہادر شاہ ظفر بادشاہ دہلی کا وہ بلا خیز سماں تھا جس میں کار توسوں پر چربی لپیٹنے کی جھوٹی افواہ اڑی اور غدر برپا کرنے کے چھپے کھلے مجمعوں میں چرچے شروع ہوئے تھے۔ تباہ ہونے والی رعایا کی نحوست تقدیر نے ان کو جو کچھ سمجھایا اس کا انہوں نے نتیجہ دیکھا اور ان کی نسل دیکھ رہی ہے۔ جن کے سروں پر موت کھیل رہی تھی انہوں نے کمپنی کے امن وعافیت کے زمانہ قدر کی نظر سے نہ دیکھا اور اپنی رحمدل گورنمنٹ

کے سامنے بغاوت کا علم قائم کیا"۔ ۳۶

تحریک آزادی کا دور گزر گیا تو بعض لوگوں نے کسی مخاصمت کی بناء پر رشید گنگوہی اور قاسم نانوتوی کے "باغی" ہونے کی مخبری کر دی۔ جناب عاشق الٰہی کے الفاظ یہ ہیں: "جب بغاوت و فساد کا قصہ فرو ہوا اور رجمنٹ گورنمنٹ کی حکومت نے دوبارہ غلبہ پا کر باغیوں کی سرکوبی شروع کی تو جن بزدل مفسدوں کو سوائے اس کے اپنی رہائی کا کوئی چارہ نہ تھا کہ جھوٹی سچی تہمتوں اور مخبری کے پیشہ سے سرکاری خیر خواہ اپنے کو ظاہر کریں۔ انہوں نے اپنا رنگ جمایا اور ان گوشہ نشین حضرات پر بھی بغاوت کا الزام لگایا"۔ ۳۷

حالانکہ واقعہ یہ تھا کہ: "یہ حضرات حقیقۃً بے گناہ تھے مگر دشمنوں کی زیادہ گوئی ان کو باغی و مفسد اور مجرم و سرکاری خطاوار ظہار کھا تھا اس لیے گرفتاری کی حلاش تھی مگر حق تعالیٰ کی حفاظت برسر تھی اس لیے کوئی آنچ نہ آئی اور جیسا کہ آپ حضرات اپنی مہربان سرکار کے دلی خیر خواہ تھے تازیست خیر خواہ ہی ثابت رہے"۔ ۳۸

ان دنوں خوف و ہراس کی لہر ہر شخص کے رگ و پے میں سرایت کیے ہوئے تھی۔ رشید گنگوہی کو معلوم ہو گیا تھا کہ ان کا نام بھی قابل اخذ مجرموں کی فہرست میں درج ہو چکا ہے لیکن ان کی حالت یہ تھی کہ: "آپ کو وہ استقلال بنے ہوئے خدا کے حکم پر راضی تھے اور سمجھے ہوئے تھے کہ میں جب حقیقت میں سرکار کا فرمانبردار رہا ہوں تو جھوٹے الزام سے میرا بال بھی بیکا نہ ہوگا اور اگر مارا بھی گیا تو سرکار مالک ہے' اسے اختیار ہے جو چاہے کرے"۔ ۳۹

ایک دفعہ رشید گنگوہی' قاسم نانوتوی' حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی اور حافظ ضامن کہیں جا رہے تھے کہ باغیوں کا سامنا ہو گیا۔ پھر کیا ہوا جناب عاشق الٰہی کی زبانی سنیے: "یہ نیرو آزما حضرات اپنی سرکار کے مخالف باغیوں کے سامنے سے بھاگنے یا ہٹ جانے والا نہ تھا۔ اس لیے اٹل پہاڑ کی طرح پیر اجما کر ڈٹ گیا اور سرکار پر جاں نثاری کے لیے تیار ہو گیا"۔ ۴۰

رشید گنگوہی کو مظفر نگر کی عدالت میں پیش کیا گیا اور پوچھا گیا کہ تم نے مفسدوں کا ساتھ دیا اور فساد کیا تو انہوں نے کہا "ہمارا کام فساد کا نہیں' نہ ہم مفسدوں کے ساتھی۔" اس تحقیق کے بعد ثابت ہوا کہ انہیں بغاوت سے کوئی تعلق نہیں تو رہا کر دیے گئے۔

علامہ فضل حق خیر آبادی اور نواب خان بہادر خاں کے بارے میں تو کہا جا سکتا ہے کہ انہوں نے ظالم و جابر حاکم کے سامنے جان بچانے کی خاطر ایسی باتیں کہہ دیں جن سے پتہ چلتا تھا کہ ان کا تحریک آزادی سے کوئی تعلق نہیں لیکن رشید گنگوہی تو ظالم حاکم کے سامنے نہیں بلکہ اپنی جگہ یہ کہہ رہے ہیں "اگر مارا بھی گیا تو سرکار مالک ہے"۔

WWW.NAFSEISLAM.COM

ایسے ارشادات کے باوجود اگر رشید گنگوہی مجاہدین میں شامل ہیں تو علامہ فضل حق خیر آبادی کا کیا تصور ہے کہ انہیں یک قلم تحریک سے غیر متعلق قرار دیا جائے؟

رشید گنگوہی بے قصور ثابت ہونے تک چھ ماہ قید میں رہے۔ قاسم نانوتوی کے گرفتار ہونے کی نوبت ہی نہ آئی لیکن علامہ فضل حق خیر آبادی کے جلاوطن ہونے اور غریب الوطنی کی حالت میں انتہائی میں وصال فرمانے میں کسے شک ہو سکتا ہے؟ ان کا جہاد آزادی سے کسی قسم کا تعلق ثابت نہ بھی ہو تو ان کے شہید ہونے میں کوئی شک نہیں کیونکہ وہ ایک ظالم حکومت کے جور و تشدد کا شکار ہوئے اور جلاوطنی میں مالک حقیقی کے دربار میں حاضر ہو گئے۔

غالب کے مشہور محقق مالک رام نے علامہ فضل حق خیر آبادی کے مقدمہ کا فیصلہ اپنے مضمون میں ماہنامہ تحریک دہلی جون 1960ء میں پیش کیا ہے اور اس بنا پر کہ علامہ فتوائے دہلی میں شامل نہیں ہوئے (کیونکہ اس وقت وہ دہلی میں موجود ہی نہ) تھے اور انہوں نے ایک موقعہ پر یہ بیان دیا تھا کہ دوسرے شخص کے شبیہ کی بنا پر میرے خلاف کارروائی کی جا رہی ہے۔ ملاحظہ فرمائیں: "مولانا فضل حق مرحوم نے 1857ء کی تحریک میں واقعی کوئی حصہ نہیں لیا تھا۔ انہوں نے اس سے پہلے لوگوں کو جو تلقین بھی کی ہو (اور اس کی طرف انہوں نے ایک جگہ اشارہ بھی کیا ہے) لیکن جب یہ ہنگامہ شروع ہوا تو وہ عملاً اس سے الگ تھلگ رہے۔ نہ عملی پہلو سے اس میں شریک ہوئے نہ قولی لحاظ سے۔ انہوں نے نہ کوئی فتویٰ لکھا نہ تلوار اٹھائی"۔ [۳۲]

تحصیل ساہی کو کافی سمجھتے ہوئے اس جگہ جناب نادم بیتاپوری کی ایک عبارت نقل کرنے پر اکتفا کیا جاتا ہے وہ رقم طراز ہیں: "آج کی کئی ریسرچ نے تحقیقاتی زاویہ نگاہ سے کم اہم اور جذباتی نقطہ نظر سے زیادہ اس بات سے انکار کیا ہے کہ مولانا خیر آبادی نے اس جنگ آزادی میں کسی قسم کا حصہ لیا ہے۔ اس سلسلہ میں کئی مضامین سامنے آچکے ہیں جن کی نامناسب اور محققانہ اصلیت فروگذاشت کے اعتراف کے باوجود میں اپنے آپ کو اس زاویہ نگاہ سے متفق نہیں کر سکا"۔ [۳۳]

جیسا کہ ہم پہلے عرض کر چکے ہیں علامہ فضل حق خیر آبادی کے مجاہدانہ کارناموں کا سب سے زیادہ مستند ماخذ علامہ کا عربی رسالہ الثورۃ الہندیہ اور تصانیف ہیبۃ الہند ہیں۔ جناب نادم بیتاپوری نے انہیں مفلوک قرار دیا ہے چنانچہ لکھتے ہیں: "جس زمانے میں کوئلہ اور پنسل کے لکھے ہوئے یہ منتشر پرچے شمس العلماء مولوی عبدالحق کو پہنچے تو اس زمانے میں وہ اپنے بوڑھے باپ کی رہائی کے لیے کوشاں تھے۔ اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ یہ منتشر پرچے ایک سیاسی قیدی کے ساتھ صحیح وسلامت حالت میں جزائر انڈمان سے ہندوستان کے ساحل تک پہنچ گئے

تو بھی یہ بات قرین قیاس نہیں ہے کہ ان کی ترتیب وتدوین کے وقت شمس العلماء مولوی عبدالحق نے اس بات کو نظر انداز کر دیا ہو کہ یہ اوراق اگر حکومت ہند تک پہنچ گئے تو مولانا کی رہائی دشوار ہی نہیں محال ہو جائے گی۔ ایسی صورت میں اس کا قوی امکان ہے کہ ان کتابوں میں کچھ نہ کچھ تحریف ضرور کی گئی۔ وہ تحریف یا ترمیم یا اضافہ کیا تھا ؟ اس کے بارے میں قطعی طور پر تو کوئی بات کہی نہیں جا سکتی لیکن روایت بالا (کہ رسالہ اور قصائد مختلف پرزوں پر کوئلے سے لکھے ہوئے تھے) کی روشنی میں انہیں محترمہ ایوب قادری کی تصنیف سمجھنا ایک حل طلب معمہ ضرور ہے"۔ ص ۳۳

پروفیسر محمد ایوب قادری نے اس روایت کی تردید کی ہے کہ رسالہ اور قصائد کوئلے سے مختلف پرزوں پر لکھے ہوئے تھے کہ "از اظہار الظمان کور کھمبار میں دفتر تمام ہو چکا تھا۔ اسکول کھل چکا تھا اور عدالتی کارروائیاں جاری تھیں۔ وہاں کے انگریز حکام کی اجازت سے تصنیف وتالیف کا کام جاری تھا تو پھر کوئلے سے لکھنے کا کیا قرینہ؟ اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے نادم بیتاپوری کی تشکیک کا محاسبہ کیا ہے ذیل میں اس کا خلاصہ پیش کیا جاتا ہے۔

❶ داخلی یا خارجی شواہد پیش کیے بغیر محض ظن وتخمین سے قصائد کو مشکوک قرار دینا درست نہیں ہے۔

❷ مولانا مفتی عنایت احمد کاکوروی اظہار سے رہا ہو کر آئے تو اپنے ساتھ اپنی تین کتابیں لائے جن میں سے تواریخ حبیب الہ اور علم الصیغہ شائع ہو کر مقبول عام ہوئیں۔ جب یہ تین کتابیں بحفاظت پہنچ گئیں تو رسالہ اور قصائد کے پہنچنے سے کیا مانع تھا؟

❸ 1277ھ میں مفتی عنایت احمد کاکوروی رہا ہو کر آئے۔ ایک دو ماہ بعد رسالہ اور قصائد مولانا کو پہنچے ہوں گے۔ 12 صفر 1278ھ کو علامہ فضل حق کا وصال ہو جاتا ہے۔ اس لیے یہ بات قرین قیاس ہے کہ مولانا عبدالحق نے علامہ کے وصال کے بعد رسالہ وقصائد کی طرف توجہ دی ہوگی لہٰذا علامہ کی رہائی کے لیے کوشش ان کی ترتیب سے مانع نہ ہوئی ہوگی۔

❹ یہ رسالہ اور قصائد مولانا عبدالحق کی ذمہ داری میں شائع نہیں ہوئے لہٰذا حکومت کے خوف کی بناء پر تحریف وترمیم کی ضرورت ہی نہیں پڑی۔

❺ رسالہ وقصائد میں حکومت برطانیہ پر سخت تنقید کی گئی ہے۔ اگر حکومت کے خوف سے ترمیم کی گئی ہوتی تو لب ولہجہ نرم ہوتا۔ ص ۳۵

وصال پُر ملال:

آخر خاتم الحکماء سجاد جلیل مولانا فضل حق خیرآبادی نے ایک سال نو ماہ انیس دن جزیرۂ انڈمان میں سیاسی

قیدی رہ کر 12 صفر 20 اگست 1278ھ/1861ء کو جام شہادت نوش کیا۔ رحمہ اللہ تعالیٰ وارضاہ عنا۔

خان بہادر سید مسعود حسن مسعود نے تاریخ وفات کہی:

عامل تھے حضرت فضل حق	کردیا نیرنگ نے بیحال
اہلمن کو لے گئی قید فرنگ	ہوگیا آخر وہیں پہ انتقال
سال ہے مسعود "بے ہادیٔ ہند"	فضل حق خیر آبادی باکمال!

۱۸۶۱ء

مولانا محمد سعید حسرت (م 1304ھ) حفید مولانا نذر محمد بلوری خلیفہ سید احمد بریلوی نے عربی میں قطعۂ تاریخ لکھا:

قد توفی الالہ فضل الحق	عالماً جذباً بلا ریب
ان نفساء الولاۃ من بلدہ	بجفاء قلبس من عجب
قال تاریخہ "لا ترکہ	فضل حق" ھو الف الغیب

۱۲۷۸ھ

اسی طرح مادۂ مذکورہ کی فارسی میں تضمین کی ہے

مولوی فضل حق چو رحلت کرد	جنتی گفت، لیست ریب مرا
گفت تاریخ "لا ترکہ	فضل حق" مرواں طبیب مرا

۱۲۷۸ھ

شاہ اسماعیل دہلوی کی تحریک:

جناب عبدالشاہد خاں شروانی علامہ فضل حق کے سلسلۂ تلامذہ میں ہونے کی وجہ سے علامہ سے گہرا لگاؤ رکھتے ہیں۔ اس کے ساتھ شاہ اسماعیل دہلوی جن کے خلاف علامہ نے تمام عمر علمی اور قلمی جہاد کیا ان سے بھی نیاز مندانہ تعلق خاطر رکھتے ہیں۔ وہ علامہ کے مسلک کو ترجیح دینے کے ساتھ چاہتے ہیں کہ شاہ اسماعیل کا دامن عقیدت بھی ہاتھ سے نہ چھوٹے، اسی لیے انہوں نے جابجا یہ تاثر دینے کی کوشش کی ہے کہ ان حضرات کا اختلاف صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے مشاجرات کی طرح تھا اور یہ اختلاف علمی اور فروعی نوعیت کا حامل تھا۔ حالانکہ فریقین کی تصانیف کے مطالعہ سے ہر انصاف پسند اس نتیجہ پر پہنچے گا کہ یہ اختلاف صرف علمی نہیں بلکہ اصولی اور اعتقادی تھا اور ایسے اختلاف کے ہوتے ہوئے ہر دو طریق کو حق پر نہیں کہا جاسکتا۔ جناب عبدالشاہد بھی مانتے ہیں کہ شاہ اسماعیل

نے غلو اور تشدد سے کام لیا اور تقویۃ الایمان میں ان امور کو جو شرک خفی تھے جلی لکھ دیا ۲۹ اور ان تحریرات سے متوقع شور و شر کے بارے میں یہ کہہ کر دل کو تسلی دے لی کہ: "گو اس سے شورش ہوگی مگر توقع ہے کہ لوگ سمجھ کر خود ٹھیک ہو جائیں گے"۔ ۵۰

تقویۃ الایمان کا منظر عام پر آنا تھا کہ واقعی زبردست اختلاف پیدا ہو گیا اور سواد اعظم اہل سنت کی طرف سے دسیوں کتابیں اور اس کے رد میں لکھی گئیں۔ اس کتاب نے اختلاف و انتشار کا ایسا دروازہ کھولا کہ "شورش" بھی ہوئی "لڑائی بھڑائی" بھی ہوئی مگر ٹھیک ہونے کا مرحلہ شاید صبح قیامت تک نہ آ سکے۔

اسماعیل دہلوی نے تقویۃ الایمان میں شفاعت کی تین قسمیں بیان کیں ❶ شفاعت وجاہت ❷ شفاعت محبت ❸ شفاعت بالاذن اور پہلی دو قسموں کا بڑی شدومد سے انکار کیا ۵۱ کسی نے یہ عبارت نقل کر کے علامہ فضل حق خیرآبادی کی خدمت میں استفتاء پیش کیا اور پوچھا یہ کلام حق ہے یا باطل؟ اس میں سید عالم ﷺ کی شان اقدس کا انتقاص ہے یا نہیں؟ اور اس کے قائل کا کیا حکم ہے؟

علامہ نے اس کے جواب میں ایک ضخیم کتاب "تحقیق الفتوی فی ابطال الطغوی" لکھی اور اسے چار مقامات پر تقسیم کیا۔ آخر کتاب میں قائل کا حکم بیان کرتے ہوئے فرمایا "جواب سوال ثالث این است کہ قائل این کلام ازروئے شرع متین بلاشبہ کافر و بے دین است ہر گز مومن و مسلمان نیست و حکم او شرعاً قتل و تکفیر است"۔ ۵۲

ترجمہ: تیسرے سوال کا جواب یہ ہے کہ اس بارے کلام کا قائل ازروئے شریعت کافر و بددین ہے۔ وہ ہرگز مومن اور مسلمان نہیں ہے اس کا شرعی حکم قتل اور تکفیر ہے۔

علامہ کا یہ نظریہ تھا تبھی تو جب اسیری الفان جاتے ہوئے اپنے شاگرد مولانا فقندھلی زبیری کو خاص طور پر نصیحت کی کہ میری تقویۃ الایمان کا ایسا تعاقب رہے جس سے یہ کتاب اس طرح سر انجام دیا۔ ایسے حالات میں یہ کس طرح مان لیا جائے کہ علامہ نے ایک موقعہ پر فرمایا "میں بھی بہکائے سکھائے سے ہوا تھا اور اب تو وہ بھی نہیں ہو سکتا"۔ ۵۳

ایک اور جگہ لکھا ہے کہ "اسماعیل دہلوی کی شہادت کی خبر پہنچی تو سنانے کے عالم میں کئی گھنٹے خاموش بیٹھے روتے رہے اور اس کے بعد فرمایا کہ اسماعیل کو ہم مولوی نہیں جانتے تھے بلکہ وہ امت محمدیہ کا حکیم تھا۔ کوئی شے نہ تھی جس کی کیفیت اور لیاقت اس کے ذہن میں نہ ہو۔ امام رازی نے اگر علم حاصل کیا تو دو چراغ تھا کر اور اسماعیل نے محض اپنی قابلیت اور استعداد خداداد سے"۔ ۵۴

ایسی خود ساختہ حکایات کو خوش عقیدگی کا نتیجہ ہی قرار دیا جاسکتا ہے ورنہ حقیقت سے انہیں دور کا بھی واسطہ نہیں ہے۔ اس بحث میں اسماعیل دہلوی نے یہ بھی کہہ دیا: ''اس شہنشاہ کی تو یہ شان ہے کہ ایک آن میں ایک حکم کُن سے چاہے تو کروڑوں نبی اور ولی اور جن اور فرشتہ' جبریل اور محمد ﷺ کے برابر پیدا کرا دے''۔ ۵۶ علامہ نے اس پر گرفت کی اور فرمایا: ''باید دانست کہ ایں کلام ناتمام کاذب وورو غ وگزاف بے فروغ است''۔ ۵۷ اور شرح وبسط سے اس پر تنقید کی اور بتایا کہ اوصاف کاملہ میں حضرت خاتم النبیین ﷺ کی نظیر بالذات ناممکن ہے۔ اس کا جواب دینے کی کوشش کی گئی تو علامہ نے اصداع النظیر ایسی محققانہ کتاب لکھی جو آج تک لاجواب ہے۔

علامہ ارشد القادری مدظلہ نے اپنی قابل قدر کتاب ''زلزلہ'' میں علماء دیوبند کا کفری تضاد جس حسن وخوبی سے بیان کیا ہے لائق داد ہے۔ اس میں انہوں نے تقویۃ الایمان وغیرہ کتب سے ایسے حوالے پیش کیے ہیں جن سے سرور دو عالم ﷺ کے تصرف اور علم غیب کے انکار کا پتہ چلتا ہے۔ دوسری طرف دیوبندی لٹریچر سے ایسے اقتباس پیش کیے ہیں جن میں اکابر دیوبند کے علوم غیبیہ اور شان تصرف کو نمایاں کر کے بیان کیا ہے۔

زلزلہ کی وقعت کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ مولانا عامر عثمانی نے ماہنامہ تجلی دیوبند میں تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے: ''ہمارے نزدیک جان چھڑانے کی ایک ہی راہ ہے کہ یا تو تقویۃ الایمان اور فتاوی رشیدیہ اور فتاوی امدادیہ اور حفظ الایمان جیسی کتابوں کو چولہے پر رکھ کر آگ دے دی جائے اور صاف اعلان کر دیا جائے کہ ان کے مندرجات قرآن وسنت کے خلاف ہیں اور ہمدیوبندیوں کے صحیح عقائد اراح الخلائق اور سوانح قاسمی اور اشرف السوانح جیسی کتابوں سے معلوم کرنے چاہئیں یا پھر ان مؤثر الذکر کتابوں کے بارے میں اعلان فرمایا جائے کہ یہ تو محض قصے کہانیوں کی کتابیں ہیں جو مطلب وہ اپنی سے لکھ دیئے ہیں اور ہمارے صحیح عقائد وہی ہیں جو اول الذکر کتابوں میں مندرج ہیں۔ ۵۸

سید احمد اور اسماعیل دہلوی صوبہ سرحد میں:

جناب عبد الشاہد شروانی نے باغی ہندوستان میں جا بجا مولوی اسماعیل دہلوی کے جہاد بالاکوٹ کا ذکر کیا ہے اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ صوبہ سرحد کی کاروائی کا مختصر جائزہ پیش کر دیا جائے۔ رشید احمد گنگوہی کا بیان ہے کہ: ''سید صاحب نے پہلا جہاد یار محمد خاں حاکم یاغستان سے کیا تھا''۔ ۵۹

اس جہاد کا نتیجہ خاطر خواہ نکلا' پشاور اور کوہاٹ قبضے میں آگئے۔ سید مراد علی شمس سرحد چوکی ورسک (ہزارہ) لکھتے

ہیں: "راویان معتبر پر چشم دید نقل کرتے ہیں کہ 1830ء میں خلیفہ سید احمد سرگروہ وہابیاں نے یار محمد حاکم پشاور و کوہاٹ، برادر دوست محمد خاں والی کابل کو بہ پشت گرمی لشکر خانیاں شکست دی اور ملک پشاور و کوہاٹ پر قبضہ کر کے اپنے تھانہ جات مقرر کیے اور بہ لقب سید بادشاہ مشہور ہوا"۔ [10]

اس کے بعد فتح خاں رئیس پنجتار اور پال قوم کے سربلند خاں وغیرہ سید صاحب کے مرید ہو گئے لیکن اپنے دور کے مشہور بامت سردار پایندہ خاں نے بیعت نہ کی۔ سید صاحب اور اسماعیل دہلوی نے بمقام عشرا ان سے ملاقات کی اور بیعت کی دعوت دی لیکن وہ تیار نہ ہوئے۔ اسی اثناء میں سردار پایندہ خاں کا چھوٹا بھائی سردار مدد خاں سید صاحب سے بیعت ہو اور کہا کہ میرا بھائی میرا جانی دشمن ہے۔ میں اس کے ہاتھوں بہت پریشان ہوں۔ سید صاحب نے اسے تسلی دی اور پایندہ خاں پر کفر کا فتویٰ لگا دیا (اس لیے کہ وہ بیعت نہیں ہوا تھا) اور اس سے جہاد کرنے کے لیے پختہ سے موضع کنیر ڈی پہنچ گئے۔ پایندہ خاں کو پتہ چلا تو وہ بھی مقابل آ کر صف آراء ہو گیا۔ سخت کشت وخون کے بعد پایندہ خان کو شکست ہو گئی اور وہ جان بچا کر موضع باندی سے ہوتا ہوا موضع شمد بڑہ (علاقہ اگرور) چلا گیا۔

سردار پایندہ خاں اس سے پہلے بھی سکھوں سے لڑتے پٹتا تھا اور اس کے بعد بھی ان سے برسرپیکار رہا لیکن اس وقت اسے اپنی حفاظت کی یہی صورت نظر آئی کہ ہری سنگھ سے امداد کی اپیل کی جائے جو اس وقت مانسہرہ میں مقیم تھا۔ ہری سنگھ نے امداد دینے کے لیے یہ شرط عائد کر دی کہ تمہیں اپنا لڑکا جہانداد خاں بطور ضمانت میرے سپرد کرنا ہو گا تاکہ تم میرے خلاف کارروائی نہ کر سکو۔ پایندہ خاں نے اس شرط کو منظور کر لیا اور سکھوں کی دو پلٹن فوج لے کر ہشنغر کی طرف روانہ ہوا۔ دریائے سرن کے راستے پر سید صاحب کے بھانجے مولوی اسمٰعیل اور اس کے ساتھیوں نے مزاحمت کی۔ میدان کارزار گرم ہوا اور یہ ہنگامہ سکھ مارے گئے۔ مولوی اسمٰعیل اور (چند ایک کے سوا) ان کے تمام ساتھی مارے گئے۔ اس کے علاوہ موضع پنجتار کی میں مقابلہ ہوا اور سید صاحب کے رفقاء کو شکست فاش ہوئی اس کے بعد سید صاحب پلٹتار چلے گئے۔ [11]

اس طرح پایندہ خان کی جان بھی بچ گئی اور علاقہ بھی خالی ہو گیا لیکن ہری سنگھ نے حسب وعدہ اس کا لڑکا جہانداد واپس نہ کیا۔ وہ چاہتا تھا کہ پایندہ خاں خود آ کر اپنے بیٹے کی رہائی کے لیے التجا کرے لیکن پایندہ خاں کسی صورت بھی ملاقات پر آمادہ نہ ہوا کیونکہ اس کے باپ کی وصیت تھی کہ کسی حاکم سے نہ ملنا۔ اس سلسلے میں اسے سکھوں سے نبرد آزما ہونا پڑا اور جا بجا مسلسل معرکے ہوئے، ہری سنگھ نے جہانداد کو رنجیت سنگھ کے پاس لاہور بھیجا دیا

جہاں سے سات سال بعد اس کی واپسی ہوئی۔ ۶۲ اس جگہ یہ بات قابل ذکر ہے کہ سردار پائندہ خاں تمام عمر سکھوں سے برسرپیکار رہا اور بالآخر 1257ھ/1840ء میں فوت ہوا۔ ۶۳

اس تفصیل سے یہ واضح ہو گیا کہ سید صاحب مسلمانوں سے بھی شمشیر بکف ہوتے رہے اور انہیں مجبور کر دیا کہ وہ سکھوں کی امداد حاصل کریں اور سرحد میں سید صاحب کی ناکامی کی بڑی وجہ وہابیانہ عقائد ہے جو تشدد اور بات بات پر کفر کے فتوے تھے کیونکہ سرحد کے اکثر باشندے سنی 'حنفی' دیوبندی' بہادر اور غیرت مند تھے۔ اگر تشدد اور وہابیت ایسے امور درمیان میں حائل نہ ہوتے تو شاید سید صاحب کو کبھی ناکامی کا منہ نہ دیکھنا پڑتا۔ بالآخر مولوی اسماعیل دہلوی اور سید صاحب 1246ھ/1831ء میں قلعہ بالاکوٹ کے قریب معرکے میں کام آئے اور عقیدت مندوں نے شہید مشہور کر دیا۔ اس میں شک نہیں کہ سید صاحب نے سرحدی مسلمانوں کے علاوہ سکھوں سے بھی لڑائی کی مگر یہ بات ابھی بحث تحقیق ہے کہ وہ کسی سکھ کے ہاتھوں مارے گئے یا کسی سرحدی پٹھان کے ہاتھوں؟؟؟

سرسید لکھتے ہیں: "1824ء میں وہابیوں نے پہاڑوں میں جا کر قیام کیا اور انہوں نے اس بات کا قصد کیا کہ سکھوں پر ہم لوگ جہاد کریں اور شہید ہوں۔ لیکن چونکہ پہاڑی قومیں ان کے عقائد کے مخالف تھیں اس لیے وہ وہابی ان پہاڑیوں کو ہرگز اس بات پر راضی نہ کر سکے کہ وہ ان کے مسائل کو بھی اچھا سمجھتے ہیں۔

مگر چونکہ وہ سکھوں کے وجود ستم سے نہایت تنگ تھے اس سبب سے وہابیوں کے اس مقصد میں بھی شریک ہو گئے کہ سکھوں پر حملہ کیا جاوے اور آخر کار وہابیوں اور پہاڑیوں نے متفق ہو کر سکھوں پر حملہ بھی کیا لیکن چونکہ وہ قوم مذہبی مخالفت میں نہایت سخت ہے اس سبب سے اس قوم نے آخیر میں وہابیوں سے دغا کر کے سکھوں سے اتفاق کر لیا اور مولوی محمد اسماعیل اور سید احمد صاحب کو شہید کیا"۔ ۶۴

جناب یوسف حسین خاں کا کہنا ہے کہ "سید احمد سکھوں کے خلاف لڑتے ہوئے شہید ہو گئے۔ وہ لکھتے ہیں: "اسماعیل شہید جیسے لوگ سرے کٹن بادہ کر لوگوں کو سکھوں کے عذاب سے نجات دلانے آئے اور مسلمانوں کے ہاتھوں ہی سے شہید ہو کر خالق حقیقی سے جا ملے"۔ ۶۵

سید احمد کی تحریک کا پس منظر:

سید صاحب کی تحریک کا پس منظر معلوم کرنے کے لیے حسین احمد دیوبندی کی عبارت کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو، وہ لکھتے ہیں: "سید صاحب کا اصل مقصد چونکہ ہندوستان سے انگریزی تسلط اور اقتدار کا قلع قمع کرنا تھا جس کے باعث ہندو اور مسلمان دونوں ہی پریشان تھے۔ اس بنا پر آپ نے اپنے ساتھ ہندوؤں کو بھی شرکت کی دعوت دی

WWW.NAFSEISLAM.COM

اور صاف صاف انہیں بتا دیا کہ آپ کا واحد مقصد ملک سے بدیسی لوگوں کا اقتدار ختم کرنا ہے اس کے بعد حکومت کس کی ہوگی؟ اس سے آپ کو غرض نہیں ہے۔ جو لوگ حکومت کے اہل ہوں گے ہندو یا مسلمان یا دونوں وہ حکومت کریں گے"۔ [۶]

مولانا عامر عثمانی نے ماہنامہ تجلی دیوبند میں اس پر یوں تبصرہ کیا ہے: "کوئی شک نہیں اگر استاذ محترم حضرت مدنی کے ارشاد گرامی کو درست مان لیا جائے تو حضرت اسماعیل کی شہادت محض نسانہ بن جاتی ہے۔ مادی پریشانیوں کو رفع کرنے کے لیے غیر ملکی حکومت کے خاتمے کی کوشش کرنا ذرا بھی مقدس نصب العین نہیں اس نصب العین میں کافر و مومن سب یکساں ہیں۔ اس طرح کی کوشش کے دوران اگر جان چلی جائے تو شہادت سے بھلا کیا تعلق رکھے گا جو اسلام کی ایک معزز ترین اصطلاح ہے اور اس طرح کی کوششوں کے نتیجہ میں فتنہ و فساد کی صعوبتیں اٹھانا آخرت کا موجب کیوں ہوگا؟" [۷]

وضع احادیث:

سید صاحب کے مریدین کو عقیدت میں اس قدر غالی بنا دیا گیا تھا کہ وہ ہر جائز اور ناجائز طریقے سے سید صاحب کی مدح و ثنا کرنے کے خوگر ہو گئے تھے۔ یہ سلسلہ یہاں تک پہنچا کہ من گھڑت روایات کو نبی اکرم ﷺ کی طرف منسوب کرنے میں بھی کوئی جھجک محسوس نہیں کرتے تھے۔

مشہور اہل حدیث عنایت اللہ اثری "غلام رسول مہر کے نام ایک مکتوب میں لکھتے ہیں: "آپ (مولوی فضل الٰہی) نے اس جماعت کا شائع کردہ رسالہ یہ مضامین مجھے دکھایا جس میں یہ حدیث تھی کہ (اذا مضت الف وماتان وارتحون سنة بعث الله المهدي فيبايع على يده خلق كثير ثم يغيب الله تعالى فيرتدون الى دين اباءهم الامن اتبع كتاب الله وسنة نبيه) ۱۲۴۰ھ ترجمہ: 1240ھ گزرنے پر اللہ تعالیٰ مہدی کو بھیجے گا جس کے ہاتھوں پر مخلوق کثیر بیعت ہوگی پھر اللہ تعالیٰ اسے غائب کر دے گا تو لوگ اپنے آبا کے دین کی طرف لوٹ جائیں گے سوائے کتاب و سنت کے متبعین کے۔

چونکہ اس وقت لاہور پر سکھ حکمران تھے اس لیے روایت سابقہ پر استغاثہ کرتے ہوئے ایک روایت میں یہ بھی بڑھا دیا (فيقاتل كفرة لاهور) [۹]

عنایت اللہ اثری نے اس روایت کے بارے میں کچھ اس طرح اظہار خیال کیا ہے: "یہ روایت کسی حدیث کی کتاب میں بھی نہیں دیکھی بلکہ جو ذخیرہ موضوعات کے نام سے علماء کرام نے جمع فرمایا ہے یہ روایت اس

میں بھی نہیں' معلوم ہوتا ہے کہ سید صاحب کی شہادت کے بعد اسے وضع کیا گیا ہے"۔ ۴۰ھ

مولانا ابوالکلام آزاد:

جناب عبدالشاہد خاں شروانی نے ابوالکلام آزاد کی مدح سرائی میں بھی بڑے سہارے سے کام لیا ہے اور آزاد کو علامہ کے ہمسر کی حیثیت سے پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ حالانکہ علامہ فضل حق خیرآبادی نے جو نظریہ ابتداء قائم کیا تھا تا حیات اس پر قائم رہے جب کہ ابوالکلام آزاد ابتداء میں بڑے زور سے مسلمانوں کی انفرادیت کا پرچار کرتے اور فرمایا کرتے تھے۔ "مسلمانوں کے لیے اس سے بڑھ کر کوئی شرم اگر یہ سوال نہیں ہو سکتا کہ وہ دوسروں کی پولیٹیکل تقلیدوں کو آگے جھک کر نیا راستہ پیدا کریں ان کو کسی جماعت میں شامل ہونے کی ضرورت نہیں وہ خود دنیا کو اپنی راہ پر چلانے والے ہیں اور صدیوں تک چلا چکے ہیں۔ وہ خدا کی جماعت ہیں اور خدا کی غیرت اس کو کبھی گوارا نہیں کر سکتی کہ اس کی چوکھٹ پر جھکنے والوں کے سر غیروں کے آگے جھکیں"۔ ۱۔ھ

یہ بھی فرمایا: "ہم تو خود مسلمانوں کی سب سے بڑی غلطی سمجھتے ہیں کہ بہت انہوں نے اپنے سامنے دوسروں کو ہی دیکھے ہیں یا گورنمنٹ پر اعتماد اور یا ہندوؤں اور کانگریس کی شرکت"۔ ۲۔ھ

لیکن خود آزاد ایک طرف شاہ برطانیہ کی تاجپوشی کے موقعہ پر یوں قصیدہ خوان نظر آتے ہیں:

ہوئی لندن میں از فضل الٰہی نہایت شان سے جب تاجپوشی
کہا آزاد نے بہر کرب سے مبارک شاہ کو اب تاجپوشی

۱۳۴۰ھ

اسی موقعہ پر ایک طویل قصیدے کے آخر میں یوں دعا گو ہیں:

دمبدم بعد ازیں آہی کاے لب قدسیاں گوید آمین
باشد بہ ادب قیام شاہی باصولت و رعب و جاہی

دوسری جانب جب ہندو نوازی کا دور شروع ہوا تو بڑے زور سے مسلمانوں کو کانگریس میں شریک ہونے کی تلقین کی۔ چنانچہ ایک بیان میں کہا: "مسلمانوں کو اپنے (حقوق) کے تحفظات کے لیے گورنمنٹ برطانیہ کی طرف نہیں دیکھنا چاہیے انہیں برادران وطن (ہندوؤں) کی طرف دیکھنا چاہیے۔ ان سے بدگمان نہیں رہنا چاہیے۔ بلکہ جوق در جوق کانگریس میں شریک ہو جانا چاہیے کہ کانگریس کے ہاتھوں میں ان کے حقوق بالکل محفوظ ہیں" ۵۔ھ

علماء اہل سنت نے جب انہیں "ہندو مسلم اتحاد" کی خرابیوں سے مطلع کیا تو وقتی اقرار کے باوجود اپنی روش میں

تبدیلی پیدا نہ کی جس کی کچھ تفصیل تحفہ میں پیش کی جا رہی ہے۔ ایک وقت وہ تھا جب آزاد پوری کی پوری ملت اسلامیہ کو جسم واحد قرار دیتے تھے اور ایک وہ وقت بھی آیا کہ مشرقی اور مغربی پاکستان کی وحدت کو صحیح نہیں مانتے تھے بلکہ یہاں تک کہہ گئے: "یہ کہنا کہ مذہبی ہم آہنگی ان علاقوں کو جو جغرافیائی، اقتصادی، لسانی اور تمدنی طور پر مختلف ہیں متحد کر سکتی ہے۔ لوگوں کے ساتھ سب سے بڑا فریب ہے۔ یہ صحیح ہے کہ اسلام نے ایک ایسے معاشرے کی تشکیل کی کوشش کی جو نسلی، لسانی، اقتصادی اور سیاسی حدود سے بالا تر ہو لیکن تاریخ نے ثابت کر دیا کہ پہلے چند قرنوں یا زیادہ سے زیادہ پہلی صدی کے بعد اسلام صرف اسلام کی بناء پر تمام مسلم ممالک کو ایک اسٹیٹ میں منسلک کرنے میں ناکام رہا"۔ ۶ے

اس اقتباس کو پڑھ کر بے ساختہ کہنا پڑتا ہے کہ ابوالکلام آزاد کے دل و دماغ پر گاندھی پرستی کا اس قدر غلبہ ہو گیا تھا کہ وہ صرف برائے نام مسلمان رہ گئے تھے ورنہ وہ اس طرح بے دھڑک ہو کر اسلام کو ناکام قرار دینے کی جرأت نہ کرتے۔ اکبر الہ آبادی نے کہا تھا:

کانگریس کے سبھا کی کیا پوچھتے ہو کیا ہے گاندھی کی پالیسی کا عربی میں ترجمہ ہے

ابوالکلام آزاد نظریۂ پاکستان کے ان مخالفین میں سے تھے جنہوں نے کبھی اس نظریہ کو دل سے قبول نہیں کیا۔ انتخاب صدارت کے بعد صاف لفظوں میں اعلان کیا: "جناح کا یہ نظریہ کہ ہندوستان میں (ہندو اور مسلمان) دو جداگانہ اقوام ہیں غلط بھی پڑتی ہے۔ میں اس بات میں ان سے متفق نہیں ہوں"۔ ۷ے

رئیس احمد جعفری لکھتے ہیں: "مظہر عام پر وہ (ابوالکلام) اس طرح ابھرے کہ معروف اور نجی معنی المنکر کا رجز ان کی زبان پر تھا لیکن سی آر داس کی رقابت، گاندھی کی نیاز مندی، موتی لال کی دوستی اور جواہر سے تعلق خاطر نے انہیں انقلاب دلا کر وہ مسلمانوں کے جن خود ساختہ لیڈروں کے قائل نہیں تھے۔ انہی میں جب جواہر لال نہرو اور گاندھی تک چار و ناچار تقسیم ہند یعنی مطالبۂ پاکستان تسلیم کر لینے پر مجبور ہو گئے۔ مولانا تب بھی اپنے رفیقوں سے دلی طور پر متفق نہ ہو سکے۔ تحریک پاکستان کے راستے میں جو سنگ گراں حائل تھے ان میں ایک مولانا (ابوالکلام) بھی تھے۔ انہوں نے ہر موقعہ پر پاکستان کے تصور اور مطالبے کی مخالفت کی"۔ ۸ے

﴿حوالہ جات﴾

۱ے عبدالاول جونپوری، مولانا: مقدمہ منیۃ المفتی، ص: ۳۹

۲ے سرسید: مقالات سرسید، حصہ شانزدہم (مطبوعہ مجلس ترقی ادب لاہور) ص: ۱۳۸

۳ محمد جعفر تھانیسری: حیات سید احمد شہید (سوانح احمدی)، مطبوعہ نفیس اکیڈمی کراچی، ص: ۳۰۴

۴ محمد الدین، مولانا: روضۃ الادباء، ص: ۱۴۸

۵ نادم سیتاپوری: غالب آورم، ص: ۹۳ (بحوالہ ماہنامہ اردوئے معلی، علی گڑھ، دسمبر 1970ء)

۶ محمد اکرم شیخ: حکیم فرزانہ، ص: ۵۲

۷ یوسف سلیم چشتی، پروفیسر: مقدمہ شرح دیوانِ غالب، ص: ۱۶۱۔۱۶۲

۸ مرزا حیرت دہلوی: حاشیہ حیات طیبہ، مطبوعہ لاہور، ص: ۱۰۰

۹ محمد قاسم نانوتوی: مناظرہ عجیبہ، مطبوعہ بلالی پریس ساڈھورہ، ص: ۷۷

۱۰ مکتوب پروفیسر محمد ایوب قادری بنام راقم الحروف، تحریر 30 اکتوبر 1971ء

۱۱ قلمی یادداشت شیخ محمد اسماعیل پانی پتی، مملوکہ مکرمی حکیم محمد موسیٰ امرتسری علیہ الرحمۃ۔ اس کی عبارت یہ ہے "تنزیل التنذیر فی نظیر البشیر و النذیر" مصنفہ مولوی قلندر علی زبیری پانی پتی، شاگرد مولانا فضل حق خیر آبادی و استاذ شمس العلماء مولانا حالی، مطبع بدیاس، جموں (کشمیر) 1291ھ / 1874ء بزبان عربی، صفحات 188 سائز 14x11 موجود کتب خانہ حکیم نور الدین بھیروی در مرکزی لائبریری قادیان۔ مولوی اسماعیل دہلوی نے تقویۃ الایمان میں لکھا تھا کہ خدا تعالیٰ کی ایسی شان ہے کہ اگر چاہے تو ایک آن میں کروڑوں انبیاء والیاء جو جبریل اور حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی مانند ہوں، پیدا کر ڈالے۔ مولوی قلندر علی نے متذکرہ بالا رسالہ اپنے استاذ مولانا فضل حق کی دسیت کی تعمیل میں اس عقیدہ کی تردید میں لکھا تھا۔

۱۲ نثار احمد فاروقی: مولانا فضل حق خیر آبادی کا ایک غیر مطبوعہ خط، سہ ماہی نوائے ادب، بمبئی، ص: ۴۰۔۴۶

۱۳ محمد فضل حق خیر آبادی، علامہ: الثورۃ الہندیہ (باغی ہندوستان)، ص: ۳۵۶۔۳۶۰

۱۴ محمد فضل حق خیر آبادی، علامہ: قصائد فتنۃ الہند، ص: ۴۲۸

۱۵ محمد فضل حق خیر آبادی، مولانا: الثورۃ الہندیہ، ص: ۳۷۸

۱۶ ایضاً

۱۷ محمد فضل حق خیر آبادی، علامہ: قصائد فتنۃ الہند، ص: ۳۵۶

۱۸ ماہنامہ تحریک دہلی، شمارہ جون 1960ء، ص: ۱۶

۱۹ ایضاً، ص: ۱۶

۲۰ ایضاً، ص:۱۰

۲۱ محمد فضل حق خیرآبادی، علامہ: الثورۃ الہندیہ، ص:۴۱۷

۲۲ ماہنامہ تحریک دہلی، ص:۱۷

۲۳ ایضاً، ص:۲۰

۲۴ امتیاز علی عرشی رامپوری: مولانا فضل حق اور 1857ء کا فتوائے جہاد، ماہنامہ تحریک دہلی اگست 1957ء

۲۵ نادم سیتاپوری: غالب نامہ آورم، طبع لاہور 1969ء، ص:۱۰۱

۲۶ امتیاز علی عرشی رامپوری: ماہنامہ تحریک دہلی اگست 1957ء

۲۷ ایضاً

۲۸ محمد فضل حق خیرآبادی، علامہ: الثورۃ الہندیہ، ص:۳۵۴۔۳۵۵

۲۹ ایضاً، ص:۴۱۷

۳۰ ماہنامہ تحریک دہلی، شمارہ جون 1960ء، ص:۱۷

۳۱ ایضاً، ص:۱۶

۳۲ محمد ریاض ڈاکٹر: جنگ آزادی 1857ء، ماہ نو کراچی مئی 1969ء، ص:۵۳

۳۳ ماہنامہ تحریک دہلی، اگست 1957ء

۳۴ سہ ماہی رسالہ العلم، اکتوبر تا دسمبر 1971ء، ص:۳۱

۳۵ غلام رسول مہر: اشعار و سوستادن کے مجاہد، ص:۲۵۰

۳۶ عاشق الٰہی میرٹھی: تذکرۃ الرشید، جلد دوم (طبع ثانی)، ص:۷۳

۳۷ ایضاً، ص:۷۶

۳۸ عاشق الٰہی میرٹھی: تذکرۃ الرشید، جلد دوم، ص:۷۷

۳۹ ایضاً، ص:۸۰

۴۰ ایضاً، ص:۷۵

(نوٹ) مہر صاحب نے علماء دیوبند کو مجاہد ثابت کرنے کے لیے اس عبارت کی عجیب توجیہ کی ہے فرماتے ہیں" مبادا" سرکار کے باغیوں کے الفاظ سے غلط فہمی پیدا ہو۔ یہاں "سرکار" سے مراد خود حضرت حاجی صاحب ہیں اور

مقابلہ ان لوگوں سے تھا جو انگریزوں کے طرف دار ہو کر آئے تھے۔ یہ بھی عرض کر دوں کہ یہ میری رائے اور سراسر غلط ہے اور میں اسے قطعی طور پر صحیح سمجھتا ہوں۔ نہیں کہہ سکتا کہ مصنف مرحوم کے پیش نظر کیا بات تھی۔ (1857ء کے مجاہد: 254)

ہمیں اس توجیہ میں سوائے لفظی التقیدت اور کچھ دکھائی نہیں دیا۔ جس توجیہ کو مہر صاحب قطعی طور پر صحیح قرار دے رہے ہیں ہماری سمجھ سے وراء ہے کیونکہ اس جتھے میں خود حالی صاحب بھی شریک تھے جو بقول مہر علی صاحب "اپنی سرکار کے مخالف باغیوں کے سامنے سے بھاگنے پر بہت جانے والا نہ تھا" تو کیا حضرت حالی صاحب اپنی سرکار کے آپ تھے؟

۱۔ عاشق الٰہی میرٹھی: تذکرۃ الرشید جلد دوم، ص: ۸۵

۲۔ مالک رام: ماہنامہ تحریک دہلی، ص: ۲۵

۳۔ نادم بیتاپوری: غالب نادم آدم، ص: ۱۰۸۔۱۰۹

۴۔ ایضاً، ص: ۱۲۳

۵۔ محمد ایوب قادری: تذکرہ اظہار میں مسلمانوں کی علمی خدمات، سالنامہ اردو جنوری 1967ء، ص: ۶۳۔۶۴

۶۔ نادم بیتاپوری: غالب نادم آدم، ص: ۱۲۱

۷۔ مسعود حسن مسعود: حدیث تاریخ (اودھ پنچ الہ آباد)، ص: ۱۱۰

۸۔ محمد سعید سرت: قسطاس البلاغۃ (مطبوعہ حسن المطابع حکیم آباد)، ص: ۲۱۰

۹۔ عبدالشاہد خاں شروانی: باغی ہندوستان، ص: ۱۱۵

۱۰۔ حکایات اولیاء (اردو ترجمہ شکایات الاولیاء) طبع دوم ادارہ اشاعت کراچی، ص: ۱۳۳

۱۱۔ تفصیل کے لیے سیف البتار از مولانا شاہ فضل رسول قادری مطبوعہ مکتبہ نعیمیہ لاہور، حاشیہ ص: ۹۱۔۹۳

۱۲۔ اسماعیل دہلوی: تقویۃ الایمان (مظہر اظہار محمدی دہلی)، ص: ۳۵۔۳۷

۱۳۔ محمد فضل حق خیرآبادی: علامہ تحقیق الفتوی فی ابطال الطغوی (قلمی)، ص: ۱۳۳

۱۴۔ اشرفعلی تھانوی: مولوی: حکایات اولیاء طبع کراچی، ص: ۳۳۹

۱۵۔ فضل حسین بہاری: الحیاۃ بعد الممات طبع کراچی، ص: ۱۹۷

۱۶۔ اسماعیل دہلوی: تقویۃ الایمان، ص: ۳۶

۵۷ محمد فضل حق خیرآبادی، علامہ: تحقیق الفتوی (قلمی) ص: ۵۹

۵۸ زلزلہ بحوالہ نجفی ص: ۱۸۷۔۱۸۸

۵۹ عاشق الٰہی میرٹھی: تذکرۃ الرشید، جلد دوم ص: ۲۷۰

۶۰ مراد علی سید: تاریخ تناولیاں ص: ۴۷

۶۱ ایضاً ص: ۴۷۔۵۳

۶۲ ایضاً ص: ۵۳۔۶۱

۶۳ ایضاً ص: ۶۸

۶۴ سرسید احمد خاں: مقالات سرسید، حصہ نہم ص: ۱۳۹۔۱۴۰

۶۵ یوسف جمیل (ایڈیٹر پیسہ اخبار) کے نام خط لاہور 25 اگست 1974ء

۶۶ حسین احمد، دیوبندی: نقش حیات، ج ۲ ص: ۱۳

۶۷ زلزلہ ص: ۱۸۷۔۱۸۸ بحوالہ نجفی، دیوبند

۶۸ عنایت اللہ اثری: مکاتیب العجابہ فی مکاتیب الصحابہ ص: ۸۵۔۸۶

۶۹ ایضاً ص: ۸۶

۷۰ ایضاً نوٹ: اس سے پتہ چلتا ہے کہ "مجاہدین" صرف مسلمانوں کا مقابلہ کرنا چاہتے تھے اسی لیے لاہور کا نام لیا۔ انگریزوں کے خلاف جہاد کے عزم کا اظہار دہلی جامع مسجد میں واضح کیا گیا ہے۔

۷۱ حبیب احمد، چودری: تحریک پاکستان اور نیشنلسٹ علماء ص: ۲۱۱

۷۲ ایضاً ص: ۲۱۲ بحوالہ روزنامہ الہلال 19 دسمبر 1912ء

۷۳ ابوسلمان شاہجہانپوری: ارمغان آزاد ص: ۷۵

۷۴ ایضاً ص: ۷۴۔۷۵

۷۵ حبیب احمد، چودری: تحریک پاکستان اور نیشنلسٹ علماء ص: ۲۱۲ بحوالہ اسٹیٹسمین 19 فروری 1940ء

۷۶ ایضاً بحوالہ انڈیا انس فریڈم ص: ۲۲۷

۷۷ ایضاً ص: ۲۱۳ بحوالہ اسٹیٹسمین 19 فروری 1940ء

۷۸ رئیس احمد جعفری: کاروان غم ص: ۳۹

WWW.NAFSEISLAM.COM

منقولات و معقولات کے امین

مولانا فضل امام خیرآبادی

علامہ حافظ خادم حسین رضوی

شیخ الحدیث حضرت علامہ حافظ خادم حسین رضوی ۳ ربیع الاول ۱۳۸۶/ ۲۲ جون ۱۹۶۶ء بروز بدھ "نکہ کلاں" اٹک میں حاجی لعل خاں علیہ الرحمۃ کے ہاں پیدا ہوئے۔ جہلم و دینہ کے مدارس میں حفظ و مجوید کی تکمیل کے بعد شہرۂ آفاق دینی درسگاہ جامعہ نظامیہ رضویہ لاہور میں درس نظامی کی تعلیم حاصل کی۔ آپ کے اساتذہ میں مفتی اعظم پاکستان مفتی محمد عبدالقیوم ہزاروی، مجاہد اسلام حضرت مولانا محمد رشید نقشبندی، استاذ العلماء حضرت مولانا مفتی عبداللطیف نقشبندی، شرف ملت حضرت علامہ محمد عبدالحکیم شرف قادری، جامع المنقول والمعقول حضرت علامہ حافظ عبدالستار سعیدی اور استاذ العلماء حضرت مولانا محمد صدیق ہزاروی ایسی شخصیات شامل ہیں۔

روحانی طور پر سلسلہ عالیہ نقشبندیہ مجددیہ میں عارف کامل حضرت اقدس خواجہ محمد عبدالواحد صاحب المعروف حاجی پیر صاحب سے کالا دیو شریف جہلم میں بیعت ہیں۔ تقریباً دو عشروں سے جامعہ نظامیہ میں ہی مسند تدریس پر رونق افروز ہیں۔ بلاشبہ آپ کے ہزاروں شاگرد اس وقت ملک عزیز کے طول و عرض میں خدمات دینیہ میں معروف عمل ہیں۔

درس و تدریس کے ساتھ ساتھ آپ تصنیف و تالیف میں بھی خدمات سرانجام دے رہے ہیں۔ علم صرف میں تیسیر ابواب الصرف اور تعلیلات خادمیہ آپ کی نوک قلم کی یادگار ہیں۔ اللہ رب العزت نے خطابت میں دلنشین و منفرد انداز عطا فرمایا ہے۔ روایتی تقاریر سے ہٹ کر آپ کے خطابات "دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے" کے مصداق پُراثر ہوتے ہیں۔

اس وقت آپ فدایان ختم نبوت پاکستان اور مجلس علماء نظامیہ کے مرکزی امیر ہیں۔ اس کے علاوہ دارالعلوم انجمن نعمانیہ سمیت کئی مدارس، تنظیمات اور اداروں کے سرپرست و نگران اور معاون ہیں۔

حضرت مولانا فضل امام خیرآبادی علیہ الرحمۃ کے والد گرامی شیخ محمد ارشد ؒ نے دو شادیاں کیں۔ پہلی شادی سے ایک بیٹا احمد حسین المعروف فقیر امیاں، اور بیٹی بی بی رحم النساء پیدا ہوئی۔ احمد حسین کے تین بیٹے منشی حسن احمد، منشی حسین احمد اور دو بیٹیاں بی بی وزیرن (زوجہ علامہ فضل حق خیرآبادی) اور دوسری بیٹی زوجہ مظہر علی خان

پیدا ہوئیں جبکہ دوسری شادی سید محمد شکر اللہ کی صاحبزادی سے ہوئی جن سے دو بیٹے مولانا فضل امام محمد صالح اور ایک بیٹی بی بی عائشہ پیدا ہوئی۔[۳]

سلسلہ نسب:

مولانا فضل امام خیرآبادی کا شجرۂ نسب بتیسویں پشت میں خلیفہ دوم سیدنا فاروق اعظم رضی اللہ عنہ سے ملتا ہے۔ آپ کا سلسلہ نسب کچھ یوں ہے: فضل امام بن شیخ محمد ارشد بن حافظ محمد صالح بن مولانا عبدالواحد بن عبدالماجد بن قاضی صدرالدین بن قاضی اسماعیل ہرگامی بن قاضی عماد بدایونی بن شیخ ارزانی بدایونی بن شیخ منور بن شیخ خطیر الملک بن شیخ سالار شام بن شیخ وجیہ الملک بن شیخ بہاؤالدین بن شیر الملک بن شاہ عطاء الملک ہبن ملک بادشاہ بن حاکم بن عادل بن تائرون بن جرجیس بن احمد نامدار بن محمد شہریار بن محمد خان بن دامان بن ہمایوں بن قریش بن سلیمان بن حفان بن عبداللہ بن محمد بن عبیداللہ بن امیر المؤمنین سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ۔[۴]

آباؤاجداد:

مولانا فضل امام خیرآبادی کے آباؤاجداد ایران سے ترک سکونت کرکے برصغیر پاک وہند میں آگئے اور یہاں ان کا خاندان ملک کے اطراف وکنار میں پھیل گیا۔ مولانا فضل امام کے والد شیخ محمد ارشد خیرآباد آگئے اور یہیں قیام کیا۔ مولانا فضل امام کی پیدائش بھی خیرآباد میں ہوئی۔

علمی وعملی خدمات:

مولانا فضل امام نے سید عبدالواحد کرمانی خیرآبادی اور ملا محمد ولی وغیرہ سے علوم مروجہ کی تحصیل کی۔ فراغت تعلیم کے بعد آپ دہلی چلے گئے اور ایسٹ انڈیا کمپنی میں کام شروع کیا۔ یہاں آپ پہلے مفتی اور پھر صدر الصدور کے عہدے پر فائز رہے۔ منصب افتاء اور صدر الصدوری پر فائز رہتے ہوئے بھی مولانا فضل امام طلباء کو نہایت شفقت ومحبت سے منطق وفلسفہ کا درس دیتے تھے۔

تلامذہ:

مولانا فضل امام علیہ الرحمۃ کے ہزاروں تلامذہ میں سے علامہ فضل حق خیرآبادی اور مفتی صدرالدین خاں آزردہ شہرۂ آفاق حیثیت ومقام کے حامل ہوئے۔

علماء پر شفقت:

علماء پر آپ کی شفقت کا اندازہ مولانا شاہ غوث علی پانی پتی کے اس بیان سے ہوتا ہے کہ "شاہ عبدالعزیز، شاہ عبدالقادر اور مولانا فضل امام کی شاگردی کا مجھے فخر حاصل ہے۔ آخر اللہ کریم کی جو شفقت میرے حال پر تھی وہ بیان سے باہر ہے۔ دہلی سے پیشاور بغرض تعلیم چلا گیا۔ میری عمر اٹھارہ برس تھی کہ استاد فوت ہو گیا۔ میں نے بھی تعلیم کو خیر باد کہہ دیا کہ نہ ایسا شفیق اور قابل استاد ملے گا اور نہ پڑھوں گا۔"

روحانی تعلق:

مولانا فضل امام ظاہری علوم کے شہسوار ہونے کے ساتھ ساتھ باطنی علوم کے بھی رمز شناس تھے۔ آپ اولاً شاہ صلاح الدین گویاموی اور ثانیاً شاہ قدرت اللہ سے بیعت ہوئے۔

خطیب مشرق علامہ مشتاق احمد نظامی اپنی شہرہ آفاق تصنیف "خون کے آنسو" میں فرماتے ہیں کہ "حضرت مولانا فضل امام ظاہری علوم کے ساتھ روحانیت میں بلند مرتبہ رکھتے تھے۔ آپ کے والد شیخ محمد ارشد مولانا احمد ابن حامی صفت اللہ محدث خیرآبادی سے بیعت تھے۔ آپ کے ایک صاحبزادے عالم جوانی میں فضاء کر گئے اور باقی بانتظام نو عمری احکام شرعیہ کے پابند نہ تھے۔ اس لیے مولانا ارشاد صاحب کو تشویش راقی تھی اور ایک بار اضطراب و بے چینی کے عالم میں پیر و مرشد کی خدمت میں حاضر ہوئے اور شیخ طریقت سے دعا کی درخواست کی۔ مرشد کامل نے دعا فرمائی۔ چنانچہ شب میں سرکار ﷺ کی زیارت نصیب ہوئی کہ سرکار کائنات ﷺ کچے باغ میں تشریف لائے اور نیل کے درخت کے نیچے وضو فرمایا اور بعد نماز فرض دو سرے دونوں ایک دونوں کو مبارک باد دینے روانہ ہوئے۔ راستے میں دونوں کی ملاقات ہوئی تو ایک دوسرے کو بشارت کا حال سنایا اور وہیں سے دونوں کچے باغ میں پہنچے تو دیکھا کہ مقام معہود پر وضو کا شریفہ پانی کی نہری موجود تھی۔ ایک مدت تک لوگ اس جگہ کی زیارت کرتے رہے۔

چنانچہ شیخ الاسلام حضرت مولانا الحاج علی خاں صاحب بریلوی علیہ الرحمۃ مقتدائے ملت" تاجدار ہلسنت سیدی امام احمد رضا خاں فاضل بریلوی رضی اللہ عنہ کو 1309ھ میں ساتھ لے کر بریلی شریف سے خیرآباد اس مقام کی زیارت کے لیے حاضر ہوئے اور مولانا حسن بخش کے یہاں مہمان ہوئے تھے۔ افسوس! نہ اب وہ مکان باقی رہا اور نہ ہی اس جگہ کا پتہ چل سکتا ہے"۔

تصنیفات:

مولانا فضل امام خیرآبادی علیہ الرحمۃ نے چند شاہکار کتب بھی تصنیف کی ہیں۔ ان میں سے چند درج ذیل ہیں۔

❶ مرقات: یہ فن منطق کی معروف کتاب ہے۔

❷ شرح افق المبین: ملا باقر داماد کی کتاب کی شرح علامہ موصوف نے کی۔ مفتی انتظام اللہ شہابی کے کتب خانے میں اس کا ایک نسخہ موجود تھا۔ [۷]

❸ تشحیذ الاذہان فی شرح بدیع المیزان: منطق میں شیخ عبداللہ تفتازانی نے اپنی ہی کتاب میزان المنطق کی شرح "بدیع المیزان" کے نام سے کی۔ علامہ فضل امام نے بدیع المیزان کی شرح تشحیذ الاذہان کے نام سے کی ہے۔ زید احمد نے اس شرح کو "حاشیہ" قرار دیا ہے۔ [۸]

❹ حاشیہ الحاشیہ الزاہدیہ تطبیب:

❺ خلاصۃ التواریخ: 1224ھ/1809ء میں مولانا فضل امام نے اسے تالیف کیا۔ اس کتاب کا مخطوطہ کتب خانہ مجلس مرکز تحقیقات فارسی ایران و پاکستان اسلام آباد میں موجود ہے۔ [۹]

❻ آمد نامہ: اس کتاب میں فارسی زبان کے قواعد "بدیع اور بیان" کے اصولوں سے بحث کی گئی ہے تیرہ ابواب میں چند نامی گرامی علماء کا ذکر خیر بھی کیا گیا ہے۔

وفات:

مولانا فضل امام نے حیات فانی کا آخری حصہ پنجیالہ میں گزارا لیکن وفات آبائی گاؤں خیرآباد میں 5 ذوالقعدہ 1244ھ بمطابق 9/ مئی 1829ء کو ہوئی۔ [۱۰]

ازدواج واولاد: [۱۱]

مولانا فضل امام نے تین شادیاں کیں۔ پہلی زوجہ کا تعلق صدر پور سے تھا۔ ان سے تین بیٹے علامہ فضل حق، فضل عظیم، فضل الرحمٰن اور تین بیٹیاں نور اں بی بی (زوجہ غلام مخدوم سندیلوی) مہراں بی بی، ظہور النساء (زوجہ غلام نبیین) پیدا ہوئیں۔

دوسری زوجہ سے درج ذیل اولاد پیدا ہوئی۔ سید محمد الحسن ضیاء الحسن، حرمت بی بی (زوجہ حسن احمد) سرفراز علی

بی (زوجہ ارشاد حسین خیرآبادی)، امتیاز و بی بی (زوجہ حکیم بولی سندیلوی) اور خدیجہ بی بی (زوجہ سید محمد بخش) وغیرہ۔ امتیاز و بی بی کی صاحبزادی سے علامہ فضل حق علیہ الرحمۃ کے صاحبزادے شمس العلماء مولانا عبدالحق کا عقد ناح ہوا۔ تیسری زوجہ سے اعظم حسین اور مظفر حسین شوقی پیدا ہوئے۔

قطعہ وصال:

مرزا اسد اللہ خاں غالب نے مولانا فضل امام کے وصال پر ملال پر درج ذیل قطعہ تاریخ کہا۔

اے دریغا قبلۂ ارباب فضل — کرد رو سوئے جنت الماوی خرام!
چوں ارادت از پے کسب شرف — جست سال فوت آں عالی مقام
چہرہ ہستی ز غم شد نخت — تا بہ تحریر گرود نظم تمام
نظم اندر "سایہ لطف نبی" — یاد آرامش گہر "فضل امام"
257 — 5-992

5-992+257
=1244

﴿حوالہ جات ومصادر﴾

۱ یہاں لفظ شیخ ان کے مقام و مرتبہ و علم کی بدولت استعمال کیا گیا ہے جیسا کہ زمانہ قدیم میں رواج رہا ہے۔
۲ خیرآباد کے قریب ایک گاؤں
۳ علامہ فضل حق خیرآبادی ص: 41-42
۴ انفاس العارفین ملفوظات دہلی کے صفحہ 152 پر شیر الملک بن عطاء الملک بن ابوالفتح ملک بن عمر حاکم ملک بن عادل بن فاروق بن جرجیس بن احمد بن محمد شہر یار بن طغان بن ہابان بن طایوں کا ذکر ہے۔
۵ علامہ فضل حق خیرآبادی ص: 39-40
۶ تذکرہ علمائے ہند
۷ تراجم الفضلاء
۸ عربی ادب میں پاک و ہند کا حصہ
۹ فہرست نسخہ ہائے خطی کتاب خانہ ص: 157-158
۱۰ تذکرہ علمائے ہند میں 1243ھ اور باغی ہندوستان میں 1240ھ درج ہے۔
۱۱ نزہۃ الخواطر ج: 7 ص: 374
۱۲ علامہ فضل حق خیرآبادی ص: 43

WWW.NAFSEISLAM.COM

خاتم الحکماء

امام فضل حق خیرآبادی

مولانا خان محمد قادری

مولانا خان محمد قادری 1963ء میں ضلع رحیم یار خان میں جناب "یار محمد" کے ہاں پیدا ہوئے۔ آپ نے ابتدائی تعلیم خانپور، رحیم یار خان اور بہاولپور میں حاصل کی۔ درس نظامی کی تکمیل جامعہ اویسیہ بہاولپور اور دارالعلوم محمدیہ غوثیہ، بھیرہ شریف سے حاصل کی۔ دوران تعلیم ہی آپ نے فن خطابت میں خوب مہارت حاصل کی اور آج خطیب پاکستان کہلاتے ہیں۔

آپ کی کئی کتب منظر عام پر آچکی ہیں ان میں عقائد اسلام، علامہ اقبال اور فلسفہ موت، کرم ہی کرم اور میری مریدی عقائد و بصائر شامل ہیں۔ اس وقت آپ دارالعلوم محمدیہ غوثیہ داتا گنج لاہور کے پرنسپل اور فدایان ختم نبوت پاکستان کے مرکزی ناظم اعلیٰ ہیں۔

اسلاف کے زندہ و جاوید کارناموں سے آگاہ رہنا اور دوسروں کو آگاہ رکھنا، آرام پرست غفلت شعاروں کا کام نہیں بلکہ بیدار مغز فداکاروں کا کام ہے۔ نفسیات انسانی کا یہ فیصلہ بھی اپنی جگہ اٹل ہے کہ ہر انسان اپنی اندرونی صفات کے دائرے کے گرد گھومتا ہے۔ اس کی ساری چاہتیں، محبتیں انہیں فطری صفات کی مرہون منت ہوتی ہیں۔ علم دوست انسان اہل علم کو پسند کرتا ہے انہیں کے گیت گاتا ہے، انہیں کے کارناموں کو سن سنا کر اپنے جذبات کی تسکین کا سامان کرتا ہے۔ جن لوگوں کو طاقت و قوت پسند ہے وہ وقتاً فوقتاً ستم و سیماب کے قصوں میں مگن رہتے ہیں۔ جو لوگ عدل و انصاف کو پسند کرتے ہیں وہ ہمیشہ نوشیرواں عادل جیسے لوگوں کی کہانیوں سے دل بہلاتے ہیں۔ غرضیکہ ہر شخص اپنے ہی جذبات کا و احساسات کا اسیر ہے۔

خوش بخت ہوتے ہیں وہ لوگ جنہیں صفات کمال سے حصہ ملا ہے۔ خود بھی خوگر ادب و احترام ہیں تو صاحب عزت و احترام سے محبت بھی کرتے ہیں۔ خود اہل علم ہیں تو علماء سے پیار بھی ان کی فطرت کا حصہ ہے۔ اگر ان کے رگ و ریشے میں دین اسلام کی حمایت و محبت کا جذبہ کارفرما ہے تو اہل دین سے ان کی وابستگی چنداں قابل تعجب نہیں۔

اگر اللہ تعالیٰ اور اس کے پیارے رسول ﷺ کی غیر مشروط غلامی کا طوق اپنے گلے میں سجانے والے ہیں تو

اس راہ حق کا ہر راہی ان کا قافلہ سالار ہے اور اسی راہ کے ہر مسافر سے انہیں پیار ہے۔ یہ ساری محبتیں، چاہتیں فدا کاریاں کسی خارجی دباؤ یا جبر سے نہیں بلکہ جی جان سے اٹھنے والا جذبہ دلبرانہ ہے۔ بالکل اسی طرح جو لوگ انبیاء کرام علیہم السلام اولیاء اللہ اور علماء حق سے محبت کرتے ہیں یہ محبت ان کے صفائے باطن کی دلیل ہے۔ کیونکہ چاند اور چکور کا رشتہ یا گل و بلبل کی محبت، شمع اور پروانے کی بے تابی کسی دلیل کی محتاج نہیں۔

اسی لیے اہل صفا نے ہمیشہ اہل وفا کو دل کی جان سے چاہا ہے اور ٹوٹ کے چاہا ہے۔ انہوں نے اس چاہت کا اظہار کبھی تقریر سے کیا تو کبھی تحریر سے، کبھی کتابوں کے ذریعے، کبھی رسالوں سے، کبھی سادہ جذبات سے تو کبھی خوابوں سے۔ ان تمام کوششوں کا مقصد یہ رہا کہ عظیم المرتبت ہستیوں کے چاند چہروں پر گردش لیل و نہار سے یا دسیسہ کاری اغیار سے غبار نہ پڑے۔

ان چاند چہروں میں ایک چہرہ خاتم الحکماء علامہ فضل حق خیرآبادی رحمۃ اللہ علیہ کا ہے۔ جو سلطنت حکمت کے بے تاج بادشاہ ہو گزرے ہیں۔ جنہوں نے کامل 50 سال علم و حکمت کے دریا بہائے۔ سرزمین ہند پر ایسا باکمال آفتاب شاید ہی چمکا ہو جو ایک طرف ارسطو اور افلاطون کی کتابوں کے ازالے کر رہا تھا تو دوسری جانب عربی علم و ادب میں فرزدق، لبید اور نابغہ کے ہم پلہ نظر آ رہا تھا۔ علامہ فضل حق خیرآبادی قافلۂ عزیمت کے اس جانباز قافلہ سالار کا نام ہے جس نے دزدان قافلہ انسانیت فرنگیوں کی سنگینوں کے سائے میں فرنگی نظریات کا ابطال کیا اور حق کے آفتاب عالمتاب کو نصف النہار تک پہنچا دیا۔

وہ ہند کا "قطب" تھا۔ ان کی محفل سے نظر بھی تھی تو تھک ہار کر واپس انہیں پہ پھیرتی تھی۔

ہزار مجمع خوبان ماہ رو ہو گا
نظر جس پہ پھیر جائے گی وہ تو ہو گا

چار ہزار سے زائد عربی اشعار کا خالق "لئے پاؤں لولو تو امرأ القیس" کا ثانی "واپس آؤ تو آزردہ" سہیائی، مومن اور غالب کا جانی۔ مرزا اسد اللہ خان غالب اردو کا سب سے بڑا شاعر جس کی نظر کسی کی پلکی نہیں تھی۔ وہ بھی علامہ کا قدرداں اور فیض یافتہ تھا۔

حضرت علامہ فضل حق خیرآبادی تمام عمر میکدۂ علم و حکمت سے پیاسوں کو بقدر ظرف جام پلاتے رہے۔ اس امام حکمت و دانائی کے ہاں ہر ہفتے دو رات سب سے سہانی ہوتی تھی جس رات یا دن وہ پراقر آن ختم فرماتے تھے۔ مخلوق خدا سے شناسائی اور خالق کی آشنائی کبھی غالب نہ آئی۔ ہر رات بطور خاص رات کے پچھلے پہر امام خیرآبادی

لذت گریہ سے ضرور لطف اندوز ہوتے۔

ہے مستانی ہوا میں گرچہ تھی شمشیر کی تیزی
لندن میں بھی نہ چھوٹے مجھ سے آداب سخن تیزی

بزم فلسفہ وحکمت کے اس بے تاج بادشاہ کی "حکمت" پشت در پشت ان کا اوڑھنا بچھونا رہی۔ علامہ فضل حق خیر آبادی کے والد نے علم منطق کی کتاب "سرقاۃ" لکھی۔ پھر "کشف الاذھان" لکھ کر اپنے علم کا سکہ بٹھادیا۔ امام فضل حق خیرآبادی کے بیٹے شمس العلماء مولانا عبدالحق خیرآبادی نے مشہور زمانہ کتاب "ھدایۃ الحکمۃ" کی شرح لکھ کر علماء کی مشکل آسان کردی۔ خود امام فضل حق خیرآبادی نے علم کا گرانمایہ سرمایہ چھوڑا۔ مثلاً

1. الھدیۃ السعیدیہ
2. الحاشیہ علی شرح قاضی مبارک
3. الرسالہ فی رد علی القائلین بحرکت الارض
4. الرسالہ فی تحقیق العلم والمعلوم
5. الحاشیہ علی الاقلی المبین
6. الکافی لحل ایساغوجی
7. الحاشیہ علی المنھیہ للقاضی مبارک علی شرحہ علی السلم
8. الجنس العالی فی شرح جواھر العالی
9. الرسالہ فی تحقیق الاجسام
10. رسالہ کلی طبعی
11. رسالہ قاطیغوریاس

یہ تو امام خیرآبادی کی وہ کتابیں جو علم منطق وفلسفہ اور حکمت پر لکھی ہیں۔ مزید برآں:

12. الروض المجود فی تحقیق حقیقۃ الوجود
13. النورۃ الھندیہ
14. قصائد فتنۃ الھند
15. مجموعۃ القصائد
16. امتناع النظیر
17. تحقیق الفتوی فی ابطال الطغوی

امام خیرآبادی زاہد خشک یا فقیہ تنگ نظر نہ تھے بلکہ صاحب درد وعشق اور صوفی باصفا بھی تھے۔ پکے سنی حنفی مسلک اور سلسلۂ عالیہ چشتیہ میں بیعت تھے۔ آپ علم وعشق کا پیکر حسن اور عاشق رحمۃ للعالمین تھے۔ آپ علامہ اقبال کے اس شعر کی کامل تصویر تھے۔

ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم
رزم حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن

آپ کی محفل میں گناہ گار قدح خوار تو آسکتا تھا مگر غداران رسالت کے لیے آپ ننگی تلوار تھے۔ گستاخان

WWW.NAFSEISLAM.COM

رسالت سے آنکھ ملانے کو بھی جذبۂ عشق کی توہین سمجھتے تھے۔ مرتبۂ رسالت کے سامنے وہ کسی کے مرتبے کو خاطر میں نہیں لاتے تھے۔ اسی لیے ان کا قلم اسماعیل دہلوی جیسوں پر خنجر خونخوار برق بار بن کر لپکتا اور برستا رہا۔ منصب رسالت اور عظمت نبوت کے بارے میں وہابیوں کے تشکیک و توہین کے کانٹوں کو صاف کرتا رہا اور آپ نے حقائق حق کے لیے اپنی جان کی بازی لگادی۔

جو رکے تو کوہ گراں تھے ہم جو چلے تو جاں سے گزر گئے
رہ یار ہم نے قدم قدم تجھے یادگار بنا دیا

قارئین اخوگر حمد سے تھوڑا سا تعلق بھی ہمیں ہو تو ماہنامہ "العاقب" قدیمان ختم نبوت کا ترجمان ہے مگر اسے اپنے میدان سے نکل کر وہ فرائض بھی ادا کرنے پڑ رہے ہیں جو ہمارے دوسرے احباب بہتر طریقہ سے کر سکتے ہیں۔ ہمارے بزرگوں کے آثار و افکار حسن و خوبی دوسرے لوگوں تک پہنچا سکتے ہیں۔

مگر ہمیں اپنے آپ کو سجانے سنوارنے سے فرصت ہی نہیں مل رہی کہ ہم اپنے اسلاف کی طرف توجہ دیں اور ان کے کردار و افکار سے روشنی حاصل کریں۔ شاید ہم سب ڈیڑھ اینٹ کی مسجد میں متقید ہو کر رہ گئے ہیں اور ہماری اجتماعیت کا حرم صرف بے امام ہی نہیں بلکہ مکمل نمازیوں سے بھی خالی ہوتا جا رہا ہے۔ محبت کے آب زم زم کی جگہ حسد و نفرت کا غبار اڑ رہا ہے۔ ہمارے سیمینارز کانفرنسیں جلسے اور جلوسوں میں صرف ہمارے جسم اکٹھے ہوتے ہیں مگر ہمارے دل ایک دوسرے سے دور بہت دور ہوتے ہیں۔ ﴿تحسبهم جميعا وقلوبهم شتى﴾ کی تصویر صاف جھلکتی ہے۔ اب اس خود سازی و خود ستائی کے دور میں علاج یہ ہے کہ ہمیں پورے اخلاص سے اپنے اپنے حصے کے کام کرنا چاہیے۔

ماہنامہ "العاقب" کا بنیادی مقصد مسئلہ ختم نبوت کا تحفظ ہے۔ باقی مسائل بھی ہمارے ہیں، افکار کسی سے نہیں لیکن تقسیم کار ضروری ہے ورنہ سب کچھ کرنے کے چکر میں کچھ بھی نہیں ہو سکے گا۔ اگرچہ ہماری حالت غالب نے کچھ یوں بیان کی ہے۔

ہوا مخالف و شب تار و بحر طوفاں خیز
گسستہ لنگر کشتی و ناخدا خفت است

یعنی باد مخالف چل رہی ہے۔ اور ہر رات تاریک ہے۔ سمندر میں طوفان بلا خیز ہے۔ ستم بالائے ستم یہ کہ جس کشتی پر ہم سوار ہیں اس کے لنگر بے کار ہیں۔ سب سے بڑی بدنصیبی یہ ہے کہ کشتی کا ملاح ان حالات میں بھی لمبی تان کے سو رہا ہے۔

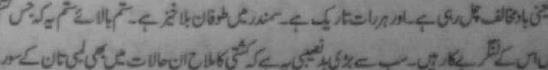

مولانا فضل امام کا شہزادہ

علامہ فیض احمد اویسی

شیخ الحدیث والتفسیر علامہ فیض احمد اویسی پاک و ہند کے علمی حلقوں میں معروف و مقبول شخصیت کے مالک ہیں۔ آپ جامعہ اویسیہ سیرانی روڈ بہاولپور کے بانی و مہتمم اور کئی مدارس و اداروں کے نگران ہیں۔ تدریسی مشاغل کے علاوہ تصنیفی میدان میں بھی آپ کے رواں دواں قلم نے خوب جوہر دکھائے ہیں۔ آپ کے درجنوں اصلاحی کتابچے اور کئی کتب منظر عام پر آچکی ہیں۔

آپ 1212ھ/1797ء میں خیر البلاد خیر آباد میں پیدا ہوئے۔ آپ کا سلسلہ نسب 33 واسطوں سے خلیفہ ثانی سیدنا فاروق اعظم رضی اللہ عنہ تک پہنچتا ہے۔ اسی وجہ سے آپ کو عمری بھی لکھا جاتا ہے۔

چونکہ آپ کا گھرانہ علمی تھا۔ فن منطق کی مشہور درسی کتاب الرقات کے مصنف حضرت علامہ فضل امام خیر آبادی رحمۃ اللہ علیہ آپ کے والد گرامی ہیں۔ اسی لیے نو عمری میں آپ نے علوم عقلیہ و نقلیہ میں کامیابی حاصل کر لی۔ علوم حدیث پاک حاصل کرنے کے لیے والد گرامی نے آپ کو شاہ عبدالقادر اور شاہ عبدالعزیز دہلوی قدس سرہما کے ہاں بھیج دیا۔ صرف تیرہ سال کی عمر میں 1225ھ/1809ء میں جملہ علوم و فنون عقلیہ و نقلیہ سے فراغت پائی۔ آپ نے صرف چار ماہ اور کچھ دنوں میں قرآن مجید حفظ کر لیا تھا۔

علامہ فضل حق نے امرؤ القیس کے قصیدہ پر ایک قصیدہ لکھ کر حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کی خدمت میں پیش کیا۔ حضرت شاہ صاحب نے ایک جگہ اعتراض کیا تو علامہ فضل حق نے اسی وقت اس جیسے تین شعر پڑھ دیے۔ ابھی اور پڑھنے والے تھے کہ مولانا فضل امام نے فرمایا بس حد ادب کا پاس کرو۔ علامہ نے کہا کہ حضرت یہ کوئی علم تفسیر و حدیث تو ہے نہیں یہ فن شاعری ہے اس میں بے ادبی کی کیا بات ہوئی۔ شاہ صاحب قدس سرہ نے فرمایا پر خوردار تو سچ کہتا ہے مجھ کو سہو ہوا۔

اس واقعہ سے جہاں علامہ رحمۃ اللہ علیہ کے حافظہ اور بچپن کے علمی کمال کا پتہ چلا وہاں یہ بھی معلوم ہو گیا کہ دور

سابق میں اساتذہ کو اپنے تلامذہ کے علمی کمال کے اعتراف میں بخل نہ تھا اور نہ آج کل تو بڑے سے بڑے محقق شاگرد پر خوشی کے اظہار کے بجائے اس کو نیچا دکھانے کی کوشش کی جاتی ہے۔

حضرت علامہ رحمۃ اللہ علیہ ہر فن میں اپنی نظیر خود تھے لیکن چونکہ منطقی تھے اسی لیے فن مناظرہ ان کی نظروں میں معمولی سی بات تھی۔ چنانچہ جن دنوں حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلوی علیہ الرحمۃ نے رد شیعہ میں "تحفہ اثنا عشریہ" لکھا تو ہندستان سے لے کر ایران تک کے شیعوں میں سخت ہیجان و اضطراب پیدا ہو گیا۔ صاحب افق المبین میر باقر داماد کے خاندان کا ایک مجتہد فریقین کی کتابیں لے کر شاہ صاحب سے مناظرہ کرنے کے لیے ایران سے دہلی پہنچا۔ خانقاہ میں داخل ہونے پر شاہ صاحب نے فرائض میزبانی ادا کرتے ہوئے قیام کے لیے مناسب جگہ تجویز فرمائی۔ شام کو مولانا فضل حق حاضر ہوئے تو شاہ صاحب کو مہمان نوازی میں مصروف پایا۔ کیفیت دریافت کی اور بعد از مغرب مجتہد صاحب کے پاس چلے گئے۔ مجتہد صاحب نے آغاز گفتگو کے لیے پوچھا: صاحبزادے کیا پڑھتے ہو؟ علامہ نے کہا "اشارات" "شفا" اور "افق المبین" دیکھا کرتا ہوں۔ علامہ چونکہ بالکل نوعمر تھے اس لیے مجتہد صاحب کو بے حد تعجب ہوا چنانچہ انہوں نے افق المبین کی کسی عبارت کا مطلب پوچھ لیا۔ علامہ فضل حق نے نہ صرف عبارت کی تفسیر کر دی بلکہ افق المبین پر متعدد اعتراضات بھی جڑ دیے۔ مجتہد صاحب نے جواب دینے کی کوشش کی تو انہیں جان چھڑانی اور بھی مشکل ہو گئی۔ جب وہ خوب عاجز ہو گئے تو علامہ نے اپنے اعتراضات کے جوابات ایسے انداز میں دیے کہ مجتہد صاحب اور ان کے رفقاء تمام علماء انگشت بدنداں رہ گئے۔ آخر میں یہ بھی بتا دیا کہ شاہ صاحب کا میں ایک ادنیٰ شاگرد ہوں اور اظہار معذرت کے بعد واپس چلے گئے۔

اب مجتہد صاحب اور ان کے رفقاء کو اپنی غلطی کا احساس ہوا کہ جب یہاں کے نونہالوں کا علم و فضل میں یہ عالم ہے تو شیخ خانقاہ کا کیا حال ہوگا۔ چنانچہ شاہ صاحب نے جب صبح مہمانوں کی خیریت طلبی کے لیے آدمی بھیجا تو پتہ چلا کہ مجتہد صاحب آخری شب ہی دہلی سے روانہ ہو چکے ہیں۔

سند فراغت حاصل کرتے ہی آپ نے پڑھانا شروع کر دیا۔ ایک دفعہ مولانا فضل امام نے ایک طالب علم کو فرمایا کہ جاؤ فضل حق سے پڑھ لو۔ وہ طالب علم معمر، کم علم اور کند ذہن تھا اور یہ ہمارے اسلاف صالحین کی عادت میں شامل تھا کہ ہر قسم کے طالب علم کو علم پڑھانا ہے خواہ وہ معمر ہو یا کند مزاج لیکن آج کے اساتذہ تو ایسوں کو پڑھانا اپنی توہین سمجھتے ہیں چونکہ مولانا فضل امام کو وقت کی قلت تھی اس لیے بیٹے کے ذمہ لگایا۔ مولانا فضل حق نوعمر (صرف چودہ سال عمر) نازک طبع، نازپروردہ جمال صورت و معنی سے آراستہ ذہن میں بلا کی جودت، استاد شاگرد میں کسی طرح

بھی ہم آہنگی نہ تھی۔ تھوڑا سا سبق پڑھایا اور برہم ہو کر طالب علم کو برا بھلا کہہ کر نکال دیا۔ وہ روتا ہوا مولانا فضل امام کی خدمت میں حاضر ہوا اور ماجرا کہہ سنایا۔ انہوں نے مولانا کو بلایا۔ علامہ حاضر ہو کر باادب کھڑے ہو گئے اور مولانا فضل امام نے ایسا زوردار تھپڑ رسید کیا کہ دستار فضیلت دور جا گری اور فرمایا کہ تم بسم اللہ کے گنبد میں پرورش پاتے رہے اور ناز و نعمت میں پلے۔ جس کے سامنے کتاب رکھی اس نے شفقت و محبت سے پڑھایا۔ تمہیں طالب علموں کی قدر و منزلت کا کیا پتہ اگر مسافرت اختیار کرتے اور بھیک مانگ کر کھانا کھاتے تو طالب علمی کی قدر معلوم ہوتی۔ طلب علم کی کیفیت ہم سے پوچھو کہ ساری ساری رات کتب بینی میں بسر ہو جایا کرتی تھی۔

دراز می شب از مژگان من پرس
کہ یک دم خواب در چشم نخفت است

خبردار! اگر ہمارے طالب علموں کو آئندہ کچھ کہا۔ خیر قصہ رفع دفع ہو گیا پھر کبھی کسی طالب علم کو کچھ نہیں کہا۔

تذکرہ خوشیہ میں ہے کہ حضرت شاہ نور علی علیہ الرحمۃ علامہ کو یہ واقعہ یاد دلا کر سے خوب ہنسی مذاق کرتے تھے۔

علامہ فضل حق خیرآبادی رحمۃ اللہ علیہ کٹر حنفی اور سلف صالحین رحمہم اللہ کے عقائد و مسائل پر مضبوطی سے عمل پیرا تھے۔ یہاں تک کہ جب اسماعیل دہلوی نے عقائد وہابیہ کا ہندوستان میں آغاز کیا تو سب سے پہلے علامہ کی ذات ہے جنہوں نے ان کو دلائل قاہرہ و براہین باہرہ سے لاجواب فرمایا۔ تحقیق الفتویٰ اور امتناع النظیر جیسی تصانیف مبارکہ شاہد ہیں کہ حضرت علامہ رحمۃ اللہ علیہ نے ایسا موثر کارنامہ سرانجام دیا اور آپ ہی کی ذات بابرکات اور تحقیقات کی وجہ سے مشاہیر دہلی و اکابر ہند اسماعیل دہلوی کے نظریات کے تحقی سے مخالف ہو گئے تھے۔ یہاں تک کہ مرزا غالب باوجودیکہ ایک آزاد منش شاعر تھے وہ بھی آپ کے علمی دبدبہ اور شان و شوکت سے متاثر ہو کر اسماعیل دہلوی کے رد عقیدے کے رد میں ایک قلم لکھنے پر مجبور ہو گئے۔

تاریخ کے اوراق شاہد ہیں کہ انگریز نے جب ہمارے ملک میں قدم جمائے تو جان ہتھیلی پر رکھ کر لڑنے والے صرف اور صرف علماء اور مشائخ اہل سنت ہی تھے۔ ان کے سر خیل حضرت علامہ فضل حق رحمۃ اللہ تھے۔ ان کے ساتھ انگریز کا صرف دو سلوک پڑھیے جو جزیرہ انڈمان میں پیش آیا۔

جزیرہ انڈمان میں علامہ اور ان کے رفقاء کو کیا کیا مظالم برداشت کرنے پڑے یہ ایک ایسی داستان ہے جسے سن کر رونگٹے کھڑے ہو جائیں۔ پتھر کا پتہ بھی ہو تو وہ بھی پانی ہو جائے۔ خود وہاں کا سپرنٹنڈنٹ علامہ کے فضل و کمال سے واقف ہوا اور ساتھ ہی ساتھ علامہ کی تکالیف کا جائزہ لیا تو فرط الم سے اس کے آنسو چھلک پڑے۔

زندہ ہو جاتے ہیں جو مرتے ہیں حق کے نام پر

سپرنٹنڈنٹ ایک شریف انگریز تھا۔ مشرقی علوم سے واقفیت رکھتا تھا اور فن ہیئت کا بڑا ماہر تھا۔ اس کی فرمائش میں ایک مزایقہ مولوی صاحب بھی تھے۔ انہیں ایک فارسی کی کتاب ہیئت کی دی تاکہ اس کی عبارت صحیح کر دیں۔ مولوی صاحب سے تو کام چلا نہیں 'علامہ' نے لے گئے تھے اور ایک ہی سال گزرا تھا۔ ان کی خدمت میں کتاب پیش کر کے صحیح کی گزارش کی۔ علامہ نے نہ صرف عبارت درست کر دی بلکہ بہت کچھ اضافہ کر دیا اور حاشیہ پر بہت سی کتب کے حوالے لکھ دیے۔

یہ کتاب جب وہ مولوی صاحب سپرنٹنڈنٹ کے پاس لے گئے تو وہ دیکھ کر حیران و ششدر رہ گیا۔ کہنے لگا مولوی صاحب تم بڑا لائق آدمی ہے مگر جن کتابوں کے حوالے ہیں وہ یہاں کہاں ہیں اور ان کی جو عبارتیں نقل کی ہیں وہ کہاں ہیں؟ مولوی صاحب مسکرائے اور اصل واقعہ علامہ کا کہہ سنایا۔ وہ اسی وقت مولوی صاحب کو لے کر بیرک میں آیا۔ علامہ موجود نہ تھے کچھ دیر انتظار کے بعد دیکھا کہ توشہ بغل میں دبائے چلے آرہے ہیں۔ وہ یہ حالت دیکھ کر آنکھوں میں آنسو بھر لایا۔ معذرت کے بعد کلرکی میں لے لیا اور گورنمنٹ میں سفارش بھی کی۔

خود علامہ وہاں کی حالت اس طرح بیان فرماتے ہیں کہ: "مجھے دشمن ترش رونے دریائے شور کے کنارے ایک مضبوط ناموافق آب و ہوا والے پہاڑ پر پہنچا دیا جہاں سورج ہمیشہ سر پر ہی رہتا تھا۔ اس میں دشوار گزار گھاٹیاں اور راہیں تھیں جنہیں دریائے شور کی لہریں ڈھانپ لیتی تھیں۔ اس کی نسیم صبح بھی گرم و تیز ہوا سے زیادہ سخت اور اس پر زہریلا عمل سے زیادہ مضر تھی۔ اس کی غذا انڈمان (حنظل) سے کڑوی اس کا پانی سانپوں کے زہر سے بھی بڑھ کر ضرر رساں تھا۔ اس کا آسمان خشوں کی بارش کرنے والا اور اس کی زمین آبلہ دار تھی۔ اس کے سنگریزے بدن کی پھنسیاں اور اس کی ہوا ذلت و خواری کی وجہ سے نیم جھی و خراب تھی۔ ہر کوٹھڑی پر پتھر تھا جس میں رنج و مرض بھرا ہوا تھا۔ ہوا بدبو دار مرض کا خزن بیماریاں بے شمار غارش و قحباء (جس سے بدن کی کھال پھٹنے لگتی ہے) عام تھی۔ بیماری کی شفایابی کی کوئی صورت نہ تھی۔ معالج رنج و تکلیف میں اضافہ کرنے والا تھا"۔

جزیرہ انڈمان میں جس وقت علامہ فضل حق خیرآبادی اپنے بستر موت پر تھے۔ اٹھنے کروٹ بدلنے پر مجبور تھے اور بغیر کسی سہارے بیٹھ نہ سکتے تھے۔ زندگی کا آخری وقت تھا۔ موت قدم چومتی ہوئی زندگی ہزار بلائیں لے کر رخصت ہو رہی تھی۔ زندگی کے ایسے نازک مرحلے پر آپ کی غیرت ایمانی کا ایسا سنگین امتحان لیا گیا جس کی مثال شاذ و نادر ہی کہیں مل سکے گی۔

چنانچہ اسی کرب و اضطراب کی حالت میں ایک انگریز افسر آیا اور اس نے حضرت علامہ سے کہا کہ اگر آپ محض

اتنا فرمادیں کہ مجھے اپنے اس فتوے پر افسوس ہے جو میں نے انگریزوں کے خلاف جہاد کا دیا تھا تو میں ابھی ابھی آپ کو رہا کر دیتا ہوں۔ بستر مرگ کا وہ نحیف و نا تواں جو بیٹھ کر دوا پینے سے بھی معذور تھا۔ اتنا سنتے ہی گرج دار آواز کے ساتھ اٹھ کر بیٹھ گیا اور انگریز افسر سے فرمایا مجھے ایسی ایک نہیں ہزار زندگیاں دی جائیں تو فضل حق یہی کہے گا کہ انگریز کے خلاف جہاد فرض ہے۔

ادھر مجاہد جلیل علامہ فضل حق خیرآبادی جزیرۂ انڈمان روانہ کر دیے گئے اور ادھر آپ کے صاحبزادے مولانا عبدالحق خیرآبادی، مولوی شمس الحق، مفتی انعام اللہ اور خواجہ غلام غوث نے منشی ایلفنسٹن مغربی کی وساطت سے اپیل داخل کرادی۔ علامہ کے جزیرہ انڈمان پہنچنے سے پہلے مفتی عنایت احمد کاکوروی، مفتی مظہر کریم اور دوسرے مجاہد علماء وہاں پہنچ چکے تھے۔ ان حضرات نے وہاں بھی تصنیف و تالیف کا سلسلہ جاری رکھا۔ مفتی عنایت احمد کاکوروی نے علم الصیغہ جیسی فن صرف کی بہترین کتاب جو آج تک داخل نصاب ہے وہیں لکھی۔ تاریخ حبیب الہ بھی وہیں لکھی گئی اور یہی اس کا تاریخی نام ہے۔ علامہ فضل حق نے بھی کئی مفید تصانیف لکھیں۔ علامہ اور ان کے ساتھیوں کو جزیرۂ انڈمان میں کیا کیا تکلیفیں جھیلنا پڑیں اور انہیں کیسے ذلت آمیز برتاؤ سے سابقہ رہا ان سب کا تذکرہ علامہ کے رسالہ الثورۃ الہندیہ میں موجود ہے۔

مولانا فضل امام کا وہ شہزادہ جو کبھی ہاتھی اور پالکی پر بیٹھ کر باپ کی آغوش محبت میں درس پاتا تھا۔ آج وہی جزیرۂ انڈمان میں سر پر ٹوکرا اٹھا رہا ہے۔ جسے دیکھ کر بعض انگریز بھی آنسو بھر لائے۔ ادھر مولوی شمس الحق اور خواجہ غلام غوث وغیرہ رہائی کی جان توڑ کوشش کر رہے تھے۔ یہاں تک کہ مولوی شمس الحق پروانہ رہائی حاصل کر کے جزیرہ انڈمان روانہ ہوئے۔ وہاں جہاز سے اتر کر شہر گئے تو ایک جنازہ پر نظر پڑی جس کے ساتھ بڑا ہجوم تھا۔

عاشق کا جنازہ ہے ذرا دھوم سے نکلے

دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ کل 12 صفر 1278ھ مطابق 20 اگست 1861ء کو علامہ فضل حق کا انتقال ہو گیا اور اب سپرد خاک کرنے جا رہے ہیں۔ ﴿انا للہ وانا الیہ راجعون﴾

علامہ فضل حق خیر آبادی
ایک تحقیقی وتجزیاتی مطالعہ

ڈاکٹر شاہد حسن رضوی

ڈاکٹر شاہد حسن رضوی معروف ادیب وشاعر سید شہاب دہلوی کے ہاں 1957ء میں بہاولپور میں پیدا ہوئے۔ سید شہاب دہلوی کا شمار اپنے وقت کے مستند ومعتمد مورخین اور اہل قلم میں ہوتا ہے۔ سید شہاب صاحب نے اپنے اہل خانہ کی تعلیم وتربیت بھی اس نہج پر کی ہے کہ ان کی نقریباً تمام اولاد شاعر وادیب ہے۔ شہاب صاحب کے چھوٹے بیٹے ڈاکٹر شاہد حسن نے اپنی تمام تعلیم بہاولپور سے حاصل کی حتیٰ کہ انہوں نے ڈاکٹریٹ (PHD) کا مقالہ بعنوان "بہاولپور کی تعلیمی وسماجی تاریخ" لکھ کر بہاولپور یونیورسٹی سے ہی پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ ڈاکٹر صاحب کا شمار انجمن طلباء اسلام بہاولپور کے بانیان میں ہوتا ہے۔ 1974ء کی تحریک ختم نبوت اور 1977ء کی تحریک نظام مصطفیٰ ﷺ میں آپ نے طلباء محاذ کے صدر کی حیثیت سے بھرپور خدمات انجام دیں۔ غزالی زماں علامہ سید احمد سعید کاظمی علیہ الرحمۃ سے آپ کا بیعت کا تعلق ہے۔ ان کے علاوہ قائد اہلسنت علامہ شاہ احمد نورانی صدیقی "مجاہد ملت مولانا عبدالستار خاں نیازی اور حکیم محمد موسیٰ امرتسری علیہم الرحمۃ سے نیاز مندانہ تعلقات تھے۔

1990ء میں والد محترم کے وصال کے بعد سے اب تک آپ ماہنامہ الہام کے روح رواں ہیں۔ اس کے علاوہ معروف ومقبول علمی وادبی جریدے سہ ماہی "الحبیر" کے ایڈیٹر ہیں۔ سہ ماہی الحبیر کو یہ اعزاز حاصل ہے اس کی خدمات پر ملک بھر کی کئی یونیورسٹیوں میں ایم فل اور پی ایچ ڈی کی سطح کے مقالے لکھے گئے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب اس وقت اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور کے شعبہ تاریخ ومطالعہ پاکستان میں ایسوسی ایٹ پروفیسر، اردو اکیڈمی بہاولپور کے جنرل سیکرٹری اور ٹی وی ریڈیو کے فیچر رائٹر ہیں۔

برصغیر پاک وہند میں اشاعت اسلام اولیاء وعلمائے سلف کی رہین منت ہے۔ جن کی کوششوں سے یہاں عظیم خانقاہی نظام کی بنیاد پڑی۔ مغلوں کی آمد کے بعد یہ نظام کمزور ہوتا چلا گیا۔ اولیاء وعلماء کی گوشہ نشینی میدان سیاست

سے دوری کا باعث بنی۔ چنانچہ دورِ اکبری (۱۵۵۶ء.....۱۶۰۵ء) سے پہلے علماء کا ریاستی معاملات میں دخل نہ ہونے کے برابر رہ گیا۔ اکبر اعظم نے علماء اور پنڈتوں کو سیاستِ میں لانے کی کوششیں کیں اور وہ اس کے عہدِ حکومت کے آخری حصے میں "دینِ الٰہی" کے پس منظر میں افراط و تفریط کا شکار ہو کر رہ گئیں۔ اس طرح انیسویں صدی کے وسط تک ریاستی امور میں علماء کا عنصر کافی حد تک دبا رہا۔ اٹھارویں صدی کا آخری اور انیسویں صدی کا ابتدائی عہد اپنے جلو میں افراتفری اور طوائف الملوکی کے عناصر لیے ہوئے تھا اور زوالِ مغلیہ سلطنت کے دروازے پر مسلسل دستک دیے جا رہا تھا۔ انگریزوں کا اقتدار ملک میں قائم ہو چکا تھا۔ اس صورتحال سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ہر صوبہ اور ہر ریاست بجائے خود مطلق العنان بن بیٹھے تھے۔ اس طرح تاجِ دہلی بے وقعت ہو کر رہ گیا تھا۔ بالخصوص پنجاب میں سکھا شاہی مغل اقتدار کے لیے ایک مستقل خطرہ بن کر ابھری جس سے نمٹنا جانا ضروری تھا۔ یہ خطرہ اس حد تک بڑھا کہ انگریز بھی سکھوں کی بڑھتی ہوئی طاقت کے آگے بے بس ہو کر رہ گئے۔ سکھوں کا المیہ یہ تھا کہ وہ اورنگ زیب کی مذہبی پالیسی کے ردِ عمل کے طور پر مسلمانوں سے انتقام پر تل گئے تھے۔ انہوں نے جگہ جگہ مسلمانوں کو تنگ کرنا شروع کر دیا۔ اکثر مقامات پر سکھ فوجیوں نے جوتوں سمیت مساجد میں داخل ہو کر ان کے تقدس کو پامال کیا اور وہاں اذانوں پر پابندی لگا دی۔ پنجاب میں مسلمانوں پر زیادتی کی خبریں جب برصغیر کے دیگر حصوں میں پہنچیں تو سارے برصغیر میں بے چینی اور اضطراب کی لہر دوڑ گئی۔ آزادی کا موقع آیا تو علماء ایک بار پھر میدانِ عمل میں آ گئے۔

مسلمانانِ برصغیر کے سیاسی ابتلاء کا آغاز اورنگ زیب عالمگیر کی وفات (1707ء) سے ہوا۔ اورنگ زیب کے جانشین اس اہل نہ تھے کہ وہ برصغیر کی وسیع و عریض سلطنت کو سنبھال سکتے۔ [illegible] ذرائع مواصلات کی عدم موجودگی میں ریاستی اکائیوں کو متحد رکھنے کا واحد حل فوجی طاقت کا استعمال تھا۔ مگر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مغل فوج کے انتظام و انصرام میں بھی ابتری در آئی۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مرکز سے دور افتادہ صوبوں میں گورنروں نے خود مختاری کا اعلان کر دیا۔ مزید یہ کہ انگریزوں نے ریاستوں کے اندرونی انتشار اور باہمی چپقلش سے فائدہ اٹھاتے ہوئے خود کو سیاسی طور پر بھی مضبوط کرنا شروع کر دیا۔ ع

جنگِ پلاسی 1757ء، جنگِ بکسر 1764ء، سقوطِ میسور 1799ء اور سقوطِ دہلی 1857ء انگریزوں کی سیاسی چالبازیوں اور دجل و فریب کے نمایاں مظاہر تھے لیکن برصغیر پاک و ہند کے حکمران انگریزوں کے بڑھتے ہوئے سیلاب کے آگے بند نہ باندھ سکے۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ انگریزوں نے کاروبارِ زندگی کو اپنے وضع کردہ اصول و ضوابط

کی روشنی میں بلا خوف و تردد چلانا شروع کر دیا۔ سو مغل بادشاہوں نے کمپنی کی دخیلہ خواری میں عافیت اندوزی۔ مگر برصغیر کے غیور عوام، انگریزی اقتدار سے نالاں تھے، انگریزوں کی من مانیوں اور معاشی استحصال نے بالآخر ایک جوالہ مکھی کی صورت اختیار کر لی جو جنگ آزادی 1857ء کی صورت اختیار کر گیا۔ ۳

جنگ آزادی میں ہر مکتبہ فکر سے تعلق رکھنے والے افراد نے حصہ لیا۔ تاہم جن افراد نے تاریخ کے اوراق میں جگہ پائی ان میں طبقہ علماء سرفہرست ہے۔ علماء میں مولانا احمد اللہ شاہ، مولانا فیض احمد بدایونی، مولانا کفایت علی کافی، مولانا سید فضل حق شاہجہان پوری، مولوی فضل عظیم بریلوی، مولانا حکیم سعید اللہ قادری، مولوی ابو الحسن فرنگی علی، مولانا تراب علی لکھنوی اور مولانا فضل حق خیرآبادی وغیرہ قابل ذکر ہیں ۴ تاہم ان تمام شخصیات میں جس عالم دین نے عالمگیر شہرت پائی وہ مولانا فضل حق خیرآبادی تھے۔

مولانا فضل حق خیرآبادی 1797ء میں صوبہ اودھ کے مشہور قصبہ خیرآباد میں مولانا فضل امام کے ہاں پیدا ہوئے جو ایک جید عالم دین تھے۔ ان کے والد دہلی کے صدر الصدور کے عہدہ جلیلہ پر فائز تھے۔ 33 واسطوں سے علامہ فضل حق کا سلسلہ نسب خلیفہ ثانی حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے ملتا ہے۔ آپ بہت ذکی اور فطین تھے۔ محض 13 برس کی عمر میں علوم دینی و دنیوی سے فراغت حاصل کر لی۔ چار مہینوں میں قرآن پاک حفظ کر لیا۔ معقولات کی تعلیم اپنے والد بزرگوار اور جبکہ معقولات میں شاہ عبدالقادر اور شاہ عبدالعزیز سے کسب علم کیا۔ ۵ 28 برس کی عمر میں والد ماجد کی وفات کے بعد دہلی میں سررشتہ داری کی حیثیت سے ملازمت اختیار کی۔ بعد ازاں لکھنؤ کے صدر الصدور بنا کر بھیجے گئے مگر انگریزی ملازمت ان کی افتاد طبع کے خلاف تھی چنانچہ استعفیٰ دے کر نواب فیض محمد خاں والی جھجر کی ملازمت اختیار کر لی۔ ۶ یہاں کچھ عرصہ قیام کے بعد مہاراجہ الور اور پھر نواب آف ٹونک کے پاس رہے۔ یہاں بھی زیادہ عرصہ نہیں لگے اور رامپور چلے گئے جہاں نواب یوسف علی خاں نے نائب ریاست کا عہدہ تفویض کیا۔ ۷ یہاں سے استعفیٰ دے کر دوبارہ دہلی آ گئے۔

اپنے ہم عصر علماء کی روایت کے برخلاف مولانا فضل حق خیرآبادی کو فن تعمیہ اور فن گوئی میں خاص ملکہ حاصل تھا۔ عربی اور فارسی میں اشعار کہتے تھے۔ فارسی میں فرقی تخلص کرتے تھے۔ شعر و شاعری میں اسی دلچسپی کی بدولت ان کے غالب سے بہت اچھے اور مخلصانہ تعلقات تھے۔ بلکہ یہاں تک کہ غالب نے انہی کے ایماء پر سہل نگاری کی ابتدا کی۔ ۸ غالب کے علاوہ ان کے امام بخش صہبائی، حکیم مومن خاں مومن، ذوق، مفتی صدر الدین آزردہ اور ولی عہد سلطنت بہادر شاہ ظفر سے بہت گہرے تعلقات تھے۔ دہلی کے قیام کے دوران مولانا فضل حق اور مفتی صدر الدین آزردہ کی رہائش گاہیں علماء اور شعراء کی نشست گاہیں تھیں۔ ۹

WWW.NAFSEISLAM.COM

مولانا کے نزدیک انگریز مسلمانوں کو معاشی طور پر مفلوج کر کے ان کی دینی غیرت وحمیت کو ختم کرنا چاہتے تھے۔ مولانا نے انگریز کی انہی پالیسیوں کو جنگ آزادی 1857ء کی اہم وجہ بتایا ہے۔ تحریک آزادی کے اسباب وعوامل کو "الثورۃ الہندیہ" میں اس طرح بیان فرمایا: "انگریزوں نے بچوں کو اپنا دین اور اپنی زبان سکھانے کے لیے جگہ جگہ اسکول کھولے اور دینی مدارس کو ختم کرنے کی پوری کوشش کی۔ ملک کی تمام پیداوار خود لیتے اور پھر ملک کی قیمت اور سپاہی پر اجارہ داری قائم کر لیتے۔ اس سے ان کا مقصد یہ تھا کہ خلق خدا ہماری دست نگر ہو جائے اور بے چون وچرا ہمارے احکام کی تعمیل کرے۔ شعائر اسلامی کو روکنے کی بھرپور کوشش کی بالخصوص خواتین کا پردہ ختم کرانے کی کوشش کی۔ مسلمان فوجیوں کو سؤر کی چربی والے اور ہندوؤں کو گائے کی چربی والے کارتوس دیے گئے جو منہ سے کاٹنے پڑتے تھے۔" [۱۴]

ان کی تحریروں میں انگریز سے نفرت روز روشن کی طرح عیاں تھی۔ فتاویٰ میں یہاں تک فرماتے ہیں: "بعض قرائن سے ثابت ہے کہ ان (انگریزوں) کی محبت کفر ہے۔ کسی حق پرست انسان کو اس میں شک نہیں ہو سکتا۔ نصاریٰ سے محبت کس طرح جائز ہو سکتی ہے جب کہ یہ لوگ اس ذات اقدس ﷺ کے دشمن ہیں جن کے طفیل ارض وسما پیدا کیے گئے۔" [۱۵]

مولانا کے انگریزوں کے متعلق یہ جذبات صرف جذبہ عقیدت پر مبنی نہیں تھے۔ وہ انگریزوں کے بڑھتے ہوئے تسلط کے اس لیے مخالف نہیں تھے کہ انگریز غیر ملکی تھے بلکہ اس کی بنا مذہب پر ہے جیسا کہ مندرجہ بالا اقتباس سے بھی ظاہر ہے۔ ان کو غم انگریزوں کے قبضے کا نہیں تھا بلکہ نصاریٰ کے قبضے کا تھا اور نصاریٰ سے تعلق شرعاً ممنوع ہے۔ [۱۶] مولانا یہ بھی محسوس کر رہے تھے کہ انگریزوں کی نظر میں ملک پر ان کے بعد کیونکہ انہی کی حکومت کے استحکام کے لیے اس ملک کے تمام باشندوں کا صرف ایک مذہب (یعنی عیسائیت) ہونا ضروری ہے اور اس سلسلے میں وہ نظام تعلیم تبدیل کرنے کے ساتھ ساتھ جگہ جگہ سکولوں کا جال بچھاتے چلے جا رہے تھے۔

رئیس احمد جعفری کے بقول "افضل حق خیر آبادی انگریزوں سے نفرت کرتے تھے اور انگریزوں کو ہندوستان سے نکالنے کے لیے ہر منظم اور باقاعدہ تحریک میں حصہ لینے پر دل وجان سے آمادہ رہتے تھے۔ چنانچہ جب غدر شروع ہوا تو مولانا بے تامل شریک ہو گئے۔ وہ بہادر شاہ ظفر کے معتمد، مقرب اور مشیر تھے۔ ان کے دربار میں شریک ہوا کرتے تھے، انہیں اہم مسائل ومعاملات پر مشورے دیتے تھے اور اس بات کے ساعی تھے کہ آزادی کی یہ تحریک کامیاب ہو اور انگریز اس دیس سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے رخصت ہو جائے۔ مولانا نے غدر میں دلیری اور جرأت کے ساتھ اطمینان بخش حصہ لیا۔ انہوں نے متحدہ الیان ریاست اور امرائے ہند کو اس تحریک میں شامل کرنے کی

کوشش کی۔ جس جس والی ریاست سے ان کے ذاتی تعلقات اور مراسم تھے ان کی تائید اور حمایت حاصل کی اور مالی امداد کے لیے مجبور کیا"۔ ۱۷

انہوں نے ایک طرف نہ صرف انگریز کے خلاف اعلان جہاد کیا بلکہ جہاد کی تبلیغ کر کے لوگوں کو جہاد میں شامل کیا۔ حتیٰ کہ بہادر شاہ ظفر کو مرکزی حیثیت سنبھال کر تحریک آزادی کی قیادت کے لیے تیار کیا۔ ۱۸ عیش و عشرت اور فسق و فجور میں غرق شہزادوں کو ان کے خوفناک انجام سے آگاہ کیا۔ مختلف علاقوں سے مجاہدین آزادی کے دستوں کے درمیان ربط و ضبط اور مرکزیت پیدا کی۔ ہندوؤں کی معاونت کے حصول کے لیے ایک شاہی فرمان کے ذریعے گاؤکشی بند کر دی گئی۔ ۱۹ مرکز میں ایک سیکرٹریٹ قائم کر کے مجاہدین کی اعانت کے لیے سامان رسد کی فراہمی اور مالی امداد کا بندوبست کیا گیا۔ ان اقدامات کے ساتھ ساتھ مولانا نے تحریک آزادی کا ایک جامع دستور بھی مرتب کیا۔ اس دستور کی بنیاد جمہوری اصولوں پر رکھی گئی تھی یعنی رعایا کو کاروبار سلطنت میں شریک کرنے کے لیے دفعات مرتب کی گئی تھیں۔ ۲۰

تحریک آزادی میں مولانا فضل حق خیر آبادی کا بھرپور اور نمایاں کردار اس وقت ہمارے سامنے آتا ہے جب انہوں نے 1857ء میں انگریزوں کے خلاف فتویٰ جاری کیا۔ اس فتوائی پر اس وقت کے ممتاز علمائے دین مفتی صدرالدین خان آزردہ، مولانا عبدالقادر، قاضی فیض احمد بدایونی، ڈاکٹر وزیر خان اکبر آبادی اور سید مبارک حسین رام پوری نے دستخط کر دیے۔ ۲۱ فتویٰ کے اجراء نے عوام میں جوش و خروش کو مزید بڑھا دیا۔ دوسری طرف انگریزوں نے بھی ظلم کی انتہا کر دی۔ زندہ مسلمانوں کو سوّر کی کھال میں سلوا کر جلتے تیل میں ڈالا گیا۔ فتح پوری مسجد میں لال قلعہ کے دروازے تک مسلمانوں کی لاشوں کو درختوں سے لٹکایا گیا۔ مسلمانوں کے بے حرمتی کی گئی جامع مسجد دہلی کے حجروں میں گھوڑوں کو باندھا گیا۔ ۲۲

جب دہلی شہر پر انگریزوں کا مکمل قبضہ ہو گیا تو انگریزوں نے مسلمانوں کا خون اور پانی بند کر دیا۔ ان حالات میں علامہ فضل حق پانچ روز تک بھوکے پیاسے مکان میں بند رہے اور بعد ازاں لکھنؤ پر فتح حاصل کی۔ گھر چلے گئے اور پھر وہاں سے ریلی چلے گئے اور وہاں روپوش رہے۔ بعض کے نزدیک قریباً 20 دن یہاں رہنے کے بعد آپ اپنے آبائی شہر خیر آباد چلے گئے۔ ۲۳

ادھر جنرل بخت خان لکھنؤ پہنچ کر احمد اللہ شاہ ولد ار جنگ سے جا ملے اور انگریزوں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا لیکن شکست کھا کر شاہ جہاں پور گئے اور پھر محمد پوری میں اسلامی حکومت قائم کر لی۔ تاج صاحب پیشوا، مولوی عظیم اللہ کانپوری اور شہزادہ فیروز شاہ وغیرہ نے بھی جنرل بخت خاں کا ساتھ دیا مگر وسائل اور افرادی قوت کی کمی آڑے آئی

اور مجاہدین کو شکست ہوئی۔ [۲۳]

ستمبر دہلی کے باوجود ملکہ اودھ حضرت محل نے نہایت جرأت کا مظاہرہ کیا۔ بھاگ کر آنے والوں کو پناہ دی اور اپنی فوج کو مختلف علاقوں کا انتظام کرنے اور دریا کے گھاٹوں کی حفاظت کے لیے متعین کر دیا۔ علامہ فضل حق بھی بھیکن سے خبر پر پہنچ چکے تھے۔ لہٰذا ملکہ کی پارلیمنٹ میں بطور مشیر خاص شریک ہوئے اور اہم کردار ادا کیا۔ [۲۴]

علامہ فضل حق خیرآبادی نے جنگ آزادی کا حال اپنی کتاب "الثورۃ الہندیہ" یعنی باغی ہندوستان بیان کیا ہے: "نصاریٰ جب لڑتے لڑتے تھک گئے تو ہندوؤں سے مدد اور معاونت کے طالب ہوئے۔ ہندوؤں نے کثیر لشکر اور ساز و سامان حرب سے تھوڑی سی مدت میں ان کی بے در پے مدد کی۔ جب نصاریٰ نے سخت آزمائی کی ٹھان لی۔

چار مہینے تک متواتر جنگ ہوتی رہی۔ کمر توڑ کثیر لاؤ لشکر اور ساز و سامان کے باوجود شہر میں داخل نہ ہو سکا۔ آخر مجاہدین کی ایک مختصر سی جماعت رہ گئی۔ جو بھوک، پیاس برداشت کر کے رات گزارتی اور صبح ہوتے ہی مقابلہ پر ڈٹ جاتی۔ بدقسمتی سے ایک شب بھاری بارش اور کسل مند جماعت مقرر کر دی گئی جو ہتھیار اتار کر آرام کی نیند سو گئی۔ دشمن نے موقع غنیمت سمجھ کر شب خون مارا اور ان کے ہتھیاروں پر قبضہ کر کے انھیں موت کی نیند سلا دیا۔

جب نصاریٰ نے اس محاذ پر قبضہ کر لیا تو بہت سی توپیں اور عمدہ عمدہ شہر کے قریب نصب کر دیں اور دن رات گولیوں کا مینہ برسانا شروع کر دیا۔ جس سے شہر پناہ کا پھاٹک گر پڑا اور امیدوں کے رشتے ہاتھ سے چھوٹ گئے۔

اب فیلوں اور دوسرے ہندوؤں نے جو نصاریٰ کے دوست تھے اپنا حلقہ چھپا لیا اور باہر سے آنے والے غلہ کی آمد روک دی گئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ لشکری اور شہری بھوک سے پریشان ہو کر شہر سے بھاگ گئے اور دشمن نے شہر پناہ، قلعہ بازار اور مکانوں پر قبضہ جمالیا"۔ [۲۵]

مولانا فضل حق کے بقول ہندوستان پر اپنا تسلط مکمل کر لینے کے بعد انگریز نے اقتدار کے لیے دو اہم اسکیمیں متعارف کرائیں۔ ① سابقہ علوم اور درس و نصاب ختم کیے گئے بعد ازاں سکولوں کی یکساں تعلیم کا رواج جس سے ہر مذہب و ملت کے افراد ایک ہی رنگ میں رنگے جائیں۔ ② معاش پر کنٹرول کر کے عوام کو زیر تسلط لایا جائے۔ [۲۶]

بقول علامہ خیرآبادی: "انگریزوں نے اچھی طرح سمجھ لیا تھا کہ مذہبی بنیاد پر فرقوں کا اختلاف تسلط و قبضہ کی راہ میں سنگ گراں ثابت ہوگا اور سلطنت میں انقلاب پیدا کر دے گا اس لیے پوری تندہی اور جانفشانی کے ساتھ مذہب و ملت کے مٹانے کے لیے طرح طرح کے مکر و حیلہ سے کام لینا شروع کر دیا۔ اس نے بچوں اور نابچوں کی تعلیم اور اپنی زبان و مذہب کی تلقین کے لیے شہروں اور دیہات میں مدرسے قائم کیے۔ پچھلے زمانہ کے علوم

ومعارف اور مدارس ومکاتب کے منانے کی پوری کوشش کی۔

دوسری ترکیب یہ سوچی کہ مختلف طبقات پر قابو اس طرح حاصل کیا جائے کہ زمین ہند کے غلہ کی پیداوار کاشتکاروں سے لے کر فقد دام ادا کیے جائیں اور ان چیزوں کو خرید وفروخت کا کوئی اختیار نہ چھوڑا جائے۔ اس طرح نرخ کے گھٹانے بڑھانے اور منڈیوں تک اجناس پہنچانے اور نہ پہنچانے کے خود ہی ذمہ دار بن بیٹھیں۔ اس کا مقصد اس کے سوا کچھ نہیں کہ خدا کی مخلوق مجبور ومقدور ہو کر ان کے قدموں میں آگرے اور خوراک وغیرہ کے نہ ملنے پر ان کے ہر حکم کی تعمیل اور ہر مقصد کی تکمیل کرے"۔ [۲۹]

پہلے مقصد کے حصول کے لیے لارڈ میکالے جیسے گرگ جہاندیدہ کو آگے بڑھایا گیا جس نے 1835ء میں ایسا نظام تعلیم دیا جس کے خون اور رنگ کے اعتبار سے ہندوستانی مگر عادات، اطوار اور زبان ومزاج کے لحاظ سے انگریز تیار کیے جانے لگے۔ [۳۰]

مولانا فضل حق نے حادثہ بالاکوٹ" واقعہ ٹانوان گڑھی" اکبر شاہ ثانی اور بہادر شاہ ظفر کی بے بسی" والی اودھ نواب واجد علی شاہ کی معزولی اور دلی ولکھنؤ کی بربادی کو چشم حیرت سے دیکھا۔ کلکتہ کے بادری ای ایڈ منڈ نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ: "برٹش راج میں تمام ہندوستان میں ایک عملداری ہوگئی ہے۔ تار برقی سے سب جگہ کی خبر ایک ہوگئی ہے۔ ریلوے سڑک سے سب جگہ کی آمد ورفت ایک ہوگئی۔ مذہب بھی ایک چاہیے اس لیے مناسب ہے کہ تم لوگ بھی عیسائی مذہب ہو جاؤ"۔ [۳۱]

اس وقت کے ہندوستان کے حالات ہندوستانیوں بالخصوص مسلمانوں کے لیے انتہائی حد تک ناموافق ہو چکے تھے۔ ان حالات میں سوائے اس کے کوئی چارہ کار نہیں تھا کہ ہندوستان کو بزور بازو دار الکفر بننے سے روکا جاتا۔ ایسے وقت میں علمائے حق پر زیادہ سے زیادہ ذمہ داری عائد ہوتی تھی۔ چنانچہ مولانا فضل حق خیرآبادی نے آتش شوق جہاد بھڑکانے کے لیے اگر یزوں کے خلاف فتوئی جہاد جاری کیا اور میدان عمل میں آگئے۔ تاہم اگر چہ منظم انداز میں اور کافی تیاری کے بعد آگے بڑھے تھے۔ اس لیے تحریک آزادی ناکامی سے دوچار ہوئی۔ مقبوضہ دلی کے بعد مولانا فضل حق خیرآبادی لکھنؤ چلے گئے جہاں بیگم حضرت محل کی معیت میں جنگ آزادی کو کسی نہ کسی طور جاری رکھا جیسا کہ علامہ فضل حق پر قائم کردہ رپورٹ سے معلوم ہوتا ہے: "یہ بات ان ایام میں عام طور پر مشہور تھی کہ چند آدمی بیگم (حضرت محل) کے مشیران خاص تھے۔ باغی فوج میں ان کی "مدبرہ شوریٰ" کے نام سے شہرت تھی بلکہ کبھی کبھی انہیں بکھری پارلیمنٹ کے نام سے بھی پکارا جاتا تھا۔ اس شوریٰ میں ملزم (علامہ فضل حق) بہت ممتاز تھا"۔ [۳۲]

علامہ پر الزام قائم کیا گیا کہ انہوں نے تیکم حضرت محل کے مشیر ہونے کی حیثیت سے بونڈی (لکھنؤ سے ملحقہ علاقہ) میں دو ایسے اشخاص کے قتل کا فتویٰ جاری کیا جو انگریز کے وفادار تھے۔ ان اشخاص میں سے ایک نے بیان دیتے ہوئے کہا: "مجھے موخاں اور مولوی فضل حق کے سامنے پیش کیا گیا" موخاں نے مولانا فضل حق سے دریافت کیا کہ میرے (عبدالحکیم) کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے؟ مولانا نے فتویٰ دیا کہ یہ شخص فرنگیوں کا ملازم ہے اس لیے سزائے موت کا مستحق ہے۔ [۳۲]

حالانکہ مولانا کے بقول صحیح صورتحال کچھ یوں تھی: "میری چغلی ایسے مرتد، جنگلی الو، منحوس خواہر اور (عبدالحکیم اور مرتضیٰ حسین) نے کھائی جو مجھ سے قرآن کی محکم آیت میں مجادلہ کرتے تھے جس کا حکم یہ ہے کہ نصاریٰ کا دوست بھی نصرانی ہے۔ وہ دونوں نصاریٰ کی موافقت و محبت پر مصر تھے انہوں نے مرتد ہو کر کفر کو ایمان سے بدل لیا تھا"۔ [۳۳]

مولانا فضل حق خیرآبادی پر 1859ء میں مقدمہ بغاوت چلایا گیا۔ انہوں نے جس جرأت، صداقت وحقانیت اور بلند ہمتی سے اس مقدمہ کا سامنا کیا وہ بجائے خود ایک مثال ہے۔ "1859ء میں سلطنت مغلیہ کی وفاداری یا فتوائے جہاد کی پاداش یا جرم بغاوت میں مولانا خود ہو کر بیتاب پور سے لکھنؤ لائے گئے۔ مقدمہ چلا۔ مولانا موصوف کے فیصلہ کے لیے جو جیوری بنی تھی۔ ایک افسر نے واقعات سن کر بالکل پھوٹ دینے کا فیصلہ کیا۔ سرکاری وکیل کے مقابل خود مولانا بحث کرتے تھے بلکہ لطف یہ تھا کہ چند الزام اپنے اوپر خود قائم کیے اور پھر خود ہی مثل تار شکوت، حقی وقانونی اور سنے تو زدیے۔ جج یہ رنگ دیکھ کر پریشان تھا اور ان سے ہمدردی بھی تھی۔ جج نے صدر الصدوری کے عہدہ میں مولانا سے کچھ عرصہ کام بھی سیکھا تھا۔ وہ مولانا کی عظمت و تبحر سے بھی واقف تھا۔ دل سے چاہتا تھا کہ مولانا بری ہو جائیں۔ کرے تو کیا کرے؟ ظاہر یہ ہو رہا تھا کہ مولانا بری ہو جائیں گے"۔ [۳۴]

مولانا نے اپنے اوپر جتنے بھی الزامات عائد کیے تھے ایک ایک کر کے سب رد کر دیے۔ جس جج نے فتویٰ کی اطلاع دی تھی اس کے بیان کی تصدیق تو نہیں بھی خود ہی کی: "پہلے اس گواہ نے جج کہا تھا اور رپورٹ بالکل صحیح لکھوائی تھی۔ اب عدالت میں میری صورت دیکھ کر مرعوب ہو گیا اور جھوٹ بولا۔ وہ فتویٰ صحیح ہے۔ میرا لکھا ہوا ہے اور آج اس وقت بھی میری وہی رائے ہے"۔ [۳۵]

حالانکہ صورتحال یہ تھی کہ جج بار بار انہیں روکتا تھا کہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ جج نے بھی عدالت کا رخ دیکھ کر مولانا کی شناخت سے گریز کرتے ہوئے کہہ دیا کہ یہ وہ مولانا فضل حق نہیں وہ دوسرے تھے۔ مگر مولانا اپنی بات پر مصر رہے۔ ان کے اقرار و توثیق کے بعد کوئی گنجائش باقی نہیں بچی تھی۔ اس لیے انگریز عدالت نے انہیں حبس دوام

WWW.NAFSEISLAM.COM

دعبور دریائے شور (کالے پانی) کی سزا سنائی۔

چنانچہ مسٹر جان کیمبل' جوڈیشل کمشنر اودھ اور میجر بارو قائم مقام کمشنر خیرآباد نے 4 مارچ 1859ء کو فیصلہ صادر کرتے ہوئے لکھا: "بغاوت شروع ہونے کے وقت وہ (مولانا فضل حق خیرآبادی) الور میں ملازم تھا۔ یہاں سے وہ دہلی آیا اور اس کے بعد وہ باغیوں اور بغاوت کے قدم بہ قدم چلتا رہا۔ ایسے شخص کو سخت ترین سزا ملنا چاہیے اور اسے خاص طور پر ہندوستان سے خارج کر دینا چاہیے"۔ [۳۶]

مولانا فضل حق اگر چاہتے تو مصلحت کوشی کا مظاہرہ کر کے صاف بچ سکتے تھے لیکن انہوں نے حق گوئی کو ہی طرۂ امتیاز بنایا۔ [۳۷] بالآخر مولانا فضل حق جزائر انڈیمان بھیج دیے گئے۔ ان کے جانے سے قبل وہاں مفتی عنایت احمد کاکوروی صدر امین بریلی وکیل مفتی مظہر کریم دریابادی اور کئی دوسرے علماء پہنچ چکے تھے۔ انہی حالتوں پاک طینت کے وجود سے جزائر انڈیمان دارالعلوم میں تبدیل ہو گئے۔ ان حضرات نے تصنیف و تالیف کا سلسلہ وہاں بھی قائم رکھا۔ ہر طرح کے مصائب کے باوجود علمی مشاغل جاری رہے۔ مفتی عنایت کاکوروی کی علم الصیغہ "تواریخ حبیب الہ" اور تقویم البلدان' مفتی مظہر کریم کا مراصد الاطلاع" کا ترجمہ (کمشنر جزائر انڈیمان میجر جان بالٹن کی فرمائش پر) مولانا فضل حق کی الثورۃ الہندیہ' اور قصائد فتنۃ الہند اسی دور کی چند اہم شاہکار کتابیں ہیں۔ [۳۸]

علامہ فضل حق اور ان کے ساتھیوں کو کیا کیا تکالیف اٹھانا پڑیں اور انڈیمان میں انہیں کیسے کیسے ذلت آمیز حالات کا سامنا کرنا پڑا۔ رسالہ قصائد میں اس کا مفصل ذکر موجود ہے۔ [۳۹]

مولانا نے جزائر انڈیمان کی تکلیف دہ زندگی کے باوجود وہاں علمی سرگرمیاں جاری رکھیں۔ جس کی نمایاں مثال ان کی مایہ ناز تصنیف "الثورۃ الہندیہ" (یعنی باغی ہندوستان) ہے۔ ان کے تبحر علمی کے نہ صرف دوست بلکہ دشمن تک قدر دان تھے۔ جس کا اندازہ اس واقعہ سے لگایا جا سکتا ہے کہ جزائر کا سپرنٹنڈنٹ مشرقی علوم سے واقف اور فن ہیئت کا ماہر ایک انگریز تھا۔ اس انگریز نے اپنی ایک فارسی کی کتاب ہیئت' وہاں قید ایک مولوی صاحب کو دی کہ اس کی عبارت کی تصحیح کر دیں۔ جب مولوی صاحب نے اس ضمن میں خود کو بے بس پایا تو مولانا فضل حق سے رجوع کیا اور مطلوبہ تصحیح کی گزارش کی۔

مولانا نے نہ صرف عبارت درست کی بلکہ مباحث میں بہت کچھ اضافہ کر کے حاشیہ پر بہت سی کتب کے حوالے لکھ دیے۔ انگریز افسر مولوی صاحب کی کاوش پر حیران و ششدر رہ گیا اور مولوی صاحب کی لیاقت کی تعریف کی۔ مولوی صاحب نے حقائق چھپانے کے بجائے انگریز سے مولانا صاحب کا ذکر کیا۔ انگریز اسی وقت مولانا

سے ملنے کے لیے ان کی کوٹھڑی میں آیا مگر آپ موجود نہ تھے۔ کچھ دیر انتظار کے بعد مولانا کو ٹہلتا ہوا دیکھا تو بہت افسوس کا اظہار کیا۔ مولانا سے معذرت کی اور انہیں کھڑکی میں لے لیا۔ تاہم جزائر کے موسم، تکالیف اور ناکافی خوراک و دیگر سہولیات کے فقدان نے مولانا کے قویٰ کو مضمحل کر دیا تھا۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مولانا مسلسل بیمار رہنے لگے۔ مولانا کے صاحبزادے مولوی شمس الحق اور خواجہ غلام غوث نے خبر (میر منشی لیفٹیننٹ مفرلی وشمالی صوبہ اودھ) ان کی رہائی کے لیے سرگرم تھے لیکن جب وہ حکومت انگلشیہ سے رہائی کے احکامات لے کر جزائر پہنچے تو مولانا وفات پا چکے تھے اور ان کا جنازہ تیار تھا۔ اس طرح یہ آفتاب علم وعمل دیار غربت میں غروب ہو گیا۔ مولانا کو جزائر انڈیمان میں ہی دفن کر دیا گیا۔ [۴۰]

مولانا پر انگریز مظالم کا سلسلہ ان کی ذات تک ہی محدود نہیں رکھا گیا بلکہ ان کی آئندہ نسلوں کو بھی درس عبرت بنانے کی کوشش کی گئی۔ مولانا فضل حق کا شمار امراء ورؤسا میں ہوتا تھا۔ ان کی عمر قید جزائے کالا پانی کے ساتھ ساتھ ان کی تمام جائیداد ضبط کر لی گئی۔ ان کا خیرآباد کا عالی شان دیوان خانہ اور محل سرا ضبط کر کے خیر خواہی کے صلہ میں سردار محمد ہاشم سیتاپوری کو دے دیے گئے۔ جس نے اسے آگے رئیس کمال پور (ضلع سیتاپور) راجہ جواہر سنگھ کے ہاتھوں کوڑیوں کے مول بیچ ڈالے۔ علاوہ ازیں کتب خانہ بھی ضبط کر لیا گیا۔ [۴۱]

انگریز حکومت کی بے حسی دیکھیے کہ 1875ء میں اسی مولانا فضل حق خیرآبادی کے فرزند مولانا عبدالحق خیرآبادی کو حکومت برطانیہ نے "شمس العلماء" کا خطاب دیا۔ اس سے بھی ایک قدم آگے بڑھ کر "اندھیر نگری چوپٹ راج کی مثال طاقہ فرمائیے کہ" جب انگریز حکومت نے مولانا عبدالحق کو شمس العلماء کا خطاب دیا تو ساتھ میں مولانا فضل حق کی ضبط شدہ جائیداد سے کچھ دیہات بھی واپس کر دیے۔ ان دنوں مولانا رام پور میں تھے۔ خیرآباد کے ایک باشندے یار علی نے علامہ فضل حق کا وہ پیغام کہ "دیہات اپنے لیے اور اعلان نہ کرنا۔" [۴۲]

علامہ فضل حق خیرآبادی کے دو شادیاں کیں۔ پہلی بیوی سے تین صاحبزادیاں سعید النساء، انجم النساء اور محمود النساء اور ایک صاحبزادے مولانا عبدالحق خیرآبادی تھے۔ دوسری بیوی سے دو صاحبزادے مولوی شمس الحق اور مولوی علاء الحق تھے۔ مولانا کی روحانی اولاد بلاشبہ ہزاروں میں تھی جن میں ان کے فرزندوں کے علاوہ مولانا ہدایت اللہ خان جونپوری، مولانا فیض الحق سہارنپوری (استاذ علامہ شبلی نعمانی)، مولانا سلطان احمد بریلوی، مولانا عبداللہ بلگرامی (مولانا عبدالقادر بدایونی، مولانا شاہ عبدالحق کانپوری، مولانا خیرالدین دہلوی (والد ابوالکلام آزاد) قابل ذکر ہیں۔ [۴۳]

مولانا فضل حق خیرآبادی ایک زبردست عالم دین ہونے کے ساتھ ساتھ اعلیٰ عہدہ اور ادبی ذوق کے بھی حامل تھے۔ جس کا ایک عالم معترف تھا۔ سرسید خاں کے بقول: "جمیع علوم وفنون میں (مولانا فضل حق خیرآبادی) منہمائے روزگار ہیں اور منطق وحکمت کی تو گویا انہیں کی گھر ہی کی دنیا وراثی ہے۔ علمائے عصر بلکہ فضلائے دہر کو کیا طاقت ہے کہ اس گروہ اہل کمال کے حضور میں بساط مناظرہ آراستہ کر سکیں۔ بارہا دیکھا گیا کہ جو لوگ اپنے آپ کو یگانہ فن سمجھتے تھے جب ان کی زبان سے ایک حرف سنا بوجہ کمال کو فراموش کر کے نسبت شاگردی کو اپنا فرض سمجھے"۔ [۳]

مولانا فضل حق خیرآبادی معقول ومنقول کے معتبر فاضل ہونے کے ساتھ ساتھ باکمال شاعر بھی تھے۔ عربی میں کم وبیش چار ہزار اشعار آپ سے یادگار ہیں۔ مولانا محمد اللہ بن فوقی کے بقول: "قصائد غرا" آپ کے امراء القیس اور لبید کے قصائد پر فوقیت رکھتے ہیں۔ نظم ونثر میں آپ کو اس قدر مہارت تھی کہ بلا مبالغہ شاید سلف وخلف میں چند آدمی آپ کے ہم پلہ ہوئے ہوں گے"۔ [۴]

یہ بھی حقیقت ہمارے پیش نظر رہنی چاہیے کہ مرزا غالب دہلوی جن کی نظر میں بڑے بڑے شعراء نہیں جچتے تھے، شعر وسخن میں مولانا فضل حق سے نہ صرف مشورہ کرتے تھے بلکہ ان کی اصلاح کو بھی قبول کرتے تھے۔ مولانا کے ایماء پر ہی غالب نے مشکل پسندی ترک کر دی تھی۔ [۵] انہوں نے غالب کی نہ صرف ادبی رہنمائی کی بلکہ اقتصادی مشکلات حل کرنے میں غالب کی حتی الوسع امداد کی۔ [۶]

سید سلیمان ندوی نے مولانا فضل حق خیرآبادی کو یوں خراج تحسین پیش کیا: "مرحوم مولانا فضل امام کے جانشین صاحبزادے اور شاگرد مولانا فضل حق خیرآبادی تھے۔ جن کے دم مسیحائی نے معقولات میں اس روح پھونکی کہ ابن سینائے وقت (بوعلی سینا) مشہور ہوئے۔ دیار واطراف سے طلباء نے ان کی طرف رجوع کیا اور انہوں نے منطق وفلسفہ کو نئے علوم سے ملک میں رواج دیا۔ سنہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے ہنگامہ میں فتویٰ جہاد کی پاداش میں گرفتار ہو کر جزیرہ انڈمان (کالا پانی) بھیجے گئے اور وہیں 1278ھ میں وفات پائی۔ مولانا فضل حق خیرآبادی کے تلامذہ ورتلامذہ نے سارے ملک میں پھیل کر علوم معقول کو بڑی رونق دی اور بڑے باکمال مدرس ثابت ہوئے"۔ [۷]

❶ الجنس العالی شرح جواهر العالی	❷ حاشیه افق المبین
❸ حاشیه تلخیص الشفاء	❹ حاشیه شرح مسلم قاضی مبارک
❺ الهدیة السعدیه	❻ رساله تشکیک مابهات
❼ رساله کلی طبعی	❽ رساله علم ومعلوم

WWW.NAFSEISLAM.COM

⑨ الروض المجود فی تحقیق حقیقۃ الوحی
⑩ رسالہ فاطیغوریاس
⑪ رسالہ تحقیق حقیقۃ الاسلام
⑫ رسالہ التورۃ الہندیہ
⑬ قصائد فتنہ الہند
⑭ مجموعۃ القصائد
⑮ امتناع النظیر
⑯ تحقیق الفتوی فی ابطال الطغوی [3]

مولانا فضل حق کی زندگی کو اگر ایک جملے میں سمیٹنا چاہیں تو تصویر کچھ یوں بنتی ہے کہ خیرآباد کے منطق و ہستان کے لمانحے، ادب شناس ادیب اور مجاہد جنگ آزادی 1857ء۔ یہ اس دور کی جامعیت تھی کہ ایک عالم بے بدل اور جید منطقی اپنے کتب و مدرسے سے اٹھ کر محفل شعر و سخن میں بھی اپنا لوہا منوا سکتا تھا۔ افسوس اعلامہ کا تاریخ میں وہ مقام نہ نبل سکا جو انگریز کے ضرورت مندوں" کو دیا گیا۔ ان کا جرم صرف یہی تھا کہ وہ انگریز کو برصغیر سے نکال کر مسلمانوں کی کھوئی ہوئی سلطنت کی بازیابی چاہتے تھے۔ مولانا خیرآبادی کے خلاف دشمن تو ایک طرف رہے خود دوستوں نے وہ سلوک کیا جس کی توقع نہیں کی جا سکتی تھی۔

انقلاب 1857 کے بعد کا ہندوستان سیاسی خلفشار کے علاوہ معاشرتی، اخلاقی، معاشی اور مذہبی افراتفری کا شکار رہا۔ مسلمانوں میں کئی تحریکیں ابھریں اور پا اغرض ہو کر رہ گئیں۔ انگریز جب تک برسر اقتدار رہا، تاریخ کے اوراق میں اس کے پروردہ لوگ ہی منظر پر رہے مگر انگریز کے چلے جانے کے بعد جب گرد و غبار کے بادل چھٹے تو تاریخ کے منظر پر وہی اشخاص جن پر سب جلوہ افروز ہونا شروع ہو گئے جن کا اوراق تاریخ پر حق تھا۔ ان شخصیات میں مولانا فضل حق خیرآبادی پیش پیش تھے۔ مولانا صرف عالم دین ہی نہیں تھے بلکہ ایک مجاہد ہونے کے ساتھ ساتھ دین و سیاست کا حسین امتزاج بھی تھے۔ جنہوں نے جنگ آزادی 1857ء میں عزم و عمل کا ایک ایسا کردار ادا کیا جو کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ آج ضرورت اس امر کی ہے کہ محققین مولانا فضل حق کی سوانح کے خفیہ گوشوں کو منظر عام پر لائیں تاکہ جنگ آزادی کے اس عظیم ہیرو کو تاریخ میں شایان شان مقام مل سکے۔

﴿حوالہ جات و تعلیقات﴾

(۱) قریشی، اشتیاق حسین، برصغیر پاک و ہند کی ملت اسلامیہ، اشاعت دوم 1983ء، ص: 227

(۲) Sarkar,j.N,Fall of the Mughal Empire, 1949, p:49.50

(۳) Qureshi,Ishtiaq Hussain,Histroy of the Freedom, Movement,karachi,P:267.68

(۴) جعفری، رئیس احمد: بہادر شاہ ظفر اور ان کا عہد، لاہور، 1969ء، ص: 259-260

(۵) نیازی، مولانا عبدالستار خان: مجاہد تحریک آزادی، مشمولہ ہفت روزہ الہام، بہاول پور، اکتوبر 1985ء، ص: 82

(۶) فاروقی، شاہ محی الدین: 1857ء کے ایک نامور مجاہد، مشمولہ ہفت روزہ الہام، محولہ بالا، ص: 24

(۷) ہفت روزہ الہام، بحوالہ سابقہ، ص: 207

(۸) مولانا فضل حق خیرآبادی کی انگریز کی ملازمت چھوڑنے کی فوری وجہ 1855ء کا سانحہ جو مان گڑھی مسجد بھی بنا۔ جب چند بدھو پنڈتوں نے مسلمانوں کو مسجد میں داخل ہونے سے روک دیا اور انگریز نے مسلمانوں کے ردعمل کے خلاف توپ خانہ کا بے دریغ استعمال کر کے بغاوت فرو کی۔

(۹) عظیم، بشیر: آسمان علم و فضل کا آفتاب درخشندہ، مشمولہ ہفت روزہ الہام، بحوالہ سابقہ، ص: 132

(۱۰) قادری، محمد ایوب: جنگ آزادی 1857ء، پاک اکیڈمی کراچی، 1976ء، ص: 437

(۱۱) واقعہ جو مان گڑھی: مسلمان مجاہدین کی کفار کے ہاتھوں شہادت۔ قرآن کی بے حرمتی، واجد علی شاہ کی بے غیرتی اور نصاریٰ اسلامی شعائر کی بربادی اور ناموس اسلام کی بے حرمتی مولانا فضل حق کو گوارا نہ تھی۔ اسی لیے انہوں نے راجاؤں کے نام خطوط لکھ کر انہیں جہاد پر آمادہ کرنے کی کوشش کی۔ راجہ الور سے بالمشافہ گفتگو کی مگر وہ تیار نہ ہوئے۔ پھر انہوں نے مولوی احمد اللہ شاہ ولاور سے بھی ملاقات کی اور انہیں جہاد پر آمادہ کیا۔ اگست 1857ء میں الور سے دہلی پہنچے اور 16 اگست کو بہادر شاہ ظفر سے بھی صورتحال پر تفصیلی گفتگو کی۔ بعد ازاں وہ جنرل بخت خان سے بھی ملے۔

(۱۲) مولانا فضل حق خیرآبادی کی قلمی بیاض (عربی) ص: 28، مملوکہ مولوی حکیم نصیر الدین ندوی، کراچی

(۱۳) برکاتی، محمود احمد: مولانا فضل حق خیرآبادی، مشمولہ ہفت روزہ الہام، بحوالہ سابقہ، ص: 57

(۱۴) قادری، محمد عبدالحکیم شرف: شہید تحریک آزادی، ہفت روزہ الہام، بحوالہ بالا، ص: 78

(۱۵) ایضاً، ص: 79

(۱۶) قرآن حکیم، سورۃ المائدۃ، آیت نمبر: 51 (۱۷) جعفری، رئیس احمد، بحوالہ سابقہ، ص: 298

(۱۸) انصاری، شاہد، بحوالہ سابقہ، ص: 199-200 (۱۹) ایضاً

(۲۰) نظامی، اسد: مولانا خیرآبادی اور سن ستاون، مشمولہ ہفت روزہ الہام، بحوالہ سابقہ، ص: 142

(۲۱) ایضاً

(rr)Sherwani,Latif:Pakistan the Making Quaid-i-Azam Academy,1987,p:4-6

(۲۳)انصاری، شاہد، بحوالہ سابقہ، ص:198-200 (۲۴)ایضاً

(۲۵)مولانا فضل حق خیرآبادی نے حکیم واجد علی شاہ حضرت محل کے ساتھ مل کر انگریزوں کا مقابلہ کیا۔ آپ نے لکھنؤ کے سب اعیان سلطنت کو نااہل، سست، بزدل، احمق اور خائن ظہرایا۔ ان کے بقول ان میں سے اکثر ذلیل اور بعض بندگان زر تھے۔ وزیر موصوف اور راجا بلدیو سنگھ کو غدار اور انگریز کے ایجنٹ قرار دیا۔

(۲۶)ایضاً، ص:215

(۲۷)خیرآبادی، مولانا محمد فضل حق، الثورۃ الہندیہ (باغی ہندوستان) مترجم عبدالطاہر خان شیروانی، ص:160

(۲۸)ایضاً، ص:160-161 (۲۹)جوشی، پی سی: انقلاب 1857ء، ص:178

(۳۰)خیرآبادی، بحوالہ سابقہ، ص:181 (۳۱)ماہنامہ تحریک، دہلی، جون 1960ء، ص:16

(۳۲)ایضاً (۳۳)ایضاً

(۳۴)خیرآبادی، بحوالہ سابقہ، ص:150-151 (۳۵)بیاری، مولانا عبدالستار خان، بحوالہ سابقہ، ص:91

(۳۶)ماہنامہ تحریک دہلی، بحوالہ سابقہ، ص:17 (۳۷)بیاری، مولانا عبدالستار خان، بحوالہ سابقہ، ص:91

(۳۸)خیرآبادی، بحوالہ سابقہ، ص:91 (۳۹)ایضاً، ص:154

(۴۰)ایضاً، ص:155 (۴۱)ایضاً، ص:156

(۴۲)ایضاً، ص:157-158

(۴۳)فریدی، سید محمد طاہر، حضرت علامہ فضل حق خیرآبادی مجاہد تحریک آزادی، بحوالہ سابقہ، ص:158

(۴۴)مقالات سرسید، حصہ شانزدہم، ص:328

(۴۵)فوقی، مولانا محمد الدین، رحمۃ الادباء، ص:148 (۴۶)ایضاً

(۴۷)بریلوی، سید مصطفیٰ علی، علامہ فضل حق خیرآبادی، بحوالہ سابقہ، ص:62

(۴۸)ندوی، سید سلیمان: حیات شبلی، ص:22-23

WWW.NAFSEISLAM.COM

علامہ فضل حق خیرآبادی
سراپا فضل، سراپا حق، سراپا خیر

ڈاکٹر سید محمد عبداللہ

ڈاکٹر سید محمد عبداللہ (1904ء۔1986ء) پاکستان کے علمی حلقوں میں محتاج تعارف نہیں۔ آپ ملک عزیز پاکستان کے نامور ماہر تعلیم، مصنف، ادیب اور دانشور تھے۔ ڈاکٹر صاحب کئی سال پنجاب یونیورسٹی کے اورینٹل کالج لاہور کے پرنسپل رہے۔ آپ کے تلامذہ میں پاکستان کے نامی گرامی ادیب، شعراء اور صحافی شامل ہیں۔ پیش نظر مضمون میں موصوف نے مختصر لیکن پُر اثر انداز میں مجاہد جلیل علامہ فضل حق خیرآبادی علیہ الرحمۃ کے حیات و خدمات کو شستہ اور جامع انداز میں پیش کیا ہے۔

اللہ اللہ ہمارا معاشرہ بھی کیا علم و تہذیب تھا۔ اس میں جیسے دیکھو آسمان فضیلت کا ماہتاب و آفتاب پائے گے۔ یہ وہ لوگ تھے جو جامع کمالات تھے، ایک فن نہ تھے اور اطراف علم پر حاوی تھے۔ کمال میں دریا کی مانند وسیع مگر قلب میں تواضع کا وہ رنگ کہ خود کو ذرۂ ناچیز سمجھتے تھے۔ ایک، ایک شخص قلزم علم، تعلیم پیشہ۔ ان کی زندگیاں بھرپور تھیں اور وہ پورے آدمی ہوتے تھے۔ مکتب بھی، مدرسہ بھی، خانقاہ بھی، قلم بھی اور سیف بھی۔ مگر ہائے زمانے نے وہ بساط الٹ ڈالی، وہ پرزے کہاں سے آئیں گے اب ان کی منزلت جاننے والے بھی کم ہیں۔

بہر حال علامہ فضل حق خیرآبادی بھی ان عالی مقام پرزوں میں سے ایک تھے۔ علامہ فضل حق خیرآبادی کو ہم تین حیثیتوں سے جانتے ہیں۔ اول خیرآباد کے منطقی دبستان کے نمائندے کی حیثیت سے، دوم ادب شناس اور ادیب کی حیثیت سے اور سوم مجاہد آزادی کی حیثیت سے۔

یہ نکتہ یاد رکھنے کے قابل ہے کہ علامہ فضل حق خیرآبادی چودہ برس کی عمر میں فارغ التحصیل ہو گئے تھے اور تدریس کا آغاز کر دیا تھا۔ یہ وہی غالب علم تھا جو بعد میں علامہ بنا اور معقول و منقول کا امام سمجھا جانے لگا۔ یہ ہمارے قدیم نظام تعلیم کا زمانہ تھا کہ اس میں آج کل کی طرح وقت ضائع نہیں کیا جاتا تھا اور کم سے کم وقت میں رسمی تعلیم سے فراغت ہو جاتی تھی۔

صرف علامہ خیرآبادی ہی نے اس کم عمری میں یہ کمال نہیں دکھایا بلکہ ہمارے تذکروں میں بے شمار بڑے علماء ایسے نکل آئیں گے جو 14 تا 18 برس میں تعلیم سے فارغ ہو گئے۔ اس بات کا اگر پتہ آج کے موضوع سے براہ راست تعلق نہیں مگر ماضی کی تعلیم کا ایک تصور دلانے کے لیے جس ماحول میں علامہ خیرآبادی پیدا ہوئے یہ بتانا مفید رہے گا کہ وہ پندرہ برس کی عمر میں فارغ ہوئے۔ اکثر علماء ابتدا میں آٹھ دس برس درس میں مشغول رہتے تھے پھر جب علم میں اذعان پیدا ہو جاتا تو تصنیف و تالیف کو بھی ساتھ شامل کر لیتے۔ پھر زندگی کے زمانے میں تحقیق و تدقیق کرتے اور نئے اضافے کرتے رہتے اور بڑے بڑے کارنامے دکھاتے۔ علامہ ابن خلدون نے اس کی بڑی تفصیل لکھی ہے اور در حقیقت زندگی میں بے شمار تصانیف کچھ جانے کا راز بھی اسی میں تھا کہ ان کا زمانہ تعلیم 15 برس میں ختم ہو جاتا اور اس طرح انہیں کام کرنے کا طویل موقعہ ملتا۔ آج کل کی طرح نہ تھا کہ بقول شاعر

۔مغربی کورس میں ہوتی ہے جوانی رخصت

صرف بی ری ری رذالہ مشاغل کے لیے

غرض علامہ نے 13-14 برس کی عمر میں علوم رسمی کی تحصیل کر لی تھی۔ اس کے بعد عمر بھر تدریس اور تصنیف و تالیف کا مشغلہ رہا۔ میں شروع میں عرض کر چکا ہوں کہ ہم علامہ کو مجملہ دوسرے امور کے بطور خاص خیرآباد کے منطقی دبستان کے نمائندے کی حیثیت سے جانتے ہیں۔ اب لازم ہوا کہ اس کی کچھ تشریح کی جائے کہ ہماری تعلیم میں اس دبستان کی اہمیت اور خصوصیت کیا تھی؟

خیرآبادی دبستان تعلیم پر سب سے بڑا اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ اس میں منطق اور معقولات پر ضرورت سے زیادہ زور دیا جاتا تھا جس کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ دینی علوم نصاب میں کم سے کم منعکس ہوتے تھے۔

اعتراض یہ ہے کہ درس نظامی میں ابھی بھی تفسیر کا عنصر دیگر علوم کم تھا۔ خیرآبادی دبستان میں یہاں تک ہوا کہ تفسیر بیضاوی کا صرف سوا پارہ کافی سمجھا گیا اور حدیث وغیرہ کی تو اور بھی کم ہی تھی۔ الزام یہ ہے کہ منطقیوں کا یہ گروہ بیکار علوم میں وقت ضائع کراتا تھا۔ سب کو معلوم ہے کہ منطق کے زمانے میں میر زاہد ملا شیرازی کے زیر اثر اور بعد میں میر باقر داماد اور ملا صدرا کی تعلیمات کے زیر اثر معقولاتی زبان زمانے کے لیے ایک رائج الوقت زبان بن چکی تھی۔ منطق کے بغیر کوئی عالم نہ بات کر سکتا تھا نہ بات منوا سکتا تھا۔

ایسے میں منطق اور معقولات کو خالص دین کا ایک ذریعہ سمجھنا چاہیے۔ جس طرح آج کا کوئی عالم نفسیات اور عمرانی علوم کے بغیر دین کا تحفظ نہیں کر سکتا اسی طرح اس دور میں حکمت و منطق ناگزیر تھی۔

پھر یہ بھی غور کے لائق ہے کہ اس زمانے کے نصابوں کا مقصد ایک عمومی قابلیت پیدا کرنا ہوتا تھا اور وہ ان نصابوں سے پیدا کی جاتی تھی۔ اس کے حصول کے بعد ہر آدمی اپنے مزاج کے مطابق دین یا دوسری شاخوں میں تخصیص پیدا کر سکتا تھا۔

معترض یہ بھول جاتے ہیں کہ عیسائیوں اور ہندوؤں سے جو فیصلہ کن بلکہ دندان شکن مناظرے ہوئے۔ اس میں زیادہ تر حصہ خیرآبادی دبستان کے لوگوں نے لیا۔ بہر حال علامہ فضل حق اسی دبستان سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کی تصانیف میں نکتہ و منطق کی کثرت ہے۔ وہ اگر کچھ بھی نہ ہوتے تو بھی اپنے خانوادے کے سب سے روشن چراغ وہی ہوتے۔

اس روشن چراغ نے بجھ کر اور چراغ بھی جلائے۔ علامہ کے بزرگ مولانا فضل امام عربی کے بلند پایہ شاعر تھے تو علامہ فضل حق خود اردو، عربی کے (اور شاید فارسی کے بھی) شاعر تھے۔ فرقتی اور آزردہ تخلص کرتے تھے۔ اسی شاعری کے رشتے سے حکیم مومن خاں مومن سے بھی دوستی تھی۔ اگرچہ مسلک کے اختلاف کے باعث گاہے گاہے آپس میں آزردگی بھی ہو جاتی تھی مگر ادب کا رشتہ اس دوستانہ کو طے ہوئے بہت جلد ایک دوسرے کو منا لیتے تھے۔

غالب سے علامہ کی دوستی کا حال ہر اس شخص کو معلوم ہے جو اردو ادب کی تاریخ سے باخبر ہے۔ غالب کو علامہ کا بڑا پاس تھا۔ اس لیے انہوں نے فرہاد کے سے مسئلہ اختراع نظیر پر ایک مثنوی بھی لکھی۔ اس کے علاوہ علامہ کی ادبی رائے پر غالب کو اعتماد تھا کہ انہوں نے ان کی اور مرزا خانی کو دال کی فرہاد کل سے اپنے پرانے دیوان کے انتخاب پر رضامندی کا اظہار کیا اور انتخاب بھی انہی سے کرایا۔ آج غالب کا جو مروجہ دیوان مقبول عام و خاص ہے وہ علامہ فضل حق اور مرزا خانی ہی کا نشان زدہ ہے۔

یہ اس دور کی جامعیت تھی کہ ایک عالم اپنے بدل اور روزگار منطق اپنے مدرسہ و مکتب سے نکل کر محفل شعر و سخن میں بھی اپنا لوہا منوا سکتا تھا۔ افسوس اب وہ جامعیت نہیں رہی۔ آج اگر کوئی عالم کسی مشاعرہ خاص میں بھی نظم پڑھ دے تو لوگ انگلیاں اٹھاتے ہیں مگر وہ دور عجیب دور تھا۔ علامہ فضل حق تو خیر تھے ہی، علامہ احمد رضا خاں کی فقیہانہ شاعری کو دیکھیے کہ بیسیوں کتابوں کے اس مصنف کے کلیات میں ہزل و یگانہ معلوم نہیں ہوتی۔

اب میں علامہ فضل حق کی تیسری لازوال حیثیت کا ذکر کرتا ہوں۔ وہ ہے ان کی مجاہدانہ حیثیت 1857ء کے انقلاب دہلی کا حال سب کو معلوم ہے۔ اس کے اسباب اور روز افزوں بے چینی کے کوائف اس وقت زیر بحث نہیں۔ قابل ذکر امر یہ ہے کہ انگریزوں کے خلاف دینی حلقوں کی طرف سے پہلی منظم کارروائی علامہ فضل حق کی تقریر جامع

مسجد دہلی سے شروع ہوئی۔ جس میں انہوں نے علماء سے فتویٰ پوچھا اور جہاد پر فتویٰ صادر کرایا۔

اس کے بعد جو کچھ ہوا یہی کہانی ہے۔ مختصر یہ کہ شکست کے بعد علامہ کو 1857ء میں فتویٰ جہاد کی پاداش میں سیتا پور سے لکھنؤ لایا گیا۔ جہاں ان پر مقدمہ چلا۔ قابل ذکر پہلو یہ کہ ان کے خیر خواہ فتویٰ کے بارے میں از راہ خیر خواہی تاویلیں کرتے تھے مگر علامہ ایسی ہر صفائی پر تردید کر کے فتویٰ کا اقرار کرتے جاتے۔ اس پر حبس دوام کی سزا ملی اور انہیں جزائر انڈمان بھیج دیا گیا۔ انڈمان میں بارکوں کی صفائی ان سے کرائی جاتی تھی۔ بہر حال اسی عالم اسیری میں ان کا انتقال ہوا۔

بنا کردند خوش رسمے بخاک و خون غلطیدن

خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را

یہ صرف ایک عالم نہ تھا جس نے برطانوی استعمار سے آزادی کے لیے جان دی بلکہ ان کے ہمراہ کئی اور اہل علم شمع آزادی پر قربان ہو گئے۔ انہی میں امام بخش صہبائی بھی تھے جنہیں خاندان سمیت گولیوں کا نشانہ بنایا گیا۔

ان کا جرم کیا تھا؟ یہی کہ یہ مسلمانوں کی کھوئی ہوئی سطوت کی بازیابی چاہتے تھے۔ یہ اسلام کی رونق کے طلب گار تھے۔ یہ اس ٹہنی کی حفاظت چاہتے تھے جو محمد بن قاسم کے ہاتھوں اس سرزمین میں لگا تھا۔ یہ اس اصول پر جان دے رہے تھے کہ اسلام غلام ہو کر نہیں رہ سکتا اور کوئی شخص مسلمان ہو کر شرع کی حکمرانی کے بغیر مسلمان نہیں بن سکتا۔ انہی اصولوں پر علامہ فضل حق نے بھی جان دے دی۔ ﴿ولا تقولوا لمن یقتل فی سبیل اللہ اموات بل احیاء﴾ بلا شبہ علامہ فضل حق آج بھی زندہ ہیں اور ان کی رحمت آج بھی وہی ہے جو ایک (اب ایڑھ) سو سال قبل تھی۔ رحمت دین، رحمت جہاد۔

﴿بشکریہ ہفت روزہ زندگی لاہور 13 نومبر 1972ء ص 25-26﴾

WWW.NAFSEISLAM.COM

خیرآبادی مردِ قلندر

حضرت مولانا عبدالحکیم اختر شاہجہانپوری مظہری شاہجہانپوری 7 جنوری 1935ء کو شاہجہانپور، دہلی (بھارت) میں چوہدری عاشق علی خان کے گھر پیدا ہوئے۔ آپ نسباً راجپوت تھے۔ روحانی طور پر شیخ کامل حضرت مولانا محمد مظہر اللہ نقشبندی مجددی دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے دستِ حق پر سلسلہ نقشبندیہ مجددیہ میں بیعت ہوئے اور پروفیسر ڈاکٹر مسعود احمد علیہ الرحمۃ سے اجازت و خلافت عطا ہوئی۔ آپ اہلسنت وجماعت کے ممتاز مصنف، محقق، مترجم اور شارح تھے۔ قدرت حق نے احادیث نبویہ ﷺ کی خدمت کرنے کا عظیم موقع آپ کو نصیب فرمایا۔ صحیح بخاری شریف، سنن ابوداؤد شریف، مؤطا امام مالک، سنن ابن ماجہ اور مشکوٰۃ شریف آپ کے گرانقدر ترجمہ وحواشی کے ساتھ منظر عام پر آچکے ہیں۔ ان کے علاوہ "برطانوی مظالم کی کہانی" آپ کی معرکۃ الآرا تصنیف ہے جس میں 1857ء کے بعد کے حالات کی منظر کشی کے ساتھ ساتھ مذہبی پیشواؤں کا پوسٹ مارٹم کیا گیا ہے۔ اس کتاب میں رد قادیانیت پر حضرت علامہ نے لگا ہے بڑی زبردست جرح وتنقید کی ہے اور مرزائیت قادیانیت کے خوب تار پود بکھیرے ہیں۔ آپ نے جامعہ نوشہ مجیدیہ واقع رواڑا اور میں کئی سال عوام الناس کو علمی واصلاحی خطبات سے سرفراز فرمایا۔ آپ کا وصال 14 نومبر 1993ء کو ہوا اور نماز جنازہ حاجی محمد فضل چغتائی اشرفی نے پڑھائی۔

مولانا فضل حق خیرآبادی رحمۃ اللہ علیہ 1857ء میں فتویٰ جہاد کے فتوے جاری کرنے والے تھے۔ ان کے بارے میں زمانہ حال کے قابل فخر مورخ جناب پروفیسر محمد ایوب قادری یوں رقمطراز ہیں: "جنگ آزادی 1857ء میں مولانا فضل حق نے مردانہ وار حصہ لیا۔ دہلی میں جنرل بخت خاں کے شریک رہے۔ لکھنؤ میں حضرت محل کی کورٹ کے ممبر رہے۔ آخر میں گرفتار ہوئے۔ مقدمہ چلا، عبور دریائے شور کی سزا ہوئی، جزیرہ انڈمان بھیجے گئے اور وہیں 12 صفر 1278ھ/1861ء میں انتقال ہوا"۔[1]

مفتی انتظام اللہ شہابی نے اس سلسلے میں فتویٰ جہاد اور علامہ کی حریت پسندانہ سرگرمیوں کا ذرا وضاحت کے ساتھ اپنے لفظوں میں یوں تذکرہ کیا ہے: "کمپنی کے قتال کی بابعدی، خود غرضی اور بدنیتی نے فرنگیوں کو بالکل بے نقاب

کر دیا تھا۔ عوام اعتراض کرنے لگے تھے تو خواص کا کیا عالم ہوگا؟ دیسی ریاست کی نکیل ہی بے زبردست فکر یا بالکل فطری تھی اور آخر 10 مئی 1857ء کو دل کا غبار آتش فشاں بن کر پھوٹ نکلا۔ عوام کی اس بے چینی کا اثر مولانا (فضل حق خیرآبادی) پر بھی پڑے بغیر نہ رہا۔ وہ دہلی آتے ہی قلعہ میں گئے۔ بہادر شاہ سے اگلی راہ و رسم تھی۔ بادشاہ ان کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ انہوں نے ایک اشرفی نذر کی موجودہ صورت حال کے متعلق بادشاہ سے گفتگو کی بادشاہ کی امنگیں ختم تھیں۔ دوسری طرف شہزادوں کی لوٹ کھسوٹ اور تخت شاہی کی تمنائیں باہمی رقابت کا میدان گرم کیے ہوئے تھیں۔ مولانا نے دیکھا کہ جانثار شہر میں بھی دو گروہ تھے۔ ایک بادشاہ کا ہمنوا دوسرا حکومت کہنہ کا بہی خواہ۔ فوجوں کا جائزہ لیا۔ حریت پسندوں کی دو جماعتیں اسی بھی تھیں جو ایک مقصد کو لیے ہوئے جان پر کھیل رہی تھیں۔ ایک جماعت مجاہدین کی تھی اور دوسری جماعت روہیلوں کی۔ یہ لوگ جنرل بخت خاں اور سردار دوبیلہ کی زیر کمان تھے۔ مولانا کی خبر سن کر جنرل بخت خاں ان سے ملنے آئے۔

چنانچہ مولانا نے آخری تیر ترکش سے نکالا۔ جمعہ کے روز جامع مسجد میں علماء کے سامنے تقریر کی اور استفتاء پیش کیا۔ مفتی صدرالدین خاں عزیز ہوئے۔ مولوی عبدالقادر، قاضی فیض اللہ دہلوی، مولوی فیض احمد بدایونی، ڈاکٹر مولوی وزیر خاں اکبرآبادی، سید مبارک شاہ رامپوری وغیرہ نے دستخط کر دیے۔ اس فتوی کے شائع ہوتے ہی ملک میں عام شورش بڑھ گئی۔ دہلی میں نوے ہزار سپاہ جمع ہو گئی تھی"۔ ع

علامہ فضل حق خیرآبادی (المتوفی 1278ھ/1861ء) معقولات کے امام و مجتہد، فن مناظرہ میں لاثانی، تبحر عالم دین اور ماہر قانون تھے۔ آپ سرشتہ عدالت صدر الصدور دہلی تک کے فرائض انتہازی شان سے ادا کر چکے تھے۔ جب علامہ گرفتار ہو گئے اور مقدمے کی سماعت شروع ہوئی تو لطف کی بات یہ ہے کہ کسی وکیل کی خدمات حاصل نہیں کیں، بلکہ آپ سرکاری وکیل سے خود بحث کرتے رہے۔ یہ طاقتور قانون کے شکنجے کو آپ تار عنکبوت کی طرح توڑ کر عدالت کو رہائی پر مجبور کر رہے تھے۔ سرکاری وکیل کو جب یارا نہ جواب کر سکے آپ اس طرح کھیلا رہے تھے جیسے بلی کسی چوہے کو منہ میں دبا کر بعض اوقات اچھالا کرتی ہے۔ مثلاً

سیرۃ العلماء میں ہے کہ 1859ء میں سلطنت مغلیہ کی وفاداری یا فتوی جہاد کی پاداش میں مولانا موصوف (فضل حق خیرآبادی) ماخوذ ہو کر بیتاپور سے لکھنؤ لائے گئے۔ مقدمہ چلا، مولانا موصوف کے فیصلے کے لیے جیوری بنائی۔ ایک اسیسر (جج) نے واقعات سن کر بالکل چھوٹنے کا فیصلہ کیا۔ وکیل سرکار کے مقابل خود مولانا بحث کرتے تھے بلکہ لطف یہ تھا کہ جملہ الزام اپنے اوپر خود قائم کرتے اور خود ہی مثل تار عنکبوت عقلی و قانونی بحث سے توڑ دیتے

تھے۔ جج یہ رنگ دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ جج نے صدر الصدور کی عہد میں مولانا سے کچھ عرصہ کام بھی سیکھا تھا' وہ مولانا کی عظمت اور تبحر سے واقف بھی تھا' وہ دل سے چاہتا تھا کہ مولانا بری ہو جائیں' اسے بے حد ہمدردی تھی اس وقت تک صورت بھی یہ تھی کہ مولانا پر جرم ثابت نہیں ہوا تھا اور امید تھی کہ بری ہو جائیں گے وکیل لاجواب تھے۔ جج ماہر قانون اور امام عقلیات ہونے کی بنا پر سرکاری وکیل کو لاجواب تو کر دیا۔ قانون کی رو سے عدالت جرم ثابت نہیں کر پائی لیکن حقیقت تو اپنی جگہ ہے کہ فتویٰ جہاد آپ ہی کا جاری کردہ تھا۔ بہادر شاہ ظفر' جنرل بخت خاں' مولانا احمد اللہ شہید اور حضرت محل کو جنگ آزادی 1857ء کے سلسلے میں اہم مشوروں' جنگی تیاریوں' مقابلے کی صورتوں اور اپنی خامیوں کو پورا کرنے کے بارے میں آپ ہی تجویزیں پیش کرتے رہے۔ علماء کا جو بورڈ تشکیل دیا گیا تھا اس میں آپ بھی شامل تھے۔ فتنہ سے روکی آتے ہوئے راستے میں شیعوں اور عیسائیوں کے خلاف جہاد کرنے کے لیے کمربستہ ہو جانے کی تلقین کرتے ہوئے آئے تھے۔

اگر قانون کے ذریعے عدالت ان میں سے کسی امر کو بھی گواہوں کے ذریعے ثابت نہ کر سکی تو نہ سہی لیکن اس سے حقیقت تو نہیں بدل گئی تھی۔ اس حق پسندی اور صداقت کی داد کہاں تک دی جائے کہ قانون کو لاجواب کر دینے کے باوجود بری ہونے کے نزدیک پہنچ کر خود اعلان کرتے ہیں کہ فتویٰ میرا تھا۔ علماء نے میرے کہنے سے اس کی تصدیق و تائید کی تھی۔ اس اقرار کا نتیجہ صاف ظاہر تھا لیکن علامہ نے ثابت کر دکھایا کہ میں نے قانون کے شکنجے کو توڑ دیا ہے لیکن جس کام کو شریعت کا تقاضا سمجھ کر کیا ہے' آج اس کا اعتراف کر کے خدا کے اس انعام اور اپنے شرعی فریضے کی ادائیگی کا اظہار کر کے عظیم الزوی سعادت سے خود کو محروم کیوں قرار دوں" علامہ کے اس تاریخی فیصلے نے انہیں اہل عزیمت کی صف میں امتیازی مقام پر کھڑا کر دیا ہے۔

چنانچہ مفتی انتظام اللہ صاحب لکھتے ہیں" "دوسرے دن اطمینان سے مولانا نے اپنے اوپر کے بقیہ الزام رد کر دیے۔ پھر پلٹا کھایا اور کہا جس مجبر نے فتویٰ کی خبر کی اس کے بیان کی اب میں توثیق و تصدیق کرتا ہوں۔ (فتویٰ) میرا ہی لکھا ہوا ہے اور میرے ہی مشورہ سے علماء نے دستخط کیے۔ پہلے اس گواہ نے جج رپورٹ لکھوائی تھی مگر اب عدالت کے سامنے میری صورت سے مرعوب ہو کر جھوٹ بولا ہے۔ مجھے خدا کے حضور میں جانا ہے غلط بات مذہب کے مسئلہ میں نہیں بول سکتا۔ جج اس بیان سے حیران ہو گیا۔ وہ گھڑی گھڑی مولانا کو روکتا تھا کہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ رنگ دوسرا ہو چکا تھا جج کو رعایت کی (اقبال جرم کی قانونی صورت میں) کوئی گنجائش ہی نہیں رہی تھی۔ بالآخر جج نے حکم سنایا۔ مولانا نے بڑی مسرت سے حکم کو منظور کیا۔ آخر میں مولانا نے فرمان روانہ ہو گئے"۔ جج

مولانا کی اس عزیمت کی قدر اہل کمال ہی کر سکتے ہیں۔ قانونی طور پر رہائی یقینی ہو چکی ہے۔ جس جرأت واستقلال سے فتویٰ جاری کیا اسی عزم واستقامت سے تمام قانونی شقوں کو توڑ کر وکیل سرکار کو لاجواب کر کے خود اقرار کرتے ہیں۔ اس اقرار کے نتائج سامنے ہیں۔ قانونی سزا معلوم ہے مگر دنیا کی زندگی میں ہر تکلیف اٹھانے اور ہر سخت سے سخت سزا بھگتنے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں اگر چہ دنیاوی راحتیں جواب بھی اپنی پوری رعنائیوں کے ساتھ قانونی رہائی کے پس پردہ علامہ کے استقبال کے لیے کھڑی تھیں' آپ کی قدم بوسی کی منتظر تھیں لیکن آفرین ہے اس جرأت رندانہ پر کہ ایسی رہائی اور دنیاوی راحتوں کو پائے استقذار سے ٹھکرا کر اپنے عظیم کارنامہ فتویٰ جہاد کا جو حریت پسندوں کے لیے صور اسرافیل اور فرنگی اقتدار پر صاعقہ تھا' خود اقرار کر لیتے ہیں اور ہر دنیاوی شے کو خندہ پیشانی کے ساتھ سہنے کے لیے از خود تیار ہو جاتے ہیں۔ قافلہ سالار عشق سید الشہداء امام حسین رضی اللہ عنہ کے صبر واستقامت کی اس آخری زمانے میں جھلک دکھانے والے اور امام ربانی حضرت مجدد الف ثانی سرہندی قدس سرہٗ کی جرأت رندانہ کی یاد پھر تازہ کر دکھانے والے اس خیرآبادی مرد قلندر کو باری تعالیٰ اپنی خاص نعمتوں سے نوازے۔ اسلام اور مسلمانوں کی طرف سے جزائے خیر دے۔ آمین یا الٰہ العالمین

؎ خیرہ نہ کر سکا مجھے جلوۂ دانش فرنگ
سرمہ ہے میری آنکھ کا خاک مدینہ و نجف

﴿حوالہ جات﴾

۱ محمد ایوب قادری' پروفیسر: تذکرہ علمائے ہند' مطبوعہ کراچی' ص: ۳۸۳

۲ انتظام اللہ شہابی' مفتی: مولوی فضل حق خیرآبادی اور جنگ آزادی' ص: ۳۵

۳ ایضاً' ص: ۳۷

۴ ایضاً' ص: ۳۹

WWW.NAFSEISLAM.COM

شیر خدا، بطل حریت

مجاہد ملت مولانا عبدالستار خان نیازی

محمد فضل حق خیرآبادی

مولانا عبدالستار خان نیازی یکم اکتوبر 1915ء کو اٹک پنیالہ تحصیل عیسیٰ خان ضلع میانوالی میں ذوالفقار خاں کے ہاں پیدا ہوئے۔ روحانی تعلق خواجہ فقیر قادر بخش نقشبندی مجددی میل شریف میانوالی سے قائم کیا۔ 1935ء میں مدرسہ اشاعت اسلام کالج سے حکیم الامت علامہ اقبال سے سند فراغت حاصل کی۔ تحریک پاکستان میں گرانقدر اور مجاہدانہ خدمات سرانجام دیں۔ بانی پاکستان محمد علی جناح کو جوان طالب علم عبدالستار خان نیازی سے بہت متاثر تھے اور انہیں قابل اعتماد نوجوان طالب علم رہنما تصور کرتے تھے۔

1952ء میں مسودہ آئین خلافت پاکستان آپ نے پیش کیا۔ اس مسودے میں مسلم توسیت کی بنیاد ختم نبوت پر رکھی تھی۔ 1953ء میں مرزا قادیانی ملعون کے نا خلف بیٹے مرزا بشیر الدین نے بلوچستان پر قبضے کا شر انگیز بیان دیا تو پورا ملک سراپا احتجاج بن گیا۔ سر ظفر اللہ قادیانی نے پلاننگ کے تحت پر امن احتجاج میں تشدد کا عنصر شامل کروا کر محافظین ناموس رسالت کے لاشے گرانے شروع کر دیے۔ 26 فروری 1953ء کو یہ احتجاج باقاعدہ تحریک کی صورت اختیار کر گیا اور اس تحریک ختم نبوت کے قیادت غازی کشمیر خلیفہ اعلیٰ حضرت حضرت مولانا سید ابو الحسنات قادری نے فرمائی۔ دوران تحریک تمام مرکزی قائدین کی گرفتاری کے بعد تحریک کی قیادت مولانا نیازی نے کی۔ مولانا نے کمال تدبر و حکمت عملی کے ساتھ اندرون دہلی گیٹ لاہور کی مسجد وزیر خان کو اپنا مرکز بنایا اور اسی جگہ سے تحریک کی کمان کرتے رہے تا آنکہ پولیس نے آپ کو بیرون لاہور سے گرفتار کر لیا۔ بعد ازگرفتاری مولانا پر بغاوت اور ڈی ایس پی (D.S.P) فردوس شاہ کے قتل کا مقدمہ درج ہوا۔ 7 مئی کو مقدمہ قتل سے بری اور مقدمہ بغاوت میں پھانسی کی سزا کا حکم ہوا۔

مولانا نے پھانسی کے پروانے پر ایسے جرأت مندانہ انداز میں دستخط ثبت کیے کہ مارشل حکام بھی مولانا کی استقامت سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ چنانچہ بعد میں آپ کی سزائے موت کو عمر قید میں بدل دیا اور 29 اپریل 1955ء کو رہائی عمل میں آئی۔ اس سارے واقعے کو بغور دیکھا جائے تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ مولانا نیازی موت کی وادی میں اذان دیتے ہوئے تختہ دار کو چوم کر رہا ہو گئے ہوں۔ رہائی کے بعد اخبار نویسوں نے عمر پوچھی تو بے ساختہ پکار اٹھے کہ 7 دن اور 8 راتیں۔ انہوں نے حیرت سے پوچھا کیسے؟ تو فرمایا میں نے تحفظ ناموس رسالت کے لیے پھانسی کی کوٹھری میں جو 7 دن اور 8 راتیں گزاری ہیں زندگی یہی ہے باقی تو شرمندگی ہے۔ اس تحریک میں بے مثال

قیادت وسیادت اور استقامت کے بعد "مجاہد ملت" کا لقب آپ کی ذات کا حصہ بن گیا۔ یاد رہے اس تحریک کے دوران آپ MLA ممبر آف لیجسلیٹو اسمبلی تھے۔

ایوبی دور میں بغاوت کے 24 مقدمات کا سامنا کیا۔ 1957ء میں مجلس تحفظ اسلام کے صدر مقرر ہوئے۔ 1972ء میں جمعیت علمائے پاکستان پنجاب کے صدر اور مئی 1973ء کو جمعیت کے مرکزی ناظم اعلیٰ منتخب ہوئے۔ 1973ء کی عظیم الشان تحریک میں گرانقدر خدمات سرانجام دیں اور مجلس عمل تحفظ ختم نبوت کے نائب امیر مقرر ہوئے۔ بعد ازاں تحریک بھٹو کے ستم ظریف کے طوفان کے سامنے سیسہ پلائی دیوار کی طرح کھڑے ہو گئے۔ عمر کے آخری عشرے میں نورانی 'نیازی کی بے مثال ولازوال جوڑی کو اپنوں کی نظر لگ گئی اور دونوں کی راہیں جدا ہو گئیں۔

میاں نواز شریف کے پہلے دور حکومت میں وزیر مذہبی امور بھی رہے لیکن ساری زندگی کاشمی چوک لاہور کے ایک کمرے میں گزار دی اور سفر آخرت بھی اسی گھر سے یکم مئی 2001ء کو ہوا۔

برصغیر کی تاریخ کو مسخ کرنے کے لیے جہاں بنیاد ہمن سامراج نت تعبیرات پیش کر رہا ہے اور یہ ثابت کرنا چاہتا ہے کہ انگریزی استعمار کے خاتمہ کے لیے جو جدوجہد ہوئی وہ موہن داس کرم چند گاندھی اور اس کے رفقاء کے ذریعہ ہوئی ہے۔ مولانا محمد علی جوہر' مولانا ظفر علی خاں' حکیم محمد اجمل خاں' قائد اعظم محمد علی جناح اور دیگر قائدین اسلامیان ہند ثانوی رتبہ رکھتے ہیں۔ حالانکہ تحریک خلافت' تحریک ہجرت اور اس سے قبل مختلف مواقع پر مسلمانوں کے ایثار اور قربانی کو کوئی اہمیت نہیں دی جاتی۔ ان لوگوں کے پھیلائے ہوئے باطل تصورات کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ آج کل کئی مسلمان لیڈر (ولی خاں وغیرہ) پاکستان کو انگریزی دماغ کی اسکیم اور نظریۂ پاکستان کو معاشی تصورات کی ظلمات میں گم کر کے ملت واحدہ کی سالمیت اور استحکام کے درپے ہیں اور مختلف قومیتوں کے نعرے بلند کر رہے ہیں۔ کیونکہ یہ سب کچھ ہمارے سامنے ہو رہا ہے اس لیے ہم ان تعریفی' اعترافی' اعتزالی اور خروجی رجحانات کو ختم کرنے کے لیے تاریخی حقائق وواقعات کی روشنی میں خیر الانام کا تصور پیش کر سکتے ہیں۔

اس سے بڑھ کر خطرناک المیہ یہ ہے کہ انگریز نے بکمال عیاری اور مکاری انقلاب ۱۸۵۷ء کے مجاہدین اور اس سے پہلے کے صحیح الفکر صاحب فراست قائدین اسلام کی سوانح حیات کو مسخ کر کے ایسے لوگوں کو تحریک حریت کا علمبردار بنا دیا ہے جنہیں سواد اعظم اہل اسلام نے مسترد کر دیا تھا۔ مثلاً آج اکثر ہمنی روشنی اور لارڈ میکالے کے نظام تعلیم سے فیض یاب اہل علم اسلامیان ہند کی تحریک آزادی کی ابتدا اسمٰعیل دہلوی اور سید احمد بریلوی سے شروع کرتے ہیں۔ علامہ فضل حق خیرآبادی' مفتی عنایت احمد کاکوروی' مولانا کفایت علی کافی شہید' مولانا احمد اللہ شاہ مدراسی' مفتی صدر الدین آزردہ' مولانا رحمت اللہ کیرانوی' جنرل بخت خاں' مولانا شاہ نقی علی خاں بریلوی اور دیگر اکابر

قائدین ملت اسلامیہ سے تاریخ کے صفحات خالی ہیں۔ حالانکہ فرنگی استعمار کے استیصال اور خاتمہ کے لیے جو عدیم المثال قربانیاں ان زعماء اسلام نے پیش کی ہیں کوئی اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ہماری نصابی کتب میں اسمٰعیل دہلوی اور سید احمد بریلوی کی ناکام مساعی کے مقابلے میں امت محمدیہ ﷺ کے صحیح اولوالعزم مدبرین و مفکرین کے کارہائے نمایاں سے نئی نسل کو آگاہ کیا جائے۔

سردست ہم اس سلسلہ عالیہ وجیہہ کے سرخیل علامہ فضل حق خیرآبادی کی جدوجہد آزادی اور تبلیغ دین متین کے چند گوشے نمایاں کریں گے۔ مجاہد اعظم علامہ فضل حق خیرآبادی کے علمی و ادبی کمالات مسلّم ہیں۔ عزم و ثبات کے پیکر بلند پایہ محقق، معقولات و منقولات کے بحر ذخار اور عشق رسالت مآب ﷺ سے سرشار اور حقائق و معارف علوم اسلامیہ کے علمبردار تھے۔ آپ بمقام خیرالبلاد خیرآباد 1212ھ/1797ء میں عدم سے منصۂ شہود پر جلوہ گر ہوئے۔ آپ کے والد ماجد مولانا فضل امام خیرآبادی دارالسلطنت دہلی میں صدر الصدور رہے اور آپ کا سلسلہ نسب تینتیسویں پشت میں امیر المومنین سیدنا فاروق اعظم عمر بن الخطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے جا ملتا ہے۔

آپ کے علمی مرتبہ کے متعلق سر سید احمد خاں نے (جو ان سے عقائد میں اختلاف رکھتے تھے) یوں خراج عقیدت پیش کیا ہے۔ ''مجمع کمالات صوری و معنوی' جامع فضائل ظاہری و باطنی' بناء فضل و افضال' بہار آرائے چمنستان کمال' بطل باطل و محقق حق' مولانا محمد فضل حق جمیع علوم و فنون میں یکتائے روزگار ہیں اور منطق و حکمت کی تو گویا انہی کی فکر عالی نے بنا ڈالی ہے۔ علمائے بعد میں فضلائے دہر کو کیا طاقت ہے کہ اس سرگروہ اہل کمال کے حضور میں بساط مناظرہ آراستہ کر سکیں۔ بارہا دیکھا گیا ہے کہ جو لوگ اپنے کو یگانۂ فن سمجھتے تھے جب ان کی زبان سے ایک حرف سنا۔ دعویٰ کمال کو فراموش کر کے نسبت شاگردی کو اپنا فخر سمجھتے۔ بایں ہمہ کمالات علم و ادب میں ایسا علم سرفرازی بلند کیا ہے کہ فصاحت کے وا سطے ان کی عبارت شستہ مخصر عروج معارج ہے اور بلاغت کے واسطے ان کی طبع رسا دست آویز بلندی مدارج ہے۔ سبحان کو ان کی فصاحت سے سرمایۂ خوش بیانی اور امرء القیس کو ان کے افکار بلند سے دست گاہ عروج معانی' الفاظ پاکیزہ ان کے رشک گوہر خوش آب اور معانی رنگین ان کے غیرت لعل ناب ہیں''۔[1]

سید سلیمان ندوی نے علامہ کے فضل و شرف کے بارے میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے ملاحظہ فرمایئے اور دیکھیے کہ ان کے کردار کی عظمت کے نقوش کتنے گہرے ہیں۔ ''مرحوم مولانا فضل امام کے جانشین صاحبزادے اور شاگرد مولانا فضل حق خیرآبادی تھے جن کے دم عیسوی نے معقولات میں ایسی روح پھونکی کہ ابن سینائے وقت (بوعلی

بینا) مشہور ہوئے۔ دیار و اطراف سے طلباء نے ان کی طرف رجوع کیا اور انہوں نے منطق و فلسفہ کو نئے طور سے ملک میں رواج دیا۔ غدر جنگ آزادی کے ہنگامہ میں (فتویٰ جہاد کی پاداش میں) گرفتار ہو کر جزیرہ انڈمان (کالا پانی) بھیجے گئے اور وہیں ۱۲۷۸ھ میں وفات پائی۔ مولانا فضل حق خیرآبادی کے تلامذہ اور تلامذہ در تلامذہ نے سارے ملک میں پھیل کر علوم معقول کو بڑی رونق دی اور بڑے باکمال مدرس ثابت ہوئے"۔ ع

ڈاکٹر سید محمد عبداللہ "اردو انسائیکلوپیڈیا و سابق پرنسپل اورینٹل کالج لاہور علامہ فضل حق خیرآبادی کی مجاہدانہ شخصیت کی بابت یوں رطب اللسان ہیں۔ "1857ء کے انقلاب دہلی کا حال سب کو معلوم ہے۔ اس کے اسباب اور روز افزوں بے چینی کے کوائف اس وقت زیر بحث نہیں۔ قابل ذکر امر یہ ہے کہ اگرچہ زبوں کے خلاف دہلی حلقوں کی طرف سے پہلی منظم کوشش علامہ فضل حق کی تقریر جامع مسجد دہلی سے شروع ہوئی جس میں انہوں نے علماء سے فتویٰ پوچھا اور جہاد پر فتویٰ صادر کرایا۔

اس کے بعد جو کچھ ہوا یہی کہانی ہے۔ مختصر یہ ہے کہ شکست کے بعد علامہ کو 1859ء میں فتویٰ جہاد کی پاداش میں جیتا پور سے لکھنؤ لایا گیا جہاں ان پر مقدمہ چلا۔ قابل ذکر یہ کہ علامہ کے خیر خواہوں کے فتوے کے بارے میں از راہ خیر خواہی تاویلیں کرتے تھے۔ مگر علامہ اپنی ہر صفائی پر تردید کر کے فتوے کا اقرار کرتے جاتے۔ اس پر بیس دوام کی سزا ملی اور انہیں انڈمان بھیج دیا گیا۔ انڈمان میں بارکوں کی صفائی ان سے کرائی جاتی تھی۔ بہر حال اسی عالم اسیری میں ان کا انتقال ہوا۔

بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر ۔۔۔ خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را

یہ صرف ایک عالم نہ تھا جس نے برطانوی استعمار سے آزادی کے لیے جان دی بلکہ ان کے ہمراہ کل اور اہل علم شیخ آزادی پر قربان ہو گئے۔ انہیں میں امام بخش صہبائی بھی تھے جنہیں خاندان اسمٰعیلیہ کو یہاں کا نشانہ بنایا گیا۔ ان کا جرم کیا تھا؟ یہی کہ یہ مسلمانوں کی کھوئی ہوئی سطوت کی بازیابی چاہتے تھے۔ یہ اسلام کی رونق کے طلب گار تھے۔ یہ اس ثمر کی حفاظت چاہتے تھے جو محمد بن قاسم کے ہاتھوں اس سرزمین میں لگا تھا۔ یہ اس اصول پر جان دے رہے تھے کہ اسلام غلام ہو کر نہیں رہ سکتا اور کوئی مفلس مسلمان ہو کر شرع کی حکمرانی کے بغیر مسلمان بن نہیں سکتا۔ انہی اصولوں پر علامہ فضل حق نے بھی جان دے دی۔ ولا تقولوا لمن یقتل فی سبیل اللہ اموات بل احیاء ولکن لا تشعرون کے بلاشبہ علامہ فضل حق آج بھی زندہ ہیں۔ ان کی دعوت آج بھی وہی ہے جو ایک سو تیس (موجودہ 152 سال) سال پہلے تھی۔ دعوت، دین دعوت جہاد"۔ ع

آج آپ قائدین ملت کی شخصیات پر غور کریں تو آپ کو ایک عجیب خلا نظر آئے گا جو علوم جدیدہ کے ماہرین ہیں وہ علوم قدیمہ سے قطعاً نابلد ہیں اور جو دینی علوم سے بہرہ ور ہیں وہ عہد حاضر کی سیاسی، اقتصادی اور نظریاتی تحریکات سے کما حقہ آگاہ نہیں۔ کارل مارکس مصنف کتاب "سرمایہ" نے جدلیات کو عنوان بنا کر جو تاریخ کی تعبیر کی ہے اس کا ان کو کوئی علم نہیں اور نہ ہی مارکس کے علاوہ عہد حاضر کے دوسرے مفکرین فرائیڈ، ہیگل وغیرہ کی تعلیمات اور تضادات سے آگاہ ہیں۔ ماڈرن لیڈر انگریزی جانتے ہیں عربی نہیں جانتے۔ اردو کی خلد بڑے ہے تو فارسی سے نابلد ہیں۔ ان کے سامنے فارسی یا عربی کا کوئی شعر پڑھ دیں تو بھونچکے رہ جاتے ہیں۔ علی ہذا القیاس درس نظامی کے فارغ التحصیل علماء علوم عاصرہ کے تقاضوں سے بے خبر ہیں۔ ان کو معلوم ہو جانا چاہیے کہ اس وقت ملت اسلامیہ پاکستان میں بعض ایسے لوگ بھی موجود ہیں جو سمجھتے ہیں کہ اسلام اس زمانے میں ناقابل عمل ہے۔ بعض کا خیال ہے کہ سارا مذہب ہی دقیانوسی ملا ہے جو یا تو اقتصادی حالات کا نتیجہ ہوتا ہے یا ذہنی ہوئی جنسی خواہشات کا ردعمل۔ یہ کارل مارکس اور فرائیڈ کے ذہنی غلام بن چکے ہیں اور بھی کئی قباحتیں پیدا ہو چکی ہیں۔ اس لیے جب تک حکیم الامت حضرت علامہ اقبال کی طرح قدیم و جدید علوم پر حاوی کوئی مفکر پیدا نہ ہو ستارہ بلند نہ کرے۔

علم عصر حاضر را شکستم ربودم دانا دانش گستم
خدا داند کہ مانند ابراہیم بتا را کوچہ بے پروا نشستم

اس شعر کے مصداق حصول ادکام علوم عصریہ کو عصر حاضر کے تقاضوں کی روشنی میں پیش کرنا ضروری ہے۔ ہمارے اسلاف میں یہ خوبی تھی کہ علوم دینیہ کے ساتھ ساتھ علوم عصریہ پر بھی حاوی تھے اور ہر دور میں انہوں نے ملت اسلامیہ کی صحیح راہنمائی کی۔

ڈاکٹر محمد عبداللہ نے علامہ محمد فضل حق خیرآبادی رحمۃ اللہ علیہ کو جامع جمیع کمالات قرار دیتے ہوئے انہیں سرمایہ فضل، سرمایہ حق، سرمایہ خیر، یگانہ روزگار، ملا، ان کی شخصیت کا منتساب ان دو مصارع میں قائم کر کے عصر حاضر کی بہتی سے موازنہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"اللہ اللہ! ہمارا معاشرہ بھی کیا جامع علم و تہذیب تھا۔ اس میں بسنے والے کیسے آسمان فضیلت کا ماہتاب و آفتاب پاؤ گے۔ یہ وہ لوگ تھے جو جامع کمالات تھے۔ یک فنے نہ تھے۔ اطراف علم پر حاوی تھے۔ کمال میں دریا کے مانند سمیٹ کر قلب میں تو اضع کا وہ رنگ کہ خود کو قطرہ آشنا سمجھتے تھے۔ ہر ایک شخص قلزم علم اور تلمیم ہنر تھا۔ ان کی زندگیاں بھرپور تھیں۔ وہ جامع جمیع صفات ہوتے تھے، اپنی ذات میں مکتب بھی تھے، مدرسہ بھی تھے اور خانقاہ بھی، صاحب قلم بھی تھے اور صاحب سیف بھی۔ مگر ہائے زمانے نے وہ بساط الٹ ڈالی۔ وہ بزرگ تو کہاں سے آئیں گے ان کی مزاحمت جانے والے بھی کم ہیں۔"

ایک زبردست المیہ:

علامہ فضل حق خیرآبادی رحمۃ اللہ علیہ غیرت اسلامی کا پیکر اور عشق رسالت مآب ﷺ کے شعلہ جوالہ تھے جنھوں نے انگریز کے پروردہ "کالے پادریوں" (سرکار پرست مولویوں) کی تحریک تخلیص رسالت کے خلاف سینہ سپر ہوکر "تحقیق الفتوی فی ابطال الطغوی" اور "امتناع نظیر" جیسی معرکۃ الآرا کتب لکھیں اور اہل اسلام کے سینوں کو تعظیم وتوقیر اور عزت وعظمت نبوت سے منور کیا۔ آج بیگانے تو بیگانے رہے اپنے بھی ان کے خلاف گمراہی اور وسوسہ اندازی کی مہم چلا کر منحوس خناسیت کا پارٹ ادا کررہے ہیں۔ ان کے ساتھ یہ ٹریجڈی ہوئی کہ اول تو ان کی شخصیت اور جدوجہد اخلاص وطن کے متعلق بہت کم کام کیا گیا اور جو کچھ ہوا ہے وہ بھی ان کے مقام ومرتبے سے فروتر ہے۔ انہوں نے مذہبی مخالفت کی بنا پر ان پر دو طرفہ حملے کیے ہیں اور ان کے بلند وبالا کردار کو مسخ کرنے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی ہے۔

جناب نادم سیتاپوری نے اس المیہ کے متعلق لکھا ہے کہ "مولانا فضل حق خیرآبادی گذشتہ انقلابی صدی کا وہ مظلوم کردار ہے جسے دشمنوں سے زیادہ دوستوں نے نقصان پہنچایا۔ انگریز اور ان کے ہوا خواہ تو مولانا سے اس لیے ناراض تھے کہ انقلاب ستاون (1857ء) کے سلسلہ میں کسی نہ کسی نہج سے ان کا نام آگیا تھا لیکن خود مسلمانوں کا ایک پروپیگنڈسٹ گروپ (کالے پادریوں کا گروپ) مولانا سے اس لیے بیزار تھا کہ وہ ان کے مذہبی نظریات کے خلاف عالمانہ مجاہدہ کر چکے تھے۔ (انکار شفاعت اور امکان نظیر جیسے گمراہ کن عقیدے کے خلاف) یہ باوقار علمی مباحثے کوئی ذاتی اور عامیانہ جنگ نہیں تھی۔ جس کا سہارا لے کر مولانا خیرآبادی کے خلاف ایک مستقل محاذ قائم کر دیا جاتا لیکن ہوا کچھ ایسا ہی۔

مولانا کے اکثر سیرت نگاروں نے نادانستہ یا دانستہ مولانا کا تذکرہ اس انداز سے کیا کہ خود "مدح" اور "ہجو بلیغ" سرمگریاں ہوگئے۔ چنانچہ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ آج جب ریسرچ اور تحقیق کی نگاہیں تاریخ کے ان اوراق تک پہنچیں تو دنیا ہی بدلی ہوئی نظر آئی"۔ ۵

امتیاز علی عرشی رامپوری اور اس قسم کے چند دوسرے علماء نے علامہ فضل حق خیرآبادی کے فتوئی جہاد اور جہاد آزادی میں شرکت سے انکار کیا بلکہ یہاں تک لکھ دیا ہے کہ جس فضل حق نے جہاد آزادی میں حصہ لیا وہ فضل حق شاہجہانپوری ہیں۔ (وغیرہ ذالک من الخرافات) لالہ مالک رام نے بھی عرشی صاحب کی تقلید میں الزام تراشیاں کی ہیں مگر اس کے مقابلے میں اہل حق کے ایک جم غفیر نے مولانا فضل حق خیرآبادی کو فتوئی جہاد اور جہاد آزادی کا

روح رواں قرار دیا ہے۔

مشہور مؤرخ رئیس احمد جعفری لکھتے ہیں کہ "فضل حق خیرآبادی انگریزوں سے نفرت کرتے تھے اور انگریزوں کو ہندوستان سے نکالنے کے لیے ہر منظم اور باقاعدہ تحریک میں حصہ لینے پر دل و جان سے آمادہ رہتے تھے۔ چنانچہ جب غدر شروع ہوا تو مولانا بے تامل شریک ہو گئے۔ وہ بہادر شاہ ظفر کے معتمد، مقرب اور مشیر تھے۔ ان کے دربار میں شریک ہوا کرتے تھے۔ انہیں اہم مسائل و معاملات پر مشورے دیتے تھے اور اس بات کے حامی تھے کہ آزادی کی یہ تحریک کامیاب ہو اور انگریز اس دیس سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے رخصت ہو جائے۔ مولانا نے غدر میں دلیری اور جرأت کے ساتھ اعلانیہ حصہ لیا۔ انہوں نے متعدد والیان ریاست اور امرائے ہند کو اس تحریک میں شامل کرنے کی کوشش کی جس جس والیٔ ریاست سے ان کے ذاتی تعلقات اور مراسم تھے۔ ان کی تائید اور حمایت حاصل کی اور مالی امداد کے لیے مجبور کیا"۔ [1]

مولانا محمود الرحمٰن لکھتے ہیں "دہلی پہنچتے ہی علامہ سید مے لال قلعے میں گئے اور بہادر شاہ ظفر سے ملاقات کی۔ جنگ کی صورت حال کے متعلق گفتگو کی۔ فوجوں کا جائزہ لیا۔ آزادی حاصل کرنے کے لیے جو لوگ کمر کس چکے تھے ان سے ملے اور پھر روہیلوں کے سردار جنرل بخت خاں کے پاس گئے۔ 1859ء میں مولانا فضل حق خیرآبادی کو مغلیہ حکومت کی وفاداری اور انگریزوں کے خلاف "بغاوت" میں شریک ہونے کے جرم میں گرفتار کر لیا گیا"۔ [2]

غلام رسول مہر (1857ء کے مجاہد) خورشید مصطفیٰ رضوی (جنگ آزادی 1857ء) ناسر کاظمی سید مفتی صدر الدین آزردہ (خیال، لاہور سن ستاون نمبر) انتظام اللہ شہابی (غدر کے چند علماء) محمد اسمٰعیل پانی پتی (کیل و نہار جنگ آزادی نمبر، سہ ماہی الزبیر بہاولپور) محمد عبدالشاہد خاں شروانی (مقدمہ باغی ہندوستان) پروفیسر محمد ایوب قادری (جنگ آزادی 1857ء کا ایک مجاہد) میں لکھتے ہیں کہ جنرل بخت کے مشورے سے علامہ فضل حق خیرآبادی نے بعد نماز جمعہ جامع مسجد دہلی میں جہاد کی اہمیت اور ضرورت پر تقریر کی اور جہاد کا استفتاء مرتب کر کے پیش کیا اور جہاد کے فتویٰ کی تیاری میں جنرل بخت خاں کی مساعی کو کامیاب بنایا۔ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی، ڈاکٹر سید محمد عبد اللہ، مولانا عبدالسلام ندوی اور مولانا ریاست علی وغیرہ جیسے کئی حق پرست مؤرخین نے علامہ فضل حق خیرآبادی کو خراج عقیدت پیش کیا ہے۔

نیز یہ تذکرہ ایک لحاظ سے ناتمام رہے گا اگر ہم پاکستان میں دیوبندی مکتبہ فکر کے آرگن ہفت روزہ خدام الدین لاہور اور اسی مکتبہ فکر کے شیخ الاسلام حسین احمد مدنی کا نکتۂ نگاہ پیش نہ کریں۔ قارئین کرام کی دلچسپی کے لیے

اقتباسات علی الترتیب درج ذیل ہیں۔

● "جو اہل تاریخ کا اس نے اپنے حافظہ سے ایسی ایسی جانباز، حق گو، بہادر اور جامع کمالات شخصیتوں کو دودھ کی مکھی کی طرح نکال پھینکا جنھوں نے اپنے دور میں وقت کے تیز و تند طوفان سے بے خوف و خطر ٹکر لی اور پیٹھ نہیں دکھائی۔ مولانا فضل حق خیرآبادی رحمۃ اللہ علیہ تاریخ کے ان جواں مرد اور نڈر مجاہدین میں سے تھے جن کی جرأت و ہمت اور حق گوئی و بے باکی نے دنیا کو حیرت میں ڈال دیا۔ مگر تاریخ کے صفحات میں ان کو شایان شان کیا کوئی معمولی جگہ بھی نہیں مل سکی۔ (العجب ثم العجب)

● مولانا فضل حق خیرآبادی نے الفضل الجهاد كلمة الحق عند سلطان جابر کا فریضہ ادا کیا اور اپنی عمر عزیز انڈمان میں جس دوام کی نذر کر دی..... علامہ فضل حق خیرآبادی وغیرہ نے انگریزوں کے خلاف فتاوی دے کر مسلمانوں کو عدم تعاون پر آمادہ کیا.....

● مولانا فضل حق خیرآبادی بھی باغی قرار دیے گئے۔ سلطنت مغلیہ کی وفاداری، فتوی جہاد کی پاداش یا جرم بغاوت میں مولانا ماخوذ کر کے سیتاپور سے لکھنؤ لائے گئے"۔ ۸

"مولانا نے اپنے اوپر جس قدر الزام لیے تھے ایک ایک کر کے سب رد کر دیے۔ جس مخبر نے فتوی کی خبر کی تھی اس کے بیان کی تصدیق دو شخص کی اور فرمایا پہلے اس گواہ نے سچ کہا تھا اور رپورٹ بالکل صحیح لکھوائی تھی۔ اب عدالت میں وہ میری صورت دیکھ کر مرعوب ہو گیا اور جھوٹ بولا ہے۔ وہ فتوی صحیح ہے، میرا لکھا ہوا ہے اور آج اس وقت بھی میری وہی رائے ہے۔ جج بار بار علامہ کو روکتا تھا کہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ مخبر نے عدالت کا رخ اور علامہ کی بارعب و پروقار شکل دیکھ کر شناخت کرنے سے گریز کرتے ہوئے کہہ ہی دیا تھا کہ یہ وہ مولانا فضل حق نہیں۔ وہ دوسرے تھے۔ گواہ حسن صورت اور پاکیزگی سیرت سے بے انتہا متاثر ہو چکا تھا مگر علامہ کی شان استقلال کے قربان جایئے کہ خدا کا شیر گرج کر کہتا ہے وہ فتوی صحیح ہے۔ میرا لکھا ہوا ہے اور آج اس وقت بھی میری وہی رائے ہے۔

نالہ از بہر رہائی نہ کند مرغ اسیر خورد افسوس زمانے کہ گرفتار نہ بود ۹

مولانا فضل حق صاحب خیرآبادی کو جو کہ تحریک کے بہت بڑے رکن تھے اور بریلی و علی گڑھ کے ملحقہ اضلاع کے دوران تحریک میں گورنر تھے۔ آخر ان کو گھر سے گرفتار کیا گیا، جس مخبر نے ان کو گرفتار کرایا تھا اس نے انکار کر دیا کہ مجھے معلوم نہیں۔ فتوی جہاد پر جس نے دستخط کیے ہیں وہ یہ فضل حق ہیں یا کوئی اور ہیں..... مولانا نے فرمایا کہ مخبر نے پہلے جو رپورٹ لکھوائی تھی وہ بالکل صحیح تھی۔ قربان جایئے علامہ کی شان استقلال پر۔ خدا کا شیر گرج کر کہہ رہا

WWW.NAFSEISLAM.COM

ہے کہ میرا اب بھی یہی فیصلہ ہے کہ انگریز غاصب ہے اور اس کے خلاف جہاد لازم فرض ہے۔ خدا کے بندے ایسے ہی ہوا کرتے ہیں۔ وہ جان کی پرواہ کیے بغیر سر بکف ہو کر میدان میں نکلتے ہیں اور لومڑی کی طرح ہیر پھیر کر کے جان نہیں بچاتے بلکہ شیروں کی طرح جان دینے کو فخر سمجھتے ہیں"۔ ۱۰

علامہ فضل حق خیرآبادی نے نہ صرف فتویٰ جہاد کا اعلان کیا بلکہ جہاد کی تبلیغ کر کے لوگوں کو جہاد میں شامل کیا۔ اس وقت ملک کی اقتصادی زبوں حالی اور فرنگیوں کے زہرہ گداز مظالم کا تذکرہ کر کے تحریک آزادی کے لیے بنیاد فراہم کی۔ بہادر شاہ ظفر کو مرکزی حیثیت سنبھال کر تحریک آزادی کی قیادت کے لیے تیار کیا۔ عیش و عشرت اور فسق و فجور میں مستغرق شہزادوں کو خونخوار انجام سے آگاہ کر کے جہاد کے لیے تیار کیا۔ مختلف علاقوں سے مجاہدین آزادی کے دستوں کے درمیان ربط و ضبط اور مرکزیت پیدا کی۔ ہندوؤں کی استمالت خاطر کے لیے ایک شاہی فرمان سے گاؤکشی بند کر دی گئی۔ اس شاہی فرمان پر ایسے عمل ہوا کہ عید الاضحیٰ کے موقع پر بھی رضا کارانہ طور پر گائے کی قربانی سے اجتناب کیا گیا۔

مرکز میں ایک سیکرٹریٹ قائم کیا۔ مجاہدین کی اعانت کے لیے سامان رسد کی فراہمی اور مالی امداد کا بندوبست کیا۔ اہلکاروں حکام کا تقرر، مال گزاری کی تحصیل کا انتظام اور ہمسایہ والیان ریاست کو جنگ میں اعانت و شرکت کے لیے آمادہ کیا۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ مولانا نے تحریک آزادی کا ایک جامع و مانع دستور مرتب کیا۔ اس دستور کی بنیاد جمہوریت پر تھی اور رعایا کو کاروبار سلطنت میں شریک کرنے کے لیے دفعات مرتب کی گئیں۔

اخبار دہلی کا مرتب چونی لال لکھتا ہے کہ "مولوی فضل حق اپنے مواعظ سے عوام کو مسلسل جہاد کے لیے بھڑکا رہے ہیں۔ انگریزوں کے ایک مخبر تراب علی نے رپورٹ دی کہ مولوی فضل حق جب سے اودھ آئے ہیں وہ فوجیوں اور شہریوں کو برطانیہ کے خلاف بھڑکانے میں مسلسل مصروف ہیں اور مولوی فضل حق کی اشتعال انگیزیوں سے شاہزادے بھی میدان میں نکل آئے ہیں اور سبزی منڈی کے پل والے محاذ پر صف آراء ہیں"۔ ۱۱

علامہ کی جنگ آزادی میں عملی شمولیت:

مولانا کی مجاہدانہ سرگرمیاں صرف مشوروں، ہدایات، منصوبہ بندی، فکری قیادت اور انتظامی امور و معاملات میں شرکت تک محدود نہیں رہیں بلکہ اس سے جہاد میں عملاً شمولیت اور محاذ آرائی تک کا بھی سراغ ملتا ہے۔

ڈاکٹر مہدی حسین لکھتے ہیں: "اگر جیون لال کے بیان پر اعتماد کیا جا سکتا ہے تو مولوی فضل حق نے شاہی فوجی کی کمان بھی کی ہے۔ آپ کنگ کونسل کے رکن مقرر کیے گئے تھے۔ آپ کے علاوہ جنرل بخت خاں اور مولوی سرفراز

علی صاحب بھی اس کونسل کے رکن تھے۔ آپ نے "ایڈمنسٹریشن کورٹ" کے نام سے تحریک آزادی کا ایک منشور مرتب کیا تھا۔ جس کے قواعد وضوابط کی تفصیلات موجود ہیں۔

مخالف وموافق آرا سے قطع نظر انگریز نے مولانا فضل حق خیرآبادی کے متعلق جو فیصلہ دیا ہے اس سے بڑھ کر اور کوئی ثبوت پیش کرنے کی ضرورت نہیں۔ مسٹر جارج کیمبل جو ڈپٹی کمشنر اودھ اور سپرنٹنڈنٹ کنٹونمنٹ خیرآباد تھا نے 4 مارچ 1859ء کو فیصلہ صادر کرتے ہوئے لکھا "بغاوت شروع ہونے کے وقت وہ الور میں ملازم تھا۔ یہاں دیدہ ودانستہ دہلی آیا اور اس کے بعد وہ باغیوں اور بغاوت کے قدم بہ قدم چلتا رہا۔ ایسے شخص کو سخت ترین سزا ملنی چاہیے اور اسے خاص طور پر ہندوستان سے خارج کر دینا چاہیے"۔ [۱۱]

قید کے دردناک ماحول میں اللہ ورسول ﷺ سے مثالی تعلق:

جس دوام کی سزا دینے کے بعد ناز دنعت میں پلے ہوئے علامہ فضل حق خیرآبادی کو ذلیل کی بارکیں صاف کرنے اور گندگی دور کرنے کی ڈیوٹی پر لگا دیا گیا تھا۔ آپ کو ایسا لباس پہنا دیا گیا جس سے آپ کا ازلم نازک بدن جھل گیا۔ آپ نے خود لکھا ہے کہ میرے دشمن میری ایذا رسانی میں کوشاں اور میری ہلاکت کے درپے رہتے ہیں۔ میرے دوست میرے مرض کے مداوا سے لاچار ہیں۔ دشمنوں نے پوری دشمنی برتی اور بغض وکید کا کھلا مظاہرہ کیا۔ میں اپنی تدبیروں کے انقطاع پر ناامید دمایوس اور جال میں پھنسے ہوئے شکاری پرندے کی طرح حیران اور پریشان ہوں۔ میں نے خدا کے سوا سب سے کنارہ کشی کر لی۔ اس کے سوا کسی دوسرے سے بخشش اور امداد کی امید نہیں ہے۔ اس بادشاہ عادل کی رحمت کا میں امیدوار ہوں۔ اے پروردگار! اس عاجز اور شکستہ کو مشمول صفات احمد حماد ﷺ کے طفیل کافر دشمنوں کے پنجال سے نکال۔ تو نے انہیں تمام مخلوق کی طرف رہبری اور ہدایت عطا اور امانت کے لیے رحمت عالم بنا کر بھیجا ہے۔ وہ حسینیت وطاب روکھنے کے لیے پکارنے والوں کے فریادرس' روز نجات میں ہماری پناہ گاہ اور مجلس میں بڑے سخی اور جواد ہیں۔ وہ گمراہ کے لیے ہادی' ناتوانا کے حامی' فریادی کے مددگار' سفارش چاہنے والے کے شفیع اور سائل کو عطیات سے نوازنے والے ہیں۔ وہ غمگین کے فریادرس' طالب بارش کے لیے بادل اور گھاٹ پر آنے والے کے لیے دریا' چارہ اور پانی کے متلاشی کے لیے سرسبز میدان ہیں۔ اے میرے محافظ اور راہنما! اس بات کی بھی دعا کیجیے کہ خدا میری موت آپ کی اقامت گاہ کے جوار میں شہادت کی موت مقدر کر کے دے۔ یہ قصائد نغمۃ الہند کے اشعار ہیں۔

میں عہد حاضر میں علامہ فضل حق خیرآبادی رحمۃ اللہ علیہ کے پایہ کے کسی انسان کی مثال دینے کی کوشش کروں تو

WWW.NAFSEISLAM.COM

رنج والم، مصائب و نوائب اور آفات و بلیات کو برداشت کرنے کے لیے اپنی تاریخ سے نہیں دے سکتا۔ صرف یہ کہہ سکتا ہوں کہ اگر قائد اعظم علیہ الرحمۃ اور حکیم الامت علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ جیسی نفاست پسند اور اعلیٰ معیار زندگی بسر کرنے والی شخصیتوں کو جزیرہ انڈمان میں بند کر دیا جائے، ان کو ٹاٹ کا لباس پہنا دیا جائے، فرش زمین پر سونے پر مجبور کر دیا جائے، ناقص خوراک دی جائے اور جیل کی بارکوں کی گندگی اور غلاظت صاف کرنے کے لیے مقرر کر دیا جائے تو ان پر کیا گزرے گی؟؟؟ حضرت علامہ فضل حق رحمۃ اللہ علیہ نے اس اذیت ناک ماحول میں بھی رحمت کائنات ﷺ کے ساتھ اپنا روحانی رشتہ قائم رکھا اور اللہ کی رحمتوں سے ناامید نہ ہوئے۔

انگریز کے ایجنٹ:

غور کیجیے ایک وہ لوگ ہیں جو انگریز کی اطاعت اور غلامی کو دین سمجھ رہے ہیں۔

● "اثنائے قیام کلکتہ ایک روز مولانا اسمٰعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ فرما رہے تھے کہ ایک شخص نے مولانا سے فتویٰ پوچھا کہ سرکار انگریزی پر جہاد درست ہے یا نہیں؟ اس کے جواب میں مولانا نے فرمایا کہ ایسی بے زور یا اور غیر متعصب سرکار انگریزی پر کسی طرح بھی جہاد درست نہیں"۔ [۱۳]

● "مولوی اسمٰعیل دہلوی نے فرمایا اگر کوئی انگریزوں پر حملہ آور ہو تو مسلمانوں پر فرض ہے کہ وہ اس حملہ آور سے لڑیں اور اپنی انگریزی گورنمنٹ پر آنچ نہ آنے دیں"۔ [۱۴]

● ان کے ہم مشرب نام نہاد امیر المومنین سید احمد بریلوی فرماتے ہیں کہ "ہم اور ہمارے قبیلہ سرکار انگریزی پر کس سبب سے جہاد کریں اور خلاف اصول مذہب طرفین کا خون بلا سبب گرادیں۔ کسی کا ملک چھین کر ہم بادشاہت نہیں کرنا چاہتے۔ نہ انگریزوں کا اور نہ کسی کا"۔ [۱۵]

(مسلمانوں سے لڑ کر ان کا ملک چھیننا جہاد اور ان کی جانب سے تقویۃ الایمان کی تکفیریات کا رد بغاوت قرار دیا گیا۔ ﴿العجب ثم العجب﴾ اور یہی خود ساختہ امیر المومنین انگریزوں کے وفادار مگماشتے کا پارٹ ادا کرتے ہیں۔)

● لارڈ ھیسٹنگز، سید احمد صاحب کی بے نظیر کارگزاری سے بہت خوش تھا۔ دونوں لشکروں کے بیچ میں ایک خیمہ کھڑا کیا گیا۔ اس میں جن آدمیوں کا باہم معاہدہ ہوا۔ امیر خاں، لارڈ ھیسٹنگز اور سید احمد صاحب تھے۔ سید احمد صاحب نے امیر خاں کو بڑی مشکل سے شیشے میں اتارا تھا۔ [۱۶]

علامہ فضل حق کا عدالت میں مجاہدانہ کردار:

اس کے مقابلے میں مجاہد کبیر علامہ فضل حق کا کردار ملاحظہ فرمایئے۔ آپ کو بغاوت کے جرم میں گھر سے گرفتار کر کے مقدمے کے لیے لکھنؤ بھیج دیا گیا اور ان پر سلطنت مغلیہ سے وفاداری اور فتوائی جہاد نافذ کرنے کے جرم میں مقدمہ چلایا گیا۔ مولانا موصوف کے فیصلے کے لیے جیوری بیٹھی۔ ایک جج نے واقعات سن کر بالکل چھوڑ دینے کا فیصلہ کیا۔ سرکاری وکیل کے مقابل خود مولانا بحث کرتے تھے۔ بلکہ لطف یہ تھا کہ جتنے الزامات اپنے اوپر خود عائد کیے اور پھر خود ہی مثل تار عنکبوت تمام الزامات عقلی و قانونی دلائل سے توڑ دیے۔ جج یہ رنگ دیکھ کر پریشان تھا اور ان سے ہمدردی بھی تھی کیونکہ اس نے صدر الصدور دہلی کے عہد میں مولانا سے کچھ عرصہ کام بھی سیکھا تھا۔ وہ مولانا کی علمیت اور تبحر علمی سے بھی واقف تھا۔ وہ دل سے چاہتا تھا کہ مولانا بری ہو جائیں۔ کرے تو کیا کرے؟ بظاہر یہ نظر آ رہا تھا کہ مولانا بری ہو جائیں گے کیونکہ سرکاری وکیل بھی لاجواب تھے۔

دوسرا دن مقدمہ کی سماعت کا آخری دن تھا۔ تجسس بھی عدالت میں موجود تھا۔ اس نے عدالت میں علامہ کی پر وقار اور بارعب شخصیت سے متاثر ہو کر یہ کہہ دیا کہ یہ وہ فضل حق نہیں جس نے فتویٰ دیا ہے لیکن علامہ صاحب نے اس کے بیان کی تصدیق و توثیق کرنے سے انکار کرتے ہوئے اس کے پہلے قول کی تائید کی اور فرمایا: "پہلے اس گواہ نے سچ کہا تھا اور رپورٹ بالکل صحیح لکھوائی تھی۔ اب عدالت میں میری صورت دیکھ کر مرعوب ہو گیا اور جھوٹ بولا ہے۔ وہ فتویٰ صحیح ہے۔ میرا لکھا ہوا ہے اور آج اس وقت بھی میں اس پر قائم ہوں اور میری انگریزی حکومت کے متعلق وہی رائے ہے جو پہلے تھی"۔

اسماعیل دہلوی کی گستاخانہ عبارات کا رد:

علامہ فضل حق خیرآبادی نے اسماعیل دہلوی کے مندرجہ ذیل عقائد باطلہ و فاسدہ پر "التحقیق الفتوی فی ابطال الطغوی" اور "امتناع النظیر" تصنیف فرمائیں اور مناظرے میں اسماعیل دہلوی کو شکست دی۔ جو شہرہ آفاق صداقت کی گرج کے سامنے نہ ٹھہر سکا اور راہ فرار اختیار کی۔ اس مناظرہ کے عقائد ملاحظہ فرمائیں جن کا رد پیش کیا گیا۔

1. خدا جھوٹ بول سکتا ہے۔ ۱۷
2. اللہ تعالیٰ کو غیب کا علم ہر وقت نہیں رہتا بلکہ چاہتا ہے تو غیب کی بابت دریافت کر لیتا ہے۔ ۱۸
3. ہر مخلوق بڑا ہو یا چھوٹا (نبی ہو یا ولی) اللہ کی شان کے آگے ہتھیار سے بھی زیادہ ذلیل ہے۔ ۱۹
4. اپنی اولاد کا نام عبدالنبی/عبدالرسول/علی بخش/نبی بخش/پیر بخش/غلام محی الدین/معین الدین رکھنا شرک ہے۔ ۲۰

۵ سب انبیاء و اولیاء اللہ کے سامنے ذرہ ناچیز سے بھی کم ہیں۔ ۲۱

۶ رسول اللہ ﷺ کے چاہنے سے کچھ نہیں ہوتا۔ ۲۲

۷ رسول اللہ ﷺ کو غیب کی کیا خبر۔ ۲۳

۸ رسول اللہ ﷺ مرکز ملی میں مل گئے ہیں۔ ۲۴

۹ جس کا نام محمد یا علی ہے وہ کسی چیز کا مختار نہیں۔ ۲۵

۱۰ رسول کا خیال نماز میں لانا اپنے نیل اور گدھے کے خیال میں ڈوب جانے سے بدتر ہے۔ ۲۶

۱۱ اللہ کے سوا اور کسی کو نہ مانے۔ ۲۷

۱۲ اللہ کو مانے اور اس کے سوا کسی کو نہ مانے۔ ۲۸

۱۳ اولیاء و انبیاء، امام زادہ اور پیر و شہید جتنے اللہ کے مقرب بندے ہیں سب انسان ہی ہیں اور بندے عاجز اور ہمارے بھائی مگر اللہ نے ان کو بڑائی دی اور بڑے بھائی ہو گئے۔ ۲۹

علامہ فضل حق کا جواب:

اس کے مقابلے میں تونسوی کی تفصیلات کھیں جن کا مرکزی نقطہ سید الانبیاء ﷺ کی ذات اقدس و اعلیٰ کا خلاف عشق و اطاعت ہے۔ "اللہ تعالیٰ نے آنحضرت ﷺ کو جو امتیاز و اکرام اور فضائل جمیلہ و مناصب جلیلہ عطا فرمائے ہیں۔ ان میں سے بعض آپ نے ملاحظہ کر لیے۔ اب گوش دل اور کامل توجہ سے ملاحظہ فرمائیں کہ جب معلوم ہو گیا کہ آنحضرت ﷺ کو بارگاہ کبریا میں وہ جاہت و حرمت اور مرتبہ محبوبیت حاصل ہے کہ اس میں اولین و آخرین اور انبیاء و مرسلین میں سے کسی کو حضور ﷺ کے ساتھ شرکت اور برابری حاصل نہیں ہے۔ اس سے پہلے بھی معلوم ہو چکا کہ وجاہت، حرمت اور رتبہ محبوبیت، شفاعت اور سفارش کی مقبولیت کا سبب ہے تو اب جان لینا چاہیے کہ شفاعت کبریٰ حضور ﷺ کا خاص منصب ہے۔ حضور کی شفاعت بلاشبہ مقبول و مستجاب ہے اور حضور ﷺ کی ذات مشہود صفات تمام جہانوں کے لیے رحمت، جنوں انسانوں اور فرشتوں کے لیے ملجا و ماویٰ ہے۔

مشرکین مکہ حضور ﷺ کے وجود فائض الجود کی برکت سے مکہ مکرمہ میں عذاب الٰہی سے محفوظ رہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے (وما کان لیعذبھم وانت فیھم) "اللہ کی یہ شان نہیں کہ کفار مکہ کو عذاب دے۔ جبکہ اے حبیب! تم ان میں موجود ہو"۔ جب حضور ﷺ مکہ مکرمہ سے مدینہ طیبہ تشریف لے آئے تو اللہ تعالیٰ نے مشرکوں کو عذاب

میں مبتلا فرمادیا اور موحدوں کو ان پر غالب و مسلط فرمادیا۔ مسلمانوں کی تلواریں ان کے لیے حاکم بنادیں اور ان کی زمینیں، املاکیں اور مال مسلمانوں کو بطور غنیمت عطا فرمادیے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ﴿وَمَا لَهُمْ أَنْ لَا يُعَذِّبَهُمُ اللَّهُ﴾ ان کی کیا حیثیت ہے کہ اللہ تعالیٰ انہیں عذاب نہ دے۔ (کہ حضور ﷺ مدینہ طیبہ تشریف لے گئے ہیں جن کی ذات مبارکہ ان کے لیے باعث امن تھی)"۔ ص

خلاصہ فتویٰ:

حضرت علامہ فضل حق خیرآبادی رحمۃ اللہ علیہ نے آخر میں اپنے اس مفصل و مدلل فتویٰ (جو ۱۸۰ صفحات پر پھیلا ہوا ہے) کا خلاصہ خود تحریر فرمایا ہے جو درج ذیل ہے۔

جب چاروں مقام مکمل ہو گئے تو آپ خلاصہ فتویٰ اور استفتاء کا جواب سنیے! سائل نے تین سوال کیے تھے۔

❶ یہ کلام حق ہے یا باطل؟

❷ اس کا یہ کلام حضرت سید الاولین والآخرین افضل الانبیاء والمرسلین آپ پر صلوٰۃ و سلام بھیجنے والوں کی پاکیزہ ترین صلوٰۃ، سلام بھیجنے والوں کا بہترین سلام، فرشتوں اور مسلمانوں کا پسندیدہ ترین ہو کی شان عالی اور قدر جلیل و جمیل کی تنقیص و تخفیف ہے یا نہیں؟

❸ اگر یہ کلام نبی اکرم ﷺ کی تنقیص شان کی قباحت پر مشتمل ہے تو اس کے مرتکب کا حال اور حکم شرع کیا ہے اور دین و ملت کے لحاظ سے کون ہے؟

❶ پہلے سوال کا جواب یہ ہے کہ چونکہ اس کا کلام مذکور سراسر جھوٹ، دروغ، فریب اور دھوکہ ہے کیونکہ وہ گناہگاروں کی نجات کے لیے شفاعت کے سبب ہونے کی نفی کرتا ہے اور نبی اکرم ﷺ دیگر انبیاء و ملائکہ علیہم السلام اور اصفیاء سے شفاعت و جاہت اور شفاعت جہت کی نفی کرتا ہے۔ اس کا یہ عقیدہ کتاب مبین، احادیث سید المرسلین اور اجماع مسلمین کے خلاف ہے۔ جیسے مقام اول میں تفصیلاً ثابت ہوا اور مقام ثانی میں اس کلام کے کچھ حصوں کا بطلان دلائل سے واضح ہوا۔

❷ دوسرے سوال کا جواب یہ ہے کہ اس کا کلام بلاشبہ بارگاہ الٰہی کے مقربین کے سردار و دیگر انبیاء، ملائکہ، اصفیاء، مشائخ اور اولیاء کی تنقیص شان پر مشتمل ہے اور استخفاف پر دلالت کرتا ہے جیسے مقام ثالث میں مذکور اور اس سے پہلے دلائل سے ثابت ہوا۔

❹ تیسرے سوال کا جواب یہ ہے کہ اس بیہودہ کلام کا قائل از روئے شریعت کافر اور بے دین ہے اور ہرگز مسلمان نہیں ہے اور شرعاً اس کا حکم قتل اور تکفیر ہے۔ جو شخص اس کے کفر میں شک و تردد لائے یا اس استخفاف کو معمولی جانے کافر و بے دین اور لعین ہے۔ مگر کفر اور بے دینی میں اس شخص سے کم ہے جو اس گمراہانہ کلام کو قابل تحسین جانتا ہے اور اس کلام کے اعتقاد کو ضروریات دین میں سے شمار کرتا ہے۔ ایسا شخص کفر میں قائل کے برابر ہے بلکہ استخفاف میں اس سے بڑھ کر ہے کیونکہ اس نے نبی اکرم و دیگر انبیاء ملائکہ اور اولیاء کے استخفاف کو مستحسن جانا اور اسے ضروریات دین میں سے گمان کیا۔ اسی طرح جو شخص ظاہراً یا باطناً ایسے مسائل میں اس قائل کی طرفداری روا رکھتا ہے اور اہل علم میں اس کی عزت کے تحفظ کے لیے کارنامہ انجام دیتا ہے وہ نبی اکرم ﷺ کی تخفیف شان کا مرتکب ہوا ہے کہ ایک بے دین کی طرفداری کو سید الانام ﷺ کی عزت و حرمت پر ترجیح دی اور ملامت کے خوف بلکہ بلفظ بدتر اس کلام کے ثابت کرنے کے درپے ہوا جو نبی اکرم ﷺ کی تخفیف شان پر دلالت کرتا ہے اور یہ سب کفر اور الحاد ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں نبی اکرم ﷺ اور آپ کی آل پاک کے طفیل اس سے محفوظ رکھے۔ چوتھے مقام میں ان مقاصد کے ثابت کرنے سے فراغت حاصل ہوئی۔ پس خاتمہ قوم کی جزاکاٹ دی گئی۔

﴿والحمد للہ رب العالمین﴾

مسئلہ امتناع نظیر میں علامہ کا عقیدہ اور غالب کی ترجمانی:

امتناع نظیر کے متعلق علامہ نے مفصل اور مضبوط دلائل دیے ہیں یہاں پر اس کا اعادہ مضمون میں زیادہ طوالت پیدا کردے گا۔ اس لیے علامہ فضل حق خیرآبادی رحمۃ اللہ علیہ کے زیر اثر مرزا اسد اللہ خاں غالب کے مندرجہ ذیل اشعار پر اکتفا کرتے ہیں جن میں انہوں نے ثابت کیا ہے کہ حضور ﷺ کو اللہ جل شانہ نے خاتم النبیین بنایا ہے۔ اس لیے اس عالم میں حضور ﷺ کا نظیر پیدا ہونا محال اور ممتنع بالذات ہے۔ پھر جب حضور ﷺ نذیراً للعالمین اور رحمۃً للعالمین ہیں تو یہ جہان چھوڑ اور بھی کئی جہان ہوں لاکھوں کروڑوں جہان ہوں بلکہ لاتعداد جہان ہوں تو بھی خاتم الانبیاء حضور ﷺ ہی رہیں گے۔ اسمٰعیل دہلوی کا یہ کہنا کہ اللہ چاہے تو کروڑوں محمد جیسے پیدا کرسکتا ہے نری گمراہی ضلالت اور حماقت ہے۔ غالب نے اپنے ان اشعار میں امکان نظیر کے خیال کو رد کرتے ہوئے علامہ فضل حق خیرآبادی کی رائے سے اتفاق کیا ہے اور اسی رائے سے اپنی موافقت ظاہر کرتے ہوئے جس مدلل طریقے سے ثابت کیا ہے یہ غالب ہی کا حصہ ہے۔

دو کے عالم دو تا خاتم بجوے
صد ہزاراں عالم و خاتم بجوئے
غالب! ایں اندیشہ بذیرم ہمی
خوردہ ہم برخویش می گیرم ہمی
ایکہ خاتم المرسلینش خواندہ
دائم ازروئے یقینش خواندہ
ایں "الف لامے" کہ استغراق راست
حکم ناطق معنئے اطلاق راست
مبدأ ایجاد ہر عالم یکے است
گر دو صد عالم بود خاتم یکے است
منفرد اندر کمال ذاتی است
لاجرم مشکش "محال ذاتی" است [۳۱]

امیر الروایات کا بہتان:

امیر الروایات کی روایت اس لیے قابل اعتبار نہیں کہ مولانا نے اپنے فتوئی اور امتناع نظیر میں اختیار کردہ موقف سے سرمو انحراف نہیں کیا۔ بلکہ معصیت کے دوران بھی انہوں نے نبی کریم ﷺ کی ذات اقدس سے اپنی جس غلامانہ وابستگی اور شیفتگی کا مظاہرہ کیا ہے اس کی موجودگی میں وہ کس طرح اسمٰعیل دہلوی کی فکریات سے اتفاق کر سکتے ہیں؟ پھر یہ بھی تو دیکھیں کہ اسماعیل دہلوی حکومت انگلشیہ کا آلۂ کار بن کر اسلامی مرکزی خلافت کے مقابلے میں ایک "نیا امیر المومنین" گھڑتا ہے۔

سرحد آزاد کے جنگجو پٹھانوں میں خلفشار پیدا کر کے ان کی لڑکیوں سے جبراً نکاح کے احکامات صادر کر کے ان عقائد میں خلل ڈال کر ان کے خلاف خانہ جنگی کو جہاد فی سبیل اللہ کا نام دیتا ہے۔ انگریزوں کے دشمن حکمرانوں پر دباؤ ڈال کر انہیں انگریزوں سے مصالحت کے لیے مجبور کرتا ہے۔ خود مسلمانوں کے ساتھ لڑتا ہوا مارا جاتا ہے اور اس کا بیڑا اپنے آپ کو غائب کر دیتا ہے اور آج تک پتہ نہیں کہ ان کا کیا انجام ہوا؟ ان حالات میں امیر الروایات' مصنف اشرف علی تھانوی میں مذکور افسوس اور ندامت ایک افسانہ اور طوطا مینا کی کہانی سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی۔

سید احمد اور اسماعیل دہلوی کے "جہاد" کی حقیقت:

اسماعیل دہلوی اور اس کے پیر و مرشد سید احمد بریلوی کا سکھوں کے خلاف جہاد جو حیثیت رکھتا ہے اور جس طرح تاریخ گھڑی گئی ہے اس کا پردہ محمد محبوب علی خاں لکھنوی نے "تاریخ اعیان وہابیہ" میں دلائل و براہین سے چاک کیا ہے۔

"اسمٰعیل دہلوی اور ان کے مرشد سید احمد بریلوی کی اس جنگ زرگری سے برٹش گورنمنٹ کو حسب ذیل فائدے ہوئے۔

1. دہلی اور ہندوستان کے دیگر بلاد آسانی کے ساتھ بہادر اور غیرت مند مسلمانوں سے اکثر خالی ہو گئے۔
2. مغل سلطنت کے جاں نثار اس کے قرب میں کم ہو گئے۔
3. سلطنت ہند کی قوت کمزور سے کمزور ہوتی گئی۔
4. ہندوستان پر مکمل قبضہ کرنا انگریزوں کو آسان ہو گیا۔
5. ان دونوں کی آپسی سے انگریز کی قوت بڑھی۔
6. ان کی جنگ زرگری سے نجات پر بھی انگریزوں کا تغلب آسان ہو گیا۔
7. سرحدی مسلمانوں میں ان دونوں نے پھوٹ ڈال دی۔
8. آزاد قبائلیوں کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور انہیں ایک دوسرے کے خون کا پیاسا بنا دیا۔
9. قبائلی مسلمانوں کے قتل کے فتوے بار بار لکھے اور شائع کیے۔
10. پٹھانوں کی طاقت کمزور کرا دی۔
11. کافروں کے مقابل ان کی ہوا خیزی کرائی۔
12. کتاب "تقویۃ الایمان" کے ذریعہ مسلمانوں میں نفاق و شقاق کی آگ بھڑکائی۔
13. دوسری ریاستوں اور حکومتوں کو بھی خطوط و سفیر بھیج بھیج کر پنجاب کی طرف متوجہ کیا اور سلطنت مغلیہ کی مدد سے غافل کر دیا۔
14. فرقہ بندی شروع کرائی، گھر گھر لڑائی کرائی، کچھ دنوں بعد ہی برٹش حکام نے تغلب حاصل کیا اور کچھ دنوں بعد ان کی مدد کی بناء پر انگریزوں نے نہ صرف دہلی بلکہ تمام ہند پر تسلط جما لیا۔

چند حقائق جن سے صرف نظر ممکن نہیں:

آخر میں ہم حکومت پاکستان کو متوجہ کرنا چاہتے ہیں کہ وہ اسمٰعیل دہلوی اور سید احمد بریلوی کے جہاد کی حقیقت واضح کرنے کے لیے ایک "ہسٹاریکل ریسرچ بورڈ" مقرر کر کے اس دور کی تاریخ از سر نو مرتب کرے اور مندرجہ

ذیل حقائق کو خاص طور پر پیش نظر رکھے۔

❶ مولانا فضل حق کے دین کی رو سے اسلام دشمنوں اور ملک کے غاصبوں پر جہاد واجب تھا جبکہ اسمٰعیل دہلوی کے مذہب کی رو سے یہ بات فرض تھی کہ انگریزوں پر جہاد کرنے میں کبھی شریک نہ ہوں۔

❷ مولانا فضل حق کا جہاد صرف انگریز کے خلاف تھا مگر اسمٰعیل دہلوی بحث میں جس عالم سے عاجز آجاتے اس کے خلاف جہاد کا اعلان کر دیتے۔

❸ مولانا فضل حق جنگ آزادی 1857ء کے عظیم رہنما تھے۔ جنگ آزادی میں حصہ لینے کی پاداش میں انگریزوں نے مسلمانوں پر ظلم واستبداد کی انتہا کر دی جبکہ اس کے مقابلے میں اسمٰعیل دہلوی اور سید احمد کا اعلان تھا کہ سرکار انگریزی کو منکر اسلام ہے مگر مسلمانوں پر کچھ ظلم اور تعدی نہیں کرتی۔ اس کے خلاف جہاد نہیں۔

❹ مولانا فضل حق اور ان کے ساتھیوں نے پیغمبر اسلام ﷺ کے ادنیٰ خادم اور نام لیوا کی حیثیت سے جنگ آزادی میں حصہ لیا جبکہ سید احمد بریلوی نے اپنے آپ کو مامور من اللہ کہا۔ اپنے اوپر الہام ہونے کا دعویٰ کیا اور اسمٰعیل دہلوی کو سید احمد کا خلیفہ بمنزلہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ قرار دیا گیا۔

❺ جنگ آزادی 1857ء میں مولانا فضل حق خیرآبادی کی خدمات جلیلہ کا اعتراف غیر جانبدار مورخین کے علاوہ جانبدار و ہابیوں کو بھی کرنا پڑا اور وہ اس جنگ کے ہیرو کہلائے جبکہ سید احمد، اسمٰعیل دہلوی اور ان کے ساتھی مجاہدین کو سندھ اور سرحد کے لوگ انگریز کا جاسوس سمجھتے تھے۔

❻ مولانا فضل حق کے خلاف استغاثے کے گواہ شہادت سے منحرف ہو گئے تو خود ان لیوں نے اقبال جرم کر کے کالے پانی اور شہادت کو خوش آمدید کہا جبکہ اسمٰعیل دہلوی و سید احمد کے خلاف اس شکایت کی تردید انگریز افسروں نے خود کی کہ یہ انگریز کے مخالف ہیں۔

❼ انگریزوں کی حکومت مولانا فضل حق کے جہاد کا ہدف تھی جبکہ اسمٰعیل دہلوی کے "جہاد" کی راہ میں گورنمنٹ انگلشیہ نے کوئی مزاحمت نہیں کی بلکہ ہر طرح کی معاونت کی۔

❽ اسمٰعیل دہلوی مرہٹوں اور سکھ سلطان کی انگریزوں کی راہ سے ہٹ جانے کے بعد سکھوں کو ان کی راہ سے ہٹانے کے لیے سرگرم عمل رہے۔ ان کی کوششوں سے سکھ حکومت پر انگریز حکومت قابض ہوئی جبکہ صرف مغل حکومت باقی تھی جسے بچانے اور انگریز کا اقتدار ختم کرنے کے لیے مولانا فضل حق نے جان کی بازی لگا دی۔

❾ مولانا فضل حق نے انگریز کے خلاف جہاد کا فتویٰ دیا اور اس جہاد میں باقاعدہ حصہ لیا جبکہ اسمٰعیل دہلوی نے

WWW.NAFSEISLAM.COM

حضور پُر نور ﷺ سے محبت رکھنے والے مسلمانوں کو مشرک قرار دے کر ان کے خلاف جہاد کا فتویٰ دیا اور اہل اسلام اور مسلموں کے خلاف جہاد کیا۔

⑩ فضل حق کو انگریز خاموں نے کالے پانی کی سزا دی۔ جہاں مصائب و شدائد کو برداشت کرتے ہوئے وہ شہید ہو گئے جبکہ اسمٰعیل دہلوی اور ان کے تمام ہمراہیوں کو "جہاد" کے لیے تیار کرنے کی خاطر انگریزوں نے کھانے کھلائے۔ سرحد میں ان کے لیے خوشیاں بچھائیں اور ہر طرح ان کو مضبوط و مستحکم کیا۔

⑪ مولانا فضل حق نے عدالت میں اپنے فتویٰ پر اصرار کیا جبکہ اسمٰعیل دہلوی نے انگریزوں کی خوشحال رعایا ہونے کا اقرار کیا۔

⑫ مولانا فضل حق نے والیان ریاست کو انگریزوں کے خلاف بغاوت کرنے پر آمادہ کیا جبکہ سید احمد بریلوی نے سرحدی امراء کو خط لکھے جن میں مسلموں اور بالخصوص مسلمانوں کے قتل و قتال کے مزامیر کا اظہار کیا۔

⑬ مولانا فضل حق نے مسلمانوں کو دین کی اصل پر قائم اور متحد رکھنے کے لیے کام کیا جبکہ اسمٰعیل دہلوی نے مسلمانوں کی تکفیر کی اور ان میں پھوٹ ڈالی۔

⑭ مولانا فضل حق غیر ملکی خاموں سے نفرت کرتے تھے جبکہ اسمٰعیل دہلوی غیر ملکی خاموں کی فرمانبرداری پر فخر کرتے تھے۔

⑮ مولانا فضل حق جنگ آزادی کے سرکردہ ولیڈر رجنرل بخت خاں اور پرنس فیروز شاہ کے معتمد اور مشیر تھے جبکہ اسمٰعیل دہلوی و سید احمد انگریز حکام کے معتمد تھے اور انگریزوں نے انہیں ہر قسم کی مراعات دیں۔

⑯ مولانا فضل حق، بہادر شاہ ظفر پر زور دیتے تھے کہ مجاہدین میں جنگ آزادی کی ہمت افزائی کریں اور انہیں بہتر معاوضہ دیں جبکہ اسمٰعیل دہلوی و سید احمد سرحدی قبائل کی نوابوں اور رئیسوں سے زر اعانت تاراج کرتے تھے اور ان کے انکار پر ان کے خلاف "جہاد" کا علم اٹھا لیتے تھے۔

سواد اعظم اہل سنت کی ذمہ داری:

سواد اعظم اہل سنت کی تمام سیاسی، مذہبی، تعلیمی، تحمدنی، تجدیدی اور معاشرتی تنظیموں کا فرض ہے کہ وہ علامہ فضل حق خیر آبادی کی تاریخ ساز شخصیت سے قوم کو روشناس کرائیں۔ جس طرح اعلیٰ حضرت عظیم البرکت مجدد دین و ملت کی شخصیت کو متعارف کرایا ہے اسی طرح اس سلسلۂ عالیہ کے سرخیل علامہ فضل حق خیر آبادی علیہ الرحمۃ کی خدمات جلیلہ خاص طور پر تحفظ ناموس رسالت میں ان کی مساعی عظیمہ کو تحریر و تقریر کے ذریعے قوم کے سامنے لائیں۔

﴿حوالہ جات﴾

۱۔ آثار الصنادید' صفحہ:۱۱

۲۔ حیات شبلی' صفحہ:۲۲۔۲۳

۳۔ ماہنامہ شام و سحر لاہور نومبر 1984ء' صفحہ:۱۳

۴۔ ایضاً' صفحہ:۱۱

۵۔ غالب نام آور' مطبوعہ 1969ء' صفحہ:۱۰۱

۶۔ بہادر شاہ ظفر اور ان کا عہد' صفحہ:۸۹۳

۷۔ آزادی کے مجاہد' صفحہ:۳۵

۸۔ ہفت روزہ خدام الدین' 23 نومبر 1962ء' صفحہ:۹

۹۔ نقش حیات' صفحہ:۲۶۲

۱۰۔ تحریک ریشمی رومال' صفحہ:۶۳

۱۱۔ اخبار دہلی' رپورٹ تراب علی' مؤرخہ 28 اگست 1857ء

۱۲۔ ماہنامہ تحریک دہلی' صفحہ:۱۷

۱۳۔ تواریخ عجیبہ' صفحہ:۷۳

۱۴۔ حیات طیبہ' صفحہ:۲۹۶

۱۵۔ تواریخ عجیبہ' صفحہ:۹۱

۱۶۔ حیات طیبہ' صفحہ:۲۹۴

۱۷۔ رسالہ یک روزہ' اسماعیل دہلوی

۱۸۔ تقویۃ الایمان' صفحہ:۱۹

۱۹۔ ایضاً' صفحہ:۲۶

۲۰۔ ایضاً' صفحہ:۸

۲۱۔ ایضاً' صفحہ:۷۵

۲۲۔ ایضاً

۲۳۔ ایضاً

۲۴۔ ایضاً

۲۵۔ صراط مستقیم

۲۶۔ تقویۃ الایمان' صفحہ:۲۳

۲۷۔ ایضاً' صفحہ:۱۹

۲۸۔ ایضاً' ص:۷۰

۲۹۔ تحقیق الفتویٰ' اردو ترجمہ' صفحہ:۱۱۰۔۱۱۱

۳۰۔ باغی ہندوستان' صفحہ:۱۲

Nafse Islam
WWW.NAFSEISLAM.COM

علامہ فضل حق خیرآبادی
تاریخ ساز شخصیت

مولانا محمد صدیق ہزاروی

حضرت علامہ ہزاروی بہترین مدرس، اعلیٰ منتظم، سلجھے خطیب، منجھے مصنف اور پختہ قلم ادیب ہیں۔ مفتی اعظم پاکستان حضرت علامہ مفتی عبدالقیوم ہزاروی آپ پر بے پناہ اعتماد کرتے تھے۔ اسی اعتماد و تربیت کی جھلک آپ کی ان گنت مصروفیات سے عیاں ہوتی ہے۔ ایک طرف آپ اسلامی نظریاتی کونسل کے رکن، جامعہ نبویہ لاہور کے مہتمم، جامعہ اسلامیہ منصورہ کے نگران اور تنظیم المدارس کی نصاب کمیٹی کے ممبر ہیں تو دوسری طرف درجنوں کتابوں کے مترجم، شارح، مصنف اور ماہنامہ "نوید سحر" کے روح رواں ہیں۔

علامہ فضل حق خیرآبادی الٰہیات، علم کلام، منطق اور فلسفے کے امام وقت تھے۔ برصغیر کے معقولین میں ابتدا سے اب تک ان کا کوئی مثیل و نظیر نہیں ہے۔ عالم اسلام کے فلاسفہ میں وہ نصیر الدین طوسی، میر باقر داماد اور صدر شیرازی کے ہم صف اور ہم مرتبہ محققین میں سے تھے۔ فلسفۂ الٰہیات اور منطق میں اُن کی تالیفات، شروح اور حواشی فلاسفۂ عالم میں ان کے مقام کا تعین کرتی ہیں۔ نصف صدی تک مسلسل تدریس کرتے رہے اور تلامذہ کی ایک معقول تعداد نے آپ سے کسبِ کمال کیا اور یوں منطق و کلام کے ایک جدید مکتب فکر "مکتب خیرآباد" کے بانی قرار پائے۔

علوم میں اس علو مقام کے ساتھ مولانا کی حیات کا ایک تابناک باب یہ ہے کہ آپ ایک مدبر سیاسی راہنما اور مجاہد بھی تھے۔ یہی باب ہمارا موضوع ہے۔

مولانا نے "سن ستاون" کی جنگ آزادی میں جو حصہ لیا وہ کسی وقتی جوش اور جذبے کا نتیجہ نہیں تھا بلکہ جنگ آزادی برپا ہونے سے برسوں پہلے آپ برصغیر پر فرنگی راج کے استیلاء و تسلط، فرنگی حکام کی نااہلی اور تہم شعاری کی وجہ سے بددل اور بیزار تھے۔ مولانا نے اپنی عملی زندگی کا آغاز اگر چہ ایسٹ انڈیا کمپنی کی ملازمت سے کیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ ملازمت ناپسند ہونے کے باوجود والد ماجد کے حکم اور خواہش کی ایک سعادت مندانہ تعمیل تھی۔ ملازمت کے تین چار سال بعد ہی ۱۸۱۸ء میں والد ماجد کے نام اپنے ایک مکتوب میں اس ملازمت سے بیزاری کا اظہار

اسطرح فرماتے ہیں۔ "میں خدا کے فضل وکرم سے خوش حال اور مطمئن ہوں مگر ملازمت میں ذلت وخواری بہت ہے۔ حاکم کے سامنے مستقل حاضر رہنا پڑتا ہے اور اس کے وہ احکام املاء کرنے ہوتے ہیں جو قابل قبول نہیں ہوتے۔ قسم خدا کی اگر مجھے رسوائی کی شرم نہ ہوتی تو کبھی کا کسی اور جگہ مستقل ہو جاتا اور متقلانہ زندگی بسر کرتا"۔ ۷

شاید والد کا اصرار ملازمت برقرار رکھنے کے سلسلے میں جاری رہا اور مولانا صبر وتحمل سے کام لیتے رہے مگر والد کی رحلت کے فوراً بعد مولانا نے غلامی کا یہ لبادہ اتار پھینکا اور والی مجھرو نواب فیض محمد خاں کی دعوت پر ریاست مجھرو کا قیام منظور فرمالیا۔ مرزا غالب نے آئینہ سکندری (کلکتہ) کے مدیر کے نام اپنے مراسلے (مورخہ ۳۱ جنوری ۱۸۳۴ء) میں اس واقعہ پر مبنی جذبات کا اظہار کیا ہے۔ اگر مولانا سے مرزا غالب کے مراسم اخوت واتحاد کے دائمی نظر آتے ہیں مولانا کے جذبات وتاثرات قصور کریں تو بے جا نہ ہوگا۔ خصوصاً اس لیے کہ فرنگی حکومت کے متعلق مرزا غالب نے ایسے الفاظ کہیں اور استعمال نہیں کیے۔

"حکام فرنگ کی بے تمیزی اور قدر شناسی نے رنگ دکھایا کہ فاضل بے نظیر والمثل یگانہ مولوی حافظ محمد فضل حق نے عدالت دیوانی کی سررشتہ داری سے استعفا دے کر تنگ وعار سے نجات پائی۔ واقعہ یہ ہے کہ اگر مولانا کے علم وفضل کے ایک فی صدی کا عدالت دیوانی کی سررشتہ داری سے موازنہ کریں تو اس عہدہ کا پلہ بالکل ہلکا رہے گا"۔ ۸

مولانا نے اس قطع تعلق پر ہی اکتفا نہیں فرمایا بلکہ اگر یہ حکام کے خلاف نا حکام واقدامات اور اس سے عوام کی تکالیف اور پریشانیوں کا بھی تفصیلی جائزہ لیتے رہے اور ان تکالیف کے ازالے کے لیے جدوجہد بھی فرماتے رہے۔ مولانا کی ان سرگرمیوں کا پتہ ہمیں اس درخواست سے چلتا ہے جو مولانا نے "سن ستاون" سے کم از کم ۳۰ سال پہلے اکبر شاہ ثانی (ف ۱۸۳۷ء) کے نام رعایائے شہر کی طرف سے مرتب کی تھی۔ ذیل میں اس طویل فارسی درخواست کا خلاصہ دیا گیا ہے۔

ملک کی اقتصادی حالت:

یہاں کے باشندے ہندو ہوں یا مسلمان ملازمت، تجارت، زراعت، حرفت، زمینداری اور دریوزہ گری پر معاش رکھتے ہیں۔ انگریزوں کی حکومت کے قیام کے بعد سے معاش کے یہ تمام وسائل مسدود ومفقود ہو گئے ہیں۔ ملازمت کے دروازے شہریوں پر بند ہیں۔ تجارت پر انگریزوں نے قبضہ کر لیا ہے۔ کپڑا، سوت، ظروف اور گھوڑے وغیرہ تک وہ فرنگ سے لے کر خود فروخت کر کے نفع کماتے ہیں۔ معافی داروں کی معافیاں ضبط کر لی گئی ہیں۔ کسانوں کو محاصل کی کثرت نے بدحال کر دیا ہے۔ ان چاروں طبقوں کی نادہن حالی کے نتیجے میں اہل حرفہ

WWW.NAFSEISLAM.COM

اور ان سب کے نتیجے میں دریوزہ گر تنگی معاش کے شکار ہیں۔

دہلی کی اقتصادی زبوں حالی:

دہلی میں ہوڈل وغیرہ بہت سے پرگنے جاگیر میں شامل تھے اور جاگیرداروں کے یہاں ہزاروں آدمی فوج، انتظامی امور اور شاگرد پیشہ کی خدمت پر مامور تھے۔ اب یہ پرگنے اور ریاستہائے دامواضعات انگریزوں نے ضبط کر لیے ہیں اور لاکھوں کسان بے روزگار ہو گئے ہیں۔ یہ اوگ اس معاش جو بہ کاشتے' ریاں بشے اور چکی پیسنے پر موقوف تھی۔ اب رسی کی تجارت حکومت (کمپنی) نے اپنے ہاتھ میں لے لی ہے اور ہاتھ کی چکیوں کی جگہ پن چکیاں لگ گئی ہیں تو یہ زرخیز معاش بھی جاتا رہا۔ عوام کی اس بے بضاعتی اور بے روزگاری کی وجہ سے اہل حرفہ اور ساہوکار بے روزگار اور رزق سے محروم ہو گئے ہیں۔

ان سب پر مستزاد اب چارلس مٹکاف نے یہ حکم دیا ہے کہ غریب کسان جو کیداری ٹیکس ادا کیا کریں۔ یہ ٹیکس پہلے کبھی نہیں لیا جاتا تھا۔

دوسرا حکم یہ ہوا ہے کہ ہر گلی کے دروازے پر پھاٹک لگایا جائے جس کا کوئی فائدہ معلوم و مفہوم نہیں ہے۔ تیسرا حکم یہ ہوا ہے کہ ان پھاٹکوں کے کھلنے اور بند ہونے کے اوقات مقرر ہوں جس سے ہمیں مشکلات کا سامنا ہے۔ چوتھا حکم یہ ہوا ہے کہ ہر محلے میں ۵ یا ۶ چوکیدار مقرر کیے جائیں۔

اس درخواست سے جہاں مولانا کی سیاسی بصیرت اور عوام کے مسائل اور شہری زندگی کی مشکلات پر ان کی گہری نگاہ کا ثبوت ملتا ہے وہاں یہ بھی اندازہ ہو گیا ہے کہ انہوں نے ان تمام مشکلات و مصائب کے سر چشمہ پر انگلی رکھ کر صحیح تشخیص کر لی تھی اور اسباب کا تجسس کر کے اس کا تعین فرما دیا تھا کہ یہ سارے مسائل غیر ملکی حکمرانوں کے پیدا کردہ ہیں۔ پھر یہ بھی قابل غور ہے کہ درخواست دہلی کے کمشنر برٹیز ہیٹ کے نام لکھی ہے جو شہر و ضلع کا حقیقی حاکم تھا مگر "حضور جہاں پناہ" کے نام پر یعنی ساکنان دہلی کے مسائل لال قلعے کے لیے بے اختیار حکمران (مغل شہنشاہ) (اکبر شاہ ثانی) کے سامنے پیش کیے گئے ہیں۔ حالانکہ لال قلعہ ۱۸۰۳ء سے ویران تھا اور اکبر شاہ ثانی کے والد شاہ عالم کی حکومت دہلی سے پالم تک رہ گئی تھی اور اکبر شاہ ثانی کی حکومت تو صرف لال قلعہ تک محدود تھی۔ خود شہنشاہ نے کمپنی کی وظیفہ خواری پر قناعت فرمالی تھی اور عوام بھی اپنی تمام تر ضروریات کے سلسلے میں سچے حکمرانوں کی طرف متوجہ ہوتے تھے۔ انہیں کی عدالتوں میں انصاف کے لیے جاتے تھے اور انہیں کو سلام کے عادی ہوتے جا رہے تھے۔

ان حالات میں برصغیر کا ایک عالم دین جس کے لیے کہا جاتا ہے کہ وہ سیاست نہیں جانتا۔ عوام کو دوبارہ لال

قلعے کے پھاٹک کی طرف لیے جارہا ہے اور ان کی طرف سے درخواست لکھ کر ان کے حالات وخیالات کا ترجمان بن کر ان کو حضور "جہاں پناہ" کے دیوانِ عام میں لا کھڑا کرتا ہے اور اس طرح ایک پیچیدہ نفسیاتی تحریک چلاتا ہے جس سے ایک طرف عوام کو دوبارہ اپنے جانے پہچانے مرکز حکومت سے گرہ کشائی اور حل مشکلات کی توقعات پیدا ہوں گی۔ دوسری طرف خود ان جہاں پناہ کی خودی بیدار ہونے کے امکانات ابھریں گے اور ان کی غیرت وحمیت بھی ممکن ہے انگڑائی لے کر جاگ اٹھے۔ تیسری طرف برطانوی حکومت کے کارکن چونکیں گے کہ یہ کیا ہوا ہے؟ سمت قبلہ پھر تبدیل ہو رہی ہے اور چونک کر ایک طرف تو وہ ان مشکلات پر توجہ دیں گے دوسری طرف شاہ کے ساتھ اپنے رویے میں نرمی اختیار کریں گے اور ان کی گستاخیوں اور اہانت کوشیوں کو لگام دیں گے۔ جن کا سلسلہ انہوں نے کئی سال سے شروع کر رکھا تھا۔

مولانا کے انگریزوں کے متعلق یہ جذبات صرف وطنیت پر مبنی نہیں تھے یعنی وہ برعظیم پر انگریزوں کے بڑھتے ہوئے تسلط کے اس لیے خلاف نہیں تھے کہ وہ ملکی نہیں تھے' غیر ملکی تھے اور ان کا تعلق ایشیا سے نہیں تھا یورپ سے تھا بلکہ اس کی بناء مذہب پر تھی۔ ان کا غم انگریزوں کے قبضے کا نہیں' نصاریٰ کے قبضہ کا تھا اور نصاریٰ سے موالات شرعاً ممنوع ہے اور قرآن کریم میں مسلمانوں کو یہود ونصاریٰ سے دوستی کی نہی فرمائی گئی ہے۔ ۵

علامہ ایک قصیدے ۶ میں فرماتے ہیں: "میرا قصور صرف یہ ہے کہ میں نے ان (نصاریٰ) سے محبت اور دوستی نہیں کی کیونکہ ان کی دوستی بنص محکم کفر ہے۔ اس بات میں ایک حق پرست آدمی کے لیے اختلاف کی کوئی گنجائش نہیں ہے بھلا ان سے کیسی دوستی جو اس ذات گرامی سے عداوت رکھتے ہیں جو وجہ تخلیق ارض وسما ہے"۔

مولانا ان "النصاریٰ البراطنہ" (برطانوی عیسائیوں) کے عزائم اور اقدامات کا بغور مطالعہ کر رہے تھے اور بڑے دکھ کے ساتھ محسوس کر رہے تھے۔ فرماتے ہیں: "انگریزوں نے ملک کے تمام امیر وغریب' چھوٹے وبڑے' مقیم ومسافر' شہری اور دیہاتی باشندوں کو نصرانی بنانے کا منصوبہ بنایا ہے"۔

وہ دیکھ رہے تھے کہ انگریز اب شعائر دین اور احکام شرع پر عمل میں بھی مزاحم ہو رہے ہیں لکھتے ہیں: "ان اقدامات کے علاوہ وہ ان کے دل میں اور بہت سے مفاسد چھپے ہوئے ہیں' مثلاً ختنہ کی مخالفت' شریف مستورات میں بے پردگی کا رواج اور تمام احکام دین متین کو مٹانا"۔

مولانا یہ بھی محسوس کر رہے تھے کہ انگریزوں کی نظر میں ملک پر ان کے ہمہ گیر تسلط اور ان کی حکومت کے استحکام کے لیے اس ملک کے تمام باشندوں کا صرف ایک مذہب "عیسائیت" ہونا شدید ضروری ہے اور اس مذموم مقصد

کے حصول کے لیے وہ نظام تعلیم کو تبدیل کر رہے ہیں اور جگہ جگہ سکولوں کا جال بچھاتے چلے جا رہے ہیں۔ [1]

مولانا کی طرح ملک کے دوسرے گوشوں میں بہت سے دردمند اور وطن دوست ہندو اور مسلمان علماءؒ زعماء اور فوجی بھی ان حالات کا بغور مطالعہ کر رہے تھے اور برطانوی سامراج کے امنڈتے ہوئے سیلاب کے خلاف جدوجہد کی تیاریاں کر رہے تھے' باہم ملاقاتیں ہو رہی تھیں' مشورے کیے جا رہے تھے اور پورے ملک میں بیک وقت ایک تحریک شروع کر دینے کا منصوبہ تیار ہو رہا تھا تا آں کہ اس کے لیے مئی ۱۸۵۷ء کا مہینہ طے کر لیا گیا اور بالآخر دہلی کے قریب ایک فوجی مرکز میرٹھ میں ۱۶ رمضان ۱۰ مئی کو انگریزوں کے خلاف جنگ آزادی کا آغاز ہو گیا۔

﴿حوالہ جات﴾

[1] مولانا کی قلمی بیاض' ص: ۲۸' مملوکہ: حکیم نصیر الدین ندوی' کمرا پی ہم نے اس عربی مکتوب کا اردو میں ترجمہ پیش کیا ہے۔

[2] کلیات نثر غالب' ص: ۱۴۸

[3] یہ درخواست جناب نثار احمد فاروقی کو اپنی ایک قلمی بیاض میں دستیاب ہوئی اور انہوں نے نوائے ادب بمبئی (جلد نمبر: ۱۳' شمارہ: ۳' جولائی ۱۹۶۲ء) میں شائع کی ہے۔ فاروقی صاحب نے خیال ظاہر کیا ہے کہ یہ درخواست بہادر شاہ ظفر کے نام ہے مگر ہمارا خیال ہے کہ یہ اکبر شاہ ثانی کے نام ہے کیونکہ اس میں سر چارلس متکاف کے ایک تازہ حکم کا ذکر ہے اور سر چارلس متکاف پہلے ۱۸۱۱ء سے ۱۸۱۹ء تک اور پھر دوبارہ ۱۸۳۵ء سے ۱۸۳۷ء تک دہلی کے ریزیڈنٹ رہے اور ۱۸۳۶ء میں وفات پا گئے تھے۔ (ملاحظہ ہو ڈکشنری آف انڈین بائیوگرافی ص: ۲۸۷' مطبوعہ: ۱۹۰۶ء' رازبٹ لینڈ) اس لیے یہ درخواست ۱۸۲۷ء سے پہلے کسی سن میں لکھی گئی ہے اور اس دور میں اکبر شاہ ثانی زندہ تھے۔ بہادر شاہ ظفر تو ۱۸۳۷ء میں تخت نشین ہوئے تھے۔ یہ درخواست افسوس ہے کہ ناقص الآخر ہے۔

[4] چوکیدارہ ٹیکس کا قانون یوپی میں ۱۸۱۴ء میں نافذ ہوا تھا۔ ممکن ہے دہلی میں بھی اسی سال یا چند سال بعد یہ قانون نافذ ہوا ہو۔ اس سے بھی اس درخواست کے عہدہ کا تعین ہوتا ہے۔

[5] سورۃ المائدہ: ۵۱

[6] فصائد فتنة الهند' قصيدته همزيه

[7] رسالہ غدریہ

سیدہ انیس فاطمہ بریلوی

مولانا فضل حق، ایک عالم ایک مجاہد

مولانا فضل حق خیرآبادی جنگ آزادی 1857ء کے ہیرو، اپنے دور کے علامہ زماں اور علوم مروجہ میں امام تھے۔ ایک طرف وہ صدر الصدور کے عہدہ عقلی پر فائز تھے تو دوسری طرف سلف صالحین کی طرز پر علوم معقول کا درس یا بندی کے ساتھ دیتے تھے۔ مولوی فضل حق خیرآبادی نے بڑی کامیاب زندگی گزاری۔ اکبر شاہ ثانی کے زمانہ میں ریذیڈنسی میں سررشتہ دار تھے اور آخری فرمانروائے ہند سے مخلصانہ تعلقات تھے۔

اس زمانہ میں سیاسی اعتبار سے اگرچہ سلطنت مغلیہ آخری سانس لے رہی تھی اور مجموعی طور پر مسلمانان ہند تباہی وانحطال کی طرف بڑھ رہے تھے لیکن دہلی میں ارباب کمال کا بڑا مجمع تھا۔ مولوی فضل حق کے ہم عصر خود اپنی اپنی جگہ یگانۂ روزگار اور منفرد لوگ تھے۔ یہ لوگ حقیقتاً علم کا پہاڑ تھے مثلاً صفتی صدر الدین خاں آزردہ، مولوی امام بخش صہبائی شہید، مولوی عبداللہ علوی، حکیم مومن خاں مومن، نواب مرزا اسداللہ خاں غالب، نواب ضیاء الدین خاں نیر، شاہ نصیر الدین نصیر، شیخ محمد ابراہیم ذوق، حکیم آغا جان عیش، حافظ عبدالرحمٰن احسان، میر حسین تسکین وغیرہم

مولانا یہ سلسلۂ ملازمت عرصہ دراز تک نبھاتے رہے اور وابستہ رہے اس کے بعد جہاں آرا بیگم نے ازراہ قدردانی طلب فرمایا۔ نواب لوہارو کے یہاں بھی تھوڑے دن قیام رہا پھر ریاست رام پور میں آپ کا کافی عرصہ قیام رہا۔ نواب محمد سعید خاں اور نواب کلب علی خاں آپ کے بڑے قدردان تھے۔ بعد میں علامہ فضل حق محکمہ نظامت وصدر الصدارت سے منسلک ہو گئے اور 10' 8 سال بعد بحیثیت صدر الصدور ہو کر پنشن پائی۔

مولانا کی حاضر دماغی کا یہ عالم تھا کہ شطرنج اور حقہ نوشی کے دوران ادق کتابوں کا سبق دیتے جاتے تھے۔ علامہ کو عربی نثر ونظم پر بڑی قدرت تھی جس کا اعلیٰ درجے کا نمونہ قصیدہ ضدیہ کتابی شکل میں موجود ہے۔ مولانا فضل حق فرقۂ مخلص کرتے تھے۔ مفتی انتظام اللہ شہابی اکبرآبادی مرحوم ومغفور غالباً پہلے شخص ہیں جنہوں نے مولوی فضل حق پر مبسوط مقالہ لکھ کر مجلس مصنفین علی گڑھ میں پڑھا۔ یہ غالباً 1940ء کی بات ہے اور سید الطاف علی بریلوی نے اپنے رسالہ "مصنف" میں اسے شائع کیا۔ افسوس ہے کہ مولانا فضل حق کے سلسلے میں جتنے کام کی ضرورت ہے اتنا کام نہ ہو سکا۔

مولانا فضل حق شعر گوئی کے ساتھ ساتھ علم فقہ میں بھی درجہ کمال رکھتے تھے۔ مولانا محمد حسین آزاد کے بقول دیوان غالب کے انتخاب میں ان کا مشورہ شامل تھا۔

1857ء کی جنگ آزادی کے دوران فتویٰ جہاد پر اتفاق کے جرم میں گرفتار کر لیے گئے۔ مقدمہ چلا تو مولانا نے معرکۃ الآراء بحث کی لیکن مولانا کو عمر قید دوام کی سزا دی گئی۔ وہاں مولانا کے پیر دباغ میں کیسے کے کام کیا گیا' علی الصبح' محنت و مشقت کرنا اور صبر و شکر کے ساتھ وقت گزارنا' یہ مولانا کا وظیفہ بن گیا تھا۔

علامہ فضل حق خیرآبادی

علم و فضل کے بحر بے کراں

میاں عبدالرشید

علامہ فضل حق خیرآبادی کا جد روزگار تھے۔ غالب جیسے لوگ ان سے استفادہ کرتے تھے۔ غالب کا حسب ذیل شعر مشہور ہے۔

بجھیاں در سخن شیوہ ہوتے دارد بوجود یکے عارد زخارج اعیاں

حالی لکھتے ہیں کہ مرزا غالب نے خود انہیں بتایا تھا کہ پہلے انہوں نے اس شعر میں لفظ "ہوتے" کی بجائے نمودے لکھا تھا لیکن علامہ فضل حق خیرآبادی کو یہ شعر سنایا تو انہوں نے فرمایا کہ اعیان ثابتہ کے لیے نمود کا لفظ نامناسب ہے لہٰذا اس کی جگہ ہوتے کر دو۔

غالب ایک جگہ علامہ کے متعلق لکھتے ہیں کہ:

چوں من صد و چوں عرفی صد ہزار را بہ عمن پرورش تواند کردا

علامہ ہی نے غالب کو مشکل گوئی سے منع کیا اور مرزا غالب کا موجودہ دیوان آپ ہی کا رہین منت ہے۔ دونوں کا سال ولادت بھی 1797ء ایک ہے۔ سرسید نے بھی آپ کی انقلابی ملاحیتوں کی جا بجا تعریف کی ہے۔ اس دور کے جملہ اہل قلم آپ کی قابلیت کے معترف تھے اور آپ کی مجلس میں بیٹھنا باعث فخر سمجھتے تھے۔

آپ نے سند حدیث حضرت شاہ عبدالقادری دہلوی سے حاصل کی۔ حضرت شاہ عبدالعزیز کے سامنے بھی زانوئے ادب تہ کیا۔ اپنے عربی استعداد اہل کو کماتے تھے۔ شاہ نصیر علی قلندر کا بیان ہے کہ علامہ فضل حق نے اوائل عمر میں عرب کے مشہور شاعر امراء القیس کے ایک قصیدے کی طرز پر عربی میں ایک قصیدہ لکھا۔ حضرت شاہ صاحب نے ایک مقام پر اعتراض کیا تو اس کے جواب میں علامہ نے اپنے شعر کے حق میں حفظ من کے بیس اشعار پڑھ دیے۔ ان کے والد مرحوم بھی اس وقت وہاں موجود تھے۔ وہ فرمانے لگے "بس ادب چاہیئے"۔ حضرت شاہ صاحب نے فرمایا بیخود از قرع کہنے ہو مجھے سہو ہوا۔

روایت ہے کہ حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے جب اپنی مشہور کتاب "تحفہ اثنا عشری"

تحریر فرمائی تو ایران سے ایک متبحر عالم و مجتہد اونٹوں پر کتب فریقین لاد کر شاہ صاحب سے مناظرے کے لیے دہلی پہنچے۔ شاہ صاحب نے فرائض میزبانی عطا فرمائے اور قیام کے لیے مناسب جگہ تجویز کر کے رخصت سفر کھلوایا۔ شام کو علامہ فضل حق جو ابھی صغر سن تھے، مجتہد صاحب کی خدمت میں پہنچے تو ایک مشہور کتاب "افق المبین" پر بحث چل نکلی۔ علامہ نے ایسی مدلل تقریر کی کہ مجتہد صاحب کو جان چھڑانا مشکل ہو گیا۔ جب انہیں معلوم ہوا کہ صاحبزادے حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب کے شاگرد ہیں تو وہ بغیر مباحثہ کیے راتوں رات دہلی سے واپس چل دیے کہ جب خانقاہ کے بچوں کے علم و فضل کا یہ عالم ہے تو خود شیخ خانقاہ کا کتنا بلند مرتبہ ہوگا۔ شاہ صاحب کو معلوم ہوا تو انہوں نے قابل شاگرد کو اس پر ڈانٹا اور ناخوشی کا اظہار کیا۔

علامہ نے آنکھ کھولی تو گرد و پیش علم و فضل اور امارت و ریاست کو جلوہ گر دیکھا۔ پڑھنے کے لیے جاتے تو ہاتھی پر سوار ہو کر جاتے۔ والد ماجد کے انتقال کے بعد آپ کی عمر اٹھائیس برس تھی اور اکبر شاہ ثانی کا زمانہ تھا۔ دہلی میں انگریزوں کی طرف سے ریذیڈنٹ مقرر تھا۔ آپ پہلے پہل اس کے محکمہ میں سرشتہ دار ہوئے۔ یہاں سے استعفیٰ دے کر ولی عہد سلطنت مرزا ابو ظفر بہادر کی ملازمت اختیار کر لی۔ ولی عہد مرزا ابو ظفر بہادر نے رخصت کرتے وقت کہا کہ لفظ "وداع" زبان پر لانا دشوار ہے۔ ایک عرصہ تک مجبور رہنے کے بعد مہاراجہ الور نے بلا لیا۔ دو سال وہاں رہے پھر وہاں سے رام پور چلے گئے جہاں کے نواب نے ان سے تلمذ اختیار کیا۔ آٹھ برس کے بعد لکھنؤ چلے گئے اور وہاں صدر الصدور مقرر ہوئے۔

1857ء کی جنگ آزادی میں حصہ لیا اور بعد میں اسی جرم کی بنا پر انگریزوں نے عمر قید کی سزا دی اور جزائر انڈمان بھیج دیا۔ آخری ایام وہاں بعہد قید کی نہایت سختی اور غربت میں گزارے۔ آپ کے صاحبزادے نے انگلستان تک مقدمہ لڑا جب رہائی کا پروانہ لے کر انڈیمان پہنچے تو سامنے سے جنازہ آتا ملا۔

علامہ مرحوم نے انڈیمان سے ایک کتاب "باغی ہندوستان" اور دو قصیدے کسی نہ کسی طرح کوئلے وغیرہ سے لکھ کر بھجوائے۔ عقیدت مندوں نے انہیں ہاتھوں ہاتھ لیا اور ان کی قلمی نقلیں اپنے پاس رکھیں۔ یہ تینوں چیزیں عربی زبان میں ہیں۔ آپ نے اس کتاب میں 1857ء کی جنگ آزادی کے حالات اور اسباب بیان کیے ہیں۔ ان سے پتہ چلتا ہے کہ آپ کی سیاسی نظر کس قدر گہری تھی اور آپ کا حریت پسندوں کے ساتھ کس قدر تعلق تھا۔ کتاب کے آغاز میں لکھتے ہیں: "میری یہ کتاب ایک دل شکستہ، نقصان رسیدہ، مصرت کشیدہ اور مصیبت زدہ انسان کی کتاب ہے۔ جسے قید کر کے ہر ممکن مصیبت پہنچائی گئی۔ اس کا قصور صرف ایران اور اسلام کی مضبوطی سے قائم رہنا ہے۔ یہ سب کچھ اس

حادثۂ فاجعہ (انقلاب 1857ء) کی وجہ سے ہوا ہے..... جس سے غموں کے بادلوں سے کڑکتی ہوئی بجلیاں مصیبت زدگانِ وطن پر گریں اور ان پر تباہی و بربادی مسلط کر دی گئی"۔

یہ داستانِ الم اس طرح ہے کہ (برطانوی) نصاریٰ نے تمام باشندگانِ ہند کو نصرانی بنانے کی اسکیم بنائی تاکہ سب ایسی کی طرح ملحد بے دین ہو کر ایک ملت پر جمع ہو جائیں"۔

اس کے بعد علامہ نے برطانوی حکومت کی معاشی پالیسی کو جس طرح سے بے نقاب کیا ہے اس سے ان کی بلند نظری اور دقیقہ رسی ظاہر ہوتی ہے۔ وہ لکھتے ہیں: "اگر جرنیلوں نے دوسری ترکیب یہ سوچی کہ یہاں کے مختلف طبقوں پر اس طرح قابو حاصل کیا جائے کہ غلہ کی ساری پیداوار نقد دام ادا کر کے لے لی جائے۔ کسی کو غلہ کی پیداوار کی خرید و فروخت کا کوئی حق نہ چھوڑا جائے۔ اس طرح بھاؤ کے گھٹ جانے یا بڑھ جانے یا اور منڈیوں تک اجناس پہنچانے یا نہ پہنچانے کی خود ہی ذمہ دار بن بیٹھیں تاکہ خدا کی مخلوق مجبور و معذور ہو کر ان کے قدموں میں آگرے اور خوراک نہ ملنے پر ان کے ہر حکم کی تعمیل اور ہر مقصد کی تکمیل کرے"۔

ابوظفر بہادر شاہ کے متعلق لکھتے ہیں: "سچ پوچھیے تو وہ آمر و حاکم ہونے کی بجائے اپنی شریک حیات (زینت محل) اور وزیر (حکیم احسن اللہ) کا کارپردازہ اور ان کی محبت میں غالی تھا۔ بادشاہ ضعیف الرائے تھا۔ اپنی رائے سے کوئی کام نہیں کر سکتا تھا اور نہ اچھا برا سمجھنے کی صلاحیت رکھتا تھا۔

اس نے اپنی عاقبت نااندیش سے "خانہ زاد" اور "زرخرید اولاد کو امیر لشکر بنا دیا" (مرزا مغل اور خضر سلطان وغیرہما کی طرف اشارہ کیا ہے) یہ لوگ دیانت دار معتمد دوں سے خطرتھے۔ انہوں نے بازاری لوگوں کو اپنا ہم نشین و ہم جلیس بنا لیا۔ وہ لوگوں سے لشکریوں کے سازوسامان کے بہانے مال جمع کرتے اور اس میں سے ایک پیسہ بھی کسی لشکری پر خرچ نہ کرتے۔ انہیں ڈانٹ ڈپٹ سے لشکریوں کے ساتھ سلوک کرتے۔ وہ لوگ دیانہ و دلالت سو کر اور دن بھر مست ہو کر گزارتے اور جب بیدار و ہوشیار ہوتے تو غافل و بیزار پھرتے۔

چار مہینے تک متواتر جنگ ہوتی رہی مگر دشمن کثیر لاؤ لشکر اور ساز و سامان کے باوجود شہر میں داخل نہ ہو سکا۔ آخر مجاہدین کی ایک مختصر سی جماعت رہ گئی جو بھوک پیاس برداشت کر کے رات گزارتی اور صبح ہوتے ہی مقابلہ پر ڈٹ جاتی۔ بدقسمتی سے ایک شب محاذ پر بزدل اور کسل مند جماعت مقرر کر دی گئی جو ہتھیار اتار کر آرام کی نیند سو گئی۔ دشمن نے موقع غنیمت سمجھ کر شب خون مارا اور ان کے ہتھیاروں پر قبضہ کر کے انہیں موت کی نیند سلا دیا۔

جب نصاریٰ نے اس محاذ پر قبضہ کر لیا تو بہت سی توپیں اور بندوقیں شہر کے قریب نصب کر دیں اور دن رات

گولیوں کا نشانہ برسانا شروع کر دیا۔ جس سے شہر پناہ کا پھاٹک گر پڑا اور امیدوں کے رشتے ہاتھ سے چھوٹ گئے۔ اب ملیوں اور دوسرے ہندوؤں نے جو نصاریٰ کے دوست تھے اپنا قلعہ پھینا لیا اور باہر سے آنے والے غلہ کی آمد روک دی گئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ لشکری اور شہری بھوک سے پریشان ہو کر شہر سے بھاگ گئے اور دشمن نے شہر پناہ قلعہ بازار اور مکانوں پر قبضہ جما لیا"۔

انگریزوں کی فتح کے بعد ملکہ وکٹوریہ کی طرف سے جو عام معافی کا اعلان کیا گیا تھا اس کا یوں ذکر ہے: "میں غربت و اضطراب کی زندگی گزار رہا تھا کہ امن و امان کا پروانہ نظر پڑا۔ مجھے بالکل خیال نہ رہا کہ بے ایمان کے عہد و پیمان پر بھروسہ اور بے دین کی قسم پر اعتماد کسی حالت میں درست نہیں ہے خصوصاً جب وہ جزا و سزائے آخرت کا قائل بھی نہ ہو۔ انہوں نے عہد و پیمان توڑ کر ہزاروں بندگان خدا کو پھانسی کی تختہ بوٹی اور قید و حبس میں ڈال دیا"۔

جزائر انڈیمان کے حالات کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا ہے: "تمرش رو دشمن نے مجھے دریائے شور کے کنارے نا موافق آب و ہوا والے پیازپر پہنچا دیا جہاں سورج ہمیشہ سر پر رہتا ہے۔ اس کی تسمیم صبح گرم و تیز ہوا سے زیادہ سخت ہے۔ اس کی غذا مخلل سے زیادہ کڑوی ہے۔ اس کا پانی سانپوں کے زہر سے بڑھ کر ضرر رساں ہے۔ اس کا آسمان شعلوں کی بارش کرنے والا ہے۔ اس کی زمین آبلے دار ہے۔ اس کی ہوا ذات دشواری کی وجہ سے نیلی چلنے والی ہے"۔

آخر میں لکھتے ہیں: "ظاہر اسباب پر نظر کر کے اپنی نجات سے مایوس ہوں اور اپنی امیدوں کو منقطع پاتا ہوں لیکن اپنے رب عزیز رحیم اور رؤف و کریم کی رحمت سے نا امید نہیں۔ وہی جابر فرمانوں سے عاجز و کمزوروں کو نجات دلاتا ہے۔ وہی دنیا کے مظلوموں کے زخموں کو اپنے رحم و کرم کے مرہم سے بھرتا ہے۔ وہ ہر سرکش کے لیے جبار و قہار، ہر ٹوٹے ہوئے دل کا جوڑنے والا، ہر بیمار کا شافی، ہر مشکل کو آسان کرنے والا اور ہر دشوار کام کو آسان بنانے والا ہے۔

میں بھی مظلوم و دل شکستہ مضطر و مسکین و ذلیل و فتاح ہو کر اسی خدائے برتر کو پکارتا ہوں اور اس کے حبیب پاک ﷺ کو وسیلہ بنا کر اس کی رحمت کا امیدوار ہو کر اس کی بارگاہ میں بعد تضرع التجا کرتا ہوں۔ وہی مجھے تکلیف سے نجات دے گا اور وہی قلق و اضطراب سے آزاد کرے گا۔ وہی امراض سے شفا بخشے گا اور وہی ظالم سے چھڑائے گا۔ اے احکم الحاکمین انتہی ظالموں سے مظلوموں کا انتقام لینے والا ہے۔

خانوادۂ علم وحکمت کا مہ کامل

مصنف: علامہ مشتاق احمد نظامی

خطیب مشرق علامہ مشتاق احمد نظامی علیہ الرحمۃ قادر الکلام والبیان شخصیت کے مالک تھے۔ آپ کی خدمات کو دیکھتے ہوئے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ نے بڑی کامیاب اور مصروف زندگی بسر کی۔ میدانِ خطابت کی شہسواری کے ساتھ ساتھ تصنیف وتالیف کے میدان میں بھی موصوف نے خوب خدمات انجام دیں۔ معروف کتاب "خون کے آنسو" نے آپ کو شہرت کی بام عروج پر پہنچا دیا۔ علامہ نظامی جدھر کا رخ کرتے حقانیت اسلام کا علم گاڑ دیتے۔ بد مذاہب کو کئی مناظروں میں شکست فاش دی اور ان کے متعدد زور مناظرین کو پچھاڑا۔ آپ دار العلوم غریب نواز سنی تبلیغی جماعت اور ماہنامہ پاسبان کے بانی مبانی تھے۔ 1990ء میں آپ اس جہانِ فانی سے کوچ فرما گئے۔

چمن میں پھول کا کھلنا تو کوئی بات نہیں
زہے وہ پھول جو گلشن بنائے صحرا کو

منطق وفلسفہ کے امام مجاہد جلیل حضرت علامہ فضل حق خیرآبادی کی شہرت ونامور ی کے جہاں اور علل واسباب ہیں ان میں سب سے زیادہ اہمیت فلسفہ کے امام ہونے کی حیثیت سے ہے۔ اس لیے علامہ کے حالات زندگی پر قلم اٹھانے سے پہلے مناسب ہے کہ فن منطق وفلسفہ پر تھوڑی سی گفتگو کر لی جائے۔

علم منطق کا باضابطہ اظہار سب سے پہلے حضرت ادریس علیہ السلام سے ہوا۔ مخالفین توحید ورسالت کو عاجز وساکت کرنے کے لیے انہوں نے اسے بطور معجزہ استعمال کیا۔ پھر ان علوم کو یونانیوں نے اپنایا چنانچہ یونان میں بڑے رتبے کے درج ذیل یہ پانچ فلسفی گزرے ہیں۔

❶ بذقیس: 500 قبل مسیح زمانہ داؤد علیہ السلام میں گزرا۔ حضرت لقمان سے علم وحکمت حاصل کرنے کے بعد یونان واپس آ گیا۔

❷ ایغاخورس: یہ اصحاب سلیمان علیہ السلام کا شاگرد تھا۔

❸ سقراط: یہ فیثا غورس کا شاگرد تھا۔ بتوں کی پرستش سے تخلوق کو روکنے اور دلائل کے ساتھ خالق باری کی طرف توجہ دلانے پر بادشاہ وقت نے قید کرا کے زہر دلایا۔

❹ افلاطون: یہ بھی فیثا غورس کا شاگرد تھا اور خاندان اہل علم سے تھا۔ سقراط کی موجودگی میں قریب قریب گمنام سا رہا اور اس کے بعد اس نے اپنا نام پیدا کیا۔

❺ ارسطاطالیس: دیقوماخوش کا بیٹا تھا اور صاحب المنطق کے لقب سے مشہور ہوا۔

بعد کے سارے فلاسفر ارسطاطالیس ہی کے رہین منت اور خوشہ چیں ہیں۔ ان پانچ کے بعد دوسرے درجے پر "نالیس المطلی" صاحب فیثا غورس "ذی مراطیس" اور "اقلیدس" ہیں۔ ارسطو کی کتابوں کے شارح ہونے کی حیثیت سے حسب ذیل فلسفی مشہور ہیں۔

❶ تاؤ فرسطس ❷ اصطفن ❸ لیس یخی بطریق اسکندریہ ❹ امونیوس ❺ سلیقوس ❻ شاؤن ❼ فرفوریوس ❽ یامطیس ❾ افرودیسی۔

یونان میں بعض دوسرے فنون کے بھی بڑے بڑے کاملین گزرے ہیں مثلاً بقراط، جالینوس علم طبیعیات وطب میں؛ اقلیدس علم ہندسہ میں؛ ارشمیدس علم الاذائر میں؛ بطلیموس اور یوحانی کلبی علم المناظر والنجوم میں آپ ہی اپنی نظیر تھے۔

مسلمان بادشاہوں میں سب سے پہلے عباسیہ خاندان کے خلیفہ ثانی ابو جعفر منصور نے علم فقہ کے ساتھ فلسفہ، منطق اور ہیئت کو بھی حاصل کیا۔ اس کے کاتب عبداللہ ابن المقفع الخطیب الفارسی مترجم "کلیلہ دمنہ" نے ارسطو کی حسب ذیل تین کتابیں عربی میں ترجمہ کر کے منطقی کے لقب سے شہرت حاصل کی۔ (۱) قاطیغوریاس (۲) ارمنیاس (۳) انولوطیقا۔

خاندان عباسی کا ساتواں تاجور خلیفہ مامون الرشید 198ھ میں جب تخت خلافت پر بیٹھا تو اپنے ذوق کی بنا پر ان فنون کی طرف متوجہ ہوا۔ چنانچہ مامون کے لکھنے پر قیصر روم نے ارسطو کی کتابوں کا ذخیرہ بھیج دیا (وزیر جمال الدین قفطی نے اخبار الحکماء میں اس کی تفصیل درج کی ہے)۔

پھر چوتھی صدی میں شاہ منصور ابن نوح سامانی کی درخواست پر حکیم ابو نصر فارابی نے ان کو مرصع ومہذب کر کے معلم ثانی کا لقب حاصل کیا۔ سلطان مسعود نے شیخ الرئیس ابو علی ابن سینا التوفی 427ھ/1037ء کو اپنا وزیر بنا کر تصانیف فارابی سے اقتباس کرا کے کتابیں لکھوائیں۔ سوء اتفاق کہ اس جان کاہی و سر مغزی کے بعد کتب خانہ ہی نذر آتش ہو گیا تو ابن سینا کا حافظہ ہی بن گئے چنانچہ جو کچھ ہے اسی کی محنت کا ثمرہ ہے۔

اس کے بعد ابو محمد ابن احمد اندلسی اور محمد زکریا رازی صاحب تصانیف کثیرہ التوفی 320ھ/932ء نے بھی چوتھی

صدی ہجری میں اس پودے کو پروان چڑھانے میں کسر اٹھا نہ رکھی۔

پانچویں صدی ہجری اور اس کے بعد امام ابو حامد محمد ابن غزالی الطوسی 505ھ علامہ ابن ارشد الطوسی 1198ء امام فخر الدین ابن تیمیہ الحرانی 768ھ/1337ء نجم الدین نجفی انی ابن سہلان اور الفضل الدین خونجی وغیرہم نے ان فنون میں نئی نئی باریکیاں پیدا کیں۔ ابن خلدون نے ان تمام حضرات کا تذکرہ بڑے عمدہ پیرایہ میں کیا ہے۔

اس کے بعد نصیر الدین محقق طوسی' قطب الدین رازی' صدر الدین شیرازی' ملا جلال محقق دوانی' ملا محمود جون پوری صاحب شمس بازغہ و فرائد وغیرہم نے اس فن کو چار چاند لگائے۔ یہاں تک کہ سلاطین مغلیہ کے عہد میں عرب وعجم کے اہل فضل وکمال کا ایک جم غفیر تھا۔ حضرت امیر خسرو نے یکے بعد دیگرے 7 بادشاہوں سے اعزاز حاصل کیا مختلف انقلابات دیکھے مگر ہندوستان سے منہ نہ موڑا۔

شعراء میں نظیری' نیشاپوری' ملک قمی' عرفی' شیرازی' ظہوری' غزالی' مشہدی' عالی شیرازی' کلیم ہمدانی' غنی کشمیری کتاب میں "شیریں قلم"' "زریں قلم"' "ہفت قلم"۔ علماء میں شیخ حسین وسعی' مولانا فتح اللہ شیرازی الطوسی 997ھ' مولانا مرزا سمرقندی' میر اسلم ہردی الطوسی 1061ھ' میر زاہد ہردی الطوسی 1111ھ' مولانا میر کلاں معلم جہانگیر الطوسی 983ھ' مولانا صدر جہاں' مولانا غازی خاں بدخشی وغیرہم جیسی علمی شخصیات سے ہندوستان جنت نشان بن گیا تھا۔ غرضیکہ ہر طرف علوم ظاہری اور باطنی کے چشمے ابل رہے تھے۔

مسلمان بادشاہوں کی قدردانی وعلم دوستی کے صرف دو واقعے بطور شہادت پیش کیے جاتے ہیں جس سے اندازہ ہو گا کہ وہ علوم وفنون جو آج صرف المارس کی زینت ہیں یا جن کی درس وتدریس کا سلسلہ مسجد یا خانقاہ کی بوسیدہ چٹائیوں پر جاری ہے کسی وقت سلاطین کے دربار میں ان کی کیا قدر ومنزلت تھی۔

❶ سلطان محمد ابن تغلق شاہ نے مولانا معین الدین عمرانی دہلوی کو قاضی عضد الدین صاحب مواقف کی خدمت میں شیراز بھیج کر درخواست کی کہ ہر قیمت پر ہندوستان تشریف لا کر متن مواقف کو میرے نام معنون کر دیجیے۔

سلطان ابو اسحاق والی شیراز کو پتہ چلا تو دوڑا ہوا علامہ قاضی عضد الدین کی خدمت میں پہنچ کر عرض پرداز ہوا کہ ہر خدمت کے لیے حاضر ہوں۔ تخت سلطنت کی خواہش ہو تو دست بردار ہونے کو تیار ہوں مگر خدا کے لیے شیراز کو یتیم نہ بنائیے۔ قاضی صاحب نے سلطان کی قدردانی سے متاثر ہو کر ارادہ بدل دیا اور سلطان ہی کے نام پر کتاب معنون کر کے ہمیشہ کے لیے زندہ جاوید بنا دیا۔

❷ دوسرا واقعہ علامہ امیر فتح اللہ شیرازی سے متعلق ہے۔ عادل شاہ بیجاپوری نے ہزاروں خواہشوں کے ساتھ دکن بلا کر اپنا وکیل مطلق بنا دیا اور 981ھ میں اکبر بادشاہ نے صدر کل بنا کر 993ھ میں امیر الملک اور عضد الدولہ کے خطاب سے نوازا۔

ہندوستان کے مشاہیر علماء ان کے حلقہ درس میں شریک رہے اور انہیں کے زمانے سے علوم عقلیہ کو شاندار فروغ حاصل ہوا۔ 997ھ میں ان کے انتقال پر اکبر بادشاہ نے بڑا غم کیا (جس کی تفصیل مآثر الکرام میں موجود ہے) البتہ فیضی کا ایک شعر سن لیجیے

شہنشاہ جہاں راور و فاش سید پرغم شد

سکندر اشک حسرت ریخت کا فلاطوں زعالم شد

یہی وہ قدردانی وعزت افزائی تھی جس کے باعث علامہ فضل حق کے مورثان اعلیٰ شمس الدین اور بہاؤ الدین دونوں بھائیوں نے بھی ہندوستان کو رونق بخشی۔

ولادت اور نسب:

علامہ فضل حق خیرآبادی 1212ھ مطابق 1797ء میں اپنے آبائی وطن خیر البلاد خیرآباد میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد ماجد مولانا فضل امام خیرآبادی علماء عصر میں ممتاز اور علوم عقلیہ کے اعلیٰ درجہ پر سرفراز تھے۔ حضرت علامہ کے دادا حضرت مولانا ارشد ہرگام پور سے خیرآباد تشریف لاکر سکونت پذیر ہوئے تھے۔

شجرۂ نسب:

(۱) مولانا فضل حق (۲) ابن مولانا فضل امام (۳) ابن مولانا شیخ محمد ارشد (۴) ابن حافظ محمد صالح (۵) ابن ملا عبد الواحد (۶) ابن عبد الماجد (۷) ابن قاضی صدر الدین (۸) ابن قاضی اسماعیل ہرگانوی (۹) ابن قاضی بدایونی (۱۰) ابن شیخ ارزانی (۱۱) ابن شیخ منور (۱۲) ابن شیخ نظیر الملک (۱۳) ابن شیخ سالار شام (۱۴) ابن شیخ وجیہ الملک (۱۵) ابن شیخ بہاؤ الدین (۱۶) ابن شیر الملک شاہ ایرانی (۱۷) ابن شاہ عطاء الملک (۱۸) ابن ملک بادشاہ (۱۹) ابن حاکم (۲۰) ابن عادل (۲۱) ابن تائرون (۲۲) ابن جرجیس (۲۳) ابن احمد نامدار (۲۴) ابن محمد شہریار (۲۵) ابن محمد عثمان (۲۶) ابن دان (۲۷) ابن ہمایوں (۲۸) ابن قریش (۲۹) ابن سلیمان (۳۰) ابن عفان (۳۱) ابن عبد اللہ (۳۲) ابن محمد (۳۳) ابن عبد اللہ ابن امیر المومنین خلیفۃ المسلمین حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔ اس طرح ۳۳ واسطوں سے خلیفہ ثانی تک آپ کا نسب گرامی پہنچتا ہے۔

علامہ کے مورث اعلیٰ شیر الملک ابن شاہ عطاء الملک ایرانی کے مورخان ایک قلعہ ملک ایران پر قابض و حکمران تھے۔ شیر الملک کے دو صاحبزادے بہاؤ الدین اور شمس الدین ذی علم بزرگ تھے۔ یہ دونوں بھائی ایران سے ہندوستان وارد ہوئے۔

مولانا شمس الدین نے منصہ اتحاد پر جنگ سنبھالی۔ حضرت شاہ ولی اللہ ابن شاہ عبدالرحیم محدث دہلوی انہیں کی اولاد سے تھے اور مولانا بہاؤ الدین قبۃ الاسلام بدایوں کے مفتی ہوئے۔ ان کی اولاد میں شیخ ارزانی بدایونی نامور بزرگ اور اعلیٰ درجہ کے مفتی ہوئے۔

شیخ عماد الدین ابن شیخ ارزانی تحصیل علم کی خاطر قاضی ہرگام (ضلع سیتا پور اودھ) کی خدمت بابرکت میں پہنچے تو قاضی صاحب نے تحقیق و شرافت و نجابت کے بعد اپنا داماد بنا لیا۔ ان سے شیخ اسماعیل پیدا ہوئے جن کی شادی سعدی کاکوروی کی دختر سے ہوئی۔ ان سے قاضی صدر الدین پیدا ہوئے۔ قاضی صاحب کے دو صاحبزادے ہوئے ایک صاحبزادے مولانا عبدالوحد جو اورنگ زیب عالمگیر رحمۃ اللہ علیہ کے اتالیق رہے اور فتاویٰ عالمگیریہ کے مولفین سے ہیں۔ اس کے علاوہ انہوں نے ہدایہ مطول اور ملا جلال پر حاشیے لکھے۔ ان کی شخصیت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ملا قطب الدین شہید سہالوی (والد استاد اکمل مولانا نظام الدین سہالوی فرنگی محل) ان سے ملاقات کے لیے ہرگام پہنچے تھے اور ملا محب اللہ بہاری صاحب مسلم آپ کے درس میں شریک ہونا چاہتے تھے۔ آپ کے پاس وقت نہ تھا اس لیے سہالی جا کر ملا قطب الدین شہید کے شاگرد ہوئے۔

دوسرے صاحبزادے مولانا عبدالماجد ابن مولانا عبدالواحد فاضل جلیل تھے کافیہ کی ہمسود شرح اور حاشیہ اقلیدس لکھا اور تعلیقات متفرقہ بہاریہ پر لکھیں۔ بہادر شاہ اول کے زمانے میں آنکھ کی بیماری سے تمام کتب خانہ جل گیا۔ ہر گام میں وفات پائی اور وہیں مدفون ہوئے۔

علامہ فضل حق کے دادا شیخ محمد ارشد نے ہرگام کو خیر آباد کہہ کر خیر آباد کو آباد کیا۔ موصوف کی دوسری بیوی سے علامہ کے والد ماجد مولانا فضل امام خیر آبادی تھے۔

مختصر حالات مولانا فضل امام خیر آبادی:

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

علامہ فضل حق کی تاریخ تشنہ تکمیل رہ جائے گی اگر علامہ کے والد محترم مولانا فضل امام خیر آبادی کے حالات

زندگی نہ پیش کیے گئے اس لیے ضمناً مولانا کے مختصر حالات درج کیے جاتے ہیں۔

مولانا فضل امام بڑے طباع اور ذہین تھے۔ مولانا سید عبدالماجد کرمانی خیرآبادی کے ارشد تلامذہ سے تھے۔ علوم عقلیہ ونقلیہ انہیں سے حاصل کیا۔ میر زاہد رسالہ اور میر زاہد ملا جلال پر حواشی لکھے۔ اس کے علاوہ اور بھی بیسیوں مفید اور معرکۃ الآراء کتابیں لکھی ہیں جن کا نام معلوم ہو سکا وہ درج کی جاتی ہیں۔

منطق میں مشہور تصنیف "مرقات" ہے جو تمام مدارس عربیہ میں داخل نصاب ہے۔ حاشیہ الف المین بتخلیص الشفا نخبۃ السرار اور آمد نامہ تصنیف کیا۔ ان میں سے بعض کتابیں غیر مطبوعہ ہیں۔ بعض مسلم یونیورسٹی علی گڑھ اور لاہور پور اور بعض عبید اللہ خان رئیس ٹونک کے کتب خانہ میں موجود ہیں۔ علمی قابلیت کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ ایک جانب شاہ عبدالعزیز صاحب اور شاہ عبدالقادر صاحب کا آٹھ معقولات میں نغ رہا تھا اور دوسری طرف اسی دلی میں مولانا فضل امام خیرآبادی کے معقولات کا سکہ چل رہا تھا۔ ہندو بیرون ہند کے طلباء دونوں دریاؤں سے سیراب ہو رہے تھے۔ سرسید احمد خاں بانی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ نے آثار الصنادید میں مولانا فضل امام کا تذکرہ جس عقیدت مندی سے کیا ہے وہ دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ ابتدا ان صفات والقاب سے کی ہے۔

"اکمل الافراد نوع انسنی مہبط انوار فیوض قدسی سراب سرچشمہ عین الیقین موسس اساس ملت ودین ماحی آثار جہل بادم بنائے انصاف کمی مراسم علم بانی مبانی انصاف قدوۃ علماء نحول حاوی معقول ومنقول سند اکابر روزگار مرجع اعالی ودانی ہر دیار مزاحم ان شخص کمال جامع صفات جلال وجمال مصور فیض ازل وابد مطرح انظار سعادت سرمد مصداق مفہوم تمام اجزاء فاضلہ سلسلہ حکمت اشراقی ومشائی مزید کرام اسوۂ عظام مقتدر انام مولانا وسندنا مولوی فضل امام ادخلہ اللہ المقام فی جنۃ النعیم بلطفہ العمیم"۔

مجھے حیرت ہے علماء دیوبند پر جو "شاہ ولی اللہ صاحب" کے حالات زندگی پر قلم اٹھاتے ہیں لیکن اپنے ان محسنین کو نہ صرف نظر انداز فرما دیتے ہیں کہ بعض اوقات انہیں مطعون ومتہم بھی قرار دیتے ہیں۔ کاش اعلماء دیوبند حقیقت پسندی سے کام لیتے اور ٹھنڈے دل سے سوچتے کہ وہ جن کی کتابیں آج بھی دارالعلوم دیوبند میں داخل نصاب ہیں ان کے ساتھ ان کا کیا برتاؤ ہے؟ کیا مولانا فضل امام وعلامہ فضل حق اسی سب وشتم کے مستحق ہیں جس گھناؤنے انداز میں علماء دیوبند انہیں یاد کرتے ہیں؟۔

نہ جانے اس عصبیت وتنگ نظری کا جس نے اپنے دیرینہ کی بھی تمیز باقی نہ رکھی۔ سچ تو یہ ہے کہ علماء دیوبند گالی دینے میں اپنی فطرت وعادت سے مجبور ہیں جب کہ علماء دیوبند رسول خدا ﷺ کو گالی دینے میں نہیں چوکتے تو

زندہ ہو جاتے ہیں جو مرتے ہیں تیری راہ میں [illegible]

مولانا فضل امام و علامہ فضل حق کس شمار و قطار میں ہیں؟

یہی ہیں وہ علماء دیوبند جنہوں نے اپنی کتابوں میں محبوب پروردگار رسول کائنات ﷺ کو ہمارے زیادہ ذلیل اور ذرہ ناچیز سے کمتر لکھا ہے ﴿العیاذ باللہ من ذالک﴾

چنانچہ مولوی محمد میاں دیوبندی مراد آبادی مولف علماء ہند کا شاندار ماضی نے مولوی اسماعیل دہلوی کا تذکرہ کرتے ہوئے علامہ فضل حق خیرآبادی کے دامن علم و ادب پر کیچڑ اچھالنے کی سعی ناکام کی ہے۔ ہاں اگر "علماء ہند کا شاندار ماضی" کے بجائے "اکابر دیوبند علماء ہند کا شاندار ماضی" اس کتاب کا نام ہوتا تو اس نام کے پردے میں مؤلف کو بہت کچھ کہنے کا اختیار تھا لیکن جب کتاب کا سرورق علماء ہند کے جلی قلم سے آراستہ ہو تو مولف کا کس قدر اجل ہے کہ دوسرے علماء دیوبند کو نہ صرف ناقابل اعتنا ہی تصور کیا بلکہ شیرہ آفاق و نامور علماء اہل سنت کو مطعون قرار دیا۔

حضرت مولانا فضل امام علوم مکاشفہ کی ساتھ ساتھ روحانیت میں بھی بلند مرتبہ رکھتے تھے۔ آپ کے والد شیخ محمد ارشد مولانا احمد امین حاجی صفت اللہ محدث خیرآبادی سے بیعت تھے۔ آپ کے ایک معاصر لڑکے عالم جوانی میں فقہ کر گئے باقی ماندہ فقہ نور عمری احکام شرعیہ کے پابند نہ تھے اس لیے مولانا ارشد صاحب کو تشویش رہتی تھی۔ ایک بار عالم اضطراب دبے چینی میں پیر و مرشد کی خدمت میں حاضر ہوئے اور شیخ طریقت سے دعا کی درخواست کی اور مرشد کامل نے دعا فرمائی۔ چنانچہ شب میں سرکار دو عالم ﷺ کی زیارت نصیب ہوئی کہ سرکار کائنات ﷺ کے باغ میں تشریف لائے اور پھل کے درخت کے نیچے جلوہ فرما ہیں بعد ازاں فرمایا دونوں ایک دوسرے کو مبارک باد دینے روانہ ہوئے۔ راستے میں دونوں کی ملاقات ہوئی تو ایک دوسرے کو بشارت کا حال بتایا اور وہیں سے دونوں کے باغ میں پہنچے تو دیکھا کہ مقام معہود پر دھوکا اثر یعنی پانی کی نمی موجود تھی۔ ایک عرصے تک لوگ اس جگہ کی زیارت کرتے رہے۔

چنانچہ شیخ الاسلام حضرت مولانا قاضی علی خاں صاحب بریلوی رحمۃ اللہ علیہ مفتی و ملت تاجدار اہل سنت سیدی امام احمد رضا بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کو 1309ھ میں ساتھ لے کر بریلی شریف سے خیرآباد اس مقام کی زیارت کے لیے حاضر ہوئے اور مولانا حسن نقش کے یہاں مہمان ہوئے تھے۔ افسوس ناب وہ مکان باقی رہا اور نہ ہی اس جگہ کا پتہ چل سکتا ہے۔

حضرت فضل امام خیرآبادی نے 5 ذیقعدہ 1240ھ مطابق 1824ء کو داعی اجل کو لبیک کہا۔ ﴿انا للہ وانا الیہ راجعون﴾ مرزا غالب نے حسب ذیل تاریخ وفات لکھی:

اے دریغا قدوۂ ارباب فضل — کرد سوئے جنت الماوی خرام
چوں ارادت از پے کسب شرف — ہست ساں قوت آں عالی مقام
چہرۂ ہستی فراشیدم نخست — تا بنائے تخرجہ کردہ تمام
گفتم اندر سایہ لطف نبی
باد آرامش گہ فضل امام

۱۲۳۶ھ

علامہ فضل حق کی تعلیم و تربیت:

مولانا فضل حق نے آنکھ کھولی تو گردو پیش علم و فضل اور عمارت و ریاست کو جلوہ گر دیکھا۔ یہی وجہ تھی کہ علامہ 1857ء کے ہنگامے کے بعد مادی ریاست سے محروم ہو کر بھی مستغنی اور کروفر سے رہے۔ ہندوستان کے مشہور مردم خیز قصبات میں خیرآباد کا نام بھی صدیوں سے رہا ہے یہ شاہی زمانہ کا کشمری کا پایہ تخت بھی رہ چکا ہے۔ بڑے بڑے علماء و مشائخ کے مزارات آج بھی زیارت گاہ خلائق ہیں۔ جس وقت علامہ فضل حق خیرآباد سے دہلی پہنچے تو ایک سے بڑھ کر ایک باکمال نظر منصہ شہود پر "فتحنا" فلاسفۂ اولیاء شعراء نظر آئے۔ جس طبقے پر نظر ڈالتے تو سب ہی موجود تھے آپ کے والد ماجد مولانا فضل امام مہمان کے علاوہ ہاتھی اور پالکی پر بھی دربار آتے جاتے ساتھ ساتھ دروس دیتے تھے اور صفر سنی ہی میں آپ کو معقولات میں اپنا جیسا یگانہ روزگار بنا لیا تھا اور معقولات کی تحصیل کے لیے شاہ عبدالقادر محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ اور شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی درس گاہ میں پہنچا دیا۔

ذکاوت و ذہانت:

حضرت علامہ نے 1225ھ / 1809ء میں سات سال کی عمر میں قواعد صرف علوم عقلیہ و نقلیہ کی تکمیل کی اور 4 ماہ 4 روز میں قرآن شریف حفظ کیا۔

حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی نے جب رشید میں تحفہ اثنا عشریہ تحریر فرمائی تو ہندوستان ہند کی طرح ایران میں بھی ہیجان پیدا ہوا۔ ایران سے میر باقر داماد صاحب افق المبین کے خاندان کا مجتہد فریقین کی کتابیں لے کر شاہ صاحب سے مناظرہ کے لیے دہلی پہنچا۔ خانقاہ میں داخل ہوتے ہی شاہ صاحب نے فرافض میزبانی ادا فرماتے ہوئے قیام کے لیے مناسب جگہ تجویز فرمادی۔ شام کو مولانا فضل حق حاضر ہوئے تو شاہ صاحب کو معروف مہمان نوازی دیکھ کر کیفیت معلوم کی اور بعد نماز مغرب مجتہد صاحب کی خدمت میں پہنچے۔ مجتہد صاحب نے پوچھا میاں

صاحبزادے کیا پڑھتے ہو؟ عرض کیا اشارات، شفاء اور الفی المین وغیرہ دیکھتا ہوں۔ مجتہد صاحب کو بڑی حیرت ہوئی اور "الفی المین" کی کسی عبارت کا مطلب پوچھ لیا تو علامہ فضل حق نے ایسی مدلل تقریر کی کہ متعدد اعتراضات صاحب الفی المین پر کر گئے۔ معزز مہمان نے اعتراضات کے جواب دہی کی کوشش کی تو ان کو جان چھڑانا اور بھی دو بھر ہو گئی۔ جب خوب عاجز کر لیا تو اپنے شبہات کے ایسے انداز میں جوابات دیے کہ تمام ہمراہی علماء بھی انگشت بدنداں ہو گئے۔ آخر میں یہ اظہار کر دیا کہ میں شاہ صاحب کا ادنیٰ شاگرد ہوں اور اظہار معذرت کے بعد رخصت ہو گئے۔ علماء ایران نے اندازہ کر لیا کہ جب خانقاہ کے بچوں کے علم و فضل کا یہ عالم ہے تو شیخ خانقاہ کا کیا حال ہوگا۔ چنانچہ صبح کو جب خیریت طلبی مہمان کے لیے شاہ صاحب نے آدمی بھیجا تو پتہ چلا کہ مجتہد صاحب آخری شب میں ہی دہلی سے روانہ ہو چکے ہیں۔

ایک لطیفہ:

دہلی کے کسی پل پر کسی وجہ سے آمد و رفت ممنوع قرار دے دی گئی تھی۔ علامہ کے پاس کچھ لوگ آئے اور ایک عبارت لے جانے کی بصد منت و سماجت اجازت چاہی۔ علامہ نے ایک دستخطی پرچے پر لکھ دیا "روکو مت جانے دو" محافظین نے پرچہ دیکھ کر عبارت کو نکل جانے دیا۔ حکومت کی طرف سے جواب طلب کیا گیا۔ علامہ نے اپنی زیرکی و دانائی سے فرمایا "میں نے تو لکھا تھا روکو مت جانے دو" اس سے غریبوں کا بھی کام نکل گیا اور اپنے اوپر الزام بھی نہ آنے دیا۔

سخن فہمی:

عام علماء کی طرح علامہ شعر و سخن کے فن سے بے خبر نہ تھے۔ شعر گوئی کی مانند سخن فہمی میں بھی کمال حاصل تھا۔ وطن مالوف خیرآباد جہاں علماء و صلحاء کا مجمع و مسکن چلا آرہا تھا وہیں لکھنؤ کے قرب اور اپنی مردم خیز زمین کی وجہ سے معدن شعراء بھی بنا ہوا تھا۔ علامہ کے دور میں حاجی تراب علی نامی منشی قدرت حسین قدرت، مولوی مظفر حسین شوق، منشی محمد جعفر زمیری، منشی بہاری لال خاور، منشی موہن لال گرامی، مولوی الٰہی بخش نازش، مولوی فضل عظیم و غیرہم گلستان شاعری کے مختلف رنگ و بو رکھنے والے شگفتہ پھول تھے اور خیرآباد کی یہی وہ علمی و ادبی فضا تھی جس نے آخری دور میں بھی ریاض، مظفر، وسیم، کوثر، کلیم، نیر اور اختر جیسے صاحب دیوان و باکمال شعراء پیدا کیے جنہوں نے لکھنوی اسکول کی شان کو چار چاند لگائے۔

علامہ ریذیڈنٹ کے محکمے کے سررشتہ دار ہو چکے تھے اور ولی عہد سے دوستانہ مراسم تھے۔ قلعہ میں آمد و رفت رہتی تھی۔ بڑے بڑے کہنہ شاعر مولوی امام بخش صہبائی، علامہ عبداللہ خاں علوی، حکیم مومن خاں مومن، مفتی صدر الدین خاں آزردہ، مرزا اسد اللہ خاں غالب، نواب ضیاء الدین خاں نیر، شاہ نصیر الدین خان نصیر، شیخ محمد ابراہیم ذوق،

حکیم آغا خاں عیش، حافظ عبدالرحمان خاں احسان، امیر حسن نسکین اور نہ جانے کتنے سخنوران باکمال کا شمسلہ تھا۔ جب یہ لوگ ایک جگہ جمع ہوتے ہوں گے تو آسمان کو بھی زمین پر رشک آتا ہوگا۔

یہی وجہ تھی کہ مرزا غالب سے علامہ کے پرخلوص اور گہرے تعلقات تھے۔ علامہ نے مرزا کی اکثر غزلوں کو سنا اور دیوان کو دیکھا تو مرزا صاحب کو سمجھایا کہ یہ اشعار عام لوگوں کی سمجھ میں نہیں آئیں گے چنانچہ حالی نے آب حیات صفحہ: 152 پر تذکرہ کیا ہے کہ مولانا فضل حق کی تحریک سے مرزا نے اپنے اردو کلام میں سے جو اس وقت موجود تھا دو ثلث کے قریب نکال ڈالا اور اس کے بعد اس روش پر چلنا بالکل چھوڑ دیا۔ مرزا غالب نے اسی سے متاثر ہو کر یہ رباعی کہی تھی۔

مشکل ہے زبس کلام مرا اے دل
سن سن کے اے سخنوران کامل
آسان کرنے کی کرتے ہیں فرمائش
گویم مشکل و گر نگویم مشکل

بقول مولانا حالی علامہ کی سخن فہمی کا اندازہ اس واقعہ سے لگایا جاسکتا ہے کہ مرزا کے ایک فارسی قصیدہ کی تشبیب کا شعر ہے

ہمچناں در عجق غیب ثبوتے دارند
بوجودے کہ ندارند خارج اعیاں

مذکورہ بالا شعر سے متعلق مرزا غالب نے مولانا حالی سے تذکرہ کیا کہ میں نے ثبوتے کی جگہ "نمودے" لکھا تھا۔ مولوی فضل حق کو جب یہ شعر سنایا تو انہوں نے کہا کہ اعیان ثابتہ کے لیے نمود کا لفظ نامناسب ہے اس کی جگہ ثبوت بنادو۔ چنانچہ طبع ثانی میں بجائے نمودے کے ثبوتے بنادیا ہے۔ (یادگار غالب "صفحہ: ۷۹) اہل علم جانتے ہیں کہ اس اصلاح نے فلسفیانہ اصلاح کے مطابق شعر کو کہاں سے کہاں پہنچادیا۔

مسئلہ امکان واختناع نظیر میں علامہ کا موقف:

یہی وہ علل واسباب ہیں جنہوں نے مرزا غالب کو مسئلہ امکان نظیر اور اختناع نظیر پر قلم اٹھانے کے لیے مجبور کیا۔ مولوی اسماعیل دہلوی اور علامہ فضل حق خیرآبادی کے مابین جہاں رفع یدین' آمین بالجہر جیسے مسائل پر اختلاف تھا وہیں سب سے اہم مسئلہ امکان نظیر واختناع نظیر کا تھا۔

اس مسئلہ میں مولوی اسماعیل کی رائے یہ تھی کہ خاتم النبیین کا مثل ممکن بالذات اور ممتنع بالغیر ہے اور حضرت علامہ ممتنع بالذات مانتے تھے۔ اس مسئلہ پر علامہ کی مستقل کتاب مناظرانہ انداز پر امتناع نظیر کے نام سے 1908ء میں موصوف کے تلمیذ الشیخ حضرت مولانا سید سلیمان اشرف بہاری رحمۃ اللہ علیہ سابق صدر دینیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے زیر اہتمام شائع ہو چکی ہے اور حضرت علامہ کے ہاتھ کا لکھا ہوا اصلی مسودہ کتب خانہ حبیب گنج میں موجود ہے۔ اس کتاب میں رسول اللہ ﷺ کی نظیر کے ممتنع بالذات ہونے پر جو دلائل و براہین قائم کیے ہیں انھیں دیکھ کر بے ساختہ مرحبا و احسنت زبان پر آتا ہے۔ حضرت علامہ نے علمی و فنی حیثیت سے وہ کارنامے کی ہیں کہ صفحات کتاب تحقیق چمنستان بن گئے ہیں۔

مسئلہ امتناع نظیر پر غالب کی ترجمانی:

یہ تو پہلے گزر رہی چکا ہے کہ مرزا اسد اللہ خاں غالب سے علامہ کے بڑے گہرے تعلقات تھے۔ علامہ کا رجحان طبع دیکھ کر اسی موضوع پر ایک مثنوی لکھ ڈالی جو کلیات غالب میں مثنویات کے سلسلے میں پہلی مثنوی ہے۔ غالب کے انداز بیان کا یہ کچھ کم کمال نہیں کہ ایسے مشکل مسئلہ کو اسی روانی اور خوبی سے سمجھا دیا۔

چنانچہ غالب لکھتے ہیں:

یک جہاں تا ہست یک خاتم بس ست — قدرت حق را نہ یک عالم بس ست
خواہ از ہر ذرہ آرد عالمے — ہر کجا ہنگامہ عالم بود
ہر عالمے را خاتمے — رحمۃ للعالمینے ہم بود
کثرت ایجاد عالم خوب تر — یا یک عالم دو خاتم خوب تر
دو یکے عالم دو ما خاتم بجوئے — صد ہزاراں عالم و خاتم بجوئے
غالب ایں اندیشہ چندیں ہی — فروہم برخویش می گیرم ہی
اے کہ ختم المرسلینش خواندہ — دانم از روئے یقینش خواندہ
ایں الف لامے کہ استغراق راست — نطق را با معنی اطلاق راست
خطاء ایجاد ہر عالم یکے است — گر دو صد عالم بود خاتم یکے است
منفرد اندر کمال ذاتی است — لاجرم "مستفتی" حال ذاتی است
زیں عقیدت برگمر دم والسلام — نامہ را دوری نوردم والسلام

غالب نے ان اشعار میں ابتدائی بانچ شعروں میں اپنی قابلیت سے ایک حل نکالنے کی کوشش کی جس میں دونوں کی بات رہ جاتی اور وہ یہ کہ خاتم النبیین اللہ تعالیٰ نے اس عالم کے لیے بنایا ہے اس میں محمد رسول اللہ ﷺ کی نظیر پیدا ہونا محال اور ممتنع بالذات ہے لیکن خدا دوسرا عالم بنا کر آدم سے عیسیٰ علیہ السلام تک اس عالم کے لیے پیغمبر پیدا کرے اور آخر میں محمد رسول اللہ ﷺ کو خاتم النبیین بنا سکتا ہے۔ اس طرح امکان نظیر کی صورت نکل سکتی ہے مگر پھر آخری چھ اشعار میں اس خیال کو رد کرتے ہوئے حضرت علامہ کی رائے سے اتفاق کرنا پڑا ہے اور پھر اسی رائے سے اپنی مخالفت ظاہر کرتے ہوئے جس مدلل طریقہ پر اسے ثابت کیا ہے یہ غالب ہی کا حصہ ہے۔

اس مختصری علمی گفتگو کے بعد قارئین نے حضرت علامہ فضل حق کی جلالت علم کا اندازہ کر لیا ہوگا کہ وہ اپنے معاصرین میں کس درجہ ممتاز و بے نظیر تھے۔ سرسید احمد خاں بانی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ نے مولوی کے والد ماجد فضل امام کے متعلق جن تاثرات کا اظہار آثار الصنادید میں کیا ہے وہ مولانا کے حالات میں پیچھے گزر چکا ہے علامہ کے متعلق بھی سرسید احمد خاں کی رائے ملاحظہ کرتے چلیں: "مجمع کمالات صوری و معنوی' جامع فضائل ظاہری و باطنی' علامہ فضل و افضال' یگانہ آفاق چہلستان کمال' مکمن اصابت رائے مسند نشین دیوان افکار رسائے' صاحب خلق مجری' مورد سعادت ازلی و ابدی' حاکم و محاکم مناظرات' فرمانروائے کشور محاکمات' عکس آئینہ صافی ضمیری' خازن الحسنین بدائع و جواہر یکی الہی وقت' ہمہ وجہی اوان' فرد وقت عہد و لیہ دوراں' مسہل باطل و محقق حق' مولانا محمد فضل حق" یہ حضرت خلف الرشید ہیں۔ جناب مستطاب مولانا فضل امام نور اللہ مرقدہ کے اور تحصیل علوم عقلیہ اور نقلیہ کی اپنے والد ماجد کی خدمت بابرکت میں کی ہے۔ زبان قلم نے ان کے کمالات پر نظر کر کے فخر خاندان لکھا اور فکر دقیق نے جب سرکار کو دیکھا تو فخر جہاں پایا۔

جمیع علوم خاصتاً علوم عقلیہ میں یکتائے روزگار ہیں اور منطق و حکمت کی تو گویا گھٹی کی فکر عالی نے بنا ڈالی ہے۔ علماء عصر بل فضلاء دہر کو کیا طاقت ہے کہ اس گروہ اہل کمال کے حضور میں بساط مناظرانہ آراستہ کر سکیں۔ بارہا دیکھا گیا کہ جو لوگ (اپنے) آپ کو یگانہ فن سمجھتے تھے جب ان کی زبان سے ایک حرف سنا دھوائے کمال کو فراموش کر کے نسبت شاگردی کو اپنا فخر سمجھتے۔ بایں ہمہ کمالات علم و ادب میں ایسا علم سرفرازی بلند کیا ہے کہ فصاحت کے واسطے ان کی عبارت شستہ صفر عروج معارج ہے اور بلاغت کے واسطے ان کی طبع رسا دستاویز بلندی معارج ہے۔

سبحان کو ان کی فصاحت سے سرمایہ خوش بیانی اور امراء القیس کو ان کے افکار بلند سے دست گاہ عروج و معانی' الفاظ پاکیزہ' ان کے رشتہ گوہر خوش آب اور معانی رنگین ان کے غیرت لعل ناب سرد' ان کی سطور عبارت کے آگے

پایہ کی اور کل ان کی عبارت رنگین کے سامنے ہیچ"۔

ایک بار مولوی اکرام اللہ شہابی گوپاموی نے شمس العلماء حضرت مولانا عبدالحق خیرآبادی سے پوچھا بھائی صاحب دنیا میں حکیم کا اطلاق کن کن پر ہے؟ مولانا کہنے لگے بھیا! ساڑھے تین حکیم دنیا میں ہیں۔ ایک معلم اول ارسطوؒ دوسرے معلم فارابیؒ تیسرے والد ماجد مولانا فضل حق اور نصف بندہ۔

وقت کے اکابر معاصرین کی شہادتوں کے بعد مرزا حیات دہلوی اور علماء دیوبند وارا کین جمعیت العلماء ہند کی جرأت و جسارت پر حیرت ہوتی ہے جو مولوی اسماعیل دہلوی کے تذکرے کے ساتھ حضرت علامہ کا نام لینا بھی گوارا نہیں کرتے اور غور کیجیے تو حیرت کی کوئی بات نہیں۔ وہ علماء دیوبند جو آقائے دو جہاں ﷺ کے فضائل و مناقب برداشت نہیں کر سکتے اگر وہ فضل حق کے کمالات کے منکر ہو گئے تو حیرت کیوں ہے؟ مردہ قوموں اور بد طینت گروہوں کا خاصا ابھی یہی رہا ہے کہ اسلاف پر کیچڑ اچھالی اور بہتان تراشی شعار بنایا گیا ہے۔ غضب کر دیا دیوبند مکتبہ فکر نے جس نے دعویٰ اسلام کے باوجود پیغمبر اسلام ﷺ تک کو نہ چھوڑا۔ کہیں ذرہ ناچیز سے کمتر اور کہیں چمار سے زیادہ ذلیل کہا۔ علماء دیوبند کی سرکردہ مولوی اسماعیل نے تو اسلام کے لیبل پر نبی رسالت کا خاکہ کھینچا جس میں روز بروز حضرات دیوبند رنگ بھرتے جا رہے ہیں۔ مثلاً علماء دیوبند کا یہ عقیدہ کہ "خدا کا جھوٹ بولنا ممکن ہے یا یہ کہنا کہ علم غیب اللہ ہی کا خاصہ ہے۔ یہ اللہ صاحب ہی کی شان ہے جب چاہیں غیب معلوم کر لیں"۔ معاذ اللہ وہ گویا جاہل ہے اور غیب سے نابلد ہے جب چاہتا ہے معلوم کر لیتا ہے۔ اسی توحید پر آج علماء دیوبند کو غرور ہے۔ ایسے ہی رسول کے بارے میں علماء دیوبند کا یہ کہنا کہ رسول مر کر مٹی میں مل گئے یا یہ کہنا کہ نماز میں گائے، بیل کا خیال لانے سے نماز ہو جائے گی مگر رسول خدا کا خیال لانے سے نماز فاسد ہو جائے گی یا یہ کہنا کہ رسول ایسے ہی ہے جیسے گاؤں کا چودھری وغیرہ وغیرہ۔

ایسے دریدہ دہن و پراگندہ ذہن والے جنہیں تنقیص الوہیت و توہین نبوت میں کوئی اندیشہ نہیں اگر وہ علامہ فضل حق اور امام احمد رضا کو گالیاں دیں تو کیا تعجب ہے؟ وہ تو رسول خدا کو گالیاں دیتے رہے ہیں۔

سب اپنا اپنا ہے جام اپنا اپنا
کیے جاؤ مے خوارو کام اپنا اپنا

WWW.NAFSEISLAM.COM

علامہ فضل حق کے اساتذہ کرام

.....مولانا فضل امام خیرآبادی (ف 1244ھ/1829ء).....

علامہ فضل حق خیرآبادی نے معقولات' منقولات اور علوم عربیہ کی تعلیم اپنے والد ماجد مولانا فضل امام خیرآبادی سے پائی۔ علامہ کی قلمی بیاض میں اوائل جوانی کے عربی میں کچھ خطوط اور قصائد ہیں جو انہوں نے اپنے والد گرامی کو بھجوائے۔ مولانا فضل امام کے توسط سے علامہ کا سلسلہ معقولات محقق دوانی اور میر سید شریف جرجانی سے ہوتا ہوا شیخ الرئیس اور معلم ثانی فارابی سے جاملتا ہے اور فارابی سے معلم اول ارسطاطالیس تک۔ ۱

☆☆☆☆

.....شاہ عبدالقادر دہلوی (1753ء/1813ھ).....

علامہ نے حدیث کی تکمیل شاہ عبدالقادر علیہ الرحمۃ سے کی جو شاہ ولی اللہ دہلوی علیہ الرحمۃ کے بیٹے تھے۔ قرآن مجید کا اردو ترجمہ سب سے پہلے (1205ھ/91-1790ء میں) انہوں نے ہی کیا تھا جو کہ متداول ہوا۔ ۲ شاہ عبدالقادر دہلوی کے توسط سے علامہ کا سلسلہ حدیث امام بخاری تک پہنچتا ہے اور ان سے حضور ﷺ تک۔ ۳

صدیق حسن قنوجی نے لکھا ہے۔ ''شاہ عبدالقادر دہلوی عالم' زاہد' فاضل' عابد' صاحب تقویٰ ووقار اور صدق فراست وحسن بصیرت والے تھے۔ ایک جماعت نے ان سے شرف تلمذ پایا۔ ان میں سب سے نمایاں ابوالعلاء فضل حق خیرآبادی ہیں جو اپنے زمانے کے سب سے ماہر ادیب ہیں۔ ۴

☆☆☆☆

.....شاہ عبدالعزیز دہلوی (1746ھ/1824ء).....

علامہ فضل حق نے شاہ عبدالعزیز دہلوی کے سامنے بھی زانوئے تلمذ تہ کیا ہے۔ علامہ عربی اشعار شاہ صاحب ہی کو دکھاتے تھے۔ ۵ یہ شاہ ولی اللہ کے بڑے بیٹے تھے۔ انہوں نے ''میزان العقائد اور تحفہ اثنا عشریہ'' وغیرہ

WWW.NAFSEISLAM.COM

تالیف کیں۔ ۷

باغی ہندوستان میں ہے کہ "شاہ صاحب نے روشیعہ میں جب تحفہ اثنا عشری محققانہ انداز میں تحریر کی تو شیعان ہند اور ایران میں ہلچل مچ گئی۔ ایران سے میر باقر داماد کے خاندان کا ایک متبحر عالم و مجتہد اپنی ڈھیروں کتابوں کے ساتھ دہلی میں شاہ صاحب کی درسگاہ میں مناظرہ کے لیے حاضر ہو گیا جب علامہ فضل حق بارہ سال کے تھے اور شاہ صاحب کے حلقہ درس میں تھے انہوں نے مہمان کے ساتھ شرح الاشارات، شفا اور افق المبین پر ایسی مدلل گفتگو کی کہ وہ عالم اسی رات، شاہ صاحب سے مناظرہ کیے بغیر دہلی سے واپس ایران کو چ کر گیا"۔ ۸

☆☆☆☆

حافظ محمد علی خیرآبادی

حافظ محمد علی خیرآبادی بھی علامہ کے اساتذہ میں سے ہیں۔ "مناقب حافظیہ" سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا فضل حق "فصوص" کا درس لینے ان کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے۔ ۹

حوالہ جات

۱ سفر اور تلاش، ص: ۳۹

۲ المنجد، ص: ۳۵۱

۳ سفر اور تلاش، ص: ۳۹

۴ ابجد العلوم، ج: ۳، ص: ۳۳۵

۵ تذکرہ نجومیہ، ص: ۱۳۷

۶ المنجد فی الاعلام، ص: ۴۵۰

۷ باغی ہندوستان، ص: ۱۳۵_۱۳۶

۸ علامہ فضل حق خیرآبادی اور جہاد آزادی، ص: ۴۰۰

WWW.NAFSEISLAM.COM

علامہ فضل حق کے تلامذہ عظام

علامہ کا عہد سیاسی اعتبار سے مسلمانان ہند کے زوال اور علمی اعتبار سے کمال کا عہد تھا۔ دلی میں جو کہ دار السلطنت تھا' منقولات کا ولی اللہی مدرسہ اور معقولات کا خیرآبادی مکتب تھا۔ دریا عرب' ایران' بخارا' افغانستان اور دوسرے دور دراز کے علاقوں سے شائقین علم آکر شریک حلقہ تدریس ہوتے تھے۔[1]

علامہ فضل حق خیرآبادی جس ریاست میں مقیم ہوتے طلبہ بھی وہیں منتقل ہو جاتے اور مستفیض ہوتے۔ آپ کے شاگردوں کی تعداد بہت زیادہ ہے مگر افسوس کہ ان سب کے نام بھی محفوظ نہیں ہیں۔ معاصر مصنف مولوی کریم الدین پانی پتی (ف 1829ء) لکھتے ہیں: "واضح ہو کہ یہ فاضل اجل' بزرگ عالم ہندوستان میں ہے۔ اس سے صدہا لوگوں کو فیض ہوا ہے اور صدہا فاضل اس کے شاگردوں میں ہیں۔"[2] قریبی عصر امیر مینائی لکھتے ہیں: "علامہ مولوی صاحب کے حساب سے باہر ہیں"۔[3]

علامہ عبدالحکیم شرف قادری لکھتے ہیں: "آج ہندو پاک کا شاید ہی کوئی مدرسہ ہوگا جہاں آپ کا فیض جاری نہ ہو"۔[4] عبدالشاہد خان شروانی کے مطابق "تیرہویں اور چودہویں صدی کے اکثر فضلاء ہند خیرآبادی مجرم علم کے خوشہ چیں ہوئے ہیں۔ موجودہ دور کے صف اول کے مشاہیر علماء کو نسبت تلمذ علامہ کے تلامذہ یا تلامذہ کے تلامذہ سے حاصل ہے"۔[5]

تلامذہ دہلی

۱) حکیم امام الدین دہلوی' طبیب اکبر شاہ ثانی و بہادر شاہ ظفر و وزیر الدولہ لوہارو۔

۲) مولانا شیخ محمد تھانوی والد شیخ احمد اللہ (1230ھ/1815ء۔ 1292ھ/1879ء)

۳) مولانا نور الحسن ولد مفتی الٰہی بخش کاندھلوی۔ قائم مقام تحصیلدار دیوبند (ف 1285ھ)

۴) حکیم نور الحسن بن حکیم شاہ علی امروہوی

۵) نواب ضیاء الدین خان نیر

۶) مولانا قلندر علی زبیری پانی پتی (ف 1323ھ) مولف تنزیل التذبیر فی نظیر البشیر و النذیر و استاذ حالی

۷) منشی دادار بخش غالبی

۸) مولوی غلام قادر گوپاموی (سبط مولانا فضل امام)، ناظر سررشتہ دار عدالت دیوانی تحصیلدار گوڑگانوہ

۹) ملا فتح الدین لاہوری

﴿سہارن پور اور کاندھلہ کے تلامذہ﴾

۱۰) مولوی عبدالرزاق سہارن پوری

۱۱) مشہور شاعر و ادیب، مولانا فیض الحسن سہارنپوری (1232ھ/1816ء-1304ھ/1887ء)، استاذ شبلی نعمانی و استاذ شعبہ عربی پنجاب یونیورسٹی، شارح حماسہ وسبعہ معلقہ

۱۲) مولوی محمد اکبر بن مولوی نور الحسن کاندھلوی (ف 1303ھ/1886ء)

﴿تلامذہ رامپور﴾

۱۳) شمس العلماء مولانا عبدالحق بن فضل حق خیرآبادی (1828ء/1244ھ-1316ھ) فلسفہ میں امام عصر، تقریباً چالیس کتابوں کے مصنف، استاذ شبلی نعمانی و برکات احمد ٹونکی و اسد الحق خیرآبادی۔ ہندوستان میں علامہ فضل حق خیرآبادی کی یادگار ہے

۱۴) بی بی سعید النساء حرماں بنت علامہ فضل حق خیرآبادی و ام مضطر خیرآبادی و بسمل خیرآبادی

۱۵) نواب محمد یوسف علی خان ابن نواب محمد سعید خان (ف 1281ھ)

۱۶) نواب محمد کلب علی خان ابن نواب محمد یوسف علی خان (ف 1878ء)

۱۷) صاحبزادہ محمد کاظم علی خان ابن نواب محمد سعید خان (ف 1292ھ)

۱۸) صاحبزادہ فدا علی خان ابن محمد کاظم علی خان

۱۹) مولوی ہدایت اللہ خان ولد رفیع اللہ خان رامپوری ثم جونپوری (ف 1326ھ/1908ء) و استاذ مولانا سید سلیمان اشرف و مولانا امجد علی اعظمی مصنف بہار شریعت

۲۰) مولانا ملا نواب ولد اسعد اللہ خان رامپوری (ف 1309ھ)

۲۱) مولوی محمد موسیٰ خان ولد احمد خان رامپوری (ف 1333ھ غالباً)

۲۲) مولوی حکیم محمد فیاض خان ولد مولوی بشارت اللہ خان رامپوری (ف 1272ھ)

۲۳) مولوی عبدالعلی خان ریاضی دان ولد یوسف خان رامپوری (ف 1303ھ) استاذ الامام احمد رضا خاں بریلوی

۲۴) مولوی نورالنبی ولد مولوی محمد اسحاق مدرس مدرسہ عالیہ رامپور (ف 1287ھ تقریباً)

۲۵) مولوی عبدالعزیز خان ولد حاجی جرہ باز خان مدرس مدرسہ عالیہ رامپور

۲۶) مولوی سلطان حسن خان ولد مولوی احمد حسن خان صدر الصدور بریلی (ف 1299ھ/1881ء)۔ سید جمیل احمد بلگرامی اور انہوں نے مل کر علامہ فضل حق کے عربی کلام کا ایک مجموعہ مرتب کیا۔

۲۷) مولوی ہدایت علی بریلوی مدرس اول (پرنسپل) مدرسہ عالیہ رامپور استاذ مولانا فضل حق رامپوری

۲۸) مولوی حکیم الٰہی بخش قادری ولد اشرف الحکماء حکیم عظیم اللہ قادری

۲۹) مولوی احمد حسن مرادآبادی (ف 1288ھ/1871ء) بخش شفاء شریف

۳۰) مولوی حکیم محمد حسن ولد شیخ کرامت علی امروہوی (ف 1323ھ)

۳۱) مولوی عبدالعزیز سنبھلی

۳۲) مولوی عبدالرشید غازی پوری

﴿لکھنؤ اور الور کے تلامذہ﴾

۳۳) مولانا نور احمد بن مولوی محمد شفیع عثمانی بدایونی (1230ھ۔1301ھ)

۳۴) مولانا عبدالقادر بن شاہ فضل رسول بدایونی (1253ھ۔1319ھ) صاحب دیوان عربی و تاریخ بدایون و ہدایت الاسلام و رسالہ حقیقتِ شفاعت وغیرہ۔

۳۵) مولوی محمد محسن ترہتی صاحب "الیانع الجنی فی اسانید الشیخ عبد الغنی" (1837ھ/1901ء)

۳۶) مولوی عبداللہ بلگرامی بن شاہ آل احمد بلگرامی

۳۷) شمس العلماء مولانا عبدالحق بن شاہ غلام رسول کانپوری (ف 1312ھ)

﴿دیگر تلامذہ﴾

۳۸) مولانا جمیل احمد بن اسلم صدیق بلگرامی (ف 1294ھ) علامہ خیرآبادی کے عربی کلام کا ایک مجموعہ بھی ترتیب دیا۔

WWW.NAFSEISLAM.COM

۳۹) مولانا نجیر الدین بن محمد ہادی (1831ء-1908ء/1326ھ) ۔والد ابو الکلام آزاد۔ اردو بابیہ میں 10 جلدوں میں علامہ سید احمد دحلان کی خواجش پر کتاب لکھی۔

۴۰) مولانا قلندر بخش پانی پتی

۴۱) مولانا سید علی ۹ سہسوانی

۴۲) مولانا محمد احسن گیلانی بن شجاعت علی واسطی (جد مناظر احسن گیلانی) (1212ھ/1301ھ)

۴۳) مولانا ابو احمد مرادعلی استاد قاضی ظفر الدین لاہوری

۴۴) مولوی سراج الدین بجنوری ثم لکھنوی

۴۵) مولوی لطف علی راج گیری (بہاری)

۴۶) مولوی حکیم میر سید دائم علی عظیم آبادی ثم ٹونکی

حوالہ جات

۱ باغی ہندوستان ص: ۲۳۰

۲ تذکرہ فرائد الدر ص: ۳۰۶۔۳۰۷

۳ انتخاب یادگار ص: ۲۹۲

۴ باغی ہندوستان ص: ۲۴۰

۵ تحقیق الفتوی مترجم ص: ۱۰۔۱۱

۶ باغی ہندوستان ص: ۲۳۲ شجرہ تلامذہ کے لیے ڈاکٹر قمر النساء کا ڈاکٹریٹ کا مقالہ ص: ۹۱ تا ۹۳ تفصیل کے لیے باغی ہندوستان ص: ۳۶۳ تا ۳۶۶

۸ ان کا نام محمد احسن بھی لکھا گیا ہے

۹ سید علی یا سید یاد علی نام تھا

WWW.NAFSEISLAM.COM

سلسلہ خیرآبادی کے خوشہ چیں

محمد وحید نور

پاک و ہند میں حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی علیہ الرحمۃ اور ان کے خاندان کے بعد حضرت مولانا فضل امام خیرآبادی علیہ الرحمۃ اور ان کے خاندان کے افراد قرآن و سنت کے موتی بکھیرنے میں دیگر سے ممتاز و فائق ہیں۔ حضرت مولانا فضل امام خیرآبادی کے خاندان کی علمی خدمات کا عملی سلسلہ تین نسلوں تک پھیلا ہوا ہے خصوصاً آپ کے لختِ جگر حضرت علامہ فضل حق خیرآبادی تو گویا "صدر العلماء" تھے۔ ذیل میں ہم مختصراً ان علماء کرام کا ذکر کر رہے ہیں جن کا بلا واسطہ یا بالواسطہ "شجرہ تعلیم" علامہ فضل حق خیرآبادی علیہ الرحمۃ تک پہنچتا ہے۔

شمس العلماء مولانا عبدالحق خیرآبادی ⟵ علامہ فضل حق خیرآبادی

مولانا ہدایت علی بریلوی ⟵ 〃 〃 〃

مولانا فیض الحسن سہارنپوری ⟵ 〃 〃 〃

مولانا قلندر علی زبیری پانی پتی ⟵ 〃 〃 〃

علامۃ الدھر مولانا ہدایت اللہ خاں جونپوری ⟵ 〃 〃 〃

مولانا عبدالعلی خاں رامپوری ⟵ 〃 〃 〃

محبِ رسول مولانا شاہ عبدالقادر بدایونی ⟵ 〃 〃 〃

علامہ فضل حق علیہ الرحمۃ سے استفادہ کرنے والے حضرات کی تعداد بلا مبالغہ سینکڑوں ہزاروں میں ہے لیکن یہاں ہم بلا واسطہ استفادہ کرنے والے اتنے ہی حضرات پر اکتفا کرتے ہیں اور ان حضرات سے جنہوں نے کسب فیض کیا ان کا ذکر کرتے ہیں تاکہ سلسلہ خیرآبادی سے مستفید ہونے والے اصحاب علم کا اجمالی تعارف حاصل ہو سکے۔

مجدد العصر امام احمد رضا خاں بریلوی ⟵ مولانا عبدالعلی خاں رامپوری ⟵ علامہ فضل حق خیرآبادی

پوتا علامہ فضل حق مولانا اسد الحق خیرآبادی ⟵ مولانا عبدالحق خیرآبادی ⟵ علامہ فضل حق خیرآبادی

WWW.NAFSEISLAM.COM

حکیم سید برکات احمد بہاری	〃 〃 〃 〃 〃 〃	〃 〃 〃 〃	〃 〃 〃 〃
صدر الشریعہ مولانا امجد علی اعظمی	مولانا ہدایت اللہ جونپوری	علامہ فضل حق خیرآبادی	〃 〃 〃 〃
فقیہ العصر مولانا یار محمد بندیالوی	〃 〃 〃 〃 〃 〃	〃 〃 〃 〃	〃 〃 〃 〃
رئیس العلماء سید سلیمان اشرف بہاری	〃 〃 〃 〃 〃 〃	〃 〃 〃 〃	〃 〃 〃 〃
مولانا محمد احسن گیلانی	مولانا قدرت علی زبیری	علامہ فضل حق خیرآبادی	〃 〃 〃 〃
امیر ملت پیر سید جماعت علی شاہ	مولانا فیض الحسن	علامہ فضل حق خیرآبادی	〃 〃 〃 〃
معروف مورخ شبلی نعمانی	〃 〃	〃 〃	〃 〃 〃 〃
مفتی عبداللہ ٹونکی	〃 〃	〃 〃	〃 〃 〃 〃
مولانا شاہ ابوالحسن احمد نوری مارہروی	مولانا ہدایت اللہ بریلوی	علامہ فضل حق خیرآبادی	〃 〃 〃 〃
مولانا فضل حق رامپوری	〃 〃	〃 〃	〃 〃 〃 〃
مولانا یونس علی بدایونی	〃 〃	〃 〃	〃 〃 〃 〃
مولانا محمد حسن سنبھلی	مولانا شاہ عبدالقادر بدایونی	علامہ فضل حق خیرآبادی	〃 〃 〃 〃
مولانا فضل احمد بدایونی	〃 〃	〃 〃	〃 〃 〃 〃
مفتی دیوبند مولوی عزیز الرحمن	〃 〃	〃 〃	〃 〃 〃 〃
سبحان الہند مولانا سید محمد سعادت مچھلی شہری	مولانا احمد رضا خاں	مولانا عبدالعلی	علامہ فضل حق خیرآبادی
حجۃ الاسلام مولانا حامد رضا خاں بریلوی	〃 〃	〃 〃	〃 〃 〃 〃
مفتی اعظم ہند مولانا مصطفی رضا خاں بریلوی	〃 〃	〃 〃	〃 〃 〃 〃
ملک العلماء مولانا ظفر الدین بہاری	〃 〃	〃 〃	〃 〃 〃 〃
امام الحرمین مولانا سید دیدار علی شاہ	〃 〃	〃 〃	〃 〃 〃 〃
فخر سادات سید احمد اشرف مچھلی شہری	〃 〃	〃 〃	〃 〃 〃 〃
مفتی اعظم پاکستان سردار ابوالبرکات قادری	〃 〃	〃 〃	〃 〃 〃 〃

WWW.NAFSEISLAM.COM

امام الحق مولانا سید غلام جیلانی میرٹھی	مولانا احمد علی محدثی	سید ولایت اللہ بہرائچی	علامہ فضل حق خیرآبادی
محدث اعظم مولانا سردار احمد قادری	〃 〃	〃 〃	〃 〃
شیخ الجامعہ مفتی تقدس علی خاں	〃 〃	〃 〃	〃 〃
مناظر جلیل مولانا حشمت علی خاں	〃 〃	〃 〃	〃 〃
مفتی اعلمیت مفتی اعجاز ولی خاں	〃 〃	〃 〃	〃 〃
محقق اعلمیت مولانا عبدالمصطفیٰ اعظمی	〃 〃	〃 〃	〃 〃
شیخ الحدیث مولانا عبدالمصطفیٰ رازقی	〃 〃	〃 〃	〃 〃
وقار ملت مفتی محمد وقار الدین	〃 〃	〃 〃	〃 〃
تاج ملت مولانا حبیب الرحمٰن الہ آبادی	〃 〃	〃 〃	〃 〃
حافظ ملت مولانا عبدالعزیز مبارکپوری	〃 〃	〃 〃	〃 〃
استاذ العلماء مولانا سلیمان اشرفی بہاری	〃 〃	〃 〃	〃 〃
شیخ الحدیث مولانا وصی احمد	〃 〃	〃 〃	〃 〃
ملک العلماء مولانا ظفر الدین بہاری	مولانا بیان محمد بنگلوری	سید ولایت اللہ بہرائچی	علامہ فضل حق خیرآبادی
شیخ القرآن مولانا عبدالغفور ہزاروی	〃 〃	〃 〃	〃 〃
پروفیسر خورشید احمد علی گڑھ	〃 〃	سید ولایت اللہ بہرائچی	علامہ فضل حق خیرآبادی
مبلغ اسلام ڈاکٹر فضل الرحمٰن انصاری	〃 〃	〃 〃	〃 〃
مولانا برہان احمد فاروقی	〃 〃	〃 〃	〃 〃
شیخ الجامعہ مولانا غلام محمد گھوسوی	مولانا فضل حق رامپوری	سید ولایت اللہ بہرائچی	علامہ فضل حق خیرآبادی
مولانا فیض الحسن	〃 〃	〃 〃	〃 〃
مولانا قاضی عبدالسبحان کھلاتی	شہید ہونے کا اعزاز	مولانا سید فضل حق خیرآبادی	〃 〃
مولانا معین الدین اجمیری	〃 〃	〃 〃	〃 〃

WWW.NAFSEISLAM.COM

مولانا عبدالعزیز فتحپانی 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃

مفتی غلام جان ہزاروی 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃

حکیم سید محمد احمد 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃

فقیہ اعظم مولانا محمد نور اللہ نعیمی — مولانا ابوالبرکات — امام احمد رضا — مولانا عبدالحق خان — علامہ فضل حق

شیخ القرآن مولانا غلام علی اوکاڑوی 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃

استاذ الاساتذہ مفتی محمد عبداللہ قصوری 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃

شارح بخاری سید محمود احمد رضوی 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃

سلطان الواعظین مولانا محمد بشیر سیالکوٹی 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃

استاذ العلماء مولانا حافظ محمد عالم سیالکوٹی 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃

علامۃ الدہر مولانا محمد مہر الدین 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃

شارح بخاری علامہ غلام رسول رضوی — مولانا سردار احمد — مولانا [illegible] اعظمی — مولانا [illegible] — علامہ فضل حق

نبیرہ اعلیٰ حضرت مولانا تحسین رضا خاں 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃

مفتی اعظم پاکستان مفتی محمد عبدالقیوم ہزاروی 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃

حافظ الحدیث مولانا سید جلال الدین شاہ مشہدی 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃

فخر سادات مولانا سید حسین الدین شاہ 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃

استاذ العلماء مولانا عبدالرشید جھنگوی 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃

نائب محدث اعظم مولانا محمد صادق رضوی 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃

ترجمان اسلام ابوسعید مفتی محمد امین 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃

استاذ العلماء مولانا محمد عبدالرشید سمندری 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃

محقق اہلسنت مولانا جلال الدین قادری 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃

شیخ الحدیث مفتی محمد حسین قادری 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃

WWW.NAFSEISLAM.COM

یادگار اسلاف ڈاکٹر محمد فاضل

مبلغ اسلام مولانا محمد ابراہیم خوشتر ورانی

فخر المحدثین مولانا شریف الحق امجدی

مولانا محمد صابر القادری نسیم بستوی

علامہ منظور احمد

مولانا محمد احسان الحق فیصل آبادی

WWW.NAFSEISLAM.COM

مولانا نثار رحمان رضا خاں بریلوی

ملقی اسلام قاضی عبدالرحیم بستوی

مولانا عبدالحفیظ عظمی

مولانا عبدالدین احمد القادری

مولانا افتخار احمد القادری

مولانا نعیمی اختر عظمی مصباحی

ملقی اعظم ازہر مولانا عبدالقدوس — مولانا حبیب الرحمن الہ آبادی — مولانا ہدایت اللہ جونپوری — علامہ فضل حق

مولانا نظام الدین

مولانا عبدالرب مرادآبادی

مولانا معین الدین سلطانپوری

مولانا نعیم اللہ خاں الہ آبادی

استاذ العلماء مفتی نظیر علی فرنگی محلی — علامہ سلیمان ناجی پوری — مولانا ابوالحسن علی — مولانا ہدایت اللہ جونپوری — علامہ فضل حق

مفتی عبدالمنان گھوسی — 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃

استاذ العلماء مولانا محمد حسن خلفی — 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃

مولانا اللہ بخش ہوں گجرس — مولانا مظاہر علی بندیالوی — مولانا ہدایت اللہ جونپوری — علامہ فضل حق

مولانا عبدالحق بندیالوی — 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃

مولانا غلام رسول سعیدی — 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃

مولانا محمد فضل رحمان مرادآبادی — 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃

مولانا سید محمد چشتی — 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃

شرف ملت مولانا حکیم شرف الدین بلگرامی — 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃

استاذ العلماء مولانا سید محمد کچھوچھوی — مولانا عبدالحق خیرآبادی — مولانا فضل حق خیرآبادی — مولانا ہدایت اللہ جونپوری — علامہ فضل حق

شیخ الحفظ مولانا عبدالرحمن عبدالرحمٰن چشتی — 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃

بانگ اسلام مولانا محمد ذاکر — 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃

مولانا افضال الحق رامپوری — 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃

شیخ الاسلام مولانا عبدالحق فرید کوٹی — مولانا کفایت علی کافی مرادآبادی — مولانا امان اللہ خیرآبادی — علامہ فضل حق خیرآبادی

پیر طریقت مولانا فضل حق خیرآبادی — 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃

سید محمد الحسن خیرآبادی — 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃

مصروف مؤرخ سید سلیمان ندوی — 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃

عبدالشاہد خاں شروانی علی گڑھی — 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃

مولانا منتخب الحق بہاری — 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃

حکیم سید محمد یوسف کانپوری — حکیم سید محمد احسن — حکیم سید برکات احمد — مولانا عبدالحق خیرآبادی — علامہ فضل حق خیرآبادی

بانگ بریلی لیڈر سید عبدالسلام آزاد — حکیم ظہیر الحسن لکھنوی — حکیم سید برکات احمد — مولانا عبدالحق خیرآبادی — علامہ فضل حق خیرآبادی

حبیب الرحمن — عبدالصمد بلگرامی — حکیم سید برکات احمد — مولانا عبدالحق خیرآبادی — علامہ فضل حق خیرآبادی

Khanqah Nizamia Jhansi
IMAMAHSUNNAT.COM

شیخ الادب علامہ شمس بریلوی ⟵ مفتی حامد رضا خاں ⟵ امام احمد رضا ⟵ مولانا شہید العلی ⟵ علامہ فضل حق خیر آبادی

عالم ربانی مولانا سعید الدین ⟵ 〃 〃 ⟵ 〃 〃 ⟵ 〃 〃 ⟵ 〃 〃 ⟵ 〃 〃

مولانا محمد عبد الحق ⟵ مولانا عبد الرسول بدایونی ⟵ مولانا عبد القادر ⟵ مولانا ولی اللہ ⟵ مولانا عبد اللہ مہاجر مکی ⟵ علامہ فضل حق

علامہ صالح چشتی ⟵ 〃 〃 ⟵ 〃 〃 ⟵ 〃 〃 ⟵ 〃 〃 ⟵ 〃 〃

مولانا عبد الحکیم سیالکوٹی ⟵ مولانا محمد عبد الحق ⟵ علامہ عبد العزیز ⟵ مولانا شہید العلی ⟵ مولانا شہید العلی ⟵ علامہ فضل حق خیر آبادی

مولانا نایاب علی نعیم ⟵ 〃 〃 ⟵ 〃 〃 ⟵ 〃 〃 ⟵ 〃 〃 ⟵ 〃 〃

وکیل الامرا نواب آگرہ ⟵ مولانا فاضل ⟵ مولانا محمد اسحاق ⟵ مولانا ولی اللہ محدث ⟵ مولانا عبد اللہ مہاجر مکی ⟵ علامہ فضل حق خیر آبادی

مولانا عبد الحی ⟵ مولانا فضل اللہ جونپوری ⟵ مولانا محمد اسحاق ⟵ مولانا محمد یوسف گجراتی ⟵ مولانا عبد اللہ مہاجر مکی ⟵ علامہ فضل حق خیر آبادی

علامہ ابو الحسنات عبد الحی ⟵ مولانا فضل اللہ جونپوری ⟵ مولانا محمد اسحاق ⟵ مولانا محمد یوسف گجراتی ⟵ مولانا عبد اللہ مہاجر مکی ⟵ علامہ فضل حق خیر آبادی

ان حضرات کے علاوہ آج بھی پاک و ہند کے طول و عرض میں جو اصحاب علم خدمت دین میں مشغول ہیں ان کا تعلق بھی سلسلہ خیر آبادی سے ہے۔ یہ فہرست حتمی نہیں بلکہ مستقبل کے محققین کے لیے نشست اول ہے۔ اگر کسی نے اس طرف نظر دوڑائی تو یقیناً اس فہرست میں گرانقدر اضافہ ہوگا۔ کاش! سلسلہ خیر آبادی کے کسی خوشہ چیں کی اس طرف توجہ ہو۔

WWW.NAFSEISLAM.COM

مومن کے جہاں کی حد نہیں ہے
مومن کا مقام سرحد نہیں ہے

(اقبال)

علامہ کے معاصرین سے روابط

سلمہ سہیول

مختر مہ سلمہ سہیول صاحبہ انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی اسلام آباد میں لیکچرار ہیں۔ مجاہد کبیر علامہ فضل حق خیرآبادی علیہ الرحمۃ کی حیات وخدمات پر موصوفہ نے ایک مقالہ مقالہ تحریر فرمایا ہے۔ استاذ بابل کیشنز لاہور نے 2001ء میں شائع کیا تھا۔ اس کتاب نما مقالے میں علامہ کی ذاتی، علمی، سیاسی اور مجاہدانہ زندگی کے متعلق بہت سے حقائق ہیں۔ بالخصوص بعض معاصرین کی جانب سے علامہ فضل حق کی 1857ء میں خدمات پر قائم کردہ شکوک وشبہات کو بیان کیا گیا ہے اور حقائق کو دیگر مستند قائدین کے کردار وآراء کی روشنی میں بیان کیا ہے۔ فیض نگر مضمون اسی مقالے کا چھوٹا سا جزو ہے۔

● علامہ اور مفتی صدر الدین آزردہ:

مفتی صدر الدین آزردہ دہلی میں 1204ھ/1789ء میں پیدا ہوئے۔ ان کے آباء واجداد کشمیر کے رہنے والے تھے۔ ان کے والد مولوی لطف اللہ لغرض تجارت دہلی آئے۔ یہ شاہ عبد العزیز، شاہ عبد القادر اور مولانا فضل امام خیرآبادی کے شاگرد تھے۔ عربی، فارسی اور اردو تینوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ آزردہ اور غالب مخلص کرتے تھے۔ شاعری میں شاہ نصیر اور میر محزون دہلوی سے تلمذ تھا۔ نواب یوسف علی خان والئی رامپور، نواب صدیق حسن خان قنوجی اور سر سید احمد خان مخلص میں تلامذہ سے ہیں۔

1242ھ/1827ء کے قریب صدر الصدور دہلی مقرر ہوئے۔ یہ عہدہ وظیفہ اور منصب میں انگریزی سب جج کے برابر تھا۔ انہوں نے جامع مسجد کے پاس دار البقاء کے نام سے مدرسہ بھی قائم کیا تھا۔ آزردہ اور علامہ فضل حق ہم سبق ساتھی تھے۔ آزردہ علامہ سے عمر میں آٹھ سال بڑے تھے لیکن ان کے اساتذہ مشترک تھے اور دہلی کے تمام دوست احباب بھی مشترک تھے۔ 1240ھ میں جب مسئلہ امتناع نظیر چھڑا تو آزردہ نے علامہ کی طرفداری کی اور ان کی مشہور تصنیف "تحقیق الفتوی فی ابطال الطغوی" پر دستخط ثبت کی۔ اور نواب مولوی حیدر علی رامپوری کی کتاب کے جواب میں جناب عبد الستار نے ایک استفتاء مرتب کر کے علماء وقت سے دستخط کروائے تو مفتی صاحب نے بھی اس پر دستخط ثبت کی اور تصدیقی عبارت بھی لکھی۔ ج

مولانا فضل رسول بدایونی کی ردِ تقویت میں کتاب المعتقد والمنتقد پر تقریظ لکھی۔ 1269ھ میں مسئلہ امکان کذب و امتناع کذب پر علامہ صاحب کو خط لکھا۔ ؎

رضا لائبریری رامپور میں ملفوظ صدر الدین آزردہ' مولانا فضل رسول بدایونی' مولانا محمد حسن خان بریلوی اور علامہ فضل حق خیرآبادی کا ایک مجموعہ تحریرات "شبہ لزوم لزومات اعتباریہ فی العقول المجردہ" ۱۱۵۲ کے نمبر پر محفوظ ہے۔

مولوی کریم الدین نے "تذکرہ فرائد الدھر" میں علامہ خیرآبادی کی ایک عربی تحریر نقل کی ہے جو انہوں نے ملفوظ صدر الدین کو لکھی تھی جبکہ ملفوظ صدر الدین آزردہ نے اپنی ایک فارسی نظم میں علامہ فضل حق کے علم و فضل کا ذکر کیا ہے ان دنوں علامہ دہلی میں تھے۔ ملفوظ صاحب کہتے ہیں:

رشک تہران و صفاہان شدہ ولی از من
انور از ذات ہمایں تو یونان باشد

ترجمہ: ولی مجھ سے تہران اور صفاہان کے رشک کی جگہ بن گیا۔ آپ کی برکت ذات سے انور یونان ہوگا۔

☆☆☆☆

● علامہ اور بہادر شاہ ظفر:

علامہ فضل حق خیرآبادی کے بہادر شاہ ظفر سے ان کی ولی عہدی کے زمانے ہی سے روابط تھے۔ اس لیے کہ علامہ دہلی میں ہی پلے بڑھے اور وہیں تعلیم پائی۔ ان کے والد دہلی کے صدر الصدور تھے اور علامہ کا قلعہ میں آنا رہتا تھا۔ بہادر شاہ ظفر آخری مغل تاجدار کے تعلقات کی تفصیل نہیں ملتی۔ صرف ایک واقعہ ملتا ہے جسے مرزا غالب نے نظم بند کیا ہے۔

غالب کے مطابق 1832ء میں 35 سال کی عمر میں جب علامہ فضل حق خیرآبادی ملازمت کچھی سے استعفیٰ دے کر نواب مچھری کی دعوت پر مچھری روانہ ہونے لگے تو ولی عہد سلطنت صاحب عالم ابو النظفر بہادر نے اپنا ملیس دو شالہ علامہ فضل حق کے کندھوں پر ڈالا اور آبدیدہ ہو گئے اور کہا: چونکہ آپ جانے کے لیے تیار ہیں۔ میرے لیے بجز اس کے اور کوئی چارہ کار نہیں کہ میں بھی اس کو منظور کر لوں۔ مگر خدائے علیم جانتا ہے کہ لفظ "وداع" زبان پر لانا دشوار ہے۔ ؎

یہ واقعہ اس بات پر شاہد عادل ہے کہ بہادر شاہ ظفر کو علامہ فضل حق خیرآبادی سے کس قدر قلبی تعلق اور عقیدت

تھی۔ یہ عقیدت بھرے روابط تاحیات جاری رہے۔ اس واقعہ سے رابع صدی بعد جہادِ آزادی 1857ء وقوع آیا۔ اس رابع صدی میں علامہ دہلی سے باہر مختلف ریاستوں میں رہے مگر بہادر شاہ ظفر اور ان کے روابط میں فرق نہ آیا۔ تاریخ گواہ ہے کہ اغیار و مستانوں کی مشکل گھڑیوں میں جب کوئی وزیر، کوئی مصاحب اور کوئی شہزادہ اعتبار کے قابل نہ رہا اور سازشیوں اور غداروں نے اپنا گھیرا تنگ تر کرلیا تو اس وقت علامہ فضل حق خیرآبادی ہی کی وہ واحد ذات تھی جو بہادر شاہ ظفر کو اعتبار کے قابل نظر آئی۔ چنانچہ بہادر شاہ ظفر نے انہیں اودھ سے بلا بھیجا اور تمام انتظام و انصرام ان کے سپرد کردیا۔

☆☆☆☆

● علامہ مولانا فضل رسول بدایونی:

علامہ فضل حق خیرآبادی کو مولانا فضل رسول بدایونی (ت 1289ھ/1872ء) سے نہایت خلوص اور عقیدت تھی دونوں تقریباً ہم سن تھے یا علامہ فضل حق صرف ایک سال بڑے تھے۔ دونوں ابتدائے عمر میں حکومت کے بعض انتظامی مناصب پر فائز رہے۔ دونوں کے نقطہ ہائے نظر میں اتفاق تھا۔ بعض متنازع اور مختلف فیہ مسائل میں بھی متفق تھے۔

تقویۃ الایمان کے رد میں پہلے علامہ فضل حق نے ہی کی تھی پھر مولانا فضل رسول نے سیف الجبار، اوراق محمدیہ، صحیح المسائل، المعتقد والمنتقد وغیرہ کتب و رسائل لکھے اور ان میں تحقیق الفتوی فی ابطال الطغوی سے اقتباس دیے۔ ۵

ایک جگہ المعتقد المنتقد میں لکھا: ﴿الفاضل الکامل الاجل الابجل المولی فضل الحق الخیر آبادی وھو بار فی الھند اول من جرح مبتدعات النجدیۃ ومفاسدھم وآخر من بین شرح فساد عقائدھم فاطمئن قلوب اھل الیقین وحصل الیقین للشاکین والمتردین وھدی اللہ بہ کثیرا من الضالین وله منة علی کافة المسلمین وأجر جزیل عند رب العالمین﴾ ۶

علامہ فضل حق نے المعتقد المنتقد پر جو تقریظ لکھی اس کا اقتباس درج کیا جاتا ہے ﴿ھو لانا الأورع الأودع البارع المصرع البارع المقرع الضارع المتضرع ذو المناقب الفواقب الجلیلة والانظار الثواقب الدقیقه الجامع بین العلوم العقلیة والنقلیة ومعارف الشریعة والحقیقة طلاع الثنایا والنجاد ذائع الصیت فی النجاد الحق وقل قرن طلع من النجد فی الاخوار

والانجاد العریف / العرّیف البشریف العطریف الصفی الخفی الحصی الحفی المولوی فضل الرسول القادری الحنفی منح اللہ المؤمنین بطول بقائہ وصانہ فی حرزہ ووقاہ وجعل خیر ایامہ یوم لقائہ۔ ۷

دونوں بزرگوں کے مراسم علمت ومودت کے سلسلے میں اکمل التاریخ کا بیان ہے کہ مولانا فضل رسول سے آپ (مولانا فضل حق) کو نہایت خلوص وعقیدت تھی۔ ایک زمانے میں آپ بدایون میں بھی تشریف لائے تھے۔ اکثر اوراد واشغال کی اجازتیں حاصل کی تھیں اور مدرسہ قادریہ میں منعقم ہوئے تھے۔ ۸

اسی تعلق خاطر کے زیر اثر مولانا فضل رسول بدایونی نے اپنے لخت جگر جناب عبدالقادر بدایونی (تاج الفحول) کو مولانا فضل حق سے استفادہ کے لیے لکھنؤ اور الور بھیجا اور مولانا فضل حق نے انہیں عزیز از جان سمجھا۔ ۹

علامہ کے سینکڑوں شاگردوں میں سے چار حضرات خاص سر آمد سمجھے جاتے تھے۔ (۱) مولانا عبدالحق خیرآبادی معقولات میں (۲) مولانا فیض الحسن سہارنپوری ادب میں (۳) مولانا ہدایت اللہ خان جونپوری معقولات میں (۴) اور مولانا عبدالقادر بدایونی جملہ علوم وفنون میں۔

یہ تھی مولانا فیض احمد بدایونی جو کہ مولانا فضل رسول بدایونی کے خواہر زادے اور خاص شاگرد تھے۔ انہوں نے جہاد آزادی 1857ء میں علامہ فضل حق کے ساتھ محاذ دہلی پر گرم حصہ لیا۔ الغرض علامہ اور مولانا فضل رسول بدایونی میں مختلف النوع عقیدت مندانہ اور گہرے روابط تھے۔

☆☆☆☆

● علامہ اور منیر شکوہ آبادی

سید اسماعیل امین منیر شکوہ آبادی کو (جو ایسوسی ایٹ صدر کے مشہور رشتہ دار ہیں) انصلی بیگ نامی ایک شخص نے قتل نواب جان کے سلسلے میں پھنسا دیا تھا۔ اسی دور میں جنگ 1857ء شروع ہوئی اور یہ نواب فرخ آباد کے ساتھ شریک انقلاب ہو گئے۔ عبور دریائے شور کی سزا ملی اور بادہ 'الہ آباد' کلکتہ جیلوں میں رہے۔ ایک جگہ سے دوسری جگہ جھٹکی اور بیڑی پہنا کر پا پیادہ لے جایا گیا تھا۔ ان پر صعوبت سفروں کو دیوان میں مختلف جگہ نظم کیا ہے۔ جب علامہ انڈیمان پہنچ گئے تو یہاں کے شریک محفل رہے اور مستفید ہوتے رہے۔ اپنے ایک خط میں جو حافظ یمان سے محمد وزیر خان مقیم شہر بادہ کو 23 مارچ 1864ء کو بھیجا تھا اس میں علامہ کے بارے میں لکھتے ہیں:

"بیشتر غزلیات وبعض قصائد لباس نظم پوشیدہ ازاں جملہ یک قصیدہ در تسبیح بدر چاچی دعا گانی کہ بہ مبالغہ واصرار

عالم معقول وادب علامہ لوبیب المشہور فی الصدر مولوی فضل حق خیر آبادی موطن ' دہلی مسکن' ایں جزیرہ مدفن' سفر اسم و بخاتمہ قصیدہ کیفیت اصرار جناب مرحوم بہ نظم آوردہ۔ بالجملہ قصیدہ ایست کہ از قدرت ایزدی خبری دہد"۔ ملی

ترجمہ: بہت سی غزلیں اور کچھ قصائد منظوم ہوئے ہیں۔ ان میں سے ایک قصیدہ بدر چاچی اور قاآنی کی ہجو دی میں معقول وادب کے عالم' دانشور' علامہ اور ہندوستان میں مشہور مولوی فضل حق کے اصرار پر نظم کیا ہے۔ علامہ کا وطن خیر آباد' مسکن دہلی اور مدفن یہ جزیرہ ہے۔ میں نے قصیدے کے خاتمہ میں جناب مرحوم کے اصرار کی کیفیت بھی نظم کی ہے۔ مختصر یہ کہ یہ قصیدہ ہے جو اللہ تعالیٰ کی قدرت کی خبر دیتا ہے۔

حضرت امام حسن مجتبیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی منقبت میں پہلا ہجویہ اشعار پر مشتمل قصیدہ جو علامہ کے اصرار پر لکھا گیا ڈیڑھ سال میں مکمل ہوا۔ علامہ کی حیات میں شروع ہوا اور 1279ھ میں مکمل ہوا۔ قصیدہ کا مطلع یہ ہے۔

اشک زلیخا ہوئے بحر صلت جوش زن — غرق ہوا نیل میں یوسف گل پیرہن

قصیدے کے آخری اشعار میں خیر الفکوہ آبادی تمام روداد نظم کرتے ہوئے کہتے ہیں:

مخزن فضل و کمال ' عالم عالی مقام — ناقہ تازی زباں نجل شناس سخن
مولوی بے نظیر فضل حق اسم شریف — دہلی تا لکھنؤ مشتہر و موطن
قید میں' میں اور وہ رہتے تھے ایک جگہ — بین عشقدر میں تھے فرق بحر سخن
کہنے لگے ایک دن مجھ سے کہ اس کا تتا — شاعر اردو زباں اس میں ہوں تو یا کہن
مصطلحات عجم اور کنایات فرس — کس لیے کرتے ہیں نسبت نظم سخن
یا متقبل نہیں لہجۂ اردو زبان — یا کوئی لائق نہیں تم میں سے بے ریب وطن
گو غزل میں نہ ہو برہے قصیدے میں فرق — وقت مطلوب ہے ہیں بوجھ حسن
حضرت سودا بغیر کس نے قصیدے کہے — وہ بھی پر اس راہ میں ہو نہ سکے قفرہ زن
شاعروں میں جز غزل پھر نہ کسی نے کہا — رقم میں گو اپنے ہوں طوطی شکر شکن
میں نے کہا راست ہے آپ جو فرماتے ہیں — آپ سنیں تو کہے کچھ یہ اسیر سخن
مصطلحات غریب جو کہ نہ معروف ہوں — نظم کرے کس طرح شاعر ہندی سخن
جو متعارف ہوا شاعروں میں پہلے سے — اس کو بھی ہیں کے آج ہوتے ہیں سب طعنہ زن
کہنے لگے یہ کلام مہمل و بے معنی ہے — ہیں شعرا بے سواد' جہل ہے ان کا وطن

گرم ہوئے بڑھ گیا سلسلۂ قہر و عتم
ہلکے تھے نازک مزاج' ماتھے پہ آئی شکن

کہتے تھے دو بار بار ہندیوں سے ہے محال
رمز و کنایات میں وقت و لطف سخن

ہو کے ادب سے خموش پھر یہ قصیدہ کہا
کوچۂ نو میں چلا قاصد مفتی کہن

قید میں قط کتاب' حافظ واہ بس ضعیف
پر مدد غیب سے خامہ ہوا حرف زن

بعض ترا کیب خاص طبع کی ایجاد ہیں
نظم ہوئیں جو تھیں یاد مصطلحات کہن

ضعف قصیدہ کیا سامنے ان کے رقم
ختم ہوا جب وہ تھے بحر سخن گو و کن

میری خطائیں کریں صاحب انصاف عفو
قید میں خود میں ہوں پر تا' پوچ ہے میرا سخن

طیب سے تاریخ لو ساتھ کہی اے متیع
ژرف دل و جاں ہوئی' شرح حدیث حسن!!

1279ھ

☆☆☆☆

● علامہ اور مولانا حیدر علی فیض آبادی:

مولانا حیدر علی فیض آبادی (ف 1299ھ) کا شمار بھی علامہ کے احباب میں ہوتا ہے۔ انہوں نے رد شیعہ میں اپنی مشہور تصنیف "منتهى الكلام" علامہ فضل حق کو دکھوائی۔ علامہ نے اس کے مطالعے کے بعد مولانا کو بزبان عربی ایک طویل خط لکھا تھا۔ اس میں کتاب کی تعریف بلیغ کے علاوہ اس شیعی عالم (سبحان علی خان) کی علمی بے بضاعتی اور اس کے دعووں کا ابطال بیان کیا ہے جس کے رسالہ (مصنفہ 1247ھ) کے جواب میں 1250ھ میں مولانا فیض آبادی نے "منتهى الكلام" تصنیف کی تھی۔

علامہ فضل حق خیرآبادی ان دنوں ریاست رامپور میں ملازم تھے۔ علامہ نے یہ جوابی خط 5 ذی القعدہ 1261ھ کو مولانا فیض آبادی کی طرف سے ایک اور خط ملنے کے بعد بھجوایا اور لکھا کہ جواب میں تاخیر ملازمت میں کثرت مصروفیات کے باعث ہوئی۔

اس خط سے معلوم ہوتا ہے کہ علامہ اور مولانا فیض آبادی میں قریبی روابط تھے۔ یہاں کہ علامہ نے انہیں اپنے تین قریبی رشتہ داروں کی وفات' دردِ قولنج میں ابتلاء' بڑے بھائی فضل عظیم کے پاس سہارنپور جانے کے پروگرام اور دو ماہ بعد واپسی کے ارادہ وغیرہ جیسی نجی مصروفیات سے بھی مطلع کیا ہے۔

☆☆☆☆

● علامہ اور مولانا رشید الدین خان دہلوی:

مولانا رشید الدین ولد امین الدین' شاہ عبدالعزیز' شاہ رفیع الدین اور شاہ عبدالقادر کے شاگرد رشید تھے۔ دوسرے علوم کے علاوہ ہیئت و ہندسہ میں کمال حاصل تھا اور دہلی کالج میں مسند درس کو زینت دی۔ [13]

سرسید احمد خان نے تذکرہ اہل دہلی میں ان کا خصوصی ذکر کیا ہے۔ ان کے ساتھ علامہ کے خصوصی تعلقات تھے۔ علامہ کی قلمی بیاض میں مولانا صاحب کے نام عربی میں ایک خط ہے۔ انہوں نے یہ خط 15 صفر 1237ھ کو دارالحکومت دہلی سے باہر دریائے جمنا کے قریب اپنی اقامت کے دوران لکھا۔ اس خط کا بیشتر حصہ نظم پر مشتمل ہے اور کچھ نثر پر۔ اس خط میں علامہ نے ملاقات کی قرعت نہ ملنے پر معذرت کی ہے اور جدائی و فراق کا ذکر کرتے ہوئے ملاقات میں پہل کرنے کا لکھا ہے۔

یونہی ہم عصر وقائع نگار عبدالقادر رامپوری نے لکھا ہے "26 شوال 1238ھ مطابق 6 جولائی 1823ء کو مولوی فضل حق اور رشید الدین نے بندہ (مولوی عبدالقادر رامپوری) کو دیکھنے کے لیے قدم رنجہ فرمایا۔ اگلے دن میں بازدید کے لیے رشید الدین خان کے دولت خانہ پر گیا"۔ [14]

علامہ فضل حق کی مشہور تصنیف "تحقیق الفتوی فی ابطال الطغوی" پر دستخط کرنے والے علماء میں مولانا رشید الدین خان کا نام بھی شامل ہے۔ جامع مسجد میں ہونے والے مشہور مناظرہ میں بھی پیش پیش تھے۔ [15]

☆☆☆☆

● علامہ اور نواب امیر خان رئیس ٹونک:

1824ء/7 ربیع الثانی 1240ھ کو رئیس نواب ٹونک امیر خان نے علامہ فضل حق خیرآبادی کو قاصد بھیج کر اپنے یہاں آنے کی دعوت دی اور علامہ تشریف لے گئے۔ علامہ کی عمر 28 سال تھی اور وہ ان دنوں دہلی میں ملازم تھے۔ علامہ نے اس دعوت کا کوئی خاص سبب ذکر نہیں کیا ہے البتہ وہ یہ ذکر کرتے ہیں کہ ان کے اہل و احباب ان کو جانے سے روک رہے تھے اور اس روکنے کا سبب بھی ذکر نہیں ہے۔

یوں معلوم ہوتا ہے کہ علامہ وہاں پر کچھ دن رہے کیونکہ علامہ نے وہاں رئیس ٹونک امیر خان کی مدح میں فی البدیہہ 54 اشعار پر مشتمل جو قصیدہ کہا اس میں نواب کی سخاوت و عدل کے ذکر کے علاوہ وہ اپنے اہل و عیال کی خود سے جدائی و فراق پر آہ و بکا کا ذکر بھی کرتے ہیں۔

☆☆☆☆

● علامہ اور نواحین رام پور:

علامہ ریاست رام پور میں 1840ء سے 1847ء تک آٹھ سال کا عرصہ رہے۔ نواب محمد سعید خان کی دعوت پر وہاں گئے اور ان کے دونوں بیٹوں نواب یوسف علی خان اور محمد کاظم علی خان اور دونوں پوتوں نواب کلب علی خان اور صاحبزادہ فدا علی خان کے استاد مقرر رہے' یوں ان سب سے گہرے روابط رہے۔

علامہ کی رام پور آمد سے متعلق مؤلف تذکرہ کاملان رامپور لکھتے ہیں: "علامہ نصیر الدین خان رامپوری کے مرضِ موت میں نواب جنت آرامگاہ محمد سعید خان نے مولوی فضل حق خیر آبادی کو بلایا۔ مولوی نصیر الدین کے ایک دوست مولوی جلال الدین ان کے ہمسائے تھے' ان سے کہا اگر صحت ہو گئی تو میں ان سے گفتگو کروں گا' مگر تم ان سے گفتگو ہرگز نہ کرنا' اس لیے کہ وہ نیچریت کے دست متفوی ہیں۔

مولوی فضل حق صاحب جس وقت رامپور پہنچے تو آپ کا انتقال ہو چکا تھا۔ مولوی فضل حق صاحب آپ کے مکان پر فاتحہ خوانی کو آئے اور بہت افسوس سے کہتے تھے کہ میرا آنا نواب صاحب کے حکم سے ہوا ہے مگر زیادہ تر شوق یہاں آنے کا مولوی صاحب مرحوم (مولوی نصیر الدین خان) کی ملاقات کے لیے تھا"۔ [16]

مؤلف تذکرہ کاملان رامپور لکھتے ہیں: "نواب محمد سعید خان بہادر جنت آرامگاہ نے جناب نواب یوسف علی خان صاحب بہادر فردوس مکاں کی تعلیم کے واسطے بسفارش عبد الرحمن خان' مولوی جلال الدین نابینا اور مولوی عبد العلی خان ریاضی داں اور مولوی محمد رام پوری کو مقرر فرمایا۔ ہر صاحب اپنے اپنے وقت پر محمد اللہ کے متعلق مختلف تقریریں کیا کرتے تھے۔ فردوس مکان نواب یوسف علی خان کی تسکین خاطر ان تینوں علماء کے بیان سے نہ ہوئی تو مولانا فضل حق دہلی سے بلائے گئے اور مولانا نے تعلیم شروع کروائی"۔ [17]

حکیم محمد الٰہی خان رامپوری لکھتے ہیں: "نواب یوسف علی خان علوم کی طرف بہت رغبت رکھتے تھے اور کاملوں سے صحبت رہتی تھی اور علوم عقلیہ منطق و حکمت میں اعلیٰ دستگاہ تھی اور ان علوم کو مولانا فضل حق خیر آبادی سے حاصل کیا"۔ [18]

حکیم صاحب مزید لکھتے ہیں: "اس زمانہ میں مولوی عبد الحق خلف مولوی فضل حق و مولوی سلطان حسن خان ابن مولوی احمد حسن خان رئیس بریلوی و صدر الصدور' نواب کلب علی خان کے ہم مکتب تھے"۔ [19]

یوں نہ صرف علامہ فضل حق بلکہ ان کی اولاد کے بھی نواحین رامپور سے قریبی تعلقات رہے۔ تذکرہ کاملان رامپور میں ہے کہ مولوی خلیل الرحمن سواتی نے نواب یوسف علی خان سے کہا کہ میں ہر جمعہ قرآن شریف

سے نکالتا ہوں یہ ذکر نواب صاحب نے مولوی فضل حق خیرآبادی سے کیا۔ انہوں (مولانا فضل حق) نے فرمایا کہ آپ ان سے فرمادیں کہ مجنون فلاسفہ کے اجزا تو قرآن سے نکال دیجیے۔ چنانچہ دوسری ملاقات میں یہی سوال کیا۔ مولوی خلیل الرحمٰن سواتی سخت پریشان ہوئے اور ان کو بھی معلوم ہوگیا کہ یہ اشارہ مولوی فضل حق کا ہے۔ اسی لیے ایک روز نواب صاحب کے سامنے مولوی فضل حق سے اصول میں گفتگو کرنے لگے۔ مولوی فضل حق کھینچ تان کر ان کو منطق میں پکڑ لائے اور بند کردیا۔ اسی روز مولوی فضل حق نے کتب اصول کو دیکھنا شروع کردیا"۔ [۳۰]

تذکرہ کاملان رامپور میں نواب فردوس مکان کے ایک اور استاد صاحب کا علامہ کے حوالے سے ذکر ملتا ہے جس کے مطابق "مولانا جلال الدین معقولی مرحوم استاد نواب غلہ مکان یوسف علی خان نہایت ذکی تھے اور مناظرہ میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ مولانا فضل حق خیرآبادی جو علوم عقلیہ میں ید طولیٰ رکھتے تھے' ان سے ہمیشہ مناظرہ علمی نہایت لطف کے ساتھ ہوا کرتا تھا اور بڑے بڑے علمائے مجلس مناظرہ میں حاضر رہتے"۔ [۳۱]

☆☆☆☆

● علامہ اور شیخ احمد عرب یمنی شروانی:

علامہ فضل حق خیرآبادی کے احباب میں ایک نام شیخ احمد عرب یمنی شروانی صاحب "لفحتہ الیمن" و "مناقب حیدریہ" وصدر مدرس مدرسہ عالیہ کلکتہ (ف 1256ھ/1840ء) کا ہے۔ شیخ احمد عرب اور علامہ کے درمیان گہرے روابط تھے۔ طرفین سے علمی وادبی تحائف کے تبادلے بھی ہوتے تھے۔

شیخ احمد عرب یمنی شروانی بارہویں صدی کے آخر میں یمن سے بغرض سیاحت ہندوستان میں آئے اور ہندوستان میں بے مثل ادیب تسلیم کیے گئے۔ آپ کی اکثر کلکتہ میں اقامت رہی تھی اور لکھنؤ بھوپال وغیرہ میں بھی ایک عرصہ گزارا۔

شیخ احمد عرب یمنی شروانی نے جب سلطان غازی الدین حیدر (ف 1827ء) کی تعریف وتوصیف میں ایک کتاب "مناقب حیدریہ" لکھی تو انہوں نے اس کتاب کا ایک نسخہ علامہ فضل حق خیرآبادی کی خدمت میں بھی بھیجا۔ علامہ نے رسید سے مطلع کیا اور شیخ یمنی کی تعریف اور کتاب کی تقریظ میں عربی زبان میں ایک خط اور ایک قصیدہ بھیجا جو میں سال لکھا۔ یہ دونوں تحریریں 20 ربیع الآخر 1236ھ/1821ء کی ہیں اور علامہ کی

بیاض میں محفوظ ہیں۔

اسی بیاض میں محفوظ خطوط کے مطابق علامہ فضل حق کے محب و رفیق خاص مولانا محمد فیض اللہ خان شریک کار سلطنت اودھ 19 جمادی الاول بروز جمعہ 1236ھ کو رئیس الوزراء دستور اعظم معتمد الدولہ کی ملاقات کو گئے۔ واپسی پر رات ہوگئی اور راستے میں ان کے حاسدین نے انہیں شہید کر دیا۔ علامہ اس حادثۂ فاجعہ سے سخت متاثر ہوئے اور ان کی یاد میں تین طویل مرثیے کہے۔ اپنے والد گرامی کو خط لکھا اور یونہی لکھنؤ میں شیخ احمد یمنی شروانی کو 19 جمادی الاخری 1236ھ کو ایک طویل خط لکھا۔ جس میں انہیں اعانت مظلوم کے لیے کہا۔ یونہی 10 شعبان 1236ھ کو مولانا خلیل الدین کاکوروی کو اسی حادثۂ فاجعہ پر اپنی قلبی کیفیت لکھی اور اس طویل خط کے آخر میں شیخ احمد یمنی کے لیے سلام لکھا نیز مولانا کاکوروی کے نام اپنے 5 ربیع الاول 1236ھ والے پہلے خط میں بھی شیخ احمد یمنی کا ذکر کیا ہے۔

نواب حسام الدین حیدر خان بہادر دہلوی (ف 1262ھ / 1846ء) شیخ احمد یمنی شروانی کے نام اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں: ''حسب الحکم رسالہ جناب فضیلت مآب الفائق علی الاماجد بحاسن افضالہ والسابق من الاقران بکرائم افعالہ الفاروق بین الباطل والحق مولوی محمد فضل حق دامت برکاتہم نویسانیدہ۔ لیکن ہنوز بحلل صحت مزین نگردیدہ۔ ہرگاہ بزیور تصحیح جناب موصوف کہ بآں معروف بحلی خواہد گشت' بخدمت اقدس ابلاغ خواہد شد۔''

ترجمہ: حسب ارشاد جناب فضیلت مآب' اپنی خوبصورت فضیلتوں کے اعتبار سے بزرگوں پر فوقیت رکھنے والے' اپنے عمدہ افعال کی بدولت معاصرین پر سبقت لے جانے والے' حق و باطل میں فرق کرنے والے' مولوی فضل حق دامت برکاتہ کا رسالہ لکھوایا گیا لیکن ابھی تک تصحیح کی پوشاک سے مزین نہیں ہوا۔ جناب موصوف اس کی تصحیح میں معروف ہیں۔ جیسے ہی زیور تصحیح سے مزین ہوگا خدمت اقدس میں پہنچا دیا جائے گا۔

مذکورہ بالا مختصر شواہد جہاں شیخ احمد یمنی شروانی اور علامہ کے تعلقات پر روشنی ڈالتے ہیں وہاں دہلی کے نواب حسام الدین حیدر خان بہادر کے دل میں علامہ کی قدر و منزلت کا بھی پتہ دیتے ہیں۔ یہ وہی نواب حسام الدین ہیں جو غالب کے خاص احباب میں سے تھے اور جن کا ذکر مرزا غالب نے علامہ فضل حق اور نواب امین الدین کے ساتھ کلکتہ میں کہی ہوئی اپنی مثنوی چراغ دیر میں کیا تھا۔

چو حرز بازوئے ایمان نویسم حسام الدین حیدر خان نویسم

☆☆☆☆

● علامہ اور مولانا مفتی خلیل الدین کاکوروی:

مولانا مفتی خلیل الدین خان (ف 1271ھ/1846ء) قاضی نجم الدین علی خان بہادر اشرف جنگ کے صاحبزادے، علم وفضل میں مشہور زمانہ اور علم ریاضی میں ماہر یگانہ تھے۔ گورنر جنرل کے یہاں شاہ اودھ کی طرف سے سفیر تھے۔

علامہ فضل حق اور مولانا کاکوروی میں گہرے روابط تھے۔ ان کے روابط کا آغاز 1236ھ کو ہوا۔ علامہ دہلی میں اور مولانا کاکوروی لکھنؤ میں تھے۔ علامہ کی عمر چوبیس سال تھی اور دونوں کو ایک دوسرے سے رابطے اور ملاقات کا شوق تھا۔ مولانا منشی غلام علی عمری اور شیخ احمد یمنی شروانی کی وساطت سے روابط کا آغاز ہوا اور پھر ایک سلسلہ چل نکلا۔ دونوں ایک دوسرے کو اپنا کلام بھجواتے اور اس سلسلہ کو منقطع نہ کرنے کا لکھتے۔

علامہ کی قلمی بیاض کے مطابق انہوں نے پہلا خط 5 ربیع الاول 1236ھ کو بھجوایا۔ مولانا کاکوروی نے 27 ربیع الثانی کو جواب بھیجا پھر 5 شعبان 1236ھ کو دوبارہ مولوی منشی غلام علی عمری کے ہاتھ علامہ کو خط بھیجا جس پر علامہ نے 10 شعبان 1236ھ کو جواب بھیجا۔ اس کے ساتھ چالیس اشعار پر مشتمل قصیدہ عمریہ بھیجا۔ اس خط میں نعت نبوی ﷺ پر مشتمل قصیدہ رائیہ اور شکوی پر مشتمل قصیدہ دالیہ بھیجنے کا بھی ذکر ہے۔

● علامہ اور نواب نقی علی خان:

نواب نقی علی خان وزیر سلطنت لکھنؤ کا نام بھی علامہ کے احباب میں آتا ہے۔ جن دنوں نواب صاحب لکھنؤ میں وزیر مقرر ہوئے انہیں دنوں علامہ وہاں "کچہری حضور تحصیل" کے مہتمم مقرر ہوئے۔

علامہ نے نواب صاحب کی مدح میں ایک قصیدہ بھی کہا جو طبع ہوا اور اب نایاب ہے۔ مفتی نجم الحسن کے مطابق اس کا ایک نسخہ ڈاکٹر حکیم انتظار حسین خیرآبادی کے پاس محفوظ تھا[۳۳] اور پروفیسر ایوب قادری کے مطابق اس کے قلمی نسخے بعض کتب خانوں میں محفوظ ہیں۔[۳۴]

علامہ فضل حق خیرآبادی کی جامع کمالات شخصیت اور ذکر کردہ اکابر کے ساتھ ان کے روابط اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ ان کا حلقۂ احباب اس سے کہیں زیادہ وسیع اور روابط کہیں گہرے تھے۔ اس لیے بھی کہ چوبیس سال کی عمر میں ان کے روابط دیگر علمی مراکز کے اکابرین وممتازین سے بھی پختہ ہو چکے تھے تو یقیناً بعد میں یہ حلقہ اور بھی وسیع ہو گیا ہوگا۔ علامہ کے تلامذہ کی طویل فہرست اور ان کے فتاوی پر علماء کی ایک بڑی

تعداد کے دستخطوں سے بھی یہی ثابت ہے کہ علامہ کے اپنے معاصرین سے روابط کے لیے معاصر تذکرے اور دہلی کے علماء وشعراء اور ادباء کے سوانح مزید حقائق منکشف کر سکتے ہیں۔

☆☆☆☆

﴿حوالہ جات﴾

۱ شفاعت مصطفیٰ، زیر بحث تحقیق الفتویٰ، ص:۲۵۰۔۲۳۷

۲ تحقیق الفتویٰ، مطبوعہ، ص:۲۶۶۔۲۶۷

۳ تاج المحول نمبر، ص:۳۲۱

۴ گنج آبنگ، ص:۳۵۶

۵ سیف الجبار، ص:۸۶تا۸۸

۶ المعتقد المنتقد، ص:۱۳۰۔۱۳۱

۷ باغی ہندوستان، ص:۱۷۵

۸ اکمل التاریخ، ج:۱، ص:۸۹

۹ تاج المحول نمبر، ص:۳۳۳۔۳۳۴

۱۰ کلیات منیر، بحوالہ باغی ہندوستان، ص:۱۶۰

۱۱ ایضاً، ص:۱۶۱۔۱۶۲

۱۲ علامہ کی بیاض، ص:۵۱تا۵۸

۱۳ اردو نثر کے ارتقاء میں علماء کا حصہ، ص:۹۶

۱۴ علم وعمل، ج:۲، ص:۱۸۵

۱۵ سیف الجبار، ص:۸۸تا۹۳

۱۶ مجموعہ مقالات از افضل قریشی، ص:۳۳۔۴۳

۱۷ ایضاً

۱۸ ایضاً، ص:۳۵

۱۹ مرقع فصیر تانی، ص:۳۱

۲۰ مجموعہ مقالات از قریشی، ص:۵۱

۲۱ ایضاً

۲۲ ایضاً، ص:۵۵۔۵۶

۲۳ خیرآباد کی ایک جھلک، ص:۵۹

۲۴ مجموعہ مقالات از قریشی، ص:۶۳

Nafse Islam
WWW.NAFSEISLAM.COM

علامہ مشاہیر کی نظر میں

﴿سرسید احمد خاں﴾

جناب مولانا مخدومنا مولوی فضل حق نور اللہ مرقدہ صحیح نکمالات صوری و معنوی' جامع فضائل ظاہری و باطنی' ملاذ علمائے فضل و افضال' بہار آرائی چمنستان کمال' مجلی ایک اصابت رائی مستقیم' زیبائی افکار رسائی' صاحب علم محمدی' مورد سعادات ازلی و ابدی' حاکم محاکم مناظرات' فرمان روائی کشور محاکمات' عکس آئینہ صافی ضمیری' وارث انعین بدھی و حریری' اسحی وقت' ولوزمی آوان' فرزدق عہد و ابید دوران' سہیل باطل و محقق حق مولانا فضل حق.....

زبان قلم نے ان کے کمالات پر نظر کر کے فخر خاندان لکھا ہے اور فکر دقیق نے جب سز کار کو دریافت کیا فخر جہاں پایا۔ جمیع علوم و فنون میں یکتائے روزگار ہیں اور منطق و حکمت کی تو گویا انہیں کی فکر عالی نے بنا ڈالی ہے۔ علمائے عصر بل فضلائے دہر کو کیا طاقت ہے کہ اس سرگروہ اہل کمال کے حضور میں بساط مناظرہ آراستہ کر سکیں۔

تہان کو ان کی فصاحت سے مرثیہ خوش بیانی اور امرء القیس کو ان کے افکار بلند سے دستگاہ و عروج معانی' الفاظ پاکیزہ ان کے رشک گوہر خوش آب اور معانی رنگین ان کے غیرت لعل ناب.....

☆☆☆☆

﴿اردو دائرہ معارف اسلامیہ﴾

وہ سرخیل علماء عصر تھے۔ منطق' حکمت' فلسفہ' ادب' کلام و اصول اور شعر و شاعری میں دست گاہ کامل رکھتے تھے۔ اعلیٰ درجے کے مدرس اور منطقی تھے۔ جن کی علمی شہرت کی وجہ سے دور دور تک کے طلبہ کھنچے چلے آتے تھے۔ ج

☆☆☆☆

﴿غلام نبی خاں﴾

مولوی فضل حق' پہ شخص رہنے والا خیر آباد کا تھا اور آدمی بڑا نامی گرامی اور علم و فضل میں علامہ' روزگار تھا کہ

ہندوستان میں مثل اس کے دوسرا ہم عصر کم ہوگا۔ ؎

☆☆☆☆

﴿سید رئیس احمد جعفری﴾

مولانا فضل حق خیرآبادی ایک یگانۂ روزگار عالم تھے۔ عربی زبان کے مانے ہوئے ادیب اور شاعر تھے۔ علوم عقلی کے امام اور مجتہد تھے اور ان سب خصائص سے بالا ان کی یہ خصوصیت تھی کہ وہ بہت بڑے سیاستدان، مفکر اور مدبر بھی تھے۔ مسند درس پر بیٹھ کر وہ علوم و فنون کی تعلیم دیتے تھے اور ایوان حکومت میں اپنی گرہ دور رس فیصلے کرتے تھے۔

مولانا کی شخصیت، سیرت، کردار اور علم و فضل پر ضرورت تھی کہ ایک مفصل کتاب لکھی جاتی، لیکن وہ ایک زود فراموش قوم کے فرد تھے، فراموش کر دیے گئے اور کچھ دنوں کے بعد لوگ حیرت سے دریافت کریں گے کہ یہ کون بزرگ تھے؟ ؎

☆☆☆☆

﴿پروفیسر ایوب قادری﴾

مولانا فضل حق مجلس علماء کے صدر نشین تھے۔ علم و فضل میں اپنی مثال آپ تھے۔ علوم معقول اور عربی شعر و ادب میں ان کا کوئی نظیر نہ تھا۔ اصحاب علم و فضل اور ارباب شعر و ادب دور دور سے اپنی تصنیفات، منظومات ان کی خدمت میں ارسال کرتے تھے۔ نامور علماء اپنی تصنیفات پر ان سے تقاریظ لکھواتے تھے۔ اس دور میں جو فتوے جاری ہوئے ہیں ان پر مولانا فضل حق کے دستخط ثبت ہیں۔ ؎

☆☆☆☆

﴿مولوی محمد ان علی﴾

مولوی فضل حق خیرآبادی عمری، حنفی ماتریدی، چشتی نے قرآن مجید چار ماہ میں حفظ کر لیا۔ تیرہ سال کی عمر میں فارغ التحصیل ہو گئے۔ علوم منطق، حکمت، فلسفہ، ادب، کلام، اصول اور شاعری میں اپنے ہم عصروں میں ممتاز اور اعلیٰ قابلیت رکھتے تھے۔ ان کی نظم چار ہزار اشعار سے زیادہ پر مشتمل ہوگی۔ دور دور کے شہروں سے طلبا آتے اور ان سے مستفید ہوتے۔ ؎

☆☆☆☆

﴿مولانا فقیر محمد جہلمی﴾

بڑے عالم فاضل، فقیہ، محدث خصوصاً علم ادب، لغت، حکمت و فلسفہ میں گویا امام و شیخ رئیس تھے۔ عربی و فارسی

میں نظم لائق اور نثر فائق کہتے تھے۔ ۷

☆☆☆☆

﴿عشرت رحمانی﴾

مولانا فضل حق حافظ قرآن اور عالم باعمل بزرگ تھے۔ مولانا کا خاندان تبحر علماء وفضلاء کا خاندان تھا۔ ان کے اجداد اس برصغیر کے نامی گرامی باوقار بزرگوں میں شمار ہوتے ہیں۔ جن کے فضائل و برکات سے ہند کا چپہ چپہ فیض یاب ہوا۔ مولانا اپنے عہد کے کامل ادیب اور پرگو شاعر تھے۔ وہ زیادہ تر عربی اور فارسی میں لکھا کرتے تھے۔ چنانچہ ان کے عربی فارسی اشعار کے دفاتر کے دفاتر اور عربی زبان میں سینکڑوں قصائد موجود ہیں۔ ۸

☆☆☆☆

﴿غلام رسول مہر﴾

مولانا ویسے تو علم و فضل کا دریا تھے لیکن عربی ادب اور معقول میں ان کا درجہ بہت بلند تھا۔ ۹

☆☆☆☆

﴿فضل حق قرشی﴾

سلسلہ خیرآباد کے حلقۂ درس مولانا فضل حق (1797ء/1861ء) معقولات اور عربی کے استاد تھے بلکہ معقولات میں تو آخری دور کے نامور مانے جاتے ہیں۔ حاضر، بال اور شاگرد بڑی تھے۔ ۱۰

☆☆☆☆

﴿خورشید مصطفیٰ رضوی﴾

وہ بڑے روشن دماغ اور بین الاقوامی مدت اور تحمل تھے۔ ۱۱

☆☆☆☆

﴿والد ابوالکلام آزاد﴾

میں نے ایسا خوش تقریر انسان عمر بھر نہیں دیکھا۔ ۱۲

☆☆☆☆

﴿ابوالکلام آزاد﴾

مولوی فضل حق فاضل بے مثل تھے۔ [13]

☆☆☆☆

﴿ضامن علی خاں﴾

ان کے بیرو کار ہندوستان میں ہر جگہ پھیلے ہوئے تھے۔ [14]

☆☆☆☆

﴿نادم سیتاپوری﴾

انقلاب سن ستاون سے پہلے دہلی کے ادبی فضا جن عناصر اربعہ سے ترتیب پارہی تھی۔ وہ بھی چار ہستیاں تھیں مولانا فضل حق خیرآبادی مفتی صدرالدین آزردہ مرزا غالب اور حکیم مومن۔ [15]

☆☆☆☆

﴿ڈاکٹر الف۔ د۔ نسیم﴾

مولانا فضل حق خیرآبادی نابغۂ روزگار تھے اور مختلف الانواع اور پہلودار شخصیت کے مالک تھے۔ وہ جہان علم و دانش اور فلسفہ و حکمت کے محرب کردار تھے۔ گلستان شعروادب کی نسیم و بہار بھی تھے۔ وہ علوم عقلی و نقلی کے ساتھ ساتھ علوم طریقت و ولایت کے رازدار بھی تھے۔ [16]

☆☆☆☆

WWW.NAFSEISLAM.COM

﴿مولوی عبدالقادر﴾

علوم عقلیہ میں ریاضی کے سواسلف کی یادگار ہیں۔ عربی ادب میں ابوالحسن تخلص ہیے ہیں۔ ان کی نثر مقامات حریری سے اور نظم دیوان متنبی سے ٹکر لیتی ہے۔ علاوہ علم کے جرأت و تہوری بھی رکھتے ہیں۔ [17]

☆☆☆☆

﴿مفتی انتظام اللہ شہابی﴾

فضل و کمال و علمی حیثیت سے علامہ جس قدر و منزلت کے شخص تھے اس کی نظیر ہندوستان میں مشکل سے ملے گی۔ علوم معقول کے تو امام تھے ہی علم ادب جو عربیت کا بڑا جوہر ہے اس میں وہ کمال پایا کہ عرب کے معاصر شعراء

سے گویا سبقت لے گئے۔ علامہ کو عربی نظم پر بڑی قدرت حاصل تھی۔ چار ہزار سے زائد اشعار کہے۔ علامہ عربی کے ساتھ فارسی میں بھی طبع آزمائی کرتے تھے۔ فارسی تخلص تھا۔ ۱۸

☆☆☆☆

﴿مولوی کریم الدین پانی پتی﴾

واضح ہو کہ یہ (مولوی فضل حق صاحب) فاضل اجل بزرگ عالم ہندوستان میں ہے۔ اس سے صدہا لوگوں کو فیض ہوا ہے اور صدہا فاضل اس کے شاگردوں میں ہیں۔ علوم عربیہ میں اس شخص کو بڑا رتبہ حاصل ہے خصوصاً علم منطق اور فلسفہ اس کے خدمت گاروں کو یاد ہے پھر ان کا کیا کہنا؟ میری زبان میں کہاں طلاقت اور قلم میں طاقت کہ اس کی تعریف لکھوں یا کچھ کہوں؟ قصیدہ دان کے زبان عربی اور فارسی کے مشہور و معروف ہیں۔ نثر عبارت اس طرح کی لکھتے ہیں کہ اچھے عرب کو ان کے مقابلہ کی طاقت نہیں۔ ۱۹

☆☆☆☆

﴿سید سلیمان ندوی﴾

مولانا فضل امام کے چالیس' صاحبزادہ اور شاگرد مولانا فضل حق صاحب خیرآبادی تھے جن کے دم عیسوی نے معقولات میں روح پھونکی کہ ہین سنائے وقت مشہور ہوئے۔ دیار اطراف سے طلبہ نے ان کی طرف رجوع کیا اور منطق و فلسفہ کو نئے طور سے ملک میں رواج دیا۔ ۲۰

☆☆☆☆

﴿محمد حسین خان شاہجہانپوری﴾

علامہ فضل حق بن فضل امام خیرآبادی وہ بڑے عالموں میں سے تھے۔ اعلیٰ علوم ادب اور نعت میں بلاشبہ شیخ الرئیس (بوعلی سینا) کی مثل تھے۔ ۲۱

☆☆☆☆

﴿علامہ مشتاق احمد نظامی﴾

آپ کی علمی و ادبی زندگی دیکھ کر بوعلی سینا' غزالی' رازی' ابوحنیفہ کی یاد تازہ ہوتی ہے۔ ۲۲

☆☆☆☆

﴿خلیق احمد نظامی﴾

مولوی فضل حق نے مختلف علوم میں خاص مرتبہ حاصل کیا تھا۔ یقیناً علم منطق میں ان کا علمی سرمایہ اجتہاد کے درجہ تک پہنچا ہوا تھا۔ ۳۳

☆☆☆☆

﴿جعفر تھانیسری﴾

علامہ فضل حق خیرآبادی افلاطون و سقراط و بقراط کی غلطیوں کی تصحیح کرنے والے تھے۔ ۳۴

☆☆☆☆

﴿روضۃ الادباء﴾

قصائد غرا آپ کے امراء القیس اور لبید کے قصائد پر فوقیت رکھتے ہیں نظم و نثر میں آپ کو اس قدر مہارت تھی کہ بلا مبالغہ شاید سلف و خلف میں چند آدمی آپ کے ہم پلہ ہوئے ہوں گے۔ ۳۵

☆☆☆☆

﴿عبدالحی لکھنوی﴾

الشیخ الامام العالم الکبیر العلامۃ فضل حق ..... احد الاساتذہ المشہورین لم یکن لہ نظیر فی زمانہ فی الفنون الحکمیۃ والعلوم العربیۃ ..... وفاق اھل زمانہ فی الخلاف والجدل والمیزان والحکمۃ واللغۃ وقرض الشعر وغیرھا ونظمہ یزید علی اربعۃ آلاف شعر ..... انتہ الطلبۃ للاشتغال علیہ من بلاد بعیدۃ فنزوس و الناد و الف واجاد وانہ شعر فائق ۳۶

☆☆☆☆

﴿ڈاکٹر ظہور احمد اظہر﴾

عالم من العلماء الربانیین المجاھدین فی شبہ القارۃ وراس ثوارھا المناضلین ضد الاحتلال البریطانی وھو الشیخ المجاھد فضل حق الخیر آبادی رحمہ اللہ والذی کان یقصد للافتاء فی جامع دھلی وکان یعتبر استاذاً وشیخاً لاھل شبہ القارۃ جمیعھم وینتھی الیہ السند فی المعقولات والمنقولات فی ھذہ الدیار وقد کان الشیخ من احدی اعداء

الاستعمار البريطاني الغاشم فقاد الثورة التي قامت في وجه الانجليز في سنة ١٨٥٧ م . فنفاه الانجليز الى جزائر اندمان ومات في المنفى وله شعر رصين وكتب حساب لعربية . الشيخ فضل حق الخير آبادي الزعيم المناضل والعالم الأممي والشاعر النابغة. ۲۷

☆☆☆☆

﴿ڈاکٹر سید محمد عبداللہ﴾

اللہ اللہ ہمارا معاشرہ بھی کیا منبع علم وتہذیب تھا۔ اس میں بسنے دیکھو آسمان فضیلت کا ماہتاب وآفتاب پاؤ گے۔ یہ وہ لوگ تھے جو جامع کمالات تھے ایک فقہ نہ تھے اور اطراف علم پر حاوی تھے۔ کمال میں دریا کی مانند وسیع مگر قلب میں تواضع کا وہ رنگ کہ غرور کو قطرۂ آشنا سمجھتے تھے۔ ایک ایک شخص قلزم علم وبحر بیکراں تھیں۔ وہ پورے آدمی ہوتے تھے۔ کتب بھی مدرسہ بھی خانقاہ بھی اور سیف بھی مگر ہائے زمانے نے وہ بساط الٹ ڈالی۔ وہ بزرگ تو کہاں سے آئیں گے اب ان کی منزلت جاننے والے بھی کم ہیں بہر حال علامہ فضل حق خیرآبادی بھی ان عالی مقام بزرگوں میں سے ایک تھے۔ ۲۸

☆☆☆☆

﴿پروفیسر یوسف سلیم چشتی﴾

جب تک فضل حق شامل نہ ہو انسان مولانا فضل حق کے مرتبہ سے آگاہ نہیں ہو سکتا۔ ۲۹

☆☆☆☆

﴿عبداللہ بلگرامی﴾

فضل ان کے کفن میں ملفوف اور علم ان کے ساتھ مدفون ہو گیا۔ ۳۰

☆☆☆☆

﴿حوالہ جات﴾

۱ تذکرہ اہل دہلی ص: ۱۳۰۔۱۳۱

۲ اردو دائرہ معارف اسلامیہ ج: ۱۵ ص: ۳۷۵

۳ تاریخ صحافت ص: ۲۱۲ بحوالہ مجموعہ مقالات ص: ۳۰

۴ بہادر شاہ ظفر اور ان کا عہد ص: ۸۵۴

۵۔ مولانا فضل حق خیرآبادی اور ملازمت بحوالہ مجموعہ مقالات از افضل قریشی، ص: ۲۵۔۲۶

۶۔ تذکرہ علمائے ہند، ص: ۱۶۴۔۱۶۵

۷۔ حدائق الحنفیہ، ص: ۳۷۴

۸۔ 1857ء کے مسلمان مجاہد، ص: ۷۵

۹۔ 1857ء کے مجاہد، ص: ۲۱۲

۱۰۔ علامہ فضل حق خیرآبادی اور جہاد آزادی، ص: ۱۱

۱۱۔ جنگ آزادی انڈمان سے ستاون، ص: ۴۵۸

۱۲۔ بہادر شاہ ظفر اور ان کا عہد، ص: ۸۲۹

۱۳۔ آب حیات، ص: ۴۶۱

۱۴۔ جنگ آزادی کے مسلم مجاہدین، ص: ۲۵۳

۱۵۔ غالب نامہ آدرم، ص: ۸۱

۱۶۔ مولانا فضل حق کی پہلو دار شخصیت: الہام، ص: ۱۱۰

۱۷۔ علم و عمل، ج: ۶، ص: ۲۵۵

۱۸۔ غدر کے چند علماء، ص: ۳۶

۱۹۔ تذکرہ فرائد الدہر، ص: ۳۰۶۔۳۰۷

۲۰۔ حیات شبلی، ص: ۳۲۔۳۳

۲۱۔ ریاض الفردوس، ج: ۱، ص: ۴۰

۲۲۔ خون کے آنسو، ص: ۶۰

۲۳۔ 1857ء کا تاریخی روزنامچہ

۲۴۔ حیات سید احمد، ص: ۳۰۴

۲۵۔ روضۃ الادباء، ص: ۱۲۸

۲۶۔ نزھۃ الخواطر، ج: ۷، ص: ۳۷۵

۲۷۔ مقدمہ دیوان فیض، ص: ۳۳۔۳۴

۲۸۔ شہید آزادی ایڈیشن ہفت روزہ "الہام" بہاولپور، ص: ۲۹

۲۹۔ مقدمہ شرح دیوان غالب، ص: ۱۶۱۔۱۶۲

۳۰۔ مقدمہ ہدیہ سعیدیہ

WWW.NAFSEISLAM.COM

تالیفات علامہ فضل حق

علامہ فضل حق خیرآبادی کی زیادہ تر تصانیف غیر مطبوعہ ہیں اور مرور زمانہ کے باعث ضائع ہونے کے قریب ہیں۔ خصوصاً علامہ کے ہاتھ کے تحریر کردہ نسخے اپنی قدامت کے باعث زیادہ بری حالت میں ہیں۔ بہر کیف مطبوعہ و غیر مطبوعہ تالیفات کا اجمالی ذکر یوں ہے۔

مطبوعہ تالیفات

❶ حاشیہ شرح سلم العلوم للقاضی مبارک گوپاموی: بزبان عربی در علم منطق

سلم العلوم ملا محب اللہ بہاری کی تالیف ہے۔ اس کی بہت سی شروحات ہیں۔ سب سے مشہور شرح قاضی مبارک گوپاموی کی ہے۔

علامہ کا دور کتابوں کے حواشی لکھنے کا دور تھا۔ حاشیہ سے صرف متن کی تشریح و تفسیر رفع اشکالات، تحصیل اجمال، توضیح مبہم ہی مقصود نہیں ہوتی تھی بلکہ بعض جگہ جگہ مولف و شارح سے اختلاف اور اس کے اقوال کی تردید و تصحیح بھی کرتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ہم علامہ کو شرح سلم العلوم کے اس حاشیہ میں بہت سے مقامات پر قاضی دانیال سے اختلاف کرتے اور ان کے اقوال کی تردید و تخلیط کرتے ہوئے بھی پاتے ہیں۔

ہم عصر مولوی کرامت الدین پانی پتی لکھتے ہیں: "یہ حاشیہ میں نے بھی مولوی نور الحق صاحب کے پاس دیکھا تھا بہت اچھا ہے۔ تفصیل اور تطویل بہت کی ہے باعث اس کا مختصر اور مطلب اور مستفید مصنف نہ کو کہا ہے"۔ [1]

علامہ کے اس حاشیہ کو بجا طور پر مسائل منطق کا انسائیکلوپیڈیا اور علوم عقلیہ کا فتاوی کہا جاتا ہے۔ یہ حاشیہ علامہ کی مایہ ناز تصنیف ہے۔ جزائر انڈیمان میں جلاوطنی کے زمانے میں علامہ سے کسی نے دریافت کیا کہ مولانا آپ ہندوستان میں کیا یادگار چھوڑ آئے ہیں؟ آپ نے جواب دیا کہ "دو یادگاریں چھوڑی ہیں۔ ایک فرزند عبدالحق ہیں اور دوسری یادگار قاضی کا حاشیہ"۔ [2]

اس حاشیہ کا قلمی نسخہ رامپور لائبریری میں 440 اور باقی پور مکتبہ میں 2317 اور 2315 کے نمبر پر محفوظ

ہے۔ یہ کتاب پہلی بار مطبع المطابع دہلی سے ربیع الاول 1317ھ / 1899ء میں چھپی اور یہ 487 صفحات پر مشتمل کتاب تھی۔ دوسری مرتبہ 28 رجب 1395ھ / 18 اگست 1975ء میں دارالعلوم ضیاء جمس الاسلام سیال شریف ضلع سرگودھا سے چھپی۔

☆☆☆☆

(12) الروض المجود فی تحقیق وحدۃ الوجود :زبان عربی در تصوف

علامہ کہتے ہیں کہ میں نے یہ رسالہ الحق کشف وشہود کے موقف کے اثبات میں بغیر سعی کبیار کے بڑی عجلت میں لکھا ہے۔ جب کہ علامہ محمد اقبال کے کلام کے شارح اور مجمر پروفیسر یوسف سلیم چشتی نے لکھا ہے کہ "علامہ خیر آبادی کے دلائل دیکھ کر نہیں لگتا کہ وہ وحدۃ الوجود کا قائل ہو گیا ہوں"۔ ؎

والد ابوالکلام آزاد مولانا خیر الدین دہلوی کہتے ہیں: علامہ کی وحدت الوجود پر تقریر اس قدر مشہور ہوئی کہ دور سے اہل علم اس کے سننے کے لیے آتے تھے۔ ؎

اس کا قلمی نسخہ رامپور لائبریری میں 394 کے نمبر سے محفوظ ہے۔ یہ کتاب پہلی مرتبہ 1313ھ میں مطبع مفید الاسلام حیدر آباد دکن سے طبع ہوئی۔ دوسری مرتبہ مکتبہ سبحانی ہند سے طبع ہوئی۔ تیسری مرتبہ مکتبہ قادریہ لاہور سے حکیم سید محمود احمد برکاتی کے اردو ترجمے اور علامہ محمد عبدالحکیم شرف قادری کے عربی زبان میں تعارف کتاب کے ساتھ طبع ہوئی۔

☆☆☆☆

(13) تحقیق الفتوی فی ابطال الطغوی :زبان فارسی در علم الکلام

یہ کتاب علامہ نے 18 رمضان المبارک 1240ھ میں شاہ اسماعیل دہلوی کی مشہور کتاب تقویۃ الایمان کے رد میں لکھی جو 15 محرم 1240ھ کو لکھی گئی تھی۔ علامہ محمد فضل حق خیر آبادی ہی وہ عالم دین ہیں جنھوں نے سب سے پہلے اس کتاب کا رد کیا۔ اور اس میں مسئلہ امکان وامتناع نظیر الٰہی اور مسئلہ شفاعت پر بحث کی۔

علامہ محمد عبدالحکیم شرف قادری نے اس کتاب کا اردو ترجمہ کیا اور مکتبہ قادریہ لاہور نے اس ترجمے کو مع متن فارسی کے 1399ھ / 1979ء میں شائع کیا۔ پھر دائرۃ المعارف الاسجدیہ مگھیرہ نے صرف اردو ترجمہ شائع کیا۔ تیسری مرتبہ المجمع الاسلامی مبارکپور انڈیا نے 1408ھ / 1988ء میں اس کا اردو ترجمہ شائع کیا اور شاہ عبدالحق محدث دہلوی اکیڈمی بندیال ضلع سرگودھا نے 1415ھ / 1994ء میں اسی ترجمہ کو شفاعت مصطفیٰ ﷺ کے نام سے

پر تحقیقی مرتبہ شائع کیا۔

☆☆☆☆

۵ امتناع النظیر: بزبان فارسی در علم الکلام

مولوی حیدر علی رامپوری ڈونگی نے ایک عرصے بعد مسئلہ امتناع النظیر پر شاہ اسماعیل دہلوی کی تائید میں غیر عالمانہ اور ناشائستہ انداز میں قلم اٹھایا اور علامہ فضل حق کی تصنیف "تحقیق الفتوی فی ابطال الطغوی" کے مقام ثانی کا رد لکھا جو کہ مسئلہ امتناع النظیر پر "تقویۃ الایمان" کی عبارات کے رد پر مشتمل ہے۔

اپنے اعتراضات میں مولوی حیدر علی رامپوری نے مولوی اسماعیل دہلوی کی حمایت میں یہ شعر بھی لکھا:

اهجو علما برانقیا وعند الله ذاک التقام

جس پر علامہ فضل حق نے فی البدیہہ ایک سو چودہ (114) اشعار پر مشتمل مولوی حیدر رامپوری اور مولوی اسماعیل دہلوی کی ہجو کہی جس کا مطلع یہ ہے:

کلامی فی حشا العادی کلام نوافذ مالہ منها التیام

اور مذکورہ بالا شعر کے جواب میں کہا:

اتمدح جاهلا شرا شقیا تدارکه من الله انتقام

اضاع العمر فی علوم ونوم ولم یک منه بالعلم اهتمام

فلم یحصل له صرف ونحو ولا علم الاصول ولا الکلام

علامہ کے ایک شاگرد (غالباً محمد ہدایت اللہ خان پوری) نے "امتناع النظیر" میں یہ قصیدہ، تحقیق الفتوی کے مقام ثانی کی عبارات اور مولوی حیدر علی رامپوری کے جوابات کو مرتب کیا اور ساتھ ہی مولوی رامپوری کی ذہنی سطح اور علمی معیار پر تنقید کرتے ہوئے مسئلہ امتناع النظیر کی شرح بھی کر دی۔

اس کتاب کا قلمی نسخہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے مکتبہ حبیب گنج میں محفوظ ہے۔ علامہ کے شاگرد مولانا ہدایت اللہ جونپوری کے ایک شاگرد سید سلیمان اشرف بہاری نے اس کی تحقیق کے بعد 20 اگست 1908ء میں جاوو پریس جونپور سے طبع کروایا۔ عرصہ دراز سے یہ کتاب بالکل نایاب تھی اب رمضان 1420ھ / دسمبر 1999ء میں مرکز تحقیقات اسلامیہ شادمان لاہور نے دوبارہ طبع کی ہے۔

☆☆☆☆

5 تقریر اعتراضات بر رسالہ تقویت الایمان: بزبان فارسی در علم الکلام

چند صفحات کا یہ رسالہ ان اعتراضات پر مشتمل ہے جو علامہ فضل حق خیرآبادی نے تقویۃ الایمان پر نوری تحریر کیے تھے۔ اصل تحریر کراچی کے رئیس الاطباء حکیم نصیر الدین مرحوم کی ملکیت تھی۔ اس کا اردو ترجمہ علامہ محمد عبدالحکیم شرف قادری نے کیا اور یہ پہلی بار 1399ھ/1979ء میں شاہ عبدالحق محدث دہلوی اکیڈمی بندیال ضلع سرگودھا سے تحقیق الفتویٰ فی ابطال الطغوی کے اردو ترجمہ شفاعت مصطفیٰ ﷺ کے آخر میں مع فارسی متن شامل اشاعت ہوا۔

☆☆☆☆

6 ہدیہ سعیدیہ: بزبان عربی در علم طبیعیات (فزکس)

ہدیہ سعیدیہ علم طبیعیات میں ایک بنیادی کتاب ہے۔ علامہ نے اس کا انتساب والی رام پور نواب محمد سعید خان اور ان کے بیٹے نواب یوسف علی خان کے نام کیا ہے۔ غالباً یہی وجہ تسمیہ بھی ہے۔

اس کتاب میں ایک مقدمہ اور تین اقسام (حصے) ہیں۔ مقدمے میں علامہ نے طبیعیات کے ان مسائل پر بحث کی ہے جو فلسفہ کے اعلیٰ ترین مباحث سے متعلق ہیں۔ پہلے حصے میں جس کو کئی ذیلی شاخوں میں تقسیم کیا گیا ہے' خصائص الاجسام پر بات کی گئی ہے۔ دوسرے حصے میں اجرام سماوی یعنی فلکیات پر بحث ہے' یہ حصہ بھی ذیلی شاخوں میں منقسم ہے۔ تیسرے حصے میں عنصریات پر بحث ہے۔ اس میں طبیعیات کی باقی ماندہ شاخیں زیر بحث آئی ہیں۔

علامہ فضل حق خیرآبادی نے زمین کے ساکن ہونے پر ایک مستقل رسالہ لکھنے کے علاوہ اس کتاب میں بھی اس کا ذکر کیا ہے۔ اس کے بعد چاروں عناصر کی باہم تبدیل پذیری اور باہم تحلیل پر بحث کی ہے۔ پھر دھواں' بخارات' ابر' بارش' اولے' گرج' بجلی' شہاب ثاقب' قوس قزح' ہالہ اور آندھی وغیرہ پر بحث کی ہے۔ ان مباحث کے بعد معدنیات کی بحث ہے اور پھر نباتات اور حیوانات کا بیان ہے۔ آخر میں علم نفسیات پر کچھ بحث ہے۔

علامہ کے فرزند مولانا عبدالحق خیرآبادی نے ھدیۃ الھدیہ کے نام سے اس کتاب کا تکملہ لکھا اور تتمہ نفس کو مکمل کیا۔ علامہ کے ایک اور شاگرد مولوی عبداللہ بلگرامی نے تحفہ علیہ کے نام سے اس کا حاشیہ لکھا۔

مفتی سعداللہ مرادآبادی (ف 1294ھ/1877ء) نے ہدیہ سعیدیہ پر بعض اعتراضات کیے تھے جس کے جواب میں علامہ کے ایک اور شاگرد مولوی سلطان حسن خان بریلوی نے ایک رسالہ لکھا جو انہیں دنوں علامہ کی حیات ہی میں چھپ گیا تھا۔ بعد میں ہدیہ سعیدیہ کے ساتھ شامل اشاعت ہوا۔ ڈاکٹر ایوب قادری اپنے مقالے

"مولانا فضل حق خیر آبادی 'دور ملازمت'" میں لکھتے ہیں: "یہ رسالہ مولانا فضل حق کی نظر سے گزرا ہے اور انہوں نے اپنے ایک خط مورخہ 10 ذی قعدہ 1265ھ بنام مفتی حسن بریلوی میں اس کا ذکر کیا ہے اور مولانا فضل حق کا یہ خط (خطی صورت میں) نیشنل میوزیم آف پاکستان کراچی میں محفوظ ہے"۔ [۷]

اسی طرح اہل حدیث عالم مولوی امیر احمد سہسوانی نے علامہ کی اس کتاب الہدیہ السعیدیہ وغیرہ پر دس اعتراضات 'فلک عشرۃ کاملۃ' کے نام سے ایک رسالے میں لکھے تھے اور مولوی سید محمد نذیر نے راہنما میں یہ رسالہ طبع کروایا تھا۔ مگر مرزا حیرت نے غلط بیانی کی اور لکھا "مولانا فضل حق کی علم و نثر پر مولوی امیر احمد صاحب مرحوم نے تیرہ سو اعتراضات کیے تھے اور مولانا سید محمد ابا پوری نے ان تیرہ سو اعتراضات کو ایک رسالے کی صورت میں مرتب کر کے اس کا نام "تیغ مجتبیٰ" رکھا"۔ [۸]

ڈاکٹر زید احمد نے اس کتاب کا تفصیلی تعارف کراتے ہوئے لکھا ہے: "یہ تصنیف طبیعیات کی ان نصابی کتب کا ایک عمدہ نمونہ ہے جن کی اساس ارسطاطیسی فلسفہ ہے"۔ رئیس احمد جعفری لکھتے ہیں: "یہ بے سعیدیہ مختصر ایک فنی کتاب ہے لیکن اس کی ایک ایک سطر مولانا کے ذوق ادب کی تصویر ہے۔ فقرے سانچے میں ڈھلے ہوئے نکلتے ہیں۔ الفاظ موتی کی طرح اپنی چمک دمک دکھاتے ہیں۔ انداز بیان کی فصاحت و بلاغت پر محسوس بھی نہیں ہوتے دیتی کہ ہم فلسفہ کے خارستان میں بادیہ پیمائی کر رہے ہیں بلکہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ گلستان ادب اور صدق معنی کے گلشت میں مصروف ہیں"۔ [۹]

یہ کتاب کئی بار طبع ہوئی۔ 1283ھ میں مطبع صدیقی بریلی سے اور 1288ھ اور 1292ھ میں کانپور سے چھپی جب کہ 1328ھ میں مطبع کتبخانہ دہلی سے مکملہ "منیہ" اور سلطان حسن بریلوی کے جوابی رسالہ کے ساتھ طبع ہوئی اور بعد میں بھی ہوتی رہی۔ یہ کتاب مصر سے بھی طبع ہوئی اور بیسویں صدی کے آغاز میں وہاں جامع ازہر میں پڑھائی بھی جاتی تھی [۱۰] پاکستان میں بریلی مدارس میں ابھی تک داخل نصاب ہے۔

اس کا قلمی نسخہ مکتبہ دار العلوم دیوبند میں 405 کے نمبر سے اور ساکی پور میں 2403 کے نمبر سے اور آصفیہ کتب خانہ میں 1216/2 کے نمبر سے محفوظ ہے۔

☆☆☆☆

[۹] اشاعۃ السنۃ: بزبان عربی در تاریخ

یہ کتاب 1857ء کی جنگ آزادی کا آغاز سے اختتام تک کا آنکھوں دیکھا حال اور تنقیدی جائزہ ہے۔ اس

کے علاوہ برصغیر کے عربی ادب کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ علامہ نے یہ کتاب جنگ آزادی کے بعد جزائر انڈیمان میں اپنی جلا وطنی کے زمانے میں لکھی اور اس کے ساتھ ہی اس موضوع پر عربی زبان میں تین قصیدے بھی لکھے۔ مولانا عنایت احمد کاکوروی جب انڈیمان سے رہا ہو کر واپس ہندوستان آئے تو یہ سب کچھ علامہ نے ان کے ہاتھ اپنے بیٹے مولانا عبدالحق خیرآبادی کو بھجوا دیا۔

یہ کتاب 1857ء کے جہاد آزادی پر پہلی کتاب تھی مگر انگریزی حکومت کے خوف سے کسی کو چھپانے کی جرأت نہیں ہوئی۔ تقریباً ایک صدی بعد عبدالشاہد خان شروانی نے دو قصائد اور الثورۃ الہندیہ کا اردو ترجمہ کیا اور پھر علامہ کے حالات زندگی پر مشتمل ایک مبسوط مقدمے کے ساتھ 1947ء میں مدینہ پریس بجنور سے "باغی ہندوستان" کے نام سے طبع کروایا۔

رئیس احمد جعفری نے اپنی کتاب "بہادر شاہ ظفر اور ان کا عہد" میں ان قصائد اور کتاب کے ترجمے کو شامل کیا پھر مولانا غلام رسول مہر نے الثورۃ الہندیہ کے ترجمے کو اپنی کتاب "دیوبندی مذہب" میں شائع کیا۔ مولانا پھر غلام رسول کلاوری ہی نے "الہوا قیت المہریہ" کے نام سے الثورۃ الہندیہ پر عربی میں حاشیہ لکھا اور 1964ء میں اس کو طبع کروایا۔

"باغی ہندوستان" یعنی الثورۃ الہندیہ کا اردو ترجمہ دوسری بار لاہور سے رمضان 1394ھ / اکتوبر 1974ء میں اور تیسری مرتبہ بھی لاہور سے رمضان 1398ھ / اگست 1978ء میں اور چوتھی بار المجمع الاسلامی مبارکپور انڈیا سے ذی القعدہ 1405ھ / اگست 1985ء میں چھپا۔

اس چوتھی طبع میں مترجم نے علامہ کے مقدمہ بغاوت کی تفاصیل اور علامہ کے مخالفین کے اعتراضات کے مدلل رد کا اضافہ کیا ہے۔ باغی ہندوستان کی پانچویں بار طباعت جمادی الاخری 1418ھ / اکتوبر 1997ء کو المستاز پبلی کیشنز لاہور سے ہوئی۔

ڈاکٹر سید معین الحق نے الثورۃ الہندیہ کا "The Story of the warof Independence" کے نام سے انگریزی ترجمہ کیا جو پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی کراچی نے اپنے جرنل کی جلد ۱۴ جزو نمبر 1 میں شائع کیا اور علیحدہ بھی شائع ہوا۔

1399ھ / 1979ء میں خواتین کالج انوار العلوم حیدرآباد کی لیکچرار محترمہ قمر النساء بیگم نے "الثورۃ الہندیہ" کو بطور مقالہ ڈاکٹریٹ ایلٹ کیا اور عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد سے ڈاکٹر محمد عبدالستار خان کی نگرانی میں مقالہ مکمل کر

کے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔ مکتبہ قادریہ لاہور نے رمضان 1406ھ/1986ء میں اس مقالے کو طبع کیا اور اس کے آخر میں علامہ کے عربی قصائد اور خطوط پر مشتمل ایک نامکمل بیاض کے قلمی نسخے کی نقل بھی طبع کی۔

الشورٰی الہندیہ کا قلمی نسخہ علی گڑھ یونیورسٹی کی لائبریری میں 136 کے نمبر سے محفوظ ہے۔[13]

☆☆☆☆

﴿غیر مطبوعہ تالیفات﴾

❽ حاشیہ الاتقی المعین: بزبان عربی در منطق

یہ علم منطق میں سید باقر داماد کی تصنیف پر حاشیہ ہے۔ اس کا قلمی نسخہ علامہ کے ہاتھ کا علی گڑھ یونیورسٹی میں 160/85 کے نمبر سے مولانا آزاد لائبریری' سبحان اللہ کلیکشن لٹن لائبریری میں محفوظ ہے' یہ نسخہ آخر سے ناقص ہے۔ اس کا ایک اور نسخہ شیخ معین الدین اجمیری رحمۃ اللہ علیہ کے کتب خانے میں ہے اور اس کا خط کافی صاف ہے۔ اس کی ایک نقل علامہ عبدالحکیم شرف قادری شیخ الحدیث جامعہ نظامیہ رضویہ لاہور کے پاس بھی ہے۔

☆☆☆☆

❾ حاشیہ تلخیص الشفاء: بزبان عربی در فلسفہ

ابن سینا کی تصنیف الشفاء کی مولانا فضل امام خیرآبادی نے تلخیص لکھی۔ اسی تلخیص پر علامہ فضل حق نے حاشیہ لکھا۔ ہدیہ سعیدیہ کے صفحہ 19 میں علامہ اس حاشیے کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں: "مسائل حکمیہ کے متعلق ہماری ذاتی تحقیق حواشی تلخیص الشفاء میں ہے"۔ اس کے کسی نسخے کا ذکر نظر سے نہیں گزرا۔

☆☆☆☆

❿ الجنس الغالی فی شرح الجواہر العالی: در فلسفہ و حکمت الٰہیہ

معاصر تذکرہ نگاروں نے ذکر کیا ہے لیکن کسی نسخہ کا مقام معلوم نہیں ہو سکا۔

☆☆☆☆

⓫ رسالہ تشکیک الماہیات: بزبان فارسی در علم منطق

اس کا قلمی نسخہ رضا لائبریری رام پور میں ہے۔

☆☆☆☆

⓬ رسالہ فی تحقیق الکلی الطبعی: بزبان عربی در علم منطق

یہ رسالہ باریک قلم سے پچیس صفحات پر تھا۔ اس کے کسی نسخے کے مقام کا علم نہیں ہو سکا مگر یا فی ہندوستان [۱۴] میں اس کے آغاز کی عبارت نقل کی گئی ہے۔

☆☆☆☆

⑬ رسالہ فی تحقیق العلم والمعلوم: بزبان عربی در علم منطق

اس کا قلمی نسخہ رضا لائبریری رام پور میں 392 کے فہرست نمبر سے محفوظ ہے۔

☆☆☆☆

⑭ رسالہ قاطیغوریاس: بزبان عربی در علم منطق

اس میں جوہر و عرض کی بحث ہے یہ 60 صفحات پر مشتمل ہے۔ رضا لائبریری رام پور میں محفوظ ہے۔

☆☆☆☆

⑮ رسالہ فی تحقیق حقیقۃ الاجسام:

اس کے کسی مخطوطے کا ذکر تو نہیں مل سکا البتہ "ہدیہ سعیدیہ" کے صفحہ نمبر 19 پر علامہ نے اس رسالے کا ذکر کیا ہے ﴿وللقوم فی هذا المقام اقوال قد فرغنا من ابطالها فی حواشینا علی تلخیص الشفاء ورسالتنا المعقودة فی تحقیق حقیقة الاجسام﴾

☆☆☆☆

⑯ رسالہ الٰہیات:

ڈاکٹر قمر النساء نے اپنے مقالے میں اس کا ذکر کیا ہے۔ [۱۵] ان سے پہلے رئیس احمد جعفری نے بھی ذکر کیا ہے۔ [۱۶] مگر ہر دو نے اس کی کوئی تفصیل نہیں دی۔

☆☆☆☆

⑰ الرسالہ فی رد علی القائلین بحرکۃ الارض:

اس کا ایک نسخہ برلن لائبریری میں فہرست نمبر 5114 سے محفوظ ہے۔ [۱۷]

☆☆☆☆

⑱ عربی شاعری:

علامہ فضل حق خیرآبادی کا عربی کلام چار ہزار سے زائد اشعار پر مشتمل ہے لیکن ابھی تک دیوان مرتب نہیں ہوا۔

اس کلام کے درج ذیل مجموعے دسترس زمانہ سے محفوظ ہیں۔

۱) نامکمل بیاض: علامہ کے کلام کا یہ مجموعہ علامہ کے ہاتھ کے لکھے ہوئے بعض عربی خطوط اور قصائد پر مشتمل ہے۔ اس میں ایک ہزار ستاون (1057) اشعار ہیں۔ یہ بیاض اب حکیم سید محمود احمد برکاتی (کراچی) کی ذاتی لائبریری میں ہے۔ اس بیاض کے قصائد کی ایک نقل کراچی کے مولانا ناظم ندوی مرحوم ۱۸ (سابق وائس چانسلر اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور) نے حکیم سید محمود احمد برکاتی کی خواہش پر کی۔ امتداد زمانہ کے باعث بیاض کرم خوردگی اور بوسیدگی سے دو چار ہے۔ بعض قصائد کو ان کے دقیق و شکستہ خط کے باعث پڑھنا انتہائی دشوار ہے غالباً اسی لیے مولانا ناظم ندوی نے غیر واضح اشعار نقل نہیں کیے۔ بیاض کی یہ نقل بہت مفید ہے اور حکیم محمود احمد برکاتی صاحب کے پاس محفوظ ہے۔

۲) علامہ کے عربی کلام کا ایک مجموعہ علامہ کے دو تلامذہ جناب جمیل احمد بلگرامی اور مفتی سلطان حسن بریلوی نے تیار کیا اور معانی کی شرح کی۔ ۱۹ غالباً یہی مجموعہ سید جمیل الدین احمد قادری ممبئی کے کتب خانے میں محفوظ ہے۔ اس میں ستر وہ اٹھارہ قصائد ہیں۔ ۲۰

۳) علامہ کے ان عربی قصائد کا ایک اور مجموعہ صاحب نزہۃ الخواطر جناب عبدالحی کے حکم پر ان کے بیٹے عبدالعلی نے اکٹھا کیا۔ ۲۱ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں محفوظ علامہ کا عربی کلام غالباً انہیں کا اکٹھا کیا ہوا ہے۔ ۲۲ آزاد لائبریری مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں 16 قصائد پر مشتمل دو مجموعے ہیں۔ ان میں اٹھارہ سو تراسی (1883) اشعار ہیں۔

۴) جزائر انڈیمان میں جلاوطنی کے زمانے میں علامہ نے جنگ آزادی 1857ء سے متعلق تین قصائد کہے۔ یہ "قصائد فتنة الهند" کے نام سے مشہور ہیں۔ یہ بھی آزاد لائبریری مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں محفوظ ہیں۔ ان میں سے قصیدہ مُحمریہ اور دالیہ باغی ہندوستان میں طبع ہوئے اور قصیدہ نونیہ علی گڑھ والے مجموعہ میں شامل ہے۔

۵) رضا لائبریری رامپور میں بھی ایک مجموعہ محفوظ ہے۔ اس کا نمبر 4414 ہے اور یہ 1343ھ کا تحریر کردہ ہے۔ غالباً 18X27 سائز کے چوالیس (44) صفحات پر مشتمل ہے۔

۶) مولوی شاہ ولایت احمد لاہر پوری کے کتب خانے میں دو بیاضوں کا ذکر ملتا ہے۔

۷) کتب خانہ مفتیان گوپاموی میں بھی کچھ کلام اصل مسودہ کے ساتھ موجود ہونے کا ذکر ملتا ہے۔ ۲۳

☆☆☆☆

حوالہ جات

۱ تذکرہ فرائد الدرر ص: ۲۰۷

۲ باغی ہندوستان ص: ۲۹۷۔۲۹۸

۳ ایضاً، ص: ۳۰۷

۴ بہادر شاہ ظفر اور ان کا عہد، ص: ۸۶۹

۵ حکیم صاحب کا 9 نومبر 1998ء کو انتقال ہوا۔

۶ شفاعت مصطفیٰ، ص: ۳۳۹ تا ۳۵۲

۷ مجموعہ مقالات از افضل قریشی، ص: ۳۹

۸ فضل حق خیرآبادی اور سن ستاون، ص: ۱۱۷

۹ ''عربی ادبیات میں برصغیر پاک و ہند کا حصہ از ڈاکٹر زبید احمد، ص: ۱۵۰۔۱۵۶

۱۰ بہادر شاہ ظفر اور ان کا عہد، ص: ۸۷۰

۱۱ باغی ہندوستان، ص: ۳۰۷

۱۲ علامہ نے اس تصنیف کا کوئی نام نہ رکھا تھا۔ پہلے یہ ''رسالہ غدریہ'' کے نام سے مشہور رہا اور پھر ''الثورۃ الہندیہ'' سے۔

۱۳ خیال رہے کہ جناب نادم سیتاپوری نے اپنی کتاب ''غالب نام آورم'' میں ص: ۱۲۳۔۱۲۴ پر الثورۃ الہندیہ اور قصائد فتنۃ الہند کے متعلق لکھا ہے کہ ''ان کی صحت یقیناً مشکوک ہو جاتی ہے اور یہ کہ انگریزی حکومت کے خوف سے ان کتابوں میں کچھ نہ کچھ تحریف ضرور کی گئی''۔ ڈاکٹر ایوب قادری نے اپنے مضمون ''جزائر انڈیمان و نکوبار میں مسلمانوں کی علمی خدمات'' ص: ۶۲ تا ۶۵ (درسہ ماہی ''اردو'' کراچی جنوری 1968ء) میں اس اعتراض کو بلا دلیل اور محض ظن و تخمین قرار دے کر رد کر دیا ہے اور اس کی صحت پر بہت سے دلائل دیے ہیں۔ یونہی جناب محمد عبد الشاہد شروانی نے بھی اس کا رد کیا ہے۔ دیکھیے ''باغی ہندوستان'' ص: ۲۷۹ تا ۲۸۱

۱۴ باغی ہندوستان، ص: ۳۰۸

۱۵ العلامہ فضل الخیر آبادی، ص: ۱۶۵

۱۶ بہادر شاہ ظفر اور ان کا عہد: ۸۵۶

۱۷ ڈاکٹر جمیل احمد نے تصانیف کے ضمن میں الکافی لحل ایسا غوجی بھی ذکر کی ہے جب کہ وہ علامہ فضل حق رام پوری کی شرح ہے۔ دیکھیے ان کی کتاب ''حرکۃ التالیف باللغۃ العربیہ'' ص: ۱۹۴ ''فضل التحیات فی مسالۃ الصفات'' مطبوعہ رامپور ۱۳۲۸ھ کو علامہ کی تصانیف میں سرِ فہرست رکھا ہے جب کہ ہم عصر تذکروں میں اس نام کی کسی تصنیف کا ذکر نہیں ملتا۔

۱۸ مولانا 9 جون 2000ء کو انتقال کر گئے۔

۱۹ ابجد العلوم، ص: ۲۵۳

۲۰ غالب نام آورم، ص: ۱۲۳

۲۱ نزھۃ الخواطر، ص: ۳۷۶

۲۲ صاحب نزھۃ الخواطر کا دیا ہوا نمونہ کلام اس بات پر دلالت کرتا ہے۔

۲۳ نادم سیتاپوری کے مطابق اس کتب خانے کا نام و نشان بھی باقی نہیں رہا۔ غالب نام آورم، ص: ۱۱۳

مجاہد جلیل علامہ فضل حق کی علمی، سیاسی اور مجاہدانہ زندگی کے چند گوشے

علامہ مشتاق احمد نظامی

رگ و پے میں جب اترے زہر غم تو دیکھے کیا ہے ؟

ابھی تو تلخی کام جگر کی آزمائش ہے

حضرت علامہ کا دور مسلمانوں کے حق میں بڑا ہی پرفتن دور تھا۔ 700 سال سے ہندوستان پر مسلمانوں کی حکمرانی تھی اور 300 سال سے سلاطین مغلیہ کا ڈنکا بج رہا تھا۔ لیکن 1757ء کی جنگ پلاسی کے بعد اسے گھن لگ چکا تھا۔ 1797ء میں جنگ میسور اور سلطان ٹیپو کی شہادت نے مسلمانوں کا حوصلہ پست کر دیا تھا۔ 1803ء میں فتح دہلی کے موقع پر لارڈ لیک کے معاہدہ سے اس کے خاتمہ کی نوبت آگئی تھی۔ رہی سہی شان وعزت 1806ء میں اکبر شاہ ثانی کی جاتی رہی۔ علماء اور اولیاء اسلام اپنی روحانیت اور علم وعمل کے ذریعہ استحکام سلطنت میں ہمیشہ پیش پیش رہے۔ ہندوستان کی سیاست میں علماء اسلام کا ہمیشہ سب سے بڑا ہاتھ رہا ہے۔ آخر دور میں حضرت مجدد الف ثانی سے لے کر مجاہد جلیل علامہ فضل حق خیرآبادی اور دوسرے مجاہدین ملت اور سرفروشان امت پیش پیش رہے ہیں۔

اک خونچکاں کفن میں ہزاروں بناؤ ہیں

پڑتی ہے آنکھ تیرے شہیدوں پہ حور کی

جس وقت علامہ دہلی سے بددل ہو کر جھجر، الور، ٹونک اور رام پور میں باعزت عہدہ سنبھالتے ہوئے 1848ء میں لکھنؤ حضور تحصیل کے مہتمم وصدر الصدور ہو گئے۔ بالاکوٹ کے حادثے نے قلب ودماغ پر بڑا اثر ڈالا تھا۔ لکھنؤ پہنچنے کے کچھ دن بعد ہی ہنومان گڑھی اجودھیا کا حادثہ فاجعہ پیش آگیا۔ وہاں کے مہنتوں نے مسجد میں اذان دینا روک دیا تھا اور کوئی بھولا بھٹکا مسافر اگر مسجد میں جا نکلتا تو مار پیٹ کر نکال دیا جاتا غرضیکہ جبر وظلم اپنے شباب پر تھا۔ 13 ذیقعدہ 1271ھ مطابق جولائی 1855ء شاہ غلام حسین اور مولوی محمد صالح اعلاء کلمۃ اللہ کی خاطر جہاد پر آمادہ ہو کر ہنومان گڑھی پہنچے۔ بیراگیوں سے مقابلہ ہوا' قرآن شریف پر ذرہ پڑ کر کے پاؤں سے مسلا گیا۔ جوتے پہن کر داخل مسجد ہو کر سنکھ (ناقوس) بجائے گئے۔ دوسو انہتر (269) مسلمان شہید ہوئے۔

اس خونی حادثہ پر مولانا شاہ امیر علی رحمۃ اللہ علیہ ساکن امیٹھی سے نہ رہا گیا اور مسلمانوں کو آمادہ جہاد کیا جب کہ پانی سر سے اونچا ہو چکا تھا۔ تب واجد علی شاہ والی لکھنؤ کو ہوش آیا۔ ان ہی دنوں حضرت علامہ فضل حق خیرآبادی مرد میدان ہو کر جہاد میں شریک ہوئے۔ لیکن حالات بد سے بدتر ہوتے گئے۔ رودولی جاتے ہوئے راہ میں 26 صفر 1272ھ مطابق 7 نومبر 1855ء بروز چہار شنبہ گوروں کی پلٹن نے گھیر کر مسلمانوں کو نماز ظہر با جماعت ادا کرتے ہوئے توپ کے گولوں سے شہید کر دیا جو بچ رہے تھے ان کا تعاقب راجہ شیر بہادر سنگھ کے آدمیوں نے دس بارہ کوس تک کر کے چھ سو آدمیوں کے سر اڑا دیے۔ "سر میداں کفن بر دوش دارم" مادہ تاریخ ہے۔

رسولی کے ایک مجذوب نے ﴿وانہ علی ذالک لشہید﴾ 1272ھ سے تاریخ نکالی ہے۔ اسلامی حکومت میں خاص اسلامی مسئلہ پر مسلمانوں کی اس بیدردی سے خونریزی۔

آسمان را حق بود گر خوں بیارد بر زمیں

آسمان تھرا اٹھا' زمین کو زلزلہ آ گیا' خدا کا قہر لارڈ ڈلہوزی کی شکل میں نمودار ہوا۔ دوشنبہ 4 فروری 1856ء کو جنرل اوٹرم ریذیڈنٹ' کپتان ہیز اور جنرل ویلہ گورنر جنرل کا عہد نامہ لے کر بادشاہ اودھ واجد علی شاہ کے پاس آیا اور معزولی کا حکم دیا۔ بادشاہ نے دستخط سے انکار کرتے ہوئے ہزار منت وسماجت کی اور لندن تک کوشش کی لیکن بے سود ثابت ہوئی۔ یہاں تک کہ کلکتہ لے جا کر میٹیا برج میں بند کر دیا۔ "لکھنؤ خراب شد و ادیا" تاریخ نکالی گئی غرضیکہ اس طرح والیان اودھ کی مدت وزارت 45 سال 3 ماہ 24 دن اور مدت بادشاہت 41 سال رہی اور والیان اودھ اپنے پیچھے عیش پرستی کی ہزاروں داستانیں چھوڑ گئے۔

سلطنت اودھ کی بربادی میں سب سے بڑا ہاتھ نواب میر علی نقی کا تھا۔ امین الدولہ کی معزولی کے بعد 19 رجب 1263ھ مطابق 9 جولائی 1847ء کو یہ وزیر اعظم بنائے گئے۔ اسی کی اندرونی سازش کی بنا پر واجد علی شاہ کو یہ روز بد دیکھنا پڑا۔

جنگ پلاسی 1857ء کے بعد میر جعفر نے شاہ عالم کے ساتھ بھی ڈرامہ کھیلا تھا اور اس طرح صوبہ بنگال ہاتھ سے نکل گیا۔ دکن میں میر صادق نے 1767ء میں شیر میسور سلطان ٹیپو کو دغا دے کر ہندوستان کی غلامی کا دائمی پٹہ انگریزوں کو لکھ دیا۔

جعفر از بنگال و صادق از دکن
ننگ آدم ننگ دیں ننگ وطن

خدا جانے میر علی نقی کو ڈاکٹر اقبال اس موقع پر کیوں بھول گئے؟

علامہ فضل حق کا بچپن، جوانی اور کہولت دہلی میں گزرے۔ آخر میں لکھنؤ پہنچے۔ وہاں کی حالت دہلی سے بدتر پائی۔ آخر الذکر نے الغیاثی ڈیوڈی تھی۔ مسجد ہنومان گڑھی شہید ہو گئی مجاہدین اسلام کفار کے ہاتھ خاک وخون میں تلتھر گئے۔ انہیں واقعات سے متاثر ہو کر علامہ فضل حق لکھنؤ چھوڑ کر 1856ء میں الور چلے گئے۔ مگر دل بے چین رہا کہ اتنے میں کچھ شورش اٹھتی نظر آئی۔ دربار دہلی سے راجاؤں کے نام خطوط بھی روانہ ہوئے۔ علامہ نے راجپوتانہ اور دیگر راجاؤں سے بھی گفتگو کی لیکن وہ سب ایک مرکز پر اکٹھا نہ ہو سکے۔ اب مذہب عیسوی کی نشر واشاعت نے فرنگیوں کو بالکل بے نقاب کر دیا تھا۔ کارتوسوں کی چربی سے دل کا غبار آتش فشاں پہاڑ بن کر پھوٹ پڑا۔ اس نے بارود پر فلیتہ (آگ) کا کام کیا۔ علامہ فضل حق الور سے نشر واشاعت کرتے ہوئے اگست 1857ء میں دہلی پہنچے۔ میرٹھ اور دوسری چھاؤنیوں میں کارتوسوں کا قضیہ زور پکڑ چکا تھا۔ گائے اور سؤر کی چربی کی آمیزش کی خبر سے ہندو اور مسلمان دونوں تو میں بھڑ اٹھی تھیں۔ میرٹھ سے دہلی پر باغی فوج نے 11 مئی 1857ء کو حملہ کر کے قتل وغارت گری کا بازار گرم کر دیا۔ بادشاہ دہلی سرگرمیوں کے مرکز بنے اور علامہ فضل حق بھی ان کے شریک مشورہ رہے۔ منشی جیون لال کا روزنامچہ 16 اگست 2، 6، 7 ستمبر 1857ء دیکھنے سے علامہ فضل حق کی باخبری وانقلابی سرگرمیوں کا اندازہ ہوتا ہے۔

آخر میں علامہ فضل حق نے ترکش سے حق تیر نکالا۔ بعد نماز جمعہ جامع مسجد میں علماء کے سامنے تقریر کی اور استفتاء پیش کیا۔ مفتی صدر الدین خاں "صدر امین" مولوی عبد القادر" قاضی فیض اللہ" مولانا فیض احمد بدایونی" وزیر خاں اکبر آبادی" سید مبارک حسین رام پوری نے دستخط کر دیئے۔ اس فتوے کے شائع ہوتے ہی ملک میں عام شورش بڑھ گئی اور دہلی میں 90 ہزار سپاہ جمع ہو گئی تھی۔ بادشاہ گرفتار کر کے قلعہ میں بند کر دیئے گئے۔ 3 شاہزادوں کو قلعہ میں داخل ہوتے ہی گولی کا نشانہ بنا دیا گیا اور ان کے سروں کو خوان پوش سے ڈھک کر خوان میں لگا کر بادشاہ کے سامنے بطور تحفہ پیش کیا گیا۔

علامہ دہلی سے 26 ستمبر 1857ء کو روانہ ہو گئے تھے۔ 19 ستمبر 1857ء کے بعد ہندوستانیوں پر مصائب کے جو پہاڑ ٹوٹے اس کی نظیر تاریخ میں مشکل سے ملے گی۔ جن مظالم کو لکھتے ہوئے دل لرزتا" سید قلم شق اور جگر قرطاس پارہ پارہ ہوتا ہے۔ زندہ مسلمانوں کو سؤر کی کھال میں سلوا کر کڑاہ میں ڈلوانا۔ فتح پوری مسجد سے قلعہ کے دروازے تک درختوں کی شاخوں پر مسلمانوں کی لاشوں کو لٹکانا" مساجد کی بے حرمتی" جامع مسجد دہلی کے حجروں میں گھوڑوں کا باندھنا" حوض میں وضو کے پانی کی جگہ گھوڑوں کی لید ڈلوانا" ناقابل معافی وغیر ممکن تلافی جرم ہیں۔ اب

قتل و غارت گری کا بازار گرم ہو چکا تھا۔ علامہ فضل حق کو بھی باغی قرار دیا گیا۔ اسیر فرنگ ہو کر بند ہوئے 1275ھ مطابق 1858ء میں لکھنؤ کی عدالت میں مقدمہ چلا۔ علامہ کے ثبات و استقلال صداقت و حقانیت' بلند ہمتی و شیر دلی کے لیے سیر العلماء وغیرہ کی عبارتیں کافی ہیں۔

1859ء میں فتوی جہاد کی پاداش یا جرم بغاوت میں مولانا فضل حق ماخوذ ہو کر بیتا پور سے لکھنؤ لائے گئے اور مقدمہ چلایا گیا۔ جج بار بار روکتا تھا مولانا آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ مگر مولانا کے شان و استقلال پر قربان جائیے خدا کا شیر گرج کر کہتا ہے کہ وہ فتوی صحیح ہے اور میرا ہی لکھا ہوا ہے اور آج اس وقت بھی میری وہی رائے ہے۔ مولانا کے اقرار و تحقیق کے بعد اب گنجائش ہی کیا باقی رہ گئی تھی؟ چنانچہ عدالت نے حبس دوام بعبور دریائے شور (کالا پانی) کا حکم سنایا۔ علامہ نے بکمال مسرت و خندہ پیشانی سے اس سزا کو قبول فرمایا۔

یہی وہ جہاد جلیل ہے جس نے سرزمین ہند پر آزادی کی داغ بیل ڈالی۔ بالآخر علامہ فضل حق جزیرہ انڈمان روانہ کر دیے گئے اور ادھر مولانا عبدالحق مولوی شمس الحق' مفتی انعام اللہ خاں اور خواجہ غلام غوث وغیرہ نے میر عشق لیفٹیننٹ مقربل کی معاونت سے اپیل داخل کر دی۔ علامہ کے جزیرہ انڈمان پہنچنے سے پہلے ہی مفتی مظہر کریم اور دوسرے مجاہد علماء وہاں پہنچ چکے تھے۔ ان حضرات نے وہاں بھی تصنیف و تالیف کا سلسلہ جاری رکھا۔ مفتی عنایت احمد نے علم طب پر جیسی فنی صرف کی منفرد کتاب جو آج تک داخل نصاب ہے وہیں لکھی۔ تاریخ عجیب الذ بھی جزیرہ انڈمان میں لکھی گئی اور یہی اس کا تاریخی نام ہے۔ علامہ فضل حق نے بھی کئی منفرد تصانیف لکھیں۔ علامہ اور ان کے ساتھیوں کو جزیرہ انڈمان میں کیا کیا تکلیفیں جھیلنی پڑیں اور انھیں کیسے ذلت آمیز برتاؤ سے سابقہ رہا۔ ان سب کا تذکرہ علامہ کے رسالہ "الثورۃ الھندیہ" میں موجود ہے۔

مولانا فضل امام کا وہ جنازہ جو کبھی ہاتھی اور پالکی پر بیٹھ کر باپ کی آغوش محبت میں درس پاتا تھا۔ آج وہی جزیرہ انڈمان میں اپنے سر پر توکرا اٹھا رہا ہے۔ جس کو دیکھ کر بعض اگریز بھی آنکھوں سے آنسو بھر لائے۔ ادھر علامہ کے صاحبزادے مولوی شمس الحق اور خواجہ غلام غوث وغیرہ رہائی کی سعی میں جان توڑ کوشش کر رہے تھے یہاں تک کہ مولوی شمس الحق صاحب پروانہ رہائی حاصل کر کے جزیرہ انڈمان روانہ ہو گئے۔ وہاں جہاز سے اتر کر شہر گئے تو ایک جنازہ پر نظر پڑی جس کے ساتھ بڑا ہجوم تھا۔

عاشق کا جنازہ ہے ذرا دھوم سے نکلے

دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ کل 12 صفر 1308ھ / 1861ء کو علامہ فضل حق کا انتقال ہو گیا اور اب سپرد

خاک کرے جا رہے ہیں۔ ﴿انا للہ وانا الیہ راجعون﴾

مولوی فضل الحق بھی بعد حضرت دیاس شریک جنازہ ہوئے اور بے نیل و مرام لوٹے۔

قسمت کی بد نصیبی کہاں لوٹی ہے کمند

دو چار ہاتھ جب کہ لب بام رہ گیا

افسوس ہمیشہ کے لیے آفتاب علم و عمل دیار غربت میں غروب ہو گیا۔ اب تک مرزا مبارک مرجع انام و زیارت گاہ خاص و عام ہے اور آج بھی قبر مبارک زبان حال سے کہہ رہی ہے۔

فانظر وا بعدنا الی الآثار

انسانیت مولانا فضل حق کے نام پر جس قدر بھی آنسو بہائے کم ہے۔ ایک طرف مولانا فضل حق کی تاریخ دیکھیے کہ انگریزوں کے جور و ظلم سے سینہ چھلنی ہو گیا تھا اور دوسری طرف مولوی اسماعیل دہلوی کی تاریخ دیکھیے کہ اس کی جنگ میں شریک ہونے کے لیے مسلم ملازمین کو حکومت کی طرف سے رخصت ملتی تھی۔ علامہ کے ساتھ وہ ظلم و ستم اور مولوی اسماعیل دہلوی کے ساتھ کہاں یہ مروت و رعایت؟ اب اس کا فیصلہ ناظرین کے ہاتھ ہے کہ انگریزوں کا پٹھو کون تھا؟ وہ فضل حق جو انگریزوں کے خلاف فتویٰ جہاد دے کر مسلمانوں کو آپے سے اتنا زندگی دینا چاہتا تھا یا وہ مولوی اسماعیل دہلوی جس نے کلکتہ جامع مسجد کی تقریر میں یہ کہا تھا کہ انگریزوں پر اگر کوئی حملہ آور ہو تو اس سے پہلے ہم جنگ کریں گے تاکہ انگریز سرکار کے دامن پر کوئی آنچ نہ آسکے اور اسی انگریز سپاہ کے لیے مولوی رشید احمد گنگوہی نے کہا تھا کہ "انگریزوں کا زمانہ غنیمت کا زمانہ ہے"۔

کاش اب بھی میرے احباب علامہ فضل حق کی تاریخ پر نظر ثانی کرتے اور ان کے اس احسان عظیم کے سامنے اپنی گردنیں جھکا کر تاریخ کا صحیح جائزہ لیتے۔ علامہ مرحوم پر غبار ڈالنے کی ہزار ہا کوشش کریں مگر زندہ و جاوید ہستی کا نام صفحات تاریخ سے کبھی نہیں مٹ سکتا۔ بالفرض تاریخ کو نذر آتش بھی کر دیا جائے تو انسانی قلوب سے علامہ کی عظمت و عقیدت کو کون چھین سکتا ہے؟ جب تک اس آسمان کے نیچے اور سطح زمین پر انسان کی آبادی ہے اس وقت تک علامہ فضل حق کے فضل و کمال کا پرچم لہراتا رہے گا۔

زندہ ہو جاتے ہیں جو مرتے ہیں حق کے نام پر

اللہ اللہ موت کو کس نے مسیحا کر دیا

مجاہد جلیل حضرت علامہ فضل حق خیرآبادی کی علمی وجہادانہ زندگی کی یہ ایک مختصر وتمام داستان عبرت ہے جس میں علامہ کے مختلف گوشہ ہائے زندگی کے اجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ وہ فضل حق جس کی تصانیف درس نظامی میں داخل کیے جانے کے قابل ہیں۔ کتب معقولات پر جس کے شروح وحواشی کو علماء اپنی آنکھوں سے لگاتے ہیں۔ ہندوستان کے مانے ہوئے شاعر مرزا غالب نے شعر وسخن میں جس کی اصلاح کو قبول کیا ہو۔ سرسید احمد خاں بانی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ وہ دیگر فاضل معاصرین نے جس فضل حق کو وقت کا امام وپیشوا سمجھا ہو۔ نواب یوسف علی خاں والی رامپور نے جس سے شرف تلمذ اختیار کیا اور مخلصانہ علامہ بھی آپ کے سپرد کر دیا ہو۔ نواب کلب علی خان نواب رامپور نے جس کی شاگردی پر فخر کیا ہو۔ دہلی سے رواں کے وقت سلطنت مغلیہ کے آخری تاجدار مرزا ابوظفر بہادر شاہ ظفر نے علامہ کو اپنا دوشالہ اوڑھا دیا اور وقت رخصت آبدیدہ ہو کر کہا چونکہ آپ جانے کو تیار ہیں میرے لیے بجز اس کے کوئی چارہ نہیں کہ میں بھی اس کو منظور کر لوں مگر خاطر نشیں ہے کہ لفظ وداع زبان پر لانا دشوار ہے۔ مرزا غالب نے بھی اپنے خط میں اس المناک دردفراق کا تذکرہ کیا ہے۔ واحسرتا! کہ آج اسی فضل حق کے دامن علم وادب پر علماء دیوبند کیچڑ اچھال رہے ہیں اور صفحات تاریخ سے اس مرد مجاہد کا نام مٹا دینا چاہتے ہیں۔

کہاں حضرت علامہ فضل حق کا علمی رعب اور کہاں مولوی اسماعیل دہلوی جن پر خود علماء دیوبند نے 'جاہل' 'ظلمۃ' زندیق اور دین سے بے بہرہ ہونے کا فتویٰ دیا ہے۔ مگر افسوس! کہ آج مولوی اسماعیل دہلوی کی تقویۃ الایمان جس کا ہر صفحہ توہین نبوت وتنقیص انبیاء سے بھرپور ہے اس کو تو عین اسلام سمجھا جا رہا ہے اور حضرت علامہ کی تصانیف جن کی ہر ہر سطر میں علم وفن کے سینکڑوں نکات ہیں ان سے بے اعتنائی کا یہ عالم ہے کہ سطر تاریخ پر مصنف کا نام تک دیکھنا گوارا نہیں۔ سید ان جہاد کا وہ سپہ سالار اعظم جس کو آزادی ہند کی خاطر گھر سے بے گھر ہونا پڑا؟ انگریز دشمنی میں جس کو جزیرہ انڈمان کی ناقابل برداشت سزا دی گئی انگریز جیسے ظالم وسنگدل بھی جس عالی مرتبت ہستی کو دیکھ کر آبدیدہ ہو گئے۔

؎ بے ساختہ آج ان کے بھی آنسو نکل آئے
دیکھا نہ گیا حال فقیرانہ کسی کا

علماء دیوبند کی نظر میں وہی فضل حق انگریزوں کا پٹھو ہے اور مولوی اسماعیل دہلوی جس نے انگریز دوستی میں ہزاروں مسلمانوں کا خون پانی کی طرح بہا دیا اور جس کے دامن پر نہ جانے کتنے بے گناہوں کے خون کی چھینٹیں ہیں۔ اسی خون آلودہ دامن کو علماء دیوبند اپنے پروپیگنڈے اور زور قلم سے پاک وصاف کرنا چاہتے ہیں۔ مگر یہ راز

سرِ بستر اس وقت عیاں ہوگا جب قاتل خود ہی میدان قیامت میں یہ کہتا ہوا اٹھے گا

دامن کو لے ہاتھ میں کہتا تھا یہ قاتل

کب تک اسے دھویا کروں لالی نہیں جاتی

ناظرین کی انصاف پسند نگاہ پر اعتماد و بھروسہ ہے کہ آپ حضرات نے اس مختصری تحریر کے بعد اپنے قلب و ضمیر کا فیصلہ حاصل کر لیا ہوگا کہ مولوی اسماعیل دہلوی کی جنگ زرگری کو حضرت علامہ فضل حق کی تحریک جہاد سے کوئی واسطہ اور نسبت نہیں۔ مولوی اسماعیل افغانی پٹھانوں سے جنگ کر رہا تھا اور انگریز جہاد اور یہاں سے 7 ہزار کی ہنڈی بھیج رہا تھا اور حضرت علامہ جیسی بلند پایہ شخصیت انجزیرہ انڈمان میں کسمپرسی کے عالم میں عزم و استقلال کی ایک تاریخ مرتب کر رہی تھی۔

بے دونوں اپنے پیچھے ایک تاریخ چھوڑ گئے مگر فرق اتنا ہے کہ مولوی اسماعیل کی تاریخ نے اقوام عالم کے سامنے قوم مسلم کی گردن جھکا دی اور حضرت علامہ فضل حق کی تاریخ نے جاری علمی و قومی تاریخ کو سرفرازی بخشی۔

حضرت علامہ کی زندگی کے دو اہم پہلو ہیں۔ آپ کی علمی و ادبی زندگی دیکھ کر بوعلی سینا' غزالی' رازی' ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہم کی یاد تازہ ہوتی ہے اور آپ کے مجاہدانہ کردار سے حسین ابن علی رضی اللہ عنہما کی مظلومیت کی خونی داستان آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے۔ جیسے امام حسین رضی اللہ عنہ کے بچپن میں پیغمبر ﷺ جبریل امین علیہ السلام سیدنا علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ اور سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا نے ناز برداری کی مگر عمر کی آخری ساعت میں نبی ﷺ کا لال مسافرت اور پردیس میں بے یار و مددگار شہید کیا گیا۔

بنا کردند خوش رسمے بخاک و خون غلطیدن

خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را

ایسے ہی فضل امام کا شہرہ و فضل حق جو ہاتھی و ہاتھی میں پلتا تھا۔ جو والیان ریاست' شہنشاہ وقت کا مخدوم اور پیارا تھا' جو آسمان علم و ادب کا روشن ستارہ اور چمنستان علم و حکمت کا شاداب پھول تھا' وہ عمر کی آخری ساعتوں میں آزادی ہند کی خاطر کسمپرسی کے عالم میں شہید کیا گیا۔

ایسے ہی خیال فرمایئے کہ دریائے شور کو میدان کربلا سے کتنی مناسبت ہے۔ وہاں دریائے فرات پر پیاسی پہرے بٹھا دیے گئے تھے اور یہاں فطرت نے خود پہرہ بٹھا دیا ہے اور تاریخ کی اس مطابقت پر تو سر دھننے کو جی چاہتا ہے کہ جس طرح مسلم ابن عقیل کی کوفہ میں جس دن شہادت ہوتی ہے اسی دن حسین ابن علی رضی اللہ عنہما کی کہ

کمر مے کو ذرہ اگی ہوتی ہے۔ ایسے ہی مولانا شمس الحق جس دن جزیرہ انڈمان میں پروانہ رہائی لے کر پہنچے ہیں تو سب سے پہلے باپ کے مزار پر نگاہ پڑتی ہے۔ شاید اسی موقع کے لیے شاعر نے کہا ہے

اے مالک تحریر یہ تقدیر ہے کیسی
راہوں میں مری آکے قضا کھیل رہی ہے

اے پروردگار عالم! جب تک آسمان کے ستاروں میں چمک اور مرغزاروں میں کوئل کی ترنم ریز صدائیں گونج رہی ہوں اے کائنات کے پالنہار! جب تک سمندر کی روانی اور سطح سمندر پر مچھلیوں کا کھیل کود ہو اے خالق کائنات! جب تک کائنات کی چہل پہل اور گہما گہمی لیل و نہار ہو تو کے رب کریم! جب تک چمن گلشن میں کلیوں کی مسکراہٹ اور پھولوں کے حسین قہقہے پر تتلیوں کی نوائنگی ہو اس وقت تک امام المنطق والفلسفہ مجاہد جلیل علامہ فضل حق خیرآبادی رحمۃ اللہ علیہ کی قبر مبارک پر ترے محبوب کے پھولوں کی بارش ہو آمین

ابر رحمت ان کے مرقد پر گہر باری کرے
حشر میں شان کریمی ناز برداری کرے

بطل حریت

علامہ فضل حق خیرآبادی کی سیاسی بصیرت

مولانا محمد وسایا الخطیب

مولانا محمد وسایا بن غلام محمد 3 مارچ 1941ء کو میانوالی کی گوٹھ موسیٰ خیل میں پیدا ہوئے۔ 1969ء میں مدرسہ انوار العلوم ملتان سے دستار فضیلت حاصل کی۔ آپ کے اساتذہ میں غزالی زماں علامہ سید احمد سعید کاظمی اور شیخ القرآن علامہ غلام علی اوکاڑوی جیسی شخصیات شامل ہیں۔ روحانی تعلق پیر سید محمد شریف چشتی دندہ شاہ بالا سے تھا۔ تحریک ختم نبوت 1974ء اور تحریک نظام مصطفیٰ ﷺ 1977ء میں آپ نے نمایاں خدمات سرانجام دیں۔ 1983ء میں جماعت اہلسنت کراچی کے صدر بھی رہے۔ آپ جامع مسجد محبوب کے خطیب اور دارالعلوم فیض نبوی کے بانی مبانی تھے۔ آپ کا وصال 27 ستمبر 2003ء کو ہوا۔

ہندوستان کی صدسالہ مکمل غلامی میں کتنی مرتبہ مسلمانوں پر مصائب و شدائد کے پہاڑ توڑے گئے اس کا اندازہ فرمایئے کہ اسی حکومت برطانیہ کے ہاتھوں سرزمین حجاز و شام کے ٹکڑے ہوئے، اسی کے ہاتھوں ترکی کا سربراہ گرفتار ہوا، اسی نے قبلہ اول بیت المقدس جیسے پاک خطہ کو ناپاک بنانے کی سازش کی، اسی کی بدولت ترکی اور عرب کے مسلمانوں پر ہندوستانی فوجوں نے گولیاں چلائیں۔ مسجد قوم کی بربادی کی ذمہ دار بھی یہی بدنام حکومت تھی۔ الڈونیشیا اور زیرستان پر بمباری و فوج کشی کرنے والی یہی حکومت تھی۔ خلافت کی چادر کے ٹکڑے اسی دولت برطانیہ نے کیے تھے۔

ان تمام دردناک مصائب کے باوجود ہندوستان کا مسلمان عیش پرست و جاہ پسند طبقہ سراسر خواب غفلت میں سوتا رہا بلکہ ظلم کی انتہا ہے کہ مسلمانان ہند اور مقامات مقدسہ کے مسلمانوں کے سینوں کو چھلنی کرانے کے لیے رنگروٹوں کی بھرتی کرائی۔ حیثیت سے زیادہ حکومت برطانیہ کو چندے دیے اور اس طرح وفاداری کا پورا پورا مظاہرہ کیا۔ اس کے عوض بڑے بڑے عہدے اور خطابات حاصل کیے اور انعام میں جاگیریں پائیں۔ علامہ فضل حق خیرآبادی رحمۃ اللہ علیہ کی سیاسی بصیرت اور فطری فہم و فراست کا اندازہ رسالہ "الثورۃ الہندیہ" سے لگایئے۔

علامہ نے اس میں بتایا ہے کہ ہندوستان پر تسلط کے بعد انگریز بقاء سلطنت کے لیے دو اکیسوں پر عمل کرنے کی تدبیریں سوچ رہا تھا۔ اول یہ کہ پچھلے زمانہ کے علوم و معارف اور مدارس و مکاتب اسلامیہ مٹانے کے بعد سکولوں کی یکساں تعلیم کا رواج جس سے ہر مذہب وملت کے افراد ایک ہی رنگ میں رنگے جائیں۔ دوم یہ کہ غلہ پر کنٹرول کر کے خدا کی مخلوق کو سر جھکانے پر مجبور کر دیا جائے۔

چنانچہ علامہ لکھتے ہیں: "انگریزوں نے اچھی طرح سمجھ لیا تھا کہ مذہبی بنیاد پر فرقوں کا اختلاف تسلط و قبضہ کی راہ میں سنگ گراں ثابت ہوگا اور سلطنت میں انقلاب پیدا کر دے گا۔ اس لیے پوری تندہی اور جانفشانی کے ساتھ مذہب وملت کو مٹانے کے لیے طرح طرح کے مکر و حیلہ سے کام لینا شروع کیا۔ انہوں نے بچوں اور ناسمجھوں کی تعلیم اور اپنی زبان و مذہب کے لیے شہروں اور دیہات میں مدرسے قائم کیے۔ پچھلے زمانہ کے علوم و معارف اور مدارس و مکاتب کے مٹانے کی پوری کوشش کی۔

دوسری ترکیب یہ سوچی کہ مختلف طبقات پر قابو اس طرح حاصل کیا جائے کہ زمین "نمبر کے غلہ کی پیداوار کاشتکاروں سے خرید کر نقد دام ادا کیے جائیں اور ان غریبوں کو خرید و فروخت کا کوئی اختیار نہ دیا جائے۔ اس طرح ذرع کے گھٹانے اور بڑھانے اور منڈیوں تک اجناس پہنچانے اور نہ پہنچانے کے خود ہی ذمہ دار بن بیٹھے۔ اس کا مقصد اس کے سوا کچھ نہیں کہ خدا کی مخلوق مجبور و معذور ہو کر ان کے نقد موں میں آپڑے اور خوراک وغیرہ نہ ملنے پر ان کے ہر حکم کی تعمیل اور ہر مقصد کی تکمیل کرے۔"

پہلی اکیسم کے متعلق لارڈ میکالے کے یہ جملے سند کے لیے کافی ہیں کہ "ہمیں ایک ایسی جماعت بنانی چاہیے کہ جو ہم میں اور ہماری کروڑوں رعایا کے درمیان مترجم ہو اور یہ ایسی جماعت ہونی چاہیے جو خون اور رنگ کے اعتبار سے تو ہندوستانی ہو مگر مذاق اور لہجہ زبان اور سمجھ کے اعتبار سے انگریز ہو۔"

بعد میں انگریز نے ان اکیسوں کو عملی جامہ پہنایا جو مسلمانوں کی بربادی کا سبب بنیں۔ حضور سید عالم ﷺ کا ارشاد ہے کہ اتقوا فراسة المومن فانه ينظر بنور الله مومن کی فراست سے ڈرتے رہو۔ یہ اللہ کے نور سے سب کچھ دیکھ اور سمجھ لیتا ہے۔ ان لوگوں کو ہوش آجانا چاہیے جو کہتے ہیں کہ مولوی کو سیاست نہیں آتی۔ آیئے علامہ کا رسالہ "الثورة الهندية" کا مطالعہ کیجیے۔ یہ درست ہے کہ مولوی کی سیاست غلام دماغ نہیں سمجھ سکتا مگر انگریز سمجھتا تھا۔ ذرا غور کریں اور سوچیں کہ انگریز کی ان اکیسوں پر عمل پیرا ہونے سے پہلے سارے دفاتر پر اسی طبقہ کا تبعہ تھا۔ علماء مشاہیر وقت سرکاری اور شاہی محکموں پر قابض تھے۔

مولانا فضل امام خیر آبادی صدر الصدور دہلی' مفتی صدر الدین خاں آزردہ صدر الصدور دہلی' مفتی عنایت احمد کاکوروی منصف و صدر امین کول و بریلی' مولوی فضل رسول بدایونی سررشتہ دار' مفتی انعام اللہ گوپاموی قاضی دہلی و سرکاری وکیل الہ آباد' مولانا مفتی لطف اللہ علی گڑھی سررشتہ دار بریلی دہلی و صدر الصدور لکھنؤ' مہتمم عظیم آباد' مولوی غلام قادر گوپاموی ناظر سررشتہ دار عدالت دیوانی و تحصیل دار گوڑگاؤں' مولوی قاضی فضل اللہ کشمیری سررشتہ دار صدر الصدور دہلی وغیرہم۔ یہ سب اپنے وقت کے بے نظیر و عدیم المثال اکابر علماء تھے۔ حکومت کی باگ ڈور انہیں کے ہاتھ میں تھی۔ انہیں مسلمانوں کی سلطنت کی بربادی کب برداشت تھی؟ موقع کا انتظار تھا۔ 1857ء کا وقت آیا' تو سب میں پیش پیش یہی اکابر تھے۔ والیان ریاست اور اراکین دولت میں ناموس حریت پھونکنے والے یہی حضرات تھے۔ عوام کو ابھارنا اور فتوی جہاد صادر کرنا انہیں کے حصے میں آیا اور انقلاب 1857ء کے بعد سب سے زیادہ مصائب اٹھانے اور آتش حریت میں جلنے والے یہی شمع شبستان آزادی کے پروانے تھے۔ انگریز نے ایک ایک کر کے ان کو تمام عہدوں سے سبکدوش کر کے ان کے خلاف محاذ قائم کیا۔ انگریزوں کے پاس اپنی ایک مخصوص جماعت خوشامدی قسم کے مسلمانوں پر مشتمل تھی جس کا سب سے بڑا مقصد علماء کی تذلیل و توہین کے ساتھ ساتھ انہیں سیاست سے نابلد بتا کر اور دقیانوسیت کا الزام لگا کر قوم کی زمام قیادت پر قبضہ کرنا تھا۔ یہی روح کارفرما تھی جنگ اسی قسم کے ایک میمورنڈم نے 1940ء میں کلکتہ سے فخریہ انداز میں اعلان کیا کہ "ہم نے علماء کے وقار کو ختم کر دیا ہے"۔

اے کاش کہ مسلمان قوم سوچتی کہ انگریز کی مدد سے اسکیم کو اس پودے میں عملی جامہ پہنا رہی ہے اور وہ اپنے مجاہدین اور سرفروش علماء کی تذلیل ان سرکاری ایجنٹوں کے اشارے پر نادانستگی سے کر کے اپنے پاؤں پر اپنے ہی ہاتھوں کلہاڑی مار رہی ہے۔

تاریخ کے جھروکوں سے جھانک کر دیکھیے کہ جب بھی کسی قوم میں پھوٹ پڑی ہے یا غیروں کی سازش کا شکار بنی' اس طبقہ کے علماء نے اپنی بصیرت سے قوم کی کشتی کو کنارے لگایا۔ یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ ہندوستان کی اسلامی سلطنتوں کی تباہی انہیں "میروں" کی بدولت ہوئی۔ جنگ پلاسی 1757ء کے بعد میر جعفر نے شاہ عالم کے ساتھ بھی ڈرامہ کھیلا تھا اور اس طرح صوبہ بنگال ہاتھ سے نکلا۔ دکن میں میر صادق نے 1797ء میں شیر میسور سلطان ٹیپو کو دھوکے سے کر شہید کرایا اور ہندوستان کی غلامی کا دائمی پٹا انگریز کو لکھ کر دیا۔

جعفر از بنگال صادق از دکن ننگ آدم ننگ دیں ننگ وطن

WWW.NAFSEISLAM.COM

علامہ فضل حق نے واقعہ ہنومان گڑھی دیدۂ عبرت سے دیکھا۔ اکبر شاہ ثانی اور بادشاہ ظفر کی بے بس اور واجد علی شاہ والی اودھ کی معزولی دبے کسی کی علت پر نظر جمائی۔ دوسری طرف عمال حکومت ہندوستانی تہذیب و کلچر کو چاٹ کرنے پر تلے ہوئے تھے۔ عیسائیت کی تبلیغ کا ڈنکا بجنے لگا تھا۔ عیسائی مشنریاں عدالتیں، ہسپتال اور دوسرے پبلک اداروں سے مذہبی اشاعت کو اپنا فرض منصبی سمجھ رہی تھیں۔ ان کی دیدہ دلیری کا نشانہ مذہب اسلام تھا۔ یادری فنڈر کا آئے دن علماء کو مناظروں کا چیلنج اور پھر ان مناظروں سے اپیل بچی ہوئی تھی۔

عوام کو خیال ہونے لگا کہ حکومت تو گئی اب مذہب بھی ہاتھ سے جانے لگا ہے۔ مسلمانوں کی اصل متاع مذہب ہے۔ مسلمان تمام نقصان اور مصیبتیں برداشت کر سکتا ہے لیکن مذہب پر آنچ نہیں آنے دیتا۔ سلسلہ یہاں تک پہنچا کہ 1850ء میں کلکتہ سے ای ایل مقف نے تمام سرکاری ہندوستانی عہدیداران کے نام مختصر چٹھی بھیجی تھی کہ "اب برٹش راج میں تمام ہندوستان میں ایک کھلداری ہوگئی ہے۔ تار برقی سے سب جگہ کی خبر ایک ہوگئی ہے۔ ریلوے سڑک سے سب جگہ کی آمد و رفت ایک ہوگئی لہٰذا اب مذہب بھی ایک چاہیے۔ اس لیے مناسب ہے کہ تم لوگ بھی عیسائی بن کر ایک مذہب ہو جاؤ"۔

علامہ کانپور اور کھوانت دہلی میں گزرے۔ آخر میں لکھنؤ پہنچے۔ وہاں کی حالت دہلی سے بھی بدتر پائی۔ بادشاہ دہلی اور والی اودھ برائے نام حکمران تھے۔ مسجد ہنومان گڑھی شہید ہوئی۔ مسلمان مجاہدین کفار کے ہاتھوں شہید ہوئے۔ امیر علی شاہ توپ سے اڑائے گئے۔ ناموس اسلام کی بے عزتی اور اسلامی شعائر کی بربادی پر بھی واجد علی شاہ کو عیش و عشرت کی پڑی تھی۔ علامہ صدر الصدور تھے۔ ان واقعات سے متاثر ہو کر لکھنؤ چھوڑ کر 1856ء میں الور چلے گئے مگر دل بے چین رہا۔ دربار دہلی سے راجاؤں کے نام خطوط بھی روانہ ہوئے۔ علامہ نے راجہ الور سے بھی گفتگو کی مگر وہ رام نہ ہوا۔ اپنا تحفہ علامہ نے الور کو چھوڑ دیا اور رامپور میں (جو میدانوں کو فتنین کرتے ہوئے چلے۔

اس سے قبل مولوی احمد اللہ شاہ اور دلاور جنگ مدراسی سے سرگوشیاں ہو چکی تھیں۔ دلاور جنگ فیض آباد چلے گئے۔ علامہ الور سے نشر و اشاعت کرتے ہوئے 1857ء میں دہلی پہنچے۔ میرٹھ اور دوسری چھاؤنیوں میں کارتوسوں کا قضیہ زور پکڑ چکا تھا۔ گائے اور سؤر کی چربی کی آمیزش کی خبر سے ہندو اور مسلمان فوجی بگڑ بیٹھے۔ میرٹھ سے دہلی پر باغی فوج نے 11 مئی 1857ء کو حملہ کر دیا۔ قتل اور غارتگری کا بازار گرم ہوا۔ بادشاہ دہلی سرگرمیوں کا مرکز بنے اور علامہ بھی شریک مشورہ رہے۔

محاذین شہر میں دو گروہ تھے۔ ایک بادشاہ کا حامی اور دوسرا حکومت کمپنی کا بہی خواہ۔ ایک جماعت مجاہدین کی

تھی اور یہ جنرل بخت خاں کی سرداری میں داد شجاعت دے رہی تھی۔ علامہ سے جنرل بخت خاں ملنے پہنچے۔ مشورہ کے بعد علامہ نے نماز جمعہ کے بعد جامع مسجد میں علماء کو خطاب کیا اور استفتاء پیش کیا۔ مفتی صدرالدین خاں آزردہ صدرالصدور دہلی، مولوی عبدالقادر، قاضی فیض اللہ دہلوی، مولوی فیض احمد بدایونی، ڈاکٹر مولوی وزیر خاں اکبرآبادی اور سید مبارک شاہ رامپوری نے دستخط کردیے۔ اس فتویٰ کے شائع ہوتے ہی ملک میں عام شورش بڑھ گئی اور دہلی میں نوے ہزار سپاہ جمع ہوگئی تھی۔ جنرل بخت خاں کی سکیموں میں مرزا مغل آڑے آتے تھے جس کی وجہ سے فوج میں پھوٹ پڑ گئی۔ جنرل بخت خاں سے لوگ بگڑ گئے۔ کمپنی کی فوج نے 14 ستمبر 1857ء کو شہر دہلی پر حملہ کردیا اور 19 ستمبر کو مکمل طور پر قابض ہوگئے۔ علامہ دہلی سے 24 ستمبر کو روانہ ہوگئے۔ مفتی صدرالدین خاں آزردہ صدر الصدور، مرزا اسداللہ خاں غالب، نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ بھی دھر لیے گئے۔ سید اسماعیل حسین شکوہ آبادی اور مفتی عنایت احمد کاکوروی کو بجرم بغاوت کالے پانی کی سزا ہوئی۔ علامہ فضل حق خیرآبادی کو بائی قرار دے دیا گیا۔ چنانچہ وہ اسیر فرنگ ہوکر بند ہوئے۔ 1859ء میں لکھنؤ میں ان پر مقدمہ چلا۔

؎ آئین جواں مرداں حق گوئی و بے باکی — اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی

علامہ کے اقرار و تحقیق کے بعد گنجائش ہی کیا باقی رہ گئی تھی؟ عدالت نے حبس دوام بہ عبور دریائے شور کا حکم سنایا۔ آپ نے کمال مسرت اور خندہ پیشانی سے اسے سنا۔ آخر شں جزیرہ انڈمان روانہ کردیے گئے۔ علامہ کو انڈمان میں کیسے ذلت آمیز برتاؤ سے سابقہ رہا۔ الثورۃ الہندیہ اور قصائد میں اس کا مفصل بیان موجود ہے۔ ادھر علامہ کے صاحبزادے اور خواجہ غلام غوث سرگرم سعی تھے۔ آخر پروانہ رہائی حاصل کرکے آپ کے صاحبزادے انڈمان روانہ ہوگئے۔ جہاز سے اتر کر شہر میں گئے تو ایک جنازہ نظر آیا، اس کے ساتھ عوام کی کثرت تھی۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ کل 12 صفر 1278ھ بمطابق 1861ء کو علامہ فضل حق خیرآبادی کا انتقال ہوگیا۔ اب سپرد خاک کرنے جا رہے ہیں۔ یہ بھی بصد حسرت و یاس شریک دفن ہوئے۔

؎ نا کردن خوش رسے بخاک و خون غلطیدن — خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

WWW.NAFSEISLAM.COM

علامہ فضل حق دنیا کے مختصر آئین کے بانی

سقوط دہلی کے بعد لال قلعہ دہلی سے جو تحریری ریکارڈ قبضہ میں لیا گیا اس میں ایک دستور العمل سلطنت بھی تھا۔ اس کا اصل مسودہ نیشنل آرکائیوز آف انڈیا دہلی میں محفوظ ہے۔

اس آئین کی ایک نقل سورندرناتھ سین نے اپنی کتاب Eigteen Fifty Seven میں صفحہ نمبر: 74 کے بعد دی ہے اور اسے دہلی کی باغی کورٹ کا آئین کہا ہے۔

ڈاکٹر مہدی حسین نے بھی اپنی کتاب Bahadur shah II and the war of 1857 in Dehli میں صفحہ نمبر:182 کے بعد اس آئین کی نقل دی ہے اور اس آئین کا انگریزی زبان میں ترجمہ بھی کیا ہے اور اس کو "جمہوریت اساس" آئین قرار دیا ہے اور لکھا ہے کہ علامہ فضل حق نے یہ آئین بنایا۔

اس آئین پر آئین ساز کا نام اور تاریخ درج نہیں مگر شواہد یہ بتاتے ہیں کہ یہ آئین اگست 1857ء کے آخری عشرہ کے آغاز میں بن گیا تھا اور اسے علامہ فضل حق خیرآبادی نے ہی وضع کیا تھا۔ اس لیے کہ اس مسودہ کا رسم الخط اور علامہ کا رسم الخط ایک ہے اور یہ کہ علامہ فضل حق خیرآبادی کی شہرت ایک ماہر قانون کے طور پر رہی ہے اور وہ بتیس سال تک مختلف ریاستوں کی عدالتوں میں اعلیٰ مناصب پر فائز رہے۔

WWW.NAFSEISLAM.COM

دستور العمل سلطنت:

ازآنجا کہ واسطے رفع برہمی سررشتہ اور موقوفی بدانتظامی طریقہ فوجی اور ملکی کے مقرر ہونا دستور العمل کا واجب اور مناسب اور واسطے عمل درآمد دستور العمل کے اولاً معین ہونا کورٹ (کابینہ) کا ضروری ہے۔ اس لیے حسب ذیل قواعد لکھے جاتے ہیں:

❶ ایک کورٹ قائم کی جائے اور اس کا نام کورٹ ایڈمنسٹریشن یعنی جلسۂ انتظام فوجی وملکی رکھا جائے۔

❷ اس جلسے (کابینہ) میں دس آدمی مقرر کیے جائیں۔ اس تفصیل سے کہ چھ جنگی اور چار ملکی ہوں اور جنگیوں میں دو شخص پلٹن پیادگان سے اور دو شخص رسالہ ہائے سواراں سے اور دو سررشتہ (محکمہ) توپ خانہ سے منتخب کیے جائیں اور ملکی

ہوں گے۔

❹ ان اراکین میں سے ایک شخص بالاتفاق غلبہ آرائے پریزیڈنٹ یعنی صدر جلسہ اور ایک شخص دائیں پریزیڈنٹ یعنی نائب صدر جلسہ مقرر ہوا دوسرے صدر جلسہ کی ہمراہی دوسرے کے قرار پائے گی اور ہر ایک سررشتہ (محکمہ) میں بقدر ضرورت سکرٹر (سیکرٹری) مقرر کیے جائیں اور باقی سمجھے ہر روز جلسہ کورٹ (کابینہ) کا ہو۔

❺ ان دو شخصوں کے مقرر ہونے کے وقت حلف ان باتوں کا لیا جائے کہ کام کو بڑی دیانت اور امانت سے بلا زور عایت کمال چابکدستی سے اور غور فکر سے سرانجام کریں گے اور کوئی دقیقہ نافع حقیقہ انتظام سے فروگذاشت نہ کریں گے اور حیلہ اور مداہنہ اور بے جا رعایت کسی طرح کی کسی ملاحظہ کو بیچ امور انتظام کورٹ (کابینہ) میں نہ کریں گے بلکہ بیطرفی اور سرگرمی سے انتظام امورات سلطنت میں مصروف رہیں گے کہ جس سے استحکام ریاست اور رفاہ اور آسائش رعیت ہو اور کسی سررشتہ کورٹ (کابینہ) کو بے اجازت کورٹ اور صاحب عالم مختار اجرائے اس کے مراد مقاصد کا کبھی کسی پر ظاہر نہ کریں گے۔

❻ انتخاب اراکین کورٹ (کابینہ) کا اس طریقے سے کہ غلبہ آرائے سے دو شخص پنشن یافتگان اور رسالہ یافتے سوداران سے اور سررشتہ (محکمہ) تو پخانہ جنگی سے جو قدیم الخدمت اور ہوشیار اور واقف کار اور لائق و عقیل ہو کیے جائیں اور اگر کوئی شخص ہوشیار بہت عقیل فہیم اور لائق انصرام کار کورٹ (کابینہ) ہو اور شرط قدیم الخدمتی اس میں نہ پائی جائے تو یہ ایک امر خاص ان صورتوں میں مانع تقرر نہ ہوگا اور اسی طرح تقرر چار شخص ملکی کا بھی عمل میں آئے گا۔

❼ بعد مقرر ہونے دس شخصوں کے اگر کوئی شخص چلہ انتظام کورٹ (کابینہ) میں رائے اپنی کسی امر میں ایسی خلاف دیانت اور امانت اور رسول اور بے رعایت کی دے ہوگا تو ثابت کر کے کامل غلبہ آرائے کورٹ (کابینہ) سے وہ شخص موقوف کیا جائے گا اور دوسرا شخص حسب قاعدہ پانچویں رقم اس کے انتخاب ہوگا۔

جو امورات انتظام کے پیش آئیں تجویز ان کی کورٹ (کابینہ) میں ہوگی اور بعد منظوری صاحب عالم بہادر مع کے اطلاع مرائے کورٹ سے (کابینہ) حضور والا میں ہوتی رہے گی۔

❽ بعد مرتب ہونے رائے غلبہ آرائے جلسہ کورٹ (کابینہ) سے واسطے منظوری کے پیش گاہ حضور صاحب عالم بہادر میں پیش ہوں گے اور کورٹ (کابینہ) ماتحت حکومت صاحب عالم بہادر ممدوح کے رہے گی اور کوئی امر امور انتظامی جنگی و ملکی کے تجویز کورٹ (کابینہ) اور بلا منظوری صاحب عالم مشیم الیہ اور بلا اطلاع حضور والا

قابل اجرائی نہ ہوگا اور در صورت اختلاف رائے صاحب عالم بہادر بعد تجویز قائل کورٹ (کابینہ) وہ رائے بحالت اختلاف بوساطت صاحب منظم الیہ پیش گاہ حضور رعمل بحالی میں پیش ہوں اور اس میں حکم کا حاصل ہوگا۔

⑧ کورٹ (کابینہ) میں سوائے اشخاص مقررہ جلسہ (میٹنگ) کے دیگر صاحب عالم بہادر اور حضرت ظل سبحانی کوئی شخص شریک جلسی اور حاضر نہ ہوگا اور جب اشخاص موجود کورٹ میں سے بعد رائے کی لانے پر ایک ایک شخص اپنے زمرہ مقررہ سے حاضر جلسہ کورٹ (کابینہ) نہ ہو سکے تو رائے غلبہ آراء اشخاص باقی حاضرین جلسہ (کابینہ) کورٹ کے بحوالہ غلبہ رائے (ووٹ) کل جلسہ (میٹنگ) کورٹ کے منصور ہوگی۔

⑨ جب کوئی شخص کورٹ (کابینہ) میں سے نسبت کسی امر کے رائے اپنی پیش کرنی چاہے تو اوّلاً اشخاص ایک رائے دوسرے شخص کا پہلے کرکے اس وقت رائے اپنی متعلق علیہ وہ شخص کورٹ (کابینہ) میں پیش کرے۔

⑩ جس وقت کوئی امر کورٹ (کابینہ) میں موافق قاعدہ مقررہ کے پیش ہو تو اول پیش کرنے والا تقریر اپنی کورٹ (کابینہ) میں بیان کرے اور جب تک بیان اس کا تمام نہ ہو کوئی شخص اس میں دخل نہ کرے۔ اہل کورٹ (کابینہ) میں سے اگر کسی کو کچھ اعتراض ہو تو وہ پہلے اپنا اعتراض ظاہر کرے بتمام ہونے اس کے بھی کوئی دخل نہ دے۔ اگر معترض پر کوئی غیر اشخص تقریر ورباب اصلاح یا ترمیم کسی طرح کی کمی بیشی کے ساتھ پیش لائے اور باقی اہل کورٹ (کابینہ) کو سکوت ہو تو ہر ایک اہل کورٹ (کابینہ) اپنی اپنی رائے علیحدہ لکھے بعد ملاحظہ موافق قاعدہ آٹھویں کے غلبہ آراء پر عمل ہوگا اور بعد منظوری ہر ایک سررشتہ (محکمہ) کے سیکرٹری (سیکرٹری) کے پاس بھیجی جائے۔

⑪ ہر ایک سررشتہ (محکمہ) فوج کے جو اشخاص حسب قاعدہ دوسرے کے منتخب کیے جائیں گے وہی اشخاص اس سررشتہ کے منتظم اور حضرم کیے جائیں اور ان کے تحت میں چار آدمی کی کمیٹی حسب طریقہ قاعدہ درج چھے کے قرار پائے اور بقدر ضرورت اس کمیٹی میں بھی سیکرٹری (سیکرٹری) مقرر ہوں اور جو رائے اس کمیٹی میں غلبہ آراء سے مرتب ہو وہ رائے بذریعہ ان شخصوں افسر کمیٹی کے کورٹ (کابینہ) میں سررشتہ پیش کی جائے اور کورٹ (کابینہ) سے موافق قاعدہ ساتویں کے عمل میں آئے اور یہی طریقہ ہر ایک فوجی اور ملکی میں مرعی کیا جائے۔

⑫ ہر وقت بمقتضائے مصلحت کورٹ (کابینہ) کو اصلاح اور ترمیم قواعد دستور العمل ہذا کا غلبہ آراء سے اختیار دیا جائے"۔

آئین کی خصوصیات:

❶ یہ دستور اردو زبان میں لکھا جانے والا پہلا دستور ہے۔

❷ اس دستور کی اپنی مخصوص اصطلاحات ہیں جو اردو کے زیادہ قریب ہیں جیسے "کابینہ" کو "کورٹ" اور "جلسہ"، "ووٹ" کو "رائے"، "پریذیڈنٹ" کو "صدر جلسہ"، "وائس پریذیڈنٹ" کو "نائب صدر جلسہ"، "میٹنگ" کو "جلسہ"، "ڈیپارٹمنٹ" اور "نظام" کو "سررشتہ" اور "سیکرٹری" کو "سکرٹر" وسکرٹر لکھا گیا ہے۔

❸ یہ ایک مکمل دستور ہے۔

❹ یہ مختصر ترین دستور ہے۔ [۳]

❺ یہ جمہوری دستور ہے۔ اس کے تمام تر طریق کار میں جمہوریت کے اصول مدنظر رکھے گئے ہیں۔

❻ اس دستور میں فوج اور سول ہر دو شعبوں کو نمائندگی دی گئی ہے۔

❼ اس دستور کے قواعد کی روشنی میں بنائی جانے والی کابینہ کے ارکان کی اہلیت، طریق انتخاب، دستوری اور حلف وغیرہ کی بھی وضاحت ہے۔

❽ یہ کابینہ صدر مملکت (بہادر شاہ ظفر) کے ماتحت رہے گی۔

❾ کابینہ کے ہر رکن کے ذمہ ایک مستقل محکمہ ہے۔ جس کا انتظام و انصرام اسے چار یا حسب ضرورت سیکرٹریوں پر مشتمل کمیٹی کی مدد سے کرنا ہے۔

❿ سیکرٹریوں کی اہلیت کی شرائط اور طریق انتخاب وغیرہ و نگران کمیٹی والا ہی ہوگا۔

⓫ اس دستور میں ضرورت و مصلحت کے مطابق اصلاح و ترمیم کی بھی اجازت رکھی گئی ہے۔

⓬ یہ دستور ہنگامی ضروریات کو پورا کرنے کے ساتھ ساتھ معمول کے حالات کے لئے بھی کارآمد ہے۔

﴿مصادر و حوالہ جات﴾

۱ خیال رہے کہ تمیز الدولہ خان نے "انقلاب 1857ء مع دیباچہ و تکملہ و ضمیمہ" میں "ہز میجسٹی آف میوٹی پیپرز" بذیل نمبر: ۵۷ فولیو نمبر: ۲۵۸ کے حوالے سے دستور آئین کی تاریخ 8 اگست بتائی ہے۔

۲ بہادر شاہ ظفر مراد ہیں اس لئے کہ یہ ان کا لقب ہے۔

۳ مختصر ترین دستور کے طور پر مشہور امریکی آئین چار ہزار الفاظ پر مشتمل ہے۔

مجاہد آزادی کی خدمات کو مسخ کرنے کی ناکام کوششیں

اسعد فلاحی

سلسلہ ولی اللّٰہی کی مشہور علمی و فکری شخصیت حضرت مولانا فضل حق خیرآبادی چشتی علیہ الرحمۃ نے خیرآباد سے دہلی میں آکر یہ دیکھا کہ مغلیہ خاندان اور ان کی حکومت و حکمت کی حیثیت چراغ سحری سے بھی کم اور چند سانسوں کی مہمان ہے۔ سراج الدین بہادر شاہ ظفر کی حکومت شاہی قلعہ کے اندر تک محدود ہے اور قلعہ سے باہر انگریز مسلط ہے بلکہ یوں محسوس کیا کہ بہادر شاہ ظفر اور ان کے جانثار ساتھیوں کی زندگیاں بھی میجر جنرل ہڈسن کے رحم و کرم پر تھیں۔ مغلیہ خاندان ریشہ دوانیوں کی آماجگاہ بن چکا تھا۔ انگریز جسے چاہتے اسے گرفتار کرکے اپنی مرضی و منشا کے مطابق سزا اور قرار دیتے۔ حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی علیہ الرحمۃ (المتوفی 1239ھ) کا انتقال ہو چکا تھا۔ انگریزوں سے مقابلہ کرنا اگرچہ بظاہر آسان نہ تھا کیونکہ برصغیر کے جاگیردار نواب اور رؤسا انگریزوں کے طرفدار بن چکے تھے۔ علاوہ ازیں اسماعیل دہلوی اور ان کے ساتھی بھی نہ صرف برٹش حکام کی غلامی اختیار کر چکے تھے بلکہ ان برطانوی حکمرانوں کی حمایت میں مسلمانانِ ہند کے خلاف جواز بھی گھڑ رہے تھے۔ کوپہ کو پہ گھوم کر خود کو انگریزوں کی "رحمت" بتا رہے تھے۔

یہ وہ المناک واقعات ہیں جنہیں مرزا حیرت دہلوی کی زبانی سنیے۔ "کلکتہ میں جب مولانا اسماعیل نے جہاد کا وعظ فرمانا شروع کیا ہے اور مسلمانوں کے مظالم کی کیفیت پیش کی ہے تو ایک شخص نے دریافت کیا۔ آپ انگریزوں پر جہاد کا فتویٰ کیوں نہیں دیتے؟ آپ نے جواب دیا کہ ان پر جہاد کرنا کسی طرح واجب نہیں ہے۔ وہ ذرا بھی دست درازی نہیں کرتے۔ ہمیں ان کی حکومت میں ہر کی طرح آزادی ہے بلکہ ان پر کوئی حملہ آور ہو تو مسلمانوں پر فرض ہے کہ وہ اس سے لڑیں اور اپنی گورنمنٹ پر آنچ نہ آنے دیں"۔ [1]

یہ تھی اس وقت مذہبی کیفیت اور سماجی المیہ کہ مذہب کی آڑ لے کر برٹش حکام کی پاسداری اور سیاست کے پردہ میں برطانوی حکمرانوں کی حمایت کہ یہاں نذیر حسین دہلوی نے انگریز حکمرانوں جیسی ظالم اور غاصب حکومت کو "خدا کی رحمت" قرار دیا۔ "انگریزی گورنمنٹ ہندوستان میں ہم مسلمانوں کے لیے خدا کی رحمت ہے"۔ [2]

تنگیٔ پرستوں کو خدا کی رحمت قرار دے کر ان کی ایسٹ انڈیا کمپنی کو مستحکم کرنے کے لیے اسماعیل دہلوی اور میاں نذیر حسین دہلوی جیسے لوگ پیش پیش تھے۔ اندریں حالات حضرت مولانا فضل حق خیرآبادی علیہ الرحمۃ دینی بقاء واستحکام اور ملک کو انگریزوں کے اثر ونفوذ سے روکنے کے لیے میدانِ جہاد میں کود پڑے۔

بے خطر کود پڑا آتش نمرود میں عشق
عقل ہے محو تماشائے لب بام ابھی

آپ کے حربی کارناموں پر روشنی ڈالتے ہوئے اقبال ساغر صدیقی لکھتے ہیں: ''چونکہ مولانا خیرآبادی خود جنگ آزادی کے سپاہی تھے ان پر بغاوت کے الزام میں مقدمہ چلا۔ جس دوام پہ عبور دریائے شور کی سزا دے کر انڈمان میں قید کر دیا گیا اور وہیں وفات پائی''۔ ۳

حضرت علامہ خیرآبادی جو اپنے اسلاف امت کے علم وعقائد کے علمبردار ہونے کی حیثیت سے انگریزوں کے خلاف برسرِ پیکار ہوئے۔ جسے شیخ محمد اسماعیل پانی پتی اپنے ایک مضمون 1857ء میں علمائے کرام کا حصہ میں لکھتے ہیں: ''جب مغلیہ خاندان کا آخری چراغ بجھ گیا۔ تخت وتاج چھن گئے اور وطن کے جانثاروں کو چن چن کر گولیوں کا نشانہ بنایا جانے لگا تو ان میں علماء بھی شامل تھے جو اس وقت دوسرے لوگوں کے پیش (آگے) آئے۔ جن علماء وفضلاء نے فتویٰ جہاد پر دستخط کیے تھے ان کو طرح طرح کی اذیتیں پہنچائی گئیں۔ مولانا فضل حق خیرآبادی کو انڈیمان بھیجا گیا''۔ ۴

شیخ محمد اسماعیل پانی پتی کے تبصرہ کے بعد اقبال ساغر صدیقی حضرت علامہ کے جنگی کارناموں اور انگریزوں سے نفرت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ''فضل حق کو بھی باغی قرار دیا گیا اسیر فرنگ ہو کر بند رہے۔ 1859ء میں لکھنؤ میں مقدمہ چلا اور کالے پانی کی سزا ہوئی۔ ان پر جرم وہی فتویٰ جاری کرنے کا تھا۔ سرکاری وکیل کے مقابلے میں انہوں نے خود بحث کی اور سب الزام ایک ایک کر کے رد کر دیے لیکن فتوے سے متعلق آخر تک اڑے رہے کہ وہ فتویٰ صحیح ہے اور میرا لکھا ہوا ہے اور آج بھی اس وقت میری وہی رائے ہے''۔ ۵

حضرت علامہ خیرآبادی علیہ الرحمۃ کو انگریزوں نے فتویٰ جہاد دینے اور عوام کو بغاوت پر اکسانے کی پاداش میں دہلی سے لکھنؤ میں لے جا کر مقدمہ تیار کیا اور اسی لکھنؤ کے اندر حضرت علامہ پر انگریزوں نے فرد جرم عائد کر کے جزیرۂ انڈمان بھیج دیا۔ آپ کے فتویٰ جہاد پر خورشید مصطفیٰ رضوی کا بیان ملاحظہ کیجیے۔ ''علماء نے جس جس طرح بغاوت کو منظم کیا اس کو مفصل بیان کرنے کے لیے تو ایک علیحدہ کتاب کی ضرورت ہے مگر ان کا کچھ تذکرہ ان صفحات

اللہ اللہ سوت کو کس نے سیکھا کر دو

پر کیا جا رہا ہے۔ اس حقیقت سے بڑے بڑے مورخ بھی انکار کی جرأت نہیں کر سکے ہیں کہ یہ علما عوام میں بے حد مقبول تھے۔ ان کی تحریر و تقریر کا بڑا اثر ہوتا تھا چنانچہ دہلی میں جنرل بخت خاں کی تحریک پر مولانا فضل حق خیرآبادی اور دوسرے علماء نے جو جہاد کا فتویٰ دیا اس کے بارے میں مولوی ذکاء اللہ دہلوی نے بھی اپنی تاریخ میں اقرار کیا ہے کہ اس سے مذہبی جوش و خروش بہت بڑھ گیا تھا۔" [1]

حضرت علامہ خیرآبادی علیہ الرحمۃ کا جذبہ اس قدر زیادہ بڑھا ہوا تھا کہ آپ کی چند تقریروں اور آپ کے فتویٰ جہاد نے مسلمانوں میں انگریزوں سے بے حد نفرت پیدا کر دی اور انگریزوں کو خطرہ لاحق ہوا اور آپ کو باغی قرار دے کے جزیرہ انڈمان بھیج دیا گیا۔

سرسید کی فکر کے حامی انتظام اللہ شہابی آپ کے بارے میں لکھتے ہیں کہ "حاکم بیتاپور نے گرفتار کر لیا۔ لکھنؤ لائے گئے اور بغاوت کے جرم میں مقدمہ چلایا گیا۔ جج کے سامنے آپ کی موجودگی میں گواہ سرکاری پیش ہوا۔ اس نے آپ کو دیکھا تو کہنے لگا کہ یہ وہ فضل حق نہیں ہیں جنہوں نے جہاد کا فتویٰ دیا۔ وہ دوسرے شخص ہیں۔ آپ فوراً بول اٹھے پہلی اطلاع اس کی صحیح ہے۔ اب غلط کہہ رہا ہے۔ مجھ پر جو جرم عائد کیا گیا ہے وہ درست ہے۔ میں نے ہی فتویٰ لکھا اور آج بھی میری رائے وہی ہے۔ جج نے جس دوام عبور دریائے شور کی سزا تجویز کی جو شدہ پیشانی سے قبول فرمائی اور انڈمان گئے۔ وہیں 12 صفر المظفر 1278ھ کو وفات پائی"۔ [2]

انتظام اللہ شہابی کے الفاظ آپ کی سرفروشی اور انگریزوں کے خلاف جذبہ جہاد اس بات کے غماز ہیں کہ آپ نے جو دینی اور حربی کارنامے سرانجام دیے وہ خود آپ کے مخالفین کی نوک قلم پر آ گئے۔ چنانچہ اسی سلسلے میں محمد میاں دیوبندی دہلوی ناظم جمعیت علماء ہند کا بیان ملاحظہ ہو "جہاد حریت کے علمبردار اور کٹہرہ عدالت میں ایک سیاسی ملزم کی حیثیت سے حاضر ایک طرف زندگی کا ہر ایک دور ناز و نعم عزت و عظمت سے ہم کنار ہے تو زندگی کا ایک دور پابند سلاسل اور دیار غربت میں وحشت بداماں"۔ [3]

آج اگر کوئی متعصب اہل قلم حضرت علامہ خیرآبادی علیہ الرحمۃ کی حربی زندگی اور انگریزوں کے خلاف جدوجہد کرنے سے انکار کرے تو ان کی اپنی مرضی مگر حقیقت کو چھپایا نہیں جا سکتا اور حقائق کو مسخ نہیں کیا جا سکتا۔

سرزمین بہاولپور کا ایک معروف ادبی سہ ماہی پرچہ "الزبیر" کا 1857ء جنگ آزادی نمبر شائع ہوا۔ جس میں حضرت مولانا خیرآبادی کا تذکرہ بھی موجود ہے ملاحظہ کیجیے: "مولانا فضل حق نے ایک دن بعد نماز جمعہ جامع مسجد میں انگریزوں کے خلاف فتویٰ پڑھ کر سنایا تو بہتوں کے لیے باعث تشویش بنا۔ اس فتویٰ پر مفتی صدرالدین آزردہ

اور دوسرے باغی علماء کے دستخط تھے۔ اس کا شائع ہونا تھا کہ جدوجہد نے ایک نیا زور پکڑا اور جگہ جگہ انگریزوں کے چھکے چھوٹ گئے۔ تاریخ ذکاء اللہ کے مطابق اس فتویٰ کے بعد صرف دلی میں نوے ہزار سپاہ جمع ہو گئی۔ سرکاری وکیل کے مقابلے میں پرانہوں نے خود بحث کی اور سب الزام ایک ایک کر کے رد کر دیے لیکن فتویٰ کے متعلق آخر تک اڑے رہے کہ وہ فتویٰ صحیح ہے اور میرا لکھا ہوا ہے اور آج اس وقت بھی میری رائے یہی ہے"۔ ۹

حضرت علامہ خیر آبادی علیہ الرحمۃ کے فتویٰ جہاد سے پورا برصغیر الجہاد الجہاد کے نعروں سے گونج اٹھا جس سے فرنگی دیوا استبداد کے صنم کدوں میں ارتعاش پیدا ہو گیا۔ آپ کے ارد گرد جو ماحول کی اہتری تھی اس کا نقشہ مجاہد المسلک دیوبندی نے ان الفاظ میں کھینچا ہے۔ "مولانا فضل حق نے اس عہد میں آنکھ کھولی جو طرح طرح کے سیاسی فتنوں سے بھرا ہوا تھا۔ مسلمانوں میں طرح طرح کی جہالت کارفرما تھی۔ سلطنت سے مسلمانوں کے قدم اکھڑ چکے تھے اور انگریزوں کے قدم روز بروز مضبوط ہوتے جا رہے تھے۔ بادشاہ سے لے کر عام آدمی تک غفلت کی نیند سو رہے تھے۔ شیخ بھجے کے لیے بار بار جھڑک رہی تھی لیکن عیش و عشرت کا بازار اس قدر گرم ہو چکا تھا کہ کسی کو ان باتوں کی طرف توجہ نہیں تھی۔ بعض متقشد ہستیاں ضرور تھیں جو چیخ چیخ کر سونے والوں کو جگا رہی تھیں"۔ ۱۰

حضرت علامہ خیر آبادی علیہ الرحمۃ کے مذہبی اور حربی کارناموں پر ان الوقت اور کینہ پرور قسم کے لوگوں نے پردے ڈالنے شروع کر دیے تا کہ اگر کوئی صحیح واقعات تلاش کرنا بھی چاہے تو انہیں ان کینہ پرور لوگوں کی خود ساختہ عبارات اور اسماعیل دہلوی پر چند الفاظ کے سوا اور کچھ نہ مل سکے۔ چشم فلک نے دیکھا کہ ایسے لوگوں کی کوششیں ناکام ہو کر رہ گئیں حالانکہ غلام رسول مہر اور ان کے ہم نوا لوگوں نے بڑی بڑی تفہیم کتابیں لکھیں اور رسائل واخبارات کذب وافترا کے لیے وقف کر دیے۔

مستقیم احسن حامدی فاضل دیوبند اپنے ایک طویل مقالے بعنوان مولانا فضل حق خیر آبادی ہفت روزہ خدام الدین لاہور میں لکھتے ہیں: "تم ہو تاریخ کا۔ اس نے اپنے حافظہ سے ایسی ایسی جانباز "حق گو" بھادر اور جامع کمالات شخصیتوں کو دودھ کی مکھی کی طرح نکال پھینکا جنہوں نے اپنے دور میں وقت کے تیز و تند طوفانوں سے بے خوف و خطر ٹکر لی اور پیٹھ نہیں دکھائی۔ مولانا فضل حق خیر آبادی رحمۃ اللہ علیہ تاریخ کے ان جواں مرد اور نڈر مجاہدین میں سے تھے جن کی جرأت و ہمت اور حق گوئی و بے باکی نے دنیا کو حیرت میں ڈال دیا مگر تاریخ کے صفحات میں ان کو شایان شان کیا کوئی معمولی جگہ بھی نہیں مل سکی"۔ ۱۱

یہی فاضل دیوبند مستقیم احسن حامدی حضرت علامہ خیر آبادی علیہ الرحمۃ کے علمی اور حربی کارناموں پر روشنی ڈالتے

ہوئے مزید لکھتے ہیں: "مولانا فضل حق خیرآبادی نے ﴿الفضل الجهاد حكمه حق عند سلطان جابر﴾ کا فریضہ ادا کیا اور اپنی ہمرزبان اظہار میں جس دوام کی نذر کردی"۔ [۱۲]

درس آزادی دینے والا مجاہد حضرت مولانا فضل حق خیرآبادی علیہ الرحمۃ اور آپ کے جاں نثار ساتھیوں کو دانستہ طور پر نظر انداز کرنے کی کوشش کی جاری ہے حالانکہ تاریخ کو مسخ کرنے والے خود مٹ گئے مگر مجاہدین اسلام کے علمی اور حربی کارناموں پر پردہ نہ ڈالا جاسکا۔ اقبال ساغر صدیقی روزنامہ اخبار "امروز" کراچی جنگ آزادی 1857ء میں حضرت علامہ خیرآبادی کے متعلق "بانی ہندوستان" کے عنوان سے لکھتے ہیں: "بادشاہ دہلی سرگرمیوں اور مشورے کا مرکز ہے۔ فضل حق بھی اس وقت معتمدوں میں بادشاہ کے شریک ہوتے تھے۔ چنانچہ منشی جیون لال اپنے روزنامچے غدر کے صبح وشام میں لکھتے ہیں: 16 اگست کو مولوی فضل حق شریک دربار ہوئے۔ سورتھال سے متعلق بادشاہ سے گفتگو کی۔

6 ستمبر 1857ء مولوی فضل حق، میر سعید علی خاں، حکیم عبدالحق آداب بجالائے اور اطلاع دی کہ متھرا کی فوج آگرہ چلی گئی ہے اور انگریزوں کو شکست دینے کے بعد شہر پر حملے کررہی ہے۔ غرض یہ کہ اس روزنامچے سے فضل حق کی باخبری اور انقلابی سرگرمیوں کا اندازہ ہوتا ہے۔ اسی درمیان میں فضل حق نے ایک دن بعد نماز جمعہ جامع مسجد میں وہ مشہور فتویٰ دیا جو بعد میں بیتوں کے لیے باعث تشویش بنا"۔ [۱۳]

حضرت علامہ خیرآبادی کے فتویٰ جہاد کی بنا پر مسلمانوں میں انگریزوں کے خلاف نفرت کی جو لہر دوڑ گئی اور ان کی رگوں میں حرارت جہاد پیدا ہوگئی۔ چنانچہ ساغر صدیقی لکھتے ہیں: "فضل حق کو بھی باغی قرار دیا گیا۔ اسیر فرنگ ہوکر بند ہے۔ 1859ء میں لکھنؤ میں مقدمہ چلا اور کالے پانی کی سزا ہوئی۔ ان پر جرم وہی فتویٰ جاری کرنے کا تھا"۔ [۱۴]

حضرت علامہ خیرآبادی کا جرم معرف یہی تھا کہ اسماعیل دہلوی اور ان کے ہمنواؤں کی طرح انگریزوں کی پاس خاطر نہیں کی۔ لہٰذا انگریزوں نے بجرم تحریک آزادی مستوجب سزا قرار دے کر جزیرہ انڈیمان بھیج دیا چنانچہ اس ضمن میں محمد اسماعیل پانی پتی کا حوالہ ملاحظہ کیجیے: "جنگ آزادی کے دوران میں علماء وفضلاء نے بھی اس طرح حصہ لیا جس طرح کہ آزادی کے دوسرے متوالوں نے لیا۔ جب دہلی میں جنگ آزادی کا زور تھا اور جنرل بخت خاں اس جنگ کا ہیرو تھا تو اس نے سوچا اگر اس وقت علماء سے جہاد کا فتویٰ لے کر اس کی تشہیر کی جائے تو لوگوں میں ایک نیا جوش پیدا ہوسکتا ہے چنانچہ اس نے علماء سے جہاد کا فتویٰ لیا اور اسے دہلی کے گلی کوچوں میں چسپاں کرایا۔ اس فتویٰ کا تشہیر پانا تھا کہ لوگوں میں ایک بجلی دوڑ گئی اور وہ پروانوں کی طرح جنگ آزادی میں کود پڑے"۔ [۱۵]

برٹش حکام کے خلاف جہاد کا فتویٰ دینے والا سرخیل حریت حضرت مولانا فضل حق خیر آبادی ہی نظر آتا ہے جس نے دنیا و مافیہا سے بے نیاز ہو کر نہ صرف ان حکمرانوں کے خلاف بلکہ ان کے کاسہ لیسوں کے خلاف اپنی جدوجہد کی جس کی پاداش میں مقدمہ بجرم بغاوت چلایا گیا اور سزا کے طور پر جزیرہ انڈیمان بھیجا گیا۔ اس قید خانہ میں آپ سے سخت ترین مشقت لی جاتی رہی جسے آپ نے خندہ پیشانی سے برداشت کیا اور ان صعوبتوں کا مردانہ وار مقابلہ کرتے ہوئے واصل بحق ہو گئے۔

آپ کی شہادت پر مولانا عبداللہ بلگرامی نے کہا: "فضل ان کے کفن میں ملکوں اور علم ان کے ساتھ مدفون ہو گیا"۔ 12 صفر المظفر 1278ھ کو آپ کی تاریخ شہادت ہے۔ جب آپ کی شہادت کی خبر دلی پہنچی تو مرزا غالب نے اظہار افسوس کرتے ہوئے یہ کہا:

"فخر ابدا و نجومین مولانا فضل حق ایسا دوست مر جائے۔ غالب نیم مردہ نیم جاں رہ جائے۔

مرتے ہیں آرزو میں مرنے کی
موت آتی ہے پر نہیں آتی
آگے آتی تھی حال دل پہ ہنسی
اب کسی بات پر نہیں آتی

حضرت علامہ خیر آبادی علیہ الرحمۃ تو جام شہادت نوش فرما گئے مگر آپ کی شمع آزادی جلتی اور تحریک چلتی رہی۔ حضرت مولانا احمد رضا خاں بریلوی علیہ الرحمۃ نے بھی انگریزوں، مکسوں، ہندوؤں اور ان کے حاشیہ برداروں کی مخالفت کی۔ تحریک خلافت، ترک موالات، ہجرت من الہند کے ایام میں آپ کا بیحد مؤثر کردار رہا اور اعلیٰ حضرت نے دو قومی نظریہ کی حمایت میں صفحات لکھے "حق" میں لکھیں۔ اعلیٰ حضرت نے حضرت مولانا فضل حق خیر آبادی کے نقش قدم پر گامزن ہوتے ہوئے انگریز کی تحریکوں کا سدباب کیا اور حضرت علامہ فضل حق خیر آبادی علیہ الرحمۃ کے درس آزادی کو آگے بڑھانے میں باہم کردار ادا کیا۔

کچھ وجہ ہے جو شوخی نقش پا کی
ابھی اس راہ سے کوئی گیا ہے

﴿حوالہ جات﴾

۱۔ مرزا حیرت دہلوی: حیات طیبہ، ص: ۲۹۶، مطبوعہ فاروقی دہلی طبع اول

۲۔ مہاں نذیر حسین دہلوی: الحیات بعد الممات، ص: ۶۳، مطبوعہ مکتبہ شعیب کراچی

۳۔ ساغر صدیقی: روزنامہ امروز کراچی 17 مئی 1957ء

۴۔ شیخ محمد اسماعیل: ہفت روزہ بیل دنہار لاہور، ص: 27، 12 مئی 1957ء

۵۔ ساغر صدیقی: روزنامہ امروز کراچی 1857ء نمبر، ص: 21

۶۔ خورشید مصطفیٰ رضوی: جنگ آزادی 1857ء، ص: 455، ناشر مکتبہ جان دہلی

۷۔ انتظام اللہ شہابی: علمائے حق اور ان کی مظلومیت کی داستانیں، ص: 56، نوری بک ڈپو دہلی

۸۔ محمد میاں دہلوی: علمائے ہند کا شاندار ماضی، حصہ چہارم، ص: 486، مطبوعہ الجمعیۃ بک ڈپو دہلی

۹۔ سہ ماہی الزبیر بہاولپور، ص: 92، تحریک آزادی نمبر 1970ء

۱۰۔ مجاہد الحسینی: اخبار نوائے پاکستان 1857ء جنگ آزادی نمبر، ص: 11، 11 مئی 1957ء

۱۱۔ مستقیم احسن حامدی: ہفت روزہ خدام الدین لاہور، ص: 9-10، 23 نومبر 1926ء

۱۲۔ ایضاً

۱۳۔ ساغر صدیقی: روزنامہ امروز کراچی، جنگ آزادی 1857ء نمبر، ص: 21، 17 مئی 1957ء

۱۴۔ ایضاً

۱۵۔ شیخ محمد اسماعیل پانی پتی: ہفت روزہ بیل دنہار لاہور، ص: 27، 12 مئی 1957ء

WWW.NAFSEISLAM.COM

علامہ فضل حق پر اتہام طرازی

میاں محمد صادق قصوری

درج ذیل مضمون دراصل خطاتھا جسے سادہ الفاظ میں پیش کیا گیا ہے۔ محترم قصوری صاحب نے مجاہد کبیر علامہ فضل حق پر سید احمد و اسماعیل دہلوی کے مکتبہ فکر کی جانب سے ہونے والے پرتناتات' الزامات اور اعتراضات کا شافی وموثر جواب دیا ہے۔ ان الزامات واعتراضات کی حیثیت پانی کے بلبلے سے زیادہ نہیں۔ ملاحظہ فرمائیں

"فکر ونظر" اسلام آباد شمارہ جولائی تا ستمبر 1984ء میں ڈاکٹر ریاض کا مضمون "علامہ فضل حق خیرآبادی" نظر سے گزرا۔ ان کی محنت کی داد نہ دینا ظلم ہوگا کیونکہ ان کے مضمون سے عیاں ہوتا ہے کہ انہوں نے بہت سی کتابوں کا گہرا مطالعہ کرنے کے بعد مہب قلم دوڑایا ہے۔ میں انہیں مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

لیکن نہایت افسوس کے ساتھ یہ عرض کرنے کی جسارت بھی کرنے دیجیے کہ انہوں نے مجاہد کبیر حضرت مولانا فضل حق خیرآبادی رحمۃ اللہ علیہ سے انصاف نہیں کیا۔ انہوں نے بعض جگہوں پر نہایت نادانستہ اور دل آزار الزامات لگا کر حضرت مولانا کی روح کو بے قرار کیا ہے اور ان کے عقیدت مندوں کی دل آزاری کی ہے جو کسی لحاظ سے بھی مستحسن نہیں ہے مثلاً

❶ صفحہ ۹ پر انہوں نے تحریر فرمایا کہ علامہ (فضل حق) شاہ اسماعیل کی مخالفت کا کوئی موقعہ ہاتھ سے نہ جانے دیتے تھے اور ایک دو اسی صفحہ پر فضل حق کی تائید کے ساتھ لکھ گئے ہیں کہ انہوں نے فتویٰ کفر کی کبھی تائید وغیرہ

اس سلسلہ میں عرض ہے کہ انہوں نے نہایت جانبداری سے کام لیا ہے۔ اگر انہوں نے نگاہ انصاف سے کام لیا ہوتا تو یہ الفاظ ہرگز ہرگز صفحہ قرطاس پر نہ بکھیرتیں اور حاشیین کی اوہام تراشیوں کا سہارا نہ لیتیں۔ علامہ فضل حق نے جب بھی کسی کی مخالفت کی اصولوں کی بنا پر کی۔ شاہ اسماعیل دہلوی کی کتاب تقویۃ الایمان افراط وتفریط کا مجموعہ تھی۔ اگر اس پر علامہ نے تنقید کی تو کوئی جرم نہیں کیا۔ خود شاہ اسماعیل نے تسلیم کیا تھا کہ "میں جانتا ہوں کہ اس (تقویۃ الایمان) میں بعض جگہ زائد الفاظ بھی آگئے ہیں اور بعض جگہ تشدد بھی ہو گیا ہے مثلاً ان امور کو جو شرک خفی

ہیں شرک جلی لکھ دیا گیا ہے۔ ان وجوہ سے مجھے اندیشہ ہے کہ شورش ضرور پھیلے گی"۔ ۱

شاہ اسماعیل دہلوی کی اس کتاب سے اکناف واطراف میں شورش برپا ہوگئی اور ہنگامہ آرائی شروع ہوگئی۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ شاہ صاحب کے قدردان اور پرانے ساتھی بھی ان کی مخالفت کیے بغیر نہ رہ سکے۔ علامہ فضل حق اگر ایسے موقعہ پر پہلوتہی اور خاموشی اختیار فرماتے تو یہ گناہ عظیم ہوتا لہٰذا انہوں نے سب سے پہلے یہی کوشش کی کہ دونوں اطراف کے اس ہنگامہ اور مسلمانوں کی باہم جنگ وجدل کو قانونی طور پر روک دیا جائے تاکہ ایک طرف عوام بھی مطمئن ہو جائیں اور دوسری طرف شاہ اسماعیل کے لیے بھی بار خاطر نہ ہو۔ علامہ کے اس اقدام میں خلوص تھا، درد تھا اور ملت اسلامیہ کی فلاح کا جذبہ تھا نہ کہ کوئی ذاتی منفعت۔ بات اتنی تھی جس کو انہوں نے بڑھا چڑھا کر افسانہ بنا دیا۔

اس کے بعد شاہ اسماعیل نے امکان نظیر کا مسئلہ چھیڑ دیا بھلا اس کی ضرورت کیا تھی؟ شاید شاہ صاحب اس مسئلہ کو چھیڑ کر ملت اسلامیہ کے اتحاد کو پارہ پارہ کرنا چاہتے تھے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس کی تہہ میں کچھ اور اغراض پوشیدہ ہوں۔ بھلا ایسے موقعہ پر علامہ فضل حق جیسا حق گو اور عاشق رسول ﷺ کیسے خاموش رہ سکتا تھا۔ شاہ صاحب کی رائے یہ تھی کہ خاتم النبیین کا مثل ممکن بالذات اور ممتنع بالغیر ہے۔ علامہ فضل حق ممتنع بالذات مانتے تھے۔ اس مسئلہ پر حضرت علامہ نے امتناع النظیر کے نام سے کتاب لکھی جس کا جواب آج تک شاہ صاحب اور ان کے عقیدت مندوں پر ادھار چلا آرہا ہے۔ اس کتاب میں حضرت علامہ نے حضور پرنور ﷺ کی نظیر کے ممتنع بالذات ہونے پر جو دلائل وبراہین قائم کیے ہیں انہیں دیکھ کر بے ساختہ مرحبا وحسنت زبان پر آتا ہے۔ اس کتاب میں علمی وفنی حیثیت سے وہ گلکاریاں کی ہیں کہ صفحات کتاب تختہ گلستان بن گئے ہیں۔ ۲

اگر ذرا صاف کلاب بھی یہی خیال ہے کہ حضرت علامہ نے شاہ اسماعیل کی مخالفت بلاوجہ کی تو یہ علامہ فضل حق سے ان کے بغض کا اظہار ہے۔ کیا ان سے پوچھنے کی جسارت کی جا سکتی ہے کہ شاہ اسماعیل دہلوی نے تقویۃ الایمان لکھ کر اور مسئلہ امکان نظیر چھیڑ کر اسلام کی کون سی خدمت کی ہے؟ ہاں یہ ضرور ہے کہ ملت اسلامیہ کے اتحاد کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا ہے۔

۱ صفحہ ۵۹۔۶۲ پر ڈاکٹر صاحب کا ارشاد ہے کہ مباحثوں میں آخر کار شاہ صاحب بازی لے جاتے تھے۔ گویا مباحثوں اور مناظروں میں علامہ فضل حق شکست کھاتے تھے اور شاہ اسماعیل فتح یاب ہوتے تھے۔ یہاں انہوں نے حقیقت سے آنکھیں بند کر کے شاہ صاحب کی عقیدت ومحبت میں غلو کی حد تک سرشار ہو کر بالکل خلاف واقعہ

بات لکھ دی ہے۔ چاہیے تو یہ تھا کہ یہ کسی مباحثہ کا ذکر کرتیں اور ثابت کرتیں کہ علامہ فضل حق لاجواب ہوئے۔ مگر چونکہ ایسا نہیں ہے لہٰذا "کیا بنے بات جہاں بات بنائے نہ بنے" کے مصداق کوئی دلیل کہاں سے لاتیں۔ ایک طرف تو وہ اپنے مضمون کے صفحہ ۷۰ پر سرسید کے یہ الفاظ نقل کرتے ہیں کہ "فضلائے دہر کو کیا طاقت ہے کہ اس سرگروہ اہل کمال کے حضور میں بساط مناظرہ آراستہ کرسکیں۔ بارہا دیکھا گیا ہے کہ جو لوگ اپنے آپ کو یگانہ فن سمجھتے تھے جب ان (علامہ فضل حق) کی زبان سے ایک حرف سنا، دھوئی کمال کو فراموش کر کے نسبت شاگردی کو اپنا فخر سمجھتے۔" ص

لیکن دوسری طرف حضرت علامہ کو شاہ اسماعیل کے سامنے بے بس بتاتے ہیں۔ اب سمجھ میں نہیں آتا کہ کون سی بات کو درست مانیں اور کون سی بات کو غلط۔ اے کاش آپ حق و باطل میں امتیاز کرسکیں لیکن

ایں سعادت بزور بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

③ ڈاکٹر صاحبہ نے اپنے مضمون کے صفحہ ۶۲ پر "امیر الروایات" کے حوالے سے لکھا ہے کہ "علامہ فضل حق جزائر انڈیمان میں دوران قید بہت نادم تھے، روتے تھے اور فرماتے تھے مجھ سے سخت غلطی ہوئی کہ میں نے مولوی اسماعیل کی مخالفت کی۔ وہ بے شک حق پر تھے اور میں غلطی پر تھا۔ مجھ پر جو یہ مصیبت پڑی ہے یہ میرے انہی اعمال کی سزا ہے۔ میری مولوی اسماعیل سے دوستی تھی اور میں بھی ان کے ساتھ شہید ہوتا مگر کیا کیجیے بدایوں والوں نے ابھار کر ان سے بحر وادیا اور میں علم کے غرور میں حق کو باطل کرنے پر تل گیا۔ تم لوگ گواہ رہنا کہ میں اپنے خیالات باطلہ سے توبہ کرتا ہوں اور میں اگر رہا ہو گیا تو اپنی توبہ شائع کروں گا"۔

ڈاکٹر صاحبہ! خوف خدا بڑی چیز ہے۔ آپ نے "امیر الروایات" سے یہ جھوٹ کا پلندہ نقل کرتے وقت جس دیدہ دلیری کا مظاہرہ کیا ہے وہ انتہائی قابل افسوس ہے۔ علامہ فضل حق کے نام ہوئے "روئے" پہنچانے اور توبہ کرنے کا قصہ ان کے مخالفین یعنی شاہ اسماعیل دہلوی کے پیروکاروں کا طبع زاد ہے۔ علامہ فضل حق کی شاہ اسماعیل سے کوئی ذاتی مخالفت یا عداوت نہ تھی۔ کوئی دنیاوی جھگڑا نہ تھا کہ علامہ بعد میں پچھتاتے کہ محض دنیا کی خاطر جھگڑتے رہے اور بے مقصد مخالفت کرتے رہے۔ یہاں تو جھگڑا تھا مقام مصطفیٰ ﷺ کا۔ شاہ اسماعیل صاحب مقام مصطفیٰ ﷺ سے نا آشنا تھے۔ انہوں نے تقویۃ الایمان لکھ کر شان رسالت میں بے شمار گستاخیاں کیں اور مقام رسول ﷺ کو گھٹانے کی

سمی نا مشکور کی۔ انہیں غلامانِ رسول ﷺ کی ہر بات میں شرک نظر آتا تھا اور وہ حضور ﷺ کو معاذ اللہ "برابھائی" سمجھتے تھے[۳] اور فرماتے تھے کہ "جس کا نام محمد یا علی ہے وہ کسی چیز کا مختار نہیں"[۵] اور ہر مخلوق بڑا ہو یا چھوٹا وہ اللہ کی شان کے آگے چمار سے بھی ذلیل ہے"۔[۶]

علامہ فضل حق نے شاہ صاحب کے ان عقائد باطلہ کی دلائل و براہین سے تردید کی اور شاہ صاحب کی لغویات کا برسرِ عام پردہ چاک کیا۔ شاہ مخصوص اللہ دہلوی، مولانا محمد رشید الدین خاں، شاہ احمد سعید دہلوی، مفتی صدر الدین آزردہ، شاہ محمد موسیٰ دہلوی جیسے بے شمار منتخب روزگار حضرات علامہ صاحب کے ہمنوا و موید تھے۔ بایں ابتدا ان کے نادم ہونے یا بچھتانے کا سوال چہ معنی دارد؟

حضرت علامہ کے مخالفین کے قربان جاؤں کہ انہوں نے شاہ اسماعیل کو حق پر اور علامہ کو غلطی پر ثابت کرنے کے لیے مفتی عنایت احمد کاکوروی کے حوالے سے کیا خوب داستان گھڑی ہے کہ حضرت علامہ نے مفتی صاحب کے ہاتھ کہلوا بھیجا تھا کہ "میں اپنے خیالات باطلہ سے توبہ کرتا ہوں۔ مجھ پر جو مصیبت پڑی ہے وہ شاہ صاحب کی مخالفت کی سزا ہے۔ میں واپس آ کر توبہ نامہ شائع کراؤں گا"۔

ڈاکٹر صاحب! میں بڑے ادب و احترام کے ساتھ آپ سے سوال کرتا ہوں کہ صاحب امیر الروایات نے مفتی عنایت احمد کاکوروی سے یہ پیغام کب وصول کیا؟ مفتی صاحب نے خود کیوں نہ اپنی کتاب میں اس کا ذکر کیا اور نہ اُن کے معاصرین نے نقل کیا اور پھر آج تک امیر الروایات کے علاوہ کسی اور کتاب میں آپ کے اکابرین کے اس طبع زاد افسانے کا تذکرہ نہ ملا۔ اگر علامہ صاحب نے مفتی صاحب کو گواہ بنا کر توبہ کی تھی اور رہا ہو کر توبہ نامہ شائع کرانے کا ارادہ ظاہر کیا تھا تو مفتی صاحب کو ہی "توبہ نامہ" لکھ کر کیوں نہ دے دیا کہ وہ میری طرف سے واپس ہندوستان جا کر شائع کروا دیں۔ توبہ نامہ کی اشاعت کو اپنی رہائی کی اُمید پر اتوام میں کیوں رکھا؟ اگر حضرت علامہ، جزائر انڈیمان سے قید و بند کے دوران اپنی کتاب "رسالہ غدریہ" (باغی ہندوستان) مفتی صاحب کے ہاتھ اپنے صاحبزادے مولانا عبدالحق کو بھیج سکتے تھے تو توبہ نامہ بھیجنے میں کون سا امر مانع تھا؟

مفتی عنایت احمد کاکوروی کی وفات 1863ء 1279ھ میں ہوئی۔[۸] اس وقت صاحب امیر الروایات کی عمر کیا تھی؟ کیا ان کی مفتی صاحب سے ملاقات ہوئی؟ اگر ہوئی تو کہاں؟ امید ہے کہ یہ عقدہ حل کرنے میں بخل سے کام نہیں لیا جائے گا۔

جہاں تک میرے ناقص علم کا تعلق ہے صاحب امیر الروایات نے شاہ سے زیادہ شاہ پرست بننے کے شوق

میں اپنی طبع زاد کہانی کو مفتی عنایت احمد صاحب سے منسوب کر کے خیراتی وکیل کا کردار ادا کیا ہے لیکن تاریخ کسی کو معاف نہیں کرتی۔ آج شاہ اسماعیل اور علامہ فضل حق خیرآبادی دونوں کے کردار قوم کے سامنے ہیں۔ لوگ جان چکے ہیں کہ انگریز کا وفادار کون تھا اور انگریز کو ہندوستان سے نکالنے کے لیے جہاد کا فتویٰ دے کر میدانِ عمل میں آنے والا کون ہے؟ لہٰذا ایسی بے سروپا اور جھوٹی داستانیں گھڑنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔

④ ڈاکٹر صاحبہ نے مضمون کے صفحہ: ۱۳ پر جہاد ہنومان گڑھی کے خلاف علامہ فضل حق کے فتویٰ کا ذکر کے تجاہل عارفانہ کا ثبوت دیا ہے۔ نہ معلوم حقائق سے کن روپہلی مصلحتوں کی بناء پر چشم پوشی کی گئی ہے۔ علامہ نے جہاد ہنومان گڑھی کے خلاف کوئی فتویٰ نہیں دیا۔ علامہ کے مخالفین نے ان کی عظمت کے مینار کو گرانے کے لیے جہاں اور مہربانیاں کیں وہاں اس فتویٰ کا الزام بھی عائد کر دیا۔ سب سے پہلے یہ الزام سید کمال الدین حیدر نے عائد نے کیا ہے جو انگریزوں کے خاص آدمی تھے اور جنہوں نے مسٹر ایلیٹ (مشہور مؤرخ) کی فرمائش پر اودھ کی تاریخ ''قیصر التواریخ'' مرتب کی تھی اور اس تاریخ کی بنا پر وہ واجد علی شاہ کے معتوب اور ملازمت سے برطرف ہونے تھے اور اسی الزام کو مولوی نجم الغنی خاں نے برسوں بعد اپنی تاریخ اودھ (مطبوعہ 1919ء) میں من وعن نقل کیا۔

مسجد پر ہندوؤں کے قبضے اور قرآن کریم کی بے حرمتی کے خلاف جہاد کی تحریک شروع ہوئی تو اودھ کی حکومت نے اس کی مزاحمت کے لیے علماء کی خدمات حاصل کیں۔ ایک استفتاء مرتب ہوا جس کے جواب میں علماء نے مجاہدین کے مقابلے میں حکومت کے نقطۂ نظر کی تائید کی۔ اس فتوے پر دستخط کرنے والے علماء میں سید کمال الدین نے مولانا فضل حق کا بھی نام لیا ہے مگر لطف یہ ہے کہ اسی کتاب میں جہاں وہ فتویٰ نقل کیا ہے اس پر مولوی محمد یوسف' مولوی احمد اللہ' مولوی خادم احمد' مولوی محمد سعد اللہ' مولوی تراب علی کے دستخط ہیں اور علامہ فضل حق کے دستخط نہیں ہیں۔ مولوی نجم الغنی خاں نے بھی تاریخ اودھ میں یہ فتویٰ نقل کیا ہے مگر یہاں بھی علامہ فضل حق کے دستخط نہیں ہیں۔ حدیقۃ الشہداء میں بھی جو مولوی امیر علی امیر المجاہدین کے ایک رفیق کی تالیف ہے اور اسی سال شائع ہوئی تھی' علماء کے فتوے درج ہیں لیکن مولانا فضل حق کا فتویٰ ہے نہ دستخط۔ آخر صاحب قیصر التواریخ کا یہ بے اصل بیان کیسے تسلیم کر لیا جائے خصوصاً جب کہ انہی کی اس کتاب میں فتویٰ پر علامہ کے دستخط نظر نہیں آتے۔ ⑨

حدیقۃ الشہداء اب بالکل نایاب ہو چکی ہے۔ سید رئیس احمد جعفری نے اس کی تاریخی اہمیت کے پیش نظر اپنی کتاب ''واجد علی شاہ اور ان کا عہد'' مطبوعہ شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور میں کاملاً نقل کر دی ہے۔ میرے پیش نظر اشاعت دوم 1967ء ہے۔ جس کے صفحہ ۲۱۱ تا ۲۳۵ پر یہ کتاب (حدیقۃ الشہداء) محیط ہے۔ صفحہ ۲۳۹ پر استفتاء

اور فتویٰ موجود ہے۔ مگر اس میں نہ تو علامہ فضل حق کا نام ہے نہ دستخط اور نہ ہی کہیں ذکر۔

حدیقۃ الشہداء میں یہ ضرور درج ہے کہ حکومت نے اس سلسلے میں ایک پنچایت بنائی تھی جس کے چار ثالث مقرر کیے تھے۔ ان میں سے ایک مولانا فضل حق بھی تھے۔ مگر حکومت نے اس پنچایت کی کوئی میٹنگ ہی نہیں بلائی۔ اس لیے اس بات کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ علامہ فضل حق کا اس سلسلے میں کس طرف رجحان تھا؟ [1]

سید محمد میاں اپنی کتاب "علماء ہند کا شاندار ماضی" میں لکھتے ہیں کہ حکیم نجم الغنی مصنف تاریخ اودھ اور مفتی انتظام اللہ صاحب شہابی مصنف ایسٹ انڈیا کمپنی اور باغی علماء نے بھی یہ ذکر کیا ہے کہ مولانا امیر علی شاہ صاحب کے خلاف جو فتویٰ مرتب کیا گیا تھا اس میں مولانا فضل حق خیرآبادی نے بھی دستخط کیے تھے لیکن اسی واقعہ کے متعلق سوال اور شیعہ سنی علماء کے فتاویٰ قیصر التواریخ جلد دوم میں موجود ہیں اور حکیم صاحب نے بھی اپنی تاریخ میں نقل کیے ہیں۔ ان میں حضرت خیرآبادی کا نام بحیثیت مجیب ہے نہ تائید و تصویب کرنے والوں میں۔ [2]

پروفیسر محمد ایوب قادری نے بھی یہ تسلیم کیا ہے کہ تصفیہ کے لیے جو چار ثالث مقرر ہوئے تھے ان میں علامہ فضل حق خیرآبادی بھی شامل تھے۔ مگر اس ثالثی کونسل کی کوئی میٹنگ نہ ہوئی پھر آگے چل کر پروفیسر صاحب مولانا نجم الغنی کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ دوسرے علماء کے ساتھ علامہ فضل حق نے بھی جہاد کے خلاف فتویٰ پر دستخط کیے مگر کتاب میں نقل کردہ فتوے میں علامہ کے دستخط یا تائید نہیں ہے۔ [3] چونکہ پروفیسر صاحب نے مولوی عبدالغنی کے حوالے سے لکھی پر لکھی ماری ہے اور یہ خیال نہیں کیا کہ جو فتویٰ درج کر رہا ہوں اس میں تو علامہ کے دستخط نہیں ہیں۔ اس مقام پر اگر میں یہ کہوں کہ تعصب نے ان لوگوں کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی ہے تو بے جا نہ ہوگا۔

ڈاکٹر صاحب! خدارا میری معروضات پر ذرا ٹھنڈے دل سے غور فرمایئے اور قبول حق کو عار نہ سمجھیے۔ خواہ مخواہ اکابرین پر الزام تراشی کسی لحاظ سے بھی مستحسن نہیں ہے۔ کسی ایک شخصیت سے عقیدت کا مطلب یہ نہیں ہونا چاہیے کہ دوسری شخصیت کی پگڑی اچھالی جائے۔ امید ہے کہ میری اس جسارت کو گستاخی پر محمول نہیں کیا جائے گا۔

انداز بیاں گرچہ میرا شوخ نہیں ہے
شاید کہ اتر جائے ترے دل میں میری بات

﴿حوالہ جات﴾

[1] عبدالشاہد خاں شروانی: باغی ہندوستان، مطبوعہ بجنور 1947ء، ص: ۱۱۵ [2] ایضاً، ص: ۱۱۷

[3] محمد اسماعیل پانی پتی: مقالات سرسید شانزدہم، مطبوعہ لاہور 1965ء، ص: ۳۲۸

۴ شاہ اسماعیل دہلوی: تقویۃ الایمان، مطبوعہ اہلحدیث اکادمی کشمیری بازار لاہور، ص:۱۱۱

۵ ایضاً، ص:۸۲ ۶ ایضاً، ص:۴۳

۷ شاہ ابوالحسن زید فاروقی: مولانا اسماعیل دہلوی اور تقویۃ الایمان، مطبوعہ لاہور 1984ء، ص:۷۱

۸ حکیم سید احمد علوی: سخنوران کاکوری، مطبوعہ کراچی 1978ء، ص:۲۷۲

۹ حکیم محمود احمد برکاتی: فضل حق خیرآبادی اور سن ستاون، مطبوعہ کراچی 1975ء، ص:۱۲۶۔۱۲۷

۱۰ رئیس احمد جعفری: واجد علی شاہ اور ان کا عہد، مطبوعہ لاہور 1967ء، ص:۲۳۶

۱۱ مولانا محمد میاں: علماء ہند کا شاندار ماضی، جلد چہارم، مطبوعہ مکتبہ محمودیہ لاہور 1977ء، ص:۴۳۶

۱۲ پروفیسر محمد ایوب قادری: جنگ آزادی 1857ء، کراچی 1976ء، ص:۱۰۳۔۱۰۸ تا ۱۱۰

جنگ آزادی میں مولانا فضل حق خیرآبادی کی شرکت

ضیاء الدین لاہوری

محترم ضیاء الدین لاہوری' علامہ اقبال ٹاؤن لاہور تاریخی تحقیق کے حوالے سے جانے پہچانے صاحب قلم ہیں۔ وہ جس موضوع پر خامہ فرسائی کرتے ہیں' اس کا حق ادا کرتے ہیں۔ موصوف نے "بہادر شاہ ظفر کے شب وروز" اور "1857 کے چند اہم کردار" نامی کتابوں کی تصنیف کے وقت لندن میں انڈیا آفس لائبریری' برٹش میوزیم اور لندن یونیورسٹی کی لائبریری سے بھرپور استفادہ کیا ہے۔ پیش نظر مقالہ بھی لاہوری صاحب کے شستہ وشگفتہ اسلوب نگارش کا آئینہ ہے۔ ملاحظہ فرمائیں

برصغیر پاک وہند میں بعض مرحوم شخصیات کی ملی وسماجی خدمات کے تذکروں میں ہمارے اہل قلم بہت ہی غلو برتتے ہیں۔ اگر کوئی شخصیت شعوری یا غیر شعوری طور پر ہمارے من کو بھا جائے تو محض اس عقیدت کی بنا پر ہم اس کے رتبے کو بلند و بالا کرنے کے لیے بعض واقعات گھڑ لیتے ہیں اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ من گھڑت واقعات تاریخی حوالوں کی صورت اختیار کر جاتے ہیں۔ اس کے برعکس اگر کسی پس منظر کے تحت ہمارے دل میں کسی شخصیت سے نفرت پیدا ہو جائے تو اس کی تحقیر کی خاطر مستند حوالوں میں قطع وبرید کر کے اس کے مثبت کاموں کو بھی منفی قرار دے ڈالتے ہیں اور حقیقت میں اس سے اپنی دلی نفرت کے اظہار کے اس انداز سے اصل مقصود محض اپنے مخاصمانہ جذبات کی تسکین ہوتا ہے۔

مولانا فضل حق خیرآبادی پر 1857ء کی جدوجہد آزادی میں شرکت کے جرم میں مقدمہ چلایا گیا جس میں انہیں کالے پانی کی سزا دی گئی اور وہ جزائر انڈمان میں آخر دم تک اسیر رہے۔ ہمارے اہل قلم کا ایک مخصوص طبقہ اس جدوجہد میں ان کے حصے لینے سے انکاری ہے اور ان کے مداحوں کے بیان کردہ بعض واقعات کو افسانے قرار دیتا ہے۔ مداحوں کا بیان ہے کہ انہوں نے دہلی میں انگریزوں کے خلاف جہاد کا فتویٰ دیا جبکہ ان کے مخالف یہ جواز پیش کرتے ہیں کہ ایسے فتوے پر ان کے دستخط موجود نہیں۔ وہ ان کے عدم شرکت کے ثبوت میں ان کے بعض

بیانات کو سیاق وسباق کے بغیر جزوی طور پر پیش کرتے ہیں یا پھر اس قسم کے شبہات پیدا کیے جاتے ہیں جیسے کہ ان کی شرکت گویا عطاءات کے تابع تھی۔

پروفیسر افضل حق قرشی مؤخر الذکر فریق کے ترجمان دکھائی دیتے ہیں۔ 1987ء میں ان کے عزیز ترین دوست سعید الرحمن علوی مرحوم کی مرتب کردہ ایک کتاب "مولانا فضل حق خیرآبادی اور جہاد آزادی" کے عنوان سے شائع ہوئی تھی۔ اس میں آٹھ مضامین اور دو ضمیمے شامل تھے۔ ان میں سے پروفیسر موصوف کا ایک مقالہ بھی تھا۔ فاضل مرتب نے اپنے دیباچے میں خاص طور پر ان کی تعریف کی تھی۔ علوی صاحب کی وفات کے بعد 1992ء میں انہوں نے اس کتاب میں چار مضامین جن میں اپنے مضمون کا تقریباً ایک حصہ جو 1857ء کی جدوجہد میں مولانا کی عدم شرکت کے بیان تک محدود تھا منتخب کیے اور مجموعے کو نیا نام "مولانا فضل حق خیرآبادی.....ایک تحقیقاتی مطالعہ" دے کر اپنے نام سے شائع کرنے کا اعزاز حاصل کرلیا۔ ذیل میں ان کے مضمون کے حوالے سے چند گزارشات پیش خدمت ہیں۔

مولانا فضل حق کا سب سے بڑا جرم یہ بیان کیا جاتا ہے کہ ان کے بعض شیدائیوں نے غلط یا صحیح جہاد آزادی کے حق میں جاری کیے گئے ایک فتوے میں ان کے شامل ہونے کا ذکر کیا اور چونکہ ایسا کرنے والے اپنے موقف کی حمایت میں کوئی دستاویزی ثبوت بہم نہ پہنچا سکے اس لیے ان کا ممدوح منصب ٹھہرا اور اس کا ہر کام اس کے مداحین کی متذکرہ نااہلیت کے باعث خفی قرار پایا۔ اس مغلطہ فکر کے حامل اہل قلم ہر وقت اس دھن میں مگن رہتے ہیں کہ مولانا کی خوبیوں پر پردہ ڈالا جائے اور اختلافی امور بیان کیے جائیں تاکہ ان کی قومی خدمات شکوک کی زد میں آکر مکلوس انداز میں پیش ہوں۔ معلوم ہوتا ہے کہ ان لوگوں کو مولانا کی زندگی کی علمی سرگرمیوں کے بعض پہلو پسند نہیں جس کا اظہار وہ متذکرہ صورت میں کرتے رہتے ہیں۔

ناوم سیتاپوری اس کیفیت کو یوں بیان کرتے ہیں: "انگریز اور ان کے ہوا خواہ تو مولانا سے اس لیے ناراض تھے کہ انقلاب کن ستاون کے سلسلے میں کسی نہ کسی نہج سے ان کا نام آ گیا لیکن مسلمانوں کا ایک پروپیگنڈسٹ گروپ مولانا سے اس لیے بیزار تھا کہ وہ ان کے مذہبی نظریات کے خلاف عالمانہ مجاہدہ کر چکے تھے۔ یہ باوقار علمی مباحثہ کوئی ذاتی اور عامیانہ جنگ نہیں تھی جس کا سہارا لے کر مولانا خیرآبادی کے خلاف ایک مستقل محاذ قائم کر دیا جاتا لیکن ہوا کچھ ایسا ہی"۔[1]

یہ بات یقیناً درست ہے کہ جب تک 1857ء میں انگریزوں کے خلاف فتووں میں مولانا کے دستخط موجود

ہونے کا ثبوت بہم نہ پہنچایا جائے اس وقت تک ان کو فتوی کنندوں میں شمار نہیں کیا جاسکتا لیکن یہ بھی انصاف نہیں کہ محض اس بنا پر ان کی جنگ آزادی میں شرکت سے انکار کردیا جائے۔ جہاں تک دستیاب فتووں میں ان کا نام موجود نہ ہونے کا تعلق ہے' یہ سوال ذہن میں اٹھتا ہے کہ ہندوستان کے ہزارہا علماء' جن کے دستخط ان فتووں پر نہیں کیا وہ تمام اللہ تعالیٰ کے ہاں معتوب ہوں گے؟ کیا اس بنیاد پر جنگ آزادی میں ان کی سرگرمیاں اور قربانیاں ملعون ٹھہریں گی؟ کیا یہ لوگ ان علماء سے بدتر ہیں جنھوں نے فتووں پر واقعی دستخط کیے مگر بعد میں مکر گئے یا اپنی بریت کے لیے متعدد بہانے تراشے؟ یہی اہل قلم خود اس دور کے ان بے شمار علماء کے قصیدے بیان کرتے ہیں جو فتوی کنندگان میں شامل نہیں۔ معلوم ہوا کہ موجود فتووں پر کسی عالم کے دستخط موجود ہونا ضروری طور پر اس کے حریت پسند ہونے کا کوئی ثبوت نہیں اور نہ ان پر اس کا نام نہ پایا جانا کوئی جرم ہے۔ جنگ آزادی میں اس کے مجموعی طرز عمل ہی سے اس کے کردار کی جانچ کی جاسکتی ہے۔ اس دور میں علماء کی ایک تعداد نے انگریزوں کے خلاف جہاد کے حق میں فتوے دیے جس سے عام مسلمانوں میں آزادی حاصل کرنے کے جذبے کو تقویت حاصل ہوئی' بالکل درست! ہاں' اگر ایسے فتوے پر کسی عالم کا دستخط کرنے سے انکار کردینے کا کوئی قابل قبول ثبوت ملتا ہے تو پھر اس امر پر بحث کی گنجائش موجود ہے مگر یہاں صرف مولانا فضل حق کے دستخطوں کی عدم دستیابی کے مسئلے نے ایک علمی جنگ کا ماحول پیدا کر رکھا ہے اور اس کی تائید اور تردید میں مقالوں پر مقالے لکھے گئے ہیں حالانکہ ضرورت اس امر کی تھی کہ ان لوگوں کے کرتوت اجاگر کیے جاتے جو اندر سے کچھ اور تھے اور باہر سے کچھ اور لیکن ان کا حدود اربعہ متعین کرنے میں کوئی سرگرمی نہیں دکھائی گئی۔

پروفیسر قریشی مولانا کے خلاف سب سے پہلی شہادت سید بہارک شاہ کو تو ال کی دیتے ہیں کہ "فضل حق نے جہاد کے حق میں کوئی فتوی نہیں دیا یا کسی بھی طریقے سے بادشاہ کو گمراہ نہیں کیا"۔[۱۰]

موصوف نے اپنے مقصد کا حوالہ تو ڈھونڈ لیا مگر شاید ان کو علم نہیں کہ وہی کوتوال مفتی صدرالدین کے بارے میں بھی یہ کہتا ہے کہ: "شہر کے صدرالصدور کو شہزادوں اور فوج دونوں نے بار بار اس امر کا فتوی جاری کرنے کو کہا کہ وہ جس جہاد میں مصروف ہیں وہ جائز اور درست ہے اور اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کا باعث ہے۔ مفتی صاحب نے ایسا کرنے سے ہمیشہ احتراز کیا۔ دراصل ایسا کوئی فتوی ممکن ہی نہیں کیونکہ قرآن اور مذہب اسلام میں اس قسم کی اعلان کا وجود کہیں بھی نہیں پایا جاتا"۔[۱۱]

جبکہ موصوف کی اس کتاب کے ایک مضمون میں شامل ایک فتوے کے دستخط کنندگان میں مفتی صدرالدین

صاحب کا نام موجود ہے۔ امتیاز علی عرشی کے اس مضمون میں بیان کیا گیا ہے کہ ڈاکٹر اطہر عباس کی ہندی کتاب "سوتنتر دہلی" کے آخر میں "بہت سے اہم کاغذات کے عکس بھی چھاپ دیے گئے ہیں۔ ان کے منجملہ صادق الاخبار دہلی مؤرخہ 26 جولائی 1857ء کا نوٹ بھی ہے۔ اس کے ایک صفحے پر فتویٰ جہاد بھی موجود ہے"۔[۴] "اخبار الظفر" دہلی کے حوالے سے اس کے استفتاء اور جواب کی جو عبارتیں مضمون میں نقل کی گئی ہیں ان کے مطابق فتویٰ کنندگان میں نمبر 3 پر مفتی صدرالدین کا نام ملاحظہ کیا جاسکتا ہے۔[۵]

یہاں یہ کیفیت بھی سامنے آتی ہے کہ محققین نے اس دور میں جاری ہونے والے ایک سے زائد فتووں کا ذکر بھی کیا ہے۔ کیا کوئی یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہے کہ اس دور میں جتنے فتوے جاری ہوئے ان سب کا ریکارڈ محفوظ ہے؟ سوچنے کی بات ہے کہ اگر کل کلاں کوئی ایسا فتویٰ دستیاب ہوجائے جس میں مولانا کے دستخط موجود ہوں تو ان "محققین" کی سیمینہ تحقیق کی کیفیت کیا ہوگی؟

حیران کن امر یہ ہے کہ اہل قلم کے اس قبیلے کے ممتاز فرد غلام رسول مہر فتوے کی تیاری اور مشورے میں مولانا کا ذکر کرتے ہیں مگر جنگ آزادی میں ان کی شرکت سے انکاری ہیں۔ فرماتے ہیں: "میرا خیال ہے کہ یہ فتویٰ مولانا فضل حق ہی کے مشورے سے تیار ہوا تھا اور ان ہی نے علماء کے نام تجویز کیے جن سے دستخط لیے گئے۔ غالباً یہی فتویٰ تھا جو انجام کار مولانا کے خلاف مقدمے کا باعث بنا' ورنہ انہوں نے نہ کسی جنگ میں حصہ لیا تھا' نہ ان کے پاس کوئی عہدہ تھا' نہ کسی کے قتل میں شرکت کی تھی اور نہ ان کے خلاف کوئی اور سنگین الزام تھا"۔[۶]

پروفیسر قریشی بھی مولانا کی شرکت کے بارے میں فرماتے ہیں کہ "مولانا جنگ آزادی میں شریک نہیں تھے۔ جیسا کہ عام طور پر سمجھا جاتا ہے۔ وہ دہلی خصوصاً باغیوں سے ملتے نہیں گئے تھے"۔[۷]

اس کے بعد انہوں نے مولانا ہی کے درج ذیل الفاظ سے اپنا مطلب اخذ کرنے کی کوشش کی ہے: "اس وقت دہلی میں میرے اکثر اہل وعیال موجود تھے اور مجھے بلایا بھی گیا تھا۔ ساتھ ہی فلاح' کامیابی' کشائش وشادمانی کی امید بھی تھی۔ جو کچھ ہونے والا تھا' وہ تو پہلے ہی مقدر ہو چکا تھا۔ میں نے دہلی کا رخ کر دیا۔ وہاں پہنچ کر اہل وعیال سے ملا' اپنی عقل اور فہم کے مطابق لوگوں کو اپنی رائے اور مشورہ سے آگاہ کیا لیکن انہوں نے میرا مشورہ قبول نہ کیا اور نہ میری بات مانی"۔[۸]

موصوف نے مولانا کی رائے اور مشورہ کو مخفی ظاہر کرنے کے لیے منشی جیون لال کی ڈائری سے درج ذیل اقتباس دے کر جعل ان کے یہ "عقدہ" کھولا ہے کہ مولانا جنگ کے حامی نہیں: "مولوی فضل حق نے اطلاع دی کہ

انگریزی اخبارات لکھ رہے ہیں کہ شہر پر قبضہ ہو جانے کے بعد باشندوں کا قتل عام کیا جائے گا، شہر کو مسمار کر دیا جائے گا اور بادشاہ کے گھرانے میں ایک بھی آدمی ایسا نہ چھوڑا جائے گا جو بادشاہ کا نام لے یا اسے پانی کا ایک قطرہ بھی دے سکے۔ اس کے بعد مولوی نے کہا کہ حضور کو مناسب ہے کہ سپاہیوں کو ترغیب دے کر انگریزوں کے مقابلے سے روک دیا جائے کیونکہ وہ کسی نوع انگریزوں پر فتح نہیں پا سکتے"۔ ۹

مضمون نگار موصوف کے پیش رو غلام رسول مہر درج بالا لفاظ کو مولانا کی گفتگو تسلیم نہیں کرتے۔ ان کا بیان ہے کہ" مجھے یقین ہے کہ یہاں اردو روزنامچے کے انگریزی مترجم سے شدید غلطی ہوئی ہے۔ یہ رائے کسی اور کی ہوگی جو مولانا سے منسوب کر دی گئی"۔ ۱۰

مگر ہمارے مضمون نگار کی تو ساری تحقیق کی بنیاد ہی مولانا کا یہ مشورہ ہے۔ ہم اس حوالے کی عبارت کو مولانا کی گفتگو قرار دینے سے انکار نہیں کرتے لیکن دیکھنا ہوگا کہ اس مشورے کا پس منظر کیا تھا اور بادشاہ نے ان کی باتوں کا کیا جواب دیا؟ قابل ذکر بات یہ ہے کہ جیون لال کے بیان سے درج بالا حوالے کے بعد کی عبارت ﴿وقفوا الصلوٰۃ﴾ کی مثال کی مانند حذف کر دی گئی کیونکہ اس سے ہی صحیح صورت حال کی وضاحت ہوتی تھی اور من پسند نتائج حاصل کرنے کے لیے ایسا کرنا ضروری تھا۔ افسوس ہے کہ اس نامکمل حوالے سے متاثر ہو کر بعض دیانت دار محقق بھی انہیں کی رو میں بہہ گئے اور اس جدوجہد میں مولانا کی شرکت کو خفی انداز میں قبول کیا۔ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ کسی نتیجے پر پہنچنے سے قبل جیون لال کے بیان کا باقی حصہ بھی ملاحظہ کر لیا جائے۔ وہ متذکرہ بالا بیان کے بعد لکھتا ہے:" بادشاہ نے جواب دیا کہ اپنی افواج کو لڑنے کے لیے لے جاؤ اور انگریزوں کے خلاف لڑاؤ۔ مولوی نے جواباً کہا کہ افسوس تو اسی بات کا ہے کہ سپاہی ان کا کہنا نہیں مانتے جو ان کی تنخواہ دینے کے ذمہ دار نہیں ہیں۔ بادشاہ نے جواب دیا کہ" اچھا تو اپنی فوج کو تحاصل حاصل کرنے کے کام پر لگا دو"۔ ۱۱

اس تمام گفتگو سے معلوم ہوا کہ مولانا بادشاہ کو وقت کے اہم ترین مسئلے کا احساس دلا رہے تھے۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ اگر اسے حل نہ کیا گیا تو فتح ناممکن ہے اور شہر کے باشندے خواہ مخواہ قتل عام کی زد میں آئیں گے۔ اس وقت شہر میں مالی بدنظمی کا جو عالم تھا جیون لال کے روزنامچے کی لحہ بہ لحہ داستان میں اس کی بڑی تفصیل موجود ہے۔ سپاہیوں کے پاس اپنی بھوک مٹانے کے لیے خوراک موجود نہ تھی اور نہ اپنے خاندان کی کفالت کے لیے کوئی رقم۔ وہ آئے دن بادشاہ سے اپنی تنخواہوں کا مطالبہ کرتے تھے۔ بادشاہ ان کا مطالبہ کیسے پورا کرتا جبکہ اس کے پاس کوئی خزانہ نہیں تھا۔ وہ تو خود انگریزوں کا وظیفہ خوار تھا اور ان حالات میں اسے وہ رقم ملنی بھی بند ہو چکی تھی لہٰذا سپاہی روزمرہ

ضروریات پوری کرنے کے لیے شہر میں لوٹ مار کرتے تھے اور مالدار افراد سے بزور بازو روپیہ وصول کیا جاتا تھا جس کی پکار دربار میں بھی ہوتی تھی۔ حتمذ کر و بالا گنتگو 18 اگست کو ہوئی۔ صرف اس وقت تک کے بے شمار واقعات میں سے چند ایک کا ہلکا سا خاکہ پیش خدمت ہے:

- "(14 مئی) دیسی افسروں نے پھر فوجوں کے راشن کے لیے مطالبہ کیا اور کہا کہ فوجوں کو لوٹ مار سے نہیں روکا جاسکتا"۔ [۱۲]
- "(15 مئی) خیر آبادی کہ باغی شہر کے باشندوں سے بہ جبر روپیہ وصول کر رہے ہیں"۔ [۱۳]
- "(21 مئی) آج قلعہ سپاہیوں سے بھر گیا جو اپنی تنخواہ کے لیے چلا رہے تھے"۔ [۱۴]
- "(2 جولائی) جنرل نے منادی کرادی کہ..... جو سپاہی لوٹ مار کرتا ہوا پکڑا جائے گا اس کے ہتھیار اس سے چھین لیے جائیں گے"۔ [۱۵]
- "(7 اگست) سفر بینا کے ایک صوبیدار نے متنبہ کیا کہ اگر فوج کو فی الفور تنخواہ نہ دی گئی تو وہ شہر میں لوٹ مار شروع کر دے گی"۔ [۱۶]
- "(17 اگست) خیر آباد کے توپچیوں نے بغیر تنخواہ کام کرنے سے انکار کر دیا ہے"۔ [۱۷]

ان حالات میں سپاہیوں کی ایک بھاری تعداد مجبوراً روز بروز اپنے گھروں کو واپس جا رہی تھی۔ صرف تین رپورٹیں ملاحظہ فرمائیں:

- "(31 مئی) تقریباً ایک ہزار سپاہی اپنی وردیاں پھینک کر فقیروں کے بھیس میں اپنے اپنے گھر چل دیے ہیں"۔ [۱۸]
- "(15 اگست) آج تین سو سپاہی تنخواہ کے ملنے سے مایوس ہو کر اور بغاوت کے نتائج سے دل برداشتہ ہو کر بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اپنے ہتھیار اور نقد انعامی پیش کر دیں اور گلگت دروازے سے گزر کر اپنے اپنے گھر چلے گئے"۔ [۱۹]
- "(16 اگست) کل تقریباً دو سو سپاہیوں نے فقیروں کا بھیس بدل کر بھاگنے کی کوشش کی تھی مگر یہ لوگ پکڑے گئے اور انھیں واپس لایا گیا۔ بادشاہ سلامت نے بذات خود ان کے بیان لیے۔ انھوں نے کہا کہ ایک تو ان کے پاس کوئی رقم نہیں دوسرے ان کے گھر تباہ ہو رہے تھے اس لیے انھوں نے اپنے گھر جانے کا ارادہ کیا تھا۔ ان سے ہتھیار لے لیے گئے اور انھیں گھروں کو جانے کی اجازت دے دی گئی"۔ [۲۰]

غور کا مقام ہے کہ کیا ان حالات میں انگریزوں پر فتح کی کوئی امید کی جاسکتی تھی؟ مولانا کی جو نامکمل گفتگو

فاضل مضمون نگار نے پیش کی وہ اسی پس منظر کے تحت تھی اور وہ بادشاہ کو اس صورت حال کے متوقع نتائج سے آگاہ کر کے اسے بالواسطہ طور پر یہ احساس دلا رہے تھے کہ سپاہیوں کی تنخواہوں کے لیے کچھ کیا جائے تاکہ وہ خوراک وغیرہ کے مسائل سے نجات پا کر دل جمعی کے ساتھ لڑائی میں مصروف ہوں اور انگریزوں پر غلبہ حاصل کرنے کے قابل ہو سکیں۔ ویسے بھی جب اس جدوجہد کے سلسلے میں جہاد کا فتویٰ دینے کے اقدام کی تحسین کی جائے گی تو اس کا صاف صاف مطلب یہ ہوگا کہ یہ کیفیت دینی حیثیت کی حامل ہے اور دین میں جہاد کے لیے سب سے بڑی شرط یہ بتائی جاتی ہے کہ مقابل پر فتح کا قیاس غالب ہو۔

بہر حال مولانا اور بادشاہ کی اس گفتگو کا جو رد عمل ہوا اس کی وضاحت منشی لال کی اسی روز یعنی 18 اگست کی رپورٹ سے ہوتی ہے۔ وہ لکھتا ہے: "جب بادشاہ دربار کرنے کے بعد اپنے گھر، خاص میں تشریف لے گئے تو مولوی فضل الحق" نواب احمد علی خاں بہادر" بر حاشیہ صاحب اور مرزا فخیر سلطان بہادر نے تحریری احکام دیے جو مفصلہ ذیل ہیں"۔ الخ

ان میں سے نمبر 16' نمبر 17' نمبر 18 اور نمبر 26 کے تحت مولانا کے حوالے سے چار احکام کا تذکرہ یوں کیا گیا ہے

- "بنام حسن علی عرض بیگی متصل پل گزشتہ کی آمدنی وصول کرنے کے لیے مولوی فضل الحق کی موجودگی میں لکھا گیا۔"
- "بنام فیض محمد" اسے ضلع بلند شہر علی گڑھ کی آمدنی وصول کرنے پر مقرر کیا گیا ہے۔ حسب ہدایت مولوی فضل الحق تحریر کیا گیا"۔
- "بنام مولی داد خاں" مذکورہ دونوں آدمیوں کی آمدنی وصول کرنے میں مدد دینے کے لیے تحریر کیا گیا۔ مولوی فضل الحق"۔
- "بنام مولوی عبد الحق خاں" ضلع گوڑگانوہ کی مال گزاری آمدنی وصول کرنے کا انتظام کیا جائے۔ حسب ہدایت مولوی فضل الحق لکھا گیا جن کا بھتیجا گوڑگانوہ جائے گا"۔ الخ

معلوم ہوا کہ بادشاہ سے مولانا کی جو گفتگو ہوئی اس کے مطابق انہوں نے محصول اکٹھا کرنے کا کام شروع کر دیا اور اس میں شک و شبہ کی قطعاً کوئی گنجائش نہیں کہ یہ سب کچھ ان سپاہیوں کی تنخواہوں کا انتظام کرنے کے لیے کیا گیا جو انگریزوں سے لڑ رہے تھے۔

حکیم احسن اللہ خاں کی یادداشتیں درج بالا واقعہ کو یوں بیان کرتی ہیں: "دوسرے روز مولوی فضل حق آئے اور

WWW.NAFSEISLAM.COM

نذر پیش کی۔ وہ باغی فوج کی بڑے زور شور سے تعریف کر رہے تھے۔ انہوں نے بادشاہ سے کہا: "اب وقت کا تقاضا ہے کہ باغیوں کو رقم اور سامان رسد کی مدد پہنچائی جائے تاکہ انہیں کچھ سہارا ہو"۔ بادشاہ نے کہا: رقم کہاں ہے؟ رہا رسد کا تو وہ پہنچتی تھی مگر ناکافی تھی اور اس کی وجہ ان باغیوں کا عوام کے ساتھ غلط رویہ ہے۔ مولوی صاحب نے کہا: "حضور کے تمام ملازمین نااہل ہیں۔ دور اور قریب کے تمام حکمرانوں سے رقم کا مطالبہ کرنے کی اجازت دیجیے اور کسی ہوشیار آدمی کو رسد کی فراہمی پر مامور کرنے دیجیے۔ میرے لڑکے (مولانا عبدالحق) اور دیگر امرا تفصیل کا کام انجام دیں گے اور رسد بھی فراہم کریں گے"۔ بادشاہ نے جواب دیا: آپ تو یہیں ہیں آپ انتظام سنبھالیے"۔ مولوی صاحب نے جواب دیا: "میرے بھتیجے اور دوسروں کو گوجرانوالہ کی تحصیل داری اور کلکٹری کا پروانہ تقرر جاری کیا جائے وہ سب انتظام کر لیں گے اور الور، بھجر، بلب گڑھ اور پٹیالہ کے راجاؤں کے نام بھی پروانے جاری کیجیے۔ پٹیالہ کا راجہ اگرچہ انگریزوں سے ملا ہوا ہے لیکن اگر دوستانہ مراسلت کی جائے تو وہ ساتھ آجائے گا"۔ مولوی صاحب جب بھی بادشاہ کے پاس آتے بادشاہ کو مشورہ دیتے کہ جہاد کی مہم میں اپنی رعایا کی ہمت افزائی کریں اور ان کے ساتھ باہر (میدان میں) بھی نکلیں۔ فوجی دستوں کو جس حد تک ممکن ہو بہتر معاوضہ دیں ورنہ اگر انگریز بچ گئے تو صرف خاندان تیموریہ بلکہ تمام مسلمان نیست و نابود ہو جائیں گے"۔[۳۳]

پروفیسر قریشی نے مولانا فضل حق کی دہلی میں آمد کے بیان میں ان کے الفاظ "فلاح" کامیابی، کشائش و شادمانی کی امید" کو عبدالطیف کے 1857ء کے روزنامچے کی مندرجہ ذیل عبارت کی روشنی میں پرکھنے کی کوشش کی ہے: "جب زمانہ میں شور و شر پھیلا تو مولوی فضل حق خیرآبادی نے دہلی کا عزم کیا اور بارگاہ میں باریابی کے آرزو مند ہوئے۔ نذر و نثار کے لیے بہت سا روپیہ پیش کیا۔ وہ حصول عہدہ کے خواہش مند تھے"۔[۳۴]

یہ ایک ڈائری نویس کا اپنا تجزیہ ہے کہ وہ کس کی نیت کو اپنے الفاظ میں کس طرح بیان کرتا ہے۔ اگر مولانا کو "حصول عہدہ" کی واقعی خواہش تھی تو بھی اس کا ایک نہیں متعدد سبب ہے۔ اب حکومت کی کسی شعبے میں اپنی خداداد صلاحیتوں کا استعمال چاہتے ہیں تو آپ کے پاس کوئی عہدہ ہونا چاہیے۔ نظم و نسق کے اصولوں کے تحت اس کے بغیر کوئی آپ کے احکام مانے یا آپ کی حکمت عملی اختیار کرنے کا پابند نہیں ہو سکتا۔ مولانا کو تحفظ مسلک بنانے میں اہل قلم کا جو طبقہ پیش پیش ہے اس کے فلسفے کے مطابق تو مسلمہ مجاہدین کو بھی ہوس پرست ظہیر کیا جا سکتا ہے۔

غور کیجیے کہ اگر اس کیفیت کو دیانت کا معیار ٹھہرایا جائے تو جنگ آزادی کے سب سے بڑے جرنیل بخت خاں کی درج ذیل آرزوئیں کس کھاتے میں شمار کی جائیں گی؟

● "(2 جولائی) بادشاہ نے جنرل (بخت خاں) کو باریابی دی۔ جنرل نے کہا کہ میں بھی آپ ہی کے خاندان سے ہوں اور بادشاہ سے کہا کہ اپنا اطمینان کرنے کی غرض سے آپ تحقیقات فرما سکتے ہیں۔ بادشاہ نے جواب دیا کہ تحقیقات کی ضرورت نہیں ہے اس لیے کہ اس وقت جنرل سے اور کوئی بڑا آدمی موجود نہیں ہے۔ جنرل نے جواب میں عرض کیا کہ میں بہادر کے خطاب کا حقدار ہو جاؤں گا اگر میں دہلی اور میرٹھ سے انگریزوں کو نکالنے میں کامیاب ہو گیا"۔ [25]

● "(11 جولائی) بخت خاں نے (بادشاہ سے) اثنائے گفتگو میں ظاہر کیا کہ میں ضلع گھنسہ کے موضع سلطان پور کا رہنے والا ہوں اور شاہ اودھ کے خاندان سے ہوں اور عرض کیا گیا کہ اگر آپ کو میرے بیان میں کچھ شبہ ہو تو آپ تصدیق فرما سکتے ہیں۔ بادشاہ نے فرمایا کہ تصدیق کی ضرورت نہیں ہے اس لیے کہ مجھے آپ کی شرافت و نجابت پر پورا یقین ہے۔ جنرل نے جواب دیا کہ میں تصدیق پر اس عرض سے زور دے رہا ہوں کہ جب انگریز دہلی' میرٹھ' آگرہ سے نکال دیے جائیں گے تو میں مسن خدمات کے معاوضہ کا طالب ہوں گا"۔ [26]

● "(26 جولائی) جنرل محمد بخت خاں کی درخواست پر انہیں گورنر کے درجہ پر فائز کیا گیا۔ بادشاہ نے جنرل کے طرز عمل پر اپنی خوشنودی کا اظہار کیا۔ جنرل نے بھی اپنی عزت افزائی پر شکریہ ادا کیا اور دس اشرفیاں بطور نذر پیش کیں اور وعدہ کیا کہ میں جواں بخت کی ولی عہدی کی تائید کروں گا"۔ [27]

جنگ آزادی میں مولانا فضل حق کی شرکت انگریزوں کے جاسوس تراب علی کی رپورٹوں کے الفاظ میں یوں واضح ہوتی ہے:

● "(24-25 اگست) اور کے مولوی فضل حق پچھلے ہفتے سے یہاں ہیں اور انگریزی حکومت کی شدت سے مخالفت اور دوسری قسم کی چالوں سے اپنے کام میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ ان کا ٹھکانہ سہارن پور کا ناظم مقرر ہوا ہے"۔ [28]

● "(28 اگست) مولوی فضل حق جب سے دہلی سے آیا ہے' شہریوں اور فوج کو انگریزوں کے خلاف اکسانے میں مصروف ہے۔ وہ کہتا پھرتا ہے کہ اس نے آگرہ گزٹ میں برطانوی پارلیمنٹ کا ایک اعلان پڑھا ہے جس میں انگریزی فوج کو دہلی کے تمام باشندوں کو قتل کر دینے اور پورے شہر کو مسمار کر دینے کے لیے کہا گیا ہے۔ آنے والی نسلوں کو یہ بتانے کے لیے کہ یہاں دہلی کا شہر آباد تھا' شاہی مسجد کا صرف ایک مینار باقی چھوڑا جائے گا۔۔۔ مولوی فضل حق کے کہنے پر شہر اور اب حملہ کرنے والی فوج کے ساتھ محاذ پر جاتے ہیں اور عموماً سبزی منڈی کے پل پر

لکھتے ہیں"۔[۲۹]

- "(30 اگست) اگر آپ مرزا الٰہی بخش کو اس کے خط کا جواب دے دیں تو اس مقصد کے لیے اپنا اثر و رسوخ استعمال کرے گا اور مولوی فضل حق اور دوسرے باغیوں کو شہر سے باہر نکال دے گا"۔[۳۰]
- "(یکم ستمبر) (جنگی مشاورتی) کونسل میں دہلی کی ہر رجمنٹ کے پانچ پانچ سپاہی اور مولوی فضل حق بھی شامل ہیں"۔[۳۱]

باقی رہی بات مولانا پر مقدمے کی مثل کی جس کے کچھ حصے فاضل مضمون نگار کی کتاب میں شامل مالک رام کے مضمون میں بیان کیے گئے ہیں۔ ان میں نقل فیصلہ کے تحت مولانا کے متعلق درج ذیل عبارت قابل غور ہے: "عدالت کی نظر میں یہ ثابت ہے کہ اس موقع پر ملزم نے بلاضرورت مستعدی دکھاتے ہوئے صراحت سے ایسا فتویٰ دیا جس کا مقصد قتل کی ترغیب دینا تھا۔ اس نے قرآن کی آیات پڑھیں اور ان کے من مانے معنی کیے اور اصرار کیا کہ انگریزوں کے ملازم کافر اور مرتد ہیں اور اس لیے شریعت کے نزدیک ان کی سزا قتل ہے۔ بلکہ اس نے باغی سردار سے یہاں تک کہا کہ اگر تم انہیں قتل نہیں کرتے تو خود خدا کی نظر میں مجرم ہو"۔.....

"یہ بات بھی قطعی شہادتوں سے ثابت ہو گئی ہے کہ ملزم سردار موغاں کا خاص معتمد علیہ تھا اور وہ اکثر ان سے مشورہ کرتا رہتا تھا جیسا کہ اس موقع پر بھی ہوا جب اس نے قتل کا فتویٰ دیا"۔

"یہ تو ظاہر ہے کہ ملزم بہت قابل آدمی ہے لیکن ..... اس نے بہانہ ہوس یا مذہبی تعصب کے باعث باغیوں سے اپنا رشتہ جوڑا اور ان کا مشیر بن گیا۔ وہ خطرناک ترین آدمی ہے جو کسی وقت بھی بے حد نقصان پہنچا سکتا ہے اور اس لیے انصاف اور امن عامہ کا یہ تقاضا ہے کہ اسے ملک بدر کر دیا جائے"۔.....

"بغاوت شروع ہونے کے وقت وہ اطور علی خاں تھا۔ یہاں سے وہ دلیہ الدولہ علی آباد اور اس کے بعد وہ باغیوں اور بغاوت کے قدم بقدم چلتا رہا۔ ایسے شخص کو سخت ترین سزا ملنی چاہیے اور اسے خاص طور پر ہندوستان سے خارج کر دینا چاہیے"۔[۳۲]

دستاویز پیش کرنے کے باوجود حیرت ہوتی ہے کہ عدالت فیصلے میں شہادتوں سے مولانا کے فتوے اور "باغیوں سے رشتہ جوڑنے" کے ثابت ہونے کے ذکر کے باوجود پروفیسر قریشی کی مانند حضرت مالک رام بھی اپنے مضمون میں فرماتے ہیں کہ: "پورے حالات کا نظر غائر مطالعہ کرنے سے ثابت ہوتا ہے کہ مولانا فضل حق مرحوم نے 1857ء کی تحریک میں واقعی کوئی حصہ نہیں لیا تھا۔ انہوں نے اس سے پہلے لوگوں کو جو تلقین بھی کی ہو

.....لیکن جب یہ ہنگامہ شروع ہوا تو وہ عملاً اس سے الگ تھلگ رہے، نہ عملی پہلو سے اس میں شریک ہوئے نہ قولی لحاظ سے انہوں نے نہ کوئی فتویٰ لکھا نہ تلوار ہی اٹھائی"۔ ۳۳

مولانا کے مخالف اہل قلم اپنی تحقیق کے نتائج ان کے عدالتی بیان کی بنیاد پر نکالتے ہیں۔ دراصل مولانا اپنے بیان میں بغاوت میں ملوث ہونے سے انکاری ہیں جبکہ شواہد ان کے بیان کی تردید کرتے ہیں۔ برصغیر کے انگریزی عدالتی نظام میں اس قسم کی بہت سی مثالیں دیکھنے میں آتی ہیں جن میں بڑے بڑے نام ملتے ہیں۔ ہم بہادر شاہ ظفر کے مقدمے کی کارروائی پڑھتے ہیں تو وہاں بھی اسی قسم کی صورت حال سے دوچار ہوتے ہیں۔ بہادر شاہ کے بیان کے اس حصے کی ایک ہلکی سی جھلک پیش خدمت ہے، جس میں اس نے بغاوت کا سارا نزلہ باغی فوج پر ڈال دیا ہے: "باغی سپاہ نے ایک کورٹ قائم کیا تھا جہاں تمام معاملات طے ہوتے تھے اور جن معاملات کو وہاں طے کیا جاتا تھا، انہیں یہ کونسل اختیار کرتی تھی لیکن میں نے کبھی ان کی کانفرنس میں شرکت نہیں کی۔ انہوں نے اس طرح ہوں (بغیر) میری مرضی یا خلاف علم صرف میرے ملازموں ہی کو نہیں لوٹا بلکہ کئی محلوں کو لوٹ لیا۔ چوری کرنا، قتل کرنا، قید کرنا ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا اور جو جی چاہتا تھا کر گزرتے تھے۔ جو امعزز اہل شہر سے اور تجار سے جتنی رقم چاہتے وصول کرتے تھے اور مطالبات اپنے ذاتی اغراض کے لیے کرتے تھے۔ جو کچھ گزرا ہے وہ سب مفسد و باغی فوج کا کیا دھرا ہے۔ میں ان کے قابو میں تھا اور کر کیا سکتا تھا؟ وہ اچانک آ پڑے اور مجھے قیدی بنا لیا۔ میں لاچار تھا اور برداشت نہ دہ۔ جو انہوں نے کہا میں نے کیا، وگرنہ انہوں نے مجھے قتل کر ڈالا ہوتا"۔ ۳۴

"مذکورہ بالا جواب میرا خود تحریر کردہ ہے اور بیان صادقہ ہے۔ حق سے اصلاً انحراف نہیں کیا ہے۔ خدا میرا عالم و شاہد ہے کہ جو کچھ بالکل صحیح تھا، جو کچھ مجھے یاد تھا وہ میں نے لکھا ہے۔ شروع میں نہیں نے آپ سے حلفیہ کہا تھا کہ میں بغیر بناوٹ اور بغیر بناوٹ کے وہی کہوں گا جو حق اور راست ہوگا، چنانچہ ایسا ہی میں نے کیا ہے"۔ ۳۵

غور فرمایئے کہ اگر عدالتی بیان کی بنیاد پر جنگ آزادی کے سرفراہوں کی اس ساری جدوجہد کے مرکز بہادر شاہ ہی کو اس قصے سے نکال دیا جائے تو باقی کیا بچتا ہے؟ کیا اس صورت میں یہ لڑائی "جنگ آزادی" کہلانے کے مستحق ہو سکتی ہے؟ بہادر شاہ کے سوا اور کون تھا جو اس دور کے ملکی حالات کے مطابق حکمران کہلاتا؟ ہمارے ہاں کسی جمہوریت کا تصور موجود نہ تھا جو انگریزوں پر فتح پانے کے فوراً بعد قابل عمل قرار پاتا اور ملک کا نظام چلایا جا سکتا۔ اپنی تمام کمزوریوں کے باوجود بہادر شاہ ہی سب کا مرکز نگاہ تھا۔ اگر اس پر یہ فرد جرم عائد کی جائے کہ وہ باغی فوجوں کی دہلی میں آمد کے بعد نہ چاہتے کے باوجود ان کے ساتھ شرکت پر مجبور ہوا تو دوسری جانب یہ شواہد بھی

موجود ہیں کہ وہ اپنے آباؤ اجداد کی مانند مطلق العنان حکمرانی کا خواہش مند تھا جس کا اظہار اس نے کئی موقعوں پر کیا اور ایسا کرنا انگریزوں کے نزدیک واقعی جرم تھا۔ پھر اس نے اپنے خلاف مقدمے میں خود کو بری الذمہ قرار کیوں دیا؟

جب ہم برصغیر کی آزادی اور سیاسی جدوجہد کی مجموعی صورت حال پر نظر ڈالتے ہیں تو اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ ایسے بیانات یہاں انگریزی عدالتی نظام کی بعض شقوں سے فائدہ اٹھانے کے لیے دیے جاتے رہے ہیں۔ ایسا کرنا اصولی طور پر غلط ہے یا صحیح؟ اور کیا ایسا کرنے والے اپنی قربانیوں کی خود ہی توہین نہیں کرتے؟ اس سوال پر دو رائیں ہو سکتی ہیں لیکن حقیقت اپنی جگہ پر قائم رہتی ہے کہ انھوں نے جدوجہد آزادی میں حصہ لیا۔ یہاں مولانا فضل حق کے معاملے میں اگر کوئی اس بات پر مُصر ہے کہ انھوں نے جنگ آزادی میں حصہ نہیں لیا تھا تو اس سے پوچھا جا سکتا ہے کہ انھیں سزا کس جرم میں ملی؟

پروفیسر قریشی اس کا جواب یوں دیتے ہیں: ''صرف ایک چیز جس نے انھیں جنگ آزادی کا ہیرو بنا دیا' ان کی سزائے عمر قید تھی۔ لیکن یہ نہ بھولنا چاہیے کہ ان دنوں بہت سے بے گناہ اور وفادار شہریوں کو فوجی عدالتوں کی طرف سے یا تو گولی مار دینے یا شدید جسمانی اذیتوں کی سزائیں دی گئیں۔ اس سلسلے میں امام بخش صہبائی اور مولوی محمد باقر کی مثالیں ہمارے سامنے ہیں۔ صہبائی دہلی کالج کے استاذ تھے اور مولوی محمد باقر دہلی کالج کے انگریز پرنسپل ٹیلر سے نہایت دوستانہ تعلقات رکھتے تھے۔ دونوں نے جنگ آزادی میں حصہ نہیں لیا تھا لیکن دونوں کو محض اس وجہ سے گولی مار دی گئی کہ وہ اپنے گھروں میں چھپے ہوئے باغی گرفتاریوں کی جانیں نہ بچا سکے تھے''۔[۳۶]

پروفیسر موصوف نے اس سلسلے میں امام بخش صہبائی اور مولوی محمد باقر کی جو مثال دی ہے وہ مولانا فضل حق کے حالات سے قطعی مطابقت نہیں رکھتی۔ دونوں صورتوں کا موازنہ کرنے کے لیے پہلے امام بخش صہبائی کا قصہ ان کے حقیقی بھانجے مولانا نصیر نگاوری علی کی زبانی سنیے: ''میں صبح کی نماز اپنے ماموں مولانا صہبائی کے ساتھ کڑھ مہرور میں پڑھ رہا تھا کہ گورے دن دن کرتے آ پہنچے۔ پہلی رکعت تھی کہ امام کے صافے سے ہماری مشکیں کس لی گئیں۔ شہر کی حالت نہایت خطرناک تھی اور دلی حشر کا میدان بنی ہوئی تھی۔ ہماری بابت مخبروں نے بغاوت کی اطلاعیں دے دی تھیں' اس لیے ہم سب گرفتار ہو کر دریا کے کنارے پر لائے گئے۔ ایک مسلمان افسر نے ہم سے آ کر کہا کہ ''موت تمہارے سر پر ہے' گولیاں تمہارے سامنے ہیں اور دریا تمہاری پشت پر ہے۔ تم میں سے جو لوگ تیرنا جانتے ہیں وہ دریا میں کود پڑیں''۔ میں بہت اچھا تیراک تھا مگر ماموں صاحب یعنی مولانا صہبائی اور ان کے

صاحبزادے مولانا سوز حیرت نہیں جانتے تھے۔ اس لیے دل نے گوارا نہ کیا کہ ان کو چھوڑ کر اپنی جان بچاؤں لیکن ماموں صاحب نے مجھے اشارہ کیا' اس لیے میں دریا میں کود پڑا۔ پچاس یا ساٹھ گز گیا ہوں گا کہ گولیوں کی آوازیں میرے کان میں آئیں اور وہ صف بستہ گر کر مر گئے"۔ ۳۷

اب مولوی محمد باقر پر کیا گزری' ملاحظہ فرمایئے: "انہوں نے اپنے انگریز دوست مسٹر ٹیلر کو جو دہلی کالج کے پرنسپل تھے اور زبردست عیسائی مبلغ تھے' باغیوں کے غیظ و غضب سے بچانے کے لیے پہلے اپنے گھر میں چھپا دیا' پھر ان کو بھیس بدل کر باہر بھجوا دیا لیکن باغیوں کی فہرست مجرمین سے ان کا خارج ہونا ممکن نہیں تھا۔ ٹیلر نے باغیوں کے مزاج کا ادراک کرنے کے بجائے اپنے پناہ دینے والے محسن سے باغیوں کے عتاب کا بدلہ لیا۔ انہوں نے جاتے جاتے مولوی صاحب کو کچھ کاغذات سونپے اور کہا کہ یہ کسی بھی مل جانے والے انگریز کو دے دیں۔ ان کاغذات میں ایک خفیہ کوڈ میں انہیں ختم کرنے کے لیے کہا گیا تھا' چنانچہ کاغذات پانے والے انگریز نے انہیں فوراً گولی سے مار دیا"۔ ۳۸

اگرچہ یہ واقعات مختلف کتابوں ذرا ذرا اختلاف کے ساتھ بیان ہوئے ہیں لیکن ان سے نتائج پر کوئی خاص فرق نہیں پڑتا۔ درج بالا واقعات کے بیان میں پروفیسر قریشی کے ارشاد کے برعکس کہ "دونوں نے جنگ آزادی میں حصہ نہیں لیا تھا" باغیوں کی فہرست میں ان کے نام پائے جانے کا ذکر ملتا ہے۔ کیا واقعی ایسا تھا؟ اس موقع پر ہمیں اس سے بحث نہیں کیونکہ یہ ہمارے موضوع سے خارج ہے البتہ دونوں واقعات میں یہ بات مشترک ہے کہ ان کی اموات ہنگامی طور پر یا فوری سزا کے تحت ہوئیں جبکہ مولانا فضل حق پر باقاعدہ مقدمہ قائم ہوا جس میں انگریزی عدالتی نظام کے لوازمات اپنائے گئے' استغاثہ نے ان کے خلاف گواہ پیش کیے۔ جرح ہوئی اور اس کی روئداد پروفیسر قریشی کی کتاب میں شامل مالک رام کے مضمون میں موجود ہے جو مضمون نگار نے براہ راست ان کے مقدمے کی مسل سے اخذ کی ہے۔ ان وجوہات کی بنا پر ان تینوں اشخاص کی سزاؤں کو ایک جیسا قرار دینے کا پروفیسر موصوف کا تجزیہ درست نہیں۔ یہ بات تحقیق طلب ہے کہ اگر مولانا فضل حق نے بغاوت میں حصہ نہیں لیا تھا تو انگریزوں کو کیا پڑی تھی کہ ایک بے ضرر اور "غیر باغی" معروف شخصیت کو خواہ مخواہ ملزموں کے کٹہرے میں کھڑا کرنے کا تماشہ رچاتے اور اسے مجرم قرار دے کر کالے پانی کی سزا کا مستحق ٹھہراتے! سزا دہی کے اس عمل کی حکمت کے پیچھے تین مفروضے قائم کیے جا سکتے ہیں کہ:

- مولانا نے بغاوت میں واقعی حصہ لیا تھا.....یا

● ان سے حکومت کو کسی بھی قسم کا کوئی خطرہ تھا.....یا

● انگریزوں کو ان سے کوئی خاص قسم کی عداوت تھی۔

تینوں صورتیں مولانا کو انگریزوں کا مخالف ثابت کرتی ہیں۔ڈاکٹر ہنٹر نے اپنی تالیف "ہمارے ہندوستانی مسلمان" میں مولانا عبدالحق صدر مدرس مدرسۂ عالیہ کلکتہ کا تذکرہ کرتے ہوئے ان کے والد مولانا فضل حق خیر آبادی کے متعلق بلا وجہ نہیں لکھا تھا کہ: "موجودہ ہیڈ مولوی اس عالم دین کے صاحبزادے ہیں جن کو 1857ء کے غدر نے نمایاں کیا تھا اور جنہوں نے اپنے ہموطنوں کا خمیازہ اس طرح بھگتا ہے کہ بحرِ ہند کے ایک جزیرہ میں تمام عمر کے لیے جلاوطن کر دیے جائیں۔اس غدار عالم دین کا کتب خانہ جس کو حکومت نے ضبط کر لیا تھا اب کلکتہ میں موجود ہے"۔ ۳۹

﴿حوالہ جات﴾

۱ غالب نام آور م بحوالہ امتیاز حق (راجا غلام محمد) مکتبہ قادریہ لاہور 1979ء ص:۱۰

۲ مولانا فضل حق خیرآبادی (مرتبہ: افضل حق قرشی) الفیصل لاہور 1992ء ص:۱۵۵

۳ Kotwal,s Diary(Syed Mubarak Shah)Pakistan Historical Society, Karachi(1994)P.49

۴ مولانا فضل حق خیرآبادی ص:۸۹

۵ ایضاً ص:۹۰

۶ 1857ء کے مجاہد (غلام رسول مہر) ص:۲۰۶

۷ مولانا فضل حق خیرآبادی ص:۱۵۶

۸ ایضاً

۹ ایضاً ص:۱۵۷

۱۰ 1857ء کے مجاہد ص:۲۰۵ (حاشیہ)

۱۱ غدر کی صبح شام (جیون لال کی ڈائری) ہمدرد پریس دہلی 1926ء ص:۲۲۰

۱۲ ایضاً ص:۱۰۸

۱۳ ایضاً ص:۱۰۹

۱۴ ایضاً ص:۱۱۶

۱۵ ایضاً ص:۱۵۳

۱۶ ایضاً ص:۲۰۶

۱۷ غداروں کے خطوط (سلیم قریشی/سید عاشور کاظمی) انجمن ترقی اردو دہلی 1993ء، ص:۱۳۸

۱۸ غدر کی صبح شام، ص:۱۲۶ ۱۹ ایضاً، ص:۲۱۷

۲۰ غداروں کے خطوط، ص:۱۳۲

۲۱ غدر کے فرمان (مرتبہ: خواجہ حسن نظامی) اہل بیت پریس دہلی 1944ء، ص:۱۲۷

۲۲ ایضاً، ص:۱۲۸_۱۲۹

۲۳ Memoirs بحوالہ "مولانا فضل حق خیرآبادی اور سن ستاون"، ص:۸۳تا۸۵

۲۴ مولانا فضل حق خیرآبادی، ص:۱۵۶

۲۵ غدر کی صبح شام، ص:۱۵۱_۱۵۲

۲۶ ایضاً، ص:۱۶۵

۲۷ ایضاً، ص:۱۸۷

۲۸ غداروں کے خطوط، ص:۱۵۴

۲۹ ایضاً، ص:۱۵۹

۳۰ ایضاً، ص:۱۶۴

۳۱ ایضاً، ص:۱۷۰

۳۲ مولانا فضل حق خیرآبادی، ص:۱۲۲تا۱۲۳

۳۳ ایضاً، ص:۱۲۸

۳۴ مقدمہ بہادر شاہ ظفر (مرتبہ: خواجہ حسن نظامی) الفیصل لاہور 1990ء، ص:۱۶۱

۳۵ ایضاً، ص:۱۶۳

۳۶ مولانا فضل حق خیرآبادی، ص:۱۶۳

۳۷ علماء ہند کا شاندار ماضی (سید محمد میاں) الجمعیۃ پریس دہلی 1960ء، جلد:۴، ص:۲۶۲

۳۸ اردو صحافت (مرتبہ: انور علی دہلوی) اردو اکادمی دہلی 1987ء، ص:۸۸_۸۹

۳۹ ہمارے ہندوستانی مسلمان (ڈبلیو۔ڈبلیو۔ہنٹر) اقبال اکیڈمی لاہور 1944ء، ص:۲۸۱

Nafse Islam
نفس اسلام
WWW.NAFSEISLAM.COM

علامہ فضل حق خیرآبادی کا فتوائے جہاد اور مجاہدانہ سرگرمیاں

مولانا محمد اختر کمال قادری

مولانا محمد اختر کمال قادری صاحب جامعہ اشرفیہ مبارکپور انڈیا کے مدرس واستاذ ہیں۔ پیش نظر مقالے میں موصوف نے علامہ فضل حق کے فتوائے جہاد کے متعلقات باحوالہ بیان کیا ہے۔ ملاحظہ فرمائیں:

مجاہد اعظم، بطل حریت علامہ فضل حق بن مولانا فضل امام خیرآبادی کی عبقری شخصیت جنگ آزادی 1857ء کے عظیم رہ نماؤں اور اس کے نمایاں ہیروؤں میں شمار کی جاتی ہے۔ جنگ آزادی میں جوش وخروش اور اشتعال انگیزی علامہ ہی کے دم قدم سے ہوئی۔ مگر آج کچھ لوگوں نے تاریخی حقائق پر پردہ ڈالنے اور جنگ آزادی کے مسلم رہ نماؤں کے خلاف فضا پیدا کرنے کی ناپاک کوشش کی ہے۔ تاریخ کا یہ المیہ ہر دور میں رہا ہے کہ طاغوتی طاقتیں علمائے ربانیین کی واقعی کوششوں اور ان کے حقیقی کارناموں کو تاریخ کے صفحات سے یکسر ختم کرنے میں کوشاں رہیں۔ ان سے بغض وعناد رکھنے والے متعصب تاریخ سازوں نے جھوٹی روایتیں اور من گھڑت واقعات سے ہمیشہ ان کے روشن وتاب ناک کردار کو آلودہ کیا ہے اور جو تیغ دین وملت اس کے اہل نہیں تھے انہیں اس کا سب سے بڑا رکن بنا کر پیش کیا جاتا ہے۔

مثال ایسی ہے اس دور خرد کے ہوش مندوں کی

نہ ہو دامن میں ذرہ اور صحرا نام ہو جائے

انہیں میں علامہ فضل حق خیرآبادی کی ذات والا صفات بھی ہے۔ اسلامی تاریخ کے دعوے داروں نے تاریخی حیثیت سے انہیں زیادہ گزند پہنچایا۔ بالخصوص وہابی' دیوبندی جماعت میں سید احمد رائے بریلوی اور اسماعیل دہلوی کے سیرت نگاروں نے تو یہ التزام ہی اپنے لیے رکھا کہ جس طرح بھی ہو تاریخ کے صفحات میں علامہ کی شخصیت کو اجاگر نہ ہونے دیں گے۔

عبدالشاہد خاں شروانی لکھتے ہیں: "شاہ اسماعیل دہلوی کی سوانح لکھنے والوں نے علامہ کے ساتھ بڑا ظلم روا رکھا'

میزی اور بہتان طرازی سے بھی دریغ نہ کیا"۔ [1]

مثال کے طور پر مرزا حیرت دہلوی صاحب حیاتِ طیبہ شاہ اسماعیل دہلوی کے بارے میں لکھتے ہیں کہ "مرزا حیرت دہلوی صاحب حیاتِ طیبہ نے تو نحوِ حیرت ہی بنا دیا۔ نہ صرف علامہ بلکہ ان کے والد ماجد مولانا فضل امام کو بھی پڑھا لکھا ماننے میں تامل کیا ہے۔ حیرت ہوتی ہے کہ انسان معاندانہ روش اختیار کرتے وقت نابینا کیوں ہو جاتا ہے"۔ [2]

مرزا حیرت دہلوی اور ایسے ہی جعفر تھانیسری کے متعلق اکثر کی رائے یہی ہے کہ یہ دونوں پائے اعتبار سے ساقط ہیں۔ ان کی تاریخ گوئی اور روایت بیانی منظورِ نظر نہیں' بلکہ ہرزہ سرائی ہے۔ [3] ان کی تصانیف اس شعر کی مصداق ہیں۔

تو لطفِ تماشہ لیتا جا' مت ڈھونڈ سراغِ اصلیت
تصنیف کے صورت خانے میں' کچھ وہم اور کچھ سچائی ہے

انہیں جیسے نام نہاد مورخین نے تاریخیں تصنیف کیں۔ جنگ آزادی کے مجاہدین اور شہداء کے خلاف کہانیاں گھڑیں اور انگریز کے جاسوس کو اور جنگ آزادی کا ہیرو ثابت کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا۔ اس کے لیے انہوں نے تاریخی ماخذ میں غلط بیانی سے کام لیا اور ان سے صرف نظر کر کے من گھڑت کہانیوں کی تشہیر کی اور کئی تنگ اسلام کو قدسی صفات بنا کر پیش کر دیا۔ لیکن کسی نہ کسی پہلو سے کسی طرح منہ سے سچی بات کبھی نکل ہی آتی ہے۔

مشاہدے کو تو کانٹوں کی بھیک بھی نہ ملی
سنا ہے صحنِ گلستاں میں پھول کھلتے ہیں

مشہور ادیب و نقاد نادم سیتاپوری لکھتے ہیں: "مولانا فضل حق خیرآبادی گزشتہ صدی کا وہ بدنصیب کردار ہے جسے دشمنوں سے زیادہ دوستوں نے نقصان پہنچایا۔ انگریز اور ان کے ہوا خواہ مولانا سے اس لیے ناراض تھے کہ انقلاب سن ستاون کے سلسلہ میں کسی نہ کسی نہج سے ان کا نام آ گیا ہے لیکن خود مسلمانوں کا ایک "پریشر گروپ" مولانا سے اس لیے بے زار تھا کہ وہ ان کے مذہبی نظریات کے خلاف عالمانہ مجاہدہ کر چکے تھے۔ یہ باوقار علمی مباحثہ کوئی ذاتی اور عامیانہ جنگ نہیں تھے جس کا سہارا لے کر مولانا خیرآبادی کے خلاف ایک مستقل محاذ قائم کر دیا جاتا لیکن ہوا کچھ ایسا ہی۔ مولانا کے اکثر سیرت نگاروں نے نادانستہ نہیں دانستہ مولانا کی مدح سرائی اس انداز میں کی ہے کہ خود "مدح" اور "ہجو بلیغ" سر بگریباں ہو گئے۔ چنانچہ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ آج جب ریسرچ اور تحقیق کی نگاہیں تاریخ کے ان اوراق تک پہنچیں تو دنیا ہی بدلی ہوئی نظر آئی"۔ [4]

مزید لکھتے ہیں: "اس میں شک نہیں کہ مولانا فضل حق (خیر آبادی) کے کئی سیرت نگاروں نے 'سن گمڑت' بھوئی اور بے سروپا حکایتیں بیان کر کے مولانا کے نیک کردار کو خواہ مخواہ مسخ کرنے کی کوشش کی ہے"۔ ۵

اس سلسلے میں علامہ فضل حق کے ایک اور سیرت نگار مفتی انتظام اللہ شہابی کے بارے میں نادم سیتاپوری لکھتے ہیں: "بھوئی روایات 'سن گمڑت واقعات اور فرضی کتابوں کے غلط حوالے مفتی صاحب کی ادبی زندگی کا شاندار شاہکار رہا ہے"۔ ۶

● ان تاریخ سازوں میں کچھ تو جنگ آزادی کا ذکر کرتے ہوئے علامہ فضل حق خیر آبادی کا نام بھی لینا گوارا نہیں کرتے۔ کچھ تو یہ کہتے ہیں کہ انہوں نے محض اگریزوں کے خلاف فتویٰ دیا تھا۔ کسی جنگ میں حصہ نہیں لیا اور کوئی قابل قدر خدمات انجام نہیں دی۔ کوئی یہ کہتا ہے کہ فتویٰ تو انہوں نے دیا ہی نہیں اور کسی فضل حق شاہ جہانپوری کے بجائے انہیں کالا پانی کی سزا دی گئی تھی جہاں وہ شہید ہو گئے۔

امتیاز علی عرشی رام پوری اپنے مقالہ "مولانا فضل حق خیر آبادی اور 1857ء میں علامہ کے فتوائے جہاد" مطبوعہ ماہنامہ تحریک دہلی اگست 1957ء میں علامہ کے فتوائے جہاد کے منکر نظر آتے ہیں۔ ملاحظہ ہو: "مولانا نے علمائے زہاد اور ائمہ اجتہاد کے فتویٰ دینے کا ذکر تو کیا ہے مگر اپنا حوالہ بالکل نہیں دیا۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اگر وہ شریک فتویٰ بھی ہوتے تو جیسا کہ آگے چل کر ارباب حکومت کو اپنے مشورے دینے کا تذکرہ فرماتے ہیں' یہاں بھی فتویٰ کی طرف کچھ نہ کچھ اشارہ ضرور کرتے"۔ ۷

● ڈاکٹر مالک رام لکھتے ہیں: "مولانا فضل حق مرحوم نے 1857ء کی تحریک میں واقعی حصہ نہیں لیا تھا۔ انہوں نے اس سے پہلے لوگوں کو جو تلقین بھی کی ہو لیکن جب یہ ہنگامہ شروع ہوا تو وہ عملاً سب سے الگ تھلگ رہے' نہ عملی پہلو سے اس میں شریک ہوئے نہ عملی لحاظ سے انہوں نے فتویٰ کی تائید اور نہ انکار فرمائی"۔ ۸

یہ تھی تاریخ میں علامہ فضل حق خیر آبادی کی مظلوم شخصیت۔ آیئے بہ نظر صداقت و تحقیق علامہ کی فقید المثال' نابغۂ روزگار ہستی کے فتوائے جہاد اور ان کی روشن خدمات کا جائزہ لیتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ ارباب علم و دانش کی نظر میں علامہ خیر آبادی کا کردار کتنا بلند ہے؟ نیز جانتے ہیں کہ انہوں نے کس گرم جوشی اور ملی درد کے ساتھ اس جنگ آزادی میں حصہ لیا ہے۔ ان شاء اللہ ہم اسے حقانیت کے آئینے میں پیش کریں گے۔

راجہ غلام محمد نے نہایت ربط و تحقیق کے ساتھ اپنی کتاب "امتیاز حق" میں ان غلط پروپیگنڈوں کی دھجیاں بکھیر دی ہیں۔ ایک جگہ وہ لکھتے ہیں: "ان لوگوں نے بہت چاہا کہ فضل حق خیر آبادی کی قربانیوں پر اپنی مصلحتوں اور

مخالفتوں کے پردے ڈالیں مگر ان کے کردار کی پختگی، عزم کی سلامتی اور استقلال و استقامت کی جزئیات پر نظر ڈالیں تو یقین آتا ہے۔

آگے گرا تھا ایک پرندہ لہو میں تر
تصویر اپنی چھوڑ گیا ہے چٹان پر

● کتب تواریخ میں علامہ کے فتوائے جہاد کا ذکر کس زور و شور سے ہے' آنے والی عبارتوں سے اس کا اندازہ کیجیے۔ میں صرف آپ کو علامہ کے فتویٰ کی بازگشت سناتا ہوں۔ خورشید مصطفیٰ رضوی "جنگ آزادی 1857ء" میں لکھتے ہیں: "علماء نے جس جس طرح جہاد کو منظم کیا' اس کا مفصل بیان کرنے کے لیے تو ایک الگ کتاب کی ضرورت ہے۔ مگر ان کا کچھ تذکرہ ان صفحات پر کیا جا رہا ہے۔ اس حقیقت پر بڑے بڑے مورخ بھی انکار کی جرأت نہیں کر سکے ہیں کہ یہ علماء میں بے حد مقبول تھے۔ ان کی تحریر و تقریر کا بڑا اثر ہوتا تھا۔ چنانچہ دہلی میں جنرل بخت خاں کی تحریک پر مولانا فضل حق خیر آبادی اور دوسرے علماء نے جو جہاد کا فتویٰ دیا' اس کے بارے میں مولوی ذکاء اللہ دہلوی نے بھی اپنی تاریخ میں اقرار کیا ہے کہ اس سے غدر میں جوش و خروش بہت بڑھ گیا تھا"۔ [۱۰]

● نیز اسی میں دوسری جگہ لکھتے ہیں: "کہا جاتا ہے کہ 1857ء قریب آنے پر آپ (مولانا فضل حق) نے اکثر والیان ریاست کو بغاوت پر آمادہ کرنے کی کوشش کی۔ اگست 57ء میں دہلی آ گئے اور یہاں جنرل بخت خاں کی تحریک پر جہاد کا فتویٰ مرتب کر کے پیش کیا' جس سے مسلمانوں میں بے حد جوش و خروش پیدا ہو گیا"۔ [۱۱]

● علامہ کے فتوائے جہاد کے متعلق مجلہ "خیال" لاہور کے سن ستاون نمبر میں شمس العلماء حسن صاحب مفتی صدر الدین آزردہ پر مضمون لکھتے ہوئے علامہ کے فتوائے جہاد کا ذکر کرتے ہیں: "جب برطانوی استعمار کے خلاف 1857ء کا ہنگامہ شروع ہوا تو بعض شاعروں' ادیبوں اور عالموں نے اس میں سرگرمی سے حصہ لیا اور انگریزی حکومت کا اقتدار بحال ہو جانے کے بعد ان پر مصیبت کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔ مولانا فضل حق کو جہاد کا فتویٰ صادر کرنے کے جرم میں انڈمان بھیج دیا گیا' مہابھائی کو پھانسی کے تختے پر لٹکایا گیا' شیخ کو قید و بند کی مصیبتیں جھیلنی پڑیں"۔ [۱۲]

● جب بھی کوئی مورخ تاثرات کو تعصبات سے قطع نظر کر کے 1857ء کا حال لکھے گا تو علامہ فضل حق خیر آبادی کے فتوائے جہاد کا ذکر ضرور کرے گا۔ آپ ہی نے جامع مسجد میں فتویٰ پڑھ کر سنایا' علماء کے دستخط کروائے اور اس فتوے کی اشاعت سے جد و جہد آزادی میں زور پیدا ہوا۔ بالآخر مقدمہ کے موقع پر علامہ فضل حق اس بات پر برقرار رہے کہ یہ فتویٰ انہوں نے لکھا ہے اور اب تک ان کی یہی رائے ہے: "جب 1857ء کا ہنگامہ عظیم دہلی میں

روشناس ہوا تو (مولانا فضل حق) نور آباد دہلی پہنچے اور جہاد کا فتویٰ دیا۔ جنرل بخت خاں کمانڈر انچیف افواج ظفر سے ملے اور اس کی بڑی اعانت و امداد کی"۔ ۱۳

● سہ ماہی "الزبیر" بہاول پور کے تحریک آزادی نمبر 1970ء میں ہے: "مولانا فضل حق نے ایک دن بعد نماز جمعہ جامع مسجد میں انگریزوں کے خلاف فتویٰ پڑھ کر سنایا تو بہتوں کے لیے باعث تشویش بنا۔ اس فتویٰ پر مفتی صدرالدین آزردہ اور دوسرے پانچ علماء کے دستخط تھے۔ اس کا شائع ہونا تھا کہ جدوجہد نے ایک نیا زور پکڑا اور جگہ جگہ انگریزوں کے چھکے چھوٹ گئے۔ تاریخ ذکاء اللہ کے بیان کے مطابق اس فتویٰ کے بعد صرف دہلی میں نوے ہزار سپاہ جمع ہوگئی"۔ ۱۴

● غیر مقلد مورخ غلام رسول مہر جو شاہ اسماعیل کے بڑے مداح ہیں۔ علامہ فضل حق خیرآبادی اور شاہ اسماعیل کے مابین "مسئلہ امتناع النظیر" پر وقوع مناظرہ اور علامہ کا اسماعیل دہلوی کو کافر قرار دینے کے سبب مورخ مذکور ہرگز علامہ کی شخصیت کو داد تحسین کی نگاہ سے دیکھنا پسند نہیں کرتا۔ تاریخ میں بے شمار ایسے لوگ گزرے ہیں جو تحریف فی التاریخ کے ناتے سے پہچانے جاتے ہیں۔ ان لوگوں نے بہت سے پاک باز نفوس قدسیہ کے روشن کردار کو مسخ کیا اور کئی ننگ اسلام شخصیتوں کو قدسی صفات بنا کر عرش بریں سے بھی اونچا کر دیا۔ مگر ﴿الحق یعلو ولا یعلی﴾ حق کی تابانیوں سے عالم روشن ہوگیا۔ حق کسی نہ کسی طرح مورخین کے قلم سے صادر ہو کر رہا۔ حتیٰ کہ مہر صاحب بھی اس حقیقت کو تسلیم کیے بغیر نہیں رہ سکے کہ فتویٰ کے سلسلے میں علامہ فضل حق خیرآبادی کی کاردگی سب سے زیادہ نمایاں ہے۔ اگر وہ نہ ہوتے تو اس فتویٰ کا وجود ہی نہ ہوتا۔

بات بن سکتی نہیں کوئی صداقت کے بغیر
تیر کی پشت پہ کردار کماں ہوتا ہے

مہر صاحب لکھتے ہیں: "مولانا (فضل حق خیرآبادی) کے دہلی پہنچنے سے پیش تر بھی لوگوں نے جہاد کا پرچم بلند کر رکھا تھا۔ مولانا پہنچے تو مسلمانوں کو جنگ آزادی پر آمادہ کرنے کی غرض سے باقاعدہ ایک فتویٰ مرتب ہوا، جس پر علمائے دہلی کے دستخط لیے گئے۔ میرا خیال ہے کہ یہ فتویٰ مولانا فضل حق ہی کے مشورے سے تیار ہوا تھا اور انہیں نے علماء کے نام تجویز کیے جن کے دستخط لیے گئے"۔ ۱۵

● سعید احمد اکبرآبادی فاضل دیوبند علامہ کے فتوائے جہاد کے بارے میں لکھتے ہیں کہ کتب تواریخ میں موجود فتوائے جہاد پر علامہ کے دستخط نظر نہ آئے تو کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ اس سے انکار ہی کر دیا جائے؟ ہرگز نہیں علامہ

کا ایک مستقل فتویٰ تھا جس کا ذکر معتبر تاریخوں میں ملتا ہے: ''اس وقت ہمارے سامنے فتویٰ کی جو نقل ہے اس پر دلی کے 38 علماء ومشائخ کے دستخط ہیں۔ مولانا فضل حق خیرآبادی کے اس پر دستخط نہیں ہیں لیکن ان کا الگ مستقل فتوائے جہاد تھا جس کا ذکر 1857ء کی جنگ آزادی کی اسلامی تاریخوں میں تفصیل کے ساتھ کیا گیا ہے۔

مولانا بلند پایہ عالم دین ہونے کے ساتھ رئیسانہ طور طریق زندگی رکھتے تھے' لیکن اس کے باوجود ان کی ایمانی جرأت وجسارت اور دینی حمیت وغیرت کا یہ عالم تھا کہ انہوں نے نماز جمعہ کے بعد جہاد کے واجب ہونے پر ایک نہایت ولولہ انگیز تقریر کی اور اس کے بعد جہاد کے ایک اور فتویٰ کا اعلان ہوا' جس پر صدر الصدور مفتی صدر الدین خاں آزردہ' مولانا فیض احمد بدایونی' ڈاکٹر مولوی وزیر احمد خاں اکبر آبادی اور دوسرے علماء کے دستخط تھے''۔ [۱۹]

● علامہ کی زندگی اور ان کے کارہائے نمایاں کی تفصیلات کے ثقہ جامع عبدالستار خاں شروانی علی گڑھی مولف باغی ہندوستان تاریخ ذکاء اللہ کے حوالے سے لکھتے ہیں: ''علامہ سے جنرل بخت خاں ملنے پہنچے۔ مشورے کے بعد علامہ نے آخری تیر ترکش سے نکالا بعد نماز جمعہ جامع مسجد میں علماء کے سامنے تقریر کی اور استفتاء پیش کیا۔ مفتی صدر الدین خاں آزردہ صدر الصدور دہلی' مولوی عبدالقادر' قاضی فیض اللہ دہلوی' مولوی فیض احمد بدایونی' ڈاکٹر مولوی وزیر خاں اکبر آبادی' سید مبارک شاہ رام پوری نے دستخط کر دیے۔ اس فتویٰ کے شائع ہوتے ہی ملک میں عام شورش بڑھ گئی' دہلی میں نوے ہزار سپاہ جمع ہو گئی تھیں''۔ [۲۰]

ان چند تاریخی شواہد سے آفتاب نصف النہار کی طرح روشن ہو گیا کہ علامہ نے 1857ء کی جنگ آزادی میں وجوب جہاد کا فتویٰ دیا اور اس دور کے معاصر علماء سے بھی استفتا کر کے وجوب جہاد کا فتویٰ لیا جس پر اس دور کی تاریخیں اور قلمی مخطوطات بھی شاہد عدل ہیں' جن کا انکار دن میں طلوع آفتاب کے انکار کے مترادف ہوگا۔ معکوسہ فتاویٰ میں علامہ کا دستخط نہ پا کر انکار کرنا ہرگز شیوۂ تحقیق نہیں۔ سعید احمد اکبر آبادی فاضل دیوبند کی حقیقت آشکار عبارت گزر چکی ہے۔ علامہ کی شخصیت پر تاریخی شکوک وشبہات وارد کرنے والوں کو یہ خبر نہیں کہ چاند پر تھوکنے سے اپنے ہی چہرے آلودہ ہوں گے۔ عبدالشاہد خاں شروانی نے اپنی کتاب ''باغی ہندوستان'' کے چوتھے ایڈیشن معلومہ ''المجمع الاسلامی مبارک پور'' میں بنام مقدمہ کی کارروائی ایک مستقل باب کا اضافہ کیا ہے۔ جس میں مقدمات کی مسل اور اس دور کے کچھ سرکاری کاغذات کی مدد سے نئے زاویہ تحقیق کی روشنی میں تاریخی ماخذوں کی تخلیط کرنے والوں کے شکوک دور کر دیے ہیں اور اپنے معاصر وکرم فرما امتیاز علی عرشی رام پوری اور مالک رام پر خامہ فرسائی کرتے ہوئے عدم طعن وتشنیع کی ارتجا بھی''' ایں گناہ بست کہ در شہر شما نیز کنند''۔ اس کے بعد اخیر میں راقم ہیں: ''مقدمہ

کی کارروائی معاصرین و مورخین کی شہادتیں اور انگریزوں کے بیانات کی روشنی میں محترم بزرگ مولانا امتیاز علی خاں عرشی رام پوری اور جناب مالک رام صاحب کے نظریہ کو کورہ پر نظر ڈالیں تو آپ کو صاف نظر آئے گا:

حریف صافی و دردی نہ ایں خطا ایں جاست
ناخوش و خوش می کنی بلا ایں جاست

اور اس کے سوا کیا کہا جاسکتا ہے کہ

نظامت ست میان شنیدن من و تو
تو بشنو و سخن من رائج باب ی شنوم ۱۸

جنگ آزادی میں اہل حریت علامہ فضل حق خیرآبادی کی نمایاں خدمات عالیہ سنہرے حرفوں میں لکھے جانے کے قابل ہیں۔ علامہ ہی کی جد وجہد سے اس میں اشتعال انگیزی اسلامی جوش و خروش اور ملی جذبہ پیدا ہوا۔ آپ حکومت انگلشیہ کی ابتدائی ملازمت ہی سے اس کے متعصبانہ رویہ سے سخت متنفر ہو چکے تھے۔ جہاں کہیں بھی وہ ملی مفاد کے برخلاف امر دیکھتے بیشتر مسلمانوں میں ان کے دینی جذبہ، ملی درد، اسلام کی روحانی طاقت و قوت اور قرون اولی کے مسلمانوں کی شان و شوکت کے ساتھ قومی عظمت باقی رکھنے کی کوشش کرتے اور دل ہی دل میں ہندوستانی قوم کے نوحۂ تقدیر غلامی پر خون کے آنسو بہاتے۔ ہمارے جس عظیم رہنما نے سب سے پہلے ہماری آزادی کے لیے اپنا خون جگر صرف کیا، ترغیب جہاد اور فکری رہنمائی کے ذریعہ پوری قوم میں آزادی کی روح پھونکی اور قوم پر اپنی قائدانہ صلاحیتوں کو قربان کرتے ہوئے ملک بدر ہو کر دیار غیر میں شدید مصائب و آلام اور لرزہ براندام تکلیفوں کو جھیلتا ہوا شوق شہادت پورا کر گیا۔ افسوس کہ اس "قائد اعظم" کی مجاہدانہ ریاضتوں اور مشقتوں کو بعض تاریخ کے صفحات پر تضحیک و ریا کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ چنانچہ مالک رام کا نظریہ گزر چکا کہ وہ علامہ کے فتوائے جہاد اور مجاہدانہ سرگرمیوں کے منکر ہیں۔

غیر مقلد مورخ غلام رسول مہر اگرچہ کسی طرح فتوی کی تائید کرتے مگر وہ بھی علامہ کے مجاہدانہ کارناموں کا انکار کرتے ہیں: "قائم یہی وہ فتوی تھا جو انجام کار مولانا (فضل حق) کے خلاف مقدمے کے باعث بنا اور نہ انہوں نے نہ کسی جنگ میں حصہ لیا، نہ ان کے پاس کوئی عہدہ تھا، نہ کسی کے قتل میں شرکت کی اور نہ ان کے خلاف کوئی اور سنگین الزام تھا"۔ ۱۹

تاریخ میں اسی منافقانہ چال اور معاجانہ رویہ اختیار کرنے کے سبب رئیس احمد جعفری اپنی تاریخ "بہادر شاہ ظفر

اور ان کا عہد" میں چوتھا حقیقت سے نقاب کشائی کرتے ہوئے رقم طراز ہیں کہ غدر 1857ء کی روح رواں اور محرک اعظم صرف دو شخصیتیں ہیں جن میں دوسرے علامہ موصوف ہیں۔ ملاحظہ فرمائیں: "ہم نے غدر کے جن ہیروؤں کا ذکر کیا ہے ان میں سے صرف بخت خاں اور مولانا فضل حق خیرآبادی دو ایسی شخصیتیں ہیں جنہوں نے دہلی کے محاربات غدر میں مرکز نشین ہو کر حصہ لیا ہے۔ بخت خاں اور مولانا فضل حق خیرآبادی کے احوال و سوانح، واقعات و حوادث، کارناموں اور سرگرمیوں کی تفاصیل معلوم کرنا آسان نہ تھا۔ غدر کے بعد غدر کا ذکر بھی کتابوں میں فرما تھا اور ان شخصیتوں کا تذکرہ جنہوں نے اس انقلابی تحریک میں مردانہ وار حصہ لیا تھا، اپنی جان سے ہاتھ دھونا تھا۔ ان کا اول تو مرتب و مدلل صورت میں کہیں ذکر نہیں ملتا اور اگر کہیں ملتا بھی ہے تو غلط انداز میں۔ ان مشکلات کے باوجود زیادہ سے زیادہ مستند انداز اور مستند مواد حاصل کرنے کی اپنے حقیر پیمانہ پر ہم نے کوشش کی ہے"۔ ص ج

روایت و تاریخ کے فنی نظر علامہ کی ملی و سیاسی خدمات کا جائزہ لینے سے قبل دراصل فکر و نظر کی روشنی میں اس وقت کے سیاسی و ملکی حالات کو سامنے رکھ کر سنجیدگی کے ساتھ شعور انسانی کو دعوت فکر دیں کہ آیا علامہ جیسا صاحب فکر و نظر، صائب الرائے اور دور اندیش شخص حیات آزادی کے لیے کی جانے والی جد و جہد کے وقت خاموش تماشائی بنا رہ سکتا ہے یا بے فکر اس آتش آزادی میں کود پڑتا ہے۔

اورنگ زیب عالمگیر کی وفات کے بعد مغل شہزادوں کے درمیان اختلاف و انتشار کے سبب زوال کے اثرات رونما ہو چکے تھے۔ ادھر ہندوستان کے جنوب مشرقی ساحل پر انگریزی قوم، بہ غرض تجارت یورپ سے ہندوستان آ کر یہاں حکمرانی کے خواب دیکھ رہی تھیں۔ رفتہ رفتہ حکومت کمزور اور بیرونی طاقت زور پکڑتی رہی۔ بالآخر غدر سے پہلے ہندوستانی مسلمانوں کی زبوں حالی کس قدر روح فرسا ہے قارئین تاریخ ہند سے یہ بات مخفی نہیں۔ غیر ملکی پورے طور پر بیدار ہو کر مسلمانوں کی فطری صلاحیتوں اور ان کے جوش و جذبہ کو اپنی حسن تدبیر سے بکسر مجمد کر رہے تھے۔ ان کے حکمرانوں کی غفلت و لاپروائی اور نااہل عہدے داروں کی عیاشیوں اور عاقبت نااندیشوں سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ان کے اردگرد سازشوں کا جال بچھا دیا۔ ہمیشہ تاریخ کے اوراق کچھ غداروں کے شرمناک کرتوں سے سیاہ رہے ہیں۔ ایک عظیم طاقت کسی غدار کے مکر فریب اور اس کی دغابازیوں کے سامنے ہیچ ہے۔ آنے والی سفید رو قوم نے اس میدان میں اپنی خصوصی توجہ مبذول کی۔ اسے یقین تھا کہ کبھی بھی صرف میدان جنگ میں قوم مسلم کو مغلوب نہیں کیا جا سکتا۔ بالآخر اس نے ہماری ہی قوم میں چند جنگ دین و ملت پیدا کر کے ان کے قدم جمانے شروع کیے، پھر تو مختلف اصلاح و دعوتی جماعتوں پر ان کا تسلط ہوتا گیا۔

علامہ کی پیدائش کے دوسرے سال 1799ء میں سلطان ٹیپو کی شہادت کے بعد ملک کے اکثر حصہ پر انگریز قابض ہو چکے تھے۔ اٹھارہویں صدی عیسوی کے اختتام کے بعد غیر ملکی طاقت پورے ملک پر چھائی۔ ہندی قوم کے عروج کا ستارہ غروب ہو کر غلامی ان کا مقدر بن چکی تھی۔ مغلوں کی بادشاہت صرف قلعہ کی چہار دیواری کے اندر محدود تھی۔ شاطر و عیار دشمن اب ہندو مسلمانوں کے مذہبی امور میں مداخلت کر رہا تھا۔ لیکن ہر دور میں فرخوئی طاقت کی سرکوبی کے لیے ایک مسیحا کا وجود قانون فطرت ہے۔ اس وقت بھی اجلۂ علمائے کرام' محدثین عظام اور صوفیاء و مشائخ کی ایک جماعت موجود تھی جن کے سینے اسلامی علوم و افکار سے مملو تھے۔

دینی تعلیم میں حکومت کی لاپرواہی کے سبب علماء کی اکثریت سیاسیات سے یک گونہ الگ ہو کر تجدید دین واحیائے سنت میں مشغول تھی۔ یہ مقدس جماعت اپنے مقدور بھر مسلمانوں کے قلوب میں انسانی حریت اور اسلامی جذبے کو پروان چڑھتی رہی۔ علامہ فضل حق خیرآبادی اپنے زمانے کے فضلاء و علماء میں سرٹیل جماعت کی حیثیت رکھتے تھے۔ علامہ کا خاندان دینی حکمت کے ساتھ ساتھ دنیاوی وجاہت بھی رکھتا تھا۔ اس لیے آپ مختلف جگہ اعلیٰ ملکی مناصب پر فائز ہوتے رہے اور اس اسلام دشمن طاقت کا مشاہدہ بہت قریب سے کیا جس سے ان کے سینے میں مسلسل حریت و آزادی کی چنگاری مشتعل ہوتی رہی۔ اس لیے علامہ جہاں کہیں بھی رہے حتی الامکان ہندی قوم میں آزادی کی لہر پھونکتے رہے۔

بالآخر غلامی جب اپنی انتہا کو پہنچ گئی' ظلم کے ترکش کا آخری تیر مذہبی معاملات میں دخیل ہونے لگا اور منہ سے توڑے جانے والے کارتوسوں میں سور اور گائے کی چربی کی آمیزش کی گئی۔ جس سے ہندی فوج یک لخت مشتعل ہو کر انگریزوں کے خلاف کمر آرا ہو گئی۔

علامہ فضل حق جیسا دور اندیش اور دانش مند مفکر جو اپنی عمر عزیز کے ایک بڑے حصے میں ان کی اسلام دشمنی کے سبب خون کے گھونٹ پی چکا ہو بھلا ایسے زریں موقع پر کیسے خاموش رہ سکتا ہے؟ فوراً علامہ نے اپنا فتوائے جہاد جاری کیا' پھر محض فتویٰ دے کر عورتوں کی طرح گھروں میں بیٹھنا کیسے متصور ہو سکتا ہے؟ بلکہ علامہ نے اس جنگ آزادی میں بھرپور حصہ لیا۔ یہ مسلم ہے کہ میدان جنگ میں لڑنے والی فوج وہ کام نہیں کر سکتی جو ایک دانش ور قائد کی قیادت و رہنمائی کر سکتی ہے۔ لہٰذا بغاوت میں امور حرب و ضرب اور مملکتی نظام میں اعیان سلطنت کو علامہ کا مشورہ دینا اور ان کی رہنمائی کرنا' بادشاہ وقت کو فوجیوں کی بھرپور مدد اور بوقت ضرورت ان کی عملی قیادت پر برانگیختہ کرنا محض امر نہیں۔ [1]

خود علامہ کو دلی مدعو کیا جانا بھی اس پر بین ثبوت ہے۔ وہ الثورۃ الہندیہ میں لکھتے ہیں۔ فتوجهت تلقاء دهلی مما کان محلی فالقیت بها رحلی ولا قیت بها اهلی واشرت الی الناس بما اقتضی رائی وقضی به عقلی فلم یاتمروا بما اشرت ولم یاتمروا بما امرت ﴿۳۲﴾ میں نے دلی کا رخ کیا وہاں پہنچ کر اہل وعیال سے ملا اپنی عقل وفہم کے مطابق لوگوں کو اپنی رائے اور مشورہ سے آگاہ کیا لیکن نہ انہوں نے میرا مشورہ قبول کیا اور نہ میری بات مانی۔

روداد کی پہلو سے علامہ خیرآبادی کی سرگرمیاں ملاحظہ ہوں۔ اس دور کے روزنامچوں اور تاروں میں پوری تفصیل تو نہ کو نہیں پھر بھی بہت سی سرگرمیوں کا سراغ ضرور ملتا ہے۔ علامہ بغاوت شروع ہوتے ہی دلی آگئے وہاں اعیان سلطنت کی رہنمائی کی اور حکومت کے دستور العمل کی ترتیب شروع کردی۔ اس کے بعد ہی آپ نے اپنا فتوائے جہاد صادر کیا۔

- انگلش حکومت کے مخبرین کی بعض تحریریں ہم تک پہنچ سکی ہیں۔ چنانچہ ایک جاسوس تراب علی لکھتا ہے: "مولوی فضل حق جب سے اودھ سے آئے ہیں وہ ہندوؤں اور شیعوں کو برطانیہ کے خلاف بھڑکانے میں مصروف ہیں"۔
- "مولوی فضل حق کی اشتعال انگیزیوں سے متاثر ہو کر شہزادے بھی میدان میں نکل آئے اور سبزی منڈی کے پھل والے محاذ پر صف آرا ہیں"۔
- ایک دوسرے مخبر چنی لال نے خبر دی: "مولوی فضل حق اپنے مواعظ سے عوام کو مسلسل بھڑکا رہے ہیں"۔
- دوسری فائل میں بھی کچھ اطلاعیں درج ہیں: "مولوی (فضل حق) صاحب جب بھی بادشاہ سے ملتے وہ بادشاہ کو مشورہ دیتے کہ جنگ کے سلسلہ میں ہدایات کی ہمت افزائی کریں اور ان کے ساتھ باہر نکلیں اور دشمنوں کو جس حد تک ممکن ہو بھتر معاوضہ دیں"۔
- ایک مجلس مشاورت قائم کی گئی تھی۔ جس کے علامہ ایک نہایت فعال متحرک رکن بھی تھے: "بادشاہ نے جنرل بخت خاں، مولوی سرفراز علی اور مولوی فضل حق پر مشتمل دربار کونسل بنائی"۔ ﴿۳۳﴾

مقابلہ حکومت کی طرف سے علامہ کو بڑے بڑے اختیارات بھی حاصل تھے جن پر مختلف احکام کے نفاذ کی تفصیل مخبرین کے اپنے اپنے روزنامچوں میں مرقوم ہے۔ برطانیہ حکومت کے ایک جاسوس منشی جیون لال کے روزنامچہ میں وسط اگست 1857ء اور اوائل ستمبر میں علامہ کی کارکردگیوں کا ذکر موجود ہے۔ ﴿۳۴﴾

اسی جیون لال کے بیان سے پتہ چلتا ہے کہ آپ نے شاہی فوج کی کمان بھی کی ہے۔ تراب علی کی مذکورہ

رپورٹ بھی اس کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ [25]

روزنامچوں کی ان تفصیلات سے علامہ کے سیاسی حالات سے باخبری اور انقلابی سرگرمیوں کا اندازہ ہوتا ہے۔

"پھر سقوط دہلی کے پانچ روز بعد علامہ خانماں برباد وں کی طرح اپنی متاع عزیز کتب خانہ اور دیگر ساز وسامان دشمن کے رحم وکرم پر چھوڑ کر خیرآباد کوچ کر گئے۔ خرابی دہلی کے بعد جنگ آزادی کی سرگرمیوں کا مرکز ملکہ حضرت محل زوجہ نواب واجد علی شاہ رئیس اودھ بنی۔ علامہ بھی چند دن بعد ملکہ کی معاونت کے لیے اودھ پہنچ گئے۔ وہاں حسب منزلت علامہ کو اعلیٰ عہدے پر فائز کیا گیا۔ علامہ اس کی مجلس مشاورت کے ایک اہم اور ممتاز رکن رہے اور انہیں مفید مشوروں سے نوازتے رہے۔ مگر ناکامی ونامرادی اور ہزیمت مقدر ہو چکی تھی۔ بالآخر اودھ اور اس کے اردگرد کے تمام علاقے انگریزوں کے زیر نگیں آ گئے۔ پھر کچھ دنوں بعد علامہ گرفتار کر لیے جاتے ہیں جہاں سے ان کی ابتلا وآزمائش کا سنگین دور شروع ہوتا ہے"۔ [26]

یہ تھی دہلی اور اودھ میں علامہ کی مجاہدانہ سرگرمیوں کی ایک جھلک۔ اس کے علاوہ مقدمات کے بیان سے بھی واضح ہوتا ہے کہ علامہ نے پورے طور پر جنگ آزادی میں فدا کارانہ حصہ لیا اور اس کے زبردست محرک بھی رہے' ورنہ بہت سے علماء کی شرکت اور بوقت جنگ آزادی بقید حیات ہونے کے باوجود انتی بھیانک سزا صرف علامہ ہی کے لیے کیوں منتخب کی گئی؟ یہ امر بھی تو ایک جداگانہ دعوت فکر اور لمحہ نظر یہ ہے۔ مختصر اً مقدمات کی رپورٹ نذر قارئین ہے:

❶ اودھ کے چیف کمشنر کا سیکرٹری اپنے سرکاری مراسلے میں لکھتا ہے: "مندرجہ ذیل لوگوں کے چلے جانے کے بعد حکومت کو قیام امن میں کافی سہولت ہو رہی ہے' فیروز شاہ' لکڑ شاہ' مولوی فضل حق جو ہماری حکومت کا دشمن جان ہے۔ حالانکہ حکومت نے اسے اور اس کے اعزہ کو اعلیٰ مناصب عطا کیے تھے"۔ [27]

❷ مسٹر جارج کمسیل جوڈیشل کمشنر اودھ اور صفر بارہ قائم مقام کمشنر خیرآباد نے 4 مارچ 1859ء کو فیصلہ صادر کرتے ہوئے لکھا: بغاوت شروع ہونے سے قبل وہ الور میں ملازم تھا' یہاں سے دیدہ ودانستہ دہلی آیا اور اس کے بعد وہ باغیوں اور بغاوت کے قدم بہ قدم چلتا رہا۔ ایسے شخص کو سخت ترین سزا ملنی چاہیے اور اسے خاص طور پر ہندوستان سے جلاوطن کر دینا چاہیے۔ [28]

● علامہ کے جہاد آزادی میں شریک ہونے کی معاصر شہادتیں آپ نے ملاحظہ کر لیں۔ بعد کی تاریخوں میں بھی اس کا چرچا سنیے۔ مولوی حسین احمد مدنی جنگ آزادی میں علامہ فضل حق خیرآبادی اور بعض معاصر علماء اور ان کے تلامذہ کے بڑے پیمانے پر شریک کار ہونے کی شہادت دیتے ہیں: "بہر حال مسلمان علماء میں سے مولانا احمد

اللہ شاہ صاحب' دلاور جنگ مدراسی اور مولانا فضل حق خیرآبادی اور مولانا امام بخش صہبائی اور ان حضرات کے تلامذہ وغیرہ نے جہاد حریت 1857ء میں بڑے پیمانے پر حصہ لیا تھا"۔ ۲۹

● محمد اسماعیل پانی پتی جنگ آزادی میں علامہ کی سیاسی خدمات کے بارے میں لکھتے ہیں: "(علامہ فضل حق نے) 1857ء کے ہنگامہ میں انگریزوں کے خلاف سخت حصہ لیا جس کے نتیجے میں گرفتار کر کے کالے پانی بھیج دیے گئے۔ جہاں اس فاضل اجل' عالم بے بدل نے نہایت کس مپرسی' بے بسی اور لاچاری کی حالت میں 20 اگست 1861ء کو انتقال کیا اور علم و دانش اور فضل و بصیرت کا یہ آفتاب ہمیشہ کے لیے غروب ہو گیا"۔ ۳۰

● دوسری جگہ وہ اپنے مضمون "1857ء میں علمائے کرام کا حصہ" میں رقم طراز ہیں: "جب 1857ء کا ہنگامۂ عظیم دہلی میں رونما ہوا تو علامہ فوراً دہلی پہنچے اور جہاد کا فتویٰ دیا۔ جنرل بخت خاں کماندار انچیف افواج قاہرہ سے ملے اور اس کی بڑی اعانت کی"۔ ۳۱

● مولوی رحمان علی "تذکرۂ علمائے ہند" میں لکھتے ہیں کہ: "جنگ آزادی 1857ء میں مولانا فضل حق نے مردانہ وار حصہ لیا۔ دہلی میں جنرل بخت خاں کے شریک رہے۔ لکھنؤ میں حضرت محل کی کورٹ کے ممبر رہے"۔ ۳۲

● سوویت یونین کی سائنس اکیڈمی کے ادارۂ علوم شرقیہ کی ایک ممتاز رکن "مادام پولونکیا" اپنے ایک مضمون میں لکھتی ہیں: "مولانا (فضل حق) اور تشریف لائے جہاں انہوں نے انگریزوں کے خلاف ایک مسلح بغاوت کا پرچار کیا۔ ان کا خیال یہ تھا کہ وہ زمیندار جو برطانوی حکومت سے مطمئن نہیں ہیں اس کی بنیادی طاقت ہوں گے۔ مولانا موصوف کے معاصرین اور ان کے سوانح نگاروں نے ان کے بہت سے خطوط کا ذکر کیا ہے جو انہوں نے مختلف ریاستوں کے حکمرانوں کو لکھے تھے۔ انہوں نے برطانیہ کے خلاف ایک مسلح بغاوت کا پیغام دیا تھا۔ بغاوت کے زمانے میں مولانا انگریزوں کے مخالفوں کی صف میں رہے"۔ ۳۳

● پاکستان کے مشہور پروفیسر محمد ایوب قادری علامہ کے دہلی اور الور دونوں جگہ کے جہاد میں شریک ہونے اور اس پر جلاوطنی کی سزا پانے کے بارے میں لکھتے ہیں: "جنگ آزادی 1857ء میں مولانا فضل حق نے حصہ لیا' دہلی میں جنرل بخت خاں کے شریک رہے۔ لکھنؤ میں بیگم حضرت محل کی کورٹ کے ممبر رہے' آخر میں گرفتار ہوئے' مقدمہ چلا اور حبس دوام عبور بہ دریائے شور کی سزا ہوئی"۔ ۳۴

● دوسری جگہ لکھتے ہیں: "1857ء کے ایک ہنگامے میں مولانا فضل حق الور سے دہلی پہنچے اور دہلی سے بعد از خرابی بسیار اودھ پہنچے' حضرت محل کی کورٹ کے ممبر ہوئے بعد ازاں مولانا فضل حق گرفتار ہوئے' بغاوت کے الزام

میں اس یگانۂ روزگار شخصیت پر مقدمہ چلا"۔ ۳۵

● نامور مورخ رئیس احمد جعفری اپنی تاریخ "بہادر شاہ ظفر اور ان کا عہد" میں جنگ آزادی میں علامہ کی زبردست قائدانہ شرکت اور بہادر شاہ ظفر کے معتمد خاص اور مملکتی معاملوں میں دخیل ہونے کے بارے میں لکھتے ہیں: "وہ (علامہ فضل حق خیرآبادی) انگریزوں سے نفرت کرتے تھے اور انگریزوں کو نکالنے کے لیے ہر منظم اور باقاعدہ تحریک میں حصہ لینے پر دل و جان سے آمادہ رہتے تھے۔ چنانچہ جب غدر شروع ہوا تو مولانا بے تامل شریک ہوئے۔ وہ بہادر شاہ کے معتمد، مقرب اور مشیر تھے۔ ان کے دربار میں شریک ہوا کرتے تھے، انہیں اہم معاملات و مسائل پر مشورہ دیتے تھے اور اس بات کے مساعی تھے کہ آزادی کی یہ تحریک کامیاب ہو اور انگریز اس دیس سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے رخصت ہو جائیں۔ مولانا نے غدر میں دلیری اور جرأت کے ساتھ اعلانیہ حصہ لیا"۔ ۳۶

؎ وہ منفعل ہو کہ مشتعل بلا سے مگر
کبھی تو حال دلِ زار پر بلا کہیے

مذکورہ تفصیلات غدر اور بعد کے تاریخی شواہد سے یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہو گئی کہ بطلِ حریت علامہ فضل حق خیرآبادی شہید جزیرۂ انڈمان قوم ہند کی آزادی کی خاطر ہمیشہ کو شاں رہے۔ یقیناً علامہ جیسی بیدار مغز، حساس دل اور حریت نواز طبع عظیم عبقری شخصیت کا ضمیر ہرگز گوارا نہیں کر سکتا تھا کہ گلے میں کسی کی غلامی کا پٹا بالخصوص اس قوم کی بے جا تحقیق کیسے قابل برداشت ہو سکتی ہے جو قوم اللہ و رسول کی دشمن اور اس کے لائے ہوئے آسمانی مذہب کی نیستی کی خواہاں اور رسول اللہ کے جاں نثاروں کے خون کی پیاسی ہو؟ اس شیرِ حق کی رگوں میں اپنے زندہ دل غیور اسلاف کا خون رواں تھا، وہ مجمد کیوں ہونے لگتا؟ افسوس کہ اس مردِ حق گو کے ساتھ اہل ہوا و ہوس متعصب مزاج تاریخ سازوں نے بڑا ظلم کیا جو ان مورخین کی سیاہ دامنی اور بد کرداری کا سبب بن کر ان کی ذات کو داغ دار اور رسوائے زمانہ تو کر گئی مگر علامہ کی منفرد و یگانہ روزگار ہستی پر کوئی حرف نہیں لا سکی۔

﴿حوالہ جات﴾

۱) مقدمہ باغی ہندوستان، ص: ۲۰
۲) باغی ہندوستان، ص: ۱۹۴
۳) اغلاط کی تصحیح: سید حکیم محمود احمد برکاتی "مشمولہ باغی ہندوستان، ص: ۲۹۴

۴) باغی ہندوستان، ص: ۴۱۷

۵) امتیاز حق، ص: ۱۲

۶) ایضاً، ص: ۱۳

۷) تحریک دہلی، اگست 1957ء بحوالہ باغی ہندوستان، ص: ۴۱۹

۸) تحریک دہلی، جون 1903ء بحوالہ فضل حق خیرآبادی اور ستاون، ص: ۷۹

۹) امتیاز حق، ص: ۲۶

۱۰) ایضاً، ص: ۲۳

۱۱) ایضاً، ص: ۲۸

۱۲) ایضاً، ص: ۲۴

۱۳) ایضاً، ص: ۲۵

۱۴) ایضاً، ص: ۲۶

۱۵) ایضاً، ص: ۴۳

۱۶) مقدمہ تحقیق الفتویٰ، ص: ۱۷

۱۷) ایضاً، ص: ۲۱۵

۱۸) ایضاً، ص: ۲۷۸

۱۹) امتیاز حق، ص: ۳۵

۲۰) ایضاً، ص: ۴۰

۲۱) تفصیل: "الثورۃ الہندیہ"

۲۲) باغی ہندوستان، ص: ۴۶

۲۳) ساری تفصیل باغی ہندوستان، ص: ۲۶۸۔۲۶۷ سے منقول ہے۔

۲۴) ایضاً

۲۵) فضل حق اور سن ستاون، ص: ۵۱

۲۶) ایضاً، ص: ۶۲۔۶۱

۲۷) باغی ہندوستان، ص: ۴۱۵

۲۸) ایضاً، ص: ۴۲۶

۲۹) ایضاً، ص: ۲۷۱

۳۰) ایضاً

۳۱) ایضاً، ص: ۲۷۲

۳۲) ایضاً، ص: ۲۷۷

۳۳) امتیاز حق، ص: ۴۹

۳۴) باغی ہندوستان، ص: ۲۷۵

۳۵) ایضاً، ص: ۲۷۶

۳۶) ایضاً، ص: ۲۷۵۔۲۷۶

Nafse Islam
نفس اسلام
WWW.NAFSEISLAM.COM

فتوی جہاد اور علامہ فضل حق خیرآبادی

جنگ آزادی 1857ء کے دوران کئی فتوے دیے گئے تھے۔ چنانچہ دو فتووں کا ذکر مولوی ذکاء اللہ کی تاریخ ج ۱۰ میں ملتا ہے۔ جس کے مطابق ایک فتوے کا حاصل تھا جبکہ دوسرا فتوی مفتی عنایت خان کے دہلی میں ورود کے بعد والا ہے اس کا حاصل بہت زیادہ تھا۔ تیسرے فتوے کا ذکر سر سید احمد خان نے اپنی کتاب میں کیا ہے۔ اس فتوے کو انہوں نے خود دیکھا تھا اور یہ عدم وجوب جہاد کا آئینہ دار تھا۔ ان معاصر اور قریبی دور کے ماخذ کے علاوہ بعد کی ایک تصنیف "باغی ہندوستان" میں بھی ایک فتوے کا ذکر ملتا ہے جو علامہ فضل حق خیرآبادی کا بتایا گیا ہے۔

مگر ان میں سے صرف ایک فتوی اب تک دستیاب ہوا ہے سارے نہیں ہیں اور وہ فتوی 26 جولائی 1857ء کو صادق الاخبار میں چھپنے والا فتوی ہے۔ جس پر دہلی کے 33 علماء نے وجوب جہاد کی تصدیق میں دستخط کیے ہیں اور اس فتوے کے مندرجات اور دستخط کنندگان مذکورہ بالا فتووں سے مطابقت نہیں رکھتے۔ ۱

1857ء کے تاریخی حقائق پر مشتمل جس قدر معاصر ماخذ اب تک منظر عام پر آئے ہیں اور جن تک ہماری رسائی ہے وہ سب تصدیق کرتے ہیں کہ علامہ وجوب جہاد کے نہ صرف قائل تھے بلکہ انہوں نے ہر سطح کے لوگوں (بادشاہ، شہزادوں، افواج اور رعایا) کو آمادہ جہاد کیا ہے اور ایک سے زائد مرتبہ فتوی جہاد دیا۔ ملاحظہ کیجیے

● "مولوی (فضل حق) نے جب جب بھی بادشاہ کے پاس آتے (بادشاہ کو مشورہ دیتے کہ جہاد کی مہم میں اپنی رعایا کی ہمت افزائی کریں اور ان کے ساتھ باہر (میدان میں) بھی نکلیں۔ فوجی دستوں کو جس حد تک ممکن ہو بہتر معاوضہ دیں ورنہ اگر انگریز جیت گئے تو نہ صرف خاندان تیموریہ بلکہ تمام مسلمان نیست و نابود ہو جائیں گے"۔ ۵

● وقلت ان العدی لن یصفحوا ابدا فما من الحرب من بد وحسنان ۶

ترجمہ: میں نے کہا کہ دشمن کبھی معاف نہ کرے گا اس لیے جنگ اور مقابلے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔

صادق الاخبار والے فتوے پر علامہ کے دستخط نہ ہونے کی وجہ سے ان کا ان دنوں اور میں ہونا ہے۔ غالباً اسی لیے علامہ لکھتے ہیں: "یہ تو سب کچھ ہو ہی رہا تھا کہ بعض شہروں سے بہادر مسلمانوں کی ایک جماعت علماء زہاد

اور ائمہ اجتہاد سے جہاد کے وجوب کا فتویٰ لے کر جدال وقتال کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی"۔ [۱]

خیال رہے کہ "باغی ہندوستان" میں علامہ سے منسوب فتوے کی تصدیق کرنے والے جن چھ حضرات کے نام دیے گئے ہیں وہ تحقیق کے مطابق مغلوط دہلی کے وقت تک نہ صرف زندہ تھے بلکہ دہلی میں موجود تھے۔ مفتی صدر الدین آزردہ اور مولوی عبدالقادر تو علمائے دہلی میں سے تھے۔ مولوی فیض احمد بدایونی اور ڈاکٹر مولوی وزیر علی خان جہاد آزادی کے یہ دونوں بڑے مجاہد آگرہ سے آئے تھے اور ان دنوں دہلی میں تھے۔ قاضی فیض اللہ دہلوی کوتوال دہلی تھے' ان کے مستعفی ہونے پر سید مبارک شاہ رامپوری ان کی جگہ کوتوال بنے اور مغلوط دہلی کے وقت تک وہی کوتوال تھے۔ یعنی یہ سب علامہ کی دہلی میں موجودگی کے گواہ ہیں۔ دہلی ہی میں تھے اور ایک فتوے پر ان سب کے دستخطوں کی موجودگی ممکن ہے اور بعید ممکن ہے کہ یہ فتویٰ ستمبر 1857ء کے پہلے ہفتے میں دیا گیا ہو۔ غیر یہ کہ اگر باغی ہندوستان وغیرہ میں ذکر کردہ فتویٰ جہاد دستیاب ہو جائے تو جہاد آزادی میں علامہ کی دیگر خدمات کے مقابل میں وہ ایک ادنیٰ سی خدمت شمار ہوگی۔

﴿حوالہ جات﴾

۱۔ تاریخ عروج سلطنت انگلشیہ ۵/۶۷۵ بحوالہ مجموعہ مقالات' ص: ۸۷۔۸۸

۲۔ اسباب سرکشی ہندوستان' ص: ۱۰۶۔۱۰۷

۳۔ باغی ہندوستان' طبع اول' ص: ۱۵۶

۴۔ جنگ آزادی 1857ء پر بہت سا مواد انڈیا آفس لائبریری لندن میں منتقل ہے۔ اس کی مکمل اشاعت تک بہت سے حقائق پردہ اخفا میں ہی رہیں گے۔

۵۔ ان علماء دہلی میں سے چند وہ ہیں جنھوں نے علامہ کے مقصد قتل پر فتوے دستخط کیے تھے۔

۶۔ تفصیل کے لیے "باغی ہندوستان" ص: ۲۶۳۔۲۶۶ اور "فضل حق خیر آبادی اور سن ستاون" ص: ۶۸۔۶۹

۷۔ دیکھیے: Bahadur Shah II:P-389-390

۸ Memoirs of Hakim Ahsanullah khan,P:24

۹۔ قصیدہ نانوتویہ' شعر نمبر: ۲۱۸

۱۰۔ باغی ہندوستان' ص: ۳۵

WWW.NAFSEISLAM.COM

علامہ فضل حق خیرآبادی کا فتوی جہاد اور ان کے حامی علماء کرام ومشائخ

محمد صادق رضا مصباحی

بادشاہ جہانگیر کے دور (1600ء) سے ہی انگریز ہندوستان کی سرحدوں میں داخل ہونے لگے تھے۔ تجارت کی غرض سے ہندوستان کا رخ کرنے والی یہ قوم اپنے ساتھ ہندوستان پر حکومت کرنے کے منصوبے بھی لائی تھی۔ چنانچہ ہندوستان کے مختلف علاقوں میں اس نے تجارتی منڈیوں کا جال بچھانا شروع کر دیا۔ کلکتہ کی "ایسٹ انڈیا کمپنی" جو 1708ء میں قائم ہوئی اس کی نشست اول کہی جاسکتی ہے۔ اس چالاک اور عیار قوم نے ان تجارتی مراکز میں تاجروں کے بھیس میں اپنے فوجی رکھے تھے جو یہاں کی ریاستوں اور علاقوں پر قبضے کا خواب دیکھ رہے تھے۔ 1857ء تک انگریز فوجوں نے ہندوستان کے مختلف علاقوں پر حملے کیے اور بہت ساری ریاستوں پر قابض بھی ہو گئے لیکن ان کی نظریں کہ دار الحکومت دہلی پر تھی اس لیے اپنی مطلوبہ منزل تک پہنچنے کے لیے ان کے مزاحم کے راستے میں بہت ساری رکاوٹیں تھیں۔ سلطان ٹیپو شہید، حافظ رحمت خاں اور نواب سراج الدولہ جیسے بے شمار سردار اور حاکم ان کے خوابوں کو تعبیر نہیں ہونے دے رہے تھے لیکن ان کو زیر کرنا انگریزوں کے لیے ضروری تھا۔ چنانچہ انہوں نے بااثر مسلمانوں کو "بلیک میل" کرنا شروع کر دیا۔ انہیں حکومت اور سرداری کا لالچ دیا اور یہ لوگ ایسے ضمیر فروش اور غدار ابن وطن ڈھونڈنے میں کامیاب ہو گئے جو انگریزوں کے حلیف بن کر مسلمان سرداروں سے الجھتے رہے اور انگریزوں کو دہلی تک پہنچانے میں نہایت اہم رول ادا کیا۔ اگر انگریزوں کو ایسے "میر جعفر" اور "میر صادق" نہ ملتے تو شاید آج برصغیر کی تاریخ کا دھارا کچھ اور ہی ہوتا۔

1857ء کے انقلاب نے ایک نیا موڑ لیا۔ مسلمانوں کی رہی سہی حکومت زوال آشنا ہو گئی اور دہلی کی باگ ڈور بھی انگریزوں کے ہاتھوں میں آگئی اور انگریز پورے ہندوستان کے سفید وسیاہ کے مالک بن بیٹھے۔ 1947ء تک ہندوستان کے افق پر ان کی حکومت کا سورج نمودار رہا۔ ان 90 سالوں میں حکومت کے دوران انہوں نے ہندوستانیوں بالخصوص مسلمانوں پر جو ظلم روا رکھا جو ہندوستان کی تاریخ میں سیاہ باب کی حیثیت رکھتا ہے۔

تاریخ کے صفحات گواہ ہیں کہ ہندوستان کو ملیچھ استبداد سے نکالنے میں جتنی قربانیاں مسلمانوں نے دی ہیں وہ

دوسرے لوگوں کی بہ نسبت کہیں زیادہ ہیں۔ بالخصوص علماء اور مشائخ کا رنگ تو اور نمایاں نظر آتا ہے۔ گو ہمارے مذہبی حریف اور ہندوستان کی احیاء پسند تنظیمیں اپنے علماء اور قائدین کو مجاہدین آزادی کی حیثیت سے پیش کرتی ہیں اور اصل مجاہدین کے بے لوث کارناموں اور لازوال قربانیوں کو حرف غلط کی طرح مٹا دیتی ہیں۔ لیکن ہم ان سے پوچھنا چاہتے ہیں کہ حقائق سے آپ کب تک نبرد آزما رہیں گے؟ حقائق دبائے تو جا سکتے ہیں مٹائے نہیں جا سکتے۔ متحدہ ہندوستان کے چپے چپے میں مسلمانوں کے اندر آزادی کی لہر دوڑانے والے کوئی اور نہیں علمائے اہل سنت ہی تھے۔ جنہوں نے اپنی تحریروں، تقریروں اور شعر و شاعری کے ذریعہ مسلمانوں کی رگوں میں آزادی کا خون دوڑا دیا۔ ان علماء کو اس پاداش میں کیسے کیسے ستم جھیلنے پڑے اور کن کن مصائب و آلام کا خونی دریا عبور کرنا پڑا ان کے تصور سے ہی آنکھوں میں آنسوؤں کے بادل امڈ آتے ہیں۔

آخر کار ایک دن علماء کی شہادتوں کا خون رنگ لایا اور عوام کی جہد و جہد سر سبز ہوئی اور انگریز 1947ء میں ہندوستان چھوڑ کر بھاگ گئے۔ علمائے کرام نے اپنی اپنی بساط کے مطابق ہندوستان کی آزادی کے لیے اپنی تمام تر توانائیاں صرف کر ڈالیں جب آزادی کی صبح طلوع ہوئی۔

اب ہم ذیل میں ان مشائخ، علماء، شعراء اور ادباء کا تذکرہ کر رہے ہیں جنہوں نے اپنے فکری، عملی اور قلمی جہاد سے ہندوستان میں ہر طرف انگریزی حکومت کے خلاف آگ لگا دی تھی اور جن کی تحریک سے ہر طرف انگریزوں کے خلاف نفرت و بیزاری کا لاوا پھوٹ پڑا تھا۔

تحریک آزادی کے مشائخ:

خواجہ محراب شاہ قلندر گوالیری (م 1233ھ)، خواجہ قطب الدین دہلوی (م 1233ھ)، خواجہ احمد سعید نقشبندی دہلوی (م 1277ھ)، سید محمد قاسم شاہ دانا پوری (م 1298ھ)، حضرت بابا نگاہی شاہ شہید پنجابی (م 1273ھ)، حضرت مخدوم حافظ جمال اللہ ملتانی (م 1226ھ)، خواجہ منشی غلام حسین شہید (م 1265ھ)، حضرت مخدوم شاہ محمد ہدایتی (م 1255ھ)، حضرت مخدوم حافظ عبد العزیز (م 1296ھ)، حضرت پیر شاہ بولن قادری شہید (م 1276ھ)، خواجہ سید عبد الحی شاہ ملتانی شہید (م 1267ھ)، خواجہ خدا بخش (م 1252ھ)، خواجہ غلام فرید (م 1317ھ) وغیرہم قدست اسرارہم۔

تحریک آزادی کے علماء:

علامہ فضل حق خیر آبادی (م 1861ء)، مفتی صدر الدین آزردہ (م 1285ھ)، مفتی رضا علی خاں بریلوی

(م 1282ھ)' مولانا احمد اللہ شاہ مدراسی (م 1858ء)' مفتی عنایت احمد کاکوروی (م 1279ھ)' مفتی رسول بخش کاکوروی' مولانا فیض احمد عثمانی بدایونی (م 1274ھ)' مولانا ڈاکٹر وزیر خاں اکبرآبادی (م 1858ء)' مولانا وہاج الدین مراد آبادی' مولانا لیاقت علی الہ آبادی (م جزیرۂ انڈمان)' مولانا سید کفایت علی کافی شہید (م 1274ھ)' مولانا امام بخش صہبائی' مولانا رحمت اللہ کیرانوی (م 1308ھ)' حکیم سعود اللہ قادری (م 1325ھ) وغیرہم رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین۔

تحریک آزادی کے شعراء:

مولانا رضی الدین شہید بدایونی (م 1869ء)' مولانا اعجاز حسین سوز شہید' مفتی محمد اسماعیل میرٹھی' وحید الہ آبادی (م 1272ھ)' مولانا فضل احمد اسیر دہلوی' میر حسن تسکین دہلوی (م 1268ھ)' مفتی رضا علی خاں بریلوی (م 1282ھ)' محمد یعقوب علی آبادی چشتی شہید' سید برہان الدین اعظم دہلوی شہید (م 1858ء)' رفیع الدین خان لکھنوی شہید (م 1858ء)' مرزا محمد جان بیگ کشمیری (م 1859ء)' عبداللہ خاں ہوم شہید' حضرت امیر احمد مینائی (م 1900ء)' نور الدین محمد خان انور شہید (م 1272ھ)' سید منور علی شہید آشفتہ (م 1247ھ)' سید کفایت علی کافی شہید (م 1274ھ)' حافظ عبدالرحمن احسان دہلوی (م 1277ھ)' مولانا لیاقت علی الہ آبادی' مفتی صدرالدین آزردہ دہلوی (م 1285ھ)۔

تحریک آزادی کے ادباء:

مولانا محمد الخیر قریشی شہید' قاری بخش جام پوری' امانت علی خاں پاک پتن شریف' میاں فضل کریم بدایونی شہید' مولانا امام بخش بہاولپوری شہید (م 1267ھ)' فضل محمود انصاری شہید (م 1267ھ)' مولانا عبدالعزیز ملتانی (م 1267ھ) وغیرہم۔

"مشتے نمونہ از خروارے" کے تحت یہاں صرف چند اسماء کا تذکرہ کیا گیا۔ اگر اس سلسلہ میں تفصیل سے خامہ فرسائی کی جائے تو ایک ضخیم کتاب مرتب ہو جائے۔ یہ سب مسلک اہل سنت کے علم بردار تھے۔ بطل حریت علامہ فضل حق خیرآبادی علیہ الرحمۃ نے انگریزوں کے خلاف اپنا فتویٰ جہاد جاری کیا اور اس پر بہت سارے علمائے اہل سنت نے دستخط فرمائے اور پھر اسی کو ہندوستان بھر میں مشتہر کیا گیا۔ فتوے کا پھیلنا تھا کہ مسلمانوں کے درمیان انگریزوں کے خلاف اور اشتعال پیدا ہو گیا اور مسلمان جذبۂ جہاد لے کر نکل پڑے۔

یہاں ٹھہر کر ہم آپ سے ایک بات پوچھنا چاہتے ہیں کہ کیا مولوی اسماعیل دہلوی کے کسی مرید یا معتقد عالم

WWW.NAFSEISLAM.COM

دین نے اس فتوے پر دستخط کیے تھے یا ان کے نظریات کے حامی کسی عالم نے اس کی تائید کی تھی؟ آپ آزادی ہند کی تاریخ کا ورق ورق الٹ ڈالیے لیکن ان کی فکر سے وابستہ کسی شخص کو تاریخ کے سامنے کھڑا نہیں کر سکتے جس نے اس فتوے کی تائید کی ہو۔ یہ لوگ اس کی تائید و توثیق تو کیا کرتے "الثنا علمائے اہل سنت کو انگریزوں کا وفادار اور ایجنٹ کہنے والے لوگ خود انگریزوں کی وفاداری اور دوستی میں گلے گلے تک ڈوبے ہوئے تھے اور کیوں نہ ہو جب انگریز گورنمنٹ جن کو مشایخ نے وظائف عطیات اور دیگر امداد و تعاون سے سرفراز کرتے تو وہ کیوں کر اپنی وفادار حکومت کے خلاف آواز اٹھائیں؟

یہ تاریخ کا کتنا بڑا المیہ ہے کہ آج ایسے ہی لوگوں کو تحریک آزادی کا ہیرو بنا کر پیش کیا جا رہا ہے اور یہ سفید جھوٹ اس زور و شور سے بولا جا رہا ہے کہ عوام تو عوام خواص کی بھی زبان سے اس کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔ مختصر شاید ہی کوئی رہ جائے گی اگر میں ان کی "وفاداریوں" کا تذکرہ نہ کروں۔ اس سے دوست اور دشمن کا فرق بہ آسانی معلوم کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ کسی گوشے سے یہ آواز سنائی دے رہی تھی کہ ہم مسلمانوں پر انگریز حکومت کی اطاعت و فرمانبرداری "مذہبی فرض" ہے..... کسی طرف سے یہ آواز آ رہی تھی کہ حکومت سے بغاوت کرنا خلاف قانون ہے..... کسی طرف سے یہ صدا کانوں سے ٹکرا رہی تھی کہ ہمیں ان کی حکومت میں ہر طرح کی آزادی ہے۔ بلکہ ان پر کوئی حملہ آور ہونا مسلمانوں پر فرض ہے کہ وہ اس سے لڑیں اور اپنی گورنمنٹ پر آنچ نہ آنے دیں..... ایک صاحب کچھ اس طرح بھی کہہ رہے تھے کہ ایسے حالات میں انگریزوں سے لڑنا اور مقابلہ کرنا جائز نہیں۔

الغرض اس نوع کی متعدد آوازیں تھیں جو ہندوستان کے مختلف علاقوں سے آ رہی تھیں۔ ان نظریات کی آواز اتنی واضح ہے کہ اس سے پردہ ہٹ جاتا ہے کہ انگریزوں کے دوست کون تھے اور دشمن کون؟ جو لوگ ان "وفاداروں" کو مجاہدین ثابت کرنے میں ایڑی چوٹی کا زور لگاتے ہیں وہ تاریخ کے بدترین مجرم ہیں۔ وہ تاریخ کی آنکھوں میں دھول جھونکنا چاہتے ہیں۔ آخر یہ لوگ کیوں ہزار بیل مدافعوں پر خط تنسیخ پھیر کر جھوٹ کو سچ بنا کر پیش کرتے ہیں؟ انہیں یہ کبھی نہیں بھولنا چاہیے کہ مستقبل کا غیر جانب دار مؤرخ ان کی اس غلط روش کو کبھی معاف نہیں کرے گا۔

غلام رسول مہر

علامہ فضل حق خیرآبادی اور فتوئ جہاد

غلام رسول مہر (1885ء۔1971ء) علمائے دیوبند کے پروردہ اور اہلحدیث رہے ہیں۔ موصوف اگر تاریخ گوئی میں تاریخ سازی نہ کرتے تو بلامبالغہ مورخ مستند مورخ ہوتے۔ لیکن مسیحا محمد اور اسماعیل دہلوی کی عقیدت و محبت و عقیدت نے انہیں کہیں کا نہیں چھوڑا۔ مہر صاحب نے درج بالا پیروہ حضرات کو "مجاہد و پیرو" ثابت کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگاتے ہوئے کئی تاریخی واقعات و حقائق کو مسخ کرنے کی حد تک روا رکھا ہے۔

مجاہد کبیر علامہ فضل حق خیرآبادی ایسی عظیم المرتبت شخصیت بھی مہر صاحب کی تاریخ سازی سے نہیں بچ سکی۔ لیکن حقیقت کبھی چھپ نہیں سکتی۔ اگر مہر صاحب ایک طرف علامہ فضل حق کی جنگ آزادی میں خدمات کے انکاری ہیں تو دوسری طرف ان کے فتوئ جہاد کو بیان کرنے پر مجبور ہیں۔

دراصل علامہ فضل حق کی جنگ آزادی میں اس قدر روشن خدمات ہیں کہ مخالف سے مخالف شخص بھی جب جنگ آزادی کی تاریخ رقم کرے گا تو علامہ فضل حق کا ذکر خیر کیے بغیر اس کا مجموعہ مکمل نہیں ہوگا۔ یہی سچائی کی قوت و طاقت ہوتی ہے اور اسی طاقت نے غالباً مہر صاحب کو علامہ کی خدمات کا ایک پہلو بیان کرنے پر مجبور کیا ہے۔ ملاحظہ فرمائیں

مولانا (فضل حق) کے دہلی پہنچنے سے دو شہر بھی بعض لوگوں نے جہاد کا پرچم بلند کیا تھا۔ مولانا پہنچے تو مسلمانوں کو جنگ پر آمادہ کرنے کی غرض سے باقاعدہ ایک فتویٰ مرتب ہوا جس پر علماء دہلی سے دستخط لیے گئے۔ میرا خیال ہے کہ یہ فتویٰ مولانا فضل حق ہی کے مشورے سے تیار ہوا تھا اور انہیں نے علماء کے نام تجویز کیے جن سے دستخط لیے گئے۔ اسی فتوے پر مفتی صدرالدین آزردہ کے دستخط تھے۔ غالباً یہی وہ فتویٰ تھا جو انجام کار مولانا کے خلاف مقدمے کا باعث بنا۔

19 ستمبر 1857ء کو شہر دہلی فتح ہوا۔ مولانا کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ پانچ روز بھوکے پیاسے مکان میں بند رہے پھر اہل و عیال کو ساتھ لے کر رات کے وقت چھپ چھپا کر نکلے اور بہت مشقتوں کے بعد بمقام پور ضلع علی گڑھ پہنچے۔ وہاں اٹھارہ روز چھپے رہے۔ ان کے فرزند ارجمند مولانا عبدالحق بھی ساتھ تھے۔ پھر نواب صمصام الدولہ بہادر جنگ بہادر (مولانا حبیب الرحمٰن شروانی کے جد محترم) نواب عبدالغفور رئیس بھیکم پوری نے ساتھ کے تھانہ سے جو

بھی ممکن پورے آٹھ میل پر ہے دریا کے پار اتار دیا۔ کچھ مدت پیچھے رہے کچھ معلوم نہیں کہ یہ زمانہ کہاں کہاں گزرا۔

جب ملکہ وکٹوریہ کی طرف سے عفو عام کا اعلان ہوا تو مولانا بھی اس پر بھروسہ کر کے خیر آباد پہنچ گئے۔ چند روز اطمینان سے گزر گئے پھر دو آدمیوں نے مولانا کی مخبری کی۔ چنانچہ انہیں مکان سے جا کر گرفتار کر لیا گیا اور مقدمے کے لیے لکھنؤ بھیج دیا گیا۔ "سیر العلماء" کا بیان ہے کہ مولانا 1859ء میں بیتاپور سے لکھنؤ لائے گئے اور ان پر سلطنت مقبلہ سے وفاداری یا فتوی جہاد یا جرم بغاوت میں مقدمہ چلا۔

مولانا کے لیے حبس دوام کا حکم صادر ہوا اور ان کی کتابیں "جائیداد منقولہ" اہل وعیال کے رہنے کا مکان "غرض ہر شے ضبطی میں آ گئی۔ مولانا انڈیمان میں پہنچے تو انہیں مشقتی کی خدمت پر مامور کیا گیا۔ جو کرائے لیتے اور کوڑا کرکٹ جمع کر کے پھینک آتے۔ ان کے پیر سے ترازو لے لیے گئے "تعبد اور کھلی" سے دی گئی تھی۔ پاؤں میں جوتا بھی نہ تھا۔

انڈیمان کے سپرنٹنڈنٹ کی لائبریری میں ایک مولوی تھا۔ سپرنٹنڈنٹ کے پاس علم ہیئت کی ایک قلمی کتاب تھی مولوی کو دے کر کہا کہ اس کی عبارت درست کر دی جائے۔ مولوی یہ کام مولانا (فضل حق) کے پاس لے گیا۔ انہوں نے نہ صرف عبارتیں درست کیں بلکہ مطالب میں اضافے اور حاشیے پر کتابوں کے حوالے بھی دے دیے۔ اس طرح مولانا کے علم وفضل اور علو مرتبت کا حال سپرنٹنڈنٹ پر کھلا۔ اس وقت سے مولانا کے لیے برائے نام مخبری کا کام تجویز کر دیا گیا اور تکلیفوں میں ایک حد تک کمی ہو گئی۔

مولانا کے صاحبزادے نے ولایت میں عرائض گزرانا تھا۔ وہ منظور ہوا اور مولانا کی رہائی کا حکم آ گیا۔ صاحبزادہ انہیں لانے کے لیے انڈیمان روانہ ہو گیا۔ جہاز سے اترنے پر ایک جنازہ پر نظر پڑی جس کے ساتھ بڑا مجمع تھا۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ مولانا کا جنازہ ہے۔ 12 صفر المظفر 1278ھ / 19 اگست 1861ء کو اس جہان فانی سے عالم بقا کی جانب عزم سفر کر گئے۔ مولانا کا مزار اب تک مرجع انام اور زیارت گاہ خاص وعام ہے۔

دیکھیے جہاد آزادی نے خاک وطن کے کتنے جواہر پاروں کو ان سنسان اور وحشت ناک جزیروں کی آغوش میں پہنچا دیا۔ جہاں کوئی انسان بہ طیب خاطر ایک دن بھی بسر کرنا گوارا نہ کرے۔

بخیزند چوں ز خاک شہیداں ما بہ حشر
در محشر آوریم دو عالم سپاہ را

(باغی ہندوستان: 1857ء کے مجاہد ازغلام رسول مہر، طبع سوم لاہور 1991ء، ص: 200 تا 212)

تقویۃ الایمان کا اولین رد

علامہ فضل حق خیرآبادی

سید احمد کے پردادہ اسماعیل دہلوی نے تقویۃ الایمان (دراصل تقویۃ الایمان) میں مسئلہ شفاعت پر گفتگو کرتے ہوئے صریح گستاخی کی۔ مجاہد کبیر علامہ فضل حق خیرآبادی نے اس گستاخی کا رد بلیغ کرتے ہوئے درج ذیل اولین تحریر رقم فرمائی۔ اس تحریر کا ترجمہ شرف ملت مولانا عبدالحکیم شرف قادری علیہ الرحمۃ نے کیا ہے۔ ملاحظہ فرمائیں

تمام تعریفیں اللہ رب العالمین کے لیے ہیں اور اچھی عاقبت متقین کے لیے ہے۔ درود وسلام ہو اللہ تعالیٰ کے رسول حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ اور آپ کی تمام آل اور صحابہ کرام پر۔

صاحب تقویۃ الایمان نے (اپنی کتاب کی) تیسری فصل میں شرک کا رد کرتے ہوئے وہابیت کا حق بیان کرنے کے بعد کہا: "اوس شہنشاہ کی تو یہ شان ہے کہ ایک آن میں ایک کُن سے چاہے تو کروڑوں نبی اور ولی فرشتے جبریل اور محمد ﷺ کے برابر پیدا کر ڈالے"۔

یعنی اللہ تعالیٰ اس امر پر قادر ہے کہ ایک آن میں ایک امر کُن سے کروڑوں افراد حضرت محمد ﷺ کے برابر عدم سے وجود میں لے آئے۔ یہ جمہور مسلمانوں کے متفقہ عقیدے کے خلاف ہے کیونکہ حضرت محمد ﷺ کی مثال ممتنع الوجود ہے (یہ صفر فی ہے) اور جس چیز کا وجود ممتنع اور محال ہو وہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کے تحت داخل نہیں ہے۔ (یہ کبریٰ ہے)

صغریٰ کا بیان یہ ہے کہ آنحضرت اکرم ﷺ کی مثل کوئی شخص ممکن ہو تو وہ لازماً نبی ہوگا کیونکہ غیر نبی، نبی کی مثل نہیں ہو سکتا۔ لیکن آپ کے مماثل نبی ممکن نہیں ہے کیونکہ آپ خاتم الانبیاء ہیں اور خاتمیت کا معنی یہی ہے کہ آپ کی مثل کا وجود ممکن نہ ہو۔ اس لیے کہ انسانی کمالات کی انتہا مرتبہ نبوت ہے اور اس مرتبہ کا کمال یہ ہے کہ وہ خواص مخلوق کے قوی ترین مراتب پر مشتمل ہو۔ اس سے زیادہ قوی مرتبہ عالم امکان میں متصور نہیں ہے لہٰذا ختم نبوت سے بلند مرتبہ ممکن ہی نہیں ہے۔

وہ مرتبہ کہ وجود امکانی کے مراتب میں اس سے بلند تر کوئی مرتبہ نہیں ہے وجود خاتم الانبیاء کا مرتبہ ہے۔ جب نبوت اس مرتبہ تک پہنچتی ہے تو ختم ہو جاتی ہے۔ ابتدا کے سلسلے میں معلول اول کا مرتبہ اور (ابتداء و ارتجاع) رجوع کے سلسلے میں خاتم الانبیاء کا مرتبہ یکساں ہے۔ (ابتداء و ارتجاع کی) قوس نزولی اور صعودی اس جگہ آکھی ہو جاتی ہیں اور دائرہ وجود اس جگہ مکمل ہو جاتا ہے۔ جس طرح سلسلۂ آغاز میں اول سلسلہ اور واجب الوجود کے درمیان کوئی فرد متصور نہیں ہے اسی طرح سلسلہ انجام میں آخر سلسلہ اور واجب الوجود کے درمیان کوئی مرتبہ متصور نہیں ہے۔ جس طرح وجود کا آغاز واجب الوجود سے ہے اسی طرح وجود کا انجام بھی وہی ہے' مبدا بھی وہی اور معاد بھی وہی ہے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ اگر خاتم الانبیاء ﷺ کا مماثل ممکن ہوتو یقیناً اس کے واقع ہونے سے محال لازم نہیں آئے گا' کیونکہ ممکن کے واقع اور متحقق ہونے سے محال لازم نہیں آیا کرتا' جبکہ اس جگہ خاتم النبیین کے مماثل کے واقع ہونے سے آپ کا ﴿ما کان محمد ابا احد من رجالکم ولکن رسول اللہ وخاتم النبیین﴾ کے منطوق کا کذب لازم آتا ہے۔ یہ آیت حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی مثل کے بالفعل موجود ہونے کے متحقق ہونے پر صراحۃً دلالت کرتی ہے۔ وجود مثل کو ممکن ماننا اللہ تعالیٰ کے بارے میں جھوٹ کو جائز قرار دینا ہے حالانکہ اللہ تعالیٰ کا جھوٹ محال ہے کیونکہ وہ نقص ہے اور نقص اللہ تعالیٰ کے بارے میں محال ہے۔ آیات وعید دیگر آیات اور احادیث کے پیش نظر شروط معلومہ کے ساتھ مشروط ہیں۔ ظاہر ہے کہ آیت مذکورہ ان آیات کی طرح نہیں ہے تاکہ اس آیت کو قوت شرطیہ میں قرار دے کر لزوم کذب کے استحالہ کو دفع کیا جا سکے۔

کبریٰ کی دلیل یہ ہے کہ قدرت کا معنی ہے فعل اور ترک کا صحیح ہونا جیسے کہ محقق دوانی کی شرح عقائد عضدیہ میں ہے یا قدرت کا معنی وہ صفت ہے جو ارادہ کے مطابق مؤثر ہو جیسے کہ شرح مواقف اور تجرید کی شرح جدید میں ہے۔ لازمی بات ہے کہ ایسی صفت فاعل کی نسبت سے صحت کا تقاضا کرے گی کیونکہ قادر وہی ہے جس کے لیے کسی کام کا کرنا اور ترک دونوں صحیح ہوں۔ فاعل کی نسبت کی قید اس لیے لگائی ہے کہ فعل فی نفسہ ممکن اور صحیح ہے۔ قدرت نے اسے صحیح اور ممکن نہیں بنایا ورنہ قلب مواد (واجب یا محال کا ممکن بنا دینا) لازم آئے گا۔ ہاں یہ کہہ سکتے ہیں کہ قدرت نے فعل کو فاعل موجد کی نسبت سے صحیح اور ممکن بنا دیا ہے۔ ماننا پڑے گا کہ قدرت ممکن پر ہی ہوتی ہے اور اس معاملے میں تمام ممکنات برابر ہیں۔ قدرت کی متعلق اللہ تعالیٰ کی ذات ہے اور مقدور ہونے کو صحیح قرار دینے والا امکان ہے۔ ذات باری تعالیٰ کی نسبت تمام ممکنات کی طرف برابر ہے۔

جب بعض پر قدرت ہوئی تو تمام ممکنات پر قدرت ثابت ہوگی کیونکہ امکان تمام ممکنات میں مشترک ہے۔

اللہ تعالیٰ ہر اس چیز پر قادر ہے جو ممکن ہو۔ ممتنع اور واجب اس کی قدرت کے تحت داخل نہیں ہیں۔ اس سے عجز لازم نہیں آتا جو قدرت کے مقابل ہے۔ کیونکہ ممتنع کے ایجاد پر قدرت کا نہ ہونا عجز نہیں ہے اس لیے کہ ممتنع وجود کے قابل ہی نہیں ہے۔ آیۂ کریمہ ﴿ان اللہ علی کل شی قدیر﴾ اور ﴿واللہ خالق کل شی﴾ کا معتی مفسرین نے ریک زبان یہی بیان کیا ہے کہ ہر شے سے مراد ہر ممکن ہے۔ کیونکہ محال بالاتفاق شے نہیں ہے اور واجب و محال پر قدرت نہیں ہوتی۔ بیضاوی میں ہے کہ قدرت کا معنی شے کو پیدا کر سکنا ہے۔

صاحب کشاف جو اکابر معتزلہ میں سے ہیں آیۂ کریمہ ﴿ان اللہ علیٰ کل شی قدیر﴾ کی تفسیر میں کہتے ہیں:

"قادر کے حق میں شرط یہ ہے کہ فعل محال نہ ہو جب تمام اشیاء پر قادر کا ذکر ہے تو محال خود مستثنیٰ ہے۔ گویا کہا گیا ہے کہ ہر اس چیز پر قادر ہے جو ہو سکتی ہے۔ اس کی نظیر یہ ہے کہ کہا جاتا ہے فلاں شخص انسانوں کا امیر ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اپنے ماسوا کا امیر ہے وہ شخص بھی اگر چہ انسانوں میں ہے لیکن اس وقت وہ ان میں داخل نہیں ہے"[۳]

اس عبارت سے صراحۃً معلوم ہوتا ہے کہ معتزلہ بھی اس امر کے قائل ہیں کہ واجب تعالیٰ ممتنع پر قادر نہیں ہے بس ثابت ہوا کہ حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی نظیر ممتنعات میں سے ہے اور اللہ تعالیٰ رحمۃً للعالمین ﷺ کی مثل ایک شخص کے پیدا کرنے پر بھی قادر نہیں ہے۔ چہ جائیکہ ایک آن میں آپ کی مثل ہزاروں افراد پیدا فرما دے۔

اس جگہ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ اگر دلیل کے صغریٰ میں امتناع سے مراد امتناع ذاتی ہے تو ہم صغریٰ تسلیم نہیں کرتے کیونکہ حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی نظیر ممتنع بالذات نہیں ہے بلکہ نظیر اس لیے محال ہے کہ آپ کا خاتم النبیین ہونا اللہ تعالیٰ کے خبر دینے سے ثابت ہے اور اللہ تعالیٰ کی خبر میں کذب ممتنع بالغیر ہے[۴] اور ممتنع بالغیر ہونا امکان ذاتی کے منافی نہیں ہے۔ اگر امتناع سے مراد امتناع بالغیر ہے تو صغریٰ سے مسلم ہے۔ لیکن کبریٰ میں کلام ہے کہ اس جگہ ممتنع کس معنی میں ہے؟ اگر اس جگہ بھی ممتنع بالغیر مراد ہو تو حد اوسط مکرر ہے لیکن کبریٰ ممنوع ہے کیونکہ ہمیں یہ تسلیم نہیں ہے کہ جس چیز کا وجود ممتنع بالغیر ہو وہ بھی اللہ تعالیٰ کی قدرت کے تحت داخل نہیں ہے۔ جب کبریٰ میں ممتنع سے مراد ممتنع بالذات ہو تو کبریٰ کی صحت میں شک نہیں ہے لیکن حد اوسط مکرر نہ ہوئی اور (اصغر کا اکبر کے تحت) اندراج لازم نہ آیا۔ اس گفتگو سے واضح ہو گیا کہ حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی مثل کے واقع ہونے سے جو محال لازم آیا ہے وہ امتناع بالغیر کی وجہ سے ہے نہ کہ امکان ذاتی کی بنا پر۔

مخفی نہ رہے کہ یہ جواب ہمارے مقصد کے منافی نہیں ہے کیونکہ ایسا ممکن بالذات جس کا واقع نہ ہونا نص قرآنی سے ثابت ہو اس کے وقوع کے ساتھ تین صفات کا تعلق برابر ہے۔ ❶ قدرت کا تعلق ❷ ارادہ کا تعلق جس کا مطلب ہے دو مقدوروں میں سے ایک کو وقوع کے ساتھ خاص کرنا ❸ خلق کا تعلق جس کا معنی ہے شے کا عدم سے فعلیت اور وجود کی طرف نکالنا۔

خلاصہ یہ کہ جس ممکن کے واقع نہ ہونے کی خبر خود اللہ تعالیٰ نے دی ہے اس کا واقع ہونا ممتنع بالذات کی طرح قدرت سے خارج ہے اگر فرض کیا جائے کہ امتناع بالغیر بھی قدرت کے متعلق ہونے کے منافی نہیں ہے اور بہت سے افراد مظہر تجلیات افضل المرسلین ﷺ کی ذات اقدس کے مسائل امکان ذاتی اور تصور عقل کے پیش نظر صرف اس اعتبار سے کہ وہ ممکن ذاتی ہیں، قطع نظر امور خارجہ اور موانع سے۔ اللہ ذوالجلال کی قدرت سے موجود ہو سکتے ہیں تو قابل غور بات یہ ہے کہ ایسے ممکن اور متصور محض امور جن کے وقوع کو عقل محض ان کے امکان ذاتی جس حیث ھُوَ کو پیش نظر رکھتے ہوئے جائز قرار دے۔ ان پر اللہ تعالیٰ کی قدرت کا اظہار عوام کا الانعام کو حیران اور پریشان کرنے کے مترادف اور ان کے عقائد کمزور کر دینے کے برابر ہے۔ تقویۃ الایمان کی عبارت میں جو مطلب بیان کیا گیا ہے اسے عوام ہرگز نہیں سمجھ سکتے، اسے صرف خواص ہی سمجھ سکتے ہیں جو امکان ذاتی، امتناع بالغیر اور مرتبہ ماہیت جس حیث ھی اور من حیث الخلط کے مطلب و مفہوم سے آگاہ ہوں گے وہ ضرور صاحب رسالہ (تقویۃ الایمان) کی مذکورہ عبارت کے مطلب تک رسائی حاصل کر سکیں گے۔

صاحب تقویۃ الایمان نے اس عقیدے کو دین کے بڑے اصول میں سے قرار دیا ہے۔ عوام اس عقیدے کو ذہن نشین اور خالی ذہنوں میں نقش کرنے کے بعد معجزات مصطفیٰ ﷺ کی ذات اقدس کی مثل ان گنت افراد انبیاء کے وجود کو دوسرے انسانی وجود کی طرح قابل وقوع ہی جانیں گے، اس کے علاوہ ان کے لیے کسی دوسری ہدایت کی توقع نہیں ہو سکتی۔

اس صورت میں اگر کوئی شخص کسی عام آدمی کو یہ سمجھائے کہ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ ﷺ کے جھوٹے ہونے کے عقیدے کو اس کے سچے ہونے کے عقیدے کے برابر جانو تو کیا حرج اور کیا نقصان ہوگا؟ کیونکہ موضوع و محمول کی خصوصیت سے قطع نظر یہ قضیہ بھی بلاشبہ صدق و کذب کا احتمال رکھتا ہے۔

مقام حیرت ہے کہ قطع نظر اس بات کہ اس مثال سے حضور سید عالم ﷺ کی بارگاہ میں بے ادبی، گستاخی اور

زبان درازی لازم آتی ہے اور اس کے سننے سے منکرین نبوت کے بھی رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ یہ رسالہ عوام کو سمجھانے کے لیے اردو میں لکھا گیا ہے (سوال یہ ہے کہ) اللہ تعالیٰ کی قدرت عامہ شاملہ کے سمجھانے کے لیے یہی مثال رہ گئی تھی کہ حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی مثل کروڑوں افراد کا وجود ممکن ہے۔ اس کے علاوہ کوئی مثال نہیں تھی؟

اے اللہ! ہمیں حق کو حق ماننے اور اس کی پیروی کی توفیق عطا فرما اور باطل کو باطل ماننے اور اس سے بچنے کی توفیق عطا فرما۔

﴿مصادر و حوالہ جات﴾

۱ علامہ عبدالعزیز پرہاروی علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں کہ علماء اسلام کہتے ہیں کہ نبی میں تین شرطوں (خواص) کا پایا جانا ضروری ہے۔ ❶ نفسِ ناطقہ سے مطلع ہونا۔ یہ اس لیے کہ ان کی روح کا مقرب فرشتوں کے ساتھ اتصال ہوتا ہے۔ ❷ مواد کا ہیولیٰ ان کی اطاعت کرتا ہے اور وہ اس میں تصرف کرتے ہیں مثلاً ہوا کو پانی بنا دینا۔ ❸ فرشتوں کو محسوس صورت میں دیکھتے ہیں اور ان کا کلام بطور وحی سنتے ہیں۔ (فوائد ص: ۳۲۹ مختصراً) خواص الغاشیہ سے علامہ کی مراد یہی تین خواص ہیں۔

۲ تفسیر کشاف جار اللہ زمخشری جلد ۲ صفحہ ۳۲۲

۳ صحیح نہیں ہے۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ فرمائیں سبحان السبوح از امام احمد رضا قادری علیہ الرحمۃ

خلاصۂ فتویٰ

علامہ فضل حق خیر آبادی

مجاہد کبیر علامہ فضل حق خیر آبادی نے سابقہ تحریر میں اسماعیل دہلوی کا تعاقب کیا تو اسماعیل دہلوی نے اس کے جواب میں ایک رسالہ "یک روزہ" لکھا۔ حضرت علامہ نے اس رسالہ کے رد میں "تحقیق الفتوی فی ابطال الطغوی" (سرکشی کے ابطال میں فتویٰ کی تحقیق) نامی کتاب تصنیف فرمائی۔ تحقیق الفتوی دراصل علامہ کا تحریر کردہ فتویٰ ہے جو اپنی ضخامت کے اعتبار سے مستقل کتاب کی صورت اختیار کر گیا ہے۔ پیش نظر مضمون علامہ کے اسی فتویٰ یا کتاب کا خلاصہ ہے۔

اس فتویٰ میں علامہ نے صراحت کی ہے کہ "تقویۃ" نامی پمفلٹ میں مقربین الٰہی انبیاء و رسل علیہم السلام کی تنقیص و گستاخی کی گئی ہے لہٰذا اس بے ہودہ کلام کا قائل ازروئے شریعت کافر و بے دین اور واجب القتل ہے اور جو شخص اس کے کفر میں شک کرے یا اسے معمولی جانے وہ خود بے دین و کافر ہوگا نیز جو شخص ظاہر آیا بلغا اس شخص کی طرف داری کرے گا وہ خود گستاخی رسالت کا مرتکب ہوگا۔

"تقویۃ" ایسی دل آزار کتاب تھی کہ محدث العصر حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی جیسی عظیم علمی ہستی نے اس سے برأت و بیزاری کا اظہار فرمایا نیز لوگ اہل علماء میں سے صدر الصدور مفتی صدر الدین آزردہ، مولانا محمد مخصوص اللہ، مولانا محمد موسیٰ بن شاہ ولی اللہ محدث دہلوی، مولانا شاہ امیر صغیر دہلوی، مولانا شاہ فضل رسول بدایونی اور مولانا شاہ عبدالمجید بدایونی وغیرہم نے تحریر و تقریر کے ذریعے اس کا رد کیا۔ علامہ کے اس فتویٰ کے آخر میں اس وقت کے دہلی کے ستر سے متعدد علماء کرام کی تصدیق و تائید ہے۔ ملاحظہ فرمائیں۔

جب چاروں مقام مکمل ہو گئے تو اب خلاصہ فتویٰ اور استفتاء کا جواب سنیے!

سائل نے تین سوال کیے تھے۔

1. یہ کلام حق ہے یا باطل؟
2. اس کا یہ کلام حضرت سید الاولین والآخرین افضل الانبیاء والمرسلین آپ پر صلوٰۃ بھیجنے والوں کی پاکیزہ ترین

صلوٰۃ' سلام بھیجنے والوں کا بہترین سلام' فرشتوں اور مسلمانوں کا پسندیدہ ترین تحفہ ہونے' کی شانِ عالی اور قدرِ جلیل وجمیل کی تنقیص وتخفیف ہے یا نہیں؟

❸ اگر یہ کلام نبی اکرم ﷺ کی تنقیص شان کی قباحت پر مشتمل ہے تو اس کے مرتکب کا حال اور حکم شرع کیا ہے اور دو دین ودولت کے لحاظ سے کون ہے؟

❶ پہلے سوال کا جواب یہ ہے کہ قائل کا کلام مذکور سرتا پا جھوٹ' دروغ' فریب اور دھوکہ ہے کیونکہ وہ گناہگاروں کی نجات کے لیے شفاعت کے سبب ہونے کی نفی کرتا ہے اور نبی اکرم ﷺ 'دیگر انبیاء وملائکہ علیہم السلام اور اصفیاء سے شفاعت وجاہت اور شفاعت محبت کی نفی کرتا ہے۔ اس کا یہ عقیدہ کتاب مبین' احادیث سید المرسلین اور اجماع مسلمین کے خلاف ہے جیسے مقام اول میں تفصیلاً ثابت ہوا اور مقام ثانی میں اس کلام کے بعض حصوں کا بطلان دلائل سے واضح ہوا۔

❷ دوسرے سوال کا جواب یہ ہے کہ اس کا کلام بلاشبہ بارگاہ الٰہی کے مقربین کے سردار' دیگر انبیاء علیہ السلام ملائکہ' اصفیاء' مشائخ اور اولیاء کی تنقیص شان پر مشتمل ہے اور استخفاف پر دلالت کرتا ہے جیسے مقام ثالث میں مذکور ہوا اور اس سے پہلے دلائل سے ثابت ہوا۔

❸ تیسرے سوال کا جواب یہ ہے کہ اس بیہودہ کلام کا قائل از روئے شریعت کافر اور بے دین ہے اور ہرگز مسلمان نہیں ہے اور شرعاً اس کا حکم قتل اور تکفیر ہے۔ جو شخص اس کے کفر میں شک وتردد لائے یا اس استخفاف کو معمولی جانے کافر وبے دین اور مسلمان نہیں ہے مگر کفر اور بے دینی میں اس شخص سے کم ہے جو اس گمراہانہ کلام کو دلیل حسین جانتا ہے اور اس کلام کے اعتقاد کو ضروریات دین میں سے شمار کرتا ہے۔ ایسا شخص کفر میں قائل کے برابر ہے بلکہ استخفاف میں اس سے بھی بڑھ کر ہے کیونکہ اس نے نبی اکرم ﷺ دیگر انبیاء علیہم السلام وملائکہ اور اولیاء کے استخفاف کو مستحسن جانا اور اسے ضروریات دین میں سے گمان کیا اسی طرح جو شخص ظاہر پر اطلاع ایسے مسائل میں اس قائل کی طرف داری روا رکھتا ہے اور اہل علم میں اس کی عزت کے تحفظ کے لیے دوراز کار تاویلات اختیار کرتا ہے وہ بھی نبی اکرم ﷺ کی تخفیف شان کا مرتکب ہوا ہے کہ ایک بے دین کی طرف داری کو سید الانام ﷺ کی عزت وحرمت پر ترجیح دی اور ملامت کے خوف بلکہ مقتضائے بدنفسی اس کلام کے ثابت کرنے کے درپے ہوا جو نبی اکرم ﷺ کی تخفیف شان پر دلالت کرتا ہے اور یہ سب کفر اور الحاد ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں نبی اکرم ﷺ اور آپ کی آل پاک کے طفیل اس سے محفوظ

رکھنے چوتھے مقام میں ان مقاصد کے ثابت کرنے سے فراغت حاصل ہوئی انیس خالم قوم کی جڑ کاٹ دی گئی۔

والحمد للہ رب العالمین

محمد فضل حق

18 رمضان المبارک 1240ھ

محمد شریف	حاجی محمد قاسم	محمد حیات الآری
کریم اللہ	محمد رشید الدین	متھوس اللہ
محمد رحمت	عبدالخالق	محمد عبداللہ
محمد موسیٰ	غلام محمد	(شاہ) احمد سعید مجددی
محمد شریف	محمد حیات	صدرالدین (آزردہ)
رحیم الدین	محبوب علی	

مسئلہ امتناع النظیر میں مرزا غالب کو علامہ فضل حق کی سرپرستی

مجاہد کبیر علامہ فضل حق خیرآبادی اور سلطان الشعراء مرزا اسد اللہ خاں غالب میں بہت گہری دوستی تھی۔ ہر دو حضرات میں محبت و الفت اور اخلاص کا ایسا رشتہ تھا جس کی مثال کم ہی ملتی ہے۔ جہاں بھی یہ حضرات اکٹھے ہوتے وہاں علم و فکر اور شعر و سخن کی ایسی محفل برپا ہوتی جس پر اہل دہلی عش عش کر اٹھتے۔ مرزا غالب اپنا نیا کلام علامہ فضل حق کو ضرور سناتے اور اس میں علامہ کی کمی ترمیم بصد احترام قبول کرتے۔ علامہ ہی کی ہستی ہے جس نے غالب کو مشکل پسندی سے آسان الفاظ کی طرف راغب کیا۔ مسئلہ امتناع نظیر پر جب خالص علمی بحث چھڑی تو علامہ نے غالب کو راغب کیا کہ اس مسئلہ کو اشعار میں بیان کریں۔ چنانچہ علامہ کے حکم کی تعمیل میں غالب نے درج ذیل اشعار تحریر فرمائے۔ یہ منتخب اشعار مثنویات غالب کی چھٹی مثنوی میں سے لیے گئے ہیں۔

بعد حمد ایزد و نعت رسول مینگارم نکتۂ چند از اصول

- خدا کی تعریف اور رسول خدا کی نعت کے بعد میں کچھ اصول دین کے لکھتا ہوں۔

نور محض واصل ہستی ذات اوست ہرچہ جز حق بینی از آیات اوست

- نور محض اور ہستی کی اصل اسی کی ذات ہے۔ حق کے سوا جو تمہیں نظر آتا ہے وہ اس کی نشانیوں میں سے ہے۔

نور حق ست احمد و لمعان نور از نبی در اولیاء دارد ظہور

- احمد خدا کا نور ہے اور نبی سے ولیوں میں نور کی چھوٹ پڑتی ہے۔

از نبی واز ولی خواہی مدد تا نہ پنداری کہ ناجائز بود

- نبی اور ولی سے مدد چاہے تو یہ ہرگز نہ سمجھ لینا کہ ایسا کرنا جائز نہیں۔

ہر کہ او را نوار حق نیرو فزاست ہرچہ ازوی خواستی ہم از خدا است

- وہ جس کو نور حق قوت پہنچاتا ہے اس سے جو کچھ دعا کرو وہ خدا سے دعا ہے۔

لیک در پوزش بدرگاہ رفیع ناہی آریم پیران را شفیع

● لیکن خدا کے دربار میں عذر و انکسار کرتے وقت ہم ان پیروں کی سفارش چاہتے ہیں۔

در سخن در مولد پیغمبر ست بزمگاہ دلکش و جان پرور ست

● اور اگر میلاد النبی ﷺ کے بارے میں کلام ہے تو وہ ایک دلکش اور روح پرور بزم ہے۔

کہت موئے مبارک جاں فزاست بارگ جانش ہمی پیوند ہاست

● (رسول اللہ ﷺ کے) موئے مبارک کی مہک جانفزا ہے۔ ان کی رگ جاں سے اس کے گہرے رشتے ہیں۔

ہرکرا دل ہست و ایمان نیز ہم چوں نوازد عشق با "نقش قدم"

● جس کے (سینے میں) دل ہے اور ایمان بھی ہے وہ نقش قدم سے عشق کیوں نہ کرے گا۔

بر ردا و پیرہن کز مصطفیٰ است جان نیفشاندن زامت کے رواست

● مصطفیٰ ﷺ کے چادر اور کرتے پر امت کیسے جان نثار نہ کرے۔

اولیاء را گر گرامی داشتیم نزپئے روی و شامی داشتیم

● اگر ہم اولیاء کو عزیز رکھتے ہیں تو ان کے روی و شامی ہونے کے سبب نہیں۔

از برائے آنکہ این آزادگان ازرہ حق جان بجاناں دادگان

● بلکہ اس لیے کہ ان آزاد انسانوں نے راہ راست پر چل کر اپنے محبوب پر جان قربان کر دی۔

دین کہ می گوئی تواناکردگار چوں محمد دیگری آرد بکار

● اور یہ جو تم کہتے ہو کہ خدائے قادر چاہے تو محمد ﷺ کی مثل دوسرا پیدا کر دے۔

باخداوند دوگیتی آفریں ممتنع نبود ظہورے ایں چنیں

● جس خدا نے دونوں جہان پیدا کیے ہیں اس کے لیے یہ ناممکن نہیں کہ وہ محمد ﷺ کا مثل ظہور میں لے آئے۔

نغز گفتی نغز تر باید شنفت آنکہ پنداری کہ ہست اندر نہفت

● تم نے اچھی بات کہی، اب اس سے اچھی بات سنو، تم جو سمجھتے ہو کہ عدم میں ان کا مثل نہاں ہے جو ظہور میں آسکتا ہے۔

گرچہ فخر دودمۂ آدم بُود ہم بقدر خاصیت کم بُود

● اگرچہ وہ نسل انسانی کے لیے فخر ہوگا لیکن پھر بھی اس میں "خاتمیت" کی کمی رہ جائے گی۔

صورت آرایش عالم مگر یک مہ و یک مہر و یک خاتم مگر

● دیکھ کہ دنیا کی آرائش کس طرح ہے۔ اس میں ایک سورج ہے ایک چاند ہے اور ایک ہی خاتم ہے۔

قدرت حق بیش ازیں ہم بودہ است ہرچہ اندیشی کم از کم بودہ است

● خدا کی قدرت اس سے بھی زیادہ ہے، جتنی تم سمجھتے ہو وہ بھی کم سے کم ہے۔

لیک در یک عالم از روئے یقین خودنمی گنجد دو ختم المرسلین

● لیکن یقین کی رو سے یہ بات نہیں مانی جاسکتی کہ ایک ہی دنیا میں دو دو آخری پیغمبر ہوں۔

یک جہاں تا ہست یک خاتم بس ست قدرت حق را نہ یک عالم بس ست

● جب تک ایک دنیا ہے ایک ہی اس کا آخری پیغمبر ہوگا۔ البتہ خدا کی قدرت ایک دنیا پر ختم نہیں ہوگی۔

خواہد از ہر ذرہ آرد عالمی ہم بود ہر عالمی را خاتمی

● وہ چاہے تو ہر ایک ذرے سے ایک دنیا پیدا کردے اور پھر ہر دنیا کا ایک خاتم ہو۔

ہر کجا ہنگامۂ عالم بود رحمۃ للعالمینی ہم بود

● جہاں کہیں بھی دنیا کی چہل پہل ہوگی، وہاں کوئی رحمۃ للعالمین بھی ضرور ہوگا۔

کثرت ابداع عالم خوب تر یا یکے عالم دو خاتم خوب تر

● بہتر کیا ہے؟ نئی نئی دنیاؤں کا وجود میں آنا یا ایک دنیا میں دو دو خاتم کا ہونا؟

در یکی عالم دو تا خاتم مجوی صد ہزاراں عالم و خاتم بگوی

● اس ایک دنیا میں دو خاتم کی امید نہ رکھو، ہاں یہ کہو کہ لاکھوں دنیائیں ہوں اور ان کے اپنے اپنے خاتم ہوں۔

غالب! ایں اندیشہ بپذیرم ہمی خوردہ ہم برخویش می گیرم ہمی

● غالب! یہ کیا بات کہی۔ یہ مجھے قبول نہیں، میں خود اپنی غلطی پکڑتا ہوں۔

ایکہ خود خاتم المرسلینش خواندۂ دائم از روی یقینش خواندۂ

● یہ جو تم نے (محمد ﷺ کو) ختم المرسلین کہا تو ظاہر ہے کہ پورے یقین سے ہی کہا ہوگا۔

این "الف لامی" کہ استغراق راست حکم ناطق معنی اطلاق راست

● ''ختم المرسلین'' میں الف لام استغراق کا ہے اس کے معنی ہوئے کہ مطلق مرسلین (یعنی تمام رسولوں کے خاتم)۔

مبدأ ایجاد ہر عالم یکیست گر دو صد عالم بود خاتم یکیست

● چونکہ ہر عالم کا مبدا ایک ہی ہے اس لیے اگر دو سو عالم بھی ہوں تو ان کا خاتم ایک ہی ہوگا۔

صانع عالم چنیں کرد اختیار کس بعالم مثل نبود زینہار

● دنیا کے پیدا کرنے والے کی مرضی یہی تھی کہ دنیا میں نبی ﷺ کی مثل ہرگز نہ ہونے پائے۔

این نہ عجزست اختیارست ای فقیہ خوبہ بی ہتا بود لاریب فیہ

● اے عالم دین! یہ قدرت خدا کی عاجزی نہیں بلکہ اختیاری ہے۔ رسول بے مثال ہیں اس میں کوئی شک نہیں۔

ہر کرایا سایہ نہ پسندد خدا ہمچو اوئی نقش کی بندد خدا

● خدا نے جس ہستی کا سایہ نہ بنایا ہو اس کی مثال کیسے بنا دے گا؟

ہم گہر مہر منیرش چوں بود سایہ چوں نبود نظیرش چوں بود

● روشن سورج بھی ان کی اصل میں موجود نہیں؛ جس وجود کا سایہ نہ پڑتا ہو اس کا ثانی کیسے ہو سکتا ہے؟

منفرد اندر کمال ذاتیست لاجرم مثلش محال ذاتیست

● رسول اپنی ذاتی صفات میں یکتا ہیں یقیناً ان کا مثل ممتنع بالذات (قطعی ناممکن) ہے۔

زین عقیدت برنگردم والسلام نامہ تمام دری نوردم والسلام

● میں اس عقیدے سے منہ نہیں پھیر سکتا' اب تحریر تمام کرتا ہوں۔ والسلام

﴿حوالہ جات﴾

WWW.NAFSEISLAM.COM

۱ مولانا الطاف حسین حالی' یادگار غالب' ص: ۷۰ تا ۷۲ میں لکھتے ہیں کہ جب مرزا غالب' علامہ فضل حق خیر آبادی کے پاس یہ نظم لے کر گئے تو علامہ نے اس شعر پر اعتراض فرمایا چنانچہ مرزا غالب نے فوراً علامہ کے حکم کی تعمیل کی اور جو کچھ لکھ چکے تھے اس کو تو اسی طرح رہنے دیا مگر اس کے آگے چند اور اشعار کا اضافہ کر کے کلام کو سر بوط کر دیا۔

مولانا فضل حق، حق پسند انسان

پروفیسر محمد بشیر احمد

یہ حق آگاہ شخصیت 1797ء میں مولانا فضل امام خیرآبادی کے ہاں پیدا ہوئی جو شاہ عبدالعزیز کے ہمعصر، علوم عقلیہ کے ماہر اور سرسید احمد خاں، نواب صدیق حسن خان اور مفتی صدرالدین آزردہ جیسی عظیم علمی شخصیتوں کے استاد تھے۔ خاندانی روایات کے مطابق علامہ فضل حق کی تعلیم کا آغاز قرآن پاک سے ہوا۔ اس ذہین بچے نے چار ماہ دس دن کی مختصر مدت میں قرآن پاک حفظ کر لیا اور اپنے والد کے علاوہ شاہ عبدالعزیز اور شاہ عبدالقادر سے مختلف علوم وفنون کی تکمیل کی۔ ان کی ذہانت کے عجیب واقعات بیان کیے جاتے ہیں۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد تیرہ سال کی چھوٹی سی عمر میں تدریس کے فرائض انجام دینے لگے۔ اس سے ان کی فہم وفراست کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

1809ء سے 1858ء تک مسلسل پچاس سال کے لگ بھگ وہ درس ہدایت کا فریضہ انجام دیتے رہے اور اس عرصہ میں ہزاروں بندگانِ خدا نے علم وعرفان کے اس سرچشمہ سے اپنی پیاس بجھائی۔ آپ بلند پایہ عالم ہونے کے ساتھ ساتھ حد درجہ فیاض بھی تھے اور دوستوں کی ہر ممکن طریق سے مدد کیا کرتے تھے۔ ان کے ایک قریبی دوست مرزا اسداللہ خاں غالب (مشہور شاعر) جب افلاس کے ہاتھوں پریشان ہوئے تو علامہ فضل حق خیرآبادی نے نہ صرف خود ان کی مدد کی بلکہ نواب یوسف علی خاں والی رامپور سے مستقل وظیفہ بھی جاری کرا دیا۔

علامہ فضل حق نے اپنے وطن خیرآباد میں علوم وفنون کے دریا بہانے کے علاوہ شعروسخن کی محفلیں بھی آراستہ کیں جن میں بلند پایہ شعراء اپنا کلام پیش کرتے۔ جب وہ دارالسلطنت دہلی پہنچے تو وہاں بھی یہ سلسلہ جاری رکھا۔ بہادر شاہ ظفر سے ان کے دوستانہ مراسم تھے۔ اس کے علاوہ غالب، ذوق، مومن، آزردہ، صہبائی، نیر، شاہ نصیر، احسان اور تسکین جیسے باکمال افراد ان کے حلقہ رفاقت میں شامل تھے۔ وہ صدرالصدور کے عہدہ تک بھی پہنچے۔ اپنی شدید مصروفیات کے باوجود انہوں نے مختلف علم وفنون پر اعلیٰ پایہ کی کتابیں لکھیں جنہیں اہل علم اب بھی قدر ومنزلت کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔ ان میں ہدیہ سعدیہ، امتناع النظیر، تحقیق الفتویٰ، حاشیہ قاضی مبارک، حاشیہ افق المبین، قصائد فتنہ الہند اور الثورۃ الہندیہ وغیرہ۔ آخری دو کتب کا موضوع 1857ء کی جنگ آزادی ہے جس میں علامہ

موصوف نے خود بھی حصہ لیا۔

جب انگریزوں کے ظلم وزیادتی اور جبر وتشدد کے خلاف برصغیر کے عوام نے 1857ء میں ہتھیار سنبھال لیے اور انگریزوں کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیا تو اکابر علماء دین نے بھی فرنگی سامراج کے خلاف جہاد کا فتویٰ دے دیا۔ ان علماء میں علامہ فضل حق خیرآبادی اور مفتی صدرالدین آزردہ بھی شامل تھے۔ فتویٰ میں علامہ موصوف کا نام پڑھ کر لوگوں میں بے انتہا جوش وخروش پیدا ہو گیا اور وہ دیوانہ وار انگریز فوجوں کا مقابلہ کرنے لگے مگر غداروں کی وطن فروشی اور انگریزوں کی سازشوں نے اس تحریک کو ناکامی سے دوچار کیا۔ دہلی پر دوبارہ انگریزوں کا قبضہ ہو گیا۔ مرزا الٰہی بخش کی مخبری پر بہادر شاہ ظفر کو عقبہ وقمایوں سے گرفتار کیا گیا اور اسے مقدمہ چلا کر رنگون بھیج دیا گیا۔ بہت سے علماء جنہوں نے فتویٰ جہاد پر دستخط کیے تھے گرفتار کر کے توپوں کے دہانوں سے باندھ کر اڑا دیے گئے۔ علامہ فضل حق کو بھی فتویٰ جہاد اور جرم بغاوت کی پاداش میں گرفتار کر کے لکھنؤ لے جایا گیا۔ جس جج کی عدالت میں مقدمہ قائم ہوا وہ ان کی عظمت، علمی قابلیت اور منطقی دلائل سے بہت متاثر ہوا۔ وہ انہیں مقدمہ میں بری کرنا چاہتا تھا اور مخبر نے بھی اپنا بیان بدل لیا تھا مگر اس حق پسند انسان نے نہایت دلیری سے کہا "وہ فتویٰ صحیح ہے۔ میرا لکھا ہے اور آج اس وقت بھی میری وہی رائے ہے"۔

ان کے اقرار کے پیش نظر انہیں عمر قید کی سزا سنائی گئی اور جزائر انڈیمان بھیج دیے گئے۔ خراب آب وہوا، جسمانی مشقت، عزیز واقارب کی جدائی کے صدمہ کے باوجود انہوں نے وہاں بھی تصنیف وتالیف کا سلسلہ جاری رکھا۔ اگرچہ ان کی رہائی کے انتظامات ہو چکے تھے مگر اس کی نوبت نہ آسکی اور علم وفضل کا یہ آفتاب 1861ء میں جزائر انڈیمان میں ہی غروب ہو گیا۔

﴿ماخوذ از: مطالعہ پاکستان برائے انٹرمیڈیٹ "مطبوعہ لاہور 1981ء" ص: 23-24﴾

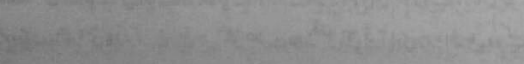

آخری مغل تاجدار بہادر شاہ ظفر کے معتمد مشیر

حضرت علامہ فضل حق خیرآبادی رحمۃ اللہ علیہ

مختار جاوید منہاس

محترم منہاس صاحب 1942ء کو معروف عالم دین علامہ محمد بشیر قادری اشرفی برکاتی کے ہاں گڑھی شاہو لاہور میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد گڑھی شاہو کے مین بازار کی جامع مسجد میں تقریباً 61 سال تک امامت وخطابت کرتے رہے۔ موصوف کا اصل نام مختار احمد منہاس اور قلمی نام مختار جاوید منہاس ہے۔

آپ نے اپنے دور کے معروف اخبارات امروز اور سعادت میں خوب قلمی جوہر دکھائے۔ اس کے علاوہ ماہنامہ "حسن عمل" اور نیشنل بنک آف پاکستان کے جریدے ماہنامہ "ضرب قلمی" کے مدیر بھی رہے۔ حصول معاش کے لیے نیشنل بنک میں ملازم ہوئے اور اسسٹنٹ وائس پریذیڈنٹ کے عہدے پر پہنچ کر ریٹائرڈ ہوئے۔ آپ کا شمار بنک کی ٹریڈ یونین کے بانیوں میں ہوتا ہے۔

محقق اہلسنت حکیم محمد موسیٰ امرتسری کی ترغیب پر منہاس صاحب نے "دارالعلوم دیوبند کے 100 سال" نامی کتاب تصنیف کی۔ اس کتاب میں صد سالہ جشن کا تحقیقی وتنقیدی جائزہ لیا گیا ہے۔ علاوہ ازیں گاہے بگاہے مختلف علمی، دینی اور سیاسی رسائل میں آپ کی نعتیں اور مضامین شائع ہوتے رہتے ہیں۔

یوں تو بنی نوع انسان کا ہر فرد اشرف المخلوقات کے شرف کا سزاوار ہے لیکن حضرت سعدی شیرازی کے بقول

نہ ہر زن، زن است، نہ ہر مرد، مرد

خدا پنج انگشت، یکساں نہ کرد

وہ قادر مطلق جسے چاہے، جیسے چاہے اور جتنا چاہے نوازدے اور خیر وخوبی کی نعمتوں سے مالا مال کردے۔ ہم جس عظیم ویگانہ روزگار ہستی کا ذکر کرنے چلے ہیں، یعنی حضرت علامہ فضل حق خیرآبادی رحمۃ اللہ علیہ وہ کیسے ہمہ گیر، عالم بے نظیر اور جامع کمالات تھے۔ یہ ایک دوسرے مکتب فکر کے ممتاز عالم سید محمد میاں کی زبانی سنیے۔ "ایک فاضل وکامل جو درس وتدریس میں یکتائے روزگار ہے تو شعر وسخن کا استاذ فنکار۔ محاضرہ اور مذاکرہ کے وقت میر مجلس ہے تو

بساط شطرنج پر رونق محفل اور کبھی ایک ہی وقت میں مدرس و معلم بھی ہے اور استاذ شطرنج بھی۔ تذکرہ علمائے ہند کے مصنف رحمان علی خان صاحب 1264ھ میں (جبکہ علامہ موصوف لکھنؤ میں قیام فرما تھے) ملاقات کے لیے حاضر خدمت ہوئے تو حیران رہ گئے کہ دریں حقہ کشی و شطرنج بازی تمیذے راسبق "الاتحاف النبلاء" لے داد و مطالب کتب را باحسن بیانی دل نشیں مے نمود"۔[1]

پیدائش اور تعلیم و تربیت:

شانِ جامعیت کا حامل یہ بطلِ جلیل ہندوستان کے ضلع سیتاپور کے مردم خیز قصبہ خیرآباد میں اپنے عہد کے مشہور عالم دین حضرت مولانا فضل امام رحمۃ اللہ علیہ کے ہاں 1212ھ/1797ء میں پیدا ہوا۔ چودہ واسطوں کے بعد آپ کا سلسلۂ نسب شاہ ولی اللہ دہلوی کے شجرہ سے مل جاتا ہے۔ یعنی آپ کے جد امجد سیدنا حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ تھے۔

آپ کی پیدائش کے وقت علامہ فضل امام دہلی میں صدر الصدور تھے۔ ابتدائی تعلیم و تربیت والد گرامی کے زیر سایہ دہلی میں ہوئی۔ علم حدیث آپ نے مولانا شاہ عبدالقادر رحمۃ اللہ علیہ اور مولانا شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ سے پڑھا اور سیکھا۔ تیرہ سال کی عمر میں تمام علوم عقلی و نقلی کی تکمیل کر لی۔ چار ماہ اور چند روز کی مدت میں قرآن مجید حفظ کر لیا' جو آپ کی خداداد ذہانت اور بے مثال حافظے کا ثبوت ہے۔

سرکاری ملازمت:

یہ اکبر شاہ ثانی کا عہد تھا۔ دہلی میں انگریز ریذیڈنٹ رہا کرتا تھا۔ عصری علوم کام آئے اور آپ سررشتہ دار ہو گئے۔ بعض لوگوں نے علامہ کی سرکاری ملازمت کو ہدف تنقید بناتے ہوئے بغض معاویہ رضی اللہ عنہ سے کام لیا ہے۔ حالانکہ انہی کے قبیلے کے نسبتاً معتدل اہل علم نے ان کی ملازمت کو ایک عیب کے طور پر بیان نہیں کیا۔

مولوی محمد میاں صاحب اسی کتاب "علمائے ہند کا شاندار ماضی" میں رقم طراز ہیں۔ "آپ نے ملازمت کی مگر اس طرح کہ آپ کی نازک مزاجی نے عزت نفس' خودداری اور وقار علم کے دامن کو کبھی میلا نہیں ہونے دیا۔ بظاہر یہی سبب تھا کہ کہیں آپ کا قیام مستقل نہیں رہا۔

ریذیڈنٹ دہلی کے یہاں جب تک سررشتہ داری رہے عزت کے ساتھ رہے اور جب آبگینۂ عزت میں بال آنے لگا تو نہ صرف ملازمت ترک کی بلکہ دہلی کی بود و باش بھی ترک کر دی"۔ ج

علامہ کی قابلیت کا شہرہ ملک گیر تھا اور آپ کے قدر دان ہمیشہ آپ کی پذیرائی کے لیے چشم براہ رہے۔ دہلی کے

فیض محمد خان نے پانچ سو روپے ماہانہ کی پیشکش کر دی۔ مولانا نے حامی بھر لی اور جھجھر چلے گئے۔ اس کے بعد ریاست الور کے مہاراجہ نے بلا لیا وہاں سے سہارنپور تشریف لے گئے۔ اس کے بعد آٹھ برس تک رام پور میں رہے۔ پھر لکھنؤ میں پہلے صدر الصدور بنائے گئے پھر جب ایک نئی کچہری "حضور تحصیل" کے نام سے وجود میں آئی تو اس کے مہتمم قرار پائے۔

آپ کے ناقدین اور مخالفین سرکاری ملازمت کو ایک عیب کے طور پر پیش کرتے اور اس پر اپنی جانب سے خوب حاشیہ آرائی بھی کرتے ہیں لیکن خود مولانا ان ایام میں خود کو بہت بے چین اور مضطرب پاتے ہیں۔ ان کی قلمی بیاض (مملوکہ مولوی حکیم نصیر الدین ندوی، کراچی) کے صفحہ نمبر 28 پر وہ 1818ء میں اپنے والد بزرگوار کی خدمت میں مکتوب میں یوں رقم طراز ہیں:

"میں خدا کے فضل و کرم سے خوش حال اور مطمئن ہوں مگر ملازمت میں ذلت و خواری بہت ہے۔ حاکم کے سامنے مستقل حاضر رہنا پڑتا ہے اور اس کے وہ احکام املا کرنا ہوتے ہیں جو قابل قبول نہیں ہوتے۔ قسم خدا کی اگر مجھے رسوائی کی شرم نہ ہوتی تو کب کا کہیں اور نکل ہو جاتا اور متوکلانہ زندگی بسر کرتا"۔ [۳]

مولانا انگریزی حکومت کی ملازمت سے کس قدر کبیدہ خاطر اور بیزار تھے یہ ان کے مستعفی ہونے پر مرزا غالب کے مندرجہ ذیل خیالات سے لگایا جا سکتا ہے جو انہوں نے مولانا کے قریب ترین یار راز دار کی حیثیت سے ظاہر کیے۔

"حکام فرنگ کی بے تمیزی اور قدر ناشناسی نے یہ رنگ دکھایا کہ فاضل بے نظیر والمعنی یگانہ مولوی حافظ محمد فضل حق نے عدالت دیوانی کی سررشتہ داری سے استعفیٰ دے کر ننگ و عار سے نجات پائی۔ واقعہ یہ ہے اگر مولانا کے علم و فضل کے ایک فیصدی کا عدالت دیوانی کی سررشتہ داری سے موازنہ کریں تو اس عہدہ کا پلہ ہلکا نکلے گا"۔ [۴]

مرزا کی درج بالا عبارت کو ایک بار پھر پڑھیے۔ ایک طرف اگر وہ مولانا کے علمی مقام و مرتبہ کی رفعت کو خراج تحسین پیش کر رہے ہیں تو دوسری جانب انگریز کی ملازمت کو مولانا کے لیے باعث افتخار نہیں وجہ ننگ و عار قرار دے رہے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ مرزا غالب مولانا کے عزیز ترین دوست کی حیثیت سے دراصل انہی کے جذبات و احساسات کی ترجمانی کر رہے ہیں۔

غلامی کے خلاف شدید جذبات اور اہل وطن کی حالت زار پر اضطراب:

جنگ آزادی 1857ء سے مدتوں پہلے ایسٹ انڈیا کمپنی کے عملا دہلی پر قبضہ کے باعث محکوم عوام کی حالت زار پر مولانا کے اضطراب کے شواہد ملتے ہیں۔ جب وہ عوام کی مشکلات و مصائب کی طرف اکبر شاہ ثانی (برائے نام

تاجدار ہند) کی توجہ مبذول کرانے کے لیے طویل درخواستیں رقم کرتے ہیں۔ان درخواستوں میں وہ کمپنی حکام کی جانب سے اصل دہلی کے ذرائع معاش کو محدود کرنے' دیہات وسواضعات پر قبضے اور بے جا ٹیکسوں کے نفاذ سے عوام میں پیدا ہونے والی بے چینی کی طرف "بادشاہ" کی توجہ مبذول کراتے ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ 1803ء سے لال قلعہ ویران پڑا ہے۔اکبر شاہ ثانی کی حکومت اسی قلعہ تک سمٹ کر رہ گئی ہے اور اصل اقتدار واختیار ایسٹ انڈیا کمپنی یا انگریز کا ہے۔لیکن باحمیت عالم دین اور حریت فکر کا امین مجاہد' اب بھی "مغل تاجدار" کو رعایا کے لیے مرکز حکومت کے طور پر پیش کر کے ان کی غیرت قومی کو آواز دیتا ہے کہ اگر وہ اس پر لبیک کہیں تو آزادی کی وہ تحریک عملی جامہ پہن سکے' جو اس کی زندگی کا مقصد وحید ہے۔

مولانا کے عنفوان شباب سے لے کر 1857ء تک ہمیں ان کے خیالات اور نظریات میں مکمل یکسوئی اور استقامت اپنی تمام تر تابانیوں کے ساتھ جلوہ گر نظر آتی ہے۔اسی مبرہن حقیقت کی بنیاد پر یہ کہنا پڑتا ہے کہ جنگ آزادی میں ان کی سرگرم شرکت کسی وقتی جوش وجذبہ کا نتیجہ نہ تھی بلکہ گذشتہ ساٹھ برسوں پر محیط ان کی زندگی کے شب وروز غلامی کی زنجیروں کو توڑ پھینکنے کی آرزو اور اس آرزو کی تکمیل کے لیے مسلسل غور وفکر اور منصوبہ بندی میں گزرے۔

مولانا آزادی کے لیے جدوجہد' جذبۂ وطنیت کے تحت ہی نہیں ایک دینی فریضہ سمجھ کر بھی کرنا ضروری سمجھتے تھے۔ان پر واضح ہو گیا تھا کہ انگریز ملک کے تمام باشندوں کو خواہ وہ کسی بھی مذہب وملت سے تعلق رکھتے ہوں' عیسائی بنانے کا منصوبہ بنا چکے تھے اور ایسے بہت سے اقدامات شروع کر دیے گئے تھے جو شعائر اسلام سے کھلے تصادم کا مظہر تھے۔

وطن کا بیٹا' اغیار سے چھڑانے کے لیے' دردمندی' جاں سوزی اور ولولہ انگیزی' تنہا مولانا فضل حق کو ہی نہیں' ملک کے مختلف حصوں میں ہندو اور مسلمان زعماء کو بے چین کیے ہوئی تھی۔باہم صلاح ومشوروں کا سلسلہ بھی چل رہا تھا اور ملک بھر میں ایک منظم وبھرپور تحریک شروع کرنے کا منصوبہ زیر غور تھا۔بعض روایات کے مطابق اس اقدام کے لیے مئی 1857ء کا مہینہ بھی طے پا گیا تھا۔

کارتوسوں کا قضیہ' جنگ آزادی کی بنیاد:

22 جنوری 1857ء کو دم دم (جہاں آج کل کلکتہ کا ہوائی اڈہ ہے) میں مقامی فوجیوں نے انگریز افسر سے شکایت کی کہ رائفلوں کے لیے فراہم کے گئے نئے کارتوسوں میں گائے اور سؤر کی چربی ہے۔حکومت نے بہت تردیدیں اور وضاحتیں کیں لیکن یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیلتی چلی گئی۔

بارک پور کی 34ویں رجمنٹ کے ایک فوجی منگل پانڈے نے مین پریڈ کے دوران "دین دین" کا نعرہ لگا کر ساتھی فوجیوں کو فرنگیوں کے خلاف لڑنے پر اکسایا۔ آفیسر انچارج نے باز پرس کی تو پانڈے نے اس پر گولی چلا دی جو خطا گئی۔ 6 اپریل 1857ء کو منگل پانڈے کے خلاف مقدمہ شروع ہوا۔ 7 اپریل کو پھانسی کی سزا تجویز ہوئی اور اگلے ہی روز یعنی 8 اپریل کو اسے سزائے موت دے دی گئی۔ منگل کے ایک ساتھی اینٹوری کو اس لیے سزائے موت دی گئی کہ اس نے منگل پانڈے کو اس وقت گرفتار کرنے میں سستی برتی تھی جب وہ اپنے افسر پر فائر کی تیاری کر رہا تھا۔

انگریز حکام نے مختلف رجمنٹوں سے ہتھیار رکھوا کر دیسی فوجیوں کو غیر مسلح کر کے انہیں دوسرے فوجیوں سے علیحدہ کر دیا۔ حکومت مطمئن تھی کہ بغاوت دم توڑ گئی ہے۔ بارک پور کی خبریں' مع مصالحہ شمالی ہند تک جا پہنچیں۔ میرٹھ میں خود انگریزی سپاہ کی پوری رجمنٹ موجود تھی۔ پھر یہاں ملک کا سب سے اچھا توپ خانہ بھی تھا۔ انگریز افسروں نے سپاہیوں کی بے چینی کو حکمت عملی کے ذریعہ ختم کرنے کی بجائے طاقت استعمال کرنے کا فیصلہ کیا۔ سختی کا رد عمل یوں سامنے آیا کہ چھاؤنیوں کی دیواروں میں آگ لگانے کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہو گیا۔

6 مئی 1857ء کو میرٹھ چھاؤنی میں پریڈ کرائی گئی۔ ہر رجمنٹ سے پندرہ پندرہ فوجی منتخب کیے گئے۔ یوں کل 90 آدمی اس پریڈ میں شامل تھے۔ کارتوسوں کی تقسیم کا حکم دیا گیا۔ پانچ کے سوا سب نے انکار کر دیا۔ ان 85 فوجیوں میں 49 مسلمان تھے اور 36 غیر مسلم۔

9 مئی 1857ء کو پوری فوج کو پریڈ میں جمع کر کے ان 85 فوجیوں کو دس دس سال قید با مشقت کی سزا سنائی گئی۔ ان کے فوجی نشان نوچ لئے گئے اور وردیاں پشت کی جانب سے پھاڑ دی گئیں۔ لوہار بلائے گئے اور ان فوجیوں کو ہتھکڑیوں اور بیڑیوں میں جکڑ دیا گیا۔ پھر ان کی مزید ذلت اور رسوائی کے لیے پیدل شہر سے گزار کر جیل تک پہنچایا گیا۔

یہ اقدام گویا جلتی پر تیل ثابت ہوا اور دس مئی 1857ء اتوار کے دن جب گرجا میں گھنٹیاں بجنا شروع ہوئیں تو یک بیک باغیوں نے اپنی کاروائی کا آغاز کر دیا' کچھ نے بیرکوں کو آگ لگائی۔ باقی جیل کی طرف لپکے اور دیکھتے ہی دیکھتے ہتھکڑیاں اور بیڑیاں کاٹ کر ساتھی فوجیوں کو رہا کرا لیا۔ ان کے ساتھ ہی جیل میں بند 800 دوسرے قیدی بھی آزاد ہو گئے۔

بھڑکے ہوئے جذبات سے آگ بگولہ باغی فوجیوں کے سامنے جو بھی انگریز آتا' مار دیا جاتا۔ یہ غیر منظم فوجی باغی اس بات سے خوف زدہ بھی تھے کہ انگریزی فوج توپ خانہ کے زور پر انہیں کسی بھی وقت بھون کر رکھ دے گی۔

WWW.NAFSEISLAM.COM

چنانچہ فوراً ہی ایک سرے سے دوسرے سرے تک یہ آواز پہنچی "دہلی چلو" اور پھر اس پر عمل بھی ہو گیا۔

انقلابی فوجی دہلی میں:

میرٹھ میں بہترین توپ خانہ اور انگریزی سپاہ کے باوجود باغیوں کو روکنے کا کوئی قدم نہ اٹھایا جا سکا۔ جب توپ خانہ اور فوج کی تیاری کی گئی اس وقت باغی بہت دور جا چکے تھے اور انگریز افسران کی منزل سے بھی بے خبر تھے۔

11 مئی 1857ء بمطابق 16 رمضان 1274ھ بروز پیر انقلابی فوج قلعہ معلی کے جھروکوں کے نیچے سے گزرتی ہوئی' راج گھاٹ کے دروازے سے دہلی میں شہر میں داخل ہو گئی۔ راہ میں آتے ہر انگریز کو موت کے گھاٹ اتارتی یہ بادشاہ کے حضور پہنچ گئی۔

باغی فوج کے قائدین نے بہادر شاہ ظفر کو تمام واقعات سے آگاہ کیا اور اپنی وفاداری کا یقین دلاتے ہوئے انگریز حاکموں کے خلاف تحریک کی قیادت کرنے کی درخواست کی۔ بادشاہ نے کہا: "میں بادشاہ نہیں فقیر ہوں۔ اپنی اولاد کو لیے بیٹھا ہوں۔ سو برس ہوئے ہمارے خاندان سے بادشاہت جاتی رہی۔ میرے بڑوں نے انگریزوں سے وظیفہ لینا قبول کیا میں آپ کی قیادت کیا کروں گا؟ ہاں انگریز ریذیڈنٹ سے کہہ کر آپ کے اور انگریزی حاکموں کے درمیان صلح صفائی کرا دیتا ہوں"۔

ریذیڈنٹ جس کا نام سائمن فریزر تھا آیا اور باغیوں کو سمجھانے بجھانے کی کوشش کی لیکن لب و لہجہ اور زیادہ سخت ان کو مرعوب کرنے کی تھی۔ اس سے انقلابیوں میں جوش اور بڑھا۔ ریذیڈنٹ نے بادشاہ سے اجازت لی۔ ارادہ اس کا بغاوت فرو کرانے کے لیے فوجی امداد حاصل کرنے کا تھا مگر ابھی زیادہ دور نہ گیا تھا کہ قتل کر دیا گیا۔

انقلابی فوج نے دہلی کے اسلحہ خانہ پر قبضہ کے لیے دھاوا بولا۔ وہاں متعین انگریز فوجیوں نے انقلابیوں کی دسترس سے اسلحہ محفوظ رکھنے کے لیے اسلحہ خانہ میں آگ لگا دی۔ جس سے بہت بڑا حصہ دھماکوں سے اڑ گیا۔ پھر بھی بہت سا بارود و ذخائر اور دوسرا اسلحہ بچ گیا۔

اس کے بعد انگریزوں کا قتل عام شروع ہو گیا۔ جہاں کہیں کوئی بھی انگریز نظر آتا موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا' اب ایک طرح سے پوری دہلی پر انقلابیوں کا قبضہ تھا۔ فرنگی یا تو مارے جا چکے تھے یا پھر دہلی چھوڑ کر نکل گئے تھے۔ اہل دہلی نے انقلابیوں کا زبردست خیر مقدم کیا اور وقتی طور پر یوں محسوس ہوتا تھا کہ انقلاب برپا ہو گیا اور دہلی پر بہادر شاہ ظفر کے حکمرانی بحال ہو گئی ہے۔

علامہ فضل حق خیرآبادی کی مجاہدانہ سرگرمیاں:

مولانا فضل حق خیرآبادی معرکۂ آزادی میں پوری طرح سرگرم اور فعال نظر آتے ہیں بلکہ ان کا کردار قائدانہ دکھائی دیتا ہے۔ بہادر شاہ ظفرؒ حضرت علامہ کے ساتھ محبت واعتقاد کے جذبات رکھتا تھا۔ چنانچہ انقلابی فوجیوں کی طرف سے بادشاہ کے منصب کی پورے طور سے بحالی کے اعلان کے بعد شاہی اقدامات میں مولانا کا عمل دخل بہت نمایاں معلوم ہوتا ہے۔

برسرزمین حقیقت یہ ہے کہ دہلی پر اہل دہلی کا قبضہ ہے۔ انگریز دہلی پر قبضہ کے لیے مسلسل حملے کررہا ہے اور اپنی جنگی صلاحیتوں کو فزوں تر کرنے کے لیے ضروری اقدامات کررہا ہے۔

قلعہ معلی میں متیم مغل خاندان کا عجیب حال ہے۔ بوڑھا بادشاہ کسی بھی عملی اقدام کے لیے آمادہ نہیں بلکہ جی تو یہ ہے کہ وہ اس کی صلاحیت ہی نہیں رکھتا۔ حکومت پر اختیار رکھنے والا ولی عہد فرنگیوں کا دوست اور آلۂ کار ہے۔ رہ گئے شہزادے تو وہ اپنی ہی دنیا میں مگن ہیں۔ اپنی من مانی کرتے ہیں لیکن زبان سے بادشاہ کی اطاعت کا دم بھرتے ہیں۔ پہلے بھی انہیں اپنے ہلوں تلوں سے فرصت نہ تھی۔ اب اس ہنگامے کی آڑ میں لشکر کے اخراجات کے نام پر مال بٹورتے اور وارداتیں دیتے ہیں۔

انقلابی فوج کی حالت بھی کچھ ایسی تسلی بخش نہ تھی۔ بعض دستے شتر بے مہار تھے یعنی ان کا کوئی سالار نہ تھا۔ کچھ میدان جنگ کی سختیوں اور نان ونفقہ کی عدم دستیابی کے باعث ہمت ہار بیٹھے تھے۔ کچھ ہاتھ آئے مال غنیمت کو ہی غنیمت سمجھ کر الگ جا کھڑے ہوئے تھے۔ بس ایک قلیل حصہ فوج ہی انگریزوں کے مقابل دادِ شجاعت دے رہا تھا۔

مقامی ہندو آبادی کی اکثریت انگریز نواز تھی جبکہ ہندو تاجر اور سرمایہ دار روپے پیسے کے ساتھ انگریز سے تعاون کررہے تھے۔ مسلمانوں میں عوام تو بلاشبہ دل وجان سے انگریزوں کے مخالف اور انقلابیوں کے حامی تھے۔ لیکن مراعات یافتہ طبقہ کا دل انگریز کے ساتھ دھڑکتا اور وہ انقلاب کو ناکام بنانے کے لیے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کرتا۔

مومنانہ بصیرت اور ایمان افروز قیادت:

علامہ اچھی طرح جانتے تھے کہ بادشاہ گو علامتی طور پر انقلاب کی کامیابی کے لیے ناگزیر تھا مگر کسی انقلاب کی قیادت یا کامیابی کی صورت میں ایک فعال حکمران کا کردار ادا کرنا اس کے بس کی بات نہ تھی۔ وقت کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے مولانا نے ایک مکمل قابل عمل منصوبہ ترتیب دیا اور بادشاہ سے اس سلسلہ میں ملاقات کی۔ بہادر شاہ ظفر علامہ کے علم وفضل اور اوصاف حمیدہ کا بڑا قدردان اور معترف تھا۔ پچیس برس قبل جب انہوں نے دہلی کی

سررشتہ داری سے استعفاء دے کر دہلی کی سکونت چھوڑی اور ریاست جھجھر جانے لگے تو اس وقت کے ولی عہد سلطنت صاحب عالم مرزا ابوظفر بہادر شاہ نے اپنا دوشالہ علامہ کو اوڑھا اور بوقت رخصت آبدیدہ ہو کر کہا "چونکہ آپ جانے کے لیے تیار ہیں میرے لیے بجز اس کہ کوئی چارہ نہیں کہ میں بھی اس کو منظور کرلوں۔ مگر خدا گواہ ہے کہ لفظ وداع زبان پر لانا دشوار ہے"۔ 5

بادشاہ کے ساتھ مولانا کی یہ ملاقاتیں متواتر ہوتی رہیں۔ وہ مسائل کی نشان دہی کرتے اور ان سے عہدہ برآ ہونے کے لیے قابل عمل اور صائب مشورے دیتے۔ بادشاہ کو علامہ کے اخلاص اور اصابت رائے پر مکمل اعتماد تھا۔ چنانچہ زیادہ تر ضروری احکام سادہ ہو جاتے تھے۔

مختلف انتظامی اور مالی امور میں آپ کی تجاویز پر عمل ہوا۔ والیان کو مالی تعاون کے لیے پروانے لکھے گئے۔ اہم تقرریاں آپ کے مشورہ کے مطابق ہوئیں۔ دستاویزی ثبوت موجود ہیں کہ بعض تقرریاں خود حضرت علامہ نے بھی فرمائیں۔

یہی نہیں وقت کے تقاضوں کو پوری طرح سمجھتے ہوئے اور آنے والے ایام کی تصویر علی وجہ البصیرت پہچانتے ہوئے مولانا نے ایک دستور مرتب کیا۔ یہ ایک انتہائی اہم دستاویز تھی جو 1857ء کے ہنگاموں میں ناپید ہو گئی۔ اس کی کوئی تفصیل تحریری طور پر دستیاب نہیں ہے۔ بس ایک دفعہ (پوائنٹ) کا تذکرہ تاریخی حوالوں میں ملتا ہے۔ جس کے مطابق گائے کے ذبح پر پابندی عائد کردی گئی تھی۔ یہ مولانا کی فراست تھی کہ اس دفعہ کے نفاذ سے ہندو مسلم جھگڑوں کی روک تھام ممکن ہوئی۔

انگریزوں کی یہ حسرت پوری نہ ہو سکی کہ عید الاضحیٰ (یکم اگست 1857ء) کے دن ہندو مسلم فساد ہو جائے۔ ایک انگریز افسر اپنی ڈائری کے یوم حوالہ میں لکھتا ہے: "بفضل کل (عید کے دن) ہمارے دست قاتلہ کے لیے ہماری امیدیں پوری نہ ہو سکیں۔ بادشاہ نے نہ صرف گائے بلکہ بکری تک کی قربانی کی شہر میں ممانعت کردی ہے۔ چنانچہ بجائے اس کے کہ وہ لوگ آپس میں لڑتے۔ وہ سب ہمارے خلاف ایک متحدہ اور بھرپور حملہ کرنے کے لیے ایک ہو گئے"۔ 6

ترغیب جہاد کے لیے جلسے:

"جنگ آزادی کی تحریک کو مسلم عوام میں مقبول بنانے اور انہیں فرنگیوں کے خلاف جہاد پر آمادہ کرنے کے لیے علامہ فضل حق نے علماء کو عوامی اجتماعات سے خطاب کرنے پر آمادہ کیا۔ خود مولانا اس مہم میں پیش پیش تھے۔

علماء کی ان تبلیغی سرگرمیوں کے بارے میں چلی لال نامی اخبار نویس 'اخبار دہلی' کی اشاعت 19 مئی 1857ء

کو لکھتا ہے: "علمائے دین نے تمام شہر کے مسلمان کو جمع کر کے انگریزوں سے جہاد کرنے کی ترغیب دی اور کہا کہ کفار کو قتل کرنے سے اجر عظیم ملتا ہے۔ ہزاروں مسلمان ان کے علم کے نیچے جمع ہو گئے۔ مولوی فضل حق اپنے مواعظ سے عوام کو مسلسل بھڑکا رہے ہیں"۔

مولانا نے عوام کے علاوہ نیم دلانہ شرکت کرنے والے انقلابی فوجیوں کو بھی جہاد کی اہمیت اور موجودہ وقت کے مطابق ان کی ذمہ داریوں کا احساس دلانے کے لیے وعظ و تبلیغ کا سلسلہ جاری رکھا۔

مالی معاملات:

دہلی کا خزانہ تھا ہی کیا؟ خود بادشاہ اور اس کے کنبہ کی گزر بسر انگریزی وظیفہ پر تھی۔ سپاہیوں کو بہر حال تنخواہ چاہیے تھی جس میں رکاوٹ جنگ آزادی کے لیے خطرناک ہو سکتی تھی۔ چنانچہ ایک سرحلہ پر بادشاہ کی بیگمات کا زیور بیچ کر کام چلایا گیا۔ مولانا نے مالی معاملات میں سد حار کے لیے بادشاہ کی طرف سے قرب و جوار بلکہ بعض دور دراز والیان ریاست کے نام زر اعانت کے لیے خطوط لکھوائے۔

مال گزاری کی تحصیل پر مقرر نا اہل ملازمین کی جگہ موزوں اور قابل افراد کو مقرر کروایا۔ چنانچہ مولانا کے صاحبزادے مولانا عبدالحی کو گورنر گانہ کا کلکٹر بنا کر بھیجا گیا۔ بادشاہ کی طرف سے حاصل اختیارات استعمال کرتے ہوئے بہت سی تقرریاں مولانا نے خود بھی کیں۔ اس طرح مالی معاملات میں بہتری پیدا ہوئی اور جنگی اخراجات میں سہولت ملی۔

مولانا میدان جنگ میں:

علامہ کی بادشاہ کے لیے کل وقتی مفید مشاورت اور انتظامی امور پر مکمل گرفت کے ساتھ جہاد میں عملاً شمولیت بلکہ انقلابی فوج کی کمان کرنے کی شہادتیں بھی کتب تاریخ میں ملتی ہیں۔ ڈاکٹر مہدی حسین "بہادر شاہ دوم" کے صفحہ نمبر 391 پر لکھتے ہیں: "اگر جیون لال کے بیان میں اعتماد کیا جا سکتا ہے تو مولوی فضل حق نے شاہی فوج کی کمان بھی کی ہے"۔

کنگ کونسل اور ایڈمنسٹریشن کورٹ:

ان ایام میں دہلی کے کوتوال سید مبارک شاہ کا بیان ہے کہ بادشاہ نے جنرل بخت خان، مولوی سرفراز علی اور مولوی فضل حق پر مشتمل ایک کنگ کونسل بھی تشکیل دی تھی۔ مولانا نے جو دستور امور مملکت چلانے کے لیے مرتب کیا

تھا۔ اس کے لیے ایڈمنسٹریشن کورٹ کے نام سے ایک مجلس منتظمہ وجود میں لائی گئی جس کے نگران خود مولانا فضل حق تھے۔ اس مجلس منتظمہ کے لیے وضع کردہ قواعد وضوابط کو ملاحظہ فرمائیں تو صاف دکھائی دیتا ہے کہ مولانا نے عصری تقاضوں کے مطابق یہ سارا نظام خالصتاً جمہوری بنیادوں پر استوار کرنا چاہا تھا۔

سقوط دہلی اور مولانا کی مجاہدانہ سرگرمیاں:

بعد یہ اسباب حرب اور بے پناہ افرادی قوت کے باعث انقلابی فوج انگریزی حملوں کا زیادہ مدت تک مقابلہ نہ کرسکی اور صرف چار ماہ بعد یعنی 19 ستمبر 1857ء کو دہلی پر انگریز کا تسلط مکمل ہوگیا۔

مجاہدین آزادی کی جنگ کو یہیں ختم کرنے پر آمادہ نہ تھے۔ ان کا منصوبہ یہ تھا کہ بہادر شاہ کو لے کر دہلی سے نکل جائیں اور لکھنؤ کو اپنی آئندہ سرگرمیوں کا مرکز بنائیں۔ بادشاہ اپنی کم ہمتی اور پست ہمتی کے باعث مجاہدین کی بجائے انگریز کے حامی مشیروں کے کہنے میں آگیا اور قلعہ چھوڑ کر ہمایوں کے مقبرے میں چلا گیا۔ مولانا فضل حق اور جنرل بخت خاں وغیرہ نے ہمت نہیں ہاری اور جنگ جاری رکھنے کے لیے یوپی کا رخ کیا جہاں ابھی میدان کارزار گرم تھا۔ مولانا نے دہلی سے نکل کر اودھ کی ریاست کے ساتھ وابستگی اختیار کرلی۔ بیگم حضرت محل مولانا کے مشوروں کو بہت قدر سے دیکھتی تھیں۔ مولانا نواب صاحبہ کی مجلس شوریٰ کے اہم اور معزز رکن تھے۔ جنرل بخت خان، مولوی احمد اللہ شاہ اور شہزادہ فیروز شاہ بھی اودھ کی فوج سے آملے۔ مولانا کی مدبرانہ اور قائدانہ صلاحیتوں سے اودھ کی حکمران ولیہ خاتون نے بھرپور استفادہ کیا لیکن امرائے سلطنت میں سے بعض کی غداری اور فوجی قیادت کی باہمی آویزش نے ناکامی و نامرادی کو قریب تر کردیا۔ مولانا کے خلاف انگریز کے قائم کردہ مقدمہ کی فرد جرم سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک باغی فوج کی نگران مولانا بھی تھیں کر رہے تھے۔

گرفتاری، مقدمہ اور سزا:

جہادی رفقاء کے منتشر ہوجانے کے بعد مولانا آزادی وطن سے مایوس اور ملکی حالات و واقعات سے سخت پریشان اور کبیدہ خاطر تھے۔ دریں اثناء نومبر 1858ء میں ملکہ وکٹوریہ کی طرف سے اعلان معافی شائع کیا گیا اور اس سے فائدہ اٹھانے کے لیے 30 دسمبر 1858ء تک کی مہلت دی گئی۔ مولانا اپنے آبائی گھر خیرآباد پہنچ گئے۔

26 دسمبر 1858ء کو مولانا کی کرنل کلارک سے ملاقات ہوئی۔ کرنل نے انہیں اپنی کمشنر کی تحویل میں دینے کا حکم جاری کیا۔ 30 جنوری 1859ء تک مولانا اپنے گھر پر ہی نظر بند رہے۔ تا آنکہ انہیں باقاعدہ گرفتار کرکے لکھنؤ روانہ کردیا گیا۔

22 فروری 1859ء کو مقدمہ شروع ہوا اور 28 فروری کو ان پر حسب ذیل فرد جرم عائد کی گئی۔ وہ 1857ء اور 1858ء کے دوران بغاوت کا سرغنہ رہا اور دہلی اور اودھ اور دوسرے مقامات پر اس نے لوگوں کو بغاوت اور قتل کی ترغیب دی۔ اس نے مئی 1858ء میں بوندی کے مقام پر باغی سرغنہ محمود خان کی مجلس مشاورت میں نمایاں حصہ لیا۔

4 مارچ 1859ء کو مولانا کو جس دوام عبور دریائے شور (کالا پانی) اور تمام جائیداد کی ضبطی کا حکم سنایا گیا۔ مئی 1859ء میں مولانا کو لکھنؤ سے کلکتہ روانہ کیا گیا۔ جہاں سے 8 اکتوبر کو جزائر انڈمان لے جائے گئے جہاں حالت اسیری میں ہی 12 صفر المظفر 1278ھ بمطابق 20 اگست 1861ء اس جید عالم دین، عظیم مدبر اور سرکردہ مجاہد آزادی نے داعی اجل کو لبیک کہا۔

جزائر انڈمان (کالا پانی):

جزائر انکوبار اور انڈمان خلیج بنگال میں واقع ہیں جو کلکتہ سے تقریباً 250 کلومیٹر کے فاصلہ پر ہیں۔ انگریزوں نے شروع سے ہی ان جزائر کو سزائے عبور دریائے شور کے لیے منتخب کیا تھا۔ سخت خرابی آب وہوا کے باعث 1726ء میں یہ جزائر بالکل ویران ہو گئے تھے۔ اس زمانہ میں جب سفر اس قدر محفوظ نہ تھا۔ جہازوں کا لنگر بحری قزاقوں کے خوف سے اور شدید سمندری طوفانی حالت سے ہراساں رہتا تھا۔ علاوہ ازیں ایسٹ انڈیا کمپنی کو دفاعی نقطۂ نگاہ سے بھی ایک ایسی جگہ کی ضرورت تھی "جو رنگون" مدراس اور کلکتہ کے درمیان واقع ہو۔ جہاں طویل سفر کے دوران اس کے تجارتی جہاز قیام کر سکیں۔ چنانچہ اس مقصد کے لیے 1788ء میں کیپٹن نے آرچی بالڈ بلیئر کو ان جزائر کا سفر کر کے یہاں ایک آبادی قائم کرنے کا منصوبہ سونپا۔ لفٹیننٹ بلیئر کی بسائی ہوئی اس آبادی کو اسی کے نام سے موسوم کیا گیا جو آب پورٹ بلیئر کہلاتی ہے۔ شروع میں میزلیو فتہ قیدیوں کو بطور مزدور یہاں بھیجا جاتا۔ مگر جب 1857ء کی جنگ آزادی کے سرخیل مجاہدین کی ایک جوئی تعداد کو مزید ناقابل برداشت سزا ضروری سمجھا گیا تو نومبر 1857ء میں فیصلہ کیا گیا کہ ان جزائر کو پھر سے سزائے عبور دوام کے کام لایا جائے۔ یہ

کالا پانی، حضرت مولانا کی زبانی:

علامہ فضل حق خیرآبادی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی خوش شہرت سوانح عمری میں ان جزائر کی کیفیت یوں بیان کی ہے:

"پھر مجھے دریائے شور کے کنارے ایک ناموافق آب وہوا والے پہاڑ پر پہنچا دیا جہاں سورج ہمیشہ سر پر ہی رہتا ہے۔ اس میں دشوار گزار گھاٹیاں اور راہیں تھیں جنہیں دریائے شور کی موجیں ڈھانپ لیتی تھیں۔ اس کی نسیم صبح بھی گرم و تیز ہوا سے زیادہ سخت اور اس کی نعمت "زہر ہلاہل" سے زیادہ مہلک تھی۔ اس کی غذا مثقل سے زیادہ سخت اور اس کا پانی

سانپوں کے زہر سے بڑھ کر ضرر رساں۔ ہر کوٹھری پر پچھر تھا جس میں رنج و امراض بھرا ہوا تھا۔ میری آنکھوں کی طرح ان کی چھتیں ٹپکتی تھیں۔ ہوا بدبودار اور بیماریوں کا مخزن تھی۔ مرض سستا اور دوا گراں۔ بیماریاں بے شمار، خارش وقہاء (ایک مرض جس سے بدن کی کھال پھٹنے اور چھلنے لگتی ہے) عام تھی بیمار کے علاج، تندرست کے بقائے صحت اور زخم کے اندمال (تندرست ہونے) کی کوئی صورت نہ تھی۔ دنیا کی کوئی مصیبت یہاں کی الم ناک مصیبتوں پر قیاس نہیں کی جاسکتی۔ یہاں کی معمولی بیماری بھی خطرناک ہے۔ بخار موت کا پیغام، مرض سرسام اور برسام (دماغ کے پردوں کا ورم) ہلاکت کی علت تام ہے۔ بہت سے مرض ایسے ہیں جن کا کتب طب میں نام ونشان نہیں"۔ ۸

علامہ نے اس شہر آشوب میں جو تاریک ترین ماہ وسال گزارے ہیں اور ان سے کوڑا کرکٹ بلکہ بعض روایات کے مطابق غلاظت تک اٹھوانے کا شرمناک کام انہیں تفویض کیا گیا تھا۔ یہ قید خانہ جس سے ایک یعنی انگریز کی تاریخ کا سیاہ ترین ورق ہے۔

علامہ ایک اور جگہ فرماتے ہیں کہ" یہ ناقابل برداشت حالات تھے کہ میں متعدد امراض میں مبتلا ہو گیا جس کی وجہ سے میرا میر مطلوب' میرا سفید رنگ' میرا چاند دھندلا اور میری عزت' ذلت سے بدل گئی۔ میں نہیں جانتا تھا کہ اس دشوار و سخت رنج و غم سے کیوں کر چھٹکارا حاصل ہو سکے گا۔ خارش اس پر مستزاد ہے۔ صبح و شام اس طرح بسر ہوتی ہے کہ تمام بدن زخموں سے بھلائی ہو چکا ہے۔ روح کو تحلیل کر دینے والے درد و تکلیف کے ساتھ زخموں میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ وہ وقت دور نہیں جب یہ پھنسیاں مجھے ہلاکت کے قریب پہنچا دیں"۔ ۹

میر محمد اسماعیل حسین منیر شکوہ آبادی:

حضرت علامہ کی زمانی رفاقت میں ایک نمایاں ترین نام' جنگ آزادی 1857ء کے مجاہد شاعر میر محمد اسماعیل حسین منیر شکوہ آبادی کا ہے۔ یہ وہ دل جمعیت عظیم الشان میں ایک جگہ تھے۔ منیر نے اپنا معرکۃ الآراء قصیدہ جو مصطلحات علم میں ہے۔ علامہ کی فرمائش پر نظم کیا تھا۔ خود مولانا فضل حق نے اس عہد اسیری میں عربی میں دو قصائد لکھے۔ ان کا نام انہوں نے "قصائد ثورۃ الہند" رکھا۔ عبدالشاہد خان شیروانی نے ان قصائد کا اردو ترجمہ کر کے علامہ کی مشہور تصنیف "الثورۃ الہندیہ" (باغی ہندوستان) کے ساتھ شائع کر دیا ہے۔ ۱۰

حضرت منیر شکوہ آبادی کا حصہ یہ کلام درجہ کمال کا حامل ہے۔ یہاں ہم ان کے چند اشعار نمونہ مشتے از خروارے کے طور پر پیش کر رہے ہیں جن سے حضرت علامہ کی سرگزشت میں کھنچے نقطہ کی تائید ہوتی ہے۔

نکل کر ہند سے آنا ہوا جب اس تیرے میں امیروں کی سیاہ بختی سے کالا ہو گیا پانی

کرو اڑہ کشی یا مٹی کھودو ' چکیاں پیسو اگر ہو جاں بلب' منہ میں نہ ٹپکائے کوئی پانی
سمجھ کر شور محشر اس کو' مردے چونک پڑتے ہیں یہ دریا شور کرتا ہے کہ ہوتا ہے جگر پانی
وطن بس کھیروں کا جاگیر ہے یہ مارو کڑوم کی کھلانا زہر قاتل ہے' یہاں کی عین مہمانی
فغان خوک خوک و نعیق زاغ سنتے ہیں یہی ہے راگ صبح و شام ' ٹوڑی ہے نہ ملتانی
یہاں بیماریاں دیکھیں زیادہ ساری دنیا سے بنا ہے کنہرا امراض گویا جسم انسانی
دوا کا قحط ہے امراض بے مانگے میسر ہیں گرانی ہوشیاری کی ہے' بے ہوشی کی ارزانی

مولانا کی اسیری اور قید حیات کا خاتمہ:

اوپر آپ پڑھ چکے ہیں کہ مولانا طرح طرح کی بیماریوں کا نشانہ بن چکے تھے۔ زمانے بھر کے مصائب و آلام کے ساتھ مسلسل پنجہ آزمائی کرتا ہوا یہ ساٹھ برس سے زیادہ عمر کا ضعیف ولاغر مجاہد' ناموافق آب و ہوا' ناقابل برداشت مشقت واذیت' پوری حوصلہ مندی اور صبر واستقامت کے ساتھ شہید ہوا۔ بالآخر اسی قہرمان جزیرے پر اپنی حیات مستعار کی آخری سانس لے کر اس بے اماں اسیری اور قید حیات سے آزاد ہو کر اپنے پروردگار کے حضور حاضر ہو گیا۔

؎ غفار رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را

تاریخ کو مسخ کرنے کی شرمناک وارداتیں:

تحریک آزادی اور جہاد 1857ء کے سرخیل حضرت علامہ فضل حق خیرآبادی رحمۃ اللہ علیہ کی زریں سوانح حیات کے بعض گوشوں کا ایک اجمالی خاکہ ہی ہمارے مضمون میں سما سکتا تھا۔ حقائق سے آگاہ لوگ خوب جانتے ہیں کہ معرکہ آزادی 1857ء کا تذکرہ حضرت علامہ خیرآبادی کے ذکر خیر کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتا۔ لیکن اس کا کیا کیجیے کہ خوئے بد' جن کے گلے کا طوق بن جائے' جان جائے' یہ عادت جان نہیں چھوڑتی۔ کچھ ایسے ''مہربان'' ہیں جو حضرت علامہ کو جنگ آزادی میں شریک نہیں مانتے۔ کچھ کے نزدیک جنگ آزادی کے ہیرو مولانا فضل حق' یہ خیرآباد والے نہیں' کوئی دوسرے تھے اور کچھ تو ایسے جھوٹ اور افترا کے جھنڈے ہیں کہ اپنے بڑوں کے چہروں کی کالک حضرت علامہ کے رخ زیبا پر پوتنے کی مکروہ کوشش کرتے ہیں۔ یہ صفحات زیادہ تفصیل کے متحمل نہیں ہیں۔ بس تھوڑی سی نشان دہی کی سعی ہے۔ شاید یہ اشارات کچھ گرہیں کھول سکیں۔

جن لوگوں کی تحریروں کو علامہ کی جنگ آزادی میں عدم شرکت کے ثبوت کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ ان میں ایک نمایاں ترین نام مالک رام کا ہے۔ ان کی ایک تحریر ملاحظہ فرمایئے: ''غرض پورے حالات کو بہ نظر غائر مطالعہ

کرنے سے ثابت ہوتا ہے کہ مولانا فضل حق مرحوم نے 1857ء کی تحریک میں واقعی کوئی حصہ نہیں لیا تھا۔ انہوں نے اس سے پہلے لوگوں کو جو بھی تلقین کی ہو (اور اس کی طرف انہوں نے ایک جگہ اشارہ بھی کیا ہے) لیکن جب ہنگامہ شروع ہوا تو وہ عملاً اس سے الگ تھلگ رہے۔ نہ عملی پہلو سے اس میں شریک ہوئے اور علمی لحاظ سے انہوں نے نہ کوئی فتویٰ لکھا نہ تلوار اٹھائی۔ ۱۲

مزے کی بات یہ ہے کہ مالک رام جی یہ دور کی کوڑی' اس مضمون میں لائے ہیں جو انہوں نے تحریک دہلی جون 1960ء میں لکھا۔ اسی مضمون میں اسپیشل کمشنر کے فیصلہ پر مشتمل مسل بھی شامل ہے جو حضرت مولانا کے مقدمہ میں پیش کیا گیا تھا۔ کمشنر کے مطابق دہلی میں علامہ فضل حق خیرآبادی رحمۃ اللہ علیہ کی باغیانہ سرگرمیاں اس نوعیت کی تھیں "اس کی گرفتاری کے بعد دہلی سے اس کے پرانے تعلقات کے باعث وہاں حکام سے بھی اس کے متعلق استصواب کیا گیا تو کمشنر دہلی نے اس کے جو جوابات تحریر کیے ان سے معلوم ہوا کہ 1857ء میں دہلی میں بھی اس کی سرگرمیاں بعینہٖ اسی قسم کی (باغیانہ) تھیں.....وہ الور میں ملازم تھا۔ یہاں سے وہ دریدہ دامنہ دہلی آیا اور اس کے بعد وہ باغیوں کے قدم بقدم چلتا رہا"۔

سقوط دہلی کے بعد اودھ میں رہتے ہوئے مولانا نے تحریک جہاد میں جو حصہ لیا اس کا تذکرہ کرتے ہوئے کمشنر لکھتا ہے: "وہ 1857ء اور 1858ء کے دوران میں بغاوت کا "سرغنہ" رہا اور دہلی اور اودھ اور دوسرے مقامات پر اس نے لوگوں کو بغاوت اور قتل کی ترغیب دی.....اس نے بوندی کے مقام پر باغی سرغنے مہوخاں کی مجلس مشاورت میں "نمایاں حصہ" لیا۔ اس نے بوندی کے مقام پر کی 1858ء میں ایک سرکاری ملازم عبدالحکیم کو قتل کرنے کی ترغیب دی۔ اس نے قرآن کی آیات پڑھیں اور ان کے من مانے معنی کیے اور اصرار کیا کہ انگریزوں کے ملازم کافر اور مرتد ہیں اور اس لیے شریعت کے نزدیک ان کی سزا قتل ہے۔ وہ باغیوں کی مجلس شوریٰ کا اہم" رکن" تھا..... یہ تو ظاہر ہے کہ ملزم بہت قابل آدمی ہے لیکن جس طرح اوپر بیان ہوا اس نے بے ایمانہ ہوس یا غلط مذہبی تعصب کے باعث باغیوں سے اپنا رشتہ جوڑا اور ان کا مشیر بن گیا۔ وہ خطرناک ترین آدمی ہے جو کسی وقت بھی بے حد نقصان پہنچا سکتا ہے۔ اس لیے انصاف اور امن عامہ کا تقاضا ہے کہ اسے ملک بدر کر دیا جائے..... ایسے شخص کو سخت ترین سزا ملنی چاہیے اور اسے خاص طور پر ہندوستان سے خارج کر دینا چاہیے"۔

انکار حقیقت کی وجہ:

ایک مخصوص گروہ حضرت علامہ فضل حق خیرآبادی رحمۃ اللہ علیہ کے جنگ آزادی 1857ء میں مجاہدانہ کردار کا

انکار آخر کیوں کرتا ہے؟ وجہ اس کی یہ سامنے آتی ہے کہ جب 1818ء میں شاہ اسماعیل دہلوی نے ابن عبدالوہاب نجدی کی "تقلید" میں "امام معین کی تقلید" ترک کر کے "تمسک بالکتاب والسنۃ" کا نعرہ لگایا اور تقویۃ الایمان کے نام سے اردو میں ایک کتاب لکھی جس کا انداز بیان عامیانہ اور مواد جمہور امت کے عقائد کے بالکل برعکس تھا۔ اس میں شفاعت کا انکار کیا گیا تھا اور نبی اکرم ﷺ کی نظیر کے امتناع کا بھی انکار کیا گیا تھا۔ دہلی کے علماء میں سخت بے چینی پیدا ہوئی حتی کہ شاہ ولی اللہ دہلوی کے مکتب فکر سے متعلق علماء بے حد برہم ہوئے۔ مگر چونکہ شاہ اسماعیل دہلوی، شاہ ولی اللہ کا پوتا اور شاہ عبدالعزیز کا بھتیجا تھا۔ اس لیے کھل کر بات نہ کرتے تھے۔

اس نازک فکر میں مولانا فضل حق خیرآبادی رحمۃ اللہ علیہ کے غیرت ایمانی کا ثبوت دیا اور "امتناع النظیر" کے مسئلہ پر شاہ اسماعیل کے رد میں ایک رسالہ تالیف فرمایا۔ بعد میں "تحقیق الفتوی فی ابطال الطغوی" کے نام سے ایک مدلل اور مبسوط کتاب تحریر فرمائی جس پر علمائے عصر بالخصوص خانوادۂ ولی اللہی سے وابستہ علماء نے بھی دستخط کیے تھے۔ اس سے لوگوں میں جرأت پیدا ہوئی اور دیگر علماء بھی کھل کر حق کہنے میں ان کے ہمنوا بن گئے۔ شاہ عبدالعزیز کے وصال 1823ء کے فوراً بعد دہلی کی جامع مسجد شاہ جہانی میں ایک تاریخی مجلس مناظرہ منعقد ہوئی جس میں ایک طرف شاہ اسماعیل اور اس کے حامی علماء تھے دوسری طرف باقی تمام علمائے حق۔ شاہ اسماعیل تو دوران مناظرہ آپے سے باہر ہو گیا اور مناظرہ چھوڑ کر چلا گیا۔ مولوی عبدالحی بڈھانوی بھی بھاگ جانا چاہتے تھے مگر اٹھ نہ سکا۔ آخر میں انہی کی جیتوں کو تسلیم کرتا ہے اور لکھ کر بھی دے گئے۔

مولانا فضل حق رحمۃ اللہ علیہ کی یہ حق گوئی ان کا ایسا "جرم" ہے جسے "اسماعیلی" عقیدت مندوں نے آج تک معاف نہیں کیا۔ ان میں سے اگر کچھ ان کے مجاہدانہ اور سرفروشانہ کردار کو سراہتے بھی ہیں تو اگلی ہی سانس میں کئی طرح کے کیڑے بھی نکالتے ہیں۔

لے دے کے اس گروہ کے پاس سب سے بڑا الزام یہ ہے کہ حضرت مولانا بھی ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت میں سرکاری عہدوں پر فائز رہے ہیں۔ اول تو یہ جرم تنہا ان کا نہیں ہے۔ الزام دینے والے قبیلے کے ان گنت افراد اسی قبیل میں شامل ہیں۔ خب وٹن اور جوش ایمانی کی شان تو دیکھیے کہ جب وقت آیا تو سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر علی الاعلان میدان کارزار میں کود پڑے۔ آزمائش کی کڑی دھوپ میں اس عظیم مرد مجاہد کا قہقہاتا اور روشن چہرہ اس طمع کی کذب بیانی اور افترا پردازیوں سے دھندلایا نہیں جا سکتا۔

سب سے لطیف بات یہ ہے کہ حضرت علامہ فضل حق خیرآبادی رحمۃ اللہ علیہ کو حکومت ایسٹ انڈیا کمپنی کا ملازم ہونے پر مطعون کرنے والے بغیر ملازمت اختیار کیے بعض خفیہ اور ناقابل بیان "خدمات" انجام دے کر انگریز سے

جس قدر مال بٹورتے اور پھر حق نمک ادا کرتے رہے، وہ بھی تاریخ کے بھروکوں سے چھن چھن کر باہر آ ہی گیا اور اب صورت یہ ہے کہ چھپائے نہ چھپے اور دبائے نہ دبے۔

اسماعیل دہلوی کے مرید خاص اور جانشین مولوی نذیر حسین کو کمشنر دہلی کی طرف سے عطا ہونے والا سرٹیفکیٹ ملاحظہ فرمائیں: "مولوی نذیر حسین دہلی کے ایک بہت بڑے متقدر عالم ہیں، جنہوں نے نازک وقتوں میں اپنی وفاداری گورنمنٹ برطانیہ کے ساتھ ثابت کی ہے..... جس کسی پر شک گورنمنٹ انگریزی کی مدد وہ چاہیں گے وہ ان کو مدد دے گا کیونکہ وہ کامل طور سے اس مدد کے مستحق ہیں"۔ [4]

اسماعیل دہلوی کے پورے فرقہ کی انگریز سے وفاداری کا عہد محمد حسین بٹالوی سے سنیے۔ وہ اپنے مشہور رسالہ "الاقتصاد فی مسائل الجہاد" میں لکھتے ہیں: "بعض اشخاص کا تو صریح نقلی اور حقیقی عہد ہو چکا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو تحریر آ حاضر و غائب خیر خواہی و وفاداری گورنمنٹ کا دم بھرتے ہیں اور ان کی خدمت و معاونت میں سرگرم ہیں۔ ان ہی لوگوں میں پنجاب کے اہل حدیث داخل ہیں جنہوں نے سر جنری ویس صاحب بہادر کے عہد نظامت گورنری میں بذریعہ ایک عرضداشت کے اس عہد کا اظہار کیا تھا جس پر 1876ء میں پنجاب گورنمنٹ سے ایک سرکلر ان کی تصدیق و تائید میں مشتہر ہوا تھا"۔ [5]

اسی رسالہ کے صفحات 49/50 درج ذیل تحریر سے مزین ہیں: "سنہ 1857ء میں جو مسلمان شریک ہوئے تھے وہ سخت گنہگار اور بحکم قرآن و حدیث وہ سنہ باغی بدکردار تھے۔ اکثر ان میں عوام کالانعام تھے۔ بعض جو خواص و علماء کہلاتے تھے وہ بھی اہل علوم دین (قرآن و حدیث) سے بے بہرہ تھے یا نافہم و بے سمجھ۔ باخبر و سمجھ دار علماء اس میں ہرگز شریک نہیں ہوئے اور نہ اس فتوٰی پر جو اس غدر کو جہاد بتانے کے لیے سنہ لے پھرتے تھے انہوں نے خوشی سے دستخط کیے۔ اس کی تفصیل ہم اشاعت السنہ نمبر 10 جلد 8 میں کر چکے ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ مولوی اسماعیل دہلوی جو حدیث و قرآن سے باخبر اور اس کے پابند تھے اپنے ملک ہندوستان میں انگریزوں سے (جن کے امن و عہد میں رہتے تھے) نہیں لڑے اور نہ اس ملک کی ریاستوں سے لڑے ہیں"۔

اوپر کے اقتباس میں جن علماء کو "باخبر اور سمجھ دار" قرار دے کر اس حقیقت کا اعتراف کیا گیا ہے کہ اسماعیل دہلوی کے پیروکار اور ہم مشرب "انگریز کی وفاداری کو اپنے ایمان کا حصہ سمجھتے تھے۔ غیر مقلد" کھلے اسماعیلی ٹولہ کے علاوہ دارالعلوم دیوبند کے اکابر بھی انہی "خیالات عالیہ" کے حامل اور اسی راہ کے مسافر تھے۔

مولوی عاشق الٰہی میرٹھی کا شمار اکابر علمائے دیوبند میں ہوتا ہے۔ انہوں نے اپنے پیر و مرشد مولوی رشید احمد

گنگوہی کی سوانح تذکرۃ الرشید کے نام سے لکھی ہے۔ یہ کتاب جو مریدانہ عقیدت ومحبت کے جذبہ سے لکھی گئی ہے اور اپنے مکتب فکر کے لوگوں میں بڑا مقام رکھتی ہے اپنے صفحات میں کچھ ایسے حقائق سموئے ہوئے ہے جو ان عہد الوہاب نجدی اور اسماعیل دہلوی کے جانشینوں کے "مجاہدانہ کردار" پر تفصیلی روشنی ڈالتے ہیں۔

جنگ آزادی میں شرکت سے برأت کا سرٹیفکیٹ دیتے ہوئے میر عظمی صاحب لکھتے ہیں "شروع ۱۲۷۶ھ ہجری نبوی ۱۸۵۹ء وہ سال تھا جس میں حضرت امام ربانی قدس سرہ (گنگوہی صاحب) پر انگریز سرکار (انگریز) سے باغی ہونے کا الزام لگایا گیا اور مفسدوں میں شریک رہنے کی تہمت باندھی گئی۔" ۱۵

میر عظمی صاحب اگلے صفحات میں واقعاتی شہادتوں سے ثابت کرتے ہیں کہ ان کے ممدوح گنگوہی صاحب اور دوسرے دیوبندی اکابر جنگ آزادی میں شریک نہ تھے بلکہ وہ تو انگریز سرکار کی حمایت میں مجاہدین آزادی کے خلاف برسرپیکار بھی رہے۔ ایک واقعہ یوں بیان کرتے ہیں۔

"ایک مرتبہ ایسا بھی اتفاق ہوا کہ حضرت امام ربانی (گنگوہی صاحب) اپنے رفیق جانی مولانا قاسم العلوم (قاسم نانوتوی) اور طبیب روحانی حضرت حاجی صاحب نیز حافظ ضامن صاحب کے ہمراہ تھے کہ بندوقچیوں (مجاہدین) سے مقابلہ ہوگیا۔ یہ نیرد آزما دلیر جتھا اپنی سرکار (انگریز) کے مخالف باغیوں کے سامنے سے بھاگنے یا ہٹ جانے والا نہ تھا۔ اس لیے اٹل پہاڑ کی طرح جم کر ڈٹ گیا اور سرکار (انگریز) پر جان نثاری کے لیے تیار ہوگیا۔ اللہ رے شجاعت وجوان مردی کہ جس ہولناک منظر سے شیر کا پتہ پانی اور بہادر سے بہادر کا زہرہ آب ہو جائے وہاں چند فقیر ہاتھوں میں تلواریں لئے جم غفیر بندوقچیوں کے سامنے ایسے جمے رہے گویا زمین نے پاؤں پکڑ لئے ہیں۔ چنانچہ حضرت حافظ ضامن صاحب رحمۃ اللہ علیہ زیر ناف گولی کھا کر شہید بھی ہوئے۔" ۱۶

آج ذرائع ابلاغ میں اثر ورسوخ اور منظم اشاعتی اداروں کے بل بوتے پر اس گروہ کے سبھی چھوٹے بڑے قلم کار اور تاریخ تراش 'پورا زور قلم' یہ ثابت کرنے پر صرف کر رہے ہیں کہ سید احمد بریلوی' اسماعیل دہلوی اور ان کے جانشین انگریز دشمن اور جنگ آزادی کے ہیرو تھے۔ لیکن عاشق الٰہی میرٹھی' کہ راز دار درون خانہ ہیں وہ اپنے بڑوں کو جنگ آزادی میں خواہ مخواہ لپیٹ کر انگریز کی نظر میں مجرم بنانے پر سخت نالاں ہیں چنانچہ لکھتے ہیں: "حب بغاوت وفساد کا قصہ فرو ہوا اور رحم دل گورنمنٹ (ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت) نے دوبارہ غلبہ پاکر باغیوں (مجاہدین آزادی) کی سرکوبی شروع کی تو جن بزدل مفسدوں کو سوائے اس کے اپنی رہائی کا کوئی چارہ نہ تھا کہ جھوٹی سچی تہمتوں اور مخبری کے پیشہ سے سرکاری خیر خواہ اپنے آپ کو ظاہر کریں۔ انہوں نے اپنا رنگ جمایا اور ان گوشہ نشین حضرات پر

بھی بغاوت کا الزام لگایا۔" الخ

انگریز سے وفاداری اور غرماں برداری کے منہ بولتے ثبوت کے طور پر اسی کتاب کے صفحہ ۸۰ کا یہ اقتباس ملاحظہ فرمایئے: "میں (رشید احمد گنگوہی) جب حقیقت میں سرکار (انگریز) کا فرماں بردار ہوں تو جھوٹے الزام سے میرا بال بھی بیکا نہ ہوگا۔ اور اگر مارا بھی گیا تو سرکار مالک ہے۔ اسے اختیار ہے جو چاہے کرے"۔ کیوں جناب اس سے بڑھ کر جاں نثاری اور خود سپردگی کی کوئی مثال دی جا سکتی ہے؟

پہلے یہ ذکر ہو چکا ہے کہ علامہ فضل حق خیرآبادی رحمۃ اللہ علیہ کی سرکاری ملازمت کی آڑ میں ان پر بے شمار بے سروپا تہمتیں دھری گئیں۔ حالانکہ عصری علوم سے متصف بہت سے علماء اور متقدر لوگوں نے ذریعہ معاش کے طور پر حکومت وقت کے مختلف محکموں سے خدمات انجام دیں۔ مگر حب وطن اور غیرت ایمانی میں وہ کسی بھی دوسرے مدعی سے ہرگز کم نہ تھے۔ اُن کے اِن اوصاف حمیدہ کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ انہوں نے وقت پڑنے پر سرکاری ملازمت پر ٹھوکر مارنے میں ایک لمحے کا توقف نہیں کیا اور مردانہ وار میدان عمل میں نکل آئے۔

شورش کشمیری کا تاریخ کے ساتھ کھلواڑ:

جنگ آزادی 1857ء ہو یا تحریک پاکستان دونوں معرکوں میں شریک مجاہدین اور قائدین کی جانشینی بدقسمتی سے ایسے کوتاہ بیں اور کوتاہ ہمت لوگوں کے حصے میں آئی جو اپنی نااہلی اور بے عملی کے باعث اس کا حق ادا نہ کر سکے۔ ایسے میں اُن اچکّوں اور اٹھائی گیروں کی بن آئی جن کے بڑے انگریز کے تلوے سہلانے اور ان کے کتے نہلانے کو اپنے لیے باعث فخر گردانتے تھے۔ وہ آج پوری ڈھٹائی اور بے شرمی کے ساتھ اپنے ان بزرگوں کو آزادی کا چیمپئن قرار دے کر تاریخ کے ساتھ بدترین کھلواڑ کے مرتکب ہو رہے ہیں۔

افسوس! کلمہ حق کہنے کی ذمہ داری جن حاملان جبہ و دستار پر عاید ہوتی ہے وہ حالات کی سنگینی سے بے نیاز خواب خرگوش کے مزے لے رہے ہیں۔ ذرائع ابلاغ میں کثیر تعداد ان اہل قلم کی ہے جو مسخ شدہ تاریخ پر آنکھیں بند کر کے یقین کرتے ہوئے اسی کج بنیاد پر اپنے مضامین اور کتابوں کی نیو رکھی میٹھی عمارتیں استوار کیے جا رہے ہیں۔ نئی نسل کو یہی بگڑی شکل والی تاریخ پڑھائی جاری ہے۔ غداران وطن کے سینوں پر شجاعت و مردانگی کے تمغے سجائے جا رہے ہیں اور وہ جو قید و بند کی صعوبتیں سہتے اس جہاں سے گذر گئے انہیں انگریز کا حامی و طرفدار بتایا جا رہا ہے۔

تاریخ کے ساتھ اس ریپ کے مجرموں میں شورش کاشمیری (1917ء۔1975ء) کا نام بہت نمایاں ہے۔ ان کی ایک واردات ملاحظہ فرمایئے: "سید احمد شہید اور شاہ اسمٰعیل کی تحریک کے سب سے بڑے مخالف مولانا فضل

حق خیرآبادی (1816ء) ایجنٹ دہلی کے محکمہ میں سررشتہ دار اور دوسرے بڑے مخالف مولوی فضل رسول بدایونی بدایوں میں کلکٹر کے سررشتہ دار تھے۔ انگریزوں نے ان کے علاوہ اس وقت کے بعض نامور حکام اور کل ایک جید فضلاء کو سرکاری خدمات کے لیے حاصل کرلیا۔ ان میں مفتی صدرالدین آزردہ (1868ء) مولوی فضل امام خیرآبادی (1829ء) اور خیرآباد کے علماء کا پورا قبیلہ تھا۔" ۱۸

دیکھا آپ نے' جنگ آزادی کے مسلمہ قائد حضرت علامہ فضل حق خیرآبادی رحمۃ اللہ علیہ اور دوسرے علمائے حق' ایک بدنام زمانہ ایک مسلمہ مخبر کے بے نام قلم کا شکار بن کر غدار ٹھہرے اور ان کے ممدوح انگریز کے پروردہ ہونے کے باوجود مجاہدین اور شہداء قرار پائے؟؟؟

علامہ کا علمی وفکری مقام ومرتبہ:

علامہ فضل حق خیرآبادی رحمۃ اللہ علیہ ایک جامع الصفات شخصیت تھے۔ ہم نے ان کی بھرپور داستان حیات کے صرف ایک گوشے کی ہلکی سی جھلک پیش کی ہے۔ حضرت علامہ محض ایک عالم دین نہیں تھے بلکہ دینی علوم پر عبور کے ساتھ ساتھ عصری علوم پر ان کی گرفت کو تسلیم کرتے ہوئے ہندوستان بھر کی ریاستیں عہدہ ومنصب کی پیشکش ہاتھ میں لئے ان کا خیر مقدم کرنے کو تیار رہتی تھیں۔ یہاں تک کہ ان کے بدترین دشمن یعنی انگریز نے ان پر فرد جرم عاید کرتے ہوئے بھی ان کی قابلیت وذہانت کو خراج تحسین پیش کیا ہے۔

جنگ آزادی میں بطور منتظم' قانون دان' مشیر' مجاہد اور سپہ سالار' مختلف حیثیتوں میں خدمات انجام دے کر انہوں نے اپنے مختلف الجہات اوصاف کا لوہا منوایا۔ وہ یک وقت عربی' فارسی اور اردو کے بہترین ادیب اور شاعر تھے۔ کالے پانی کی جلاوطنی اور کڑی آزمائش کے دوران انہوں نے دو مشہور عربی قصائد تحریر فرمائے۔ جن کے نام "الثورۃ الہندیہ" اور "قصائد فتنۃ الہند" ہیں۔ اول الذکر کتاب کا اردو ترجمہ مولانا عبدالشاہد خان شیروانی نے 1947ء میں باغی ہندوستان کے نام سے کیا۔ شیروانی صاحب نے اس کتاب کے دیباچہ میں مولانا کی 18 قصائد کا ذکر کیا ہے۔ ان کے علاوہ نادم بیتاپوری نے اپنے مضمون "غالب اور فضل حق خیرآبادی" میں علامہ کے 17-18 غیر مطبوعہ قصائد کی نشان دہی کی ہے جو انہوں نے سید جمیل الدین احمد قادری کے کتب خانہ واقع بمبئی میں دیکھے تھے۔

اہل علم سے گزارش!

پاکستان کے جملہ اہل علم بالخصوص تاریخ کے شناوروں سے التماس ہے کہ غدار تاریخ کی مٹی پلید ہوتی دیکھ

کر بھی خاموش اور لاتعلقی کے جرم سے خود کو بچائیں۔ ہم جن نسل کو خوراک اور آب و ہوا ایک خالص نہیں دے پا رہے تو کم از کم انہیں اپنی تاریخ تو ملاوٹ اور آلودگی سے پاک دے کر جائیں۔ ہمیں مفاد اور خود غرضی کے باعث غیر ملکی آقاؤں کے گرد پروانہ وار گھومنے والے ضمیر فروشوں اور اعلائے کلمۃ حق کے لیے پھانسی کے پھندے چومنے والوں میں فرق کرنا ہوگا۔ ہمیں انگریز کے بوٹوں کے تلوے چاٹنے والوں اور کالے پانی کی بدترین قید دوام کاٹنے والوں کو ان کی کارکردگی کے مطابق مقام دینا ہوگا۔

﴿حوالہ جات﴾

۱۔ علمائے ہند کا شاندار ماضی' جلد چہارم' ص: 442

۲۔ ایضاً' صفحہ: 445

۳۔ فضل حق اور سن ستاون' ص: 21-22

۴۔ کلیات نثر غالب' ص: 148

۵۔ ایضاً

۶۔ جنگ آزادی' خورشید مصطفیٰ' ص: 191

۷۔ انہیں پل گزرا آب الف' حصہ 5' ص: 351 تا 360

۸۔ شہر آشوب کا تحقیقی مطالعہ' ڈاکٹر نعیم احمد' ص: 184

۹۔ باغی ہندوستان' ص: 425

۱۰۔ کلیات ضمیر' دیوان اول' ص: 65

۱۱۔ جنگ آزادی کا مجاہد شاعر' ص: 171۔173۔175

۱۲۔ فضل حق خیر آبادی اور سن ستاون' حکیم محمود احمد برکاتی' ص: 79

۱۳۔ الحیات بعد الممات' فضل حسین بہاری' صفحہ: 140

۱۴۔ الاقتصاد فی مسائل الجہاد' صفحہ: 48

۱۵۔ تذکرہ الرشید' ص: 73

۱۶۔ ایضاً' ص: 74-75

۱۷۔ ایضاً' ص: 76

۱۸۔ تحریک ختم نبوت' ص: 15

Nafse Islam
WWW.NAFSEISLAM.COM

حیات و خدمات
علامہ فضل حق خیرآبادی

علامہ سید شاہ تراب الحق قادری

اپنے وقت کے دو معروف علماء حضرت بہاؤالدین فاروقی مفتی رہنگ (پنجاب) اور حضرت مولانا شمس الدین فاروقی مفتی بدایوں فرزند شیر الملک بن شاہ عطاء الملک فاروقی کی نسل میں کئی جلیل القدر علماء پیدا ہوئے۔ حضرت شاہ ولی اللہ بن شاہ عبدالرحیم دہلوی، مفتی بہاؤالدین اور حضرت علامہ فضل حق خیرآبادی بن علامہ فضل امام خیرآبادی بن قاضی ارشد ہرگامی مفتی شمس الدین کی اولاد میں سے ہیں۔[1]

علامہ فضل حق نے اپنے والد علامہ فضل امام اور حضرت شاہ عبدالقادر محدث دہلوی و حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی سے تعلیم و تربیت حاصل کی۔ 1225ھ/1809ء میں بعمر 13 سال تمام علوم نقلیہ و عقلیہ کی تکمیل کرلی۔ ایک مدت تک درس و تدریس میں مصروف رہے اور پھر اواخر 1815ء میں سرکاری ملازمت سے وابستہ ہو گئے۔ اس کے بعد 1831ء میں نواب فیض محمد خاں والی جھجر (صوبہ پنجاب) نے قدردانی کے ساتھ آپ کو اپنے یہاں بلایا اور پانچ سو روپے ماہانہ نذرانہ پیش کرتے رہے۔

جھجر (پنجاب) کے بعد علامہ فضل حق خیرآبادی نے مہاراجہ الور کی دعوت پر ریاست الور اور پھر نواب ٹونک و نواب رام پور کی دعوت پر ٹونک و رام پور میں ملازمت کی۔ رام پور کے بعد لکھنؤ کے صدر الصدور اور "حضور تحصیل" کے مہتمم بنائے گئے۔ سہارنپور میں بھی دو سال تک کسی بڑے عہدے پر فائز رہے۔ ایک مرصہ تک عدالت دہلی کے سررشتہ دار بھی رہے۔

محمد حسین آزاد کلام غالب کے انتخاب اور دیوان غالب کے متعلق اپنی معلومات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"سن رسیدہ اور معتبر لوگوں سے معلوم ہوا کہ حقیقت میں ان کا دیوان بڑا تھا۔ یہ منتخب ہے۔ مولوی فضل حق صاحب خیرآبادی فاضل بے عدیل تھے جو ایک زمانے میں دہلی کی عدالت ضلع میں سررشتہ دار تھے..... انہوں نے اکثر غزلوں کو سنا اور دیوان کو دیکھا تو مرزا صاحب کو سمجھایا کہ یہ اشعار عام لوگوں کی سمجھ میں نہ آئیں گے۔ مرزا نے کہا جو کچھ کر چکا اب کیا تدارک ہو سکتا ہے؟ انہوں نے کہا خیر جو ہوا سو ہوا۔ انتخاب کرو اور مشکل شعر نکال ڈالو۔ مرزا

صاحب نے دیوان حوالے کر دیا۔ دونوں صاحبوں نے دیکھ کر انتخاب کیا۔ وہ یہی دیوان ہے جو آج تک کی طرح لوگ آنکھوں سے لگائے پھرتے ہیں"۔ ۴

مولانا عبدالشاہد شیروانی علی گڑھی لکھتے ہیں: "والد ماجد کے انتقال کے وقت علامہ کی عمر بتیس سال تھی۔ اکبر شاہ ثانی کا زمانہ تھا۔ دہلی میں ریزیڈنٹ رہا کرتا تھا۔ اس کے محکمہ کے سررشتہ دار ہو گئے"۔ ۵

مفتی صدرالدین آزردہ دہلوی و علامہ فضل حق خیرآبادی و مرزا اسداللہ غالب کے باہمی روابط و تعلق کے بارے میں مولانا عبدالشاہد شیروانی لکھتے ہیں: "مرزا غالب سے علامہ کے پرخلوص اور گہرے تعلقات تھے۔ اس کی وجہ شاید یہ بھی تھی کہ دونوں بالکل ہم سن تھے۔ دونوں 1212ھ/1797ء میں پیدا ہوئے تھے۔ مفتی صدرالدین خاں آزردہ "ثالث ثلاثہ" تھے۔ یہ تینوں ایک جسم کے لیے "ابعاد ثلاثہ" (طول، عرض، عمق) کا حکم رکھتے تھے۔ جس طرح جسم اپنے ابعاد کے بغیر نہیں سمجھا جا سکتا اسی طرح ان تینوں کو جسم خلوص و محبت سے علیحدہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ مفتی صاحب دونوں سے آٹھ سال بڑے تھے"۔ ۶

دہلی میں علماء کی دو جگہ نشست تھی۔ ایک علامہ (فضل حق) کے یہاں، دوسرے مفتی صدرالدین آزردہ کے دولت کدہ پر۔ علامہ کے علمی دربار میں آٹھویں روز شعرائے دہلی کا اجتماع ہوتا تھا۔ شعراء میں غالب، صہبائی، مومن، آزردہ، احسان، نیر، نثار، شیفتہ، ضمیر، ممنون، نصیر وغیرھم اور علماء میں مولوی عبدالحی خان علوی، مولوی عبدالخالق، مولوی محبوب علی، مولوی نصیرالدین شافعی، مولوی کریم اللہ، مولوی نورالحسن، مولوی کرامت علی، مولوی مملوک علی، مفتی سید رحمت علی، مولوی امان علی، مولوی محمد جان، مولوی محمد رستم علی خاں وغیرہم۔

اندازہ لگائیے کہ اکبر بادشاہ کے دربار سے یہ دربار کسی طرح کم تھے؟ بادشاہ نے لاکھوں روپے صرف کر کے نورتن جمع کیے تھے اور ان شاہانِ علم نے اپنے حسن اخلاق سے سینکڑوں باکمال حضرات کو دربار بنا لیا۔ ۷

علامہ فضل حق خیرآبادی ۱۸۵۶ء میں لکھنؤ چھوڑ کر ریاست الور چلے گئے۔ اس دوران آپ کے دل و دماغ میں انقلاب کی آہٹ صاف محسوس ہو رہی تھی۔ مہاراجہ الور کو آپ نے اپنا ہمنوا بنانے کی کوشش کی مگر اس میں کامیابی نہیں مل سکی۔ پھر آپ نے جو کچھ کیا اسے اس روزنامچہ کے آئینے میں دیکھا جا سکتا ہے۔ "علامہ الور سے رخصت واشاعت کرتے ہوئے مئی ۱۸۵۷ء میں دہلی پہنچے۔ میرٹھ اور دوسری چھاؤنیوں میں کارتوسوں کا قضیہ زور پکڑ چکا تھا۔ گائے اور سؤر کی چربی کی آمیزش کی خبر سے ہندو اور مسلمان فوجی بگڑ بیٹھے۔ روٹی کی ٹکیا کی تقسیم کسی خاص اسکیم کے ماتحت گاؤں گاؤں پہلے سے ہو ہی چکی تھی۔ میرٹھ سے دہلی پر "باغی" فوج نے ۱۱ مئی ۱۸۵۷ء کو حملہ کر دیا۔ قتل و غارت گری

کا بازار گرم ہوا۔ بادشاہ دلی سرگرمیوں کا مرکز بنے اور علامہ بھی شریک مشورہ رہے۔

منشی جیون لال اپنے روزنامچہ میں لکھتے ہیں:

● ۱۶ اگست ۱۸۵۷ء: مولوی فضل حق شریک دربار ہوئے۔ انہوں نے اشرفی نذر پیش کی اور صورت حال سے متعلق بادشاہ سے گفتگو کی۔

● ۱۲ ستمبر ۱۸۵۷ء: بادشاہ دربار عام میں تشریف فرما ہوئے۔ مرزا الٰہی بخش، مولوی فضل حق، میر سعید علی خاں اور حکیم عبدالحق آداب بجالائے۔

● ۱۶ ستمبر ۱۸۵۷ء: مولوی فضل حق نے اطلاع دی کہ متھرا کی فوجی گروہ پہلی گئی ہے اور انگریزوں کو شکست دینے کے بعد شہر پر حملے کر رہی ہے۔

● ۱۷ ستمبر ۱۸۵۷ء: بادشاہ دربار خاص میں رہے۔ حکیم عبدالحق، میر سعید علی خاں، مولوی فضل حق، بدرالدین خاں اور دیگر تمام امرا اور رؤسا شریک دربار رہے۔ ۶

اس روزنامچہ سے علامہ کی باخبری اور انقلابی سرگرمیوں کا اندازہ ہوتا ہے۔ ۷

"علامہ سے جنرل بخت خاں ملنے پہنچے۔ مشورہ کے بعد علامہ نے آخری تیر ترکش سے نکالا۔ بعد نماز جمعہ جامع مسجد (دلی) میں علماء کے سامنے تقریر کی۔ استفتا پیش کیا۔ مفتی صدرالدین خان آزردہ صدر الصدور دلی، مولوی عبدالقادر، قاضی فیض اللہ دہلوی، مولانا فیض احمد بدایونی، ڈاکٹر مولوی وزیر خاں اکبر آبادی اور سید مبارک شاہ رام پوری نے دستخط کیے۔ اس فتوے کی شائع ہوتے ہی ملک میں عام شورش برپا ہو گئی۔ دلی میں نوے ہزار سپاہی جمع ہو گئی تھی"۔ ۸

پروفیسر خلیق احمد نظامی لکھتے ہیں: "پھر انتظامی اعتبار سے بھی یہ حقیقت فراموش نہیں جا سکتی کہ بعد وستانی سپاہی جو بہادر شاہ کے گرد جمع ہو گئے تھے انہیں سخت ترین مالی دشواریاں پیش آرہی تھیں۔ آئے دن فوج کے ضروری اخراجات کے لیے روپیہ قرض لینے کی ضرورت پڑتی تھی۔ ایسی صورت میں کوئی فوج بے گاری کے ساتھ کام نہیں کر سکتی تھی۔ منشی جیون لال نے اپنے روزنامچہ میں بہادر شاہ اور مولوی فضل حق کی گفتگو نقل کی ہے۔

بہادر شاہ نے جب مولوی صاحب کو حکم دیا کہ "اپنی افواج کو لڑانے کے لئے لے جاؤ اور انگریزوں کے خلاف لڑو" تو انہوں نے کہا: "افسوس تو اسی بات کا ہے کہ سپاہی ان کا کہا نہیں مانتے جو ان کی تنخواہ دینے کے ذمہ دار

نہیں۔" ۹

۱۴ ستمبر ۱۸۵۷ء کو ایسٹ انڈیا کمپنی نے دلی پر پوری طاقت و قوت کے ساتھ حملہ کیا اور ۱۹ ستمبر کو دلی پر اس کا مکمل قبضہ ہو گیا۔ بہادر شاہ ظفر قلعہ ہمایوں سے ۲۱ ستمبر کو گرفتار کر لیے گئے۔ جنرل بخت خاں، ڈاکٹر وزیر خاں، اکبر آبادی مولانا فیض احمد بدایونی وغیرہم لکھنؤ چلے گئے اور مولانا احمد اللہ شاہ مدراسی کے پرچم کے نیچے جمع ہو کر انگریزوں سے لڑتے رہے۔ آخر میں شاہ جہاں پور پہنچے اور اپنی حکومت قائم کر لی پھر آخر شکست کے بعد روپوش ہوتے ہوئے نیپال گئے۔ اس کے بعد کسی کا کچھ پتہ نہیں چل سکا۔ البتہ بلدیو سنگھ راجہ پوائیں شاہ جہاں پور کی غداری سے مولانا احمد اللہ شاہ مدراسی ۱۲ ذوالقعدہ ۱۲۷۳ھ/ ۱۵ جون ۱۸۵۷ء کو شہید ہو گئے اور جہان آباد (شاہجہان پور) میں آپ کا سر دفن ہوا۔

وصال علامہ فضل حق:

علامہ فضل حق ۱۲۳ ستمبر ۱۸۵۷ء کو دلی سے نکل کر کسی طرح اودھ پہنچے۔ جہاں لکھنؤ میں ۱۲۷۵ھ/ ۱۸۵۹ء میں آپ پر مقدمہ چلا اور کالا پانی کی سزا ہوئی۔ وہیں ۱۲ صفر ۱۲۷۸ھ/ ۱۸۶۱ء میں آپ کا انتقال ہو گیا۔

علامہ کے وصال پر غالب کے تاثرات:

آپ کے دوست مرزا غالب نے انتقال کی خبر سنی تو شیخ لطیف اہل بگرامی کے نام اپنے ایک خط میں لکھا: "کیا لکھوں اور کیوں؟ نور آنکھوں سے جاتا رہا اور دل سے سرور دنیا تھم میں رخصت ہوا۔ کان سماعت سے عاری ہے۔

عتاب عرصہاں در آمد بجوش صراحی نمی گفت و ساقی خموش

فقرا بعاد و بخوین مولانا فضل حق ایسا دوست مر جائے۔ غالب نیم مردہ نیم جاں رہ جائے۔

مرتے ہیں آرزو میں مرنے کی موت آتی ہے پر نہیں آتی

آگے آتی تھی حال دل پہ ہنسی اب کسی بات پر نہیں آتی ۱۰

جرم بغاوت کی دفعات:

علامہ فضل حق خیرآبادی پر جرم بغاوت کی دفعات اس طرح عائد کی گئی تھیں:

بعدالت لکھنؤ مؤرخہ ۱۳ مارچ ۱۸۵۹ء

بہ اجلاس لیفٹیننٹ جی کیمبل جوڈیشل کمشنر آف اودھ و میجر بی ڈی ایم او فٹنگ کمشنر خیرآباد و ڈویژن۔

مولوی فضل حق پر مندرجہ ذیل الزامات عاید کیے گئے۔

نکتہ ❶: ۱۸۵۷ء اور ۱۸۵۸ء میں باغی سرکار کی حیثیت میں دلی، اودھ اور دوسری جگہوں پر بغاوت اور قتل میں مدد دی۔

نکتہ ❷: بوندی (اودھ) میں ماہ مئی ۱۸۵۸ء میں باغی سردار موخاں (اودھ) کے مشیر خاص کی حیثیت سے نمایاں کام سرانجام دیا۔

نکتہ ❸: بوندی میں ماہ مئی ۱۸۵۸ء میں ملازم معاہد الحکیم سرکار انگلشیہ کے خلاف سازش قتل کی۔

عدالت کا فرد جرم عائد:

عدالت نے قیدی کو مندرجہ ذیل وجوہ پر مجرم قرار دیا:

قیدی نے ۱۸۵۷ء اور ۱۸۵۸ء میں باغیوں کی کونسل میں خاص کام انجام دیے۔ خاص طور پر باغی سردار موخاں کے مشیر خاص کی حیثیت سے اس نے ایسے اصولوں کی اشاعت کی جس سے قتل کے امکانات پیدا ہوئے۔

۱۴ مارچ کو مجرم کو عمر قید بعبور دریائے شور بحیثیت قیدی سرکار انگلشیہ اور ضبطی جائیداد کی سزا دی گئی۔

مفتی انتظام اللہ شہابی اکبر آبادی لکھتے ہیں: "۱۸۵۹ء میں سلطنت مغلیہ کی وفاداری یا فتوائے جہاد یا جرم بغاوت میں مولانا خود ہو کر پیتاپور سے لکھنؤ لائے گئے۔ مقدمہ چلا۔ مولانا موصوف کے فیصلے کے لئے جیوری بیٹھی۔ ایک اسیسر نے واقعات سن کر بالکل چھوڑنے کا فیصلہ کیا۔ سرکاری وکیل کے مقابل خود مولانا بحث کرتے تھے بلکہ لطف یہ تھا کہ چند الزامات خود اپنے اوپر قائم کیے اور پھر خود مدلل تار عنکبوت عقلی و قانونی اولہ سے توڑ دیے۔ جج یہ رنگ دیکھ کر پریشان تھا اور ان سے ہمدردی بھی تھی۔ کرے تو کیا کرے؟ ظاہر یہ ہو رہا تھا کہ مولانا بری ہو جائیں گے۔ سرکاری وکیل لاجواب تھے..... دوسرا دن آخری تھا۔ آپ نے اپنے اوپر جس قدر الزامات عائد کیے تھے ان کو ایک ایک کر کے رد کیا اور جس تجربہ نے فتویٰ کی خبر دی اس کے بیان کی توثیق و تصدیق کی اور فرمایا اس گواہ نے سچ کہا تھا۔ وہ فتویٰ صحیح ہے۔ میرا لکھا ہوا ہے اور آج اس وقت بھی میری وہی رائے ہے۔ چنانچہ اس کے بعد بے حد رنج کے ساتھ عدالت نے حبس دوام کا حکم سنایا۔ آپ نے مسرت سے منظور کیا۔ یہ جج آپ سے کام سیکھ چکا تھا۔[11]

مولانا شیروانی لکھتے ہیں: "بغاوت و سرکشی ۱۸۵۷ء میں شروع ہوئی۔ جوں ہی اس کی اطلاع ملی علامہ اہل خانہ کو الور چھوڑ کر دلی آ گئے اور سرگرمی سے بغاوت کی رہنمائی اور حکومت کے دستور العمل کی ترتیب شروع کر دی۔ جولائی میں جنرل بخت خاں کے دلی آنے پر فتوائے جہاد مرتب کر کے علماء کے دستخط کرائے۔ اسی دوران راجہ الور نے

سنگھ کی خبر ارتحال پر الور چلے گئے۔ تقریباً ایک ماہ میں واپس دہلی آ گئے۔ پھر ۱۵ ایم دہلی میں قیام کر کے الور آ گئے اور اپنے اہل وعیال کو لے کر اوائل ستمبر میں دہلی آ گئے۔ وسط ستمبر ۱۸۵۷ء میں دہلی پر انگریزوں کا مکمل قبضہ ہو گیا۔ ۱۲

- مولوی فضل حق کی اشتعال انگیزیوں سے متاثر ہو کر شہزادے بھی میدان میں نکل آئے اور سبزی منڈی کے پھل والے محاذ پر صف آرا ہیں۔ ۱۳
- مولوی فضل حق اپنے مواعظ سے عوام کو مسلسل بھڑکا رہے ہیں۔ ۱۴
- بادشاہ نے جنرل بخت خاں، مولوی سرفراز علی اور مولوی فضل حق پر مشتمل کنگ کونسل بنائی۔ ۱۵

ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر اپنی مشہور کتاب "ہمارے ہندوستانی مسلمان" میں علامہ فضل حق خیرآبادی کے صاحبزادے مولانا عبدالحق خیرآبادی (متوفی ۱۳۱۶ھ/۱۸۹۸ء) جو ایک زمانہ میں صدر المدرسین مدرسہ عالیہ کلکتہ تھے ان کے بارے میں لکھتا ہے: "موجودہ ہیڈ مولوی اس عالم دین کے صاحبزادے ہیں جن کو ۱۸۵۷ء کے غدر نے نمایاں کر دیا تھا اور جنہوں نے اپنے جرموں کا خمیازہ اس طرح بھگتا تھا کہ بحر ہند کے ایک جزیرہ میں تمام عمر کے لئے جلاوطن کر دیے جائیں۔ اس غدار عالم دین کا کتب خانہ جس کو حکومت نے ضبط کر لیا تھا اب کلکتہ کالج میں موجود ہے"۔ ۱۶

مولانا امداد صابری دہلوی لکھتے ہیں: "دہلی میں آزادی کی تحریک ۱۸۵۷ء میں شروع ہو چکی تھی۔ مولانا فضل حق کے ساتھیوں نے جہاد کا فتویٰ مرتب کیا۔ اس کی تائید وتصدیق مفتی صدرالدین آزردہ نے فرمائی۔ عمل مولانا امام بخش صہبائی نے کیا۔ نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ بھی پروگرام کے مطابق ولی داد خاں کے ساتھ بغاوت کی آگ لگانے میں مصروف ہو گئے۔ معرکے ہوئے۔ جنگی صلاحیت قوم میں نہیں تھی اس لئے شکست ہوئی"۔ ۱۷

مولانا سعید احمد اکبرآبادی فاضل دیوبند سابق صدر شعبہ دینیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ لکھتے ہیں: "اس وقت تمہارے سامنے فتویٰ کی جو نقل ہے اس پر دلی کے ۳۸ علماء ومشائخ کے دستخط ہیں۔ مولانا فضل حق خیرآبادی کے اس پر دستخط نہیں ہیں لیکن ان کا ایک الگ مستقل فتوائے جہاد تھا۔ اس فتویٰ کا ذکر ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کی اسلامی تاریخوں میں تفصیل کے ساتھ کیا گیا ہے۔

مولانا بلند پایہ عالم دین ہونے کے ساتھ رئیسانہ طور طریق زندگی رکھتے تھے لیکن اس کے باوجود ان کی ایمانی جرأت وجسارت اور دینی حمیت وغیرت کا یہ عالم تھا کہ انہوں نے ہر چیز سے بے نیاز ہو کر دلی کی جامع مسجد میں نماز جمعہ کے بعد جہاد کے واجب ہونے پر ایک نہایت ولولہ انگیز تقریر کی اور اس کے بعد جہاد کے ایک فتویٰ کا اعلان ہوا جس پر صدر الصدور مفتی صدرالدین خاں آزردہ، مولانا فیض احمد بدایونی، ڈاکٹر مولوی وزیر خاں اکبرآبادی اور

دوسرے علماء کے معتقد تھے"۔ [۱۸]

رئیس احمد جعفری ندوی لکھتے ہیں: "مولانا فضل حق خیرآبادی ایک یگانہ روزگار عالم تھے۔ عربی زبان کے مانے ہوئے ادیب اور شاعر تھے۔ علوم عقلی کے امام اور مجتہد تھے اور ان سب سے بالا ان کی یہ خصوصیت تھی کہ وہ بہت بڑے سیاست داں، مفکر اور مدبر بھی تھے۔ مسند درس پر بیٹھ کر وہ علوم وفنون کی تعلیم دیتے تھے اور ایوان حکومت میں بیٹھ کر وہ دور رس فیصلے کرتے تھے۔ وہ بہادر اور شجاع بھی تھے۔

غدر کے بعد نہ جانے کتنے سورما اور رزم آرا ایسے تھے جو گوشہ عافیت کی تلاش میں مارے مارے پھر رہے تھے۔ لیکن مولانا فضل حق ان لوگوں میں سے تھے جو اپنے کیے پر نادم اور پشیماں نہیں تھے۔ انہوں نے سوچ سمجھ کر میدان میں قدم رکھا تھا اور اپنے اقدام وعمل کے نتائج بھگتنے کے لئے حوصلہ مندی اور دلیری کے ساتھ تیار تھے۔ سراسیمگی دہشت اور خوف یہ ایسی چیزیں تھیں جن سے مولانا بالکل ناواقف تھے۔

مولانا کی شخصیت 'سیرت' کردار اور علم وفضل پر ضرورت تھی کہ ایک مفصل کتاب لکھی جاتی' لیکن وہ ایک زود فراموش قوم کے فرد تھے فراموش کر دیے گئے۔ کچھ دنوں کے بعد لوگ حیرت سے دریافت کریں گے کہ یہ کون بزرگ تھے؟" [۱۹]

تصانیف علامہ:

علامہ فضل حق خیرآبادی امام المنطقیۃ والکلام وقائد جنگ آزادی ہونے کے ساتھ بلند پایہ مصنف بھی ہیں۔ آپ کی تصانیف کی تعداد تقریباً دو درجن ہے۔ منطق وفلسفہ کے دقیق علمی مباحث پر آپ کی کئی ایسی تصانیف وحواشی ہیں جنہیں آج کے ہندوپاک میں بدقت تمام چند علماء ہی سمجھ پائیں گے۔ اکثر تصانیف غیر مطبوعہ ہیں۔

حکیم محمود احمد برکاتی لکھنوی (کراچی) لکھتے ہیں: "شاہ عبدالعزیز اور ان کے بھائیوں کے اختلاف وتخالف میں فکر ونظر کے اختلاف اور مذہب ومسلک کے تعدد نے دو گروہ پیدا کر دیے تھے۔ ایک گروہ جس کا سربراہ شاہ اسماعیل شہید تھا جو شخص معین کی تقلید کے وجوب کا منکر اور کسی حد تک محمد بن عبدالوہاب نجدی کا ہم نوا تھا اور دوسرا گروہ شاہ عبدالعزیز کے مسلک کا متبع متشیع پر مشتمل ومصر "حکم بالکفر والشرک" کے باب میں التباس تھا۔ مختصر یہ کہ جادۂ اعتدال سے منحرف نہیں ہوا تھا۔ شاہ محمد موسیٰ (فرزند شاہ رفیع الدین شاہ ولی اللہ محدث دہلوی) اس دوسرے گروہ کے حامی وناصر تھے۔

علامہ فضل حق خیرآبادی جو حزب عزیزی کے گویا قائد ومنتخب تھے شاہ اسماعیل کے متعدد انہ افکار ونظریات کے

رد میں سبقت کی اور "تحقیق الفتوی فی ابطال الطغوی" کے نام سے ایک مفصل رسالہ میں دلائل عقلی ونقلی کے ساتھ شاہ اسماعیل کا رد کیا تو اس کے آخر میں جن ولی اللہی اور عزیزی علماء وفضلاء کے دستخط تھے ان میں شاہ محمد موسیٰ بھی تھے۔ پھر یہ اختلاف ان دونوں گروہوں کو شاہ جہاں کی جامع مسجد میں منعقد ایک مجلس مناظرہ میں لے گیا تو اس میں بھی شاہ محمد موسیٰ سرگرم نظر آتے ہیں"۔ [۲]

"الثورۃ الھندیہ" (بانی ہندوستان) انقلاب آزادی کا ایک مستند ترین ماخذ ہے۔ اس کے کئی ایک مخلوطے مولانا آزاد لاہوری مسلم یونیورسٹی ہال گڑھ میں آج بھی موجود ہیں۔ اسے اور "تصدقة فتنة الهند" (مخطوط) کو علامہ فضل حق نے جزیرہ انڈمان (کالا پانی) سے ۱۲۷۴ھ/۱۸۶۰ء میں بذریعہ حضرت مفتی عنایت احمد کاکوروی (متوفی ۱۲۷۹ھ/۱۸۶۳ء) اپنے فرزند سعید شاگرد رشید مولانا عبدالحق خیرآبادی (متوفی ۱۲۹۹ھ/۱۸۹۸ء) کے پاس کوئلہ پنسل سے کپڑا وغیرہ پر لکھ کر بحفاظت تمام بھیجا تھا۔

ابوالکلام آزاد (متوفی ۱۹۵۸ء) کے والد ماجد حضرت مولانا خیرالدین دہلوی (متوفی ۱۳۳۷ھ/۱۹۰۸ء) علامہ فضل حق خیرآبادی کے اور خود مولانا آزاد مولانا نظیر الحسن اینصوی تلمیذ مولانا عبدالحق خیرآبادی کے شاگرد تھے۔ ابوالکلام آزاد بانی ہندوستان مرتبہ عبدالشاہد شیروانی کے پہلے ایڈیشن کے تعارف میں لکھتے ہیں: "والد مرحوم نے معقولات کی تکمیل مولانا مرحوم سے کی تھی اس لئے ان کی مصنفات اور حالات سے خاص علاقہ رکھتے تھے۔ مولانا کے فرزند مولانا عبدالحق مرحوم نے یہ رسالہ خود اپنے قلم سے نقل کر کے والد مرحوم کو بمکہ معظمہ بھیجا تھا۔ چنانچہ وہ میرے کتب خانہ میں موجود ہے۔ مولوی عبدالشاہد صاحب شیروانی نے جب مجھ سے اس رسالہ کی تلخیص واشاعت کے ارادہ کا ذکر کیا تو مجھے نہایت خوشی ہوئی"۔ [۳]

معروف تلامذہ:

علامہ فضل حق خیرآبادی کے چند مشہور شاگردوں کے نام یہ ہیں: ● مولانا عبدالقادر بدایونی (متوفی ۱۳۱۹ھ/۱۹۰۱ء) ● مولانا ہدایت اللہ رام پوری ثم جون پوری (متوفی ۱۳۲۲ھ/۱۹۰۸ء) ● مولانا فیض الحسن سہارن پوری (متوفی ۱۳۰۴ھ/۱۸۸۷ء) ● مولانا سید عبداللہ بلگرامی (متوفی ۱۳۰۵ھ/۱۸۸۸ء) ● مولانا ہدایت علی بریلوی (متوفی ۱۳۲۲ھ/۱۹۰۴ء) ● مولانا عبدالعلی رام پوری (متوفی ۱۳۰۳ھ/۱۸۸۶ء) ● مولانا نور احمد بدایونی (متوفی ۱۳۰۱ھ/۱۸۸۴ء) ● مولانا نور الحسن کاندھلوی (متوفی ۱۲۸۵ھ/۱۸۶۸ء) ● مولانا غلام قادر گوپاموی اور مولانا قلندر علی زبیری وغیرہم۔

WWW.NAFSEISLAM.COM

مولانا عبدالعلی رام پوری تلمیذ علامہ فضل حق خیرآبادی سے فقیہ اسلام مولانا احمد رضا خاں بریلوی (متوفی ۱۳۴۰ھ/۱۹۲۱ء) نے علم ہیئت کی تعلیم حاصل کی تھی۔ مولانا عبدالحق خیرآبادی فرزند علامہ فضل حق خیرآبادی کے ایک معروف شاگرد مولانا حکیم سید برکات احمد ٹونکی (متوفی ۱۳۲۷ھ/۱۹۲۸ء) تھے۔ مولانا ہدایت اللہ جون پوری تلمیذ علامہ فضل حق خیرآبادی کے شاگرد رشید مولانا امجد علی اعظمی (متوفی ۱۳۶۷ھ/۱۹۴۸ء) و مولانا یار محمد بندیالوی (متوفی ۱۳۶۷ھ/۱۹۴۷ء) و مولانا سید سلیمان اشرف بہاری ثم علی گڑھی (متوفی ۱۳۵۸ھ/۱۹۳۹ء) تھے۔ مؤخرالذکر دونوں حضرات (مولانا ٹونکی و مولانا جون پوری) کے ذریعہ خیرآبادی سلسلہ تعلیم کو کافی فروغ حاصل ہوا۔

علامہ کے صاحبزادے:

علامہ فضل حق خیرآبادی کے صاحبزادے مولانا عبدالحق خیرآبادی کے بارے میں رئیس احمد جعفری ندوی لکھتے ہیں: "مولانا عبدالحق خیرآبادی اپنے علم و فضل اور منطق و فلسفہ میں بے نظیر قابلیت اور مہارت کے باعث سارے ہندوستان میں بلند ترین منصب پر فائز تھے۔ انہوں نے اپنی زندگی سے یہ ثابت کر دیا کہ دولت علم کے مقابلے میں دولت دنیا ہیچ ہے۔

مولانا عبدالحق مولانا فضل حق کے فرزند اکبر تھے۔ ۱۸۲۸ء/۱۲۴۴ھ میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ والد سے تحصیل علم کی۔ سولہ سال کی عمر میں سند فضیلت حاصل کر کے درس و تدریس میں مشغول ہو گئے۔ کچھ دنوں ٹونک میں رہے پھر نواب کلب علی خاں نے رام پور بلا لیا اور اپنے پوتے حامد علی خاں کا اتالیق مقرر کیا۔ ۱۸۶۵ء/۱۲۸۱ھ سے ۱۸۸۶ء/۱۳۰۳ھ تک یعنی نواب کلب علی خاں کی تمام مدت حکومت تک رام پور میں رہے۔ نواب صاحب کے انتقال کے بعد کلکتہ گئے۔ وہاں حاکم مرافعہ اور مدرسہ عالیہ کلکتہ کے افسر رہے۔ شمس العلماء کا خطاب پایا۔ وہاں سے ۱۸۹۶ء/۱۳۱۴ھ میں نواب حامد علی خاں نے رام پور بلا لیا اور خود تلمذ اختیار کیا۔ یہاں سے بیمار ہو کر وطن خیرآباد گئے اور ۱۸۹۸ء میں انتقال ہوا۔ مولانا عبدالحق خیرآبادی اپنے زمانہ کے امام فلسفہ تھے۔ آپ کے شاگردوں میں متعدد مور علماء نکلے۔ مولانا نے چالیس کے قریب کتابیں تصنیف کیں"۔ [۲۲]

انڈمان میں شب و روز:

مفتی انتظام اللہ شہابی اکبرآبادی لکھتے ہیں: "مولانا (فضل حق خیرآبادی) انڈمان پہنچے۔ استاذنا محمد عمر انصاری بخاری اکبرآبادی اپنے استاذ کی زبانی کہتے تھے کہ مولانا کو خدمت ذلیل درجہ کی دی گئی تھی۔ جیل سپرنٹنڈنٹ ایک شریف انگریز تھا۔ مشرقی علوم سے واقف اور فن ہیئت کا ماہر تھا۔ اس کی پیشی میں ایک سزا یافتہ مولوی بھی تھے۔ اپنی

تصنیف کردہ کتاب ہیئت جوفاری میں تھی وہ ان کو دی کہ عبارت صحیح و درست کر دیں۔ مولوی صاحب سے تو کام نہیں چلا۔ علامہ (فضل حق) نے نئے گئے تھے۔ ایک ہی سال گذرا تھا۔ ان کو وہ کتاب دی اور کہا کہ مولانا! آپ اس کو درست کر دیں۔ چنانچہ علامہ نے اس کی عبارت درست کی اور معلومات میں بہت کچھ اضافہ کر دیا اور حاشیہ میں کثیر التعداد کتب کے حوالے لکھے۔ جب یہ کتاب مولوی صاحب سپرنٹنڈنٹ کے پاس لے گئے تو وہ اسے دیکھ کر حیران و ششدر رہ گیا اور اس نے کہا مولوی صاحب! تم بڑے لائق آدمی ہے مگر جن کتابوں کے حوالے دیے ہیں اور ان کی عبارتیں نقل کی ہیں یہ کہاں ہیں؟

مولوی صاحب مسکرائے اور اصل واقعہ علامہ کا سنایا۔ وہ اسی وقت مولوی صاحب کو لے کر بیرک میں آیا۔ علامہ تھے نہیں۔ کچھ انتظار کے بعد دیکھا کہ تو کرا بغل میں دبائے چلے آرہے ہیں۔ وہ یہ دیکھ کر آنکھوں میں آنسو بھر لایا اور معذرت کی اور گلے کی میں لے لیا اور گورنمنٹ میں ان کی سفارش کی۔

فرزند گرامی مولانا عبدالحق کی وصیت و خواہش:

مولانا عبدالحق خیرآبادی فرزند علامہ فضل حق خیرآبادی کے بارے میں مولانا عبدالشاہد شیروانی لکھتے ہیں: مولانا نے آخر وصیت بھی فرمائی کہ جب انگریز ہندوستان سے چلے جائیں تو میری قبر پر خبر کر دی جائے۔ چنانچہ ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو رفیق محترم مولوی سید نجم الحسن صاحب رضوی خیرآبادی نے مولانا (عبدالحق) کے مدفن (درگاہ مخدومیہ خیرآباد ضلع سیتاپور/اودھ) پر ایک جم غفیر کے ساتھ حاضر ہو کر میلاد شریف کے بعد قبر پر فاتحہ خوانی کی اور اس طرح پورے پچاس سال کے بعد انگریزی سلطنت کے خاتمہ کی خبر سنا کر وصیت پوری کی۔ جزاہ اللہ خیر الجزا [۲۳۱]

حوالہ جات

۱۔ باغی ہندوستان از عبدالشاہد شیروانی، ص: ۱۳۱

۲۔ آب حیات، محمد حسین آزاد

۳۔ باغی ہندوستان، ص: ۱۲۸

۴۔ باغی ہندوستان، ص: ۱۵۷

۵۔ ایضاً، ص: ۱۶۲۔۱۶۳

۶۔ روزنامچہ منشی جیون لال، ص: ۲۱۷۔۲۳۰۔۲۳۶۔۲۳۷

۷۔ باغی ہندوستان، ص: ۲۱۴

۸۔ تاریخ عروج عہد انگلشیہ از ذکاء اللہ دہلوی، بحوالہ باغی ہندوستان، ص: ۲۱۵

۹۔ غدر کی صبح وشام، ص: ۲۲۰

۱۰۔ اردوئے معلی علی گڑھ، دسمبر ۱۹۰۷ء، ص: ۳۲

۱۱۔ غدر کے چند علماء، ص: ۳۷۔۳۸

۱۲۔ باغی ہندوستان از عبدالشاہد شیروانی، ص: ۲۶

۱۳۔ اخبار دہلی رپورٹ تراب علی

۱۴۔ اخبار دہلی رپورٹ چنی لال

۱۵۔ دہلی گزیٹ ریویلیشن آف ۱۸۵۷ء، ص: ۱۲۸، ۱۸۳

۱۶۔ ہمارے ہندوستانی مسلمان، ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر، ص: ۲۰۲۔۲۰۳

۱۷۔ داستان شرف، امداد صابری، ص: ۹

۱۸۔ ہندوستان کی شرعی حیثیت، سعید احمد اکبرآبادی، ص: ۴۲

۱۹۔ بہادر شاہ ظفر اور ان کا عہد، رئیس احمد جعفری ندوی، ص: ۸۵۳

۲۰۔ شاہ ولی اللہ اور ان کے اصحاب، ص: ۱۸۵۔۱۸۶

۲۱۔ باغی ہندوستان، ص: ۲۳

۲۲۔ بہادر شاہ ظفر اور ان کا عہد، ص: ۵۵۳

۲۳۔ مقدمہ زبدۃ التکلمہ، عبدالشاہد شیروانی، ص: ۱۲

Nafse Islam
نفس اسلام
WWW.NAFSEISLAM.COM

یارب العلمین حل جلالہ یارحمۃ للعلمین صلی اللہ علیہ وسلم

خیرآباد کا لعل شب چراغ اور اس کی حویلی

سید رئیس احمد جعفری

سید رئیس احمد جعفری ندوی (1912ء۔1968ء) پاک و ہند کے نامور صحافی، مؤرخ اور ادیب گزرے ہیں۔ علی برادران کے زیر شفقت رہ کر موصوف نے تحریک خلافت سے لے کر تحریک پاکستان تک پُر جوش کردار ادا کیا اور شہرت عام حاصل کی۔

مولانا فضل حق خیرآبادی یگانہ خصوصیات و ملکات اور فضائل و حسنات کے جامع تھے۔ وہ عربی زبان کے بلند پایہ اور صاحب طرز انشاء پرداز و شاعر تھے۔ منطق اور فلسفہ کے امام تھے۔ دولت و ثروت ان کے قدم چومتی تھی اور شہرت پیچھے پیچھے چلتی تھی۔ وہ صاحب دل بھی تھے اور صاحب دماغ بھی۔ اہل قلم بھی تھے اور اہل سیف بھی۔ اعزاز اور منصب کو ان کی ذات پر فخر تھا۔ دولت اور امارت ان کے گھر کی لونڈی تھی۔ بہادر شاہ ظفر اور واجد علی شاہ اختر کے عہد گرامی گھر میں وہ دربار اور ایوان کی زینت بھی بنے لیکن علم و فن سے انھیں جو لگاؤ تھا وہ بدستور قائم رہا۔ ان کی اصل جگہ ایوان حکومت میں نہ تھی بلکہ مجلس علم میں تھی۔ ان کے پایۂ فضل و کمال کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ان کی لکھی ہوئی کتابیں مدارس عربیہ کے نصاب میں گزشتہ ایک سو برس سے شامل ہیں جن کی قدر و قیمت اور افادیت و معنویت آج بھی اپنی جگہ قائم ہے۔

مولانا فضل حق کا وطن مالوف اودھ کا ایک مردم خیز قصبہ خیرآباد تھا۔ خیرآباد کی یہ چھوٹی سی بستی علماء، صلحاء، اصفیاء و صوفیاء، شعراء و ادباء، فضلائے روزگار اور حکمائے ذی وقار کا مولد و منشاء رہی ہے۔ مولانا فضل حق بھی اسی دودمان کے لعل شب چراغ تھے۔

1857ء کی تحریک آزادی عام طور پر غدر کے نام سے مشہور ہے لیکن درحقیقت یہ بہت بڑی انقلابی تحریک تھی۔ اگر کامیاب ہو جاتی تو آج ہندوستان کی تاریخ کچھ اور ہوتی۔ اس تحریک میں مولانا نے بھی حصہ لیا، ماخوذ ہوئے اور حاکم مجاز کے سامنے پیش ہوئے۔ بچاؤ کی بہت سی صورتیں تھیں، وسائل و ذرائع بھی تھے اور سعی و سفارش کے

امکانات بھی تھے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ جس انگریز کی عدالت میں مقدمہ پیش تھا وہ مولانا کی شخصیت سے بے حد متاثر تھا اور اس پر تیار تھا کہ اگر مولانا جرم سے انکار کر دیں تو وہ کاغذات داخل دفتر کر کے پروانہ رہائی صادر کر دے گا۔ مولانا اس پر تیار نہ ہوئے اور انہوں نے فرمایا کہ رہائی حاصل کر کے توشہ آخرت سے محروم ہونا مجھے گوارا نہیں۔ اس جواب کے بعد رہائی کا سوال ہی نہ تھا۔ ساری املاک وجائیداد ضبط کر لی گئی اور حبس دوام بہ عبور دریا شور کے تعزیر کا فرمان صادر ہو گیا۔ مولانا اظہر یمان بھیج دیے گئے اور املاک وجائیداد سرکاری تحویل میں آ گئی۔ اظہر یمان کے دوران اسیری ہی میں مولانا کے خادم حقیقت رقم نے "النشرۃ الہندیہ" کے نام سے وہ مونتی نیچے جو عربی ادب کی تاریخ میں زندہ جاوید بن چکے ہیں۔

خیرآباد میں مولانا نے ایک نہایت شاندار اور رفیع المنزلت حویلی تعمیر کرائی تھی۔ یہ سنگ سرخ کی ایک مستحکم اور خوشنما عمارت تھی۔ بہت بڑا پھاٹک جس میں سے بیک وقت دو ہاتھی گزر سکتے تھے۔ آگے بڑھیے تو وسیع دالان خوبصورت فوارہ، دائیں بائیں خوشنما باغ۔ آمنے سنگ مرمر کی ایک نہایت سبک اور نظر فریب بارہ دری۔ ان سرحلوں کو طے کر کے آگے بڑھیے تو زنان خانہ اپنی وسعت اور کشادگی میں ایک چھوٹا سا محل۔ اندر باہر بائیں باغ۔ اس حویلی کو دیکھنے سے اندازہ ہوتا تھا کہ یہ کسی امیر کبیر کا گھر ہے اور بات بھی ایسی ہی تھی۔ مولانا جہاں بہت بڑے عالم تھے وہاں تجارت وکاروبار سے بھی پوری دلچسپی رکھتے تھے۔ سرسید نے آثار الصنادید کے پہلے ایڈیشن میں ایسے والہانہ طرز پر مولانا کا ذکر کیا ہے کہ معلوم ہوتا ہے جہانگیر کے دربار میں عرفی اپنا قصیدہ پڑھ رہا ہے۔

مولانا کی حویلی جس محلہ میں واقع تھی یہ ارباب شریعت اور اصحاب طریقت کا مسکن تھا۔ چند قدم کے فاصلہ پر حضرت بڑے مخدوم صاحب کا مزار پر انوار ہے۔ حویلی سے کھارے کنویں کی طرف بڑھیے تو ذرا سی مسافت پر محمد آخر کے صوفی صافی متبحر یہاں کا آستانہ ہے۔

میں نے شعور کی آنکھیں کھولیں اس وقت سب حویلی دیکھی تھی اس کی حیثیت ایک دیرانہ سے زیادہ نہ تھی۔ حبس دوام کے بعد حکومت نے صلہ وفا کے طور پر اسے ایک غیر مسلم تعلق دار راجہ صاحب کمال پور کو بخش دیا۔

اس حویلی میں واقعی سرقندو بخارا کا علم آ کر جمع ہو گیا تھا۔ یہ حویلی جو آج ایک ویرانہ نظر آ رہی تھی کبھی علم وفضل کا مرکز تھی۔ یہاں سے علم کے سوتے پھوٹتے تھے۔ یہاں علم کی روشنی سے تاریکی دور ہو جاتی تھی۔ دور سے دور مختلف دیار واطراف سے تشنگان علم آتے تھے اور سیراب ہو کر جاتے تھے۔ یہ حویلی نہ تھی علم کا سرچشمہ تھا۔

بہر کجا بود بیشۂ شیریں
مردم و مرغ و مرگرد آنجا

اب یہ حویلی ایک ہندو تعلق دار کی ملکیت تھی۔ جسے اس کے رکھ رکھاؤ سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ جس کے نزدیک یہ صرف خاک کا ایک ڈھیر تھی۔ جس کے پتھر قیمتی تھے لیکن ان پتھروں سے بھی بالکل بے نیاز جو قدم قدم پر بکھرے ہوئے تھے کوئی قیمت نہ رکھتے تھے کسی اہمیت کے حامل نہ تھے۔ کبھی یہاں روم و شام، شیراز و اصفہان، ماوراء النہر اور ترکستان کے طالبانِ علم جوق در جوق سموں اور سوج آیا کرتے تھے۔

یہاں کے نام ور حکمت و معرفت کی صداؤں سے گونجا کرتے تھے۔ یہ سخن چمن کل کدہ نہ تھا بلکہ خیابانِ علم و فن تھا۔ یہ بارہ دری جس پر آمدے، یہ کمرے، یہ ایوان، یہ دالان، یہ در و دیوار سے جہاں اصحابِ فضل و کمال کے قافلے اترا کرتے تھے۔ جہاں ارباب فن دست بستہ سر کے بل حاضر ہوتے تھے۔ جہاں وقت کے امراء اور حکام سر جھکا کر آستان بوسی کیا کرتے تھے۔ جہاں علم کا دریا بہتا تھا۔ حکمت کی گرہ کشائیاں ہوتی تھیں اور اجتہاد و تحقیق کے مرحلے طے ہوتے تھے۔ اب وہاں ویرانی تھی سناٹا تھا اور سکوت مرگ تھا۔ باقی کا لے پانی بھیج دیا گیا اور وہیں عالم قید میں سفرِ آخرت کر گیا۔ اس کی اولاد ادھر ادھر بکھر گئی اور اس کا مکان عالیشان ویران بن گیا۔

گلشن میں بولے دم ساز نہیں آتی
اڑنے کو ہے ہنا تا آواز نہیں آتی

پھر کمال پور کے راجہ سورج بخش سنگھ کو اپنے محل کی توسیع کی ضرورت محسوس ہوئی۔ تعلق دار ہونے کے باوجود آدمی خوبرس تھے۔ بے ساختہ ان کی نظر مولانا کی حویلی پر گئی۔ اس حویلی کے پتھر یہاں کی کھڑکیاں، کاغذی اینٹیں اب بھی کام آسکتی تھیں لہٰذا یہ سب چیزیں اٹھا اٹھا کر محلِ سرا پر بھیجی جانے لگیں۔ ان میں یہ حویلی بھی تھی۔ غرض اس طرح صادر ہوا اور مولانا فضلِ حق کی حویلی کدالوں اور پھاوڑوں کی زد میں آگئی۔ یہ جہت اتری وہ دیوار گری یہ بھانک اکھڑا۔ ایک محل ڈھے گیا اور دوسرا محل تعمیر ہو گیا۔

مسلمانوں پر بے حسی طاری تھی۔ کسی نے صدائے احتجاج بھی بلند نہ کی ورنہ آسانی سے یہ سمٹے ہوئی کونسل میں اٹھایا جا سکتا تھا اور محلِ آثار قدیمہ کو مجبور کیا جا سکتا تھا کہ اپنی تحویل میں لے کر اس کی نگہبانی کا فریضہ انجام دے۔

دسمبر 1946ء میں آخری مرتبہ میرا خیر آباد جانا ہوا تو اس وقت تک اس حویلی کے کچھ کچھ آثار اور نقوش باقی تھے۔ کم از کم یہ اندازہ ضرور ہوتا تھا کہ یہ ویرانہ کبھی رشکِ چمن رہ چکا تھا۔ مٹی مٹی ہی سہی ایک یادگار باقی تھی لیکن

زمانہ کی گردش اسے بھی نہ دیکھ سکی۔ اب وہ اکھڑے اکھڑے اور مٹے مٹے سے نشان باقی نہیں رہ گئے تھے۔

نومبر 1960ء میں ایک مرتبہ پھر خیرآباد جانے کا جی چاہا۔ بمبئی، دہلی، لکھنؤ اور خیرآباد کے لیے ایک ایک ہفتہ رکھا تھا۔ پروگرام کے مطابق سب سے آخر میں خیرآباد کا نمبر آیا۔ لکھنؤ سے صبح نو بجے روانہ ہوا اور گیارہ بجے پہنچ گیا۔ اپنے عزیز اور دوست سید منجم الحسن صاحب کے یہاں مہمان بنا۔ تھوڑی دیر وہاں بیٹھ کر اپنے خاندانی قبرستان (جزیرہ میں) فاتحہ پڑھنے گیا۔ وہاں سے مولانا فضل حق کی حویلی کی طرف گیا لیکن اب وہاں خاک اڑ رہی تھی۔ جیسے صدیوں سے یہ مقام وحشت بیاباں کا ایک حصہ چلا آرہا ہے۔ سامنے حضرت مخدوم صاحب کی درسگاہ کا گنبد نظر آرہا تھا۔ وہیں سے کھڑے کھڑے فاتحہ پڑھ کر واپس چلا آیا۔ طبیعت اتنی بے کل ہوئی کہ پھر ایک لمحہ بھی ٹھہرنے کا جی نہ چاہا۔ الفاس خیراں اسٹیشن پہنچا اور لکھنؤ واپس آگیا۔ چھوٹے ویرانے سے بڑے ویرانے میں۔ ہا! یہ ہے دنیا!

مٹے نامیوں کے نشاں کیسے کیسے
زمیں کھا گئی انساں کیسے کیسے

(ماخوذ از: نام ور راج سے رام راج تک، مطبوعہ لاہور اکیڈمی سرکلر روڈ لاہور، ص: 193 تا 197)

شیخ محمد اسماعیل پانی پتی

مولانا فضل حق خیر آبادی رحمۃ اللہ علیہ

یہ نہایت ہی فاضل اجل اور عالم بے بدل بزرگ تھے۔ اپنے زمانہ میں کوئی شخص بھی فضل و کمال، ادبی حیثیت اور علمی فضیلت میں ان کے برابر نہ تھا۔ حضرت شاہ عبد القادر محدث دہلوی کے شاگرد اور مولانا فیض الحسن (سہارنپوری) جیسے یگانۂ روزگار فاضل کے استاذ ہیں۔ عربی ادب اور شعر میں اپنا جواب نہ رکھتے تھے۔ حافظہ کی قوت اور ذہن کی جودت کا یہ حال تھا کہ صرف 14 برس کی عمر میں تمام علوم مروجہ میں فارغ التحصیل ہو گئے۔

ان کے علم و فضل کا یہ حال تھا کہ ایک مرتبہ بہت مشکل زمین میں ایک طویل عربی قصیدہ تصنیف کر کے حضرت شاہ عبد العزیز کو سنایا۔ حضرت شاہ صاحب نے ایک مقام پر کچھ اعتراض کیا۔ مولانا نے بڑی روانی کے ساتھ فوراً عربی اساتذہ کے بیس اشعار اپنے شعر کی تائید میں سنا دیے۔ حضرت شاہ صاحب کو یہی کہتے بنی کہ "برخوردار مجھے سمجھوا"۔

حضرت مولانا فضل امام جیسے زبردست فاضل اور ادیب کے فرزند تھے۔ 1797ء میں خیر آباد میں پیدا ہوئے۔ مفتی صدر الدین آزردہ صدر الصدور دہلی ان کے ہم سبق اور مولانا امام بخش صہبائی، حکیم مومن خاں مومن، اسد اللہ خاں غالب، نواب ضیاء الدین رخشاں اور ابراہیم ذوق جیسے باکمال ادیب اور شاعر ان کے گہرے دوست تھے۔ فن شعر میں فرقتی اور آزرو تخلص کرتے تھے۔ چار ہزار صفحات سے زیادہ یادگار چھوڑے۔ دہلی، جھجر، سہارن پور، ٹونک، رام پور میں مختلف اوقات میں مختلف ملازمتیں کیں پھر صدر الصدور ہو کر لکھنؤ چلے گئے۔

جب 1857ء کا ہنگامہ عظیم دہلی میں رونما ہوا تو فوراً دہلی پہنچے اور جہاد کا فتویٰ دیا۔ جنرل بخت خاں کمانڈر انچیف افواج ظفر سے ملے اور اس کی بڑی اعانت اور امداد کی۔ مگر جب دہلی کی تسخیر ہو گئی اور بہادر شاہ ظفر گرفتار ہو گئے تو یہ مایوس ہو کر واپس چلے آئے۔ انگریزوں کی نظر میں ان کی ایک ایک حرکت تھی۔ سیتا پور سے گرفتار ہو کر آئے اور لکھنؤ میں ان پر مقدمہ قائم ہوا۔ نہایت بے باکی اور صفائی کے ساتھ بغیر ذرہ برابر ہچکچاہٹ اور تذبذب کے اقرار کیا کہ ہاں میں نے ہی جہاد کا فتویٰ لکھا اور اس پر دستخط کیے اور جو کچھ میں نے کیا اپنے خیال میں ٹھیک کیا۔ مجسٹریٹ نے جس دوام حبسِ دریائے شور کی سزا دی اور اس پیکر علم و فضل کو انڈمان کی سنگلاخ گھاٹیوں میں لے جا

کر قید کر دیا۔ نہایت ذلیل خدمتیں ان کے سپرد کیں اور ستانے اور دق کرنے میں کوئی کسر باقی نہ چھوڑی۔ یہاں تک کہ 19 اگست 1861ء کو مولانا کا طائر روح قفس عنصری سے پرواز کر گیا اور وہ عدیم النظیر انسان جو اپنے علم وفضل کے لحاظ سے ہندوستان کے علماء کا سرتاج تھا وطن سے دور غریب الوطنی کی حالت میں اپنے آخری سانس پورے کر کے بڑی حسرت کے ساتھ دنیا سے رخصت ہو گیا۔

﴿شکریہ ہفت روزہ "لیل ونہار لاہور" جنگ آزادی نمبر 1857ء 12 مئی 1957ء ص: 28﴾

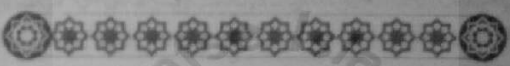

بسم اللہ الرحمن الرحیم

توکلت علی اللہ

مولانا فضل حق خیرآبادی

مفتی انتظام اللہ شہابی

انتظام اللہ شہابی 1892ء کو آگرہ میں پیدا ہوئے۔ آپ سلسلۂ علمائے فرنگی محل اور مدرسہ خیرآباد سے وابستہ تھے۔ تقریباً 129 کتابیں آپ کی یادگار ہیں۔ پہلی کتاب "دواعی اسلام" اور آخری کتاب "سخنان اکبرآباد" تھی۔ موصوف نے جنگ آزادی 1857ء میں علمائے ہند کے حصے کو اپنے مطالعہ کا موضوع بنایا۔ آپ کی کتابوں میں مولانا فضل حق وعبدالحق خیرآبادی "غدر کے چند علماء" ایسٹ انڈیا کمپنی اور باغی علماء اور علمائے حق کی مظلومیت کی داستانیں اہم ہیں۔ اکثر محققین کے نزدیک موصوف کی کتاب "غدر کے چند علماء" کے اکثر مندرجات غیر معتبر اور من گھڑت ہیں۔ آپ کا انتقال 8 دسمبر 1968ء کو ہوا۔

مولانا فضل حق مخلص فرنگی خیرآبادی کے والد مولانا فضل امام بن شیخ ارشد بہ لحاظ نسب فاروقی تھے۔ فضل وکمال کے ساتھ منطق وفلسفہ میں تبحر حاصل تھا۔ دلی میں صدر الصدور کے فرائض انجام دیتے تھے مگر اس کے ساتھ باپ دادا کا طریقہ بھی جاری تھا۔ نجفی طلباء کو بالخصوص علوم معقول کا درس دیتے۔ "مرقات" اور "حاشیہ قاضی المبین" آپ کی یادگار ہیں۔ 1240ھ/1824ء میں انتقال کیا۔

1212ھ/1797ء میں علامہ فضل حق پیدا ہوئے۔ باپ سے احمد علوم وفنون کی تحصیل کی۔ سند حدیث مولانا عبدالقادر دہلوی سے حاصل کی۔ 14 سال کی عمر میں فارغ التحصیل ہو گئے اور باپ کے حلقۂ درس دینے لگے۔

اکبر شاہ ثانی کا زمانہ تھا۔ دلی میں ریذیڈنٹ رہا کرتا تھا۔ اس کے محکمے میں سررشتہ دار ہو گئے۔ ابوظفر ولی عہد بہادر سے دوستانہ مراسم تھے۔ قلعہ میں آتے جاتے۔ دلی وہ دلی تھی کہ ایک طرف حدیث وفقہ کا دور دورہ تو دوسری طرف منطق وفلسفہ کی گرم بازاری مشعر وسخن کے گلی کوچہ میں چرچے بڑے بڑے یکتائے منطق شاعر موجود۔ ان کے ہم سبق مفتی صدر الدین خاں آزردہ دوستوں میں مولوی امام بخش صہبائی علامہ عبداللہ خاں علوی حکیم مومن خاں مومن نواب مرزا اسداللہ خاں غالب نواب ضیاء الدین خان نیر شیخ محمد ابراہیم ذوق حکیم آغا جان عیش

حافظ عبدالرحمٰن احسان، میر حسین تسکین سے باکمال لوگ تھے۔ شام کو مولانا کے یہاں نشست رہا کرتی تھی۔
حافظ عبدالرحمٰن احسان، میر حسین تسکین سے باکمال لوگ تھے۔ شام کو مولانا کے یہاں نشست رہا کرتی تھی۔

علامہ ایک حکیمانہ دماغ لے کے آئے تھے۔ قوم میں اضمحلال آنکھوں سے دیکھنے میں آیا۔ اکبر شاہ ثانی کا عہد دیکھا، بہادر شاہ کا زمانہ پایا، حکومت کے معزز عہدوں پر سرفراز رہے۔ شاہ امیر علی امیٹھوی، ہنومان گڑھی کے مہنتوں کی سرکوبی کو آمادہ ہوئے اور ان کے خلاف علم جہاد کر کے نواب اودھ کی فوج کے ہاتھوں جام شہادت نوش کیا۔ یہ واقعہ تازیانہ عبرت تھا۔ ادھر دلاور جنگ مولوی احمد اللہ شاہ مراسی آگرہ سے لکھنؤ آئے تو آپس میں ملے چلے۔ رنگ کچھ اور ہی ہو گیا۔ دلاور جنگ فیض آباد گئے، یہ اور چلے گئے۔ ایک سال بعد ہنگامہ 1273ھ رونما ہوا۔ مولانا (فضل حق) دہلی آئے فتویٰ لکھا۔ جنرل بخت خاں سے ملے مگر سب تدبیریں الٹی پڑیں۔ وہاں سے دلمن چلے آئے۔ بادشاہ دہلی سے رنگون روانہ کیے گئے۔

1859ء میں سلطنت مغلیہ کی وفاداری یا فتویٰ جہاد کی پاداش یا جرم بغاوت میں مولانا ماخوذ ہو کر سیتا پور سے لکھنؤ لائے گئے۔ مقدمہ چلا، مولانا موصوف کے فیصلہ کے لیے جیوری بیٹھی۔ ایک اسیسر نے واقعات سن کر بالکل چھوڑنے کا فیصلہ کیا۔ سرکاری وکیل کے مقابل مولانا خود بحث کرتے تھے بلکہ لطف یہ تھا کہ چند الزام اپنے اوپر خود قائم کیے اور پھر خود ہی مثل تار عنکبوت عقلی و قانونی ادلہ سے توڑ دیے۔ جج یہ رنگ دیکھ کر پریشان تھا اور ان سے ہمدردی بھی تھی۔ کرے تو کیا کرے؟ ظاہر یہ ہو رہا تھا کہ مولانا بری ہو جائیں گے۔ سرکاری وکیل لاجواب تھے۔

دوسرا دن آخری دن تھا۔ آپ نے اپنے اوپر جس قدر الزام کیے تھے ان کو ایک ایک کر کے رد کیا اور جس مخبر نے فتویٰ کی خبر دی اس کے بیان کی توثیق و تصدیق کی اور فرمایا پہلے اس گواہ نے سچ کہا تھا اور رپورٹ بالکل صحیح لکھوائی تھی۔ اب عدالت میں میری صورت دیکھ کر مرعوب سا ہو گیا اور جھوٹ بولا۔ وہ فتویٰ صحیح ہے، میرا لکھا ہوا ہے اور آج اس وقت بھی میری وہی رائے ہے۔ چنانچہ اس کے بعد بھی بے حد زور کے ساتھ عدالت نے حبس دوام کا حکم سنایا۔ آپ نے مسرت سے منظور کیا۔ الحمد ان بھیج دیے گئے۔ استاد مولانا محمد عمر انصاری بخاری اکبر آبادی اپنے استاد کی زبانی کہتے تھے کہ مولانا کو خدمت ذلیل درجہ کی دی گئی تھی۔

جیل کا سپرنٹنڈنٹ ایک شریف انگریز تھا۔ مشرقی علوم سے واقف اور فن ہیئت کا ماہر تھا۔ اس کی پیشی میں ایک مرزا یاقوت مولوی سعید الرحمان بھی تھے اور اپنی تصنیف کردہ کتاب ہیئت کی جو فارسی میں تھی وہ ان کو دی کہ عبارت صحیح درست کر دیں۔ مولوی صاحب سے تو کام چلا نہیں۔ علامہ نے نئے لکھ دیے تھے۔ ایک سال ہی گزرا تھا۔ ان کی

وہ کتاب دی اور کہا مولانا! آپ اس کو درست کر دیں۔ چنانچہ علامہ نے اس کی عبارت درست کی اور معلومات میں بہت کچھ اضافہ کر دیا اور حاشیہ میں کثیر التعداد کتب کے حوالے لکھے۔ جب یہ کتاب مولوی صاحب (مولوی سعید الرحمان) سپرنٹنڈنٹ کے پاس لے گئے وہ دیکھ کر حیران و ششدر رہ گیا اور اس نے کہا مولوی صاحب! تم بڑا لائق آدمی ہے مگر جن کتابوں کے حوالہ ہیں اور ان کی عبارتیں جو نقل ہیں یہاں کہاں ہیں؟ مولوی صاحب مسکرائے اور اصل واقعہ علامہ کا کہہ سنایا۔ وہ اسی وقت مولوی صاحب کو لے کر بارک میں آیا۔ علامہ تھے نہیں کچھ انتظار کے بعد ٹوکرا بغل میں دبائے چلے آرہے تھے۔ وہ یہ حیثیت دیکھ کر آنکھوں میں آنسو بھر لایا اور معذرت کی اور کلرکی میں لے لیا اور گورنمنٹ میں ان کی سفارش کی۔

ادھر علامہ کے صاحبزادہ مولوی شمس الحق دہلوی اور علامہ کے قریبی عزیز خان بہادر مفتی انعام اللہ کو پامسوی کے داماد منشی خواجہ غلام غوث سرگرم سعی تھے۔ بروایۃ آزادی حاصل کیا اور مولوی شمس الحق اندمان روانہ ہو گئے۔ وہاں جہاز سے اترے شہر میں گئے تو ایک جنازہ نظر پڑا۔ اس کے ساتھ بڑا اژدہام تھا۔ انہوں نے پوچھا تو معلوم ہوا کہ کل 12 صفر المظفر 1278ھ/1861ء کو علامہ کا انتقال ہو گیا۔ اب سپرد خاک کرنے جا رہے ہیں۔ یہ بھی ہمراہ ہو گئے اور بعد دفن و فاتحہ وطن بصد حسرت و یاس لوٹے۔

چند عربی شعر قصیدہ نعتیہ سے نقل ہیں

هو اول الانبياء آخرهم به ختم نبوة وابتدء الابداء

وہ پہلا نبی اور آخر انبیاء ہے۔ اس پر تمام ہوئی نبوت اور اس سے شروع ہوئی۔

فدحصه الباري باوصاف علي لم يعطها الاحداث والقدما

خاص کیا اللہ تعالیٰ نے ساتھ بڑے وصفوں کے۔ کہ نہیں دیے وہ اوصاف پچھلوں اور اگلوں کو

تصانیف میں شرح تہذیب الکلام، تحقیق حقیقۃ الاجسام، حاشیہ قاضی مبارک، حاشیہ افق المبین، حاشیہ تلخیص الشفاء، ہدیہ سعیدیہ فی الحکمت الطبعیہ، روض الموجودی تحقیق الوجود، رسالہ مبحث قاطیغوریاس، رسالہ تحقیق علم و معلوم، رسالہ غدریہ اور ان کے علاوہ کتب اور قصائد عربی شمار میں 100 سے زائد ہیں۔

﴿تلخیص: مشاہیر جنگ آزادی از مفتی انتظام اللہ شہابی، طبع کراچی 1957ء، ص: 77 تا 91﴾

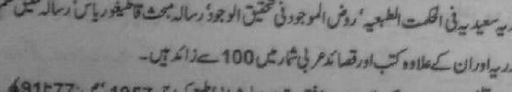

سید مصطفیٰ علی بریلوی

علامہ فضل حق خیرآبادی رحمۃ اللہ علیہ

مولانا فضل حق خیرآبادی کے والد مولانا فضل امام خیرآباد کے ممتاز علماء میں شمار کیے جاتے تھے۔ مولوی فضل حق نے ابتدائی تعلیم اپنے والد اور ان کے جلد شاہ عبدالقادر محدث دہلوی اور حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی جیسے اصحاب دانش سے حاصل کی۔ وہ اعلیٰ علمی سرگرمیوں میں مشغول رہے۔ طالب علموں سے آپ کو خصوصی لگاؤ تھا۔ بعض اوقات بر سر عدالت مقدمات کی سماعت کے دوران بھی ضرورت مند طلباء کو سبق دیتے جاتے تھے۔

مولوی فضل امام کی وفات کے بعد فضل حق کی عمر 28 سال تھی اور اکبر شاہ ثانی کا زمانہ تھا۔ دہلی میں انگریز ریذیڈنٹ مقرر ہو چکا تھا۔ مولوی فضل حق اس کے محکمہ میں سررشتہ دار کے عہدے پر متعین ہوئے جو اس وقت بہت بڑی بات تھی۔ کچھ عرصہ بعد آپ کا تبادلہ ریذیڈنسی کمشنری میں کر دیا گیا۔ یہ وہ دور تھا جب انگریزوں کی قوت دن بدن بڑھ رہی تھی اور وہ کسی بڑی ہستی کو خاطر میں نہ لاتے تھے۔ علامہ فضل حق جیسی خوددار شخصیت اس کیفیت کو کس طرح گوارا کر سکتی تھی۔ اس لیے انہوں نے استعفیٰ دے دیا۔ نواب فیض محمد خاں والی جھجر نے پانچ سو روپے ماہوار کی پیش کش کی۔ آپ نے یہ تجویز منظور کر لی اور دہلی سے جھجر روانہ ہوئے۔

اس زمانہ میں لوگ ایک نظم سے دوسرے شعبہ میں جانا باعث ذلت تصور کرتے تھے۔ اس لیے دہلی کے تمام ہی اہل علم کو صدمہ ہوا۔ ولی عہد سلطنت ابوظفر محمد سراج الدین نظر نے اپنا ملبوس دو شال آبدیدہ ہو کر اوڑھا دیا۔ مرزا غالب بھی مولوی صاحب کی جدائی سے پریشان تھے جس کا اظہار ان کی اکثر تحریروں میں ملتا ہے۔ مولوی فضل حق ایک عرصہ تک دربار جھجر سے وابستہ رہنے کے بعد مہاراجہ الور سے وابستہ ہو گئے تھے پھر محکمہ عدالت سے منسلک ہو گئے۔ ریاست رامپور کے مشہور عالم دوست نواب کلب علی خاں آپ ہی کے شاگرد تھے۔ دربار رام پور اور مرزا غالب کے تعلقات مولوی فضل حق ہی کے توسط سے قائم ہوئے۔ 1848ء میں مولوی صاحب لکھنؤ پہنچے اور "حضور تحصیل" کے مہتمم قرار پائے۔ "حضور تحصیل" مملکت اودھ کی خصوصی اصلاح کے لیے قائم کی گئی تھی۔

1857ء کی جنگ آزادی کے سلسلہ میں جب علمائے دہلی نے فتویٰ جہاد جاری کیا تو مولانا فضل حق نے بھی دستخط فرمائے۔ لکھنؤ میں آپ کے خلاف مقدمہ کی سماعت ہوئی۔ دوران مقدمہ آپ نے حیرت انگیز صبر و استقلال، زور خطابت اور دلیری کا مظاہرہ کیا۔ آپ نے اپنی وکالت خود فرمائی۔ پہلے اپنے اوپر فرضی الزامات عائد کیے جو سرکاری فہرست سے کہیں سخت تھے اور پھر ایک ایک کر کے جانداد استدلال سے انہیں رد کر دیا۔ آخر میں فتویٰ جہاد پر دستخط کرنے کے جرم کا بڑی دلیری اور جرأت کے ساتھ اقرار کر کے خود عاکم عدالت کو حیرانی میں ڈال دیا' جو چاہتا تھا کہ مولانا کسی نہ کسی بنیاد پر انکار کر دیں تو وہ ان کو آزاد کر دے۔ بحث کے دوران سرکاری وکیل اور انگریز ناجواب ہو کر رہ گئے۔ بالآخر جس دوام بحبوحہ کالے عشر سزا سنائی گئی۔

"صدق جدید" لکھنؤ کے مدیر مولانا عبدالماجد دریا آبادی کے دادا مفتی منفعت کریم اور مفتی عنایت احمد کاکوروی صدر امین بریلی نیز اور بہت سے علماء فضلاء پہلے سے کالے پانی میں موجود تھے۔ انگریزوں نے ان یگانۂ عصر شخصیتوں کو ذلیل و خوار کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ ان سے مٹی ڈھوائی' مل چلوائے' عام مزدوری کا کام لیا لیکن وہ ان کی ذہانت کو مجروح کرنے میں قطعاً کامیاب ہے۔

اس زمانہ میں ایک انگریز جو سپرنٹنڈنٹ جیل تھا کسی حد تک علمی آدمی تھا۔ وہ مشرقی علوم اور فن ہیئت میں خصوصی دلچسپی رکھتا تھا۔ اس نے اپنی ایک فارسی کتاب ایک اور مولوی صاحب کو جو اس کی پیشی میں تھے درست کرنے کو دی لیکن وہ کامیاب نہ ہو سکے۔ جب یہ کتاب مولوی فضل حق کے پیر دیوئی تو انہوں نے بالکل درست کر دی نیز کچھ مفید اضافے بھی کیے۔ جن کے ثبوت میں حاشیہ میں کتابوں کے حوالے بھی لکھ دیے۔ سپرنٹنڈنٹ مولوی صاحب کی زبردست یادداشت اور قابلیت کو دیکھ کر ششدر رہ گیا اور کہنے لگا "تم بڑا لائق آدمی ہے"۔ اس نے از راہ مہربانی مولوی صاحب کو مزدوری سے مستثنیٰ کر دیا اور "کلرکی" کا کام اور ساتھ ہی ساتھ گورنمنٹ میں ان کی رہائی کی سفارش لکھ دی۔ دوسری طرف مولانا کے لائق صاحبزادہ مولانا عبدالحق وخلیفہ غلام غوث میر منشی لیفٹیننٹ گورنر مغربی و شمالی صوبہ اودھ (یوپی) ان کی رہائی کے سلسلہ میں کوشاں تھے۔

رہائی کا پروانہ لے کر سعادت مند بیٹا خود انڈمان پہنچا۔ ساحل پر قدم رکھتے ہی ایک جنازہ پر نظر پڑی جس کے ساتھ مخلوق خدا ٹوٹی پڑتی تھی۔ اتنا عظیم اژدہام دیکھ کر مولانا عبدالحق نے دریافت کیا کہ کس کا انتقال ہو گیا ہے؟ جواب ملا کہ مولوی فضل حق خیرآبادی مجاہد جنگ آزادی عالم باعمل اس جہان فانی سے کوچ کر گئے۔ صاحبزادے نے آسمان کی طرف منہ کر کے دل کو تھام لیا اور جنازہ میں خود بھی شریک ہو گئے۔

جامعۃ الازہر میں
حضرت علامہ محمد فضل حق خیرآبادی
کی علمی وادبی شخصیت پر دو اہم مقالات

مولانا ڈاکٹر ممتاز احمد سدیدی

ڈاکٹر ممتاز احمد سدیدی 8 دسمبر 1966ء کو لاہور میں پیدا ہوئے۔ آپ کا تعارف کئی حوالوں سے کروایا جاسکتا ہے لیکن سب سے معتبر حوالہ یہ ہے کہ موصوف اہلسنت وجماعت کی معروف شخصیت استاذ العلماء شیخ القرآن والحدیث حضرت علامہ محمد عبدالحکیم شرف قادری علیہ الرحمۃ کے فرزند ارجمند، تلمیذ رشید اور تربیت یافتہ ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے جامعہ نظامیہ رضویہ لاہور سے تعلیم حاصل کی اور تعظیم المدارس کے لیے امام احمد رضا اور دیوبندیت کے عنوان پر مقالہ تحریر کیا۔ بعدازاں انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی اسلام آباد سے ایم اے عربی اور معروف وقدیم الازہر یونیورسٹی قاہرہ مصر سے امام احمد رضا خاں بریلوی کی عربی شاعری پر ایک وقیع مقالہ لکھ کر ایم فل کیا۔ جامعہ ازہر سے ہی مجاہد کبیر تحریک آزادی علامہ فضل حق خیرآبادی کی عربی شاعری پر ایک وقیع مقالہ تصنیف کر کے ڈاکٹریٹ (پی ایچ ڈی) کی ڈگری حاصل کی۔

تقریباً دو سال آپ جامعہ نظامیہ رضویہ لاہور اور پھر ماہ جامعہ نعیمیہ لاہور میں مدرس رہے۔ اس وقت آپ فیصل آباد یونیورسٹی میں اسسٹنٹ پروفیسر کے عہدے پر تعینات ہیں۔

ڈاکٹر صاحب کا تقریباً 500 صفحات کا حال ہی میں پی ایچ ڈی مقالہ تاہنوز اشاعت کا منتظر ہے۔ کاش کوئی ادارہ اس کمپوز شدہ مقالے کی اشاعت کا اہتمام کرے تاکہ مجاہد کبیر علامہ فضل حق خیرآبادی علیہ الرحمۃ سے عرب دنیا کو متعارف کروائے۔

عالم اسلام کی قدیم ترین اور عظیم درسگاہ جامعۃ الازہر میں مدتوں سے دنیا بھر کے مسلمان طلبہ علم وآگہی اور شعور حاصل کرنے آتے ہیں اور علم وحکمت کے روشن چراغ لے کر اپنے اپنے ملکوں کو لوٹ جاتے ہیں۔ جہاں ان چراغوں سے مزید چراغ جلنے کا ایک لامتناہی سلسلہ چل پڑتا ہے۔ اس وقت الازہر یونیورسٹی کو علم کا نور بانٹتے ہزار سال سے زیادہ عرصہ ہو گیا ہے اور اس وقت بھی وہاں 90 سے زیادہ ممالک کے طلبہ وطالبات زیر تعلیم ہیں۔ غالباً

خاتم خدا اور رفیع رسول ﷺ کے بعد الازہر یونیورسٹی امت مسلمہ کا سب سے بڑا مرجع ہے۔ حرمین شریفین کی سر زمین اللہ رب العزت کی عبادت کے تناظر میں دنیا بھر کے مسلمانوں کے لیے جاذب قلب و نظر ہے جبکہ الازہر یونیورسٹی علمی گہرائی، فکری اعتدال اور وسعت نظری کے متقاضی طلب کی آرزوؤں کا مرکز ہے۔ میرے ناقص علم کے مطابق شاید ہی کسی اسلامی ملک میں اتنے کثیر ممالک کے طلبہ تعلیم پاتے ہوں گے اللہ تبارک وتعالیٰ عالم اسلام کے اس عظیم علمی مرکز کو اپنی حفاظت میں رکھے اور یہاں سے علم، حکمت اور فکر ونظر کی روشنی دنیا بھر سے تاریکیوں کو مٹاتی رہے۔

الازہر یونیورسٹی میں زیر تعلیم طلباء جب ایم اے یا پی ایچ ڈی کے لیے مقالہ لکھنے کے مرحلے میں پہنچتے ہیں تو بعض اوقات اپنے ممالک کی نمایاں شخصیات اور ان کی علمی و فکری خدمات کے حوالے سے موضوع کا انتخاب کرتے ہیں اور الازہر کے اساتذہ ان موضوعات کا کھلے دل سے جائزہ لینے کے بعد معیاری موضوعات سونپ دیتے ہیں اور یوں الازہر یونیورسٹی میں مختلف اسلامی ممالک کے طلبہ اپنے اپنے ملک کی نمایاں شخصیات کو متعارف کرواتے ہیں۔ الازہر یونیورسٹی کی فیکلٹی آف اصول الدین اور فیکلٹی آف عربک لینڈ اسلامک سٹڈیز کے عقیدہ ڈپارٹمنٹ میں آج بھی منطق اور فلسفہ کو بڑے اہتمام سے پڑھایا جاتا ہے۔ بلکہ قارئین کرام کو یہ جان کر خوشگوار حیرت ہوگی کہ الازہر یونیورسٹی کے زیر انتظام چلنے والے الازہر سکولز میں بھی منطق پڑھائی جاتی ہے۔ بہر حال میں یہ کہنے جا رہا تھا کہ ہمارے محترم دوست ڈاکٹر حافظ عبدالواحد صاحب (فاضل دار العلوم محمدیہ غوثیہ بھیرہ شریف) نے عقیدہ و فلسفہ میں پی ایچ ڈی کے لیے علم الکلام میں علامہ فضل حق خیر آبادی کی آراء کو بطور موضوع اختیار کیا اور درج ذیل موضوع پیش کیا: ﴿العلامہ فضل الحق الخیر آبادی و آراؤہ الکلامیۃ﴾

ڈپارٹمنٹ آف عقیدہ کے بورڈ آف سٹڈیز نے مقالے کا خاکہ دیکھ کر اس موضوع اور خاکے کو منظور کر لیا نیز الازہر یونیورسٹی کے ایک انتہائی کبار اساتذہ پروفیسر ڈاکٹر عوض اللہ حجازی کو مقالے کا نگران مقرر کیا۔ یاد رہے کہ ڈاکٹر عوض اللہ "منطق، فلسفہ اور علم الکلام میں کئی کتب کے مولف ہیں اور ان علوم میں حجت سمجھے جاتے ہیں۔ نیز الازہر یونیورسٹی میں رئیس الجامعہ کے منصب پر فائز رہے ہیں۔ اس مقالے کی رجسٹریشن 17 نومبر 1998ء میں ہوئی اور 267 صفحات پر مشتمل اس مقالے کا وائیوا 6 اپریل 2003ء کو ہوا۔ پروفیسر ڈاکٹر عوض اللہ حجازی (نگران) جبکہ ڈاکٹر علی سعید فرغلی (بیرون ممتحن) اور ڈاکٹر عبدالمجید عزالعرب (ڈپارٹمنٹ سے ممتحن) مقرر ہوئے تھے۔ وائیوا کمیٹی نے طویل مناقشہ (Viva) کے بعد مقالہ نگار کو مرتبۃ الشرف الاولیٰ (Grade First class with honour) کے ساتھ فلسفہ اور علم الکلام میں پی ایچ ڈی کی ڈگری عطا کرنے کا اعلان کیا۔

وائیوا کے دوران دونوں محققین حضرات نے کئی امور کی نشاندہی کی، بعض باتوں کی وضاحت طلب کی اور بعض باتوں کی درستی فرمائی۔ وائیوا کے آغاز میں ڈاکٹر عوض اللہ حجازی نے مقالے کا تعارف کرواتے ہوئے کہا: ''یہ مقالہ تیرھویں صدی ہجری میں ہندوستان میں پیدا ہونے والے ایک ایسے عجمی مفکر اور محقق کے بارے میں ہے جس نے اسلام کا دفاع کیا اور انگریز سے جنگ کا اعلان کیا، اس لیے انگریزوں نے اسے ملک بدر کر دیا۔ اس کے نتیجہ میں اسلام کا یہ سپاہی تیرھویں صدی ہجری (1268ھ) میں وطن سے دور اللہ کو پیارا ہو گیا۔ یہ مفکر عربی النسل ہے لیکن پیدائش اور نشوونما کے لحاظ سے ہندوستانی اور عجمی اللسان ہے۔ انہوں نے عقیدہ اور فلسفہ میں ضخیم کتب یادگار چھوڑیں لیکن انہیں کوئی ایسا شخص نہ ملا جو اُن کے عظیم علمی ورثے کو (عرب دنیا میں) متعارف کروائے۔ حافظ عبدالواحد نے اُن کے علمی ورثے کو متعارف کروانے کے لیے علم الکلام میں ان کی آراء پر اپنا پی ایچ ڈی کا مقالہ لکھا ہے''۔

وائیوا کے دوران پہلے محققین ڈاکٹر عبدالحمید عزالعرب نے مقالے کی خوبیوں کو سراہتے ہوئے بعض امور کی اصطلاح فرمائی۔ اُن کے بعد دوسرے محققین ڈاکٹر علی معبد فرفلی نے مقالے کا تنقیدی جائزہ لینے کے بعد علامہ فضل حق خیرآبادی کے بارے میں کہا: ''علامہ فضل حق خیرآبادی فلسفہ سے بڑھ کر علم کلام کے ماہر تھے، بے شک انہوں نے فلسفہ کے حوالے سے اپنی آراء دی ہیں لیکن یہ دقیق النظر شخص پہلے علم الکلام کا ماہر ہے پھر فلسفی ہے۔ مقالے کا عنوان یوں ہونا چاہیے تھا: ﴿العلامه فضل الحق الخير آبادى مفكرا وناقداً﴾

ڈاکٹر علی معبد فرفلی کی مندرجہ بالا دونوں باتوں سے پتہ چلتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب کو علامہ فضل حق خیرآبادی کا علمی ورثہ نہ صرف پسند آیا ہے بلکہ ان کے معیار پر بھی پورا اُترا ہے، لہٰذا ضرورت اس بات کی ہے کہ نہ صرف اس مقالے کو کتابی صورت میں شائع کیا جائے بلکہ علامہ خیرآبادی کی مطبوعہ اور مخطوطہ مؤلفات کو مائیکروسوفٹ ورڈ (Micro soft word) میں کمپوز کروا کر شائع بھی کیا جائے تاکہ علم منطق، فلسفہ اور کلام کے ماہر عرب محققین ان علمی تحقیقات کے مطالعہ سے لطف اندوز ہو سکیں۔

علامہ فضل حق خیرآبادی پر الازہر یونیورسٹی میں لکھا جانے والا دوسرا مقالہ علامہ فضل حق خیرآبادی کی عربی شاعری پر لکھا گیا اور اللہ تبارک وتعالیٰ کے فضل وکرم اور توفیق سے راقم الحروف (ممتاز احمد سدیدی) کو علامہ خیرآبادی کی عربی شاعری کا تجزیہ اور تنقیدی مطالعہ کرنے کا موقع ملا۔ اس مقالے کی رجسٹریشن 1998ء میں ہوئی اور پروفیسر ڈاکٹر محمد السعدی فرھود کو مقالے کا نگران مقرر کیا گیا۔ واضح رہے کہ ڈاکٹر صاحب جامعۃ الازہر میں رئیس الجامعہ کے منصب پر فائز رہے اس کے علاوہ انہیں مصر کے علمی وادبی حلقوں میں عربی ادب کے معدودے چند اساتذہ

میں شمار کیا جاتا تھا۔ فاضل موصوف رجسٹریشن کے تقریباً ایک سال بعد اپنے رب کی بارگاہ میں حاضر ہو گئے۔ اس کے بعد مقالے کی نگرانی ڈاکٹر محمد عرفہ المغربی اور ڈاکٹر رزق مرسی ابوالعباس کے سپرد کر دی گئی۔ راقم الحروف نے اگست 2003ء میں اپنا مقالہ مکمل کر کے جمع کروا دیا تھا لیکن چند ناگزیر وجوہات کی بنا پر وائیوا میں تاخیر ہوتی چلی گئی اور بالآخر انتظار کی گھڑیاں ختم ہوئیں اور 16 فروری 2004ء کے دن مناقشہ ہوا۔ وائیوا کمیٹی نے تقریباً تین گھنٹے مناقشہ کرنے کے بعد مقالہ نگار کو عربی ادب میں مرتبہ الشرف الاولیٰ Grade first class with honour کے ساتھ پی ایچ ڈی کی ڈگری عطا کیے جانے کا اعلان کیا۔ وائیوا کمیٹی میں شامل چار افراد کے نام درج ذیل ہیں:

1. ڈاکٹر عرفہ المغربی (سینئر نگران)
2. ڈاکٹر رزق مرسی ابوالعباس (نگران)
3. ڈاکٹر علی علی صبح (بیرونی ممتحن)
4. ڈاکٹر عبداللطیف حسن (اندرونی ممتحن)

مناقشہ کے دوران پروفیسر ڈاکٹر علی علی صبح نے علامہ فضل حق خیرآبادی کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے فرمایا:

"مقالہ نگار نے علامہ محمد فضل حق خیرآبادی کی زندگی اور شاعری کا تجزیاتی اور تنقیدی جائزہ لے کر مجھے بہت مسرت سے ہمکنار کیا ہے؛ کیوں؟ اس لیے کہ میرے علم کے مطابق مشرق بعید کے ہاتھوں سے عرصہ دراز سے عربی زبان کی باگ دوڑ چھوٹ چکی ہے۔ ان حالات میں اگر کوئی عالم شاعر یا اسلامی مفکر عربی زبان کو بہ حیثیت ہتھیار کے طور پر استعمال کرے تو میں سمجھتا ہوں کہ مشرق بعید کے لوگ عربی زبان کو جو کلہ لکھتے یا بولتے ہیں وہ ایسا بم یا میزائل ہے جو دنیا بھر میں اسلام دشمنوں کے بغض و عناد کو پارہ پارہ کر دیتا ہے۔ اس لیے ان ممالک میں لکھی یا بولی جانے والی عربی (نظم و نثر) کی قیمت عرب ملک میں شاعری کرنے والے عظیم شاعر احمد شوقی کی عربی سے زیادہ ہے"۔

جیسے علامہ فضل حق خیرآبادی کا منطق، فلسفہ اور علم الکلام میں چھوڑا ہوا علمی ورثہ علمائے ازہر کو پسند آیا تھا اسی طرح علامہ کی عربی شاعری کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھا اور اس مقالہ کو مرتبۃ الشرف الاولیٰ Excelent grade with first class honour کے ساتھ عربی ادب میں پی ایچ ڈی کی ڈگری عطا کیے جانے کا اعلان کیا۔ علامہ خیرآبادی نے اکثر اصناف سخن مثلاً غزل، مدح، ہجاء، اخاء اور حکمت وغیرہ میں کامیابی سے طبع آزمائی کی ہے لیکن اللہ تعالیٰ اور اس کے حبیب ﷺ کی محبت ان کی شاعری کا مرکزی خیال تھا۔

اس مقالے پر کئی اہل علم حضرات نے اپنی تقریظات کی صورت میں تاثرات کا اظہار فرمایا۔ پروفیسر ڈاکٹر مجید السعید (سابق رئیس الجامعۃ الجامعۃ الاسلامیہ بغداد) نے اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا: "ہمارے ادیب علامہ محمد فضل حق کی شاعری ظاہر میں مارتے جذبات سے معمور تھی اور وہ اپنے تجربات اور کیفیات کو تعبیر کرتے وقت سچائی سے آراستہ تھے۔ ان کی شاعری ان کے تجربات، دینی، وطنی اور انسانی احساسات کی انتہائی باریک بینی سے تعبیر تھی"۔

اس مقالے پر ڈاکٹر مجید السعید کے علاوہ ڈاکٹر محمد عزۃ المغربی ڈاکٹر رزق مرسی ابوالعباس، ڈاکٹر رجب سالم رفاعی، ڈاکٹر حسین محب مصری اور ڈاکٹر طارق کرلیہ (سابق رئیس الجامعۃ الازہر یونیورسٹی) نے تقریظات تحریر کی ہیں اور اس مقالے کا بھی مقدر عام پر آنا اور زیور طبع سے آراستہ ہونا انتہائی اہمیت کا حامل ہے اور یقیناً عرب دنیا کے شاعر اور ادیب حضرات اس عظیم اسلامی مفکر اور عربی النسل شاعر علامہ فضل حق خیرآبادی کی عربی شاعری سے محظوظ ہوں گے۔

بات طویل ہوگئی۔ وائیوا کے روز مقالہ نگار کو ایک طرف تو اس بات کی خوشی تھی کہ آج اس کی محنت کا پھل ملنے والا ہے تو دوسری طرف اسے یہ خوشی بھی نصیب ہوئی کہ اس کے عظیم والد اور استاذ حضرت علامہ محمد عبدالحکیم شرف قادری بھی وائیوا کے سامعین کے درمیان بہ نفس نفیس تشریف فرما تھے۔ مصری مقالہ نگار تو وائیوا کے موقع پر اپنے والدین اور عزیز واقارب کو دعوت دیتے ہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم اور اس کے انعام کی ان گھڑیوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھیں لیکن کسی غیر ملکی طالب علم کو میرے علم کے مطابق یہ سعادت شاید ہی میسر آتی ہو کہ انعام اور خوشی کی ان گھڑیوں میں اس کا والد دور دراز کا سفر طے کر کے شامل ہوا ہو۔

آج کا دن اس اعتبار سے بھی تاریخی تھا کہ آج رب کریم نے اپنے ایک متوکل بندے کے وعدے کی لاج رکھ لی تھی "درس نظامی کی تعلیم کے دوران ایک مرتبہ مجھے شیطانی وسوسوں کے تحت شدت سے خیال ہوا کہ میں درس نظامی کو چھوڑ کر اسکول میں داخلہ لوں اور پھر کالج اور یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کروں۔ میں نے جب یہ بات حضرت والد گرامی کے سامنے رکھی تو وہ ایک لمحہ کے لیے سکتے میں آگئے کیونکہ مجھ سے پہلے میرے ایک چچا اور ایک کزن دینی تعلیم حاصل کرتے کرتے اچانک ہی دینی تعلیم کو خیرباد کہہ چکے تھے۔ حضرت والد گرامی چند لمحوں میں سنبھل گئے اور مجھے فرمانے لگے" درس نظامی کی تکمیل کرلو پھر اگر انٹرمیڈیٹ اسلامک یونیورسٹی میں پڑھنا چاہو گے تو تمہیں وہاں سے تعلیم دلوادوں گا اور اگر الازہر یونیورسٹی جانا چاہو گے تو وہاں بھی بھجوادوں گا"۔ میرے ذہن میں یہ خیال ابھرا کہ والد صاحب اتنے اخراجات کیسے برداشت کریں گے؟ لیکن پھر ان کے اخلاص کی برکت سے میرے دل میں ایک دوسرے عزم نے سر اٹھایا تب میں نے فیصلہ کیا کہ حضرت والد صاحب مجھے اسلامک یونیورسٹی اور الازہر یونیورسٹی

میں تعلیم دلا سکیں یا ان کے لیے ایسا کرنا ممکن نہ ہو لیکن ان کی دلی خواہش تو پوری کروں۔ اسی وقت میں نے حضرت والد صاحب کے سامنے ان کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے درس نظامی کی تکمیل کا وعدہ کر لیا اور بفضل اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان کے وعدے کی ایسی لاج رکھی کہ میں نے انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی سے پانچ سال میں ایم اے عربی کیا اور بعد میں الازہر یونیورسٹی سے آٹھ سال کے عرصے میں ایم فل اور پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ الازہر کے سکالرشپ کے سلسلے میں میرے اور حضرت والد گرامی کے استاذ مفتی اعظم پاکستان حضرت علامہ مفتی محمد عبدالقیوم ہزاروی رحمۃ اللہ علیہ کا بہت اہم کردار ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ انہیں کروٹ کروٹ جنت نصیب فرمائے اور ان کے درجات بلند فرمائے۔ بہر حال مجھے خوشی تھی کہ حضرت والد کے خواب کی تعبیر نصیب ہوئی اور اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان کے وعدے کی لاج اس شان سے رکھی کہ وہ انعام اور لطف وکرم کے ان لمحات کا مشاہدہ کرنے کے لیے بہ نفس نفیس خود بھی سامعین کے درمیان تشریف فرما تھے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ حضرت مفتی صاحب، حضرت والد صاحب اور ہمارے اس دوست کو جزائے خیر عطا فرمائے جس نے حضرت والد صاحب کی مصر آمد ورفت کے اخراجات برداشت کیے۔

علامہ فضل حق خیرآبادی کا ذریعہ نظر "الشہاب ثاقب"

شمس العلماء مولانا

عبدالحق خیرآبادی

مرتبہ و مقدمہ فرحان علی رضوی

پیدائش و بچپن:

مولانا عبدالحق خیرآبادی 1244ھ/29-1828ء کو ہندوستان کے معروف علمی گھرانے کے چشم و چراغ علامہ فضل حق خیرآبادی علیہ الرحمۃ کے ہاں دہلی میں پیدا ہوئے۔[1] اس وقت دہلی کے افق پر مولانا رشید الدین، مولانا شاہ اسحاق دہلوی، مفتی صدرالدین آزردہ، مرزا اسداللہ غالب، مولانا امام بخش صہبائی اور حکیم مومن خان مومن جیسے اصحاب علم و فضل اور کمال کا ڈنکا بج رہا تھا۔ اگر ان تمام حضرات کو ستاروں سے تشبیہ دی جائے تو مولانا عبدالحق خیرآبادی کے والد گرامی علامہ فضل حق خیرآبادی چاند کی مانند ہوں گے۔ ان تمام حضرات کو علامہ فضل حق خیرآبادی سے بہت قرب حاصل تھا اسی وجہ سے مولانا عبدالحق کو بچپن و لڑکپن میں ہی ان تمام اصحاب کی شفقت و محبت سمیٹنے کا بھرپور موقع ملا۔

حصول تعلیم:

مولانا عبدالحق خیرآبادی نے دینی تعلیم اپنے والد گرامی یگانۂ روزگار عالم دین علامہ فضل حق خیرآبادی سے حاصل کی اور صرف 16 سال کی عمر میں تعلیم سے فارغ ہوئے اور علمی مسائل پر مجتہدانہ گفتگو کی بصیرت و صلاحیت کی حامل۔

الور کے عمائد سلطنت:

علامہ فضل حق جن دنوں ریاست الور سے منسلک تھے مولانا عبدالحق اپنے والد گرامی کے ساتھ دربار ریاست میں جاتے تھے۔ مہاراجہ الور، مولانا عبدالحق کی علمی گفتگو سے بہت متاثر تھا۔ جب علامہ فضل حق رامپور چلے گئے تو مہاراجہ الور نے انہیں عمائدین سلطنت میں شامل کرلیا۔

1857ء میں خدمات:

جنگ آزادی 1857ء کے وقت مولانا عبدالحق دہلی میں مقیم تھے۔ جب علامہ فضل حق فتویٰ جہاد پر دستخط

کرنے کے "جرم" میں گرفتار ہوئے تو مولانا عبدالحق نے ان کی رہائی کے لیے قانونی چارہ جوئی کی تاہم اس کے باوجود علامہ فضل حق کو بطور سزا "انڈمان" بھیج دیا گیا۔ مولانا عبدالحق نے بعد میں بھی اپنی کوششیں جاری رکھیں تاوقتیکہ حکومت انگلستان کی طرف سے پروانہ رہائی جاری ہوا۔ جب مولانا عبدالحق مع مولانا شمس الحق اور دیگر احباب اس رہائی کے آرڈر کو لے کر انڈمان پہنچے تو تمام امیدوں پر پانی ہی پھر گیا۔ سامنے والد گرامی کے جسد کو نماز جنازہ اور تدفین کے لیے لوگوں کا ہجوم لے جا رہا تھا۔ مولانا عبدالحق بھی شکستہ دل کے ساتھ اس مجمعے میں شامل ہو گئے۔

زندگی کے شب و روز:

مولانا عبدالحق کچھ عرصہ نواب ٹونک کے ہاں مقیم رہے پھر گورنمنٹ نے مدرسہ عالیہ کلکتہ کے لیے ان کی خدمات حاصل کیں مگر کلکتہ کی آب و ہوا انہیں راس نہ آئی چنانچہ نواب کلب علی خاں کے اصرار پر رامپور تشریف لے گئے اور رامپور میں 1864ء تا 1883ء تک حاکم مرافعہ اور پرنسپل مدرسہ عالیہ کے عہدوں پر فائز رہے۔ بہ حقیقت رامپور کے ضمیمے میں مولوی محمد ضیاء الحق نے ان کا عہدہ ملازمت "ڈائریکٹر تعلیمات شرقی" لکھا ہے۔ [3]

نواب کلب علی خاں کی وفات کے بعد آپ واپس خیرآباد آ گئے اور کچھ عرصہ کے لیے حیدرآباد تشریف لے گئے۔ بعد میں نواب حامد علی خاں کی فرمائش پر دوبارہ رامپور چلے گئے اور ایک سال قیام کے بعد مستقل طور پر خیرآباد آ گئے اور آخر وقت تک یہیں مقیم رہے۔

طرزِ زندگی و بود و باش:

مولانا عبدالحق کی زندگی کا بڑا حصہ نوابوں کے درباروں میں اہم عہدوں پر فائز رہتے ہوئے گزرا ہے۔ اسی لیے ان کی طرزِ زندگی و بود و باش رئیسانہ تھی۔ مولانا خوش خوراک اور خوش پوشاک تھے غالباً اسی وجہ سے دن میں دو تین بار کپڑے بدلتے تھے۔ آپ پورے رعب داب اور رئیسانہ طرز پر آمد و رفت کرتے تھے۔ ان تمام آسائشوں کے باوجود آپ بہت رحمدل، بردبار اور مہربان شخصیت کے حامل تھے۔

شمس العلماء کا خطاب:

حالات کی ستم ظریفی ملاحظہ فرمائیں کہ مولانا عبدالحق کے والد گرامی قدر علامہ فضل حق کو حکومتِ انگلستان نے ہندوستان سے بہت دور قید رکھا اور ہر طرح کا ظلم روا کیا جبکہ انہیں کی حقیقی و علمی جانشین مولانا عبدالحق کو 16 فروری 1887ء کو "شمس العلماء" کا خطاب دیا۔ یہ خطاب درحقیقت مولانا کی عالی شان شخصیت کے سامنے کچھ حیثیت

نہیں رکھتا تھا لیکن اس کے باوجود مولانا نے اس خطاب سے کبھی کوئی مادی فائدہ حاصل نہیں کیا۔ حتیٰ کہ آپ نے 1857ء میں ضبط کی گئی اپنی آبائی جائیداد کی واپسی کے لیے بھی کوئی چارہ جوئی نہ کی۔ اس خطاب کے ملنے پر آپ فرماتے تھے کہ باپ کو انڈمان میں مارا اور بیٹے کو "شمس العلماء" کے خطاب سے خوش کرنے کی کوشش کی۔

تصنیفات:

مولانا عبدالحق خیرآبادی سے درج ذیل کتابیں یادگار ہیں۔

❶ حاشیہ غلام یحییٰ	❷ شرح ہدایت الحکمت
❸ تسہیل الکافیہ: علامہ سید شریف جرجانی کی فارسی شرح کا عربی ترجمہ	
❹ جواہر الغالیہ	❺ حاشیہ شمس بازغہ
❻ حاشیہ میر زاہد اسود عامہ	❼ رسالہ تحقیق تلازم
❽ شرح مسلم الثبوت	❾ شرح سلاسل الکلام
❿ حاشیہ حمداللہ ؒ	⓫ تحفہ وزیریہ والی ٹوک کی فرمائش پر

شرح ہدایت الحکمت اور تسہیل الکافیہ وغیرہ آج بھی مدارس دینیہ کے نصاب میں شامل ہیں۔

تلامذہ: ؒ

مولانا عبدالحق خیرآبادی سے فیض پانے والے افراد کی تعداد بلا مبالغہ سینکڑوں میں ہے۔ ان میں سے چند درج ذیل ہیں:

❶ مولانا عبدالعزیز سہارنپوری	❷ مولانا نور حق
❸ مولانا ماجد علی جونپوری	❹ مولانا حکیم سید برکات احمد بہاری
❺ مولانا ظہور الحسن رامپوری	❻ سید علی بلگرامی
❼ مولانا محمد طیب مکی	❽ مولانا اسد الحق خیرآبادی بن مولانا عبدالحق
❾ مولانا سید احمد بخاری (والد حکیم محمد احمد خیرآبادی)	❿ مولانا نظیر الحسن الہ ٹھوی
⓫ مولانا محمد علی خان رامپوری (استاذ ابوالکلام آزاد)	⓬ عبدالحق خاں (والد حکیم عجم الحق مؤرخ)
⓭ عبدالملک خاں	⓮ فضل حق رامپوری

WWW.NAFSEISLAM.COM

⑮ مولانا حکیم احمد رضا خاں لکھنوی
⑯ مولانا افضال احمد خان رامپوری
⑰ مولانا حسین رضا خان
⑱ مولانا سید شہاب الدین
⑲ مولانا تفضل حسین
⑳ مولانا عبدالہادی خاں
㉑ مولانا حاجی منور علی
㉒ مولانا مرتضیٰ
㉓ محمد علی خاں
㉔ مولوی محمد نبی خاں
㉕ نصیر الدین
㉖ مولانا مقیم الدین لوہانی
㉗ مولانا شاہ اعظم حسین مدنی
㉘ مولانا شاہ لشکر بگل مردان
㉙ مولانا عبدالعزیز بلوانی
㉚ مولانا سید اللہ رامپوری

وفات:

آپ کا وصال 23 شوال المکرم 1316ھ /5 مارچ 1899ء کو خیرآباد میں ہوا اور آپ کو اپنے دادا علامہ فضل امام خیرآبادی علیہ الرحمۃ کے پہلو میں دفن کیا گیا۔

پسماندگان:

عمدۃ العلماء مولانا عبدالحق خیرآبادی علیہ الرحمۃ نے دو شادیاں کیں۔ پہلی شادی اپنے چچا فضل الرحمن کی بیٹی باجرہ بی بی سے کی جن سے بیٹی عائشہ بی بی اور حمیدہ بی بی پیدا ہوئیں۔ دوسری شادی حکیم یوعلی سندیلوی کی صاحبزادی سے ہوئی جن سے بیٹا مولانا اسد الحق پیدا ہوا۔ مولانا اسد الحق نے احمد حسین کی صاحبزادی سے نکاح کیا جن سے مولانا اسد الحق بن مولانا عبدالحق کے دو بیٹے عزیز الحق اور حکیم ظفر الحق اور ایک بیٹی بی بی رقیہ زوجہ حسن رضا سندیلوی پیدا ہوئیں۔ حکیم ظفر الحق بن اسد الحق بن مولانا عبدالحق کا ایک بیٹا عین الحق اور تین صاحبزادیاں تولد ہوئیں۔ ۸

قطعہ تاریخ وصال:

عمدۃ العلماء مولانا عبدالحق خیرآبادی علیہ الرحمۃ کے وصال پر درج ذیل قطعہ تاریخ وصال کہا۔

خس العلماء ز قلب دہر
چو تیراز ز تیرہ رفت
ز لوح مزار امیر خویش
آرام گہ امام وقت است

1316ھ

حوالہ جات

1. باغی ہندوستان، ص: 198
2. ایضاً، ص: 199
3. ایضاً، ص: 201
4. حقیقت راجپوتانہ (ضمیمہ) ص: 5
5. باغی ہندوستان
6. الزبیر، کتب خانہ نیر
7. نزھۃ الخواطر، ج: 8، ص: 222، 224
8. باغی ہندوستان، ص: 167، 180
9. باغی ہندوستان، ص: 164-169
10. غالب نامہ، دوم، ص: 121
11. خیرآبادی ایک مطالعہ، ص: 48-92-99، 119

Nafse Islam
نفس اسلام
WWW.NAFSEISLAM.COM

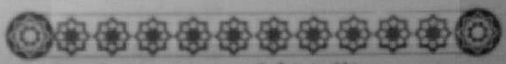

کتابیات
مولانا فضل حق خیرآبادی
کی زندگی کے ماخذ

مختر مہیاں محمد قصوری صاحب 1943ء کو الحاج شہاب الدین کے ہاں علی پور سیداں میں پیدا ہوئے۔ بچپن ہی سے پڑھنے لکھنے کے شوق نے آپ کو مؤرخ بنا دیا ہے۔ اس وقت تک آپ کی تقریباً پچاس کتب شائع ہو چکی ہیں جن میں ملفوظات کی تشریح "تاریخ تصوف" "تذکرہ خلفاء اہل حضرت" تحریک پاکستان میں علماء و مشائخ کا کردار" مجاہد ملت بلکھور تعلیم الامت (علامہ اقبال) اور مولانا نیازی حیات و خدمات تعلیمات و غیرہ نمایاں ہیں۔ قصوری صاحب اپنی ان علمی و اشاعتی خدمات کا کریڈٹ حکیم محمد موسیٰ امرتسری علیہ الرحمۃ ڈاکٹر مسعود احمد علیہ الرحمۃ ڈاکٹر محمود رضا بیگ اور انجینئر میاں اسلامک یونیورسٹی اسلام آباد و ڈاکٹر انعام الحق کوثر کو دیتے ہیں۔

قصوری صاحب کا روحانی تعلق امیر ملت کے بڑے صاحبزادے ابوالمسعود محمد حسین شاہ گیلانی سے ہے۔ اس کے علاوہ مجاہد ملت مولانا عبدالستار خان نیازی کے آپ "لکھتے" تلمیذ مجاز ہیں۔ اس وقت بھی آپ مجاہد ملت فاؤنڈیشن اور مرکزی جمعیل امیر ملت کے ماہانہ جرائد کے مدیر ہیں۔

مجاہد کبیر حضرت مولانا فضل حق خیرآبادی رحمۃ اللہ علیہ نے میدان علم و عمل اور معرکہ حق و باطل میں جو خدمات انجام دی ہیں وہ تاریخ کا ناقابل فراموش باب ہیں۔ آپ کی عظیم قربانیوں نے برطانوی استعمار کے پرخچے اڑا کر برصغیر میں قال اللہ تعالیٰ و قال الرسول کی صدائیں بلند کیں جو دوسری طرف 1857ء کی جنگ آزادی میں شمشیر بکف مجاہد کا کردار ادا کر کے آزادی کی شمع جلائی اور جزائر انڈیمان میں اسیر رہ کر نہایت کسمپرسی کی حالت میں اپنی جان جان آفریں کے سپرد کر دی۔ یہ انہی کی قربانیوں کا ثمر ہے کہ آج ہم پاکستان جیسی عظیم آزاد اسلامی مملکت کے مالک و باسی ہیں۔

راقم علامہ فضل حق کی مجاہدانہ زندگی و خدمات کو پیش کرنے والی چند کتب و رسائل کا ذکر کر رہا ہے تاکہ مستقبل کے قلم کار کو ذخیرہ مواد آسانی مل سکے۔ "کتابیات" میں جن کتابوں کا ذکر کیا گیا ہے وہ سب کی سب میرے کتب خانہ میں موجود ہیں۔ قارئین سے استدعا ہے کہ ان کے علم میں موضوع مذکور پر اگر کوئی مزید کتاب ہو تو براہ کرم مطلع

فرمائیں تاکہ "کتابیات" مکمل ہو جائے۔

نمبر شمار	نام کتاب	مصنف / مؤلف	سن و جائے طباعت	صفحات
۱	امتیاز حق	راجا غلام محمد	لاہور 1979ء	۱۳۶ صفحات
۲	آزادی کے مجاہد	محمود الرحمٰن	کراچی 1974ء	ص ۳۱ تا ۴۵
۳	آزادی کی ان کہی کہانی	محمد فیضی بی اے	سرگودھا 1974ء	ص ۶ تا ۹۳
۴	انقلاب 1857ء	پی سی جوشی	دہلی 1972ء	ص ۱۰۰ تا ۱۱۱، ۱۷۸
۵	اکمل التاریخ جلد اول	مولانا ضیاء القادری	بدایوں 1333ھ	ص ۸۸ تا ۹۰
۶	بہادر شاہ ظفر اور ان کا عہد	رئیس احمد جعفری	لاہور 1969ء	ص ۲۵۹ تا ۲۶۱
۷	باغی ہندوستان	عبدالشاہد خاں شیروانی	بجنور 1947ء	۳۷۶ صفحات
۸	بدایوں 1857ء میں	مولانا محمد سلیمان بدایونی	کراچی 1960ء	ص ۷۳
۹	غالب نامہ	شیخ محمد اکرم	لاہور غیر ورڈ سنز	ص ۱۷۰
۱۰	غالب نام آور دم	نادم سیتاپوری	لاہور 1970ء	متعدد صفحات پر ذکر
۱۱	غالب عصر غالب	پی ڈبلیو محمد ایوب قادری	کراچی 1982ء	ص ۱۳۳ تا ۱۳۴
۱۲	پاکستان انقلاب سے پہلے اور بعد	اشرف عطاء قوم نظامی	لاہور 1968ء	ص ۴۸ تا ۳۰
۱۳	تذکرہ علمائے ہند	رحمٰن علی	کراچی 1961ء	ص ۲۸۳ تا ۳۸۴
۱۴	تذکرہ علمائے اہلسنت	مولانا حکیم احمد شجاع قادری	بھیرہ 1391ھ	ص ۲۰ تا ۲۶۲
۱۵	تحقیق الفتویٰ	مولانا فضل حق خیرآبادی	سرگودھا 1979ء	ص ۲۲ تا ۲۵ (مقدمہ)
۱۶	تاریخ ادب اردو	ڈاکٹر رام بابو سکسینہ	لاہور 1978ء	ص ۲۶۳
۱۷	تاریخ ہندو پاکستان	مولانا قاری احمد	کراچی 1974ء	ص ۱۳۰، ۱۳۱، ۲۱۵، ۲۱۷
۱۸	نام راج سے رام راج تک	رئیس احمد جعفری	لاہور اکیڈمی	ص ۱۹۳ تا ۱۹۸
۱۹	حیات غالب	شیخ محمد اکرام	لاہور غیر ورڈ سنز	ص ۱۷۰

۲۰	حدائق الحنفیہ	مولانا فقیر محمد جہلمی	لاہور 1971ء	ص:۴۹۷
۲۱	جنگ آزادی 1857ء	پروفیسر محمد ایوب قادری	کراچی 1976ء	ص:۳۳۲تا۳۳۷
۲۲	حیات ظفر	مفتی انتظام اللہ شہابی	کراچی 1957ء	متعدد صفحات پر ذکر
۲۳	حیات علامہ فضل حق	مفتی انتظام اللہ شہابی	لکھنؤ 1966ء	صفحات ۶۳
۲۴	خون کے آنسو	علامہ مشتاق احمد نظامی	لاہور مکتبہ تعمیر	ص:۲۷تا۲۸
۲۵	علماء ہند کا شاندار ماضی جلد چہارم	مولوی محمد میاں	لاہور 1977ء	ص:۳۲۳تا۳۵۴
۲۶	دیوبندی مذہب	مولانا غلام مصطفیٰ خان	چشتیاں 1956ء	ص:۲۹۳تا۳۲۰
۲۷	مسلمانوں کی جدوجہد آزادی	ڈاکٹر معین الرحمن عقیل	لاہور 1982ء	ص:۴۳
۲۸	کاروان گم گشتہ	رئیس احمد جعفری	کراچی 1971ء	ص:۸۸
۲۹	مطالعہ پاکستان	پروفیسر محمد شبیر احمد	لاہور 1981ء	ص:۲۳تا۲۴
۳۰	مقالات سعیدی	مولانا غلام رسول سعیدی	لاہور 1982ء	۵۷۳تا۵۷۸
۳۱	علم و عمل جلد اول	مولوی معین الدین	کراچی 1970ء	ص:۲۵۲تا۲۵۵
۳۲	علم و عمل جلد دوم	مولوی معین الدین	کراچی 1961ء	ضمیمہ ص:۳۱تا۳۰
۳۳	مقالات مرتضیٰ جلد شانزدہم	محمد اسماعیل پانی پتی	لاہور 1965ء	ص:۳۲۷تا۳۳۶
۳۴	اکمل حیات	حسین احمد مدنی	لاہور 1975ء	ص:۵۵تا۵۱
۳۵	مفتی صدرالدین آزردہ	عبدالرحمن پرواز اصلاحی	دہلی 1977ء	ص:۱۷تا۲۷
۳۶	1857ء کا تاریخی روزنامچہ	خلیق احمد نظامی	دہلی 1971ء	متعدد صفحات پر ذکر
۳۷	1857ء	غلام رسول مہر	لاہور 1971ء	ص:۳۵۲تا۱۶۰
۳۸	1857ء کے مجاہد	غلام رسول مہر	لاہور 1971ء	ص:۲۱۲تا۲۰۰
۳۹	غالب اور سن ستاون	ڈاکٹر سید معین الرحمن	لاہور 1974ء	ص:۱۶۲
۴۰	فضل حق خیرآبادی اور سن ستاون	حکیم محمود احمد برکاتی	کراچی 1975ء	۱۲۸ صفحات

WWW.NAFSEISLAM.COM

۴۱	نواب خان بہادر خاں	سید مصطفیٰ علی بریلوی	کراچی' 1966ء	ص:۷ تا ۱۴
۴۲	1857ء کے مجاہد شعراء	امداد صابری	دہلی' 1959ء	ص:۲۶۸
۴۳	مولانا فیض احمد بدایونی	پروفیسر محمد ایوب قادری	کراچی' 1957ء	ص:۲۱' ۲۲
۴۴	مشاہیر جنگ آزادی	مفتی انتظام اللہ شہابی	کراچی' 1957ء	ص:۷۷ تا ۹۱
۴۵	غدر کے چند علماء	مفتی انتظام اللہ شہابی	دہلی' دینی بکڈپو	ص:۳۱' ۲۴
۴۶	57ء کے ہیرو	سیدہ انیس فاطمہ بریلوی	کراچی' 1956ء	ص:۲۹' ۴۷' ۷۰
۴۷	عظیم اللہ خاں (انگریزی)	سید لطف اللہ	کراچی' 1970ء	متعدد مقامات پر ذکر
۴۸	سہ ماہی "العلم"	غالب نمبر	کراچی' اپریل تا جون 1969ء	ص:۶۹ تا ۷۳' ۹۴' ۹۵
۴۹	ماہنامہ "خیال"	سن ستاون نمبر	لاہور' مئی 1957ء	ص:۲۶۱ تا ۲۶۵
۵۰	ماہنامہ "ترجمان السنہ"	1857ء نمبر	کراچی' جولائی 1975ء	ص:۵۳ تا ۵۷
۵۱	ماہنامہ "الشجاع"	جنگ آزادی 1857ء	کراچی' مئی 1957ء	ص:۴۲
۵۲	ہفت روزہ قندیل	1857ء نمبر	لاہور' مئی 1957ء	ص:۲۸
۵۳	عندلیب تواریخ	سید مسعود حسن مسعود	الہ آباد' 1963ء	ص:۱۰۰ پر قطع تاریخ وفات

● ماہنامہ "العاقب" لاہور کی جانب سے اس میں درج ذیل اضافہ کیا جا رہا ہے۔

۵۴	العلامہ فضل حق الخیرآبادی	ڈاکٹر قمر الشماء	لاہور' 1986ء	۷۰۶ صفحات
۵۵	تاریخ ساز شخصیات	مولانا محمد صدیق ہزاروی	لاہور' 1992ء	۱۵۶ تا ۱۶۴
۵۶	علامہ فضل حق خیرآبادی	سلمہ سیہول	لاہور' 2001ء	۴۴۶ صفحات
۵۷	علامہ فضل حق خیرآبادی	پروفیسر ڈاکٹر مسعود احمد	لاہور' 2002ء	۳۰ صفحات
۵۸	خون کے آنسو	علامہ مشتاق احمد نظامی	لاہور' 2003ء	۳۹ تا ۶۳
۵۹	1857ء کے چند اہم کردار	ضیاء الدین لاہوری	لاہور' 2007ء	۷ تا ۲۵

۶۰	جنگ آزادی کی شخصیات	سعود الحسن خاں روہیلہ	لاہور 2007ء	۳۶۴تا۳۶۹
۶۱	چند ممتاز علماء انقلاب 1857ء	علامہ یٰسین اختر مصباحی	کراچی 2008ء	۸۴تا۷۰
۶۲	برطانوی مظالم کی کہانی	علامہ عبدالحکیم اختر شاہجہانپوری	لاہور	۱۱۲تا۱۱۷
۶۳	ماہنامہ "معارف رضا"	محمد صادق رضا مصباحی	کراچی دسمبر 2006ء	۱۸تا۲۰
۶۴	ماہنامہ "اشرفیہ"	مولانا اختر کمال قادری	مبارکپور اگست 2008ء	۶۹تا۷۷

مسافرانِ آخرت

● 10 جولائی 2009ء بروز جمعہ مفتی اعظم پاکستان مفتی محمد عبد القیوم ہزاروی علیہ الرحمۃ کی اہلیہ محترمہ اور صاحبزادہ مولانا عبد المصطفیٰ ہزاروی ناظم اعلیٰ تنظیم المدارس کی والدہ ماجدہ وصال فرما گئیں۔ (تفصیل اداریے میں ملاحظہ فرمائیں)

● 27 جون بروز ہفتہ میں فاتح رافضیت مولانا محمد علی لکھنوی علیہ الرحمۃ کی اہلیہ محترمہ اور مجاہد اہلسنت، ناظم اعلیٰ جامعہ سراجیہ شیرازیہ مولانا صاحبزادہ رضائے مصطفیٰ کی والدہ محترمہ وصال فرما گئیں۔

● 26 جون بروز جمعہ ممتاز خطیب مولانا محمد عبد الحق ظفر پشتی لاہور میں وصال فرما گئے۔

● 12 جون بروز جمعہ تنظیم المدارس کے ناظم اعلیٰ مولانا ڈاکٹر محمد سرفراز احمد نعیمی کو شہید کر دیا گیا۔ (تفصیل اداریے میں ملاحظہ فرمائیں)

● 11 جون بروز جمعرات ممتاز عالم دین اور بزرگ سیاستدان، استاذ العلماء علامہ محمد حسن ظفر ثانی اشرفی طویل علالت کے بعد وصال فرما گئے۔

● یکم جون بروز پیر استاذ العلماء شیخ الحدیث مفتی محمد وقار الدین حنفی کے لخت جگر وصال فرما گئے۔

● یکم جون بروز پیر کونسل آف جرنلسٹ پاکستان کے جنرل سیکرٹری محمد نواز کھرل صاحب کے والد گرامی محمد اسحاق کھرل وصال فرما گئے۔

● ماہ جون میں ہی کنز الایمان سوسائٹی کے بانی محمد نعیم طاہر رضوی کی والدہ محترمہ وصال فرما گئیں۔

● 15 مئی بروز جمعہ مفتی محمد خلیل خاں برکاتی علیہ الرحمۃ کی اہلیہ اور مفتی احمد میاں برکاتی کی والدہ وصال فرما گئیں۔

● 6 مئی بروز بدھ شیخ الحدیث مولانا احمد دین تونسوی لاہور میں وصال فرما گئے۔

● 6 مئی بروز بدھ پاکستان فلسفہ فورم کے بانی اور ممتاز دانشور پروفیسر وحید عشرت وصال فرما گئے۔

WWW.NAFSEISLAM.COM

حصہ دوم

جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء

WWW.NAFSEISLAM.COM

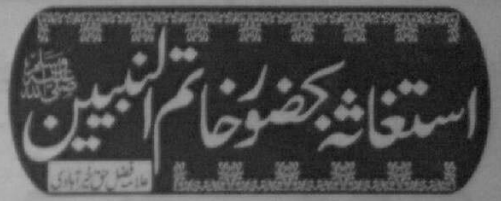

یا رب انقذہ من ابدی عدی کفر — بجاہ احمد محمود و حمّاد

● اے پروردگار! اس عاجز و خستہ کو بستودہ صفات احمد و حماد ﷺ کے طفیل کافر دشمنوں کے چنگل سے نکال۔

ارسلتہ رحمۃً للعالمین — الی الانام طرّا لارفادوارشاد

● تو نے انہیں تمام مخلوق کی طرف اس کی رہبری و ہدایت اور عطا و اعانت کے لیے رحمت عالم بنا کر بھیجا ہے۔

غوث المنادی لکفّ الباس مفزعنا — یوم التنادی ندیّ الکف فی النادی

● وہ مصیبت و عذاب روکنے کے لیے پکارنے والوں کے فریادرس' روز قیامت میں ہماری پناہ گاہ اور مجلس میں بڑے سخی و جواد ہیں۔

ھاد و حام و ماح مالیح لغوٍ — عیٍ و مستصرخ مستشفع جادی

● وہ گمراہ کے لیے ہادی' ناجا کے حامی' فریادی کے مددگار' سفارش چاہنے والے کے شفیع اور سائل کو عطیات سے نوازنے والے ہیں۔

جار لجار شکا جوز یمیح لمن — قد استماح و مستاد لممتاد

● ظلم سے شاکی پڑوسی کے محافظ ہیں' امداد چاہنے والے کے معاون اور طالب عطا کے لیے سخی ہیں۔

ھادٍ بشر قد الفت بشائرہ الرُّھبان — فی رَھب و الھُود فی ھاد

● وہ خوشخبری سنانے والے ہادی ہیں' راہبوں نے ان کی آمد کی اطلاع حالت خوف میں پہنچائی اور اسی طرح یہود نے۔

ھدی سبلا سویّا کل منحرف — عن السبل وسوّی کل مئتاد

● انہوں نے ہر گم کردہ راہ کو سیدھا راستہ بتایا اور ہر ٹیڑھے کو سیدھا کر دیا۔

WWW.NAFSEISLAM.COM

غوث وغيث للملهوف ومنتجع — بحر وبر لوراد وزواد

● وہ مظلومین کے فریادرس اور طالب بارش کے لیے بادل، گھاٹ پر آنے والوں کے لیے دریا چارہ اور پانی کے متلاشی کے لیے (سرسبز) میدان ہیں۔

بحر شريعته بيضاء صافية — مشروعها مشرع عذب لوراد

● وہ دریا ہیں ان کی شریعت روشن اور صاف ہے جس کے احکام پیاسوں کے لیے شیریں چشمہ ہیں۔

برندق يشبع الفرلى اصابعه — جادت فجادت نجود اللائب الصادى

● وہ بڑے نیک اور سخی ہیں بھوکوں کا ان کی انگلیاں پیٹ بھرتی ہیں۔ جب انگلیاں سخاوت پر آتی ہیں تو تشنہ لبوں کی پیاس پر غالب آجاتی ہیں۔

ان زاد ادم جدا من لبنه فكم — باين حلا جدُّ اباء واجداد

● آدم علیہ السلام کی بزرگی میں ان کی وجہ سے اضافہ ہوا تو تعجب کیوں ہے؟ ہبت سے آباء واجداد نے اپنی اولاد کے بھروشرف کے باعث بلند مرتبہ پالیا ہے۔

خاتم النبين اولاهم واولهم — بدء لبدى سناه بدءُ ايجاد

● وہ خاتم النبیین ہیں انبیاء میں سب سے افضل ہیں خلق میں اولیت کا شرف انہیں کو حاصل ہے اور انہیں کی روشنی سب سے پہلی ایجاد ہے۔

قد بينه ناسخ الاديان قاطبة — باق على مرّ احقاب واباد

● ان کا دین تمام مذہبوں کا ناسخ اور باقی رہنے والا ہے۔

تلا كتابا حكيما محكما حكما — يقضى على كل مرتاب لمرتاد

● انہوں نے حکمت والی مضبوط اور فیصلہ کن کتاب کی تلاوت کی وہ کتاب متلاشی حق کی حمایت میں اور شک کے خلاف فیصلہ صادر کرتی ہے۔

دعا ليدخل فى الفراد امته — رسل على ما روى اصحاب امناد

● رسولوں نے ان کے امتی بننے کی خدا کی بارگاہ میں دعا کی روایات میں اسناد کے ساتھ اس کا تذکرہ موجود ہے۔

دعوا لكى يحسبوا من امة وَسَط — عدل على الامم الماضين اشهاد

WWW.NAFSEISLAM.COM

● انہوں نے امت وسط' شاہد عادل (امت محمدیہ) میں شمار ہونے کی دعا کی جو کہ تمام سابقہ امتوں پر قیامت کے دن گواہ بنے گی۔

فمن اولئک من لم یعط ما اَملوا والبعض فازوا بما مول ومرتاد

● ان میں سے بہت کی آرزو پوری نہ ہوئی اور بعض اپنی مراد کو پہنچے۔

اکرم بعترته الغرّ الکرام فهم خیر النبال وهم سادات امجاد

● کس قدر قابل عظمت ہے ان کی شریف' بزرگ' نجیب اور بلند رتبہ اولاد۔

اصحابه جاهدوا للدین واجتهدوا لنصره واجدّوا کل اجداد

● ان کے صحابہ نے دین کے لیے جہاد کیا' معاونت میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی اور اس سلسلہ میں طرح طرح کی کوششیں کیں۔

یا سید الخلق یا خیر الوری خلقا یا خیر من یرتحی یا خیراجواد

● اے مخلوق کے سردار اور اخلاق میں سب سے بلند و بہتر' امیدوں کے بہترین سہارے اور تمام اہل سخاوت سے بلند مرتبہ رکھنے والے۔

الیک محنی ومحنی واکفنی محنی بالمیح یا خیر ممتاح وممتار

● میں آپ پر قربان' مجھ پر رحم فرمایئے اور مجھے بخشش سے نوازیئے' اپنی عطاسے میری مشقتوں اور غموں کی تلافی کیجئے' اے جود وعطا کے مالک۔

فاشفع ومحنی وسل ربی لینجینی ممن بلانی بشغربی وافرادی

● مجھ پر کرم کرتے ہوئے خدا سے میری سفارش کیجئے کہ مجھے جلاوطنی اور قید تنہائی کی مصیبت و آزمائش سے نجات دے۔

وان ینفس عنی عاجلا کُربی اللائی تجاوزن عن حصر وتعداد

● اور جلد سے جلد میری ان پریشانیوں اور اذیتوں کو دور کرے جو حد و شمار سے متجاوز ہو چکی ہیں۔

وان عافینی فوراً وبدلنی وجدی بوجدوا شقائی باسعاد

● اور مجھے قلت کے ساتھ اپنی عافیت میں لے اور میرے غم کو سرور اور شقاوت کو سعادت سے بدل دے۔

وان یتیح حِمامی بالشهادة لی　　جوار مثواک یا جاری ویا هادی

● اے میرے محافظ و رہنما! اس بات کی بھی دعا کیجیے کہ خدا میری موت آپ کی اقامت گاہ کے جوار میں شہادت کی موت مقدر کردے۔

ناشدتک الله فاقبل مدحتی کرما　　حتی افوز بمنشودی بانشادی

● میں آپ کو خدا کی قسم دلاتا ہوں، اپنے کرم سے میری مدح و ستائش قبول فرمائیے تاکہ اشعار خوانی کی بدولت میں اپنی مراد کو پہنچوں۔

علیک ازکی صلوة الله ما صدحت　　ورقاء ایک و دیق اوشد اشادا[1]

● آپ پر اللہ کی پاکیزہ رحمتیں نازل ہوتی رہیں جب تک سرسبز و شاداب مرغزاروں میں قمریوں کی آوازیں گونجتی رہیں اور گانے والے گاتے رہیں۔

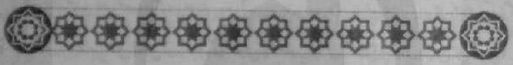

اگر قبول کرے دینِ مصطفیٰ ﷺ انگریز
سیاہ روز مسلماں رہے گا پھر بھی غلام

WWW.NAFSEISLAM.COM

---

[1] علامہ فضل حق علیہ الرحمۃ کے درج بالا تمام اشعار "قصیدۂ دالیہ" سے لیے گئے ہیں۔

جنگ آزادی کی کہانی مجاہد اعظم علامہ فضل حق خیرآبادی کی زبانی

جنگ آزادی 1857ء کے پر آشوب حالات کے متعلق اگر کوئی سب سے زیادہ مستند اور قابل اعتماد ماخذ ہے تو وہ مجاہد کبیر علامہ فضل حق خیرآبادی علیہ الرحمۃ کی درج ذیل تحریر ہی ہے۔ علامہ فضل حق صرف اس جنگ آزادی میں شامل ہی نہیں ہوئے بلکہ اس میں شمولیت کرنے والوں کے سب سے بڑے محرک وقائد تھے۔ جنگ آزادی کے متعلق جس قدر مستند بات تحریک آزادی کے قائد کی ہو سکتی ہے کسی اور کی کہاں؟

اس مضمون میں ایسی شخصیت کی داستان حیات ہے جو اپنے دور میں علم وعمل کا سرچشمہ تھا۔ جس سے مسند درس وتدریس کی آن قائم تھی۔ اس شخصیت کو اپنے اہل وعیال سے بہت دور ایک ایسے جزیرے میں محبوس رکھا گیا جہاں انسان تو کجا جانوروں کا بسیرا بھی مشکل تھا۔ فرنگی کمپنی کے مشنریوں کا منصوبہ تھا کہ باشندگان ہندوستان کسی طرح اپنے دین سے جدا ہو کر ملحد وبے دین ہو جائیں یا غربت وافلاس کے ہاتھوں تنگ آکر ان کے قدموں میں گر جائیں۔

اس داستان عشق ومستی میں اہل اسلام کے کمزوریوں خصوصاً مغل شاہ اور شہزادوں کی ناسمجھیوں اور شاہ خرچیوں کا ذکر ہے۔ اس میں طائفوں ورباب میں مست بعض نادانوں اور اپنوں کی ایمان فروشی وضمیر فروشی کا ذکر بھی ہے۔ اس میں بادشاہ کی کمزوری اور شہزادوں کے عبرتناک انجام کا ذکر ہے۔ اس میں فرنگی سامراج کی مکاری وعیاری اور مطلب پرستی کا ذکر ہے۔ اس میں ہندوستان میں موجود ہندوؤں اور سکھوں کی غداری کا ذکر ہے۔ اس میں اہل اسلام اور شاہی خاندان پر ہونے والے المناک مظالم کا ذکر ہے۔ اس میں ذکر ہے وحشت ناک جزیرۂ انڈمان کے رنج والم اور مصائب سے بھرپور شب وروز کا۔ الغرض علامہ کے اس لاجواب وشہکار تحریر میں ہر اس امر کا ذکر ہے جو اور کسی دوسری تحریر میں درج نہیں۔ ملاحظہ فرمائیں

تمام ثنائیں اس خدائے برتر کے لیے ہیں جس سے بغیر کسی ناامیدی کے محنت وآزمائش کہنگی وبوسیدگی اور غم وتکلیف سے نجات دینے کی بہت بڑی امید وابستہ ہے اور جو اسے اس کے اعلیٰ نام سے پکارے اسے بہترین عطایا اور بے شمار نعمتیں عطا فرمانے والا ہے بالخصوص مظلوم ومضطر کی اس کی مصیبتوں اور بیماریوں میں سننے والا ہے۔

سلام ہو اس خوش رو، خوشخبری سنانے والے اور ڈرانے والے پر جس کی تمام نبی نوید مسرت آمد سناتے آئے بلا اور وبا کے دور کرنے، دشمنوں کے ظلم کے پردے چاک کرنے، بڑی بدبختی اور سخت بیماری سے نجات دلانے کی، گنہگاروں اور سیہ کاروں کو اس کی شفاعت سے بڑی امید ہے۔ سلام ہو اس کی شریف و نجیب و کریم اولاد پر اور اس کے عظیم المرتبہ، شدید و رحیم اصحاب پر خصوصاً پاکباز و صاف باطن خلفاء پر، اللہ کی رحمتیں اور برکتیں ان سب پر نازل ہوں جب تک فرشتے آسمان پر تسبیح و تہلیل کرتے رہیں اور کشتیاں سمندر میں تیرتی ہیں۔

میری یہ کتاب ایک دل شکستہ، نقصان رسیدہ، حسرت کشیدہ اور مصیبت زدہ انسان کی کتاب ہے جو اب تھوڑی سی تکلیف کی بھی طاقت نہیں رکھتا۔ اپنے رب سے جس پر سب کچھ آسان ہے، مصیبت سے نجات کا امیدوار ہے جو ابتداء عمر سے عیش و فراغت کی زندگی بسر کرنے کے باوجود اب محبوس دام ظلم اور تباہ شدہ ہے۔ مقبول دعاؤں کے ذریعہ خدا سے ازالۂ کرب کا طالب ہے۔ وہ بڑی مشکلات میں مبتلا اور ترش رو ظالموں کے ہاتھوں میں گرفتار ہے۔ ان ظالموں نے اسے اچھے لباس سے معرا کر کے غم و حزن کی وادیوں اور ایسے تنگ و تاریک قید خانوں میں ڈال دیا ہے جو سیاہ فتنوں کے مرکز ہیں۔ وہ محبوس و خریں، سخت دل، آبلے اور ظالم افراد پر نظر کرتے ہوئے اپنی رہائی سے مایوس ہے مگر اللہ کی رحمت سے ناامید نہیں ہے۔

وہ ایک سیدھا سادھا، نرم خو اور مریض و کمزور ہوتے ہوئے شریر و بدفطرت کی قید میں ہے اور ظالم و جابر، بدخلق و بدکردار کے مظالم سے حیران و پریشان ہے۔ وہ آفت رسیدہ ایسے مصائب میں مبتلا ہے جن کی سختیوں تک قیاس کرنے والے کا قیاس نہیں پہنچ سکتا اور ایسا مضطر محتاج ہے جو سخت عذاب و اضطراب میں گرفتار ہو چکا ہے۔ وہ سفید رو، سیاہ دل، معتون مزاج، ترش رو کی قید میں آچکا ہے جس کا اپنا عمدہ لباس اتار کر موٹا اور سخت لبادہ پہنا دیا گیا ہے جو اس وقت مجبور و عاجز ہے اور اپنے رب سے لو لگائے ہوئے ہے۔ اپنے تمام اعزہ و اقربا سے دور اور بہت دور ہے۔ مدعی اور منازع کے بغیر اس پر فیصلہ صادر کر دیا گیا ہے۔ وہ اپنے ہم نشینوں اور خادموں کے سامنے شرمندہ ہے۔ اس کے بازوؤں کو سخت تصادم سے کمزور کر دیا گیا ہے۔ وہ غمزدہ، تنہا اور دور افتادہ ہے۔ اسے اپنی زمین و شہر سے جلاوطن اور اہل و عیال سے دور کر دیا گیا ہے۔ یہ سارا ظلم و ستم ظالم بدکیش نے روا رکھا ہے۔

اسے اور اس کے اہل و عیال کو اپنی درندگی کی جھاڑی میں چھوڑ دیا ہے۔ اسے قید کر کے ہر ممکن مصیبت پہنچائی گئی ہے۔ اس کا قصور صرف ایمان اور اسلام پر مضبوطی سے قائم رہنا اور علماء اعلام میں شمار ہونا ہے۔ اس سے ان ظالموں کا مقصد نشان درس و تدریس کو مٹانا اور علم کے جھنڈے کو نیچے گرانا ہے۔ وہ صفحات قرطاس سے بھی نام

ونشان مٹانا چاہتے ہیں۔ یہ سب کچھ اس حادثۂ فاجعہ (انقلاب 1857ء) کی وجہ سے ہوا ہے جس نے آبادیوں کو ویران اور معیشتوں کی شوروزمین کو شاداب بنا دیا ہے۔ جس سے قوموں کے بادلوں سے گرتی ہوئی بجلیاں مصیبت زدگان وطن پر گریں اور ان بادشاہوں کو غلام وقیدی اور امراء کو محتاج وفقیر بنانے والی انقلابی وغداری مسلط کر گئی۔

یہ داستان الم اس طرح ہے کہ وہ برطانوی نصاریٰ جن کے دل ممالک ہند کے دیہات وبلاد پر قبضہ اور اس کے اطراف واکناف وسرحدات پر تسلط کے بعد عداوت وکینہ سے بھر گئے تھے اور تمام ذی عزت اعیان کو ذلیل وخوار کر کے ان میں سے ایک کو بھی اس قابل نہ چھوڑا تھا کہ سیر نافرمانی کو جنبش دے سکے۔ انہوں نے تمام باشندگان ہند کو کیا امیر کیا غریب، چھوٹے بڑے، معتبر ومعتمد، فقیر وبیوپاری سب کو فرمانبرداری بنانے کی اسکیم بنائی۔ ان کا خیال تھا کہ ان کو نہ تو کوئی مددگار ومعاون نصیب ہو سکے گا اور نہ انقیاد واطاعت کے سوا سرتابی کی جرأت ہو سکے گی۔

یہ سب کچھ اس لیے تھا کہ سب لوگ انہی کی طرح ملحد بے دین ہو کر ایک ہی ملت پر متفق ہو جائیں اور کوئی بھی ایک دوسرے سے ممتاز فرد نہ رہ سکے۔ انہوں نے اچھی طرح سمجھ لیا تھا کہ مذہبی بنیاد پر حکمرانوں سے باشندوں کا اختلاف، تسلط وقبضہ کی راہ میں سنگ گراں ثابت ہوگا اور سلطنت میں انقلاب پیدا کر دے گا اس لیے پوری جانفشانی اور تندہی کے ساتھ مذہب وملت کے مٹانے کے لیے طرح طرح کے حکمت وحیلہ سے کام لینا شروع کیا۔ انہوں نے بچوں اور نابالغوں کی تعلیم اور اپنی زبان ودین کی تلقین کے لیے شہروں اور دیہات میں مدرسے قائم کیے اور پچھلے زمانے کے علوم ومعارف اور مدارس ومکاتب کے مٹانے کی پوری کوشش کی۔

دوسری ترکیب یہ سوچی کہ مختلف طبقوں پر قابو اس طرح حاصل کیا جائے کہ وہ میں ہند کے غلہ کی پیداوار، کاشتکاروں سے لے کر فقہ دام اداکیے جائیں اور ان طریقوں کو خرید وفروخت کا کوئی حق نہ چھوڑا جائے۔ اس طرح بھاؤ کے گھٹانے بڑھانے اور فصلوں تک اپنا تسلط پہنچانے اور نہ ٹکانے کے خود ہی ذمہ دار بن بیٹھیں۔ اس کا مقصد اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ خدا کی مخلوق مجبور ومعذور ہو کر ان کے قدموں پر آ پڑے۔ خود اک نہ ملنے پر ان نصاریٰ اور ان کے اعوان وانصار کے ہر حکم کی تعمیل اور ہر مقصد کی تکمیل کرے۔

ان ترکیبوں کے علاوہ ان کے دل میں اور بھی بہت سے مفاسد چھپے ہوئے تھے مثلاً مسلمانوں کو ختنہ کرانے سے روکنا شریف وبرد وتحسین خواتین کا پردہ ختم کرانا نیز دوسرے احکام دین متین کو مٹانا وغیرہ وغیرہ۔

انہوں نے اپنے لشکر کی ابتداء اس طرح کی کہ سب سے پہلے اپنے ہندو مسلم لشکریوں کو ان کے رسوم واصول سے ہٹانے اور مذہب واعتقاد سے گمراہ کرنے کے درپے ہوئے۔ ان کا گمان تھا کہ جب بہادر لشکری اپنے دین کو

بدلنے اور احکام نصرانیت بجالانے پر آمادہ ہو جائیں گے تو پھر دوسرے باشندوں کو سزا و عقاب کے ڈر سے خود ہی مجال انکار نہ ہو سکے گی۔

انہوں نے ہندو لشکریوں کو جو تعداد میں بہت زیادہ تھے گائے کی چربی اور مسلمان سپاہیوں کو جو تھوڑی تعداد میں تھے سؤر کی چربی چکھانے پر زور ڈالا۔ یہ شرمناک روش دیکھ کر دونوں فرقوں میں اضطراب پیدا ہو گیا اور اپنے اپنے مذہب و اعتقاد کی حفاظت کی خاطر ان کی اطاعت و انقیاد سے منہ موڑ لیا۔ ان کے اس اضطراب نے خرمن امن پر چنگاری کا کام کیا۔ گروہ نصاریٰ کا قتل و اکذنی ان کے سرداروں اور سپہ سالاروں پر حملہ شروع کر دیا بعض لشکری حد سے تجاوز کر گئے۔ انہوں نے قساوت قلبی اور خونریزی کا اپنا شیوہ بنا لیا۔ بچوں اور عورتوں کے قتل سے بھی دریغ نہ کیا اور بچھونے بچوں اور بے گناہ عورتوں کی قتل و غارتگری سے سنسنی و دہشت کے مستحق بن بیٹھے۔

پھر تمام باغی گروہ لشکریاں اپنی اپنی چھاؤنیوں سے اپنے افسروں سے نبٹنے کے بعد چل کھڑے ہوئے۔ عالموں اور حاکموں کے نظام درہم برہم ہو گئے۔ راستوں کے امن میں خلل پڑا حقوق خدا میں فتنہ و فساد اور دیہات و بلاد میں شور و شغب پھیل گیا۔ طوفان حوادث جوش میں آ گیا۔

بہت سے لشکر شہر شاہجہان آباد معمور ہمسکن آل تیموری دار السلطنت دہلی جا پہنچے۔ وہاں پہنچ کر ان سب نے ایسے شخص کو سردار و پیشوا بنایا جو اس سے پہلے بھی ان کا سردار و حاکم تھا۔ جس کے پاس اس کے ارکان دولت اور وزیر بھی تھے لیکن وہ خود ضعیف العمر و ادھیڑ تجربہ کار تھا۔ عمر کی کافی منزلیں طے کر کے بڑھاپے کی وادی میں قدم رکھ چکا تھا اور جی چاہے تو آمر و حاکم ہونے کے بجائے اپنی شریک حیات آ اور وزیر کا مامور و محکوم تھا۔ اس کا یہ وزیر جو حقیقت میں نصاریٰ کا کارپرداز (ایجنٹ) اور ان کی محبت میں غالی تھا۔

ان میں سے بعض تو مقرب بارگاہ اور ارد گرد رہتے تھے۔ یہ سب کے سب جو بھی چاہتا تھا کرتے تھے۔ اپنی آراء پر عمل پیرا ہوتے تھے لیکن اس کی اطاعت کا دم بھرتے تھے اور وہ سردار ایسا ضعیف الرائے اور نا تجربہ کار تھا کہ کچھ جانتا ہی نہ تھا۔ اس سے عجیب عجیب حرکتیں سرزد ہوتی تھیں۔ کام اپنی رائے سے نہ کر سکتا تھا اور نہ اچھا برا سمجھنے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ وہ نہ کسی کو خلعت اور علی الاعلان کوئی حکم دے سکتا تھا اور نہ کسی کو نفع و ضرر پہنچانے کی طاقت رکھتا تھا۔

یہ تو سب کچھ ہو ہی رہا تھا کہ بعض شہر و دیہات سے بہادر مسلمانوں کی ایک جماعت علماء زہاد اور ائمہ اجتہاد سے جہاد کے وجوب کا فتویٰ لے کر جدال و قتال کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی۔ ادھر اس ناتجربہ کار سردار نے اپنے بعض ناعاقبت اندیش اسلحہ خانہ اور بزدل اولاد کو ۶ ہمراہ لشکر بنا دیا۔ یہ لوگ دیانتدار خدمتگروں سے متنفر تھے۔

انہیں نہ تو میدانِ کارزار سے کبھی واسطہ پڑا تھا اور نہ ہی کبھی شمشیر زنی اور نیزہ بازی کا موقعہ ملا تھا۔ انہوں نے بازاری لوگوں کو اپنا ہم نشین و جلیس بنا لیا۔ اس طرح یہ ناآزمودہ کار' آرام طلبی' اسراف بے جا اور فسق و فجور میں مبتلا ہو گئے۔

وہ تنگدست ہو چکے تھے پھر مالدار ہو گئے۔ جب مالدار ہو گئے تو عیش پرستیوں میں پڑ گئے۔ لوگوں سے لشکروں کے ساز و سامان کے بہانے سے کافی مقدار میں مال جمع کرتے تھے اور اس میں سے ایک حبہ بھی کسی لشکری پر خرچ نہ کرتے تھے۔ جو کچھ وصول کرتے تھے وہ خود کھا جاتے تھے۔ یہاں تک بھی قیامت تھا لیکن ان کو تو زنان فاحشہ و شاہ کار نے طلایہ کی قیادت اور کنیزوں کی شب باشی نے لشکروں کے ساتھ رات کو چلنے سے روک دیا اور آلاتِ عیش و طرب نے آرام طلبی میں دال کر مقدمۃ الجیش (ہراول دستہ) سے بھی پیچھے کر دیا۔ ان کے دلوں میں نامردی اور ذلیل اندیشہ بیٹھ گیا۔ اسی نے ان کو وسطِ لشکر میں ثابت قدمی سے روکا' شوئی قسمت نے میمنہ (دائیں بازو کی فوج) سے اور قہار و تو نگری نے میسرہ (بائیں بازو کی فوج) سے باز رکھا۔ ان کے خوشحالی اور بازاری ہم صحبتوں نے ساقہ (پچھلا دستہ) سے بھی علیحدہ رکھا۔ ایسا ہی ہوا کرتا ہے جب کسی نااہل کو کوئی بڑا کام سپرد کیا جاتا ہے اور کمزور پر بھاری بوجھ لادا جاتا ہے۔ وہ رات سو کر اور دن بدمست ہو کر گزارتے' جب بیدار و ہوشیار ہوتے تو قافلہ و تیران پاتے۔

نوبت بہ ایں جا رسید کہ نصاریٰ کا لشکر ان پر آ کر ٹوٹ پڑا۔ ایک بلند پہاڑی پر چڑھ کر شہر کا رخ کر دیا۔ شہر کا محاصرہ کر کے منجنیقیں کھڑی کر دیں اور منجنیقیں نصب کر کے شہر پر گولہ باری شروع کر دی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ بجلیاں اور تارے ٹوٹ ٹوٹ کر شہر والوں پر گر رہے ہیں۔

ہندوستانیوں کا یہ بیکار اور باغی لشکر مختلف ٹولیوں میں تقسیم تھا۔ بعض گروہ کا کوئی جنرل ہی نہ تھا' بعض کو جانے پہنچانے بھی میسر نہ تھی' بعض کی قوت کو فقر و فاقہ نے سلب کر کے ہاتھ پاؤں توڑ کر بٹھا دیا تھا' کچھ تھوڑا سا مال غنیمت ہاتھ لگنے سے بے نیاز ہو گئے تھے' کچھ تو سامانِ حرب کے ساتھ بھاگ گئے تھے' بعض طلبائے دینی سے بدکار عورتوں پر لعنت بھیجنے' بعض نے میدانِ جہاد کے تنگ و سخت فوجی کپڑے پہن کر صفوفِ جنگ میں داخل ہونے کو ننگ جانا اور صرف ایک گروہ نصاریٰ کا جواب دیتے ہوئے بہادری سے لڑتا رہا۔

نصاریٰ جب لڑتے لڑتے تھک گئے اور پست ہو گئے تو غربی ہندوؤں سے مدد و معاونت کے طالب ہوئے۔ ہندوؤں نے کثیر لشکر اور ساز و سامانِ حرب سے تھوڑی سی مدت میں پے در پے مدد کی۔ اب تو نصاریٰ نے سخت لڑائی

طعان دی اور اس پہاڑی پر بہت سا لشکر اور مددگار و معاون جمع کر لیے۔ ان کے لشکریوں میں کوئے منہ کے گروہ بھی تھے اور ذلیل ترین ہندو اچھوت بھی اور وہ بدبخت و بدکیش مسلمان بھی جو ایمان کے بعد نصاریٰ کی محبت میں مرتد ہو کر اپنے دین کو چند ٹکوں کے عوض بیچ چکے تھے۔

ہزاروں شہری بھی نصاریٰ کی محبت کا دم بھرنے لگے اور تمام ہندو ان کے ساتھی ہو گئے۔ مسلمانوں میں دو گروہ بن گئے ایک گروہ تو ان (غیر ملکیوں) کا جانی دشمن تھا اور دوسرا گروہ ان کی محبت میں اس درجہ غلو رکھتا تھا کہ اس نے ہندوستانی لشکر کی بربادی' مجاہدین کی شوکت و وقار کی خواری اور ان کے قلع قمع کرنے میں مکر و حیلہ سے کوئی کسر نہ اٹھا رکھی تھی۔ ان کے اندر اخلاق و انسانیت کا نام و نشان تک باقی نہ تھا۔

پھر تو نصاریٰ شہر اور اس کے پھاٹکوں' دیواروں اور محافظوں پر حملہ کرنے لگے۔ ادھر جماعت مجاہدین اور لشکریوں کے ایک بہادر گروہ نے ان کے حملوں کو روکنا اور ان کے مقاصد میں حائل ہونا اپنے لیے اہم ترین فرض قرار دیا۔ دن رات پیدل اور سوار دادِ شجاعت دینے لگے۔

چار مہینے ۸ تک متواتر جنگ ہوتی رہی۔ دشمن اس مدت میں کثیر لاؤ لشکر اور ساز و سامان کے باوجود شہر میں داخل نہ ہو سکا۔ جب بھی حملہ کرتے تھے روکے جاتے تھے اور جس وقت اقدام کرتے تھے ٹوکے جاتے تھے۔ بہادر اور شجیان غازی بڑے زور و شور سے یلغار کو روک رہے تھے۔ عاقبت دہمبارزت میں خوب خوب جوہر دکھا رہے تھے۔ غازی مقابلے میں جرأت قدم تھے اور ہر پیش قدمی کرنے والے پر آگے بڑھ کر حملہ آور تھے۔ ان میں بہت سے جامِ شہادت پی کر سعادت کے اعلیٰ مقام پر فائز ہوئے۔ قرآن کریم میں ہے کہ نیکو کاروں کے لیے بہشت' حوریں اور اس سے بڑھ چڑھ کر بھی نعمتیں ہیں۔

اب مجاہدین کی ایک مختصر جماعت باقی رہ گئی جو صبح و شام پاسبانی کرتے رات گزارتی اور صبح ہوتے ہی دشمن کے مقابلہ پر رات کر خیر و آزما ہوتی۔ لشکریوں کی ایک جماعت کے ساتھ مل کر یہی شہر پناہ کی حفاظت اور شہری سرحدات کی نگہداشت کرتی۔ بدقسمتی سے ایک شب کو پہاڑی کی محاذی کمین گاہ پر ایک عیش پرست' بزدل اور کسل مند جماعت مقرر کر دی گئی۔ وہ اپنے ہتھیار اتار کر آرام کی نیند سو گئی اور دشمن نے موقعہ غنیمت سمجھ کر شب خون مارا اور ہتھیاروں پر قبضہ کر کے اسے قیامت تک کے لیے سلا دیا۔

جب نصاریٰ نے اس کمین گاہ پر قبضہ کر لیا تو بہت سی توپیں اور بندوقیں نزدیک ترین شہر پناہ اور قریب ترین برج پر ان کے گرانے اور محاذی پھاٹک کھولنے کے لیے لگا دیں۔ دن رات گولیوں اور بندوقوں سے گولیوں کا مینہ

برسانا شروع کر دیا جس سے شہر پناہ کی دیوار اور برجوں میں شگاف پڑ گئے' چھاتک گر پڑا اور امیدوں کے رشتے ہاتھ سے چھوٹ گئے اور حائل پردہ درمیان سے اٹھ گیا۔ کوئی لشکری اٹھنے' بیٹھنے کی وہاں قدرت نہ رکھتا تھا اور نہ دیوار پر چڑھ کر جھانک سکتا تھا' جو جھانکتا تھا گولی کا نشانہ بن کر خندق میں جا پڑتا تھا۔

اب نصاریٰ نے یہ چال چلی کہ ایک لشکر دوسرے دروازے کی طرف روانہ کیا تاکہ دوسری طرف سے حملہ محسوس کیا جائے۔ یہ دیکھ کر مجاہدین اور لشکریوں کا گروہ ادھر متوجہ ہو گیا اور دشمن کا مکر نہ سمجھتے ہوئے وہاں مدافعت میں مشغول ہو گیا۔ یہ موقعہ پا کر نصاریٰ اور ان کا لشکر اسی گرے ہوئے چھاتک' ٹوٹی ہوئی دیوار اور منہدم برج سے داخل شہر ہو گیا اور وہاں انہیں کوئی مزاحم و مدافع نہیں ملا۔

وہ تلاش کر کے ان لوگوں کے گھروں میں پہنچے جو پہلے ہی سے ان کے معاون و مددگار بن چکے تھے۔ انہوں نے فوراً ان کی حفاظت کا گھروں میں انتظام کیا اور جلد جلد پہلے سے تیار شدہ ضیافت سے نوازا۔ انہیں خوب پیٹ بھر کر گوشت اور دودھ کھلایا پلایا اور تمام ضروریات کی چیزیں مہیا کیں۔ مکانوں کے دروازے بند کر کے دیواروں میں روزن (سوراخ) کر دیے تاکہ جو بائی ادھر آ نکلے اس پر گولی چلا کر اپنی حفاظت کر سکیں چنانچہ جو لشکری یا شہری ادھر آ نکلا یہ بندوق چلا کر مار ڈالتے اور مقابل کا ان پر کوئی قابو نہ چلتا تھا۔

وہ فرصت کے منتظر رہتے تھے کہ موقعہ پا کر اپنے دوستوں کے گھروں کی طرح دوسرے گھروں میں پہنچ کر انہیں شب و روز کی آرام گاہ بناتے لیکن وہ لشکری جب بھی نکلتے پکڑ کر قتل کر دیے جاتے۔ اس لیے جہاں انہیں مقابلہ کا اندیشہ ہوتا وہاں بہت کم نکلتے۔ اس کے باوجود انہیں پیہم لڑائی سے مسلسل مدد پہنچ رہی تھی اور پریسائی دوست اور ہنگرو ان کی مدد میں پیش پیش تھا۔

بڑی مصیبت یہ آ پڑی تھی کہ شہر میں غلہ کوئی جانے نہ پا رہی تھی اور بڑی عام کمی پڑ رہی تھی (بادشاہ) اپنے اہل و عیال کو لے کر شہر سے نکل کھڑا ہوا۔ مقصد یہ تھا کہ وہ اصل اپنی مہم اور شاہانہ وقار کو ملحوظ تھا' جس نے کذب و بہتان سے کام لے کر روحہ کے میں ڈال رکھا تھا۔ اس نے یہ کہہ کر بادشاہ کو پھسلایا تھا کہ نصاریٰ قابض ہونے کے بعد اس کے ساتھ اچھا سلوک کریں گے اور اسی کو بزرگی سپرداری بخش دیں گے۔ وہ فریب خوردہ ان شیطانی وعدوں اور ابلیسی آرزوؤں پر خوش تھا۔ بادشاہ کے ساتھ اس کے تمام امراء و متعلقین بھی اپنے اہل و عیال کو لے کر گھروں میں مال و متاع چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ ان سب کے شہر چھوڑ کر چلے جانے سے شہریوں پر رعب طاری ہو جانا قدرتی امر تھا چنانچہ مرعوب و دہشت زدہ لوگ بھی مکان چھوڑ کر بھاگ نکلے۔

جب شہر کے مکان مکینوں سے خالی ہو گئے تو نصاریٰ اور ان مکانوں کا لشکر ان میں داخل ہو گیا۔ انہوں نے مال و متاع لوٹا اور باقی ماندہ ضعیفوں، بچوں اور عورتوں کو قتل کرنا شروع کیا۔ بہادران شہر میں سے ایک بھی ایسا نہ بچا تھا جو ان کا کسی اعتبار سے مقابلہ کر سکتا۔

باغی لشکروں میں سے بعض تو نصاریٰ کے قبضہ سے پہلے ہی بھاگ گئے، بعض قبضہ کے بعد ثابت قدم نہ رہ سکے اور بعض کئی بار شہر میں معروف کارزار رہ کر بے دم ہو چکے تھے۔ اب پیلیوں اور دوسرے ہندوؤں نے جو نصاریٰ کے دوست تھے اور بادشاہ کے ان کارپردازوں نے جو مجاہد گروہ کے دشمن تھے ایسی تدبیر سوچی جس سے شہریوں اور لشکریوں کو ہلاک کر سکیں۔ انہوں نے ہوسِ غلہ جو پیوں کے پاس تھا پھیلا دیا اور دیہات و قصبات سے جو ان کے پاس اناج آتا رہتا تھا وہ روک دیا۔ یہ تدبیر کارگر ہوئی، لشکری اور شہری بھوک، تباہی، سوزش اور بے چینی سے دن گزارنے لگے بالآخر وہ مجبور و پریشان ہو کر بھاگ گئے۔ پھر تو نصاریٰ نے شہر کے پھاٹک، شہر پناہ، قلعہ، بازار اور مکانوں پر مکمل قبضہ جما لیا۔

اس وقت دہلی میں میرے اکثر اہل و عیال موجود تھے اور مجھے بلایا بھی گیا تھا۔ ساتھ ہی فلاح و کامیابی اور کشائش و شادمانی کی امید بھی تھی۔ جو کچھ ہونے والا تھا وہ تو پہلے ہی مقدر ہو چکا تھا چنانچہ میں نے دہلی کا رخ کر دیا۔ وہاں پہنچ کر میں اہل و عیال سے ملا اور اپنی عقل اور فہم کے مطابق لوگوں کو اپنی رائے اور مشورہ سے آگاہ کیا لیکن نہ انہوں نے میرا مشورہ قبول کیا اور نہ میری بات مانی۔

جب نصاریٰ کا شہر پر اچھی طرح قبضہ ہو گیا اور کوئی لشکری و شہری باقی نہ رہا۔ قلعہ اور پانی دشمنوں کے قلم و استبداد کی وجہ سے ناپید ہو گیا تو پانچ شبانہ روز اس حالت میں گزار کر اپنی عزیز ترین متاع کتابیں، مال و اسباب چھوڑ کر (بار برداری کا انتظام نہ ہو سکنے کی وجہ سے) بظاہر بے سر و سامان گرتے پڑتے اہل و عیال کو ساتھ لے کر نکل کھڑا ہوا۔

شہر اور اس کے مال و دولت پر سلیدی لشکریوں کے ذریعہ قابض ہو کر نصاریٰ کی تمام تر توجہ بادشاہ اور اس کے بیٹوں اور پوتوں کے پکڑنے کی طرف مبذول ہوئی۔ ان سب نے اب تک اپنا مستقر (مقبرہ) نہ چھوڑا تھا، تقدیر الٰہی نے انہیں وہیں برقرار رکھا تھا۔ انہیں اپنے جھوٹے اور مکار وزیر کی کذب بیانی پر اعتماد تھا۔ وہ اس مقبرہ میں بڑے خوش اور مگن تھے۔ تحمد مزے ہوئے دن گزار رہے تھے۔

اس فریب خوردگی کا نتیجہ یہ ہوا کہ حسرت کشیدہ دل، بیٹوں اور پوتوں کے ساتھ پابزنجیر شہر کی طرف لے جایا گیا۔ راستے میں بیٹوں اور پوتوں کو کسی سردار نے بندوق کا نشانہ بنایا، دھڑ وہیں پھینک کر سروں کو خوان میں لگا

کر بادشاہ کے سامنے تحفۃً پیش کیا پھر ان سروں کو بھی بگل لٹکا کر پھینک دیا۔

بادشاہ کو گورے منہ، سیاہ دل، گندمی بال اور کنجی آنکھ والوں کی حراست میں سوئی کے سوراخ سے بھی تنگ کوٹھری میں مقید کر دیا۔ پھر اس وسیع ملک سے نکال کر ذورہ راز جزیرہ ۳۱ میں پہنچا دیا۔

بادشاہ کے ساتھ اس بیگم کو بھی روانہ کیا گیا جو نصاریٰ کی اس وقت بھی صلح دوست تھی بلکہ وہ حقیقت میں ملکہ تھی۔ وہ اپنی آرزوؤں (بیٹے کی جانشین بنانے) میں ناکام رہی اور اس کا جمع کردہ مال بھی چھین لیا گیا۔ وہ زینت ۱۴ بیٹے کے بعد بدصورت اور خاصت کے بعد بدہیئت بنی۔ بادشاہ کی قوم میں سے جو بھی ملتا اس کی گردن ماردی جاتی یا پھانسی دی جاتی جیسا کہ دوسرے لوگوں کے ساتھ بھی عمل کیا گیا۔ ان کمزوروں میں سے وہی بچ سکا جو رات میں چھپ کر یا دن میں نظریں بچا کر چوری سے بھاگ گیا اور ایسے خوش نصیب بہت کم تھے۔

پھر نصاریٰ نے شہر کے گرد و نواح کے رئیسوں اور سرداروں کو قتل کرنا، ان کی جائیداد، ذخائر، مویشی، مال و متاع، ہاتھی گھوڑے، اونٹ اور ہتھیاروں وغیرہ کو لوٹنا شروع کیا۔

اسی پر اکتفا نہ کیا بلکہ ان کے اہل و عیال کو بھی قتل کرڈالا حالانکہ یہ سب رعایا بن چکے تھے اور ڈرپاکی سے فرمانبردار بن ہی جاتے۔ انہوں نے تمام راستوں پر چوکیاں بٹھادیں تاکہ بھاگنے والوں کو پکڑ پکڑ کر لایا جائے۔ ہزاروں بھاگنے والوں میں سے تھوڑے ہی بچ پائے اور باقی سب پکڑے گئے۔ ان لوگوں کے پاس جو کچھ چاندی، سونا نکلا پہلے تو وہ چھین لیتے، پھر چاندی، تبیذہ یا جامہ جو کچھ ہاتھ لگتا چھوڑتے۔ اس کے بعد افسروں کے پاس پہنچا دیتے اور وہ ان کے لیے قتل یا پھانسی کی سزا کا فیصلہ کرتے۔ جو ان بوڑھا شریف اور رذیل سب کے ساتھ یہی سلوک ہوتا۔ اس طرح پھانسی پانے والوں اور قتل ہونے والوں کی تعداد ہزار بایک پہنچ گئی۔ خانساموں کے ظلم کا شکار اکثر و بیشتر مسلمان تھے۔ ہندوؤں میں سے صرف وہ مارے گئے جن کے متعلق دشمن دوست ہونے کا یقین تھا اور مسلمانوں میں سے فقط وہ بچ سکے جو کسی نہ کسی طرح وہاں سے ہجرت کر گئے تھے یا وہ جو نصاریٰ کے ناصر اور اپنے دین و مذہب سے قاصر تھے، یا وہ جو ان کے جاسوس اور اللہ کی رحمت سے مایوس تھے۔ انہیں میں سے بادشاہ کا وہ عامل بھی تھا جس نے نصاریٰ کو مسلط کر کے حاکم بنایا تھا لیکن اسے امیدوں کی محرومی اور ناکامی کی حسرت کا غم اٹھانا پڑا۔ اس کا حال حقیر ہو گیا اور زمانے میں ذلیل و خوار ہو کر جیا۔ دنیا اور آخرت دونوں جگہ نقصان میں رہا اور یہی کھلا ہوا نقصان ہے۔

ادھر نصاریٰ نے ماتحت ہندوستان کے پاس پیغام بھیجا کہ جو شخص بھی تمہارے علاقہ میں سے گزرے اسے مار

لیا جائے۔ ان بدطواروں نے کافی تعداد میں مسافروں اور مہاجروں کو پکڑ کر نصرانی سرداروں کے پاس پہنچا دیا۔ ان ظالموں نے سب کو مار ڈالا۔ نہ کوئی عالی خاندان فرد بچ سکا نہ کسی ادنیٰ انسان کو چھٹکارا نصیب ہوا۔ پھر اطراف واکناف ملک میں لشکر جیسے جنہوں نے قتل و غارت گری کی انتہا کر دی۔

اس اثناء عظیم میں پردہ نشین خواتین پیدل نکل کھڑی ہوئیں۔ ان میں بوڑھی اور عمر رسیدہ بھی تھیں جو تھک کر عاجز ہو گئیں اور بہت سے خوف کی وجہ سے جان دے بیٹھیں۔ بچا کھچوں عفت و عصمت کی بنا پر ڈوب کر مر گئیں۔ اکثر پکڑ کر قیدی بنا لی گئیں اور طرح طرح کی مصیبتوں میں مبتلا ہو گئیں۔ کچھ کو بعض رذیلوں نے لونڈیاں بنا لیا اور بعض چند ٹکوں کے عوض بیچ ڈالی گئیں۔ بہت سی بھوک پیاس کی تاب نہ لا کر مر گئیں اور بہت سی ایسی غائب ہوئیں کہ پھر نہ لوٹ کر آئیں اور نہ ان کا پتہ چل سکا۔

ہزاروں عورتیں اپنے سر پرستوں 'شوہروں' باپوں' بیٹوں اور بھائیوں سے جدا کر دی گئیں۔ وہ ایسی مصیبت کا زمانہ تھا جو قیامت کا منظر پیش کر رہا تھا کہ اس دن انسان اپنے بھائی' ماں' باپ' بیوی' اولاد اور اہل خاندان سے بھاگتا نظر آئے گا۔ بہت سی صبح کی سہاگن عورتیں شام کو بیوہ بن گئیں اور شب کو آغوش پدر میں سونے والے بچے یتیم ہو کر اٹھے۔ کتنی ہی عورتیں اپنی اولاد وغیرہ کے غم میں گریہ وزاری کرتی تھیں اور کتنے مردوں کی آنکھوں سے آنسوؤں کا دریا جاری تھا۔ شہر چٹیل میدان اور بے آب و گیاہ جنگل بن گیا تھا اور شہری تباہ و برباد منتشر ہو گئے تھے۔

اس کے بعد نصاریٰ کی توجہ مشرقی شہروں اور دیہات کی طرف مبذول ہوئی۔ وہاں بھی بڑا فساد مچایا' قتل' غارتگری اور پھانسی کا بازار گرم کر دیا۔ بے شمار مرد اور پردہ نشین مستورات موت کی گھاٹ اتر گئے اور سینکڑوں' ہزاروں رعایا کے آدمی مار ڈالے گئے۔

میرا کیا پوچھنا؟ میں اپنے وطن مالوف (شیر آباد) کی طرف چلا جا رہا تھا۔ راستہ خوفناک اور راہگذار اندوہ ناک تھا۔ میرے اور دشمن کے درمیان کئی خوف و خطرے بھری ہوئی منزلیں تھیں۔ نصاریٰ اور ان کا لشکر دن رات تلاش و تجسس میں سرگرداں رہتا۔ جانوں کو مسافروں کے مار ڈالنے' ڈرانے' لوٹنے اور ڈاکہ ڈالنے کی کھلی چھٹی دے دی گئی تھی۔

انہوں نے سارے ناکے بند کر رکھے تھے اور کسی گھاٹ پر کوئی کشتی یا ناؤ تک نہ چھوڑی تھی۔ کشتیوں کو پھاڑ ڈالتے یا تک خراب کر کے غرق کر دیتے یا جلا ڈالتے۔ ملاحوں کو روک دیا تھا تاکہ کوئی سیاح یا مسافر کسی وقت بھی ادھر سے نہ گزر سکے۔

خدائے مالک الملک نے مجھے اور میرے متعلقین کو ہر مصیبت و بلاکت سے محفوظ رکھ کر ذلیل اور کشتی کی مدد کے بغیر دریاؤں اور سمندروں کو عبور کرا کے نجات دی اور ہم سب کو آفات مسافات' مہالک مسالک' حوادث راہ اور مصائب گزرگاہ سے مصون و مامون رکھا اور اپنی پوری حفاظت' کامل حمایت' مکمل نعمت اور بے شمار رحمت کے ساتھ ہمیں اپنے جوار و دیار اور احباب و رشتہ دار تک پہنچایا۔ ہم خدا کی اس بے پناہ عنایت اور تمام آفات سے حفاظت پر اس کا شکر بجا لائے۔

نصاریٰ کے باغی گروہوں اور ہمارے نواح کے متعدد لشکروں نے اپنے سابق معمول والی وبا کی ایک مہم بجا لا اور اس کے ایک تاجر کو بکار اور نا سمجھ لڑکے کا امیر و حاکم بنا ڈالا۔ نصاریٰ نے اس والی سے اس کا ملک چھین لیا تھا۔ وہ بڑا اوباش و لاابالی تھا۔ عیش و طرب میں منہمک' انتظام ملکی سے غافل' عقل و خرد سے بیگانہ اور نقض عہد و میثاق میں بیباک۔ نتیجہ نصاریٰ کی عملداری ختم ہونے پر وہ ملک مالک بن گئی۔ اس لڑکا چھوٹا' ناتجربہ کار' ناز پروردہ' ہم سنوں کے ساتھ کھیلنے والا اور دشمن سے لاپروا تھا۔ تدبیر امور' مملکت' اجراء احکام اور قیادت فوج کی صلاحیت نہ رکھتا تھا۔ اس کے اعیان و اکابر سلطنت اور ارکان دولت سب کے سب نااہل' سست' بزدل' احمق' خائن اور غیر دیانتدار تھے۔ اکثر ذلیل اور بعض بندگان زر تھے۔

ان میں سفلہ' عیش پرست' نادان' بلند آواز' سست' منافق' چرب زبان' ذلیل' غلام زادہ' حیران و پریشان' ظالم و جابر' حیلہ ساز و مکتسب خائن و مکار' بندہ و نعمت خور' سبھی قسم کے لوگ تھے۔

بعض ایسے بھاگنے والے مدبر تھے کہ ان کی تدبیر جانوروں کی طرف لے جاتی تھی اور صاحب نظر افراد کو عبرت کے عجیب مناظر دکھاتی تھی۔ ان میں سے اکثر نصاریٰ کے معاون و مددگار اور محب و وفا شعار تھے اور یہ سب کے سب دشمن کی ہلاکت خیز تدبیروں سے ناواقف اور ان کی مصلحت اندیشی سے بے بہرہ تھے۔

نصاریٰ اپنے بچوں اور کمزوروں کے ساتھ شہر وبیں محصور محو خلاف مرضی کی ناقص تدبیروں کی وجہ سے اپنے مکانوں میں محفوظ تھے۔ نصاریٰ نے خندقیں کھود کر اور حصار بنا کر ان مکانوں کو قلعہ کی شکل دے لی تھی اور مقابل لشکر ان پر حملہ آور ہو کر پسپا ہو جاتا تھا۔ اسی حالت میں محصورین کی امداد کے لیے سفید رو گروہ آ گیا۔ شہر میں داخل ہونے لگا تو بہادر غازیوں نے ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ بہت سے گورے مارے گئے' باقی ماندہ دل شکستہ اور حسرت زدہ ہو کر محصورین تک پہنچ گئے۔ پھر تازہ دم ہو کر یہ مکانوں سے نکلے تو بزدلی اور کوتاہی کی وجہ سے کوئی مقابلہ پر نہ آیا۔ نصاریٰ نے شہر سے دو میل دور باغ پر قبضہ جما لیا اور قوت و بہادری سے اسی کو اپنا گڑھ بنا لیا۔ وہاں عدد پر مدد اور

سامان پر سامان جمع کر لیا۔

وہ لشکر جو شہر میں پہلے سے موجود تھے اور وہ جو دلی سے بھاگ کر بیگم کی پناہ میں آ گئے تھے جن کو ملکہ نے قدر و منزلت کے ساتھ جود و بخشش سے نوازا تھا اور تحفوں اور دلداریوں کا وہ جم غفیر جو حرب و ضرب سے نابلد اسلحہ بندی سے ناواقف اور مصلحت و معرکہ سے ناآشنا تھا' یہ سب اس باغ پر خندقیں کھود کر اور کمین گاہ بنا کر جا ڈٹے۔

دونوں فریقوں میں ایک مدت تک مقاتلہ و مقابلہ اور نیزہ بازی و تیر اندازی ہوتی رہی۔ تنگ آ کر نصاریٰ نے پہاڑوں کے والی سے مدد مانگی۔ اس نے ان کی آرزو کے مطابق تیس ہزار سے زیادہ پہاڑی لشکر بھیج کر مدد کی۔

اب تو نصاریٰ کی گوری فوجوں کو ان کے سپاہیوں اور لڑاکا معاونوں نے ایک ساتھ حملہ کر دیا۔ یہ حملے بڑے سخت' متواتر اور مسلسل تھے جنہوں نے مقاتلین کو ان کی جگہ سے ہلا دیا اور ان کے پاؤں اکھاڑ دیے۔ وہ کمین گاہوں سے ایسی بُری طرح بھاگے کہ شہر کی سرحدوں پر بھی نہ ٹھہر سکے۔ ملکہ اور اس کے لڑکے کو تنہا محل میں چھوڑ بھاگے۔ ان دونوں سے دشمنی کی بجائے ارکان دولت' اعیان سلطنت نے وفا کیا اور وہ دیرینہ جوان کے علاقہ سے ان کی مدد و اعانت' عزت و آبرو' مال و دولت کی صیانت و حفاظت کے لیے آئے تھے عہد شکنی کر کے اور کفر کو ایمان سے بدل کر منافق بن گئے۔ نصاریٰ کی موافقت و رفاقت کرنے لگے' نصاریٰ مع معاونین شہر میں داخل ہو گئے اور شہر کے رہنے والے گھروں کو خالی کر کے نکل گئے۔

نصاریٰ اور ان کی گوری فوج اور مددگاروں نے اس محل شاہی کا جس میں ملکہ تھی محاصرہ کر لیا' بیگم اپنے ولی عہد اور دو سہیلیوں کو لے کر محصور محل کی پشت سے نکل کر دوسرے محلہ میں تیزی سے پیدل پہنچ گئی۔

تین دن شہر میں رہ کر بھاگے ہوئے لشکر کو واپس کرنے اور اس سے مدد حاصل کرنے کی کوشش کرتی رہی۔ وہ لشکر ایسا وحشت زدہ ہوا تھا کہ کسی صورت سے اس تاریک سوقہ پر دلگیری کو تیار نہ ہوا' اس میں سے کوئی بھی نہ لوٹا اور نہ شہر بھر میں کہیں جائے پناہ ہی رہی۔ آخر کار بیگم اپنے اعوان و انصار سے مایوس ہو کر ولی عہد اور چند ساتھیوں کو ساتھ لے کر چنبیل میدان اور بے آب و گیاہ جنگل کی طرف چل کھڑی ہوئی۔ اب اس کے گرد کمزور دل سواروں کی کچھ جماعتیں' پیدل مردوں کا انبوہ اور کثیر شہریوں اور عزت دار عورتوں کی کافی تعداد آ کر جمع ہو گئی۔

وہ شہری ننگے بدن اور ننگے پاؤں تھے حالانکہ سرداروں میں سے تھے اور عورتیں ننگے پاؤں اور بے پردہ تھیں' حالانکہ گرامی قدر پردہ نشین اور محل سراؤں کی رہنے والی تھیں۔ وہ سرسبز و شاداب خطوں سے چنبیل میدانوں کی طرف پھینک دی گئیں۔ وہ پیدلوں کے کپڑے پہن کر ستر پوشی کرتی تھیں اور برقعے نہ ہونے سے اسی پر اکتفا کرتیں۔

ایک میدان سے دوسرے میدان میں پہنچیں اور بے پردگی میں روز بروز اضافہ ہوتا رہتا۔ وہ عیش و عشرت میں زندگی بسر کرتی تھیں پھر دور دراز جنگل اور پُر خطر میدان میں ڈال دی گئیں۔ ان لوگوں کو محلات' پالکیاں اور ریاستیں چھوڑنا پڑیں حالانکہ وہ ان سے ذرا بھی ہلنا نہ چاہتے تھے یہاں تک کہ حال حقیر اور ہلاکت عام ہوگئی۔ یہ ایسی مہلک مصیبت نازل ہوئی جس نے شہروں کو میدان' آزادوں کو غلام' مالداروں کو فقیر و مسکین اور شریفوں کو خوار و ذلیل بنا دیا۔ وہ اپنے اہل و عیال میں آرام و آسائش کی زندگی بسر کر رہے تھے' خوش حال اور فارغ البال تھے کہ مجبور ہو کر نکلنا پڑا۔ فقیری و تنگدستی نے بہتوں کی مجالست اور اضطراب و اضطرار نے برابر والوں کی رفاقت سے دور کر دیا۔

رونے والے آہ و زاری' بیمار' غریب و دشوار کرتے' آہ و فغاں چلاتے اور حسرت کشیدہ انا للہ پڑھتے' بچے اپنی ماؤں کے سینوں سے قبل از وقت جدا کر دیے گئے تھے۔ بوڑھے اور جوان حاجتوں کے پورا کرنے سے ناامید تھے' نان کا کوئی ٹھکانا تھا' نہ بیماری کی دوا تھی' ان کے دل خالی تھے' ان میں نہ کوئی خواہش تھی نہ انہیں کوئی بات بھاتی تھی۔ زندگی اور موت ان کے لیے دونوں برابر تھے۔ وہ مسرت و شادمانی' تخت شاہی' دیباج و حریر' میوے' خوش طبعی' عیش و عشرت' نظافت و زیبائش' نزاکت و لطافت' نعمت' سرور و مال و دولت' خیر' گائی' سرور میں پلے تھے۔ آج ان کی راہ میں کانٹے ہیں' سامان و زاد راہ کا پتہ نہیں' کپڑے بوسیدہ ہیں اور عیش و راحت میں کوئی حصہ نہیں۔ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے انہیں معاف کرے اور ظالموں کو سخت گرفت میں لے۔

بھروالیہ یعنی حضرت عالیہ' اس لشکر کو جو بھاگ کر اس کی پناہ میں آ گیا تھا اور دوسرے ساتھیوں کو لے کر ایسے دریاؤں اور نہروں سے گزری جن سے بغیر کشتی کے عبور مشکل و دشوار تھا۔ وہ شمالی ملک میں دریا کے کنارے ایک گاؤں میں اپنے ساتھیوں کے ساتھ اقامت گزیں ہوگئی اور دریا کے گھاٹوں پر سوار' پیادے بٹھا دیے تاکہ تمام کشتیوں پر قبضہ کر لیں اور دشمنوں کو دریا عبور نہ کرنے دیں۔ اس نے انتظام رعایا اور حصول خراج کے لیے شہروں اور قصبات و دیہات میں عامل بھیج دیے اور لشکروں کو آراستہ کر کے اپنے اس دار السلطنت کے قریبی مورچوں پر جس پر اب نصاریٰ کا قبضہ ہو چکا تھا' بھیج دیا تاکہ اگر دشمن ادھر کا قصد کرے تو اس کا ڈٹ کر مقابلہ و مقاتلہ اور مزاحمت و مجادلہ کیا جائے۔ یہ تمام امور ہمہ اور ان کا اہتمام و انصرام ایسے ذلیل' غافل اور تحقیر عامل ۳۳ کو سونپا گیا تھا جو کسی طرح اس کا اہل نہ تھا۔

وہ صحیح مشورہ سے گریزاں اور جہل سے ہمکنار تھا۔ آسان بات کو سخت اور دشوار کو آسان سمجھتا۔ وہ ذلیل' احمق اور بزدل تھا۔ اس نے مکالمت اور مشاورت' مجالست اور مناوحت کے لیے احمق' جاہل اور ذلیل طبقہ کو چن رکھا تھا۔

وہ نخوت و غرور کی بنا پر شریف سرداروں اور عقلمند رہنماؤں سے پہتا اور اپنے ہی اہل خاندان اور اعزہ میں سے جاہلوں اور احمقوں کو مصاحب و حاکم بناتا۔ چنانچہ اس نا تجربہ کار نے ان لشکروں پر کمین' ذلیل' بزدل اور رذیل لوگوں کو سردار بنا دیا۔ وہ بڑے ہی لالچی تھے جو کچھ لشکریوں کو خوراک وغیرہ دی جاتی' کھا جاتے۔ وہ بددیانت تھے۔ اپنی کینہ پروری کی وجہ سے ان کے غلہ اور جنس میں خیانت کرتے اور گراں فروشی کے مرتکب ہوتے۔ ہر آواز کو دشمن کی آواز سمجھتے اور ہمیشہ اضطراب کے ساتھ خوف کی وجہ سے لرزتے رہتے۔ کسی وقت بھی ان کو راحت و سکون میسر نہ تھا۔ بزدلی سے ہر آواز کو موت کا پیش خیمہ اور ہر صدا کو موت کی پکار سمجھتے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ کینے دشمنوں کے سامنے محبت و حاجت کے ساتھ پیش کیے جا رہے ہیں۔

نصاریٰ دار السلطنت پر قبضہ کرنے کے بعد وہیں ڈٹے رہے اور اطراف و جوانب کی طرف نہ نکلے۔ انہوں نے گرد و نواح کے کافروں' دیہاتیوں اور کاشتکاروں کی تالیف قلب شروع کر دی۔ ان کی خطاؤں کو درگزر' ان کے خراج میں تخفیف اور تاوانوں میں کمی کی۔ اس مہربانی پر وہ مطیع و فرمانبردار و معاون و مددگار بن گئے۔ ادھر سے مطمئن ہو کر اطراف ملک میں شہر و دیہات پر قبضہ کرنے کے لیے نصاریٰ نکل کھڑے ہوئے۔

جب نصاریٰ اس مرصد ۲۴ کی طرف متوجہ ہوئے جو دار السلطنت سے جانب شمال آٹھ میل کے فاصلہ پر واقع تھا اور جس میں سوار' پیادے اور وہ رذیل و ذلیل قائد عظیم بھی تھا تو وہ کمین قائد ان کی آمد کی خبر سن کر اپنے ذلیل سرداروں کے ساتھ بھاگ گیا۔ بہادر ہندوؤں کی تھوڑی سی تعداد اپنے گاؤں کے بہادر مکھیا کے ساتھ مقابلہ پر ڈٹ گئی۔ یہ سو سے زیادہ نہ تھے۔ دشمنوں کو فنا کر کے گھاٹ اتار کر خود بھی کٹ گئے۔ وہ افراد کی عار برداشت نہیں کر سکتے تھے اور بھگوڑے قائد کی طرف کافی لشکر اور ساز و سامان کے ہوتے ہوئے بھی انہیں کوئی مدد نہیں پہنچ سکی تھی۔

نصاریٰ نے جب اس گاؤں کو جس میں وہ نامرد خائن' عاجل مجاہد اشت کے لیے موجود تھا' خالی اور ویران پایا تو اس پر قبضہ جما کر اپنا مضبوط و محفوظ قلعہ بنا لیا۔ وہیں فوج جمع کر لی اور مدت تک وہیں مقیم رہے اور وہ ایک میل بھی نکل کر نہ گئے۔ وہ سردارانِ لشکر کی امیدوں کی تکمیل اور ان خائنوں کے ایفاء عہد کے منتظر تھے اسی لیے اپنے ایفاء وعدہ میں بھی تاخیر کر رہے تھے۔

ادھر سے فارغ ہو کر انہوں نے اس مغربی گوشے کا رخ کیا جہاں کے تمام باشندے ان کے مطیع ہو چکے تھے اور دشمنوں پر ان کے معاون تھے۔ وہاں بھی ملکہ کی طرف سے ناعاقبت اندیش' غیر مدبر' ناتجربہ کار اور ذلیل عامل تھا' وہ بھی پیٹھ پھیر کر مقابلہ کیے بغیر بری طرح بھاگا۔ سرنگ میں ہو کر اپنا راستہ بنایا' اس کے پاس سوار اور پیادے بھی کم

تھے۔ اس پر ستم یہ ہوا کہ کفار اور دیہاتیوں نے معاہدہ وقسم کے باجود وقت پر دغا کیا اور غدر وکفر کی انتہا کر دی۔ نازو نعمت اور پُرعیش وسرت زندگی کا کفران کیا' معاہدوں سے انکار کر کے کفر میں اضافہ اور ارتداد میں زیادتی کر لی۔

اس موقعہ پر مقتلط نصاریٰ سے قتال کے لیے دوسری طرف کا ایک عالم ۲۵ اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے خیرات وبیرات اور سعادت وحسنات کا کافی ذخیرہ اپنے اندر جمع کر لیا تھا۔ وہ بڑا ہی پاک طینت' صاف باطن' متقی' پرہیز گار' بہادر اور رسول ملاحم اور نبی مراحم ﷺ کا ہم نام تھا۔ اس نے نصاریٰ کے لشکر پر حملہ کر کے پہلے ہی حملہ میں شکست دے دی۔

اپنی ساری کوششیں ختم کر کے وہ بھاگے اور قصبہ کے ایک ہندو کے مضبوط ومحفوظ مکان میں پناہ لینے پر مجبور ہوئے اور عظماء نصاریٰ کے پاس شہر میں پیغام بھیج کر مدد مانگی۔ انہوں نے ایک لشکر اور منافقین ودہاقین کا جم غفیر جنہوں نے عہد عثمنی کی تمنی ان محصورین کی مدد کو بھیج دیا۔

ادھر اس نیک سرشت بہادر عالم سے ایک دیہاتی کافر زمیندار ۲۶ نے بڑا داؤ کھیلا۔ اس نے قسمیں کھا کر اطمینان دلایا کہ جب دونوں جماعتیں مقابلہ پر آجائیں گی تو چار ہزار بہادروں کا گروہ لے کر مدد کو پہنچوں گا۔ جب مقابلہ کی نوبت آئی تو اس زمیندار کی قسموں پر بھروسہ کر کے اس دیانتدار عالم نے اپنے تھوڑے سے بہادروں کے ساتھ دشمن پر حملہ کر دیا۔

نتیجہ یہ ہوا کہ سامنے سے تو بندوقوں اور توپوں سے چھروں اور سینوں پر نصاریٰ نے گولیاں برسائیں اور پیچھے سے اس غدار مکار زمیندار کی جماعت نے پشت وسرین کو پھوڑنا شروع کیا۔ وہ دراصل نصاریٰ کے انصار واعوان اور شیاطین کے اتباع واخوان تھے۔ وہ خدا پرست عالم معرکہ میں گر کر شہید ہوا اور اس کی ساری جماعت نے بھی اسی کے نقش قدم پر چل کر جام شہادت نوش کیا۔

ان سب ابرار واخیار کی شہادت کے بعد بزدل لوگ ایسے بھاگے کہ نامردی اور اضطراب سے پیچھے مڑ کر بھی نہ دیکھا۔ نصاریٰ نے تعاقب کر کے ان سب کو پکڑ کر قتل کر ڈالا۔ تھوڑے سے وہ بچ گئے جنہوں نے بھاگنے میں پوری تیزی اور عجلت سے کام لیا۔ اس نواح کے سارے باشندے دہقانی' کاشتکار' کھیا اور مقدم وغیرہم سب مطیع وفرمانبردار بن گئے البتہ دو بہادر غیرت مند اور غارت گر جو اشرروں نے خوب جم کر مقابلہ کیا۔ انہوں نے اپنی بے پناہ شجاعت وبسالت سے قلت اسباب وجماعت کے باوجود دشمن کے ہزاروں سوار' پیادے ٹھکانے لگا دیے۔ آخر کار مجبور ہو کر اپنی بہادری سے جان بچا کر نکل گئے اور دشمن ان کا تعاقب نہ کر سکا۔ اب وہ نواح بھی صاف ہو گیا

تو ان دونوں سرداروں کی شکست کے بعد مخالفوں کے دل میں دشمن کا رعب قائم ہو گیا۔

یہ واقعہ رنجیدہ واقعات میں سے سب سے اہم اور آخری واقعہ اور اس جنگ کا خاتمہ تھا۔ نصاریٰ یہاں غالب ہونے کے بعد دوسرے اطراف میں پھیلنا شروع ہوئے۔ وہ جب کسی طرف کا قصد کرتے تو وہاں کے رہنے والے غم وفکر میں مبتلا ہو جاتے اور لڑے بغیر شکست مان لیتے۔

ان تمام فتح مندیوں کے بعد بھی ملکہ نصاریٰ (وکٹوریہ) مکر سے باز نہ رہی۔ اس مکر کی وجہ سے انہیں بڑی قوت وطاقت حاصل ہو گئی۔ اس نے تمام دیہات، شہروں اور قصبوں میں مطبوعہ حکم نامے جاری کیے جن میں عام معافی کا اعلان کیا کہ تمام "باغی" لشکر اور سرکش ونافرمان رعایا کو ان لوگوں کو چھوڑ کر معاف کیا جاتا ہے جنہوں نے عورتوں، بچوں اور ان نصاریٰ کو جنہوں نے مجبور ہو کر پناہ لی تھی، ظلم وعداوت سے قتل کر ڈالا یا وہ جنہوں نے سلطنت وریاست قائم کی یا وہ جنہوں نے سرکشی وعدوان پر لوگوں کو ابھارا۔

ادھر وہ باغی لشکر اور دوسرے بیگم کے ساتھی روزی کے نہ ہونے اور تنخواہ وضروریات زندگی میسر نہ آنے سے پریشان ہو چکے تھے۔ نصاریٰ کے مسلط ومنتشر ہو جانے کی وجہ سے بیگم کے پاس خراج اور محاصل کا آنا بند ہو گیا تھا۔ زمین کی کشادگی کے باوجود ان پر زمین تنگ ہو چکی تھی۔ وہ بڑی سخت مصیبت وتنگی میں پڑ گئے تھے اور وہ سب تنگ دست اور عیش وراحت سے دور تھے۔ ان کے دل اہل وعیال کی جدائی سے پارہ پارہ تھے۔

ایسے حالات میں مجبور ومضطر ہو کر بہت سے لشکری وغیرہ نصاریٰ کے اطاعت گزار بن گئے۔ ان کے پاس ہتھیار، گھوڑے جو کچھ تھا چھین لیا گیا اور پروانہ امان دے دیا گیا۔ اب وہ اہل وطن کی طرف خائب وخاسر ہو کر لوٹے۔ پھر تو نصاریٰ سارے ملک پر بلا مزاحمت قابض ہو گئے۔ میدان کارزار اور لڑائیوں سے نجات پا گئے۔ بیگم اس تباہی وبربادی کے بعد بچے کھچے تھوڑے سے ساتھیوں کے ساتھ پہاڑوں کی چوٹیوں پر چلی گئی۔

میں مسافرت وغربت اور اضطراب ومصیبت کی زندگی گزار رہا تھا۔ میرا اشتیاق ورغبت اپنے گھر اہل وعیال، پڑوسی اور احباب تک پہنچنے کے لیے بڑھ رہا تھا کہ امن وامان کا وہی پروانہ جسے قسموں سے موکد کیا گیا تھا، نظر پڑا۔ اس پر بھروسہ کر کے اپنے اہل وطن میں پہنچ گیا۔ مجھے اس کا بالکل خیال نہ رہا کہ بے ایمان کے عہد وپیمان پر بھروسہ اور بے دین کی قسم ویمین پر اعتماد کسی حالت میں درست نہیں خصوصاً جب کہ وہ بے دین جزا وسزا آخرت کا قائل بھی نہ ہو۔

تھوڑے دن کے بعد ایک حاکم نصرانی نے مجھے مکان سے بلا کر قید کر دیا اور رنج وغم میں مبتلا ومقید کر کے دار

السلطنت (کھلونا) جو دراصل اب خانہ بلاکت تھا بھیج دیا۔ میرا معاملہ ایسے ظالم حاکم کے سپرد کر دیا جو مظلوم پر رحم کرنا ہی نہ جانتا تھا اور میری چغلی ایسے دو مرتد، جنگجو اور تنہ خو افراد نے کھائی جو مجھ سے قرآن کی محکم آیات میں مجادلہ کرتے تھے۔ جس کا حکم یہ تھا کہ نصاریٰ کا دوست بھی نصرانی ہے۔ وہ دونوں نصاریٰ کی مودت و محبت پر مُصر تھے اور انہوں نے مرتد ہو کر کفر کو ایمان سے بدل لیا تھا۔

اس ظالم حاکم نے میری جلا وطنی اور عمر قید کا فیصلہ صادر کر دیا اور میری کتابیں، جائیداد، مال و متاع اور اہل و عیال کے رہنے کا مکان، غرض ہر چیز پر غاصبانہ قبضہ کر لیا۔ اس شرمناک رویہ کا تنہا میں ہی شکار نہ بنا تھا بلکہ بہت سی مخلوق سے اس سے بڑھ چڑھ کر ناروا سلوک روا رکھا گیا۔ انہوں نے عہد و پیماں توڑ کر ہزاروں مخلوق خدا کو پھانسی دی اور انہیں قتل، جلا وطنی اور قید جیسی میں مبتلا تعذیر مبتلا کر دیا۔ وعدہ خلافی کر کے بے شمار نفوس اور لاتعداد نفیس چیزوں کو تباہ کر ڈالا۔ اس طرح خونِ ناحق شمار سے آگے بڑھ گیا۔ سینکڑوں اور ہزاروں سے کتنی نہیں ہو سکتی۔ اسی طرح شریف و غیر شریف قیدیوں کی تعداد حد سے متجاوز ہے خصوصاً رومی اور ہمارے دیار کے مابین وسیع ملاقے میں جہاں شریف و حقیر خاندانوں کے شہر کے شہر گاؤں کے گاؤں اور قصبے کے قصبے آباد ہیں۔

ان شرفاء عظماء کے پاس ایک رئیس نے جو اسلام و ایمان کا عدو بھی تھا۔ دار الریاست میں طلبی کے ساتھ امن و امان کا پیغام بھیجا۔ وہاں پہنچنے پر اپنے وعدے سے پھر کر نصاریٰ کی خوشنودی کی خاطر غداری کر کے ان سب کو گرفتار کر لیا۔ بد عہدی سارے خاندان میں مذموم و ممنوع ہے اس کا بھی لحاظ نہ کیا۔ یہ بد بخت نصاریٰ کی رضا جوئی میں خدائے عزیز و مقتدر کے غصے کو بھی نہ ڈرا۔ نصاریٰ نے ان سب کو تھوڑی اور بیڑی پہنا کر محبوس کر دیا۔ اکثر شرفاء کو قتل اور باقی کو قید، جلا وطنی اور طرح طرح کے عذاب میں مبتلا کیا۔ اس طرح وہ بد نصیب رئیس بھی نصاریٰ کے ساتھ اللہ کی مخلوق کو سخت عذاب میں مبتلا کرنے کی وجہ سے اجر و ثواب کا مستحق بن گیا۔

یہ المناک کہانی یوں ختم ہوئی، اب میرا ماجرا سنیے۔ مکر و تلبیس سے نصاریٰ نے جب مجھے قید کر لیا تو ایک قید خانے سے دوسرے قید خانے اور ایک سخت زمین سے دوسری سخت زمین میں منتقل کرنا شروع کیا۔ مصیبت پر مصیبت اور غم پر غم پہنچایا۔ میرا جوتا اور لباس تک اتار کر موٹے اور سخت کپڑے پہنا دیے۔ نرم و بہتر بستر چھین کر غراب، سخت اور تکلیف دہ بچھونا حوالہ کر دیا۔ گویا اس پر کانٹے بچھا دیے گئے تھے یا دکھی ہوئی پیکاریاں ڈال دی گئی تھیں۔ میرے پاس لوٹا، پیالہ اور کوئی برتن تک نہ چھوڑا۔ بھل سے ماش کی دال کھلائی اور گرم پانی پلایا۔ جہاں تلخی کے آب محبت کے بجائے گرم پانی اور ناتوانی و کمزوری کے باوجود ذلت و رسوائی سے ہر وقت سامنا رہا۔

پھر ترش رو دشمن کے ظلم نے مجھے دریائے شور کے کنارے ایک بلند و مضبوط، ناموافق آب و ہوا والے پہاڑ پر پہنچا دیا جہاں ہمیشہ سورج سر پر ہی رہتا تھا۔ اس میں دشوار گزار گھاٹیاں اور راہیں تھیں جنہیں دریائے شور کی موجیں اطراف لیتی تھیں۔ اس کی نسیم صبح بھی گرم و تیز ہوا سے زیادہ سخت اور اس کی نوعت زہر ہلاہل (مہلک زہر) سے زیادہ مضر تھی۔ اس کی غذا حنظل (ایک پھل جو بہت زیادہ کڑوا ہوتا ہے) سے زیادہ کڑوی اس کا پانی سانپوں کے زہر سے بڑھ کر ضرر رساں، اس کا آسمان طوفوں کی بارش کرنے والا، اس کا بادل رنج فہم برسانے والا، اس کی زمین آبلہ دار، اس کے سنگریزے بدن کی پسلیاں اور اس کی ہوا ذلت و خواری کی وجہ سے نیزہ بھی چلنے والی تھی۔ ہر کوٹھری پر چھپر تھا جس میں رنج و مرض بھرا ہوا تھا۔ میری آنکھوں کی طرح ان کی چھتیں بھی نمناک تھیں۔ ہوا بدبودار اور بیماریوں کا مخزن تھی، مرض سستا اور دوا گراں، بیماریاں بے شمار، غارش و قولنج (وہ مرض جس سے بدن کی کھال پھٹنے اور چھلنے لگتی ہے) عام تھی۔ بیمار کے علاج، تندرست کے بقاء صحت اور ہر دو کے صحیح ہونے کی کوئی صورت نہ تھی۔

معالج مرض میں اضافہ کرنے والا اور معالج ہلاک ہونے والا طبیب تکلیف و رنج بڑھانے والا تھا۔ رنجیدہ کی نہ غمخواری کی جاتی نہ اس پر رنج و افسوس کا اظہار ہوتا۔ دنیا کی کوئی مصیبت یہاں کی المناک مصیبتوں پر قیاس نہیں کی جا سکتی۔ یہاں کی معمولی بیماری بھی خطرناک ہے۔ بخار موت کا پیغام، مرض سرسام اور برسام (دماغ کے پردوں کا ورم) ہلاکت کی علت تام ہے۔ بہت سے مرض ایسے ہیں جن کا کتب طب میں نام و نشان نہیں۔ نصرانی ماہر طبیب مریضوں کی آنکھوں کو نوچ کی طرح جلاتا اور مریض کی حفاظت نہ کرتے ہوئے آگ کا قہوہ اس کے اوپر بناتا ہے۔ مرض نہ پہچانتے ہوئے دوا پلا کر موت کے منہ کے قریب پہنچا دیتا ہے۔ جب کوئی ان میں سے مرجاتا ہے تو نجس و ناپاک خاکروب جو درحقیقت شیطان نکاس کا پابند ہوتا ہے اس کی ٹانگ پکڑ کر کھینچتا ہوا، غسل و کفن کے بغیر اس کے کپڑے اتار کر ریت کے ٹوٹے میں دبا دیتا ہے۔ نماز کی قبر کھودی جاتی ہے نہ نماز جنازہ پڑھی جاتی ہے۔

یہ کیسی عبرت ناک و الم انگیز کہانی ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ اگر موت کے ساتھ یہ برتاؤ نہ ہوتا تو اس جزیرہ میں مرجانا سب سے بڑی آرزو ہوتی اور اچانک موت سب سے زیادہ تسلی بخش تھی۔ اگر مسلمان کی خود کشی مذہب میں ممنوع اور قیامت کے دن عذاب و عقاب کا باعث نہ ہوتی تو کوئی بھی یہاں مقید و مجبور رہنا کر تکلیف مالا یطاق نہ دیا جا سکتا اور مصیبت سے نجات پانا جیو آسان ہوتا۔

یہ ناقابل برداشت حالات تھے ہی کہ میں متعدد سخت امراض میں مبتلا ہو گیا جس کی وجہ سے میرا صبر مغلوب، میرا سینہ تنگ، میرا اجانہ ہلکا اور میری عزت ذلت سے بدل گئی۔ میں نہیں جانتا کہ اس دشوار و سخت رنج و غم سے کیونکر چھٹکارا

ہو سکے گا' خارش وقوباء میں ابتلاء اس پر مستزاد ہے۔ صبح وشام اس طرح بسر ہوتی ہے کہ تمام بدن زخموں سے چھلنی بن چکا ہے۔ روح کو تحلیل کر دینے والے درد و تکلیف کے ساتھ زخموں میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ وہ وقت دور نہیں جب یہ پھنسیاں مجھے ہلاکت کے قریب پہنچا دیں۔

ایک زمانہ وہ بھی تھا جب عیش و مسرت' راحت و عافیت میں زندگی بسر ہوتی تھی۔ اب محبوس و قریب ہلاکت ہوں۔ ایک زمانہ وہ بھی تھا جب محسود خلائق غنی اور صحیح و سالم تھا اب اپاہج اور زخمی ہوں۔ بڑی سخت مصیبتیں اور بیسیوں صعوبتیں جھیلنا پڑ رہی ہیں۔ ٹوٹی ہوئی ہڈی جس طرح لکڑی اور پٹی کا بوجھ اٹھاتی ہے اس طرح ہم بھی ناقابل برداشت مصیبتیں اٹھا رہے ہیں۔ ان تمام مصائب کے باوجود اللہ کے فضل و احسان کا شکر گزار ہوں کیونکہ اپنی آنکھوں سے دوسرے قیدیوں کو بیمار ہوتے ہوئے اور بیڑیاں پہنے ہوئے زنجیروں میں کھینچے جاتے ہوئے دیکھتا ہوں انہیں لوہے کی بیڑیوں اور زنجیروں میں ایک سخت' تیز اور غلیظ انسان کھینچتا ہے جو محنت و مہنت' کینہ' وعداوت کا پورا مظاہرہ کرتا ہے' تکلیفوں پر تکلیفیں پہنچاتا اور بھوکے پیاسے پر بھی رحم نہیں کھاتا ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ اس نے ان آفات و تکالیف سے محفوظ رکھا۔

میرے دشمن میری ایذاء رسانی میں کوشاں اور میری ہلاکت کے درپے رہتے ہیں۔ میرے دوست میرے مرض کے مداوا سے لاچار ہیں۔ دشمنوں کے دل میں میری طرف سے بغض و کینہ مذہبی عقائد کی طرح راسخ ہو گیا ہے۔ ان کے سلیم سینے کینہ' عداوت کے دفینے بن گئے ہیں۔

ان ظاہری اسباب پر نظر کرتے ہوئے میں اپنی نجات سے مایوس اور اپنی امیدوں کو منقطع پاتا ہوں لیکن اپنے رب عزیز و رحیم' رؤف و کریم کی رحمت سے ناامید نہیں ہوں۔ وہی تو جابر فرمانوں سے عاجز ضعیفوں کو نجات دلاتا ہے اور وہی تو زخمی مظلوموں کے زخموں کو اپنے رحم و کرم کے مرہم سے بھرتا ہے۔ وہ ہر سرکش کے لیے جبار و قہار ہے۔ ہر ٹوٹے ہوئے دل کا جوڑنے والا اور ہر تہمان رسیدہ فقیر کا کامیاب بنانے والا اور ہر دشوار کو آسان کرنے والا ہے۔

اسی نے نوح (علیہ السلام) کو غرق اور ابراہیم (علیہ السلام) کو تپش و حرق' ایوب (علیہ السلام) کو مرض و مصائب' یونس (علیہ السلام) کو شکم ماہی اور بنی اسرائیل کو بربادی و تباہی سے نجات دی۔ اسی نے موسیٰ و ہارون (علیہما السلام) کو ہامان و فرعون و قارون اور عیسیٰ مسیح (علیہ السلام) کو مکر مدکرین اور اپنے حبیب مصطفیٰ ﷺ کو دجل و فریب کفار پر غالب کیا۔ اگر مجھے مشقتوں' صعوبتوں اور حوادث و معاصی نے گھیر لیا ہے تو اس کی رحمت و فضل سے کیوں مایوس ہوں۔ وہی میرا رب شافی و کافی اور خطا پوش و آمرزگار ہے۔

بہت بیمار جو موت کے کنارے پر پہنچ کر بھی اسے یاد کرتے ہیں شفا پاتے ہیں۔ بہت خطا کار جب استغفار

واستغفار کرتے ہیں مقبول بارگاہ ہوتے ہیں۔ بہت دردمند جب اسے پکارتے ہیں تو مصیبت سے نجات پاتے ہیں۔ بہت مسافر جب اپنی حاجتیں پیش کرتے ہیں تو مراد کو پہنچتے ہیں۔ بہت سے قیدی جو زنجیروں میں جکڑے ہوتے ہیں خلاقِ مطلق انہیں بیڑیوں اور قیدیوں سے بلا فدیہ واحسان چھٹکارا دلاتا ہے۔

میں بھی مظلوم ودل شکستہ ومضطر اور مسکین وذلیل محتاج بن کر اسی خدائے برتر کو پکارتا ہوں۔ اس کے حبیب ﷺ کو وسیلہ بنا کر اور امیدوار رحمت ہو کر اس کی بارگاہ میں بصد تضرع التجا کرتا ہوں۔ وہ وعدہ خلافی نہیں کرتا' اس نے مظلوم ومضطر کے یاد کرنے پر اجابت دعوت اور کشف مصیبت کا وعدہ کیا ہے۔ وہی مجھے تکلیف سے نجات دے گا اور وہی قلق واضطراب سے آزاد کرے گا اور وہی امراض سے شفا بخشے گا' وہی پکڑنے والے سے چھڑائے گا' وہی ظالم سے بچائے گا' وہی میرے گریہ وبکا پر رحم کرے گا اور وہی میری بدبختی وشامت کو مٹائے گا۔ وہ دعا کا سننے والا' بہت دینے والا اور بلاؤں کا دفع کرنے والا ہے۔ اسی سے جلاوطنی کے غم کو دور اور بہترین نعمتوں کے عطا کرنے کی امیدیں وابستہ ہیں۔

اے میرے رب! مصیبتوں سے مجھے نجات دے۔ اے امیدواروں کے امیدگاہ اور اپنے التجا کرنے والوں کے پناہ گاہ! اپنے حبیب ﷺ امین اس کی آل طاہرین ومبارکین اور اس کے صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین محافظین دین کے صدقے میں ہماری سن لے۔ اے ارحم الراحمین! اور اے احکم الحاکمین! تو ہی ظالموں سے مظلوموں کا انتقام لینے والا ہے۔ بے شک ساری تعریفیں سارے جہان کے پالنے والے کے لیے ہیں۔

یہاں پر دردالم انگیز کہانی ختم ہوئی۔ میں نے اپنی مصیبت وپریشانی کا کچھ حال دو قصیدوں میں بھی لکھا ہے۔ ایک قصیدہ ہمزیہ ہے جس میں شیطانی وساوس کا ذکر ہے اور دوسرا دالیہ ہے جس میں اس تمکین ومعذور کی تکلیف ورنج کا تذکرہ ہے۔ ان دونوں قصیدوں کو سرورِ کائنات علیہ السلام والصلوٰۃ کی مدح پر ختم کیا ہے۔ ان دونوں سے پہلے "نون" کے قوافی میں بھی قصیدہ لکھا تھا جو دُرِ یتیم کی طرح فرید ویگانہ ہے۔ اس کا ہر شعر مضبوط ومرتفع قصر کی طرح ہے۔ اس کے تین سو سے کچھ زیادہ اشعار ہو کر رہ گئے اور اس کے اتمام کی نوبت نہیں آئی۔ مصائب وآلام کے ہجوم نے اس کی تکمیل کا موقعہ نہیں دیا۔ اس کا مطلع یہ ہے

ما ناح اورق فی اوراق اشجان الا وهیج اشجانی واشجانی

اگر اللہ نے مجھ پر رہائی سے احسان فرمایا تو اس ذات کی مدح اس میں شامل کر کے ختم کروں گا جسے مکارم اخلاق سے پورا پورا حصہ ملا ہے۔ اس پر اور اس کی آل پر قیامت تک صلوٰۃ وسلام ہو۔ والله سبحانه وتعالى اعلم بالصواب

﴿حوالہ جات وحوالہ جات﴾

۱ بہادر شاہ ظفر

۲ ملکہ زینت محل

۳ حکیم احسن اللہ خاں

۴ شہزادہ مرزا مغل وغیرہ

۵ مولوی ابوسعید مستفتی وغیرہ

۶ مرزا مغل اور خضر سلطان وغیرہ

۷ پہاڑی وغیرہ

۸ مئی 1857ء تا ستمبر 1857ء

۹ مقبرہ ہمایوں

۱۰ مرزا الٰہی بخش وغیرہ

۱۱ علامہ کی رفیقہ حیات اور بیٹے مولانا انس الحق وغیرہ

۱۲ مسٹر ہڈسن نے مرزا مغل اور خضر سلطان وغیرہما کو گولی کا نشانہ بنایا تھا۔

۱۳ جزیرہ رنگون

۱۴ زینت محل اس ملکہ کا نام تھا۔

۱۵ حکیم احسن اللہ خاں

۱۶ واجد علی شاہ اختر

۱۷ حضرت محل

۱۸ برجیس قدر

۱۹ نوخاں وغیرہ

۲۰ بیلی گارد

۲۱ بخت خاں

۲۲ جنرل بخت خاں، شہزادہ فیروز شاہ وغیرہما

۲۳ نواب احمد علی خاں المعروف نوخاں

۲۴ نواب سیف ضلع بارہ بنکی

۲۵ مولانا احمد اللہ شاہ مدراسی

۲۶ بلدیو گنگھ راجہ پوائیں ضلع شاہجہانپور

۲۷ سرحد نیپال

Nafse Islam
WWW.NAFSEISLAM.COM

بہادر شاہ ظفر کی کہانی خود اپنی زبانی

بہادر شاہ ظفر

پیش نظر مضمون 300 سالہ سلطنت مغلیہ کے آخری مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر کی آپ بیتی ہے۔ جسے خشونت سنگھ کی کتاب "دہلی" سے ماخوذ کیا گیا ہے۔

دلی پر شکوک و شبہات کی فضا مسلط تھی۔ ہم اس نتیجے پر پہنچے کہ قسمت نے شہزادگی کے سنہرے ہمارے خلاف کر دیے ہیں اور ہم جیت نہیں سکتے۔ دلی کی بدقسمتی پر مہر لگ گئی تھی۔ اب واحد منتہی کا تقاضا یہ تھا کہ ہم جو ممکن ہو بچانے کی کوشش کریں۔ ہم نے دشمن کے کمانڈر ولسن صاحب کے پاس خفیہ طور پر ایک قاصد بھیجا کہ اگر ہماری اور زینت محل اور ہمارے بچوں کی جان بخشی کر دی جائے اور ہماری پنشن بحال کر دی جائے تو ہم شہر کے دروازے اس کی فوج کے لیے کھول دیں گے۔ اس نے ہمیں جواب بھیجنے کی زحمت بھی گوارا نہیں کی۔

ہم نے آخری وقت تک انتظار کیا۔ نتیجہ برآمد ہونے میں سات دن لگے۔ 14 ستمبر کو فرنگی اور اس کے اتحادی پٹھانوں، پنجابی مسلمانوں، سکھوں اور گورکھوں نے دلی پر دھاوا بول دیا۔ کابلی دروازے سے لے کر جمنا تک پوری فصیل پر شدید گولہ باری کی گئی۔ توپوں کے گولے لال قلعے میں گر رہے تھے۔ بعض "سلاطین" کے گھر تباہ ہو گئے۔ (یاد رہے کہ "سلاطین" وہ مغل شہزادے تھے جنہیں جانشینی کے تنازع میں کامیاب ہونے والے بادشاہ لال قلعے میں نظر بند کر دیتے تھے۔ انہیں اندھے کر کے کوٹھریوں میں ڈال دیا جاتا تھا۔)

جنرل بخت خاں نے دشمن کے حملے کا بڑی دلیری سے مقابلہ کیا۔ وہ ہر محاذ پر خود پہنچتا تھا۔ صبح سویرے منڈی میں ہوتا، سہ پہر کو موری دروازے پر اور شام کو کشمیری دروازے پر۔ غروب آفتاب کے بعد وہ رپورٹ دینے لال قلعہ آتا۔ دشمن شہر میں گھس آئے تھے۔ شہریوں نے بھی ان کا مقابلہ کیا حتیٰ کہ عورتیں اور بچے حملہ آوروں کے سروں پر پتھر برساتے تھے۔ اگرچہ عمر نے ہماری ہڈیاں بوڑھی کر دی تھیں، ہم اپنے عربی گھوڑے "ہمدم" پر سوار ہو کر اپنے دستوں کی حوصلہ افزائی کے لیے باہر نکلے لیکن اللہ کی مرضی تھی کہ ہمیں ذلت و خواری سے دوچار کر کے سبق سکھایا جائے۔

21 ستمبر کو بخت خاں نے ہمیں بتایا کہ دلی ہاتھ سے نکل چکا ہے۔ اس نے ہم سے کہا کہ ہم اس کے ہمراہ اودھ چلے چلیں تاکہ وہاں سے جنگ جاری کر سکیں۔ ہم نے اس سے کہا کہ ہمیں معاف کر دے۔ ہماری عمر کے بیاسی سال ہمارے جسم ناتواں پر بہت بھاری تھے۔

لوگ شہر چھوڑ کر جانے لگے۔ ہم نے بھی جانے کا فیصلہ کر لیا۔ پہلے ہم نے سوچا کہ مہرولی چلے جائیں جہاں ہم خواجہ قطب الدین بختیار کاکی علیہ الرحمۃ کے مقدس مرقد سے قریب تو ہوں گے۔ لیکن ہمارے مرحوم ولی عہد مرزا فخرو کے سسر الٰہی بخش نے ہمیں مشورہ دیا کہ ہم اپنے جد امجد شہنشاہ ہمایوں کے مقبرے میں پناہ لے لیں۔ اس نے ہمیں بتایا کہ مہرولی کا دفاع نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے برعکس مقبرہ ہمایوں ایک قلعے کی طرح تھا اور وہاں ہم اس پوزیشن میں ہوں گے کہ گورے صاحب سے مذاکرات کر سکیں۔ ہم نے اس کا مشورہ قبول کر لیا۔

قدرت کے ہاتھ نے ہماری روانگی کی نوبت بجا دی۔ ہمارا دل بوجھل تھا۔ ہم نے مولا بخش ہاتھی اور دھدم گھوڑے کو خدا حافظ کہا جو ہماری جوانی کے دنوں سے ہمارے ساتھی رہے تھے۔ ہم نے گاکوں میں بندھے اپنے سارے کبوتر چھوڑ دیے اور ان سے کہا ہماری بے کسی کی خبر ہر کہیں پہنچا دیں۔ ہماری پالکی آگرہ روڈ پر چلی۔ ہمارے حرم کی خواتین اور بچے، سلاطین اور خدام ہمارے قافلہ میں پیچھے آ رہے تھے۔ راستے میں ہم بیلگڑوں لوگوں کے پاس سے گزرے جو بیل گاڑیوں اور چھکڑوں پر اور پیدل جا رہے تھے۔ جب ہم اکبری سرائے میں پہنچے تو دیکھا کہ مقبرے کے اردگرد باغات لوگوں سے بھرے ہوئے تھے۔ ہمارے سب بچے، پوتے، نواسیاں اپنے خاندانوں اور رشتے داروں کے ہمراہ وہاں موجود تھے۔ ہم نے اپنے دکھوں سے بوجھل سر اپنے جد امجد شہنشاہ کی قبر کے قدموں میں رکھ دیا اور اسی طرح رات گزار دی۔

اگلی صبح جبکہ لوگ رات کی تھکاوٹ کے باعث اپنی چارپائیوں اور کمبلوں میں لاشوں کی طرح پڑے تھے۔ ہم نے حضرت نظام الدین اولیا کے مزار کا رخ کیا۔ کسی نے بادشاہ غازی مظل اللہ شہنشاہ ہند کی آمد کا اعلان نہ کیا۔ نماز کے بعد ہم اولیاء کے مزار کے قدموں میں بیٹھ گئے اور اپنی تسبیح پڑھتے رہے۔ ہم نے اپنے والد اکبر شاہ ثانی، اپنے بھائی مرزا جہانگیر، بیگم جہاں آرا اور امیر خسرو کے مقبروں پر فاتحہ پڑھی۔ ہمیں یوں لگا کہ جلد ہی ہم بھی ان کے درمیان محو خواب ہوں گے۔ ہم نے درویش کی دعا پڑھی "اے آقا اس ستم زدہ پر رحم کر کیونکہ اس سے پہلے تو اچھے آدمیوں کے لیے اچھے حالات پیدا کر کے ان پر رحم کرتا رہا ہے۔" ہم مقبرہ ہمایوں لوٹ آئے اور اپنی قسمت بھگتنے کے لیے تیار تھے جو اللہ نے ہمارے لیے مخصوص کی تھی۔

ہم نے دو دن انتظار کیا۔ تیسری صبح ایک گورا پچاس گھڑ سواروں کے ساتھ دروازوں پر نمودار ہوا۔ ان کا قاصد رجب علی تھا' یک چشم خوشامدی جو اکثر ہمارے قدموں میں لیٹ جاتا تھا اور ہمارے پاؤں چومنے کی اجازت ملنے کی التجا کرتا تھا۔ اس نے ہمیں اطلاع دی کہ مرزا الٰہی بخش نے انگریزی فوج کے کمانڈر ولسن صاحب بہادر سے وعدہ کیا تھا کہ وہ ہمیں گرفتار کرا دے گا۔ ایک میجر ہڈسن نامی کو ہماری گرفتاری کے حکم پر مملدر آمد کا کام سونپا گیا تھا۔ ہمارے کانوں نے یہ یقین کرنے سے انکار کر دیا کہ حکیم احسان اللہ خان بھی دشمن سے جا ملا ہے اور ہماری جائیداد کی فہرست بنا رہا ہے۔ جاسوسوں پر یہ کہا جاتا ہے کہ جاسوس کی جلد جتنی نرم ہو اس کے دانتوں میں اتنا ہی زہر ہوتا ہے۔

ہمارے لیے کہنے کو کچھ نہیں رہ گیا تھا۔ اس قابل نفرت' یک چشم مسخرے مرزا رجب علی نے ہم کو یقین دلایا تھا کہ اگر ہم اس کے ساتھ چلے چلیں تو ہماری جان بخشی ہو جائے گی۔ بیاسی برس کی عمر میں ہماری زندگی کس کام کی تھی لیکن ہمیں زینت محل اور بیٹے جواں بخت کی فکر تھی پھر ہمارا بیٹا مرزا مغل تھا۔ اس نے ہم پر زور دیا کہ "ہم رجب علی کے منہ پر تھوک دیں۔ ہم گوروں اور ان کے باریش سکھ سورماؤں کے کباب بنا ڈالیں گے" اس نے مجھی سمجھایا۔

ہم ایک گھنٹے کی بحث و تکرار سنتے رہے۔ ہم نے اپنا فانی الضمیر بیان نہ کیا بلکہ زینت محل اور جواں بخت کو بلا بھیجا۔ ہم ان کو ساتھ لیے مقبرہ ہمایوں کی سیڑھیاں اتر آئے۔ مرزا مغل اور اس کے ساتھی پیچھے سے پکارتے رہے۔ ہم نے ان کی پکار سنی ان سنی کر دی اور راضی برضا ہو گئے۔ پھر ہم نے مرزا مغل اور اپنے دوسرے بیٹوں سے کہا وہ دیکھیں کہ گورے صاحب ہم سے کیا برتاؤ کرتے ہیں اور پھر اپنی راہ عمل کا فیصلہ کریں۔ ہم نے انہیں باری باری سینے سے لگایا۔ یہ سوچ کر کہ شاید ہم آخری بار ایسا کر رہے ہیں۔ ہم نے اپنے عزیز و اقارب اور خدام کو الوداع کہا۔ وہ ہمارے ہاتھ چوم کر روتے رہے۔ ہماری پالکیاں مقبرے کے دروازے سے باہر نکلیں اور اس طرف چل دیں جہاں ہمارے گرفتار کنندگان ہمارے منتظر تھے۔

پالکی سے باہر قدم رکھنے سے پہلے ہم نے درود تاج دس بار' آمن الرسول دس بار اور قل ھواللہ دس مرتبہ پڑھا۔ ہم نے آسمان کی طرف ہاتھ بلند کیے اور دعا کی "اے اللہ ہم تیرے خادم بہادر شاہ ظفر کو تجھے سونپتے ہیں۔ ہماری نگہبانی کرنا"۔

ہم سکھ رسالے کے کمانڈر گورے صاحب کے پاس پہنچے اور دریافت کیا کہ وہ ہڈسن صاحب ہے؟ اس نے اپنا سر ہلایا۔ ہم نے مشہور تلوار "ذوالفقار" اسے پیش کی جو ایرانی فاتح نادر شاہ نے ہمارے بزرگوں کو دی تھی۔ ہمارے بیٹے نے اپنی تلوار پیش کی۔ ہمیں اپنی پالکیوں میں بیٹھنے کا حکم دیا گیا۔ اب ہم فرنگی کے اسیر تھے۔

ہمیں واپس دلی پہنچنے میں پورا دن لگا۔ ہم کو ہجوم کے نعرے سنائی دے رہے تھے اور بار بار پالکیاں روک لی گئیں۔ سہ پہر تک شور و خوغا عظیم ہو گیا۔ جب ہم دلی دروازے میں داخل ہوئے تو شہر خموشاں کا سماں تھا۔ ہمیں کوئی آواز سنائی نہ دی سوائے ہمرکاب رسالے کے گھوڑوں کے قدموں کی آواز کے۔ لوہاری دروازے پر جمعدار صاحب نے ہمیں ایک گورے رسالے کی تحویل میں دے دیا۔

ماضی میں جب کبھی ہم قلعے میں داخل ہوتے تھے تو ہماری آمد کا اعلان کرنے کے لیے توپیں داغی جاتی تھیں اور نقار خانے میں نوبت بجتی تھی۔ اس بار ہم نے جو کچھ سنا وہ یہ تھا کہ ہمارے نام کا غلط غلط کیا جا رہا تھا۔ جب ایک گورا سپاہی ہمیں دوسرے کے سپرد کرتا تو وہ ہمیں "بہادر شاہ" کہہ کر پکارتا۔ ہماری پالکیاں بنا بازار میں سے گزاری گئیں۔ ہمیں ان تہہ خانوں میں اتارا گیا جہاں چھ ماہ پہلے ہم نے یورپی خاندانوں کو پناہ دے کر انھیں کے ہاتھوں ذبح ہونے سے بچایا تھا۔ ہمیں دنیا سے اور ہر شے سے الگ تھلگ کر دیا گیا سوائے بڑی خبروں کے۔

قسمت کی کمان نے سینکڑوں زہریلے تیر ہمارے سینے میں جھونک دیے۔ جس طرح غربت سے بے حس شدہ عضو کاٹنے کی چبھن محسوس نہیں کرتا اسی طرح ہمارا دماغ غموں کے مقابلے میں بے حس ہو گیا تھا۔ ایک قاصد ہمارے تہہ خانے میں خبر لایا کہ ہمارے رشتے دار اور حالی موت سے دوچار ہو گئے ہیں۔ ہمارے دو بیٹے مرزا اخضر اور مرزا اعظل اور پوتے مرزا ابوبکر کو گولی مار دی گئی ہے۔ ہم نے کوئی احتجاج نہ کیا بلکہ صرف یہ درخواست کی کہ ہماری جائیداد کی فروخت سے جو کچھ حاصل ہو وہ خونیان کی سناسنہ ٹین پر خرچ کیا جائے۔ مرزا اعظل، مرزا اخضر سلطان اور ابوبکر کی لاشیں مقبرہ ہمایوں میں سپرد خاک کی گئیں۔

مجھر اور فرخ نگر کے نوابوں کو جنھیں پھانسی پر لٹکا دیا گیا تھا" صبر دلی میں خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کے مقبرے کے متصل ان کے ساتھیوں قمبر خانوں میں دفن کر دیا گیا۔ بعد گزرے ہے۔ بعد برابر کو پھانسی دے دی گئی تھی' اسے بندہ ہونے کے باعث جنازہ کے گھر بودہ گھاٹ پر جلا دیا گیا۔ اپنے دوسرے بیٹوں اور جنگجوؤں اور پوتوں کے بارے میں ہمیں بس یہی پتہ چلا کہ انھیں پھانسی دینے کے بعد ان کی لاشیں صبر دلی یا نظام الدین میں دفن کر دی گئیں۔ ہزاروں لوگوں میں جنھیں گوروں نے گولی مار دی یا پھانسی پر لٹکا دیا' ہمارے دوست اور شاعر شیخ امام بخش صہبائی اور ان کے دو بیٹے بھی تھے۔ کوئی نہیں جانتا کہ ان کی لاشوں کو کیا ہوا۔

پورے باغ میں خزاں کی آندھی چلی تھی کہ جو کبھی ہماری سلطنت تھا۔ اس آندھی نے ہر درخت اکھاڑ پھینکا۔ ہمارا ذاتی سکون جاتا رہا۔ ہماری زندہ رہنے کی تمنا جاتی رہی۔ اس قیدی پرندے کی طرح جو پھڑپھڑاتا اور اپنے پر

بچھو کے سلاخوں پر مارتا ہے۔ ہم تہہ خانے کی دیواروں کے ساتھ اپنا سر ٹکراتے اور اپنی قسمت کو روتے رہے۔ ایک وقت تھا جب دنیا پھولوں کا باغ لگتی تھی کہ جہاں سے پیر کی دھوپ غنچوں کو گرماتی تھی اور وہ مکمل کھلتے تھے۔ اسی دنیا میں اب سینکڑوں ہزاروں سڑتی ہوئی لاشوں کا تعفن پھیلا ہوا ہے۔ یہ شہر تھا جو دن کی دھوپ میں نہا جاتا تھا اور رات کو چاندنی میں۔ یہ شہر تھا جس میں جنت کی حوروں کی طرح حسین عورتیں رہتی تھیں۔ کس نے یہ شہر اجاڑ دیا؟ اور نظر لگا یہ کیا قیامت آ گئی؟ یا کیا تمہاری اپنی جوانی روٹھ گئی ہے؟۔

ہم سے جو سلوک کیا گیا اسے بیان کرنے کے لیے آنسوؤں سے بھرا روشنائی کا کنواں درکار ہوگا۔ ہر گھڑی لوگ تہہ خانے کی کھڑکیوں میں جھانک کر دیکھتے جیسے ہم کسی قسم کے جانور ہوں۔ ہمارے تہہ خانے کے دروازے اچانک کھلتے اور گورے صاحب در آتے۔ ہماری عورتیں اپنے منہ دیواروں کی طرف کر لیتیں۔ ہمیں کھڑے ہو کر ہر گورے مرد اور عورت کو سلام کرنا پڑتا تھا۔ وہ ہم پر طنز کرتے "تم شہنشاہ ہند ستان بننا چاہتے تھے؟" بعض اوقات ایک نوجوان گورا مکری کے میمنے کی نقل اتارتا۔ "بڈھے آدمی! تمہاری نوجوان بیویاں کہاں ہیں؟" وہ پوچھتا اور پھر وہ سب ہنس پڑتے۔ ہم اس اہانت کو اللہ کی رضا سمجھ کر قبول کر لیتے۔

کاغذ اور قلم فراہم کرنے کی ہماری درخواست مسترد کر دی گئی۔ ہم اپنے حق سے کوئلے سے ٹکڑے چا لیتے اور کوٹھری کی دیواروں کو سلیٹ کے طور پر استعمال کرتے۔ ہم اپنا وقت عبادت کرنے اور شعر کہنے میں گزارتے۔

اپنی جوانی کے دنوں میں ہم نے ایک عاشق کے بارے میں اشعار تخلیق کیے تھے جو اپنے محبوب کے ظلم و ستم کی شکایت کرتا ہے۔ یہ اشعار جو بہت مقبول ہوئے تھے ان کا مفہوم کچھ یوں ہے

ہمارا محبوب ہم پر ظلم و ستم نہ کرے؟

اللہ کسی کو بھی عشق اور کسے ہجر اور الم میں مبتلا نہ چھوڑے!

یہ اشعار کہتے ہر محل تھے جبکہ ہمیں قید کرنے والا محبوب نہیں بلکہ دشمن تھا۔ گورے آدمی کے قول کی حقیقت جلد آشکار ہو گئی۔ وہ ہمیں دھمکی دے کر پکارتا کیونکہ ہمارے سپاہیوں نے گوری عورتوں اور بچوں کو قتل کیا تھا۔ جو لوگ جانتے تھے انہوں نے حلفیہ بتایا کہ ہم نے ان بلاکتوں کو روکنے کی پوری پوری کوشش کی تھی۔ فرنگی صاحبوں نے ہم پر یقین کرنے سے انکار کر دیا۔ ان کے جو تین درجن عورتیں اور بچے مارے گئے ان کے عوض انہوں نے ہزار گنا زیادہ افراد قتل کیے۔ ہم نے رجب علی کی وساطت سے جو نقطہ حرام اور تھوے چاٹنے والا بدمعاش تھا "یقین دہانیاں کروائیں اس کے باوجود ہم پر مقدمہ چلایا گیا۔ فرنگی صاحب ہم پر الزام لگانے والے ہمارے وکیل اور ہمارے

منصف تھے۔ وہ ان آدمیوں کو لے آئے جنہوں نے ہمارا نمک کھایا تھا۔ حکیم احسن اللہ' درویش حسن عسکری' رجب علی' غلام عباس' مکھ لال..... اور ان سب نے رٹے رٹائے الفاظ میں ہمارے خلاف گواہی دی۔

ہمیں یہ بیان کرکے دکھ ہوتا ہے کہ جن لوگوں نے ہمارے خلاف الزام دراندازی کی ان میں وہ بیگ ذات عائشہ الذہ یل بھی تھی۔ ہم نے اس عورت اور اس کی تین بیٹیوں کی جانیں بچانے کے لیے اپنی زندگی خطرے میں ڈال دی تھی۔ اس عائشہ کی ماں نے ایک گورے سے شادی کرلی تھی۔ عائشہ کی بطور مسلمان پرورش ہوئی تھی لیکن چونکہ اسے والد کی طرف سے صحیح چہرہ عطا ہوا تھا اور اس نے انگریزی میں گٹ مٹ کرنا بھی سیکھ لیا تھا۔ اس کا شمار فرنگی عورتوں میں ہوا اور اس نے ایک بوڑھے گورے سے شادی کرلی تھی۔ ہم اس کے شوہر کو پہچان سکے لیکن چونکہ وہ قرآن کی تلاوت کرسکتی تھی اور اس کی بیٹیوں کو لکھ سکتا تھا' ہم ان کو بچانے میں کامیاب ہوگئے تھے۔ ہمیں امید تھی کہ ہم نے اس کے لیے جو کچھ کیا تھا وہ اس کی گواہی دے گی مگر اس نے مسلمان اور عیسائی دونوں عقیدوں کے خلاف کام کیا۔ اللہ تعالیٰ اسے سزا دے!

اللہ ہمارا واحد گواہ تھا۔ کسی فانی انسان نے ہمارے حق میں زبان کھولنے کی جرأت نہ کی۔ انہوں نے ہمیں ہمارے خلاف عائد کردہ تمام الزامات کا مجرم ٹھہرایا۔ ہمیں اس سرزمین سے جلاوطن کرنے کا حکم صادر ہوا جسے ہمارے آباؤ اجداد نے فتح کرکے تین سو برس اس پر حکمرانی کی تھی۔ بہتر تھا کہ وہ ہمیں سزائے موت کا حکم سناتے تاکہ ہماری ہڈیاں دہلی کی مقدس خاک میں مل جاتیں۔

پچاس بیگمات اور ہمارے بیٹے جواں بخت نے جلاوطنی میں ہمارا ساتھ دینے کا فیصلہ کیا۔ بعد میں ان میں سے اکثر نے ارادہ تبدیل کرلیا اور ہمارے ہندوستان کی سرحد پار کرنے سے پہلے کسی نہ کسی بہانے وہ ہمارا ساتھ چھوڑ گئیں۔ ہماری پیاری زینت محل ہمارے ساتھ رہی۔ اس نے وہ مقام جہاں ہمارا ساتھ دیا اور اپنی محبت سے ہمیں شاد کام کرنے کی کوشش کرتی رہی۔ ہمیں رسول کریم ﷺ کی زوجہ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے بارے میں آپ ﷺ کے الفاظ یاد آئے "جب میں غریب تھا تو میں نے مجھے مالدار کردیا' جب ساری دنیا نے مجھے چھوڑ دیا تو اس نے میری غم خواری کی' جب مجھے جھٹلایا گیا تو وہ مجھ پر ایمان لائیں"۔

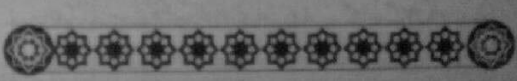

1857ء کا جہادی پہلو صحیح یا غلط

مولانا محمد شہباز عالم مصباحی کا تعلق جامعہ طیبہ اسلامیہ نئی دہلی سے ہے۔ موصوف نے جنگ آزادی 1857ء کے ضمن میں ایسے عنوان کا انتخاب کیا ہے جس کی طرف عام طور پر محققین کی توجہ کم ہوتی ہے۔ بہر کیف مولانا موصوف نے اس عنوان میں موادکو بہت احسن پیرائے میں بیان کیا ہے۔

علامہ فضل حق کا فتویٰ جہاد تحریک آزادی کی روح:

1857ء کی جنگ کے مطالعہ سے یہ حقیقت منکشف ہوتی ہے کہ غیر ملکی انگریزوں کے پیہم ظلم وستم، جارحیت وسفاکیت، قتل وغارت گری اور مذہبی مداخلت کے ردعمل میں 11 مئی 1857ء سے شروع ہو کر 21 ستمبر کو ختم ہونے والا انقلاب 1857ء کی تحریک میں جس چیز نے روح پھونکی تھی وہ علامہ فضل حق خیرآبادی اور اس وقت کے دیگر اکابر علماء کا وہ معرکۃ الآرا فتویٰ تھا جسے جنرل بخت خاں کے 26 مئی 1857ء کو دہلی میں ورود اور حضرت علامہ سے مشورہ کے بعد جامع مسجد میں مرتب کیا گیا تھا۔ اس فتویٰ کے شائع ہوتے ہی پورے ملک میں شورش برپا ہو گئی اور صرف دہلی میں لاکھ ہزار سپاہی جمع ہو گئے تھے۔ اس فتویٰ پر حضرت علامہ کے علاوہ پانچ اور علماء کے دستخط تھے یہ فتویٰ کہیں دستیاب نہیں ہو سکا لیکن اسی طرز کا ایک فتویٰ جو حضرت علامہ کے ورود دہلی سے پہلے مرتب ہو کر شائع ہو چکا تھا اور بقول مولوی ذکاء اللہ جس کا چرچا شہر میں بہت کم تھا، ہمیں ملا ہے ہم اسے ذیل میں نقل کرتے ہیں:

"کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس امر میں کہ اب جو انگریز دلی میں چڑھ آئے اور اہل اسلام کی جان ومال کا ارادہ رکھتے ہیں۔ اس صورت میں اب اس شہر والوں پر جہاد فرض ہے یا نہیں؟ اور اگر فرض ہے تو وہ فرض عین ہے یا نہیں؟ اور اوپر لوگ جو اور شہروں اور بستیوں کے رہنے والے ہیں ان کو بھی جہاد چاہیے یا نہیں؟ بیان کرو اللہ تم کو اجر دے"۔

جواب: درصورت مرقومہ فرض عین ہے اور تمام اس شہر کے لوگوں کے اور استطاعت ضرور ہے اس کی فرضیت کے واسطے چنانچہ اس شہر والوں کو طاقت مقابلہ اور لڑائی کی ہے بسبب کثرت اجتماع افواج کی اور مہیا اور موجود ہونے آلات حرب کے تو فرض عین میں کیا شک رہا اور اطراف وحوالی کے لوگوں پر جو دور ہیں باوجود فرض کفایہ ہے۔ ہاں اگر اس شہر کے لوگ باہر ہو جائیں مقابلہ سے یا سستی کریں اور مقابلہ نہ کریں تو اس صورت میں ان پر بھی فرض عین ہو جائے گا اور اسی طرح اور اسی ترتیب سے سارے اہل زمین پر شرقاً اور غرباً فرض عین ہوگا اور جو عہد اور بستیوں پر ہجوم اور قتل اور غارت کا ارادہ کریں تو اس بستی والوں پر بھی فرض عین ہو جائے گا بشرطیکہ ان کی طاقت ہے۔"

اس فتوے کے مہیج مولانا فرحت حسین۔ ان کے علاوہ 35 اور علمائے کرام کے دستخط اس فتوے پر ثبت ہیں۔ ۹ حضرت علامہ فضل حق خیرآبادی کے مرکزی فتوی کی بنیاد پر 1857ء کی جنگ "جہاد" قرار پائی اور اس کے جاں نثاروں کو "شہید" اور "مجاہد" کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔

مسلمانانِ وطن کا شوقِ شہادت:

جنگ 1857ء کی جہادی حیثیت کی جانکاری صرف اہل علم، ارباب افتاء اور شاہی دربار سے وابستہ افراد ہی تک محدود نہ تھی بلکہ اس جنگ میں شریک ہونے سے اونی شخص بھی اس بات سے واقف تھا اور اسی وجہ سے وہ بڑا سے بڑا خطرہ بھی مول لیتا تھا کیونکہ اسے یقین تھا کہ یہ کوئی عام جنگ نہیں بلکہ ایک مقدس جہاد ہے، جس میں اگر موت بھی حاصل ہوتی ہے تو وہ ہزاروں دنیاوی زندگیوں سے بدرجہا بہتر ہے۔ ذیل میں نقل کردہ واقعات سے ہماری بات کی صداقت سامنے آتی ہے:

● "گرانٹ جیکب نے یہ واقعہ بیان کیا ہے کہ جب باغیوں کو توپ سے اڑایا جارہا تھا تو ان میں سے ایک ایسا تھا جو صرف زخمی ہوا لیکن اس کے باوجود فکر سے سیدھا تن کر دوسرے راؤنڈ کے لیے توپ کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ یہ دیکھ کر جیکب اس کے قریب گیا اور کہا کہ مجھے تم پر رحم آتا ہے شاید دھوکا دے کر تمہیں بغاوت میں پھنسا دیا گیا ہے۔ اگر تم سرکار کی مدد کرو اور باغی سرداروں کے نام بتا دو تو تمہاری جان بچ سکتی ہے۔ یہ زخمی شخص اپنے زخم کی تکلیف سے جھکا خاموش رہا اور میری طرف ترش روئی اور حقارت سے دیکھ کر بولا کہا" میں نے جو کیا ٹھیک کیا۔" یہ کہہ کر اس نے منہ پھیر لیا اور دلیری سے توپ کے سامنے کھڑا ہو گیا"۔ ۱۰

● گوری فشکر جو انگریزوں کا ایک مخبر تھا اس نے 7 ستمبر 1857ء کو انقلابیوں کے متعلق جو رپورٹ بھیجی اس کے الفاظ ملاحظہ ہوں: "دو دن ہوئے تقریباً چار سو غازیوں کا ایک دستہ گوالیار سے پہنچا تھا۔ یہ لوگ بالکل کنگال ہیں۔

نواب محمد میر خاں کے صاحب زادے میاں بدھن نے ان سے دریافت کیا کہ کیا ان کے پاس خوراک وغیرہ کا بندوبست ہے؟ تو انہوں نے جواب دیا کہ وہ لوگ شہادت کے لیے وہاں پہنچے ہیں۔ ان کو خوراک وغیرہ کی ضرورت نہیں"۔ [۱۰]

جنگ آزادی کا مخالف گروہ:

1857ء کی جنگ ایک جہاد اور مظلوم ہندوستانیوں کی جائز صدائے احتجاج اور جملہ برحق تھی۔ یہ اس وقت کے دانش ور اور حالات پر گہری نظر رکھنے والے علمائے کرام کا "شرعی فیصلہ" ہے لیکن اسی دور میں علماء کا ایک چھوٹا سا گروپ اس فیصلے کو غلط قرار دیتا تھا اور اس کے برعکس اپنی "رائے" رکھتا تھا۔ ان کے کہنے کے مطابق ان حالات میں انگریزوں کے خلاف مسلمانوں پر جہاد کا فرض ہونا تو درکنار، جائز بھی نہیں تھا۔ اس کے پیچھے ان علماء کے کیا مقاصد تھے، ہم ان سے بحث نہیں کریں گے۔ ہمارا مقصد صرف اتنا ہے کہ 1857ء ہی میں جنگ 1857ء کی معروف عام تحقیق سے ثابت اور حالات کے عین مطابق جہادی حیثیت سے انکار کرنے والا ایک گروہ پیدا ہو چکا تھا، جس کا ثبوت ہمیں ذیل کے واقعات سے ملتا ہے۔

● ایک واقعہ کے بارے میں وحید الدین خاں لکھتے ہیں: "1857ء کے زمانے میں جب علماء نے انگریزوں کے خلاف جہاد بالسیف کا فیصلہ کیا، اس وقت دیوبند میں ایک بڑے عالم مولانا شیخ محمد صاحب تھے۔ مولانا کی رائے دوسرے عالموں کے بالکل برعکس تھی۔ ان کا کہنا تھا کہ انگریزوں کے خلاف جہاد کرنا ہم مسلمانوں پر فرض تو درکنار موجودہ احوال میں جائز ہی نہیں۔ چنانچہ دیوبند میں ایک مشاورتی اجتماع ہوا۔ اس میں دوسرے علماء کے ساتھ مولانا رشید احمد گنگوہی اور مولانا نانوتوی بھی شریک تھے۔ اس واقعہ کی تفصیل بتاتے ہوئے مولانا حسین احمد مدنی لکھتے ہیں: "اس اجتماع میں جہاد کے مسئلہ پر گفتگو ہوئی۔ حضرت نانوتوی نے نہایت ادب سے مولانا شیخ محمد صاحب سے پوچھا کہ حضرت کیا وجہ ہے کہ آپ ان دشمنان دین و وطن پر جہاد کو فرض بلکہ جائز بھی نہیں فرماتے؟ تو انہوں نے جواب دیا کہ ہمارے پاس اسلحہ اور آلات جہاد نہیں ہیں، ہم بالکل بے سروسامان ہیں۔ مولانا نانوتوی نے عرض کیا کہ کیا اتنا بھی سامان نہیں ہے جتنا کہ غزوۂ بدر میں تھا اس پر مولانا شیخ محمد صاحب نے سکوت فرمایا"۔ [۱۱]

● دوسرا واقعہ مولوی ذکاء اللہ کی زبانی سنیے: "مولوی رحمت اللہ اس نوبہ میں آئے کہ دلی میں جہاد کی کیا صورت ہے؟ وہ بڑے عالم فاضل تھے اور عیسائی مذہب کے رد میں صاحب تصنیف تھے۔ وہ قلعہ کے پاس مولوی

محمد حیات کی مسجد میں اترے۔ اس دانش مند مولوی کے نزدیک دہلی میں جہاد کی کوئی صورت نہ تھی بلکہ ایک ہنگامۂ فساد برپا تھا"۔ [۱۳]

آج بھی چند جدت پسند "مفکرین" اور بزعم خویش مجتہدین اسی چھوٹے سے گروہ کے فکری اثاثے کو بنیاد بنا کر 1857ء کی جنگ کو جہاد کہنے سے گریز کرتے ہیں اور اسے "غدر" کا نام دیتے ہیں۔

1857ء کے تعلیق علماء کو کن باتوں نے جنگ کے عدم جواز کا فتویٰ دینے پر مجبور کیا تھا؟ ہم ان کے بیان سے صرف اس لیے بچنا چاہتے ہیں کہ ایک دوسری بحث نہ چھیڑ جائے اور پھر ان باتوں کو 1857ء کی تاریخ سے تھوڑا سا بھی شغف رکھنے والا شخص جان سکتا ہے بشرطیکہ مطالعہ میں غیر جانب دار رہنے کا پیمانہ اپنائے۔ انقلاب 1857ء کے حوالے سے مفکرین نے جو اپنی فکر کے خاکے بنائے ہیں اس کی اصل بنیاد 1857ء کی جنگ کی ناکامی پر ہے۔ اگر یہی جنگ فتح سے ہم کنار ہوتی تو یہی نام نہاد مفکرین اس کو جائز برحق اور جہاد ثابت کرنے میں ایڑی چوٹی کا زور لگا دیتے۔

جنگ آزادی 1857ء کا شرعی پہلو؟

شروع ہی سے 1857ء کی جنگ کے شرعی پہلو کے تحقیق سے دو نظریے رہے ہیں۔ ایک نظریہ جمہور علمائے کرام کا ہے اور دوسرا ایک چھوٹے سے گروپ اور اس کے ہم نواؤں کا۔ اب ہمیں اس بات کا تفصیل سے جائزہ لینا ہے کہ کون سا نظریہ درست ہے اور یہی جہاد اصل موضوع ہے۔ اس سلسلے میں سب سے پہلے جہاد کا مفہوم اس کے شرائط اور نصب العین جاننے کی ضرورت ہے تاکہ ہمیں ایک معیار مل جائے جس کی روشنی میں ہم بحث کو خوب سے خوب انداز میں سمجھ سکیں۔

جہاد کا مفہوم:

جہاد عربی زبان کا لفظ ہے جس کا معنی ہیں محنت کرنا، مشقت اٹھانا اور کوشش کرنا۔ اصطلاح شرع میں جہاد کا مطلب ہے اللہ کے راستے میں جنگ میں پوری توانائی صرف کرنا۔

اسلام کے نظریۂ جہاد کا فقہی مطالعہ یہ واضح کرتا ہے کہ وہ اصلاً بے قصوروں پر بے سبب ہونے والے ظلم و ستم اور جبر و تشدد کی دفاعی کاروائی کا نام ہے۔ عام حالات میں وہ فرض کفایہ ہے۔ متعلقہ خطے کے مکلف مسلمانوں نے اسے انجام دے دیا تو سبھی اس فریضہ جہاد سے بری ہو جائیں گے۔ ہاں اگر حالات ایسے ہو جائیں کہ کفار کی شرارت سے تمام اہل اسلام متاثر ہوں اور مقابلے کے لیے مدمقابل کے عام لوگ بھی اٹھ کھڑے ہوں اور دشمن اسلامی سرزمین کی حدود میں داخل ہو کر دندناتا پھرے تو ایسے موقع پر ہر صاحب تکلیف اور سچے مسلمان پر جہاد فرض

ہو جاتا ہے۔ جو جنس نفیس شرکت کر سکتا ہے وہ شریک ہو۔ جس کے سامنے شرکت میں رکاوٹیں ہوں وہ دوسرے ذریعوں سے تعاون کرے جہاد میں حصہ لینا ہر حال سب پر ضروری ہے۔ ایسی ہی صورت حال کو فقہاء "نفیر عام" سے تعبیر کرتے ہیں اور اس کے بارے میں فقہاء نے یہاں تک لکھا ہے کہ اگر مشرق میں کسی خاتون پر دست درازی ہو تو مغرب کے مسلمان پر بھی اس کا تحفظ و تعاون لازم ہے۔

ہدایہ میں ہے: ﴿الجهاد فرض على الكفاية اذا قام به فريق من الناس سقط عن الباقين الا ان يكون النفير عاماً و حينئذ يصير من فروض الاعيان﴾ [۳]

اسی میں ہے: ﴿فان هجم العدو على بلد وجب وعلى جميع الناس الدفع﴾ اگر دشمن شہر پر حملہ آور ہو جائیں تو اس کا دفاع تمام لوگوں پر واجب ہے۔

جہاد کی شرائط:

1. جہاد اسی حالت میں فرض ہے جب کہ مسلمانوں کے پاس خلیفہ یا سلطان ہو اور وہ اپنے امراء و حکام اور علمائے کرام کے مشورہ سے اعلان جہاد کرے۔
2. مسلمانوں کے پاس مقابلے کی استطاعت ہو اور فوج کی ایک بھاری تعداد ہو ورنہ سلطان اسلام اگر یہ سمجھے کہ کفار زائد ہیں تو ایسی حالت میں ان سے قتال نہ جائز ہے۔ ﴿هذا اذا غلب على ظنه انه يكافئهم والا فلا يباح قتالهم﴾ (رد المحتار)
3. آلات حرب کافی مقدار میں ہوں۔
4. مسلمانوں کا سفاد ظنی ہو یا یہ کہ اس کا ظن غالب ہو۔
5. جہاد کی فرضیت کے لیے لازم اور مطلوب حالت یہ ہے کہ موجودہ حالات جیسے کوئی شوریدہ سر جماعت مسلمانوں کے وجود اور عزت و وقار پر حملہ آور ہو اور ان کے مذہبی معاملات میں مداخلت کرنے لگے لوگوں کا سکون و چین تباہ و برباد کر دے اور اپنے مادی مفادات کے حصول اور ترجیح میں ظلم و عداوت کا ایسا طوفان کھڑا کرے کہ آدمی کا دین و ایمان اور جان و مال محفوظ رہنا مشکل ترین مسئلہ بن جائے۔

جہاد کا نصب العین:

جہاد کا مقصد حصول اقتدار اور دولت یا ذاتی غیظ و غضب اور انتقام کی آگ بجھانا نہیں ہے بلکہ غلبۂ دین حق، قیام امن، انسداد ظلم اور استیصال فتنہ و رفع شر ہے۔

1857ء کے حالات کا جائزہ:

جہاد کے مفہوم، شرائط اور نصب العین سے آگاہی کے بعد اب ہم 1857ء کے حالات کا جائزہ لیں گے اور ان میں شرائط جہاد کو ڈھونڈنے کی کوشش کریں گے۔ اگر ہماری یہ کوشش کامیابی سے ہم کنار ہوتی ہے جب تو 1857ء کے جمہور علماء کا فتوائے جہاد صحیح، برحق اور برمحل ہوگا اور اس کی ضرورت وصداقت کے سامنے سر تسلیم خم کرنا ہوگا ورنہ ہم بھی یہ کہنے میں حق بجانب ہوں گے کہ یہ ان کا جذباتی، جنون خیز، ناعاقبت اندیشانہ اور پوری قوم کو ہلاکت ودتباہی کے غار میں دھکیلنے والا اقدام تھا۔

● **کاشت کاروں کا استحصال:**

کسانوں کا استحصال کرنے کے لیے انگریزوں نے ایک جامع کمپنی اور بھاری شرح مال گزاری ان کی فصلوں پر مقرر کر رکھی تھی۔ شمالی ہندوستان میں 1822ء کے ریگولیشن VII کی دفعات کے ماتحت مال گزاری زمین کی کل پیداوار کا 80 فیصد مقرر کی گئی تھی۔ 19 یہ سیاہ اصول بھی صرف کاغذ پر تھا ورنہ عملی طور پر جو مال گزاری وصول کی جاتی تھی وہ پیداوار کے تناسب سے کہیں اونچی ہوتی تھی۔ 20 اس استطاعت سے باہر مال گزاری نے زرعی ترقی کو روک دیا تھا اور کاشت کار بدترین مفلسی اور عدم وسائل کا شکار ہو گئے تھے۔

اس بھاری مال گزاری کے ساتھ انگریزوں کی دوسری ظالمانہ کارروائی یہ تھی کہ وہ کاشت کاروں کو مجبور کرتے تھے کہ وہ وہی فصل اگائیں جس سے ان کا فائدہ ہو، خواہ وہ کاشت کاروں کے لیے نفع مند ہو یا نہ ہو، مثلاً دھان کے موسم میں اگر انہیں انڈیگو سے غیر معمولی نفع حاصل ہونے کی توقع ہوتی تو وہ کسانوں کو انڈیگو کی فصل اگانے پر مجبور کرتے۔ 21

● **تاجروں پر ظلم وستم:**

بنگال میں سیاسی طاقت سنبھالنے کے بعد انگریزوں نے ملک کی تجارتی کارروائیوں پر بھی اپنی اجارہ داری قائم کر لی۔ اس اجارہ داری کے نتیجے میں نجی تاجروں کی چیزیں بالخصوص مقامی (مسلمانوں) یا ہندوؤں کی ملکیت والی اشیاء عام سڑکوں پر روک کر، کرایہ وصول کرنے والے گودام لے جائی جاتی تھیں۔ ان اشیا کے مالکان کو اکثر مجبور کیا جاتا تھا کہ وہ اپنے سامانوں کے ساتھ ایسے جہازوں پر سوار ہوں جن کے بارے میں ان کی رائے اچھی نہیں ہوتی تھی اور ایسے سفر پر روانہ ہوں جس کی منزل اور جس کا انتظام ان کی تجارتی اسکیم کے خلاف ہوتا تھا۔ راستے سے باہر اور

نامانوس بندرگاہوں پر چھوڑ دیے جانے سے سامان کا نقصان ہو جاتا تھا اور کبھی کبھی وہ ضائع بھی ہو جاتا تھا۔ ۱۸

انگریزوں نے کسٹم ڈیوٹی اور مال کو ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جانے کے لیے مقرر محصول کی شرحوں میں بہت زیادہ اضافہ کر دیا تھا اور ان چیزوں پر بھی کسٹم ڈیوٹی لگا دی تھی جو ابھی تک اس سے بری تھیں اور نئے نئے محاصل درآمد برآمد اور چنگی کی حد بندیاں کھڑی کر کے تاجروں کو طرح طرح کی مشکلات میں ڈال دیا تھا۔ ۱۹

● صنعت کاروں کے ساتھ ناروا سلوک:

اسٹیم کی طاقت اور مشینری کے استعمال کی بدولت انیسویں صدی کی اول دہائیوں میں انگلستان اس قابل ہو گیا تھا کہ وہ یورپ کے بازاروں میں ہندوستان کے سامانوں کا مقابلہ کر سکے۔ اس لیے برطانیہ نے اپنے تیار کردہ سامانوں کے لیے مواقع فراہم کرنے کی غرض سے ہندوستانی اشیا کی درآمد پر بہت ہی زیادہ بھاری ٹیکس لگا دیے تاکہ ہندوستانی اشیا کی درآمد نہ ہو سکے اور اس چیز نے ہندوستانی صنعت کاروں کی کمر توڑ دی تھی۔ ۲۰

ولسن لکھتا ہے: یہ ضروری ہو گیا ہے کہ مؤثر انداز کر (برطانوی کارخانوں) کی حفاظت یا تو ہندوستانی مال کی قیمت پر 70-80 فی صد ٹیکس لگا کر یا مال کا داخلہ بند کر کے کی جائے۔ ۲۱

ہندوستانیوں کا مال خریدنے کے لیے کمپنی نے جو طریقہ اختیار کیا تھا وہ بھی نہایت خالمانہ اور غریب جولاہوں کا حق مارنے کے مترادف تھا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی نے مال خریدنے کے لیے ہماری تجوریوں پر کچھ ایجنٹ رکھے تھے جن کو گماشتہ کہا جاتا تھا۔ ہر گماشتہ کے ساتھ ایک کلرک اور ایک ترجمان ہوتا تھا۔ یہ سب مقررہ اوقات پر گاؤں میں خریداری کرنے جاتے تھے اور پورے غور پر اپنی مرضی سے خریداری کرتے تھے۔ اس میں غریب جولاہوں کی مرضی کا کچھ بھی خیال نہیں کیا جاتا تھا۔ گماشتے جہاں چاہتے تھے ان سے انتظام کرا لیتے تھے اور جو رقم جولاہوں کو دی جاتی تھی اس کے لینے سے اگر وہ انکار کرتے تو انہیں یا تو ہتھکڑیاں اور کمر سے باندھ دیا جاتا تھا اور کوڑے لگانے کے بعد ہی چھوڑا جاتا تھا۔ ۲۲ گماشتے سامانوں کا جو دام مقرر کرتے تھے وہ کم از کم 15 فی صد اور بعض حالات میں 40 فی صد اس سے کم ہوتا تھا جو عام بازار میں آزادی سے فروخت کرنے پر ملتا تھا۔ ۲۳

اس کے علاوہ انگریزوں کا ایک ظلم یہ تھا کہ انہوں نے کچھ مال کے دام حد سے زیادہ بڑھا دیے تھے تاکہ ہندوستانی دستکار انہیں خرید نہ سکیں اور اس طرح ہندوستانی صنعت زوال پذیر ہو جائے۔ (۲۴)

اس وقت ہندوستان میں عموماً یہی تین طرح کے لوگ تھے اور ہر کوئی اپنے اپنے دائرے میں انگریزوں کے ظلم وستم اور جور وتشدد کا نشانہ بنا ہوا تھا اور اس طرح ثمرت دولت اور طاقت حاصل کرنے کے تمام ذرائع ہر سطح کے

لوگوں پر مسدود کر دیے گئے تھے اور اس کے ساتھ علم بالائے علم ہوتا کہ انگریزوں نے عوامی اعزاز حاصل کرنے، حکومت کی اعلیٰ ملازمتوں اور اعتماد و آمدنی کے بلند عہدوں پر فائز ہونے کے حقوق سے بھی ہندوستانیوں کو یکسر محروم کر رکھا تھا۔ انہیں صرف ان جگہوں پر ملازمت کرنے کا اہل سمجھا جاتا تھا جہاں ان کے بغیر کام نہ چل سکے۔ [19]

یہ تو عام لوگوں کی صورت حال تھی۔ انگریزوں نے امرا یہاں تک کہ سلطان وقت کو بھی نہیں بخشا تھا۔ چنانچہ انقلاب کے اسباب کا تاریخی تجزیہ کرتے ہوئے امداد صابری لکھتے ہیں:

"چارلس مٹکاف ریزیڈنٹ دہلی نے نہایت ہی ہوشیاری سے شاہی اختیارات کا خاتمہ کر دیا، جس کی قدرے تفصیل اس طرح ہے:

❶ دہلی میں طویل قید یا نصاحس کے احکام پر بادشاہ سے منظوری لی جاتی تھی۔ یہ رسم موقوف کر دی گئی، جس سے بادشاہ کی ملکیت کا آخری اشراقی تھاوہ سرے سے ختم ہو گیا۔

❷ ایک موقع پر لارڈ ایمرسٹ گورنر جنرل نے صاف الفاظ میں اکبر شاہ کو تحریر کر دیا کہ آپ کی بادشاہت صرف نام کی ہے اور محض اخلاقاً آپ بادشاہ کے نام سے یاد کیے جاتے ہیں۔

❸ 1832ء میں قدیم دارالسلطنت دہلی پر بادشاہ کی برائے نام حکومت بھی ختم کر دی گئی اور دہلی کو صوبہ مغربی و شرقی میں شامل کر دیا گیا۔

❹ 1835ء میں دہلی کے بادشاہ کے سکے کی بجائے سکہ کمپنی بہادر رائج کر دیا گیا"۔ [20]

● ہندوستانیوں کا غربت و افلاس:

دوج بالا حالات نے لوگوں کو نادار اور محتاج بنا دیا تھا۔ ہزاروں لوگ بے روزگاری، فاقہ کشی اور بھوک میں مرتے تھے۔ لوگ اس قدر محتاج ہو گئے تھے کہ آٹے دوج آٹھ یوسف بہادر انگریزی فوج میں ملازمت کے لیے آمادہ ہو جاتے تھے۔

سرسید احمد خاں نے لکھا ہے: "اہل حرفہ کا روزگار بسبب جاری اور رائج ہونے اشیائے تجارت اور ولایت کے بالکل جاتا رہا تھا۔ یہاں تک کہ ہندوستان میں کوئی سوئے بنانے اور دیا سلائی بنانے کو بھی نہیں پوچھتا تھا۔ جولاہوں کا تار بالکل ٹوٹ گیا تھا"۔ [21]

انگریزوں کے دور اقتدار میں اہل لکھنؤ جس بے چینی، بے اطمینانی، مفلسی اور معاشی ابتری سے دوچار تھے اس کی جھلکیاں ہمیں اس دور کے اخبار "سحر سامری" کے درج ذیل تراشے سے نظر آتی ہیں۔ یہ تراشے ملاحظہ کیجیے اور

حالات کی ابتری کا اندازہ لگائیے: "ان دنوں غلے کی گرانی ہے' گرانی خاطر از دانی ہے۔ اس قدر مہنگا اناج ہے' آسیائے فلک بھی دانے کا محتاج ہے۔ جو رفاقہ سے افاقہ نہیں۔ بے معاشی نے ہر قماش کے آدمی کا اطمینان کھو دیا' جس نادان و دانا نے حال پر بادی کو سنا' رو دیا۔ ایک تو معاش نہیں جائے معاش نہیں۔ دوسرے دھوپ غم سے گندمی رنگ ہر جثہ نیلا ہوا' گویا مطلعی میں آٹا گیلا ہوا۔ خون دل بجائے شراب ہے' لخت جگر کباب ہے۔ بدحواسی سے زوال اعتدال مزاج ہوا۔ ہر غریب و مسکین روٹی کے ٹکڑے کا محتاج ہوا۔ پکی پکڑی باتوں سے تدبیر نہیں چلتی' بہت سر پٹکتے ہیں دال نہیں گلتی' حاکم اس طرف متاں توجہ موڑتا نہیں' بس کیا کریں' کیا چارہ ہے' چھوڑتا نہیں۔ [۲۸]

● انگریزوں کی مذہبی مداخلت:

جب پورے ہندوستان میں انگریزوں کی عمل داری قائم ہو گئی تو انھیں یہ احمقانہ بات سوجھی کہ سارے ہندوستانی ان کے ہم مذہب ہو جائیں۔ اس کے لیے انھوں نے طرح طرح کے طریقے اپنائے۔ عیسائی پادریوں کو کھلی چھوٹ دے دی۔ وہ عیسائی مبلغ اسکولوں میں' بازاروں میں' شفاخانوں میں' جیل خانوں میں' غرض جس جگہ موقع ملتا تبلیغ کرنے لگتے تھے۔ بعض اضلاع میں پادریوں کے ساتھ تھانے کے چپراسی بھی جاتے تھے اور یہ پادری غیر مذہب کے مقدس لوگوں اور مقدس مقامات کو بہت برائی سے اور بلند سے یاد کرتے تھے جس سے سننے والوں کو نہایت رنج اور دلی تکلیف پہنچتی تھی۔ [۲۹]

اس حوالے سے علامہ فضل حق خیر آبادی لکھتے ہیں: "انھوں نے تمام باشندگان ہند کو کیا امیر' کیا غریب' چھوٹے و بڑے' متعلم و معلم' طرح طرح کی دل آزاری سے مسلم کا لعدم فی مقابلے کی اسکیم بنائی۔ ان کا خیال تھا کہ ان کو نہ تو کوئی مدد گار و معاون نصیب ہو سکے گا اور نہ انھیں وہ اطاعت کے سوا سرتابی کی جرأت ہو سکے گی"۔ [۳۰]

اسی میں آگے لکھتے ہیں: "ان سازشوں کے علاوہ ان کے دلوں میں اور بھی بہت سے مفاسد چھپے ہوئے تھے۔ مثلاً مسلمانوں کو ختنہ کرانے سے روکنا' شریف و رذیل کا پردہ ختم کرانا' نیز دوسرے احکام جن میں کوئی مذاق' دلچسپی یا لگاؤ"۔ [۳۱]

"نور مغربی" 1857ء کا ایک ہفت روزہ اخبار تھا جو حوض قاضی (دہلی) سے شائع ہوتا تھا۔ اس کی ایک رپورٹ ملاحظہ کریں: "اخبارات کلکتہ سے دیکھا گیا ہے کہ مقام مذکور میں گوروں نے بہت سر اٹھا رکھا ہے۔ سر بازار ہر ایک سے دنگا فساد کرتے ہیں اور مسجدوں اور گھروں میں گھس جاتے ہیں' باعث اس کا یہ ہے کہ قرار واقعی سزا نہیں ملتی"۔ [۳۲]

انگریزوں کی ایک دوسری مذہبی مداخلت یہ تھی کہ انہوں نے مسلمان فوجیوں کو سور کی چربی لگے ہوئے کارتوسوں کو دانت سے کاٹنے پر مجبور کر دیا تھا۔

چنانچہ سرسید احمد خاں لکھتے ہیں: "ایک اور بات سنو کہ یہ تمام بغاوت جو ہوئی تھی، بنا اس کی وہ کارتوس تھا جس پر سور کی چربی لگی ہوئی تھی"۔ ۳۳

1857ء اور اس سے قبل کے حالات بالکل جہاد کے متقاضی اور اس کی فرضیت کے محرک تھے۔ انہیں حالات کو فقہا "نفیر عام" سے تعبیر کرتے ہیں اور ایسے ہی ناگزیر حالات میں ہر بچے اور بوڑھے، مرد و عورت پر جہاد فرض ہو جاتا ہے کہ وہ ظلم و ستم اور سفاکیت و بربریت کے جن خونخواروں کے یہ حالات پیدا کیے ہیں ان کے خلاف شمشیر و سنان کی جنگ چھیڑے اور اس وقت تک دم نہ لے جب تک کہ خدا کی مخلوق کو اس کے کھوئے ہوئے حقوق واپس نہ مل جائیں اور سکون و قرار کی زندگی بحال نہ ہو جائے۔

شرائط جہاد کی موجودگی:

1857ء کے جہاد متقاضی حالات سے آگاہی کے بعد جہاد کے شرائط میں تین چیزیں باقی رہ جاتی ہیں۔ سلطان اسلام کا وجود، فوج کی تعداد اور ساز و سامان آلات حرب کی کثرت کا ثبوت۔ ہم ان تینوں کو بھی ترتیب وار ذکر کر رہے ہیں۔

❶ سلطان اسلام:

82 سال کی عمر میں 28 دسمبر 1837ء کو اکبر ثانی اس دار فانی سے کوچ کر گیا اور اس کی جگہ 30 دسمبر 1837ء مطابق 29 جمادی الاخری 1252ھ کو خاندان تیموریہ کا آخری تاجدار بہادر شاہ ظفر سریر آرائے سلطنت ہوا۔ شاہی مسجد میں بعد نماز جمعہ تخت پر بیٹھا اور فوج نے سلامی دی۔ ۳۴

بہادر شاہ ظفر ایک نیک کردار، روشن ضمیر، باکرامت، نورانی اور صوفی منش بادشاہ تھا۔ ۳۵ اور انگریزوں کا بنایا خود خوار ہونے کے باوجود اسے ایک مرکزی حیثیت حاصل تھی۔ ہندوستانی عوام کے لیے اس کی شخصیت کا مثل تعظیم تھی اور یہ قدر و منزلت ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کی نظر میں یکساں تھی۔ ۳۶

❷ فوج کی کافی تعداد:

• میرٹھ ایک برمش رائٹر ہے۔ اس نے اپنی کتاب "تاریخ کے آئر" میں 1857ء کے وقت برطانوی اور

ہندوستانی فوجوں کی تعداد کے بارے میں لکھا ہے:

" There were in India at the time only 45000 British troops as against more than 250000 sepoys".

1857ء کے زمانے میں انڈیا میں برطانوی فوجیوں کی تعداد صرف 45 ہزار تھی جب کہ ہندوستانی فوجیوں کی تعداد دو حالی لاکھ سے زیادہ تھی۔ ۳۲

● ڈاکٹر وقار الحسن صدیقی اس کارنامہ پر رضا لائبریری لکھتے ہیں: "جب جنگ کا آغاز ہوا تو ایک لاکھ سے زیادہ مجاہدین اس میں شامل تھے۔" ۳۳

● 4 ستمبر 1857ء کے روزنامچے میں جیون لال نے چند مخصوص راجاؤں کے نام ارسال کردہ شاہی مکتوب کے بارے میں لکھا ہے جس میں فوج کی کمک کا ذکر موجود ہے: "شہنشاہ ہندوستان نے پروجو دھ پور، بیکانیر، دھلور، کوٹہ، بندی مضمون لکھے ہیں کہ شاہ دہلی کے پاس بغاوت کثیر فوج کی ہے اور دل سے چاہتے ہیں کہ انگریزوں کو نیست و نابود کردیں مگر چوں کہ تمہارے پاس کوئی مدد تدبیر واسطے مملکت کے نہیں لہٰذا چاہتے ہیں کہ تم آکر انتظام ملک کا اپنے قدرت میں لاؤ۔" ۳۴

● سید عاشور کاظمی نے "غداروں کے خطوط" میں "گھر کے چراغ سے" کے عنوان سے انقلاب 1857ء کی تاریخ پر ایک تفصیلی مضمون لکھا ہے: جس میں ہندوستانی جنگ جوؤں کے بارے میں ان کا کہنا ہے: "جنگ آزادی لڑنے والوں میں انگلش فوجی دستے شامل تھے جن میں بمبئی کے سپاہیوں کے علاوہ "نیمچ" "جھانسی" "مجھر" "مہاراجہ پور" "علی گڑھ" "مصیر آباد" اور "جاورہ" تک کے دستے شامل تھے۔ گوالیار کے فوجی دستے بھی راجا کی مرضی کے خلاف مجاہدین سے آملے تھے۔" ۳۵

❸ آلات کا اطمینان بخش ذخیرہ:

● 31 مئی 1857ء میں ایک نامعلوم غدار نے کسی انگریز افسر کے نام ایک خط لکھا تھا جس میں اس نے علی پور کے لیے روانہ ہونے والی فوج کے پاس موجود اسلحے کی تفصیل اور مسلمانوں کی اسلحہ سازی کے بارے میں جاسوسی کی تھی:

فوج کے پاس جو اسلحہ ہے اس کی تفصیلات یہ ہیں:

50000

توپ کے گولے

گولوں کے خول	:	20000
گولے	:	150
گول گولے	:	255
انگور نما گولے	:	150
بارود کے کنستر	:	125
گولے داغنے کے چارجرز	:	200

اس کے علاوہ ان کے پاس گھوڑوں سے کھینچی جانے والی 12 توپیں، پیادہ فوج کے 5 رجمنٹیں اور کیولری کی 1 رجمنٹ بھی ہے۔ انہوں نے باغیت کے لیے 4 اور توپیں بھیجنے کا بھی حکم دیا ہے۔ ان کے پاس اس وقت گھوڑوں سے کھینچی جانے والے 31 توپیں ہیں۔ محاصرہ توڑنے والی توپوں کی تعداد تو انگریزوں سے بھی زیادہ ہے۔ بارود اور کارتوس کے چارجرز بنانے کے لیے 250 مستری کام کر رہے ہیں۔ ان کے پاس 400 من دیسی بارود کا ذخیرہ ہے۔ جو بھی انگریزی بارود ان کے پاس بچا تھا وہ اب سلیم گڑھ میں مقیم 74 ویں رجمنٹ کی تحویل میں دے دیا گیا ہے۔ کل جتنے بھی کارتوس بنے تھے وہ آج فوج میں تقسیم کر دیے گئے ہیں۔

کارتوسوں کی ٹوپیاں بنانے کے لیے کہا جا رہا ہے کہ بارود کے کارخانے کے ایک ملازم کلو مستری نے اصلی نمونے کی ٹوپیاں تیار کی ہیں۔ اس طرح شہر کے ایک داروغہ مظہر علی نے لوگوں کو داغنے کا مسالہ تیار کرنے کے لیے اپنی خدمات پیش کی ہیں۔ [۴۱]

● قلعہ کے اندر ایک بڑا بارود خانہ تھا جس میں 520 بارود بنانے والے تھے۔ [۴۲] مولوی رجب علی جنگ شروع ہوتے ہی اپنی چرب زبانی اور عیاری سے بادشاہ کی مشاورتی کونسل کا رکن اور بارود خانے کا داروغہ بننے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ [۴۳] یہ رجب علی انگریزوں کا جاسوس بھی تھا۔ اس نے 7 اگست 1857ء کی شام کو بارود خانہ تباہ کر دیا جس میں سارے بارود ساز بھی ہلاک ہو گئے۔ [۴۴]

● بازار خانم جو ایک بارونق بازار تھا، یہاں بھی ایک بہت بڑا بارود خانہ تھا۔ جنگ کے دوران میں یہاں کے باشندوں نے آلات حرب کی تیاری کی ذمہ داری اپنے سر لے لی تھی اور دست کاری میں اپنے کمال کا مظاہرہ اس طرح کیا تھا کہ توپ کا گولہ، بندوق کی ٹوپی اور تفنگ کو بالکل انگریزوں جیسا بنا دیا تھا۔ انقلاب 1857ء کے بعد انگریزوں نے اپنے انتقام کی آگ ٹھنڈی کرنے کے لیے اس بازار کو تباہ و برباد کر دیا تھا۔ [۴۵]

● عبداللطیف 2 ذی قعدہ 26 جون 1857ء کی روداد میں لکھتا ہے: "حافظ ندیم الدولہ اور بہادر محمد داؤد خاں نے عرض کیا کہ کوچہ چرخی سازاں کا ہر شخص سرگرداں و پریشان ہے کیونکہ ان کا کوچہ موت کی نشانی بن گیا ہے اور وہ اس وجہ سے کہ اس کوچہ کے ایک مکان کو بارود خانہ بنا دیا گیا ہے۔ جب آبادی میں بارود بنایا جائے تو وہاں کے باشندوں کو آگ لگنے اور جل جانے کا اندیشہ کیوں نہ ہو؟ بادشاہ نے مرزا مغل کو حکم دیا کہ رعیت کا خیال کرو اور بارود بنانے کے لیے بستی کے باہر کوئی جگہ پسند کرلو۔ [۳۶]

علی پور جو فوج بھیجی جارہی تھی اس کی تاریخ 31 جولائی 1857ء تھی جب کہ جنگ کا آغاز 11 مئی 1857ء کو ہو چکا تھا۔ اس وقت اتنے سارے اسلحہ جات کے ساتھ فوج کو روانہ کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ ہندوستانی افواج کے پاس ساز و سامان و آلات حرب کی قلت نہ تھی بلکہ یہ وافر مقدار میں اور متعدد انواع میں موجود تھے جیسا کہ درج بالا تاریخی اقتباسات سے معلوم ہوا۔ ہاں! جنگ کے آخری دنوں میں قلعہ کے بارود خانہ کے جل جانے اور جنگ کے طول پکڑنے کی وجہ سے ان سامانوں کی قلت ضرور ہوگئی تھی جس کا ذکر روزنامچوں میں بھی ملتا ہے لیکن اس سے فتوائے جہاد پر کوئی حرف نہیں آتا ہے کیونکہ آغاز جنگ میں فوج کی جو تعداد اور آلات کا جو ذخیرہ تھا وہ نہایت ہی اطمینان بخش تھا اور ظاہری اسباب کے طور پر جنگ میں غلبہ حاصل کرنے کا مکمل ضامن تھا۔

انقلاب 1857ء کا نصب العین:

جہاد کے لیے ضروری ہے کہ اس کا مقصد حصول اقتدار و دولت نہ ہو بلکہ اللہ تعالیٰ کی زمین پر اس کی حاکمیت قائم کرنا اور فتنہ و فساد ختم کر کے اس دھرتی کو امن و سکون اور عدل و انصاف کا گہوارہ بنانا ہو۔ اس لیے یہاں ضروری ہے کہ انقلاب 1857ء کا مقصد معلوم کریں۔ جہاد کے نصب العین سے اس کی ہم آہنگی یا غیر ہم آہنگی کا پتہ چل سکے۔ اس کے لیے بہادر شاہ ظفر کا بیان سند کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس لیے ہم بادشاہ وقت کے دو بیان کی نقل کرتے ہیں۔

● بہادر شاہ ظفر نے والیانِ ریاست کے نام جو خط بھیجا تھا اس میں اس نے لکھا تھا: "انگریزوں کو ملک سے نکال دینے کے بعد میرا مقصد ہندوستان پر حکومت کرنے کا نہیں۔ اگر تمام راجے دشمن کو ملک سے نکالنے کے لیے تلوار نیام سے نکال لیں تو میں شاہی اختیارات اور طاقت سے دست بردار ہونے کے لیے رضامند ہو جاؤں گا"۔ [۳۷]

● منشی جیون لال 2 جولائی 1857ء کی روداد میں لکھتا ہے: "شاہ دہلی نے فرمایا کہ میری منشا یہ ہے کہ انگریز نیست و نابود ہو جائیں اور شہر کی لوٹ موقوف کی جاوے"۔ [۳۸]

● شاہی فرمان و بیان کے علاوہ ایک اور بیان ملاحظہ کریں جس سے صاف طور پر ثابت ہوتا ہے کہ روز آغاز

نئی سے اس جنگ کا مقصد تحفظ مذہب اور خلق خدا کو امن وسکون کی خوشگوار فضا فراہم کرنا تھا۔ اس کے بیان کرنے والے پنڈت سندر لال جی ہیں جو تاریخ ہند کے ایک لائق وستند راوی مانے ہوئے مصر ہیں۔ ان کی مشہور کتاب "بھارت میں انگریزی راج" کو عالم انگریزوں نے ضبط کرلیا تھا اور پنڈت جی کو فیض آباد جیل میں بند کردیا تھا۔ ایک دن چند قیدیوں سے گفتگو کے دوران پنڈت جی نے ایک راز سے پردہ اٹھایا اور کہا "مولوی علی احمد فیض آبادی جو عربی اسکول میں پڑھاتے تھے وہ روٹیاں اور کنول کا پھول تقسیم کیا کرتے تھے" جس کا مقصد یہ تھا کہ ہونے والی جنگ روٹی کے لیے ہے اور کنول کے پھول کا مطلب یہ ہے کہ مذہب بچاؤ۔ لہٰذا یہ ہونے والی جنگ ان دونوں مقاصد کے لیے لڑی جائے گی"۔ [۹]

یہ مضمون اللہ کے فضل سے پایۂ تکمیل کو پہنچا۔ آخر میں "دانش مندان وقت" سے عرض ہے کہ 1857ء کے ظلم وستم اور جبر وتشدد پر بھی ان حالات میں جہاں شرائط جہاد اپنے پورے کوائف کے ساتھ موجود نہیں۔ ایسے سنگین اور جہاد مقتضی وقت میں کیا یہ دانش مندانہ اور حکیمانہ اقدام ہوتا کہ علمائے کرام حالات سے نظر پوشی کرتے ہوئے ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھ رہتے اور انسان نما شیطانوں کو مظلوم انسانوں کی زندہ لاشوں پر اپنی تجارت وسیاست کا شیش محل تعمیر کرنے کے لیے آزاد چھوڑ دیتے؟ اور آج کے دانش مند سر جوڑ کر سوچیں اور پھر بتائیں؟؟؟

یہ حق ہے کہ 1857ء کے سیاہ سخت گیر اور ابتر سے ابتر حالات میں جہاد کی ضرورت کا اعلان کررہے تھے جس کو اس وقت کے دانشور اور زمانہ شناس علماء نے سمجھ لیا تھا اور جہاد کا فتویٰ صادر کیا تھا۔ اگر وہ ایسا نہ کرتے تو یہ تعاون در باب ظلم وعدوان ہوتا جو سراسر ناجائز ہے۔

حوالے وحواشی

[۱] غداروں کے خطوط، سید صادق علی، ص: 37 [۲] غداروں کے خطوط، ۱۱، اکبر الٰہ آبادی، مجم، ص: 310

[۳] روزنامچہ عبداللطیف، مرتبہ خلیق احمد نظامی، ص: 129 [۴] باغی ہندوستان، عبداللہ چغتائی، ص: 215

[۵] ایضاً، ص: 264 [۶] ایضاً، ص: 266

[۷] اخبار الظفر سے منقول بحوالہ تاریخ جنگ آزادی ہند 1857ء، سید خورشید مصطفیٰ رضوی، ص: 347-348

[۸] ایضاً

[۹] Jacob: Western India, Savarkar,p:500.501

[۱۰] غداروں کے خطوط، سید عاشور کاظمی، ص: 182-183

۱۱ علما اور دورِ جدید، وحید الدین خاں، ص: 20
۱۲ نقشِ حیات، ص: 42
۱۳ تاریخ مروج سلطنتِ انگلشیہ، مولوی ذکاء اللہ، بحوالہ روزنامچہ عبد اللطیف، ص: 192
۱۴ ہدایہ، جلد 2، ص: 559
۱۵ تاریخ تحریک آزادی ہند، تارا چند، ص: 442
۱۶ ایضاً، ص: 443
۱۷ ایضاً، ص: 465
۱۸ ایضاً، ص: 467
۱۹ ایضاً، ص: 468
۲۰ ایضاً، ص: 456
۲۱ ایضاً، ص: 458
۲۲ ایضاً، ص: 460
۲۳ ایضاً، ص: 461
۲۴ ایضاً
۲۵ ایضاً، ص: 419
۲۶ جنگِ آزادی اور وطن کے جاں باز، ص: 48
۲۷ اسبابِ بغاوتِ ہند، سرسید احمد خاں، ص: 36
۲۸ اخبار سامری لکھنؤ، 15 دسمبر 1856ء
۲۹ 1857 کا تاریخی روزنامچہ، عظیم احمد نظامی، ص: 20
۳۰ باغی ہندوستان، علامہ فضل حق خیر آبادی، ص: 31
۳۱ عربی سے ترجمہ ایضاً
۳۲ نور نظری، جلد 5، شمارہ 13، خیر کلکتہ 28 مارچ 1857ء بحوالہ غداروں کے خطوط، ص: 31
۳۳ اسبابِ بغاوتِ ہند، سرسید احمد خاں، بحوالہ مراۃ الاخبار، جہدِ آزادی، محبوب حسین، ص: 119
۳۴ جنگِ آزادی اور وطن کے جاں باز، عبد المالک مصباحی، ص: 49
۳۵ روزنامچہ عبد اللطیف، مرتبہ عظیم احمد نظامی، ص: 115
۳۶ سرگزشت دلی درخشاں تا جور، ص: 11
۳۷ F.G.C Hearenshaw,The ifs of History, P.156-157
۳۸ تاریخ جنگِ آزادی ہند 1857ء، ڈاکٹر صمد خاں، ص: 16
۳۹ سرگزشت دلی درخشاں تا جور، ص: 250
۴۰ غداروں کے خطوط، سید عاشور کاظمی، ص: 37
۴۱ ایضاً، ص: 114
۴۲ روزنامچہ عبد اللطیف، عظیم احمد نظامی، ص: 162
۴۳ غداروں کے خطوط، سلیم قریشی، ص: 17
۴۴ ایضاً
۴۵ ایضاً، ص: 149
۴۶ ایضاً، ص: 141
۴۷ جاں باز مرزا، ص: 122

WWW.NAFSEISLAM.COM

جنگ آزادی کے چند تاریخی حقائق

پروفیسر غلام یحییٰ انجم

پروفیسر غلام یحییٰ انجم ہندوستان کے معروف مصنف اور ماہر تعلیم اور ہمدرد یونیورسٹی' نئی دہلی کے شعبہ علوم اسلامیہ کے صدر ہیں۔

انقلاب 1857ء کے تعلق سے علمائے اہل سنت کا کردار بلاشبہ قابل تقلید رہا ہے۔ انہیں حضرات کی کاوشوں کا ثمرہ ہے کہ ہم آج پاک و ہند کی کھلی فضا میں سانس لے رہے ہیں۔ مگر جن ہاتھوں میں قلم تھا ان کا تعلق اہل سنت کے مخالف گروہ سے تھا اس لیے انہوں نے اپنے آباؤ اجداد اور اپنے اکابر کے کارناموں کو بڑھا چڑھا کر ایسے پیش کیا کہ جنگ آزادی کے اصل ہیرو ہی وہ بن گئے اور سنّی چوں کہ قلمی اعتبار سے مفلوج تھے اس لیے وہ اپنی سچی تاریخ بھی اہل دانش کے سامنے پیش نہ کر سکے۔ اس کے نقصانات کس قدر ہوئے وہ آج ہماری نگاہوں کے سامنے ہیں۔

غدر کے واقعات سے جہاں دہلی کے مسلمانوں میں تباہی و بربادی پھیلی ہوئی تھی وہیں دوسرے برادران وطن مطمئن تھے۔ ان کے ذہن و دماغ میں کسی قسم کا انتشار نہ تھا۔ مولوی ذکاء اللہ اپنی تصنیف "تاریخ انگلیسیہ" میں لکھتے ہیں: "جن محلوں میں غدر سے پہلے ہندوؤں کا ملک میں ایک مکان نہ تھا' غدر کے بعد وہاں بہت سے ہندو مالک مکان ہو گئے۔ مسلمانوں نے اپنا زیور بہت سستا ہندوؤں کے ہاتھ بیچا۔ بارہ آنے تولہ چاندی اور چودہ روپے تولہ سونا۔ بہت سے ہندوؤں کے گھروں میں غدر کیا آیا' لکشمی آئی۔ انہوں نے سپاہیوں سے لوٹ یا چوری کا مال ارزاں خرید لیا"۔[1]

یہ وہ حقائق ہیں جنہیں نہ تو کوئی بیان کرتا ہے اور نہ ہی انہیں نظر انداز کیا جا سکتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ملکی قیادت آزادی کے بعد مسلسل انہیں برادران وطن کے ہاتھوں میں رہی' اس لیے انہوں نے مسلم مجاہدین جنگ آزادی کے متعلق کاوشوں کو پس پشت ڈال دیا اور خود ہی جنگ آزادی کے ہیرو بن بیٹھے۔ ٹھیک اسی طرح جس طرح دیوبندی مورخین نے علمائے اہل سنت کی مجاہدانہ کاوشوں کو غدر کے صفحۂ تاریخ سے مٹا دیا اور خود جنگ آزادی کے ہیرو

بن گئے۔ ایسا ایک گہری سازش کے تحت کیا گیا ہے جس کے جاننے کے لیے ہندو متعصبانہ ذہنیت کا مطالعہ تاریخ وند کے حوالے سے مناسب ہوگا۔

مسلم مجاہدین آزادی کے ساتھ برادرانِ وطن نے جو متعصبانہ رویہ اختیار کیا اس کے خلاف ہمارے علماء نے کچھ نہیں کیا۔ ان حضرات کے نوکِ قلم سے ایسی کوئی پالیسی وضع نہیں ہوئی جس کے باعث مکمل طور پر اس گھناؤنی حرکت پر قدغن لگایا جاسکے۔ اس سلسلے میں مسلم علماء و قائدین کو چاہیے کہ مسلم مجاہدین آزادی کے متعلق سیمینار اور کانفرنسیں کریں اور اس میں شائقین مملکت اور حکومت کے اہم ذمہ داران کو بلا کر ان کی قربانیوں کا ذکر کریں۔ اردو زبان کے علاوہ دیگر زبانوں میں بھی ان مسلم مجاہدین اور ان کی مجاہدانہ قربانیوں کے متعلق تفصیل سے لکھیں۔

قلم کی طاقت اغیار کے پاس تھی اور انہوں نے جنگ آزادی کی ایسی تاریخ گڑھی جس کا حقائق سے دور کا واسطہ نہیں۔ انہوں نے جس کو چاہا جنگ آزادی کا ہیرو بنا دیا اور جس کو چاہا سفلہ ہستی سے مٹا دیا۔ حقائق سے یہ واضح ہے کہ وہابی علماء نے جنگ آزادی کی مخالفت کی اور علمائے دیوبند کا جنگ آزادی میں حصہ دال میں نمک کے برابر رہا ہے مگر تحریک آزادی پر قلم اٹھانے والوں نے اس تاریخ کو ایسا پیش کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ صرف اور صرف علمائے دیوبند ہی کی مجاہدانہ کاوشوں سے ہمیں ہندوستان کی آزاد فضا میں سانس لینے کا موقع ملا۔ تاریخ کو گڈمڈ کرنے اور جھوٹ کو سچ اور سچ کو جھوٹ ثابت کرنے میں ہمارے بعض مورخین جن میں غلام رسول مہر کا نام سرِ فہرست ہے' کا کلیدی کردار رہا ہے۔ انہوں نے اپنی تاریخ نگاری میں جنگ آزادی کی پوری تاریخ مسخ کر کے رکھ دی ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بعض سیدھے سچے لوگوں نے بھی ان کی گمراہ کن تحریروں کو اصل سمجھ لیا ہے۔ اس تعلق سے ایک واقعہ جو حقیقت پر مبنی ہے یہاں لکھنا ضروری سمجھتا ہوں جس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ایسے مورخین کی تحریروں سے سیدھے سچے لوگ کس قدر گمراہ ہوئے ہیں۔ جنگ آزادی کے متعلق میرا ایک مقالہ "ایوان اردو" دہلی میں 2007ء کے شمارے میں شائع ہوا تھا۔ مقالہ میں انہیں حقائق کی نشان دہی کی گئی تھی جنہیں مسلسل نظر انداز کیا جارہا تھا۔ مقالہ چھپتے ہی ایک خود ساختہ دانش ور نے اس پر اعتراض کر ڈالا۔ معترض اور اس کے اعتراض کا راقم نے جو جواب دیا وہ دونوں ہدیۂ ناظرین ہیں:

﴿اعتراض معترض﴾

تحریک آزادی سے متعلق ایک غلط فہمی یہ ہے کہ 1857ء کو پہلی جنگ آزادی قرار دیا جاتا ہے جب کہ برٹش سامراج کے خلاف پہلی مسلح جدوجہد 1826ء میں شروع ہوئی۔ وہابی تحریک جہاد کے اس اولین معرکہ کے سالار شاہ

WWW.NAFSEISLAM.COM

محمد اسماعیل دہلوی اور سید احمد رائے بریلوی تھے جو 6 مئی 1831ء کو بالاکوٹ کے میدان میں شہید ہوئے۔ 1857ء کا معرکہ دوسری جنگ تھی۔ تیسرا معرکہ 1942ء کو نیتاجی سباش چندر بوس نے آزاد ہند فوج کی تشکیل کر کے شروع کیا۔ اس طرح جنگ آزادی کے یہ تین مرحلے تھے۔ یہ تاریخی حقیقت ہے اور اسے نظر انداز نہیں کیا جانا چاہیے۔

غلام یحییٰ انجم کا مضمون "دہلی کے علماء اور 1857ء" غیر مستند حوالوں پر مبنی ہے اور قابلِ اعتراض بلکہ اشتعال انگیز ہے۔ انہوں نے شاہ محمد اسماعیل دہلوی اور سید احمد رائے بریلوی کو جنگ آزادی کا مخالف قرار دیا ہے حالانکہ یہ دونوں جنگ آزادی کے اولین سالاروں میں سے تھے اور دونوں 1831ء میں شہید ہوئے۔ اس لیے یہ کہنا کہ جنگ آزادی کے مخالف تھے، محض تعصب اور بدنیتی پر مبنی ہے۔ دہلی میں تحریک آزادی 1857ء میں شروع ہوئی جب کہ یہ دونوں 25 سال پہلے اس دنیا سے جا چکے تھے۔

انجم صاحب اگر ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر کی کتاب "ہمارے ہندوستانی مسلمان" ڈاکٹر قیام الدین کی کتاب "ہندوستان میں تحریک وہابیت" اور مولانا غلام رسول مہر کی قاموسی تحریر "تحریک مجاہدین، سرگشتِ مجاہدین اور سید احمد شہید" کا بغور مطالعہ کریں تو انہیں معلوم ہوگا کہ وہابی جنگ آزادی کے اولین نقیب اور مجاہد تھے۔

﴿اعتراض﴾

آزادی کے ساٹھ سال پورے ہونے پر ملک ہندوستان میں متعدد تقریبات کا اہتمام کیا گیا اور کلچرل پروگرام کے علاوہ جنگ آزادی کے متعلق کئی ایک کتابیں زیورِ طبع سے آراستہ ہوئیں۔ کئی دینی و ادبی رسالوں میں جنگ آزادی کے متعلق مضامین شائع ہوئے۔ اس متعلق راقم کا بھی ایک مقالہ "دہلی کے علماء اور 1857ء" اردو اکیڈمی کے موقر رسالہ ایوانِ اردو دہلی میں شائع ہوا۔ اس مقالہ میں ان حقائق کی نشان دہی کی گئی تھی جس کی طرف سے مسلسل اغماض برتا جا رہا تھا۔ یہ حقائق چوں کہ چونکا دینے والے تھے اس لیے کچھ لوگوں نے انہیں پسند نہیں کیا۔ معترض نے اس سلسلہ میں تین چیزوں کی طرف توجہ دلائی:

1. پہلی جنگ آزادی 1857ء نہیں 1826ء ہے۔
2. شاہ اسماعیل دہلوی اور سید احمد رائے بریلوی جنگ آزادی کے اولین سالاروں میں سے تھے۔
3. اس سلسلے میں اصل حقائق جاننے کے لیے راقم کو ڈبلیو ہنٹر اور مولانا غلام رسول مہر کی کتابوں کا مطالعہ کرنا چاہیے۔

اب معترض کے ان اعتراضات کے جواب ملاحظہ فرمائیں:

❶ معترض نے پہلی جنگ آزادی 1826ء کو قرار دیا ہے جو محل نظر ہے۔ ابھی جو تقریبات منائی گئی ہیں تمام حلقہ والوں نے ہی 1857ء کو پہلی جنگ آزادی قرار دیا ہے۔ جنگ آزادی کی مہم کبھی بھی چھڑی ہو لیکن اس جنگ نے باضابطہ جنگ کی شکل اس وقت اختیار کی جب علماء نے فتویٰ جہاد صادر فرمایا اور پھر جوق در جوق علماء اس مہم میں شریک ہوئے اور ایسا 1857ء میں ہوا' جس کی تفصیل اس دور میں لکھی جانے والی کتابوں میں دیکھی جاسکتی ہے۔

❷ معترض نے اپنے مکتوب میں جو یہ دعویٰ کیا ہے کہ شاہ اسماعیل دہلوی اور سید احمد رائے بریلوی جنگ آزادی کے اولین سالاروں میں تھے یہ بھی محل نظر ہے۔ ان کے دونوں سوانح نگار جعفر تھانیسری اور مرزا حیرت دہلوی ان کے نہایت ہی اہم اور قریب العہد سوانح نگار ہیں۔ ان سوانح نگاروں کی تحریروں کی صداقت اور حقانیت کا اعتراف مسعود عالم ندوی' حسین احمد مدنی اور دور آخر میں ابوالحسن علی ندوی نے کیا ہے۔ یہ دونوں مصنفین بہانگ دہل اس کا اقرار کرتے ہیں کہ سید احمد رائے بریلوی اور شاہ اسماعیل دہلوی نے انگریزوں سے نہیں سکھوں سے جہاد کیا تھا اور اسی میں ان کی موت ہوئی تھی۔

شاہ اسماعیل دہلوی' جو سید صاحب کے ہم پیالہ وہم نوالہ بھی تھے' سید احمد رائے بریلوی کی اتباع میں انگریزوں سے کیسی محبت کرتے تھے۔ جعفر تھانیسری لکھتے ہیں: ''یہ صحیح روایت ہے کہ اثنائے قیام کلکتہ میں جب ایک روز مولانا محمد اسماعیل دہلوی وعظ فرمارہے تھے کہ ایک شخص نے مولانا سے یہ فتویٰ پوچھا کہ سرکار انگریز سے جہاد کرنا درست ہے یا نہیں؟ اس کے جواب میں مولانا نے فرمایا کہ بے روریا اور غیر متعصب سرکار پر کسی بھی طرح جہاد کرنا درست نہیں''۔ ۲

مرزا حیرت دہلوی نے بھی اپنی تصنیف میں یہ بات تحریر کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں: ''کلکتہ میں جب مولانا اسماعیل دہلوی نے جہاد کا وعظ فرمانا شروع کیا اور سکھوں کے مظالم کی کیفیت پیش کی تو ایک شخص نے دریافت کیا کہ آپ انگریزوں پر جہاد کا فتویٰ کیوں نہیں دیتے؟ آپ نے جواب دیا ان پر جہاد کرنا کسی طرح واجب نہیں۔ ایک تو ان کی رعیت ہیں دوسرے مذہبی ارکان کے ادا کرنے میں وہ ذرا بھی دست اندازی نہیں کرتے۔ ہمیں ان کی حکومت میں ہر طرح آزادی ہے بلکہ ان پر کوئی حملہ آور ہو تو مسلمانوں پر فرض ہے کہ وہ اس سے لڑیں اور اپنی گورنمنٹ پر آنچ نہ آنے دیں''۔ ۳

سید احمد رائے بریلوی نے انگریزوں کی ایماء واشارہ سے سکھوں کے خلاف جہاد کی تیاری کی اور اس جنگ میں انگریزوں نے اس کی مدد کی۔ سکھوں سے اس جہاد کو وہ اپنے لیے مامور من اللہ سمجھتے تھے۔ اپنے ایک مکتوب میں

سید صاحب لکھتے ہیں: "معاملہ ایں خاک سار کا عکس فی زمانہ اظہار ہو یدا آشکارا ست کہ جہاد اہل مناوقوم سکھ ماموم" یعنی (اس خاکسار کا معاملہ سہ پہر کے سورج کی طرح واضح ہے کہ میں اہل مناوقوم سکھ سے جہاد کے لیے مامور ہوں)

اس کے علاوہ سید صاحب یہ بھی فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ مجھے سکھوں سے جہاد کرنے کے لیے اللہ کی طرف سے الہام بھی ہوا ہے: "اما بیان الہام پس از تقریر پردۂ غیب بہ بشارت رہانی باستیصال کفار وازالہ مویاں مراد است"۔ ۶

سید صاحب کا الہام بتا رہا ہے کہ وہ کفار و ازالہ مویاں یعنی سکھوں کے استیصال کے لیے مامور تھے۔ جعفر تھانیسری لکھتے ہیں: "سفر جہاد سے پہلے آپ کو بذریعہ الہام ربانی ہوا تھا کہ ملک پنجاب آپ کے ہاتھوں فتح ہو کر پشاور سے دریائے ستلج تک جمیع ملک ہندوستان کے رشک افزائے چمن ہو جائے گا۔ چنانچہ ان مواعید و بشارات کے آپ کا ہر ایک مرید واثق تھا"۔ ۷

آپ کے سوانح نگار دوسری جگہ لکھتے ہیں: "ان حالات کی موجودگی میں کہ انگریز سرکار کا فرماتھی مگر اس کی مسلمان رعایا کی آزادی اور سرکار انگریز کی بے روریائی اور ان حالات کی موجودگی میں ہماری شریعت کی شرائط انگریز سے جہاد کو مانع تھیں۔ اس لیے آپ نے فیصلہ فرمایا کہ سکھ قوم پنجاب پر جو نہایت ظالم اور احکامات شریعت کی خارج اور مانع تھی جہاد کیا جائے"۔ ۸

ان تفصیلات کی روشنی میں معترض صاحب دیانت کی روشنی میں بتائیں جو ان کے قریب العہد سوانح نگار لکھ رہے ہیں اسے مانا جائے یا 125 سال بعد جو غلام رسول مہر لکھ رہے ہیں اسے تسلیم کیا جائے؟ معترض ذرا مگر یبان میں اپنا سر ڈال کر سوچیں کہ سید صاحب کو الہام ہو تا رہے کہ آپ سکھوں کے خلاف جہاد کریں' 125 سال تک لوگ یہی کہتے رہے مشہور رہا مگر بعد کا غلام رسول مہر کو الہام ہوا کہ سید صاحب انگریزوں کے خلاف تھے اور ان سے جہاد کرنا چاہتے تھے۔ اگر چہ انگریز حکومت کی مخالفت میں ان سے ایک حرف بھی منقول نہیں۔ کیا یہ سوچ ایک مخصوص مکتب فکر کی ترجمانی نہیں کرتی؟

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اسماعیل دہلوی جیسے لوگ دیگر لوگوں کو سکھوں کے عذاب سے نجات دلانے آئے تھے اور مسلمانوں کے ہاتھوں ہی مارے گئے۔ عبید اللہ سندھی لکھتے ہیں: "1831ء میں بالاکوٹ کے مقام پر حضرت سید احمد شہید اور ان کے ساتھی شہید کر دیے گئے اور خود آزاد قبائل میں سے بعض لوگوں نے ہندوستانی مجاہدین کو لوٹا کھسوٹا اور قتل تک کیا"۔ ۹

اس حقیقت کا اعتراف سرسید نے بھی کیا ہے کہ اسماعیل دہلوی اور سید احمد مسلمانوں کے ہاتھوں مارے گئے۔ وہ لکھتے ہیں: "ہندوستان کے شمال و مغرب کی سرحد پر جو پہاڑی قومیں رہتی ہیں وہ سنی المذہب اور قومیں ہیں۔ چونکہ پہاڑی قومیں ان (سید احمد و اسماعیل دہلوی) کے عقائد کے مخالف تھیں اس لیے وہ وہابی ان پہاڑیوں کو ہرگز اس بات پر راضی نہ کر سکے کہ وہ ان کے مسائل کو بھی اچھا سمجھتے ہیں مگر البتہ چوں کہ سکھوں کے جور و ستم سے نہایت تنگ تھے اس سبب سے وہ وہابیوں کے اس منصوبے میں شریک ہو گئے کہ سکھوں پر حملہ کیا جائے..... لیکن چوں کہ یہ قوم مذہبی تعصب میں نہایت سخت ہے۔ اس سبب سے اس قوم نے آخر میں وہابیوں سے دغا کر کے سکھوں سے اتفاق کر لیا اور مولوی محمد اسماعیل صاحب و سید احمد کو قتل کر دیا۔"[1]

یہ ہے وہ اصل حقیقت جس پر غلام رسول مہر نے پردہ ڈالنے کی ناکام کوشش کی ہے اور عام سوانح نگاروں سے ہٹ کر ملت اسلامیہ کی تاریخ کو توڑ مروڑ کر پیش کیا ہے اور بیانگ دہل اس بات کا اقرار کیا ہے کہ "میں مجاہدین کی شان و آبرو بہر حال تا قیام قیامت کا قائل ہوں اگرچہ وہ سابقہ بیانات اور توجیہات سے میں مطابق نہ ہوں۔"[2]

[1] مگر یہ مصنف ایلیٹ ڈاؤسن کی جس کتاب کے مطالعہ کا معترض صاحب نے مجھے مشورہ دیا ہے اس کتاب کے بارے میں مرزا حیرت دہلوی لکھتے ہیں: "ان کی ابتدائے تحریر سے یہ بات صاف مترشح ہو جاتی ہے کہ وہ جس طرح ان سے ہو سکے گا مسلمانوں کو باغی ٹھہرانے اور گورنمنٹ کو ان کی طرف سے بدظن کرنے کی کوشش کریں گے۔ چنانچہ تمام کتاب تک انہوں نے ایسا ہی کیا ہے۔ ان کی 218 صفحے کی کتاب غلطیوں کے انبار سے بھری ہوئی ہے۔ اسی طرح ہے جا تحکم اور غلط مفروضے کی ہر جگہ بھرمار پائی جاتی ہے۔ کاش اگر کچھ بھی انصاف ہوتا تو وہ مظلوم مسلمانوں کو ایسا متہم نہ کرتے"۔[2]

مسلک دیوبند کی بنیاد کب پڑی؟

ان تصریحات کی روشنی میں بہ طور پر کہا جا سکتا ہے کہ علمائے اہل سنت کے قلم کی کوتاہی سے کہیں زیادہ دیوبندی علماء اور دانش وروں کے نظریاتی تعصب کا کافی عمل دخل رہا ہے۔

دیوبندیت کی تاریخ کچھ زیادہ پرانی نہیں۔ مولوی قاسم نانوتوی اور مولوی رشید احمد گنگوہی اس مکتب فکر کے موسسین میں سے تھے۔ جو لوگ اس کا ڈانڈا حضرت شاہ ولی محدث دہلوی علیہ الرحمۃ سے جوڑتے ہیں وہ تاریخی اعتبار سے غلطی پر ہیں۔ اس سلسلے میں جناب انظر شاہ کشمیری (م مئی 2008ء) استاذ تفسیر دار العلوم دیوبند کا بیان قول فیصل ہوگا۔ وہ اپنے ایک مقالہ "مسلک دیوبند کیا ہے؟" میں لکھتے ہیں: "مسلک دیوبند چودھویں صدی کی پیداوار

ہے۔ مولانا قاسم نانوتوی مولانا رشید احمد گنگوہی سے پہلے کسی مسلک مخصوص سے اس مسلک کا کوئی تعلق نہیں"۔

پھر وہ لکھتے ہیں: "میرے نزدیک دیوبند بدعت خالص ولی اللہی فکر بھی نہیں اور نہ کسی خاص خانوادہ کی نجی بندھی فکر دولت و متاع۔ میرا یقین ہے کہ اکابر دیوبند جن کی ابتدا میرے خیال میں سیدنا الامام مولانا قاسم صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ علیہ اور فقیہ اکبر مولانا رشید احمد گنگوہی سے ہے علم کامل اور شعور بالغ کے ساتھ قدرت نے ان کو ایک ایسی چھلنی بھی عطا کی تھی جس سے وہ افکار و نظریات کو چھان کر ہی قبول کر سکیں۔ مجھے اس حقیقت کے اعتراف کرنے میں کوئی تامل و تذبذب نہیں ہوتا کہ ہندوستان کی سیاسی و مذہبی پامالی کے دور میں دین کو اپنی شکل میں باقی رکھنے کے لیے دیوبند کا وجود قدرت کا ایک عطیہ ہے اور جن اکابر کو فکر و نظر کی تراش خراش کے لیے خدا تعالیٰ نے کھڑا کر دیا وہ عظیم الشان صدیوں کی الف پیمیز میں وجود پذیر ہوتے ہیں۔ اس لیے میں دیوبندیت کی ابتدا حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ سے کرنے کے بجائے مذکورہ بالا دو عظیم ہستیوں سے کرتا ہوں"۔ بجا ہے

اکابر دیوبند جن میں رشید احمد گنگوہی (م 1905ء) اور قاسم نانوتوی (م 1880ء) کا نام سرفہرست ہے۔ ان میں اول الذکر کی ولادت 1829ء اور موخر الذکر کی پیدائش 1842ء میں ہوئی۔ یعنی 1857ء کے غدر میں ان حضرات کی عمریں ترتیب 28 اور 15 سال تھی۔ جب علمائے اہل سنت آزادی کے حصول کے لیے اپنی جانوں کا نذرانہ دینے کے بعد اپنے جسموں کو تپتی اور کوئلہ کی طرح دہکتی ہوئی توپوں کے دہانوں پر باندھ کر اڑا رہے تھے تو ان ایام میں یہ دیوبندی اور وہابی علماء انگریزوں کی طرف سے دیے جانے والے اعزازات اور انعامات سے سرفراز ہو رہے تھے۔

بقول رئیس احمد جعفری: "مولوی نذیر حسین صاحب اور مولوی عبدالرب صاحب اور مولوی عنایت اللہ خاں صاحب نے غدر میں ایک دو مسلمانوں اور یوں کو اپنے گھر میں چھپایا تھا۔ اس صلے میں انگریزوں نے ان کو انعام دیا تھا اور ان کی خیر خواہی کی قدر کی"۔ ص 43

برصغیر میں افتراق بین المسلمین کا بانی اسماعیل دہلوی

یہ بالکل سچ ہے کہ برطانوی عہد کے انگریز حکمرانوں نے "لڑاؤ اور حکومت کرو" کی پالیسی پر بڑی سختی سے عمل کیا۔ اگر وہ اس پالیسی پر عمل نہ کرتے تو شاید ان کا بتاز و بہت پہلے ہندوستان سے نکل گیا ہوتا۔ مگر انہوں نے ایک جماعت کو اپنا ہم نوا بنا لیا جو ان کے ہر منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کی مسلسل منصوبہ بندی کرتی رہی۔ مولوی اسماعیل دہلوی ان میں سے ایک تھا۔ انہوں نے "تقویۃ الایمان" کے نام سے ایک کتاب لکھی جو ہندوستان میں تفریق بین المسلمین کے لیے نشست اول ثابت ہوئی۔ مسلمانوں کے درمیان شورش پیدا کرنے اور انہیں لڑانے بھڑانے اور شرک

غلی کو شرک جلی لکھنے کے خود اقراری مجرم تھے خود شاہ اسماعیل دہلوی ہیں۔ انہوں نے ہی تو یہ اقبال جرم کیا ہے۔ [۱۴]

﴿دار العلوم دیوبند کا حقیقی بانی کون؟﴾

یہ بات اظہر من الشمس ہو چکی ہے کہ دار العلوم دیوبند کے اصل بانی الحاج عابد حسین تھے جو سلسلۂ قادریہ میں مہاں راج شاہ سودہ شریف ہریانہ کے اجلہ خلفاء میں سے تھے اور موجودہ زمانے کے علمائے اہل سنت وجماعت کی طرح وہ بھی نذر و نیاز اور میلاد و فاتحہ پر عمل پیرا تھے۔ جب سے دار العلوم دیوبند پر قاسم نانوتوی اور ان کے احباب کا غاصبانہ قبضہ ہوا اور حاجی عابد حسین ادارہ سے بالکل بے دخل کر دیے گئے اسی وقت سے ہی ادارے کے مقاصد جو عظمت رسول اور اشاعت دین حق پر مبنی تھے یکسر بدل گئے۔ انگریزوں کے خلیفہ خوار مولوی اس ادارے کے اہم اراکین میں شامل ہو گئے۔ یہاں حضرات نے اس ادارے کے پلیٹ فارم سے وہی سب کچھ کیا جو انگریز بہادر چاہتے تھے۔ اس ادارے نے ملت کے درمیان انتشار کا جو عمل پھیلایا وہ انگریز بہادر کے لیے انتہائی مسرت و شادمانی کا سبب بنا۔

دیوبندی مکتب فکر کے مشہور دانش ور پروفیسر محمد ایوب قادری فرماتے ہیں: "اس مدرسہ نے یونہی نہیں ترقی کی۔ 31 جنوری 1875ء کو وزیر ہند لیفٹیننٹ گورنر سر جان اسٹریچی کے ایک خاص معتمد مسٹر جان پامر نے اس مدرسہ کو دیکھا اور اس نے نہایت اچھے خیالات کا اظہار کیا۔ اس کے معائنہ کی چند سطور درج ذیل ہیں: "جو کام بڑے بڑے کالجوں میں ہزاروں روپے کے صرف (خرچ) سے ہوتا ہے وہ یہاں کوڑیوں میں ہو رہا ہے۔ جو کام پرنسپل ہزاروں روپے ماہانہ تنخواہ لے کر کرتے ہیں وہ یہاں ایک مولوی چالیس روپے ماہانہ پر کر رہا ہے"۔ [۱۵]

مولانا حکیم اختر شاہجہان پوری اس مذکورہ اقتباس پر تبصرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں: "انگریز افسر نے مدرسہ دیوبند کی اور وہاں کے مدرسین کی تعریف کی اس وجہ سے کہ وہاں اہل اسلام کی خدمت ہو رہی ہے؟ انگریز خدمت اسلام سے خوش ہوتے تھے یہاں کے اشتعال میں سکون محسوس کرتے تھے؟"۔ [۱۶]

دار العلوم دیوبند پر غاصبانہ قبضہ کرنے کے بعد اس کے پلیٹ فارم سے دینی خدمات کے نام پر کیا کارنامہ انجام دیا گیا اس کی تفصیل بھی مختصراً پڑھتے چلیں تاکہ یہ واضح ہو جائے کہ انگریز گورنمنٹ کی ملازمت سے سبک دوش پنشن یافتہ "وفادار" افراد اشاعت دین حق میں کس قدر مخلص تھے؟

❶ 1290ھ/1874ء میں مولوی قاسم نانوتوی نے اپنی کتاب "تحذیر الناس" میں رسالت مآب ﷺ کے ختم نبوت کا انکار کیا۔

❷ 1301ھ/1884ء میں مولوی رشید احمد گنگوہی نے "امکان کذب باری تعالیٰ" یعنی اللہ تعالیٰ کے جھوٹ

بولنے پر قادر ہونے کا فتویٰ دیا۔ [۱۷]

❸ 1304ھ/1887ء میں مولوی خلیل احمد انبیٹھوی نے اپنی کتاب "براہین قاطعہ" میں رسالت مآب ﷺ کے علم پاک کو شیطان سے کمتر ثابت کیا جس کی تصدیق مولوی رشید احمد گنگوہی نے بھی کی۔

❹ 1319ھ/1901ء میں مولوی اشرفعلی تھانوی نے اپنی کتاب "حفظ الایمان" میں رسول اکرم ﷺ کے علم پاک کو پاگل، مجنوں، جانوروں اور چوپایوں جیسی حقیر اور ذلیل مخلوق سے تخمینہ دے کر رسالت مآب ﷺ کے علم غیب کی نفی کی۔

❺ مولوی قاسم نانوتوی نے اپنی کتاب "تحذیر الناس" میں انبیائے کرام کو مرتکب کذب اور معاصی زدہ ہونا ثابت کیا۔ 1965ء میں مفتی مسعود احمد اور مفتی سید احمد علی سعید نے دار الافتاء دیوبند سے ذکر و عقیدے پر کفر کا فتویٰ دیا۔ [۱۸]

الغرض انگریز بہادر کی حکومت کا انحصار ہی انہیں جیسے نام نہاد مسلمانوں کے ذریعہ سماج میں انتشار پیدا کروانے اور پھر اس کی آڑ میں حکومت کرنے پر تھا۔ اس موضوع پر اور بہت سے محققین اور قلم کاروں نے تفصیل سے لکھا ہے جس کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔

انگریز کے وفادار گروہ

برطانوی عہد کے وفاداروں میں کئی ایک فرقے تھے لیکن انگریزوں کی وفاداری میں جن فرقوں نے اہم کردار ادا کیا ان میں درج ذیل تین مکاتب فکر کے سربراہان کا کلیدی کردار رہا ہے۔

❶ قادیانی گروہ:

مرزا غلام احمد قادیانی یہ ہندوستان کا نقاب اوڑھ چال کر رہا ہے۔ اسے برطانوی سامراج کی در پردہ سرپرستی اور پشت پناہی حاصل تھی۔ اس نے انگریزوں کا قرب حاصل کرنے کے لیے فریضہ جہاد کی کو ساقط کرا لا۔ عدم استطاعت اور قدرت کی بنیاد پر عدم فرضیت کی بات اس نے نہیں کی بلکہ یہ کہا اور لکھا کہ اب کبھی بھی کسی مسلمان پر جہاد فرض نہ ہوگا۔ [۱۹]

❷ دیوبندی گروہ:

مسلکہ دیوبند کے اکثر علماء انگریز بہادر کے ملازم اور وظیفہ خوار تھے۔ مدرسہ دیوبند کے ذمہ داروں اور مدرسوں

کی اکثریت ایسے بزرگوں پر مشتمل تھی جو گورنمنٹ کے قدیم ملازم اور حال پنشنر تھے جن کے بارے میں گورنمنٹ کو شک وشبہ کرنے کی گنجائش ہی نہ تھی۔ [۳۰]

③ وہابی گروہ:

مولانا محمد مظہر نانوتوی مدرس آگرہ کالج' مولانا محمد منیر دیوبندی مدرس بریلی کالج' مولانا محمد احسن نانوتوی مدرس بنارس و بریلی کالج' دیوبندی شیخ الہند مولانا محمود حسن کے والد مولانا ذوالفقار علی دیوبندی مدرس بریلی کالج تھے۔ مولانا فضل الرحمٰن دیوبندی اپنی اسکالر مدارس تھے اور پنشن تک آپ یوپی کے مختلف اضلاع بالخصوص بجنور میں اپنی اسکالر محکمہ تعلیم کے عہدے پر فائز رہے۔ [۳۱]

وہابی علماء بھی انگریزوں کے ہم نوا تھے۔ انہوں نے علی الاعلان انگریزوں کی حمایت کا اعلان کیا تھا اور یہ لکھا کہ برٹش حکومت مٹ جانے اور یہ امن وامان جو آج حاصل ہے فساد کے پردے میں جہاد کا نام لے کر اخاذیا جائے' سخت تباہی اور بربادی کی بات ہے۔ [۳۲]

مولانا محمد حسین بٹالوی جو انگریز حکومت کے بہی خواہ اور وفادار تھے۔ انہوں نے حکومت ہند کو درخواست دی کہ جماعت اہل حدیث حکومت ہند کی مکمل وفادار اور خیر خواہ ہے اس لیے لفظ وہابی کی جگہ لفظ اہل حدیث لکھنے اور سرکاری کاغذات میں اسی طرح اندراج کرنے کا حکم صادر فرمائیں۔ ان کی یہ درخواست تحریری طور پر 19 جنوری 1887ء کو منظور ہوئی اور 1888ء میں اس کے لیے سرکاری پروانہ مسٹر ہے نی ایسوسی ایٹ سیکرٹری گورنمنٹ آف انڈیا نے 11 جون 1888ء کو شملہ سے جاری کیا۔ [۳۳]

وہابی علماء کی انگریز وں کے ساتھ وفاداری کا اس سے بڑھ کر اور ثبوت کیا ہو سکتا ہے کہ 1886ء میں ملکہ برطانیہ کی گولڈن جوبلی منائی گئی۔ اس خوشی وہابی علماء نے جو انجمن بنائی تھی اس کا نام "انجمن شکر گزاری" رکھا تھا۔ یہ لکھنا واضح ہو کہ اس موقع پر جو کچھ اہل حدیث نے کیا ہے ان میں چند یہ ہیں:

① (۱) ملکہ معظمہ کی حکومت پچاہ سال کی خوشی کرنا اور اس خوشی میں مسلمانوں کو کھانا کھلانا۔

② برٹش حکومت کی اطاعت وعقیدت کرنا اور اس کو فرض مذہبی بتانا۔

③ ملکہ معظمہ اور اس کی سلطنت کے لیے دعائے سلامتی وحفاظت وبرکت کرنا"۔ [۳۴]

ایسے علماء جو حکومت وقت کے وفادار تھے ان کی ایک طویل فہرست ہے جن کی تفصیل اس دور کی لکھی جانے والی کتابوں میں دیکھی جا سکتی ہے۔

﴿ حوالہ جات ﴾

۱ تاریخ انگلیسیہ، ص:719

۲ سوانح احمدی، ص:171

۳ حیات طیبہ، ص:423

۴ مکتوب احمدی، ص:236

۵ ایضاً، ص:180

۶ سوانح احمدی، ص:172

۷ ایضاً، ص:125

۸ مقدمہ کامل میں سات سال، ص:15

۹ مقالات سرسید، حصہ نہم، ص:39-40

۱۰ افادات مہر، ص:231

۱۱ حیات طیبہ، ص:422

۱۲ ماہنامہ ابلاغ، کراچی، ذی الحجہ 1388ھ، ص:131

۱۳ بہادر شاہ ظفر اور ان کا عہد، ص:357

۱۴ انگریز نوازی کی حقیقت، ص:59

۱۵ سوانح احسن نانوتوی، ص:217

۱۶ فیضان امام ربانی، ص:178

۱۷ فتاویٰ رشیدیہ، ص:96، مطبوعہ

۱۸ ماہنامہ تجلی، دیوبند، اپریل 1965ء، ص:65

۱۹ انگریز نوازی کی حقیقت، ص:61

۲۰ حاشیہ سوانح قاسمی، ص:7، 2، مرتبہ مناظر احسن گیلانی

۲۱ انگریز نوازی کی حقیقت، ص:74

۲۲ ترجمان السنہ، ص:7

۲۳ اشاعۃ السنہ، جلد:11، شمارہ:2، ص:47

۲۴ ایضاً، :229

Nafse Islam
نفس اسلام
WWW.NAFSEISLAM.COM

انقلاب 1857ء کے کچھ مضمرات وحقائق

مولانا مبارک حسین مصباحی

مولانا مبارک حسین مصباحی معروف صحافی، کالم نگار اور تجزیہ کار ہیں۔ آپ ماہنامہ "اشرفیہ" مبارک پور اعظم گڑھ کے مدیر اعلیٰ اور روح رواں ہیں، ہندوستان کے رسائل و جرائد میں مولانا مصباحی صاحب پوری آب و تاب سے جلوہ گر ہو کر اپنی انقلابی فکر و سوچ سے عوام و خواص کو نوازتے ہیں۔ ماہنامہ اشرفیہ مبارک پور، جام نور دہلی اور کنز الایمان دہلی وغیرہ میں گاہے بگاہے آپ کی نگارشات شائع ہوتی ہیں۔

انقلاب 1857ء کا تعلق ہندوستان کی آزادی میں بڑا تاریخی اور کلیدی کردار رہا ہے۔ یہ سچ ہے کہ 1857ء میں مجاہدین بظاہر جنگ ہار گئے تھے مگر اس کے خاکستر میں کچھ چنگاریاں ضرور دبی تھیں جنھوں نے بعد میں حکومت برطانیہ کو ہوا دے کر ہوا میں اڑا دیا۔ انقلاب زندہ باد کا نعرہ و رنگ لایا، غلامی کی زنجیریں ٹوٹیں اور متحدہ ہندوستان برطانوی جبر و ظلم کے چنگل سے آزاد ہوا۔ اس نے 1857ء کے مجاہدین کی قربانیوں کو یاد رکھنا ہمارا قومی فریضہ بھی ہے اور تاریخی ذمہ داری بھی۔

انقلاب 1857ء کا تانگ ہند میں برطانوی سامراجوں کے خلاف پہلی خوں ریز جنگ نہیں تھی بلکہ برطانیہ کے جبر و استحصال کا ہمارا ملک صدیوں شکار رہا ہے۔ 1601ء سے 1756ء تک برطانوی تاجروں نے اسے لوٹا کھسوٹا اور پھر ایسٹ انڈیا کمپنی کے پلیٹ فارم سے بنگال کی صنعت و تجارت اور زراعت کو اپنا نشانہ بنایا۔ اسی طرح اس نے دوسرے صوبوں کو بھی اپنی تجارتی سازشوں کا نشانہ بنایا۔ جب یہ کمپنی مالی اعتبار سے مستحکم ہو گئی تو پوری توانائی کے ساتھ 1757ء میں اس نے پلاسی کے میدان میں اپنی عسکری جارحیت کا آغاز کیا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی نے ہندوستانی راجوں مہاراجوں اور نوابوں سے درجنوں چھوٹی بڑی جنگیں کیں مگر 1857ء کی جنگ انگریزوں کے خلاف ایک ہمہ گیر عوامی انقلاب تھا جس نے پہلے مرحلے میں برطانوی سامراج کی چولیں ہلا کر رکھ دیں۔ اس میں دہلی، آبپاشی کلکتہ، بندیل کھنڈ اور اودھ سے آرہ (بہار) تک لاکھوں عوام براہ راست شریک تھے جو لاکھوں کی تعداد میں ملک و وطن

کے لیے اپنے جان و مال کی بے دریغ قربانیاں دے رہے تھے۔

انقلاب 1857ء کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ علمائے اہل سنت نے اس جنگ کو جہاد کا نام دیا تھا۔ علامہ فضل حق خیر آبادی، مولانا احمد اللہ شاہ مدراسی، مولانا فیض احمد بدایونی، مولانا کفایت علی کافی مراد آبادی، مولانا لیاقت علی الہ آبادی، مفتی عنایت احمد کاکوروی، سید مبارک شاہ رام پوری اور مولانا رضا علی شاہ بریلوی سمیت سینکڑوں علماء نے فتویٰ جہاد کی مہر اپنے اپنے علاقوں میں ثبت فرمائی اور ملک بھر میں ایثار و قربانی کی عظیم لہر پیدا کر دی۔ یہ اسی فتویٰ جہاد کا اثر تھا کہ ہزاروں علماء نے اس جنگ میں حصہ لیا اور جنگ کی سزاؤں سے لے کر پھانسی کے پھندوں تک کا سامنا بڑے حوصلہ و جرأت کے ساتھ مسکراتے ہوئے کیا۔

انقلاب 1857ء کے اسباب کیا تھے؟ یہ ایک اہم بحث ہے جسے بار بار اٹھایا جاتا ہے۔ ہم انقلابی انتشار کے ساتھ اس پر بھی روشنی ڈالتے ہیں۔ ہندوستانی زمینوں کا اصل فائدہ انگریز حاصل کر رہے تھے۔ ہندوستانی تجارت و صنعت کو انہوں نے اپنے مفاد استبداد میں بکتر بند تھا اور اس کا بیشتر فائدہ برطانیہ کو پہنچ رہا تھا۔ سونے کی چڑیا سامراج کے تحت ہندوستانی عوام کو جاہل رکھنے کی کوشش کی جاری تھی یا انہیں ایسی تعلیم دینے کی کوشش کی جاری تھی کہ ہندوستانی ہونے کے باوجود ان کا دل و دماغ انگریزوں جیسا ہو جائے۔ اس کے علاوہ ہندو مسلم ثقافت پامال کی جا رہی تھی اور سماجی رسم و رواجات کے تار و پود بکھیرے جا رہے تھے۔ پادریوں اور مشنری اسکولوں کے ذریعہ دین و مذہب پر حملے کیے جا رہے تھے بلکہ مسلمانوں کو عیسائی بنانے کی کوشش کی جا رہی تھی۔ عام طور پر مسلمانوں اور دیگر ہم وطنوں میں یہ خوف پیدا ہو رہا تھا کہ ہماری نسلوں کو جبراً عیسائی بنا دیا جائے گا۔ ہندوستان کو انگریزوں نے مسلمانوں کے ہاتھ سے چھینا تھا اس لیے انگریز حکمرانوں کے خلاف مسلمانوں میں غم و غصہ بھی زیادہ تھا اور انگریزوں کے خلاف مسلم عوام اور علماء نے کھل کر اعلان جنگ بھی کیا تھا۔

1857ء کی عام بغاوت کے اسباب کا ذکر کرتے ہوئے عدالت عالیہ مدراس کے ممبر کرنل سر میلکم لوئن نے لندن کے ایک رسالے میں لکھا تھا۔ "ہم نے ہندوستانی ذاتوں کو ذلیل کیا، ان کے قانون وراثت کو منسوخ کیا، جاہ شاہی کے قاعدوں کو بدل دیا، قدیمی رسم و رواج کی توہین کی، عبادت خانوں کی جاگیریں ضبط کیں، سرکاری کاغذات میں انہیں کافر لکھا، ہمارے ریاستیں ضبط کیں، لوٹ کھسوٹ سے ملک کو تباہ کیا، انہیں تکلیف دے کر مال گزاری وصول کی اور اونچے خاندانوں کو برباد کر کے انہیں آوارہ گرد بنا دینے والے بندوبست کیے۔"[1]

انگریزوں کی ایک انتہائی بھیانک سازش یہ تھی کہ دیگر نسلوں کے فکری ارتداد کے لیے مسلسل جہد و جہد کر رہے

تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ خاک ہند کے ساتھ باشندگان ہند کے دل و دماغ پر بھی ہمارا قبضہ ہو جائے۔ اپنے اس مقصد کے لیے انگریز درس گاہوں کا بھی استعمال کر رہے تھے۔ سر چارلس ٹریولین کہتا ہے: "میرا یقین ہے کہ جس طرح ہمارے بزرگ کل کے کل ایک عیسائی ہو گئے تھے اسی طرح یہاں بھی سب کے سب عیسائی ہو جائیں گے۔ ملک میں مذہب عیسوی کی تعلیم بلا واسطہ پادریوں کے ذریعہ اور بالواسطہ کتابوں' اخباروں اور یورپین افراد سے بات چیت وغیرہ کے ذریعہ نفوذ کرے گی۔ حتیٰ کہ عیسوی علوم تمام سوسائٹی میں نفوذ کر جائیں گے' تب ہزاروں کی تعداد میں عیسائی ہوا کریں گے"۔ ج

اسی خفیہ سازش کی نشاندہی کرتے ہوئے لارڈ میکالے لکھتا ہے: "ہمیں ایک ایسی جماعت بنانی چاہیے جو ہم میں اور ہماری کروڑوں رعایا کے درمیان مترجم ہو اور یہ جماعت ایسی ہونی چاہیے جو خون اور رنگ کے اعتبار سے ہندوستانی ہو مگر ذوق اور اپنے الفاظ اور سمجھ کے اعتبار سے انگریز ہوں"۔ ج

ان چند حوالوں کی روشنی میں آپ بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ انقلاب 1857ء کے اسباب کیا تھے اور مسلمانوں میں انگریزوں کے خلاف نفرت و بیزاری کے اسباب و علل کیا تھے؟

یہ بات تو بار بار دہرائی جاتی رہی ہے کہ اگر خاک ہند میں 1857ء کی جنگ نہ لڑی گئی تو 1947ء میں ہندوستان کو یہ وہ آزادی میسر نہ آتا۔ 1857ء سے 1947ء تک کا بڑا گہرا رشتہ ہے۔ مگر افسوس مسلمانوں نے جس بے جگری سے 1857ء کی جنگ لڑی تھی اور جس عزم و حوصلہ کے ساتھ جان و مال کی قربانیاں پیش کی تھیں۔ آزاد پاک و ہند میں ان کا اتنا حق اعتراف نہیں کیا گیا بلکہ اکثر علماء اور مجاہدین کے تاریخ سے نام تک کو کر دیے گئے۔

گزشتہ ڈیڑھ صدی کے اندر 1857ء کے متعلق بے حد لکھا گیا ہے مگر اس سے زیادہ نظر انداز کر دیا گیا۔ تاریخ نگاری سے زیادہ تاریخ سازی کی گئی۔ عام تاریخ نگاروں نے مسلمان مجاہدین کی قربانیوں کو نظر انداز کیا جبکہ مذہبی مورخین نے مسلکی تعصبات سے کام لیا۔ دیوبندی اور وہابی مکاتب فکر کا انقلاب 1857ء میں سرے سے کوئی کردار ہی نہیں تھا۔ مگر افسوس اس حقیقت کو ایک منصوبہ بند تاریخ سازی کی گئی کہ انگریزوں کے وفاداروں کو محب وطن ثابت کیا گیا اور انگریزوں کے حاشیہ برداروں کو مجاہدین کی صف میں لا کھڑا کیا گیا۔

ارباب قلم نے بھرپور دلائل و شواہد کے ساتھ یہ ثابت کیا ہے کہ انقلاب 1857ء میں اصل مجاہدین اہل سنت و جماعت تھے۔ فتویٰ جہاد دینے والے بھی علمائے اہل سنت تھے اور جنگ و جہاد میں پیش پیش بھی علمائے اہل سنت تھے۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ جب انقلاب 1857ء ناکام ہوا تو انگریزوں کے ظلم و ستم کا نشانہ علمائے اہل سنت بنے۔

علمائے اہلسنت ہی جزیرہ انڈمان میں قید و بند کی صعوبتوں سے گزرے، گولیوں کا نشانہ بنے، پھانسی کے پھندوں کو چوما، گھر سے بے گھر ہوئے اور بے وطنی کی زندگی گزارنے پر مجبور ہوئے۔ دہلی، لکھنؤ اور میرٹھ وغیرہ کے شہر و قصبات علمائے اہل سنت سے خالی ہو گئے۔ ہزاروں علمائے اہل سنت نے شہادت کا جام نوش کیا۔ اس کے برخلاف جو انگریزوں کے وفادار تھے انہیں خوب مراعات ملیں اور ان شہروں میں ان کا دین و مذہب بھی خوب پھلا پھولا۔

﴿حوالہ جات﴾

۱ روشن مستقبل، ص:109-110

۲ تاریخ تعلیم، ص:69

۳ ایضاً، ص:105

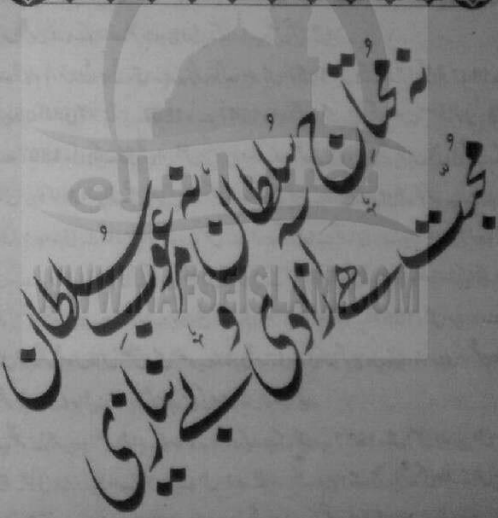

انقلاب 1857ء
کے بعد انگریزوں کی دہشت گردی

مولانا غلام مصطفی قادری رضوی

مولانا غلام مصطفی قادری رضوی کا تعلق نوری مشن مالے گاؤں سے ہے۔ پاکستانی رسائل وجرائد میں بھی وقتاً فوقتاً آپ کی تحریریں شائع ہوتی رہتی ہیں۔

1857ء ایک قیامت خیز تحریک تھی جس نے برطانوی افراد کو متزلزل کر دیا تھا۔ انگریز ہندوستان میں انجون کی گولی کھا کر نہیں آئے تھے بلکہ نہایت شعور اور چابک دستی کے ساتھ اپنے مقاصد کی تکمیل کے لیے انہوں نے یہاں قدم جمائے تھے۔ وہ آئے تو تجارت کی غرض سے تھے مگر جوں جوں اپنی تجارت کو فروغ وارتقا کی منزل پر دیکھتے رہے مسلمانوں کی عظمت وشوکت کا بھی مشاہدہ کرتے رہے۔ انہیں یقین ہو گیا کہ اس ملک میں حکومت وسلطنت کے استحکام کے لیے سب سے پہلے ہمیں قوم مسلم کو ختم کرنا ہوگا۔ اپنے ان مقاصد سیئہ کو پورا کرنے کے لیے انہوں نے مسلمانوں کی تہذیب وتمدن اور مذہبی شعائر کو مجروح کرنا شروع کیا۔

اس طرح بغاوت وعداوت کے شعلے ان کے دلوں میں بھڑکنے لگے تو حالات کے پیش نظر علمائے حق اہل سنت وجماعت نے ان کے ظلم واستبداد سے اہل اسلام کو بچانے کے لیے تحریک چلائی اور ان سفید چمڑی والوں کو سات سمندر پار واپس بھیجنے پر مجبور کر دیا۔ حالات کے تقاضوں کے پیش نظر مجاہدین اسلام نے انگریزوں کے ناپاک عزائم کو خاک میں ملا دیا۔ علامہ فضل حق خیرآبادی نے فتویٰ جہاد دیا اور علماء نے اس کی تصدیق کی۔ ملک بھر میں ہنگامہ ہوا' مسلمان بیدار ہوئے اور انگریزوں کے تئیں ان کے جذبات میں تیزی آئی۔ انقلاب کا آغاز ہوا اور آزادی ہند کے لیے ملک بھر سے چھوٹے بڑے اپنی قربانیاں دیتے رہے۔

مگر 1857ء کے بعد بدلہ لینے کی غرض سے انگریزوں نے جو ظلم کیے وہ قابل مذمت ہیں۔ ''دہلی اور اس کے اطراف پر قبضہ کے بعد انگریزوں نے جو روح فرسا اور انسانیت سوز مظالم ڈھائے وہ تاریخ کا ایک شرم ناک اور سیاہ ترین باب ہے۔ اس کا صفحہ صفحہ خون میں شرابور اور سطر سطر فریادی ہے۔ یہاں پر یہ بات ذہن نشین رہے کہ

1857ء کے خونی معرکہ سے پہلے انگریزوں کا ہیڈ کوارٹر کلکتہ تھا۔ مگر 1857ء کی جنگ میں کامیابی کے بعد دہلی تبدیل ہو گیا اور دہلی پر قبضہ کے بعد انگریزوں نے دہلی کی کل آبادی کو ہر سے نکال دیا تھا۔ ایک ماہ بعد ہندوؤں کو اپنی دولت کا 10 فی صد حکومت کو دینے کے بعد داخلہ کی اجازت ملی جب کہ مسلمانوں کا داخلہ سات ماہ بعد اپریل 1858ء میں اپنی دولت کا 25 فی صد ادا کرنے پر ہی ہو سکا۔ بہت سوں کی جائیدادیں ضبط کر لی گئیں۔ لال قلعہ کی دیوار سے چار سو گز تک کی عمارتیں حفاظتی نقطہ نظر سے مسمار کرنے کی وجہ سے ہنگڑوں اپنے آشیانوں سے محروم ہو گئے"۔ [1]

دہلی جیسے بڑی آبادی والے شہر جہاں خوشی رہنے والے انسانوں پر انگریزوں نے ظلم و جبر کے جو پہاڑ توڑے اس کی ناقابل بیان داستان ہے۔ مسرت و شادمانی کے ساتھ جو بھرے آباد رہتے تھے اب وہاں خوف اور دہشت کا عالم طاری تھا۔ خاموشی چھائی ہوئی تھی اور باہر نکلنے والوں کو منحوس آسیب اثیں نظر آتی تھیں۔

● انگریزوں کے کمانڈر لارڈ رابرٹس نے اس وقت کے دہلی شہر کی منظر کشی ان الفاظ میں کی ہے: "صبح کی ابتدائی روشنی میں دہلی سے گزرنا کا وہ مرحلہ بڑا ہی دردناک تھا۔ لال قلعہ کے لاہوری دروازے سے نکل کر ہم چاندنی چوک سے گزرے۔ دہلی حقیقتاً شہر خموشاں معلوم ہوتا تھا۔ ہمارے اپنے گھوڑوں کی سموں کی آواز کے سوا کوئی آواز کسی سمت سے نہ آتی تھی۔ ایک بھی ذی روح مخلوق ہماری نظر سے نہ گزری۔ ہر طرف نعشیں بکھری پڑی تھیں' ہر نعش پر وہ حالت طاری تھی جو موت کی کش مکش نے طاری کر دی تھی۔ ہر نعش تجہیز و تکفین کے منتظر معلوم ہوتی تھی۔ ہم بے تاب چلے جا رہے تھے یا کہنا چاہیے کہ بے ارادہ زیر لب باتیں کر رہے تھے تاکہ انسانیت کے ان دردناک باقیات کی استراحت میں خلل نہ پڑے۔ ان مناظر سے ہماری آنکھیں دو چار ہو رہی تھیں وہ ہمارے دل و دماغ پر نقش ہوتے جا رہے تھے۔ کہیں کوئی کتا کسی نعش کا بریدہ عضو منہ میں دبائے بھاگتا دکھائی دیتا تھا کہیں کوئی گدھ یا چیل کسی نعش پر اپنی گھناؤنی غذا کا لقمہ نوچ کر پھڑپھڑاتے پروں سے زور اور پھیلا جاتا لیکن اس کا پیٹ اتنا بھرا ہوا تھا کہ اڑ نہ سکتا تھا۔ اکثر حالتوں میں مرے ہوئے زندہ معلوم ہوتے تھے۔ کسی کے ہاتھ اوپر اٹھے ہوئے تھے جیسے کسی کو اشارہ کر رہا ہو۔ دراصل یہ پورا منظر اس وجہ بھیانک تھا کہ بیان میں نہیں آ سکتا۔ معلوم ہوتا تھا کہ ہماری طرح گھوڑوں پر بھی خوف طاری تھا اس لیے وہ بھی بدک رہے تھے اور تھتھنے پھیلا رہے تھے۔ پوری فضا ناقابل بیان حد تک بھیانک تھی جو بڑی معرکہ باری اور ہنگامہ خیز تھی"۔ [2]

انگریزوں کے مظالم ناگفتہ بہ تھے۔ آج بھی ان کو پڑھ اور سن کر کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ جنگ آزادی کا پرجوش انتظام کرنے کے لیے ان کے کرتوتوں کی ایک طول داستان ہے۔ چوں کہ انگریزوں کو معلوم تھا کہ اس انقلاب میں

اہل اسلام فیض فیض ہیں۔ اس لیے مسلمانوں پر ان کا غصہ اور تیز تھا اور اس وجہ وہ جلال میں تھے کہ کثیر تعداد میں لاشوں کو دیکھ کر بھی ان کے دل میں رحم کا جذبہ پیدا نہ ہو سکا بلکہ وہ برابر نئے نئے طریقوں سے قتل و غارت گری سے نہ چوکے۔

● انگریز فوجی افسر ہنری کوان لکھتا ہے: "دہلی دروازہ سے پیشاور تک گرینڈ ٹرنک روڈ کے دونوں ہی جانب شاید ہی کوئی خوش قسمت درخت ہوگا جس پر انقلاب 1857ء کے ردعمل اور اسے کچلنے کے لیے ہم نے ایک یا دو عالمین کو پھانسی پر نہ لٹکایا ہو۔ ایک اندازے کے مطابق تقریباً 22 ہزار علماء کرام کو پھانسی دی گئی"۔ ۳

● "دہلی میں خوں ریزی کے عادی انگریز سپاہیوں نے جوش انتقام کو تسکین دینے کے لیے جلادوں کو رشوت دے کر اس بات پر آمادہ کیا تھا کہ وہ پھانسی کے تختے پر مجرم کو زیادہ اونچا نہ لٹکائیں تاکہ لاش تڑپنے کی دردناک کیفیت دیکھ کر "لطف وہ" کیفیت" کہتے ہیں اپنی خوشخو اور طبائع کے لیے دلچسپی کا سامان نہ کریں۔ جمعہ کے نواب صاحب کو جان سے میں بہت عرصہ لگا"۔

● "پھانسیاں دینے کے لیے رضاکارانہ خدمات پیش کی گئی تھیں جنہوں نے اس مقصد کی تکمیل کے لیے دیہات کا دورہ کیا۔ اس حالت میں کہ ان کے پاس پھانسی دینے کا سامان بھی مکمل نہ تھا اور نہ پھانسی دینے کے طریقے سے پوری طرح واقفیت تھی۔ چنانچہ ان میں ایک "شریف" آدمی اپنی کامیابی کا فخریہ اظہار کرتا تھا کہ "ہم پھانسی دیتے وقت عام طور پر آم کے درخت اور باغیچی کو استعمال کرتے تھے۔ یعنی طریقہ باغیچی پر رکھا کر درخت کے نیچے لے جاتے اور سر اس کے گلے میں ڈال کر باغیچی کو ہٹا لیا جاتا تھا۔ یہاں تک کہ عموماً اس طریقہ تڑپنے اور جانکنی کے عالم میں اکثر اوقات انگریزی زبان کے حرف S یا ہندسہ 8 کی دلچسپ شکل بن کر رہ جاتا"۔ ۴

● دہلی میں انگریزوں کے مظالم کا عینی مشاہدہ کرتے ہوئے ایک اور انگریز لکھتا ہے: "میں نے دہلی کی گلیوں میں چلنا پھرنا ترک کر دیا ہے کیوں کہ کل جب ایک افسر اور میں خود 20 جولاہوں کو پھانسی کے لیے باہر لے گئے تو ہم نے 14 مرد و عورتوں کو دیکھا۔ ان کے شوہروں نے ان کے گلے کاٹ دیے تھے اور انہیں شاہوں میں لپیٹ کر لٹکا دیا تھا۔ ہم نے وہاں ایک آدمی کو پکڑا جس نے ہمیں بتایا کہ ان عورتوں کو اس ڈر سے قتل کیا گیا ہے کہ کہیں یہ انگریزوں کے ہاتھ میں گرفتار نہ ہو جائیں۔ پھر اس نے ان کے خاوندوں کی لاشیں ہمیں دکھائیں"۔ ۵

● انگریز جنرل لکھتا ہے: "ہم نے ایک بڑے گاؤں میں آگ لگا دی جب گاؤں کے باشندے آگ سے بچنے کے لیے بھاگے تو ہم نے انہیں گولیوں سے اڑا دیا"۔

● سرجان نے اعتراف حقیقت کرتے ہوئے لکھا ہے کہ: "انگریزوں نے انتقام کے جوش میں اندھے ہو کر نہ عورتوں کو بخشا نہ بچوں کو بلکہ بے گناہوں کا اس طرح قتل عام کیا گیا جس طرح وہ اس بغاوت کے ذمہ دار تھے۔ کالے ہندوستانیوں کو گولی سے اڑانے میں انتقام پسند انگریزوں کو ایک لطف سا آتا تھا"۔ [۶]

1857ء میں انگریزوں کے جوش انتقام کے نتیجے میں علماء سے لے کر عوام تک سینکڑوں ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں انسانوں کے خون بہائے گئے جن کو الگ الگ تحقیقات سے تاریخ آزادی میں بیان کیا گیا ہے۔ ان گورے جسم والوں کے بہیمانہ اور سفاکانہ انداز کو دیکھ کر اور پڑھ کر آج بھی آنکھیں اشک بار ہو جاتی ہیں۔ عوام الناس تو تھے ہی، علمائے کرام کے ساتھ ان کے قاتل مذمت وحقارت سلوک کے بارے میں پڑھنے کے بعد جسم کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

جہاد حریت میں جو علماء شریک ہوئے یا جن پر کسی طرح سے شرکت کا شبہ ہوا انھیں تختۂ دار پر لٹکا دیا گیا۔ ان کی جائیداد اونے پونے نیلام کی گئی۔ املاک تباہ کیے گئے۔ مکانات زمین بوس کروا کر ہل چلوائے گئے۔ جلاوطنی اور کالا پانی کی قید با مشقت برداشت کرنی پڑی۔ جیل خانہ کی آہنی سلاخوں میں جکڑے گئے، عدالتوں میں بے آب ودانہ تڑپا تڑپا کر مارے گئے، دہکتے ہوئے انگاروں پر لٹائے گئے، گرم گرم تیل کے کڑاہوں میں ڈالے گئے، گھوڑوں کے ٹاپوں سے روندائے گئے غرض کہ مصائب وآلام کے تمام حربے ان پر آزمائے گئے۔ مگر واہ رے ہمت مومنانہ! ان میں سے ایک بھی ایک قدم پیچھے نہیں ہٹا۔

● ان روح فرسا مناظر کا چشم دید گواہ انگریز مؤرخ ایڈورڈ ٹامسن اپنا مشاہدہ بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے:

"1864ء سے 1857ء تک انگریزوں نے علماء کو ختم کرنے کا فیصلہ کیا اور یہ تین سال ہندوستان کی تاریخ کے بڑے الم ناک سال ہیں۔ ان تین سالوں میں انگریزوں نے 14 ہزار علماء کو تختۂ دار پر لٹکا دیا۔ دہلی کے چاندنی چوک سے خیبر تک کوئی ایسا درخت نہ تھا جس پر علماء کی لاشیں نہ لٹکی ہوں۔ علماء کے جسم کو تانبے سے داغا گیا، سؤر کی کھال میں لپیٹ کر جلتے ہوئے تندور میں ڈالا گیا، ہاتھیوں پر کھڑا کر کے درختوں سے باندھ کر ہاتھیوں کو نیچے سے چلا دیا گیا"۔ [۷]

ایک اندازے کے مطابق اس جنگ میں 5 لاکھ مسلمانوں کو پھانسیاں دی گئیں۔ جو بھی معزز مسلمان انگریزوں کے ہاتھ لگ گیا اس کو ہاتھی پر بٹھایا گیا اور وہی سلوک اس کے ساتھ کیا گیا جو مندرجہ بالا سطور میں آپ ملاحظہ کر چکے۔ ظلم وبربریت کا یہ ننگا ناچ چشم اشک بار نے ماضی میں کبھی نہ دیکھا ہوگا۔

● امریش مشرا اپنی کتاب War of Civilization: India,South Asia, Europe and the World 1857-1867 میں لکھتا ہے: "1857ء میں جب انگریزوں کو پتہ چلا کہ ان کی شکست یقینی ہے تو انہوں نے اپنے قتل عام کے پلان کو انجام دیا۔ ان کی فتح کا واحد راستہ پورے شہروں اور گاؤں کو نیست و نابود کرنا تھا۔ بڑے پیمانے پر ہندوستانی مرد و خواتین اور بچوں کا قتل کرنا تھا"۔ ۸

مجاہدین آزادی نے ظلم و استبداد برداشت کرنے کے جو نمونے پیش کیے وہ ان ہی کا حصہ تھا۔ انگریزوں کے جور و استبداد کی یہ بجلی کسی جھلک تھی ورنہ انہوں نے اس سے بھی دردناک مظاہرے کیے تھے۔ وطن عزیز کی آزادی کے لیے علمائے اہل سنت کی قربانیاں فراموش نہیں کی جاسکتیں۔ آج اس انقلاب کو 152 سال ہو چکے ہیں اس لیے ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم تحریک آزادی کے شہداء کو یاد کریں اور ان کے زریں کارناموں اور جاں نثاریوں سے عوام الناس بطور خاص نوجوان نسل کو واقف کرائیں۔ آج ہماری وفاداری وطن کو شک و شبہ کی نگاہ سے دیکھا جا رہا ہے۔ ایسے حالات میں اور زیادہ ضرورت ہے کہ ہم آزادی کی تحریک کے تئیں مسلمانوں کے جذبات کو تاریخ کے حوالے سے متعارف کرائیں اور ثابت کردیں کہ

عزت سے ہم بھی جینے کے حق دار ہیں یہاں
شامل ہمارا خون بھی قربانیوں میں ہے

﴿حوالہ جات﴾

۱ جنگ آزادی اور وطن کے جاں باز: 53

۲ ایضاً ص: 54

۳ ایسٹ انڈیا کمپنی اور باغی علماء ص: 23

۴ جنگ آزادی نمبر، اشریہ سہارا، دہلی ص: 9

۵ ماہنامہ اشرفیہ انڈیا سہارا پوز جنوری 2007ء

۶ جنگ آزادی اور وطن کے جاں باز ص: 56

۷ ایضاً

۸ روزنامہ اردو ٹائمز ممبئی یکم جون 2007ء

WWW.NAFSEISLAM.COM

دہلی چھوڑ کر غریب الوطنی کی زندگی بسر کرنے والے

جنگ آزادی 1857ء میں بے شمار لوگ گھر سے بے گھر ہوئے۔ دہلی سے جن افراد نے غریب الوطنی اختیار کی ان میں سے چند درج ذیل ہیں۔

1. میاں غلام نظام الدین
2. نواب غلام محی الدین خاں، پنشن دار
3. حکیم محمود خاں والد حکیم اجمل خان
4. حکیم مرتضیٰ خاں
5. نواب یعقوب علی خاں
6. مرزا فاضل بیگ
7. عبدالحلیم خاں، نائب کوتوال (مع ضبطی جائیداد)
8. منشی آغا جان، محرر اسبقبٹی
9. صفدر سلطان بخشی
10. نواب سید حامد علی خاں، رئیس بدست
11. مرزا معین الدین خاں، تھانیدار پہاڑ گنج
12. محمد حسین خاں، تھانیدار بدر پور
13. راجہ رام جی داس، گڑھ والے
14. ضیاء الدولہ، خلف حکیم رکن الدولہ
15. موسیٰ خاں، بن حافظ عبدالرحمن خاں
16. عبدالصمد خاں، خسر نواب جھجھر
17. حکیم امام الدین خاں، بن حکیم غلام رضا خاں
18. نواب حسن علی خاں برادر نواب جھجھر
19. سعادت علی خاں، خلف حسن علی خاں
20. میر نواب، نائب کپتان
21. نواب عبدالرحمن خاں
22. نواب علی محمد خاں، عم والی جھجھر
23. راجہ اجیت سنگھ، عم راجہ نرہند رسنگھ (رئیس پٹیالہ)
24. غلام فخر الدین خاں، تحصیل دار کوٹ قاسم

جنگ آزادی 1857ء کے بعد پھانسی پانے والے یا گولیوں سے اڑائے جانے والے

جنگ آزادی 1857ء میں ان گنت افراد تختہ دار اور گولیوں کی بھینٹ چڑھے ان میں سے چند ذیل ہیں۔

1. نواب عبدالرحمن خاں والی مجھرہ (مع ضبطی جائیداد)
2. راجہ ناہر سنگھ رئیس بلب گڑھ
3. نواب مظفر الدولہ
4. نواب میر خاں پنشن دار و جاگیردار پلول
5. نواب اکبر خاں بن فیض اللہ خاں بنگش
6. احمد مرزا
7. میر محمد حسین
8. حکیم عبدالحق بن حکیم بخش
9. قاضی فیض اللہ کشمیری سرشتہ دار (صدر الصدور)
10. میر پنجہ کش مشہور خوشنویس
11. مولانا امام بخش صہبائی معروف شاعر
12. نواب احمد قلی خاں (جیل میں موت واقع ہوگئی)
13. نواب محمد حسین خاں
14. نظام الدین خاں بن حکیم شرف الدین خاں
15. خلیفہ اسماعیل خلف استاد ذوق
16. محمد علی خان خلف نواب شیر جنگ خاں
17. عبدالصمد خاں بن محمد علی خاں (رسالدار شاہی فوج)
18. دلدار علی خاں کپتان
19. میاں حسن عسکری صوفی
20. غلام محمد خاں (عم نواب احمد علی خاں رئیس فرخ نگر)

WWW.NAFSEISLAM.COM

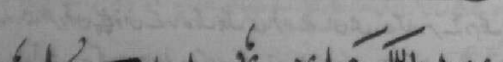

رنگون میں آخری مغل شہنشاہ

ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری

پیش نظر مقالہ کی اصل زبان ہندی ہے جسے ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری نے تحریر کیا ہے۔ اس مقالہ کا اردو ترجمہ ڈاکٹر خالد ندیم صاحب نے کیا ہے۔ ملاحظہ فرمائیں۔

1857ء کا ذکر ہے، صبح سویرے لال قلعے کے سامنے کچھ پالکیاں اور ڈولیاں آکر کھڑی ہوئی ہیں، اندر گریہ و زاری کی صدائیں بلند ہو رہی ہیں اور باہر اس کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔ آخری مغل شہنشاہ کے دیدار کے لیے میدان میں لوگوں کا ہجوم ہے۔ کچھ دیر بعد ایک بوڑھا انگریز، سپاہیوں کے پہرے میں آتا ہے اور ایک پالکی میں بیٹھ جاتا ہے۔ اپنی بے نور اور پرنم نگاہیں قلعے کی سنگین دیواروں پر ڈالتا ہے۔ وہ قلعہ، جہاں مغلوں کی عظمت دفن ہے، جہاں ہندوستان کا وقار ہچکیاں لیتا ہے، پھر شاہی خاندان کے کچھ افراد اور کچھ بیگمات سروں پہ خاک ڈالے باہر نکلتی ہیں۔ پالکیاں روانہ ہو جاتی ہیں، ان کی روانگی کے ساتھ ہی مغلوں کا شاندار تاجدار ہمیشہ کے لیے گم ہو جاتا ہے۔

کہتے ہیں کہ شکست کی کہانی ریت کے ٹیلے پر لکھی ہوتی ہے جسے زمانے کا ایک جھونکا مٹا دیتا ہے۔ وہی حال بہادر شاہ ظفر کا ہوا۔ تاریخ گواہی دیتا ہے کہ مغلوں کا آخری نام لیوا رنگون گیا، وہاں فوت ہوا اور وہیں دفن، لیکن اس کی زندگی کے آخری لمحات کیسے گزرے؟ یہ ہمیں معلوم نہیں، تاہم مغل تاریخ کا یہ گم شدہ باب صرف آنسوؤں کی بوندیں ہی لکھ سکتی ہیں۔

رنگون میں آمد:

بہادر شاہ ظفر رنگون پہنچے تو ان کے ساتھ لگ بھگ تیس افراد تھے۔ ان میں سے گیارہ مرتے دم تک ان کے ساتھ رہے، باقی میں سے کچھ ہندوستان لوٹ گئے اور کچھ نے برما میں ہی سکونت اختیار کر لی۔ ساتھیوں میں عزیز ترین فرزند جواں بخت اور ان کی اہلیہ شاہ زمانی بیگم، دکھ سکھ کی ساتھی زینت محل بیگم اور لاڈلا بیٹا عباس شاہ شامل تھے۔ اور بھی کئی رشتہ دار تھے، برما کے شہروں میں جن کے خاندانوں کا اتا پتا چل جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ تاج محل بیگم

اور شہزادی رابعہ بیگم بھی ساتھ ہی رنگون آئی تھیں' تاہم سرتاج کے اٹھ جانے کے بعد ہندوستان لوٹ آئیں۔

ظفر کے جو ساتھی برما ہی میں سکونت پذیر ہو گئے تھے ان میں سے اکثر نے "مولمین" میں گھر بسا لیا اور بری عورتوں سے شادی کر لی۔ شہزادہ عباس شاہ نے بھی "مولمین" میں ایک بری خاتون سے شادی کر لی تھی اور ان کے فرزند شہزادہ رحمت سلطان اب تک وہیں مقیم ہیں۔ ظفر کے عزیز شہزادہ نظام شاہ نے بھی "مولمین" کو مستقر بنایا جہاں ان کے بیٹے انتظام شاہ زندگی کے دن کاٹ رہے ہیں۔ باقی افراد کا علم نہیں ہو سکا۔ وہ بری معاشرے میں تحلیل ہو گئے اور زیادہ عرصے تک اپنی گذشتہ آن بان کو قائم نہ رکھ سکے۔ اس طرح قید تنہائی میں ظفر کے ساتھ لے دے کے ان کی اہلیہ زینت محل' بیٹا جواں بخت اور بہو زمانی بیگم رہ گئیں۔ تیرہ سو سی میں تو سایہ بھی انسان کا ساتھ چھوڑ دیتا ہے' پھر غیروں سے کیا امید۔

مغل شہنشاہ کی رہائش گاہ:

بہادر شاہ ظفر کو جہاز سے اتار کر گوروں کی سخت نگرانی میں رنگون کے صدر بازار کے ایک دو منزلہ بنگلے میں لایا گیا۔ یہ بنگلہ پرانے گھڑ دوڑ کے میدان کے نزدیک موجودہ "وائل روڈ" کے کنارے واقع تھا۔ اب تو اس کا کہیں نشان بھی نہیں ہے' وہاں اب کچہری اور پولیس کی چوکی ہے۔ یہ کل احاطہ مسٹر ڈاسن نامی انگریز کی ملکیت ہے۔ اسی احاطے میں آخری مغل شہنشاہ اپنی اہلیہ کے ساتھ ابدی نیند سویا ہوا ہے۔ ظفر کی زندگی میں اس بنگلے کے اردگرد پہرے دار چیلوں کی طرح منڈلاتے رہتے تھے۔

کسی بادشاہ کی آتما کا خون کرنا ہو تو اس کی شاہی توقیر کا خاتمہ کر دو' پھر دیکھو وہ کس طرح تڑپتا ہے۔ اس کی ہر سانس ایک آہ ہے' اس کا ہر بول ایک کراہ ہے' اس کی مسکراہٹ موت کی ہنسی ہے۔ انیسویں صدی کے اسی (80) سالہ برائے نام مغل بادشاہ کی حالت زار کی عکاسی اپنے بس کی بات نہیں' جس نے 350 سالہ اقبال اور وقار کو وقت کی ایک ٹھوکر سے خاک میں ملتے ہوئے دیکھا ہو' جس کے کانوں نے اپنی بیٹیوں کی چیخ و پکار اور ننھے بچوں کی فریاد سنی ہو اور پھر ہمیشہ کے لیے دنیا سے الگ کر دیا گیا ہو' اس کے دکھوں کا اندازہ لگانا بہت کٹھن ہے۔

ظفر اپنے تنگ و تاریک کمرے سے کبھی باہر نہ نکلتے تھے۔ چارپائی پر پڑے حقہ گڑگڑاتے' اپنے پُر درد اشعار گنگناتے اور نماز پڑھتے ہوئے شب و روز گزار رہے تھے۔ کبھی کبھی جواں بخت کو اس فانی دنیا کے دکھ اور ماضی کی کہانی سنانے لگتے تھے۔ بیتے دنوں کی یاد جلے پر نمک کا کام کرتی تھی۔

زندہ ہو جاتے ہیں جو مرتے ہیں حق کے نام پر | اللہ اللہ موت کو کس نے مسیحا کر دیا

قید تنہائی کے چند اشعار:

ذیل میں ہم فقیر کے کچھ ایسے اشعار درج کر رہے ہیں جو انہوں نے قید تنہائی میں لکھے تھے۔ بجا ہے شاعری روح کا آئینہ ہے۔

کون گھر سے آئے ہم اور کون گھر میں بار ہے ہیں
جائیں گے ہم کون گھر کو' ہوتے من میں ہراسے ہیں

کیسا ملک ہے' کیسا دیوا' کیسی چال اور کیسی ڈھال؟
باغی من کو لقمہ پیٹے اور باغی جی کو ساسے ہیں

دیس نیا ہے' بھیس نیا ہے' رنگ نیا ہے' ڈھنگ نیا
کون آشنا کرے ہیں واں' اور رچے کون اداسے ہیں

کیا کیا پھول دیکھے پہلے ہم نے اس پھلواری میں
اب جو پھلے ہیں اس میں پھل' کچھ اور ہی ان میں باسے ہیں

باد بندی سب اور ہے یاں کی' واں کی ہے کچھ اور ہوا
کوئی جتائے یہ ان کو جو اڑتے لوگ ہوا سے ہیں

دنیا ہے اک رین بسیرا' بیت گئی' رہی تھوڑی سی
ان سے کہہ دو' سو نہ جائیں' نیند میں جو کہ خفا سے ہیں

دہلی سے روانگی کے وقت غزل:

کہتے ہیں کہ دہلی سے لکھنؤ جاتے وقت مولانا خیرآبادی نے یہ غزل کہی تھی

جلایا یار نے ایسا کہ ہم وطن سے چلے
بہ طور شمع کے روتے اس انجمن سے چلے

نہ باغباں نے اجازت دی سیر کرنے کی
خوشی سے آئے تھے' روتے ہوئے چمن سے چلے

جو پائے بہر صداقت ہے قول سے اپنے
کبھی نہ ٹھوکریں کھائے' اگر چلن سے چلے

مرے پہ دامن صحرا نے پردہ پوشی کی
رہ عدم آئے تھے، لپٹے ہوئے کفن سے چلے

ایک ایک لفظ سے اداسی ٹپکتی ہے اور کیوں نہ ہو یہ شکستہ دل کی کہانی ہے۔ افسوس ہے کہ ادب کے یہ انمول رتن ہم تک نہ پہنچ سکے۔ ظفر نے دیواروں پر ناخن سے اپنے شعر لکھ دیے تھے۔ ان کی موت کے بعد اس بات کا علم ہوتے ہی کسی نے ان اشعار کو نوٹ کر کے کوئی تیس پینتیس برس قبل شائع کر دیا تھا۔ معلوم نہیں یہ افواہ کہاں تک درست ہے لیکن بہت دن پہلے یہ کتاب میں نے بھی دیکھی تھی۔ دکھ اس بات کا ہے کہ اب یہ اصوظ نے سے بھی کہیں نہیں ملتی۔ یہ ہمارے ادب کی بدقسمتی ہے کہ اچھے ایسے پاک ٹھوس نشان کی نذر ہو گئے۔ ظفر کی عمر قید پر الگ لکھنے کا موقع ملا تو میں اس موضوع پر بھی روشنی ڈالوں گا۔

ظفر کی موت:

ظفر کو کتنی پنشن ملتی تھی؟ اس کے متعلق کئی باتیں کی جاتی ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ سخت مشکلات کے باوجود شاہی قیدی نے اپنی خودداری سے کنارہ کشی اختیار نہ کی اور برطانوی سرکار سے کوئی کوڑی لینے سے بھی انکار کر دیا۔ آخری دم تک ظفر نے اپنی آن پر حرف نہ آنے دیا حالانکہ کئی کئی فاقے گزرے، لباس تار تار ہو گیا، بستر کی جگہ چیتھڑوں نے لے لی، مگر یہ خوددار شہ سے مس نہ ہوا۔ حکومت نے پنشن دینے کی بیحد کوشش کی لیکن ظفر کی "ناں" کسی بھی صورت "ہاں" میں تبدیل نہ ہوئی اور زینت محل کے بنے کچھے زیورات کو فروخت کر کے گزارا کرتے رہے۔

بہت دنوں سے انہیں دردِ گردہ کی شکایت تھی۔ درد بڑھ کر ناسور کی صورت اختیار کر گیا۔ مرض لاعلاج ہو گیا۔ آخر 7 نومبر 1862ء کو روح کا یہ پنچھی جسمانی پنجرا توڑ کر آزاد ہو گیا۔ میت کے پاس زینت محل، جواں بخت، شاہ زمانی بیگم اور اس کی وہ ماما بیگ (جو بچپن زمانی بیگم) کے علاوہ اور کوئی نہ تھا۔ ایک آہ کہ کی موت تھی، مسیحاؤں اور دیوتاؤں کی فکر کے دیدہ حکیم، ملک الموت سے الجھ رہے تھے، زوپ کنواریاں تھوے سہلا رہی تھیں، ایسی موت ہو تو کون نہ مر جائے اور اس کے ایک نام لیوا کو دیکھو اکہ کوئی نبض پر ہاتھ رکھنے والا بھی نہیں ہے اور.....

آج وہ پھول کھلتا ہے تربت میری..... کہتے کہتے دم توڑ دیتا ہے۔

ظفر کی قبر:

اب وہ خاک آلود قید خانہ 6 تھیبز روڈ کہلاتا ہے۔ اس کے احاطے میں آخری مغل شہنشاہ کو چپکے سے دفن کر دیا گیا۔ زینت محل ہر روز اپنے بدنصیب شوہر کی قبر پر فاتحہ پڑھتی اور گھنٹوں بیٹھی آنسو بہایا کرتی تھی، مگر مقدر کو یہ بھی

پسند نہ آیا۔ شاہی خاندان کو اس گھر سے بے دخل کر کے ایک دوسرے مکان میں ٹھہرایا گیا جواب تک بٹلر انسٹی ٹیوٹ آف پبلک ہیلتھ سے آگے موجود ہے۔ کچھ دنوں بعد ایک انگریز مسٹر ڈاسن نے اس قدیم احاطے کو خرید لیا۔ نجی ملکیت ہو جانے کے باعث اب ظفر کی تربت پر پھول چڑھانے اور دیا جلانے کی ممانعت کر دی گئی اور قبر کا راستہ بھی بند کر دیا گیا۔ بیر کا جو سوکھا ڈنڈ مغل شہنشاہ کی قبر کا پتا بتاتا تھا وہ بھی کاٹ دیا گیا۔ اس وقت رنگون ایک چھوٹی سی بستی تھی اور ہندوستانیوں کی آمد و رفت بھی کم تھی۔ اس لیے آہستہ آہستہ لوگوں نے اس قبر کی یاد بھلا دی اور ظفر کی یہ پیشین گوئی درست ثابت ہوئی۔

؎ پس مرگ میرے مزار پر جو دیا کسی نے جلا دیا
اسے آہ! دامن باد نے سر شام ہی سے بجھا دیا

آج سے بیس پچیس برس پہلے جب مسلمانوں نے توجہ دی تو حکومت نے ایک سنگِ مرمر کے ٹکڑے پر قبر کے پاس یہ الفاظ کندہ کروا دیے۔ ''دہلی کے سابق شہنشاہ، بہادر شاہ ظفر 7 نومبر 1862ء کو فوت ہوئے اور اس جگہ کے قریب دفن ہیں''۔

''اس جگہ کے قریب''..... ان الفاظ سے عیاں ہوتا ہے کہ یہ کتبہ اصلی جگہ پر نصب نہیں کیا گیا' کیوں کہ ڈاسن نے قبر کا راستہ ہی بند کر دیا تھا۔ اب سال ہا سال کی مقدمے بازی کے بعد راستہ کھل گیا ہے' قبر پختہ بن گئی ہے اور ہر جمعرات کو لوگ ان کی تربت پر پھول چڑھانے حاضر ہوتے ہیں۔ انسان کی عقیدت کو کوئی طاقت نہیں روک سکتی۔ شاعر نے بھی کہا ہے.....

؎ شہیدوں کی چتاؤں پر جڑیں گے ہر برس میلے
یہی ہوتا آیا ہے اور یہی ہو گا

﴿شکریہ: سہ ماہی صحیفہ لاہور، مجلس ترقی ادب لاہور، جنوری تا جون 2007ء، ص: 291 تا 294﴾

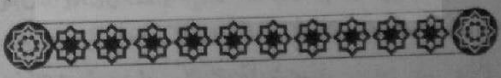

جنگ آزادی 1857ء

اپنوں اور غیروں کے مظالم

مولانا عبد الحکیم اختر شاہجہانپوری

حضرت مولانا عبدالحکیم اختر مجددی مظہری شاہجہانپوری 7 جنوری 1935ء کو شاہجہانپور، دہلی (بھارت) میں چوہدری عاشق علی خان کے گھر پیدا ہوئے۔ آپ سہارا راجپوت تھے۔ روحانی طور پر شیخ کامل حضرت مولانا محمد مظہر اللہ نقشبندی مجددی دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے دست حق پر سلسلہ نقشبندیہ مجددیہ میں بیعت ہوئے اور پروفیسر ڈاکٹر مسعود احمد علیہ الرحمۃ سے اجازت وخلافت عطا ہوئی۔ آپ اہلسنت وجماعت کے ممتاز مصنف، محقق، مترجم اور شارح تھے۔ قدرت حق نے احادیث نبویہ ﷺ کی خدمت کرنے کا عظیم موقع آپ کو نصیب فرمایا۔ صحیح بخاری شریف، سنن ابوداؤد شریف، مؤطا امام مالک، سنن ابن ماجہ اور مشکوۃ شریف آپ کے گرانقدر ترجمہ وحواشی کے ساتھ منظر عام پر آچکے ہیں۔ ان کے علاوہ "برطانوی مظالم کی کہانی" آپ کی معرکۃ الآرا تصنیف ہے جس میں 1857ء کے بعد کے حالات کی منظر کشی کے ساتھ ساتھ مذہبی بہروپیوں کا پوسٹ مارٹم کیا گیا ہے۔ اس کتاب میں ردِ قادیانیت پر حضرت علامہ نے گاہے بگاہے زبردست جرح وتنقید کی ہے اور مرزائیت قادیانیت کے خوب تار پود بکھیرے ہیں۔ آپ نے جامعہ غوثیہ مجیدیہ والٹن روڈ لاہور میں کئی سال عوام الناس کو علمی واصلاحی خطبات سے سرفراز فرمایا۔ آپ کا وصال 14 نومبر 1993ء کو ہوا اور نماز جنازہ حاجی محمد افضل چغتائی اشرفی نے پڑھائی۔

1857ء کے ٹکراؤ کے پس پردہ اسباب ومحرکات:

انگریز جس طرح ملک کے بلاشرکت غیرے حاکم بنے، دولت لوٹی یہاں تک کہ صنعتیں تباہ کیں، پاک وہند کے باشندوں کی پشت ہا پشت کے گاڑھے خون پسینے کی کمائی سے جس طرح اپنے قلاش ملک انگلستان کو خوشحال اور صنعتی بنادیا ان میں سے ہر زخم دوسرے سے گہرا تھا۔ اہل ملک کو تڑپانے کے لیے ان میں سے ایک قلم بھی کافی تھا لیکن پے در پے مظالم کے پہاڑ ڈھائے جارہے تھے اور خون کا گھونٹ پی کر وہ ظلم سہتے جارہے تھے مگر جب پاک وہند کے باشندوں کو عیسائی بنانے کے پروگرام پر عمل شروع ہوا تو مظلوم بلبلا نے لگے۔ حکومت کے خلاف نفرت کے جذبات اپنے نقطۂ عروج پر جا پہنچے۔ اس ستم بالائے ستم نے غیظ وغضب کی ایک لہر دوڑا دی۔ پورا ملک ایک آتش فشاں پہاڑ

بن گیا اور اس لاوے کو پھٹنے کے لیے صرف کسی خاص بہانے کی ضرورت تھی۔ چنانچہ چربی والے کارتوسوں نے جلتی پر تیل چھڑکنے کا کام کیا۔ فوجیوں کا یہ خیال تھا کہ مسلمانوں کو جو کارتوس دیے جاتے ہیں ان پر خنزیر کی چربی اور ہندوؤں کو دیے جانے والے کارتوس پر گائے کی چربی لگائی جاتی ہے۔ چونکہ یہ کارتوس زبان سے لگائے بغیر کھل نہیں سکتے تھے لہٰذا ہندو اور مسلمان فوجیوں کا یکساں خیال تھا کہ اس طریقے سے حکومت ان کے دھرم اور ایمان کو خراب کرنا چاہتی ہے اور ان کے جذبات کو ٹھیس پہنچا رہی ہے۔

میرٹھ چھاؤنی کے بعض سپاہیوں نے وہ کارتوس استعمال کرنے سے انکار کر دیا تو انہیں اطمینان دلانے کی بجائے اقتدار میں مست رہنے والے افسروں نے ان کے ساتھ انتہائی خراب سلوک کیا۔ اس امر کا تذکرہ جناب غلام رسول مہر نے متوخانہ انداز میں یوں کیا ہے: "9 مئی کی صبح طلوع ہوئی۔ پریڈ کی رسالے کی پریڈ کے میدان میں آنے کا حکم مل گیا۔ پریڈ شروع ہوئی تو پ خانے کو اس طرح کھڑا کیا گیا کہ اگر کوئی سپاہی مزاحمت کی غلطی بھی حرکت کرے تو توپوں کے دہانے کھول دیے جائیں اور سب کو موت کے گھاٹ اتار دیا جائے۔ پچاس گھڑسوں کو (جنہوں نے میرٹھ چھاؤنی میں 24 اپریل 1857ء کو چربی والے کارتوس استعمال کرنے سے انکار کر دیا تھا اور جنہیں اگلے روز سزائے موت کا حکم سنا چکے تھے) پریڈ کے میدان میں لایا گیا۔ پریڈ کے میدان میں پہلے ان کی وردیاں اتاری گئیں پھر لوہاروں کو حکم دیا گیا کہ ان گھڑسوں کو بیڑیاں پہنائی جائیں۔ چنانچہ اس پر عمل ہوا۔ کیٹی نے لکھا ہے: "یہ منظر بڑا دردناک تھا۔ ان بدنصیب آدمیوں کے پاس کھڑے ہو کر بہت سے لوگوں کے دل میں ہمدردی کے جذبات متحرک ہو گئے۔ ان میں اپنے آگے کھڑے ہوئے کو دیکھ کر ہر شخص سمجھتا تھا کہ کل یہ ہی ہم بھی ہو سکتا ہے۔ ان میں سے بعض سپاہی جنہوں نے صدہا خطرناک حالات اور جنگی مقامات میں حکومت برطانیہ کی خدمات انجام دی تھیں اور ان کی وفاداری میں کبھی تزلزل نہ آیا تھا۔ قیدی ہاتھ اٹھا اٹھا کر اور چلا چلا کر اپنے ساتھیوں سے التجا کر رہے تھے کہ ہم پر رحم کھائیں اور ایسی ذلت خیز سزا نہ دیں۔ جب انہیں ان کی وردی بھی اتار کر بیڑیاں پہنا دی گئیں تو انہوں نے اپنے ساتھیوں سے خطاب کر کے کہا: "ہمارا کہنے کر کیوں چپ چاپ کھڑے ایسی ذلت کا تماشہ دیکھ رہے ہو۔"

ظاہر ہے کہ گردنوں میں توقیریں لگی ہوئی تھیں اور ان کی ادائے کے لیے ایک بھی حرکت سب کی فوری موت کا باعث بن سکتی تھی۔ لہٰذا اگر چہ دلوں میں غیظ و غضب کا طوفان متلاطم تھا تاہم صبر و ضبط کے سوا چارہ نہ تھا۔ ذرا سوچیے کہ ان پر کیا گزری ہو گی۔ اس کا اعتراف کیا ہے کہ یہ فعل سراسر استقام تھا اور اس وجہ استقام جو تصور میں بھی نہیں آ سکتا"۔

مؤلف نے اس جرنیل کے اسی استقام فعل کے بارے میں فارسٹ جلد اول صفحہ ۳۳۰ کے حوالے سے اس

وقت کے انگریز گورنر جنرل کے تاثرات یوں قلمبند کیے ہیں: "آدمیوں کو پڑھ میں جڑیاں پہنانا جس میں کئی کھنچے صرف ہوئے اور ان لوگوں کی موجودگی میں سب کچھ کرنا جن میں سے بعضوں کی طبیعتیں برگشتہ تھیں اور وہ کارتوسوں کی داستان کو درست سمجھتے تھے۔ یقین ہے کہ اس سے پڑھ کے دل پر سخت ضرب لگی ہوگی۔ فوج کے مزاج اور ان لوگوں کے جرم کو قابل نظر رکھتے ہوئے انہیں ایسی رسم کی بجا آوری کے بعد محض دیسی گارد کی حفاظت میں جیل بھیجنا کافی تصور کیا گیا تھا"۔ ج

یہ ہیں گورنر جنرل کے تاثرات۔ جب حکومت ایسی معیار اور عالم ہو تو لاوا کیوں نہ پکتا۔ میرٹھ چھاؤنی میں ذکر کردہ برطانوی جرنیل کے فرمودہ تیسرے غیر محسوس طریقہ کار کے مظلوموں کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ ابتداء میرٹھ چھاؤنی سے ہوئی۔ 10 مئی 1857ء کو وہاں فوج نے بغاوت کر دی۔ انگریز جوں کی فوج سے تصادم ہوا۔ دہلی کی طرح یہ فوج دوسری چھاؤنیوں میں پہنچی اور وہاں بھی دیسی افسروں کی جگہ انگریز افسر تعینات کر دیئے گئے۔ فوجوں کی طرف سے کمزور کے بے گناہ عوام بھی اپنے غصے کی آگ کو ٹھنڈا کرنے کو ظالم حکمرانوں سے بدلہ لینے میں شریک کار ہو گئے نتیجہ یہ ہوا کہ پورا ملک میدان کارزار بن گیا۔ دیسی اور پردیسی محکوم اور حاکم مظلوم اور ظالم آپس میں اس طرح ٹکرا گئے کہ ایک طرح کی مکمل جنگ چھڑ گئی تھی۔

اس مسلح اور پرتصادم کا نتیجہ صاف نظر آ رہا تھا کہ پاک و ہند کی سرزمین پر حکومت کرنے کا انگریزی کاروبار چند دنوں میں ٹاٹ الٹنے کی طرح سمٹنے والا تھا۔ کچھ ہی مقامات پر دیسی فوجوں کا قبضہ ہو گیا اور انگریزوں کا کسی شہر پر قبضہ باقی رہا بھی تو دیر کی بات ہے یہ معلوم ہونے لگا تھا کہ شاید ایک بھی انگریز دیس برطانیہ جانے کے لیے زندہ سلامت نہ بچ سکے گا۔ لیکن بعض ملک دشمن اور ملت فروش عناصر نے تن من دھن کی بازی لگا کر اپنے آقاؤں کی گئی ہوئی آخری عملی حکومت کو بچا لیا۔ اس طرح چند غداروں نے اور ان کے معظم و صادق نے اپنے عمل سے ملت فروش ہونے پر مہر تصدیق ثبت کر دی۔

صوبہ یوپی سے انگریزی اقتدار کا جنازہ سب سے پہلے نکلا گیا اور جگہ جگہ قومی پرچم لہرا دیے گئے لیکن ان خوش نصیبوں کو کیا معلوم تھا کہ انگریزوں کے بعض یہی خواجہ سکوں پر بک جانے والے ملک دشمن اور ملت فروش عناصر اس خوشی کو پھر مایوسی میں تبدیل کر دیں گے اور 1857ء سے 1947ء تک 90 سال کے لیے انگریزوں کو پاک و ہند کی قسمت کے مالک بنائے رکھنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ انگریزوں کی حمایت میں خود اپنے بھائیوں کا خون اس جرم کی پاداش میں اپنے ہاتھوں بہائیں گے کہ وہ ایک غیر ملکی ظالم قوم کی غلامی سے آزاد ہونا چاہتے تھے۔

میاں محمد شفیع نے صوبہ یوپی کے حالات کا نقشہ اپنے الفاظ میں یوں کھینچا ہے: ''حقیقت یہ ہے کہ اس ساری تحریک کا مرکز یوپی تھا، جس کا کونا کونا سلگ اٹھا، جس کے ایک ایک دل سے انگریزوں کے خلاف لاوا پھوٹ پڑا۔ جس نے ملک اور دین کے لیے جان و مال' عزت و آبرو' صحت' شفقت' دنیا طلبی' حرص لالچ' مآل اندیشی' بہتری' بہبود غرض یہ کہ ہر چیز کی بازی لگادی۔ نہ ماضی کی شان کو دیکھا' نہ مستقبل کی تباہی کو سوچا' نہ جاگیروں پر نظر گئی' نہ دولت کا خیال آیا' شہر شہر' قصبہ قصبہ' گاؤں گاؤں آزادی خواہی میں بھڑک گیا۔ آبادیوں اور جنگلوں میں آگ لگ گئی''۔ ۳

جنرل بخت خاں' خان بہادر خاں اور دیگر مجاہدین جنگ آزادی نے جس دانش مندی اور جرأت سے بریلی شہر کو سب سے پہلے انگریزی تسلط سے آزاد کروایا وہ تاریخ میں اپنی مثال آپ ہے۔ بریلی کی اس شاندار اور جرأت مندانہ معرکہ آرائی کے بارے میں میاں محمد شفیع صاحب نے اپنے تاثرات کا ان لفظوں میں اظہار کیا ہے: ''آفرین ہے روہیلکھنڈ کے ان مجاہدین پر جنہوں نے بریلی کے میدان میں شجاعت اور قربانی کی مثال قائم کی تھی اور بتا دیا تھا کہ مسلمان بیچارگی میں شیر نیستاں اور یل دماں ہے۔ جب وہ اللہ کے نام پر تلوار اٹھاتا ہے تو وہ کائنات کو ٹھکرا کر موت سے ہم آغوش ہو جاتا ہے۔ باطل کا ہجوم اس کے ضمیر کو زیر نہیں کر سکتا۔ طاقت و جبروت کے سینے میں پنجے ڈال دیتا ہے''۔ ۴

خان بہادر خاں صاحب نے بریلی کو فتح مندی سے ہمکنار کرنے کے بعد دیگر اضلاع خصوصاً دہلی میں بادشاہ کے پاس عرضداشت بھیجی۔ پاک و ہند کے باشندوں کو آزادی کی دولت حاصل کرنے کے لیے گرمایا اور سرتوڑ کوشش کرنے کی ترغیب دلائی۔ میاں صاحب نے اس امر کا تذکرہ یوں کیا ہے: ''یہ ساری کوشش خان بہادر خاں اور اس کے کارکنوں کی تھی کہ اتنی آسانی سے بیک وقت روہیلکھنڈ کا صوبہ آزاد ہو گیا۔ پھر اس نے خود ایک عرضداشت بادشاہ کے پاس اپنے ہاتھ سے لکھ کر بھیجی اور روہیلکھنڈ کے تمام اضلاع میں بھی شائع کی۔ ہندوستان کے رہنے والو! بڑے انتظام کے بعد ہماری آزادی واپس آگئی ہے۔ اب بتاؤ تم اسے قبول کرتے ہو یا رد کرنا چاہتے ہو؟ تم اس مبارک موقع سے فائدہ اٹھانا چاہتے ہو یا اپنے ہاتھوں سے دے دینے پر تیار ہو اور فائدے کے خواہشمند نہیں؟''۔ ۵

بریلی اور اس کے گرد و نواح کو انگریزی تسلط سے پاک کرنے کے بعد وہاں کا انتظام خان بہادر خاں کے سپرد کیا گیا اور 1857ء کی جنگ آزادی کا ممتاز مجاہد و مدبر جنرل بخت خاں عازم دہلی ہوا۔ فوج' خزانہ اور سامان حرب و ضرب ساتھ تھا تا کہ بادشاہ دہلی کی مدد کر کے مغلیہ حکومت میں جان ڈالی جائے۔ بریلی سے لاؤ لشکر سمیت بخت خاں کا جانا خود ظاہر کرتا ہے کہ انگریز حکومت میں کسی جگہ روکنے یا ٹکرانے کی سکت نہیں تھی۔ انگریزی طاقت

چھوٹے چھوٹے اجزاء میں منتشر ہوئی پڑی تھی۔ لیکن اس مجاہد ملت کی امنگیں اور آرزوئیں کامیاب ہوتے ہوئے ناکام ہو کر رہ گئیں۔

غلام رسول مہر نے ان حقائق کو یوں بیان کیا ہے: "جنرل بخت خاں اواخر جون میں پہنچا۔ وہ اپنے ساتھ منظم فوج لایا تھا اور اسے چھ مہینے کی تنخواہ پہلے ادا کر دی تھی۔ ساز و سامان بھی لایا تھا اور روپیہ بھی خزانہ سرکاری میں جمع کیا تھا۔ اس میں جنگی اور انتظامی دونوں قسم کی صلاحیتیں موجود تھیں لیکن اس کے پہنچنے سے پیشتر شہزادے تمام امور اپنے قبضے میں لے چکے تھے۔ بادشاہ نے اگرچہ بخت خاں کو پورے اختیارات دے دیے تھے لیکن شہزادوں کو کب منظور تھا کہ اور کوئی شخص دہلی میں مختار بن جائے۔ وہ ہر کام میں روڑے اٹکاتے رہے یہاں تک کہ انتظام درست ہو ہی نہ سکا"۔ [1]

جنرل بخت خاں کی قابلیت کو میاں محمد شفیع صاحب نے یوں خراج عقیدت پیش کیا ہے: "بخت خاں میں دو باتیں جمع تھیں۔ اول تو وہ روہیلہ تھا جو شجاعت و جانبازی کا سبب ہے۔ پھر یہ کہ اس میں بادشاہی خون بھی تھا جس نے اسے تحمل شائستگی اور مزید شرافت کی خوبیوں سے آراستہ کر دیا تھا۔ باقی طبعی خوبیاں بھی اس اپنے روہیلے میں کسی سے کم نہ تھیں..... انگریز نے اس کی دانائی اور فوجی شعور دیکھ کر تمام دیسی توپ خانہ اس کے ماتحت کر دیا۔ جس بڑی کایہ سردار تھا وہ کارگزاری میں سب پر سبقت لے گئی تھی۔ غدر کے قریب یہ لائق صوبہ ار بدل کر اپنے باپ دادوں کے اصل وطن بریلی میں آچکا تھا اور اس کی شہرت دور دور تک پہنچ گئی تھی۔ بادشاہ بھی اس سے بے خبر نہ تھا۔ 31 جون کو جب بریلی میں انگریزوں کا صفایا ہو گیا تو بخت خاں جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے 7 ہزار باقاعدہ سوار اور پیدلوں کی رجمنٹیں اور کئی ہزار مجاہد لے کر مع سامان حرب 2 جولائی 1857ء کو دہلی پہنچا"۔ [2]

مولانا احمد اللہ شہید مدراسی رحمۃ اللہ علیہ ایک متبحر عالم دین اور صاحب اجازت تھے۔ 1857ء کی جنگ میں آپ نے عدیم النظیر جنگی کارنامے سرانجام دیے۔ جس فنی مہارت کے ساتھ مولانا نے انگریزوں کے مایہ ناز اور پختہ کار جرنیلوں کو پے در پے شکستیں دیں اور ان کے جنگی منصوبوں کو خاک میں ملایا وہ تاریخ عالم کے جنگ آزما جرنیلوں کی تاریخ کا ایک سنہرا اور تابناک ورق ہے۔

اس سلسلے میں میاں محمد شفیع یوں رقمطراز ہیں: "7 مئی 1857ء کو خان بہادر خاں اور باقی لیڈر بریلی سے نکل گئے۔ (کیوں کہ انگریزوں نے حریت پسندوں کو شکست دے کر دوبارہ بریلی پر قبضہ کر لیا تھا) مولوی احمد اللہ شہید پھر شاہجہان پور پہنچے۔ ان کی تیز نظر نے بھانپ لیا تھا کہ انگریز وہاں تھوڑی سی فوج چھوڑ کر بریلی آئے ہیں۔ انہوں

نے وہاں پہنچ کر اس تھوڑی سی فوج کو مار بھگایا اور بریلی کی شکست کی تلافی کر لی۔ جنرل ہیل کو سخت ہزیمت دی ..... اب لڑائی کا رنگ یہ ہو گیا کہ سر کومن اودھ کو فتح کرتا تھا تو مولوی صاحب روہیلکھنڈ پر قبضہ جما لیتے تھے۔ وہ روہیلکھنڈ (بریلی) کو لیتا تھا تو یہ اودھ کو فتح کر لیتے تھے۔ اس پر یٹانی میں انگریز نے طے کیا کہ اس آپسی ہاتھ کو شش کر دینا چاہیے۔ اس بے مثل مجاہد سے جب تک پیچھا نہ چھڑایا جائے گا اس وقت تک ساری کوشش بیکار ہے۔ اس کے سوا اور کوئی ایسا خطرہ نہیں پھر بھی لڑائی میں قابو پانا یا اس کو زیر کرنا مشکل تھا اس لیے سوچ لیا کہ یہ کام غدار اچھی طرح کر سکیں گے"۔ ۸

انگریزوں نے "پاون" نامی ہندو راجہ سے ساز باز کی جس نے 50 ہزار روپے انعام پانے کے بدلے 1857ء کی جنگ آزادی کے ہیرو اور حریت پسند کے عدیم النظیر جرنیل کو شہید کر کے پاک و ہند کی غلامی کے عصر پر دستخط کر دیے۔

میاں صاحب نے مولانا احمد اللہ شہید رحمۃ اللہ علیہ کو ان کے ہمعصر العقول کارناموں کے پیش نظر یوں خراج عقیدت پیش کیا ہے۔ "آخر کار قوم اور دین کا سب سے بڑا مجاہد ملک کی آزادی کا عظیم ترین حامی شجاعت کا شیر نیستاں اس آخری وقت کا سہارا، عقل و تدبر کا مسند، جنگی چالوں میں انگریز کے جگر کو پگھلانے والا عزم و استقلال کی چٹان اسلام اور مسلمانوں کا فخر، انقلابیوں کے ٹوٹے ہوئے دل کی جان، آزادی خواہوں کی امیدوں کا روشن آفتاب اس طرح اپنے ہی ایک غدار کے ہاتھ سے موت کی وادی میں غروب ہو گیا"۔ ۹

مولانا احمد اللہ شہید نے شاہجہان پور کے معرکے میں جس فراست، تجربہ کاری اور عزم و استقلال سے انگریزوں کے ایک مایہ ناز سپہ سالار "جنرل ہیل" کو شکست فاش دی اور اس کے سارے جنگی منصوبوں کو خاک میں ملایا تھا، مولانا کی اس مہارت اور تمائی کارکردگی پر ہیلیسن کے تبصرے کو میاں صاحب نے یوں نقل کیا ہے: "مولوی کا یہ حملہ بالکل اچھوتا تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی یورپ کا جنرل لڑ رہا ہے"۔ ۱۰

مولانا احمد اللہ شہید کی شہادت کا علم ہونے پر جوش مسرت میں "ہومز" نے اپنے خیالات کا یوں اظہار کیا: "شمالی ہندوستان میں ہمارا سب سے بڑا دشمن سب سے خطرناک انقلابی ختم ہو گیا ہے"۔ ۱۱

اودھ کے علاقے میں مدتوں لڑائی کا سلسلہ جاری رہا لیکن وہاں جس استقامت اور پامردی کے ساتھ حریت پسندوں نے آزادی کی دولت حاصل کرنے کے لیے تن من دھن کی بازی لگائی اور ہر قسم کی تکالیف برداشت کر کے جنگ جاری رکھی اس پر خود ہیلیسن نے یوں تبصرہ کیا تھا: "اودھ کے لوگ اپنے سپاہی بھائیوں کے شریک کار اور ملک

کی آزادی کے لیے جانیں دے دیں۔ ہم ذکر کر چکے ہیں کہ انہوں نے کس عزم وارادہ اور سرفروشی کے ساتھ ہم سے جنگ آزمائی کی۔ اصل یہ ہے کہ ہندوستان کے کسی حصے میں ایسی طویل اور استقامت آمیز جنگ نہیں ہوئی۔ ان تمام معرکوں میں اس ظلم کی داستان (واجد علی شاہ کی معزولی) آگ لگاتی رہی جو ہم نے 1856ء میں کیا تھا۔ یہی خیال' یہی روح تھی جس نے ان کے دلوں کو فولاد سے زیادہ مضبوط کر دیا تھا..... شکستوں پر بھی ان کا یہ حال تھا کہ بھوکے مر جانے کو ہماری اطاعت پر ترجیح دیتے تھے اور ان تمام طبقوں نے اس آخری وقت میں خاموشی اختیار کی جب دنیا میں ان کے کوئی چارہ نہ رہا"۔ ۱۲

اودھ کے معزول حکمران واجد علی شاہ کی بیگم' حضرت محل نے میدان جنگ تو کیا زندگی بھر محل سے باہر کی فضا بھی نہیں دیکھی تھی۔ جب اس خاتون نے شمع حریت کے پروانوں کو سینہ سپر دیکھا تو خاموش نہ بیٹھ سکی۔ بربھیں قدر کی سرپرست بن کر' رعایا میں نئی روح بن کر میدان کارزار میں انگریزی فوجوں سے مصروف پیکار ہو گئی۔

میاں صاحب نے یوں اس امر کی وضاحت کی ہے: "خیر اس بادشاہ کی کوتاہیوں کو اس کی ایک بیگم' حضرت محل نے اس طرح پورا کیا کہ انتقام کی آگ میں اگر دشمنوں کو نہ جلا سکی تو کیا ہوا خود اس میں جل کر قوم کو سرخرو کر گئی اور جو کچھ بادشاہ کو کرنا چاہیے تھا' اس کی لکھنؤ میں رہ جانے والی اس بیگم نے ہر طرح کی قربانی دے کر حق ادا کیا۔ حالانکہ لکشمی بائی (جھانسی کی رانی) کی طرح نہ آزاد فضا کی پلی ہوئی تھی' نہ اس نے حیرت انگیز کا استعمال سیکھا تھا۔ نہ مردوں کے دوش بدوش رہی تھی اور وہ تو شاہی محل کی پردہ نشین خاتون تھی..... اس لائق بیگم نے اپنے بیٹے بربھیں قدر کی سرپرستی لے کر محبوب علی کو نیابت دی اور سب سے پہلے بادشاہ دہلی کو آزادی اودھ کی مبارک باد دے کر علاقے کے زمینداروں' جاگیرداروں' نوابوں اور راجاؤں کو خطوط لکھے۔ سب نے اطاعت میں تلوار اٹھانی اور سینہ سپر ہو گئے"۔ ۱۳

تیموری خون کا امین' شہزادہ فیروز شاہ ان انتہائی نگڑے ہوئے اور ناسازگار حالات میں بابر اور اورنگ زیب کی یادگار ثابت ہوا۔ دہلی سے گوالیار تک کے آخری معرکوں میں حریت پسندوں کی مختلف جماعتوں میں شامل ہو کر مردانہ وار لڑتا اور شمع حریت کے پروانوں کو غاصب انگریزوں سے لڑاتا رہا۔ وہ اپنے طرز عمل سے ثابت کر گیا کہ بابر کی شجاعت اور اورنگ زیب کی ایمانی فراست کا کم از کم ایک امین' 1857ء کی جنگ آزادی کے وقت مغلیہ خاندان میں ضرور موجود تھا۔

اس عظیم شہزادے کو میاں صاحب نے یوں خراج عقیدت پیش کیا ہے: "جس وقت غدر ہوا' اس سے پہلے ہی فیروز شاہ حج کے لیے گیا ہوا تھا۔ جب واپس آیا تو ساحل پر قدم رکھتے ہی انقلاب کی خبر کانوں میں پڑی اور یہ

جوانمرد شہزادہ دہلی پہنچ کر بنگلہ وارو گیر میں کود پڑا۔ داد شجاعت دی اور جب دہلی پر انگریز قابض ہو گئے تو نہایت احتیاط کے ساتھ مشرقی دروازے سے نکل کر بریلی کی طرف آ گیا۔ بریلی کی جنگ کا خونریز معرکہ ختم ہوا تو راؤ صاحب کے پاس جا پہنچا اور جب تانتیا توپی ناگپور سے دوبارہ گوالیار آیا تو یہ اور نواب باندہ بھی اس سے جنگلوں میں آملے تھے۔ وہ (تانتیا توپی) بھی گرفتار ہو کر پھانسی چڑھ گیا تو فیروز شاہ کچھ دنوں ادھر اُدھر بھٹک بھٹک کر خوش قسمتی یا ہوشیاری سے بچ نکلا اور مکہ چلا گیا۔ کہتے ہیں کہ وہیں باقی زندگی فقیرانہ حالت میں گزار کر دنیا کو رخصت کیا۔ رحمت ہو اس باہمت شہزادے پر"۔ [14]

جھانسی کی رانی، لکشمی بائی نے 1857ء کی جنگ آزادی میں عورت ہونے کے باوجود جس طرح مردانہ وار حصہ لیا اور اپنی حریت پسندی کا ثبوت دیا اس کی ایک جھلک ملاحظہ فرمایئے: "وہ لکشمی بائی بھی حضرت محل کی طرح محل کی راحتوں کو چھوڑ کر باہر نکل آئی ورنہ انگریز کے قدموں پر سر جھکا دیتی تو اس کی زندگی کی راحتوں میں ذرا سا بھی شک نہ آتا۔ اس نے جھانسی سے غاصب انگریز کو نکال دیا۔ اس کے انقلابیوں نے ساگر، نوگاؤں، باندہ، بانا پور، شاہ گڑھ اور کرکی سے انگریزوں کا نام و نشان مٹا دیا۔ رانی نے اس کے بعد امن و امان اور انتظام کی وہ لیاقت دکھائی کہ لوگ حیران رہ گئے"۔ [15]

تانتیا توپی برہمن نے جس شجاعت اور جوانمردی سے اس جنگ آزادی میں حصہ لیا وہ بھی حریت پسندوں کی تاریخ میں ایک امتیازی مقام رکھتا ہے۔ نامساعد حالات میں بھی مختلف انقلابی لیڈروں کے ساتھ مل کر اور تنہا انگریزوں سے اس طرح مقابلہ کرتا رہا کہ تم پیشہ انگریزوں کو ناک چنے چبوا دیے۔ مولانا احمد اللہ شہید کے بعد تانتیا توپی کی رزم آرائیاں فنون حرب و ضرب کے لحاظ سے کسی بھی دوسری انقلابی لیڈر سے کم حیرت انگیز نہیں۔

اس محب وطن برہمن کے کارناموں کا رشتہ ملاحظہ ہو: "جنرل وٹھم جس نے یورپ میں اپنی لیاقت دکھائی تھی، اس وقت کان پور کی فوجوں کا کمانڈر تھا۔ تانتیا برہمن (جو کبھی نانا صاحب کا کلرک اور اب جنرل تھا) نے سوچ لیا کہ اب کان پور میں تھوڑی سی فوج ہے، جنرل وٹھم پر ضرب لگانی چاہیے اور اپنی بے قاعدہ فوج لے کر جنرل وٹھم کے مقابلے پر آ گیا..... باقاعدہ سخت گولہ باری شروع ہوئی۔ تانتیا نے اپنی فوج کو نیم دائرے کی شکل میں ترتیب دے کر بڑھنا شروع کیا۔ وٹھم نے حلقہ توڑنے کی کوشش کی لیکن تانتیا کی توپوں نے معذور کر دیا..... تانتیا کے دائرے نے گرفت کو زیادہ مضبوط کر لیا۔ شام کے چھ بجے تک انگریزی فوج نے پورے طور پر حوصلہ ہار دیا اور بہت سامان جنگ انقلابیوں کے ہاتھ آیا..... دن نکلتے ہی لڑائی شروع ہو گئی اور انقلابیوں نے دونوں پہلوؤں پر گولہ باری شروع کر دی۔

دایاں بازو بالکل اڑا دیا۔ بریگیڈیئر لوسن، کیپٹن ایم کری مارفی، میجر سٹرلنگ، میجر گھن سب مارے گئے۔ تیسرے دن انقلابیوں کو مکمل فتح حاصل ہوئی۔ انگریزی فوج بالکل تباہ ہوگئی۔ اس دن تانتیا کا پورے کانپور قبضہ پر ہو گیا"۔ 16

متعدد بار حوصلہ شکن حالات سے بھی دوچار ہونا پڑا کیونکہ غداروں کی سرگرمیوں کے باعث ملکی حالات میں نشیب و فراز آتے رہے لیکن واہ رے بہادر برہمن جو جذبۂ حب الوطنی سے سرشار اور آزادیٔ وطن کا والہانہ طلبگار تھا' بے سروسامانی کی حالت میں بھی اس کے عزائم متزلزل نہ ہوئے مثلاً "تانتیا" رانی جھانسی کے ساتھ مل کر انگریزوں سے لڑتا رہا اور جب یہ بہادر رانی جنگ آزادی میں ماری گئی تو اکیلا رہ گیا اور نانا صاحب سے بھی ساتھ چھوٹ گیا۔ نہ کوئی فوج تھی' نہ سامان تھا پھر بھی پوری ہمت سے راؤ صاحب اور پیشوا کو ساتھ لے کر سرمتصورا (متوسط ہندوستان) میں جا بیٹھا اور غداروں کو لوٹ کر کچھ سامان مہیا کر لیا"۔ 17

تانتیا' راؤ اور شہزادہ فیروز شاہ نے اپنی حریت پسندی اور جوانمردی کا زندہ ثبوت اپنے عمل سے گھر میں بیٹھ کر نہیں بلکہ موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مہیا کر دیا تھا۔ ان بہادروں کا انجام ملاحظہ ہو: "25 دسمبر 1857ء کی رات دونوں نے میجر لاک کی فوج پر سخت شب خون مارا اور بالکل تباہ کر کے جنگل سے نکل گئے۔ شہزادہ فیروز شاہ بھی اپنی فوجوں سے آملا اور یہ سب اندر گڑھ میں جمع ہو گئے۔ انگریزوں نے ہر طرف سے گھیرا ڈال لیا ..... جب یہ لوگ جنگل میں چھپے ہوئے تھے تو انگریز عیار نے مان سنگھ سے جو اس تمام دوز دھوپ میں اُس (تانتیا) کا ساتھی تھا سازش کر لی اور اس غدار نے جنگ آزادی کے اس ہیرو کو گرفتار کرا دیا۔ 7 اپریل کو تانتیا انگریزوں کے ہاتھ میں آ گیا۔ تین دن مقدمے کی کارروائی ہوئی پھر 28 اپریل 1858ء کو پھانسی دے دی گئی۔ آخر وقت جب یہ بہادر تختے کے پاس پہنچا اور پھانسی دینے والے ہاتھ پاؤں باندھنے کے لیے بڑھے تو اس نے مسکرا کر کہا: "اس تکلف کی کیا ضرورت ہے"؟ اُچھل کر خود پھندا گلے میں ڈال لیا اور لٹک گیا۔ راؤ صاحب 21 اگست کو جنگلوں سے گرفتار ہوا اور پھانسی دی گئی۔ شہزادہ فیروز شاہ بچ کر نکل گیا اور کعبے جا پہنچا"۔ 18

جب انگریزوں نے اپنے زر خرید غلاموں اور حلیفوں یعنی ملک دشمنوں اور ملت فروشوں کے سہارے انقلابیوں کا زور توڑ دیا اور تقریباً تمام بڑے بڑے شہروں پر دوبارہ قبضہ کر لیا تو انقلابیوں کے چھوٹے چھوٹے باغی مادہ جتھے ایک جگہ جمع ہونے میں کامیاب ہو گئے۔ انگریزوں نے انہیں پسپا کرتے ہوئے نیپال کی ترائی میں دھکیل دیا۔ ان بہادروں نے اس بیچارگی اور کسمپرسی کی حالت میں بھی اپنے خون سے مادر وطن کی سرزمین کو لالہ زار تو کر دیا لیکن برطانوی لٹیروں کے سامنے گردن نہ جھکائی۔

میاں صاحب اس امر کی یہ وضاحت فرماتے ہیں: ''نیپال کی ترائی ان بہادروں کے خون سے رنگین ہوگئی جنہوں نے اپنے ملک کی آزادی کے لیے ہر چیز کی بازی لگا کر ڈھائی سال تک انگریزوں کی طاقت کو ہلکان کیا تھا۔ بے سروسامانی اور بدنظمی میں انتہائی معذوری' مجبوری اور بے بسی میں بھی اپنے ملک کی عزت کو بلند رکھ کر جانیں قربان کیں۔ ہر طرف سے مایوسی کے بادل سر پر منڈلاتے دیکھے۔ اہل ملک کی غداری سے سارے سہارے ٹوٹ گئے۔ موت کے سوا کوئی آس نگاہوں کے سامنے نہ رہی' پھر بھی تلوار ہاتھ سے نہ رکھی اور غاصب وظالم انگریز کے سامنے سر نہ جھکایا۔ یہاں تک کہ ہمالیہ کے دامن میں آخری حملے کر کے خون میں نہائے اور زمین پر گر کر آنے والی نسلوں کو سعی آزادی کا پیغام دے گئے''۔ 19

غداران وطن اور ملت فروش عناصر

قارئین کرام! یہ تھا 1857ء کی تحریک آزادی کا ایک رُخ۔ اب اسی تصویر کا دوسرا رخ بھی ملاحظہ فرمائیں تاکہ یہ واضح ہو جائے کہ 1857ء میں لاکھوں حریت پسندوں کا خون کن مخون چہروں کی وجہ سے رائیگاں گیا۔ وہ کون سے وطن دشمن اور ملت فروش عناصر تھے جن کے باعث مٹھی بھر پردیسی پاک وہند کے کروڑوں باشندوں کو دوبارہ طاقت کے ذریعے غلام بنانے میں کامیاب ہو گئے۔

مرزا الٰہی بخش:

مرزا الٰہی بخش کا کارنامہ ملاحظہ ہو: ''یہ (مرزا الٰہی بخش) شاہی خاندان کا بوڑھا' سمجھ دار آدمی' بادشاہ کا رشتے میں چچا اور سمدھی تھا۔ بہادر شاہ اس سے تمام معاملات میں مشورہ لیتا تھا۔ اس ظالم کو ملک و مذہب سے تو کیا ہمدردی ہوتی' خاندان کی بہتری سے بھی بے بہرہ نکلا۔ انگریزوں کا پٹھو بن کر ٹھنڈا تا دیا بھی بجھا دیا۔ ذرا ذرا سی خبریں پہنچائیں' زینت محل کو بہتر بائع وفا کر ہم رائے کر لیا۔ حکیم احسن اللہ خاں پر بھی ڈورے ڈالے اور انقلابیوں کو بدنام کرتا رہا۔ ہر معاملے میں انہیں غلط راہ پر ڈالنے کی کوشش کی تاکہ اس کا انعام نہ مارا جائے۔

سب سے بڑا کارنامہ جو اس نے کیا وہ یہ تھا کہ بادشاہ کو بخت خاں کے ساتھ جانے سے روکا' پھر اپنی زندگی میں بادشاہ کو پکڑوایا اور شہزادوں کی گرفتاری کے وقت بھی پہنچ کر ان کو تسلیاں دیں اور وثوق کرا دیا۔ چالاک اتنا تھا کہ سب پر شبہے کیے گئے اور گرفتیں ہوئیں اور شور مچے لیکن یہ ہر طرح محفوظ رہا۔ نہایت چرب زبان اور سلجھا ہوا تھا۔ ایک اور ظلم اس نے یہ کیا تھا کہ جمنا کا پل تڑوا دیا جس کی وجہ سے انقلابیوں کی مشرقی رسد رسانی بند ہو گئی۔ انگریز نے بھی پیٹ بھر کے انعام دیے۔ دربار میں پہلی کرسی مقرر ہوئی۔ 22830 روپے سالانہ پنشن دی جو نسل در نسل تھی۔

بیوی کی الگ' لڑکوں اور لڑکیوں کی الگ' عزیزوں کی ان کے علاوہ۔ بعد میں مختلف تقریبوں پر اضافے ہوتے رہے۔ یہ تنگ خلف اپنے خاندان کی درگاہ حضرت سلطان جی میں رہا اور 1875ء میں مرا"۔ ۲۰

حکیم احسن اللہ خاں:

بہادر شاہ ظفر کے معتمد اور مشیر یعنی حکیم احسن اللہ خاں کی محسن کشی اور ملک دشمنی ملاحظہ ہو: "بہت سمجھدار' تعلیم یافتہ اور معاملات میں بصیرت رکھنے والا آدمی تھا لیکن جس پر رجب علی اور الٰہی بخش کا جادو چلے اور وہ غداری نہ کرے یہ کیونکر ہو سکتا تھا؟ افسوس تو یہ ہے کہ جس پر بادشاہ اور عوام کو پورا اعتماد ہو' عزت سے وقت بھی گزر رہا ہو' ہر طرح کی دلجوئی بھی ہوتی ہو' وہ ملک اور قوم اور اپنے ولی نعمت سے بے وفائی برتے؟..... بادشاہ کے خلاف گواہی دی' اس سے زیادہ اور کیا کرتا"؟ ۲۱

منشی رجب علی جگرانوی:

مولوی ذکاء اللہ صاحب نے منشی رجب علی جگرانوی کے بارے میں اس کی ملت فروشی اور انگریز دوستی کے پیش نظر یوں اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے: "سرکار انگریزی کے جو ایجنٹ اس تجربی کے لیے کہ دشمن کیا حرکتیں کرتا ہے دہلی میں رہتے تھے۔ ان سب کے سردار' منشی رجب علی تھے۔ جاسوسی کے لیے جو اعلیٰ درجے کی لیاقتیں چاہیے وہ ان میں تھیں۔ انگریز منتظموں کو اس پر پورا اعتماد تھا۔ وہ ہمیشہ اپنے کارفرماؤں کے ساتھ راست باز رہے' سچی بات دریافت کر لینے کی عجیب قابلیت واستعداد اور فراست وکیاست رکھتے تھے"۔ ۲۲

موصوف کی ملت فروشی اور انگریزوں کا ایجنٹ ہونے پر میاں صاحب نے یوں تبصرہ کیا ہے: "یہ مولوی یا منشی' انگریز کا ارسطو جاہ' جسے علم ارسطو کی ہوا بھی نہ لگی تھی' جگراؤں ضلع لدھیانے کا رہنے والا تھا۔ دہلی کالج کا ذہین طالب علم' ملک وملت کے درد سے بالکل بیگانہ تھا..... وائسرائے کا میر منشی بھی رہا۔ بڑا کام یہ کیا کہ دہلی کے بڑے قوم فروش الٰہی بخش وغیرہ کو اپنے ساتھ ملا لیا اور ایسے کام کرائے کہ رہتی دنیا تک دونوں کی پیشانی پر کلنک کے ٹیکے ثبت رہیں گے"۔ ۲۳

نادیدہ قوتیں:

1857ء کی اس جنگ آزادی کو ناکام بنانے اور مٹھی بھر انگریزوں کو مزید 90 سال کے لیے اپنے ملک وقوم پر مسلط کر لینے میں کون کون سی طاقتوں کا ہاتھ تھا ان کی نشان دہی یوں کی گئی ہے: "فرنگی کی یہی وہ کامیابی تھی جس

نے ملک کی آزادی کو سو سال پیچھے پھینک دیا۔ ہندوستانی سپاہی نہ ملتے تو ہمیں مہینا نہ ہوتیں تو اس کا تدبر کام نہ آتا۔ نہ سازوسامان مدد دیتا اور نہ یک بینی و دوگوش اپنے جزیرے میں جا بیٹھتا۔ جو شہری غدار اور خانساماں ہمارے اسے چٹے ہوئے تھے کب تک بچا لیتے؟ وہ نکال دیا گیا تھا اور نکال دیا جاتا۔

بھلا ہو میاں والی اور عیسیٰ خیلی والوں کا' بھلا ہو پنجاب کے پھلتے پھولتے والے زمینداروں کا' بھلا ہو ریاست ہائے پھلکیاں کا اور سب سے زیادہ بھلا ہو سکھ قوم کا جس نے صرف روٹی کے لیے انگریز کی غلامی کا بلا گلے میں ڈال کر بڑی خوشی اور اجنبائی مسرت و شادمانی کے ساتھ اس کی جڑیں پاتال تک پہنچا دیں اور ملک کے آزادی خواہوں کے سینے چھلنی کر کے شہروں' قصبوں اور گاؤں کو لوٹ کر ہندوستان (پاک و ہند) کی پیشانی پر ہمیشہ کے لیے کلنک کا ٹیکا لگا دیا"۔ [۴۳]

جنگ آزادی میں صوبہ پنجاب کا حصہ:

1857ء کی جنگ آزادی میں صوبہ پنجاب نے جس طرح حصہ لیا اس کے متعلق سرجان لارنس کی رپورٹ کا ایک اقتباس اور میاں صاحب کے اپنے تاثرات اور تحقیق ملاحظہ ہو: "انگریز یورپی میں بے دست و پا ہو گیا تھا لیکن پنجاب اس کے اثر میں تھا۔ پنجاب کے سکھ اور مسلمان فوج میں بھرتی کر لیے گئے تھے اور انھیں کے ذریعے وہاں کے جن اضلاع میں ہندوستانی فوجوں نے بغاوت کی ان کو سختی سے تباہ کر دیا گیا۔ اب دہلی کا سر حلقہ رہ گیا تھا اور اس کے بعد ہندوستان کے اکثر حصوں میں اس آگ (تحریک آزادی) کو بجھانا تھا۔ بڑے پیمانے پر بھرتی شروع کی گئی اور لوگ بہت خوشی کے ساتھ انگریز کے دست و بازو بن کر ہندوستان کی طرف چل پڑے۔ ان کی کیا نیت اور کیا ارادے تھے؟ کس خیال پر اتنی آسانی سے شرکت کی؟ سرجان لارنس کی زبانی سنیے! وہ غدر کی رپورٹ میں لکھتا ہے: "خیال ہمارے ساتھ ہو گئے۔ جتنے بھی گروہ ہندوستانیوں سے نفرت کرتے تھے۔ ہندوستانیوں کو اپنی برتری کا احساس تھا اور یہ خیال کرتے تھے کہ ہم ان سے بہتر ثابت ہوں گے۔ اسی طاہر خیال کرتے تھے کہ جس روٹی کو ہندوستانیوں نے ٹھکرا دیا ہے وہ اب ہمارے حصے میں آئے گی۔ اس کے ہم مالک بنیں گے"۔ [۴۴]

جنگ آزادی 1857ء میں صوبہ پنجاب کے مسلمانوں اور سکھوں نے حریت پسندوں کا ساتھ دے کر انگریز کی غلامی کا جوا اتار پھینکنے کی کوئی کوشش نہیں کی۔ اس کے برعکس جب اکثر شہروں اور علاقوں سے برٹش اقتدار کا جنازہ نکل چکا تھا تو صوبہ پنجاب کے باشندوں نے چند سکوں اور انگریزوں کی خوشنودی حاصل کرنے کی خاطر

برطانوی ڈاکوؤں کے دست دراز و بن کر حریت پسندوں کو کچلنے اور انگریزی اقتدار دوبارہ بحال کرنے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کیا۔

اس صوبے کا کارنامہ یوں بیان کیا گیا ہے: "پنجاب کی عدم شرکت کا ایک عذر یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ سکھوں کے ظلم نے اس قابل نہ چھوڑا تھا کہ بغاوت میں حصہ لیتے۔ ان کا ملی و قومی شعور مردہ کر دیا تھا۔ شاید یہ صحیح ہو کیونکہ دیکھنے میں یہ آتا ہے کہ جب انگریز نے بھرتی کی تحریک شروع کی تو سب لبیک کہہ کر دوڑ پڑے تاکہ لوٹ میں شریک ہو کر ہندوستانیوں سے بدلہ لیں۔ پھر انگریز کے دست بدست ان کے سب مظالم میں حصہ لیا اور کسی برے سے برے فعل سے بھی اجتناب نہ کیا اور نہ شرم انگوس کی اور نہ دل میں یہ خیال گزرا کہ ان بھائیوں پر یہ سب کچھ کر رہے ہیں جو اپنے لیے نہیں بلکہ اپنی قوم اور مذہب کے لیے ایک غیر قوم سے لڑ رہے ہیں"۔ [36]

پنجاب کا نوابانہ خاندان:

پنجاب کے مشہور نوابانہ خاندان نے جنگ آزادی 1857ء میں خاصی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا کیونکہ یہاں محمد شفیع نے اپنی ذاتی تحقیق کی بنا پر یہ دعوے پیش کی ہے: "مئی 1857ء میں تین سو سواروں کا دستہ بھرتی کر کے جہلم میں پلٹن نمبر 14 کے باغیوں سے لڑا پھر عالم کے ساتھ مل کر نمبر 26 کے باغیوں سے جالبازی کی اور ان کو گرفتار کرایا اور انہوں نے کالے کانوں آزادی خواہوں کی لاشوں سے پاٹنے میں اس کا ہاتھ تھا۔ اس کے بعد مختلف علاقوں میں بہت کارگزاریاں کیں۔ تانتیا کے مقابلے میں کالپی کا میدان انقلابیوں کے خون سے رنگین کیا اور وہاں سے جنرل میجر کے ساتھ دہلی ہندو کے جھگڑے نمٹائے۔

پنجاب میں داخل آکر خان بہادری کا خطاب' 480 روپے کی پنشن اور 1200 روپے سالانہ کی جاگیر ملی۔ اپنی محنت اور جستجو سے عزت کی زندگی حاصل کر لی دریائے جہلم سے نہر تک کھدوائی۔ مقدموں کی نسل کو قابل رشک ترقی دی۔ خاندانی جھگڑوں سے الگ تھلگ رہا' عزت پائی اور اے سی۔ ایس۔ آئی کا خطاب ملا اور آخر میں تمام جائیداد ملا کر ایک اچھی خاصی ریاست ہو گئی اور صرف تدبیر سے شاہ پور کا نہیں بلکہ پنجاب کا ایک رئیس اعظم بن گیا۔ ہمارے محبان وطن اور جاں نثاران دین و ملت کے خون کی سیاہی کہاں جا سکتی ہے؟" [37]

لاہور کا قزلباش خاندان:

لاہور کے قزلباش خاندان کے بارے میں بھی یہاں صاحب کی ایسی ہی تحقیق ہے۔ معلوم نہیں ان کے پاس کیسے دلائل تھے اور ان دلائل میں کتنا وزن ہے؟ بہر حال انہوں نے لکھا ہے: "علی رضا خاں قزلباش نے غدر میں

دہلی کے قریب ایک رسالہ بھرتی کیا اور جائیداد حج کر خرچ بھرا۔ اس میں اس کے چاروں بھتیجے (بلکہ بانجوں) عبداللہ خاں' محمد حسن خاں' محمد زمان خاں' غلام حسین خاں اور شیر محمد خاں بھی تھے۔ اس فوج نے نکلسن کو نمایاں خدمات انجام دیں اور بہت شجاعت دکھائی۔ محمد رضا خاں اس کا بھائی بہت دلیر تھا۔ مالوے اور شمس آباد میں دو مرتبہ زخمی ہوا اور دو گھوڑے مرے۔ سخت معرکوں میں بے محابا کھس جاتا تھا۔ اس لیے "آرڈر آف میرٹ" حاصل کیا۔ سردار بہادری کا خطاب اور 200 روپے پنشن علی الدوام ملی۔ علی رضا خاں کو بیوانچ اور اودھ میں تعلق داری ملی۔ خان بہادر کا خطاب پایا اور تمام بھائیوں کو خان بہادری کے خطاب ملے۔ 1864ء میں علی رضا خاں کو نوابی کی عزت بخشی گئی۔ اس کے بڑے بیٹے نوازش علی خاں کو مختلف اعزاز بخشے گئے اور باپ کے بعد نوابی کا خطاب ملا۔ دوسرے بیٹے ناصر علی خاں کو بعد میں اسسٹنٹ کمشنر بنایا گیا۔ نوازش علی خاں نے خدمت خلق سے بڑی عزت پائی اور لاہور کا سب سے بڑا آدمی ہوا بلکہ پنجاب کے چوٹی کے رئیسوں میں شمار ہونے لگا۔ سی۔ آئی۔ ای کا خطاب بھی پایا۔ بعد میں چھوٹے بھائی ناصر علی خاں نواب ہوا اور عزت سے کارگزاریاں دکھا کر 1896ء میں مرا۔ شیخ علی خاں نے اس کی جگہ لی' جو بھتیجا تھا۔ یہ نواب بھی اطاعت و فرماں برداری سے انگریز کے نزدیک سرباندہ و وفادار رہا"۔ [۲۵]

شاید ایسے ہی کارہائے نمایاں سے متاثر ہو کر دیوبندیوں کے امیر شریعت اور شعلہ بیان خطیب یعنی مولوی عطاء اللہ شاہ بخاری (المتوفی ۱۳۸۱ھ/۱۹۶۱ء) نے بقول ڈاکٹر خالد محمود سرزمین پنجاب کو یوں مطعون تعریف فرمائی ہے:

ندیم کشورے مردود و مرتاب — ہوی بادے کفر آباد پنجاب
چہ ملکے تنگ و مارے بخت کشور — زشرق و غرب یارش خاک بر سر
فجیر طینتش مردم کشی با — دلش مسلمش باشد خوشی با
چہ حرامش مریدان فرنگی — لقب کافور داده پاک زنگی
زنواب و رئیسانش چہ پرسی — سگ و سگ زادگاں کری پہ کری
چناں فرزند نامعوار زاید — کہ از مظر قیامش برتر نیاید
چکدار لالہ اش خون مسلماں — از و ناناں نجاز و مصر و ایراں
جو ابائش غلامان فرنگی — پناہ شاں بدامان فرنگی
چہ پنجاب آں فرنگی را مفکر — معسکر را غلام احمد پیمبر
ضلالت را پیمبر ہست پنجاب — فرنگی را معسکر ہست پنجاب

فضائل کفر و کفر بداست ۔ بہ آئین الٰہی در ستیزاست
زمین فتنہ زائے فتنہ خیزے ۔ کہ شیطاں فارش پائش سجودہ ریزے ۲۹

1857ء میں انگریزوں کو کہاں کہاں سے بھرتی کرنے کے لیے جوان ملے' جن کے مل بوتے پر حریت پسندوں کو بری طرح کچل کر برصغیر کو دوبارہ استحکام نصیب ہوا تھا ملاحظہ ہو" یکم اپریل 1858ء تک انگریزی فوج کی تعداد 96 ہزار تک پہنچ گئی۔ سکھ' پٹھان اور پنجابی مسلمان بھرتی ہو ہو کر آگے۔ راجاؤں اور نوابوں نے بھی اپنی فوجیں بھیج دیں۔ اس طرح بے شمار فوج جمع ہو گئی اور چاروں طرف پھیل کر انقلابیوں کا صفایا بول دیا۔ لوگارڈ اور انگلس پہاڑی طرف چلے گئے۔ ونسر اور ہڈسن کے ذریعہ دہلی سے شروع ہی میں مدد ہکموں تھی اور جنگ بہادر غدار نہایت خلوص اور دیانتداری سے 8 ہزار گورکھوں کے ساتھ نصف بیکی کیا۔ ۳۰

سکھوں کی دشمنی:

مشرقی پنجاب میں پٹیالہ' نابھہ اور جیند وغیرہ سکھوں کی ریاستیں تھیں۔ یہ ریاستیں آزادی وطن کی تحریک سے دشمن تھیں۔ انگریزوں کی حمایت میں حریت پسندوں کے خلاف بڑھ چڑھ کر کارنامے دکھائے۔ انقلابیوں پر دل کھول کر ضربیں لگائیں اور انگریزوں سے بھی بڑھ کر مظالم کے پہاڑ توڑے۔ ان کے کارہائے نمایاں کی کہانی غلام رسول مہر کی زبانی سماعت فرمایئے۔ "ان ریاستوں کو موقع حاصل تھا کہ انقلاب کی بنیادیں مستحکم کر دیتیں یا اسے ختم کر ڈالتیں۔ یہ اخبار اور دہلی کے درمیان واقع تھیں اور ہمیں کے امداد کے بغیر انگریزوں کا منصب خلافت سے بالکل محروم تھا۔ اگر یہ ریاستیں خاموش بھی بیٹھی رہتیں تو اس حالت میں بھی انقلاب کی کامیابی کے امکانات موجود تھے لیکن جب پٹیالہ' نابھہ اور جیند نے انقلاب پر انگریزوں سے بھی زیادہ بے دردی کے ساتھ ضربیں لگانی شروع کیں تو دہلی اور پنجاب کے درمیان اتصالات کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ ان ریاستوں نے نہ صرف دہلی کی دولت القمرانی جو سوار پیغام لے کر آئے تھے انہیں قتل کر دیا اور اپنے خزانے انگریزوں پر نثار کیے۔ اپنی فوجیں جمع کیں اور جن علاقوں میں سے انگریزوں کو گزرنا تھا انہیں بچانے رکھا پھر انگریزوں کے ساتھ ہو کر دہلی پر حملہ کیا۔" ۳۱

ان ریاستوں کی مذکورہ کارکردگی پر مصنف نے یوں تبصرہ کیا ہے "جیند' نابھہ اور پٹیالہ کے علاقے ایسی جگہ واقع تھے کہ اگر وہاں کے رئیس ذرا صبر کرتے تو دہلی سے ملحق کا پورا علاقہ انگریزوں کے لیے غیر محفوظ ہو جاتا اور انبالہ بھی خطرے میں پڑ جاتا۔ اگر وہ قومی آزادی کی جنگ میں معاون بن جاتے تو انگریزوں کے چھوٹے چھوٹے دستے بکھرے رہتے اور ان کے لیے اکٹھے ہونے یا آپس میں سلسلہ مخابرت قائم کر لینے کی کوئی صورت نہ تھی اور وہ یقیناً مارے جاتے۔

اس کے بعد انگریز انگلستان سے بڑی فوج لا کر ہندوستان کو از سر نو فتح کرنے کے لیے اگر کوئی قدم اٹھاتے تو یقیناً اس میں کامیاب ہونا آسان نہ رہتا لیکن ان سکھ ریاستوں کی انگریز دوستی اور وطن دشمنی نے صورت بگاڑ دی"۔ [۳۲]

سکھوں کی وطن دشمنی اور انگریز دوستی' جو اس موقع پر واضح ہوئی وہ قومی لحاظ سے پاک و ہند کی تاریخ میں ایک امتیازی کارنامہ ہے کیونکہ پوری سکھ قوم انگریزوں کی ڈوبتی ہوئی ناؤ کو بچا کر کنارے پر لگانے کی غرض سے آزادی چاہنے والے مسلمانوں اور ہندوؤں کے خلاف صف آراء ہو گئی' مثلاً: "سکھوں نے اس اہم موقع پر جبکہ مذہب دولت کے دھوکے پر ہندوستانی کے دل کو آگ لگا دیا تھا خاص طور پر خلوص کے ساتھ انگریز کی غلامی کو راحت سمجھ کر گلے میں ڈالا اور دست و بازو بن کر ہندوستان کے دل پر ضربیں لگائیں جیسے خاص اسی کام کے لیے پیدا ہوئے ہوں۔ اور تو اور اپنی رانی مائی جنداں کا بھی انگریزوں کے لیے مقابلہ کیا۔ دلی میں آکر تو گویا حق نمک ادا کر دیا۔ بڑی بڑی قربانیاں دیں اور باغیوں کو ذاتی دشمن سمجھ کر لڑے"۔ [۳۳]

انگریزوں نے سکھوں سے حریت پسندوں کو کچلوانے اور خاص طور پر ان سے تخت دلی اور مسلمانوں کو پست و نابود کروانے کی غرض سے عیارانہ طریقے پر استعمال انگیزی کی۔ اس چالبازی کا ذکر میاں صاحب کے لفظوں میں ملاحظہ ہو: "انگریزوں نے سکھوں کو بھڑکانے کے لیے ایک عجیب چال چلی۔ وہ یہ کہ بادشاہ دلی کی طرف سے ایک جھوٹا اعلان چھپوا دیا کہ سب کاموں سے پہلے باغیوں کا یہ فرض ہے کہ سکھوں کو تباہ کر دیں۔ سکھ پہلے ہی وطن پرستی سے خالی تھے اور اس تحریک سے انہیں کوئی ہمدردی نہ تھی چنانچہ اس اعلان سے اور بھڑک ہو کر بھرتی ہوئے تاکہ دلی والوں سے خوب بدلہ لیں"۔ [۳۴]

پاک و ہند کے مختلف گوشوں میں پنجاب کے مسلمانوں اور سکھوں نے جو کارنامے انجام دیے ان کی ایک جھلک پیش کی جا چکی ہے پنجاب کے اندر اور باہر سے جو یوں کے فوجی مختلف بیماریوں میں مبتلا تھے جب انہوں نے بغاوت کو فرنگ کے خلاف اعلم جہاد بلند کیا تو ان مسلح حریت پسندوں کے ساتھ پنجاب میں جو سلوک ہوا وہ ملاحظہ فرمایئے: "پنجاب میں بھی فتح کے بعد پھانسیوں ہی کی پالیسی چلی اور تک پھیلی ہوئی تھیں۔ وہ ہر جگہ کارروائیں لیکن انگریز یہاں مضطرب و مجبور نہ تھا۔ ملک (پنجاب) کے لوگ اس کے دست و بازو تھے۔ ہر جگہ ان کو کچل دیا گیا۔ باقی مقامات سے پلٹنیں پہنچتی رہیں نیز وہ پورے بھی قریب ہونے کی وجہ سے پہنچیں"۔ [۳۵]

منڈل خاندان کا کردار:

نواب احمد علی خاں منڈل نے اس جنگ آزادی میں جو کارنامہ انجام دیا اس کی ایک جھلک بھی ملاحظہ ہو۔

"منڈل خاندان کا نواب (احمد علی خاں) جس کی خدمات کی تعریفیں لارڈ کیننگ تک نے کیں۔ سالانہ 500 روپے لگان کے ادا کرتا تھا وہ ہمیشہ کے لیے معاف کر دیا گیا۔ اس لیے کہ اس نے غدر میں انگریز کی ایسی مخلصانہ مدد کی کہ ملکہ وکٹوریہ کا پتا بھی نہ کرتا"۔ ۳۶

جن حضرات کی انگریز دوستی اور ملک دشمنی کی طرف سطور بالا میں اشارات کیے گئے ان سے مقصود کسی پر کیچڑ اچھالنا یا کسی کو بدنام کرنا نہیں بلکہ ان حضرات کا ذکر ضمناً اس وجہ سے آگیا ہے کہ مٹھی بھر انگریزوں نے کس طرح سفر زمین پاک و ہند پر قبضہ جمایا اور مدتوں یہاں کے باشندوں پر حکومت کی؟ کتنے ہی اہم ترین مواقع پر ناممکن کو ممکن کر دکھانے کی ان کے اندر جو صلاحیت تھی اس کا اندازہ کے لیے دو چیزیں ہیں۔ ایک یہ کہ ان کے اندر ایجنٹ تلاش کرنے اور ان کے ذریعے سازشوں کا جال پھیلانے کی بڑی مہارت تھی اور دوسرا جو پہلے کہہ چکے کہ ملک کے اندر ایسے حضرات کی کوئی کمی نہیں تھی جو انگریزوں کی خوشنودی حاصل کرنے کی خاطر دین سے بڑی چیز قربان کر دیا کرتے تھے۔

برٹش گورنمنٹ کی ساری کامیابیوں کا راز دراصل ان حضرات کی ملک دشمنی، پیٹ پرستی اور ملت فروشی کی مرہون منت ہے۔ یہاں صرف ان حضرات کا تعارف حضور تاجِ کی بدولت برطانوی یہاں اپنی حکومت قائم کرنے اور مٹھی بھر ہونے کے باوجود اپنا قبضہ واقتدار ایسے وسیع و عریض ملک پر برقرار رکھنے میں کامیاب و کامران رہے۔ ملک اور قوم کا اپنے ذاتی اور گھٹیا مفاد پر سودا کرنے والوں کی نشان دہی کر دینا بھی انگریزوں کی عیاری اور مظالم کے ساتھ لازم وملزوم کی حیثیت رکھتا ہے یعنی

لاؤ تو قتل نامہ ذرا تم بھی دیکھ لیں
کس کس کی مہر ہے سر محضر لگی ہوئی

WWW.NAFSEISLAM.COM

جنگ آزادی کے بعد انگریزوں کے مظالم

اس تحریک آزادی کے دوران اور دوبارہ غلبہ پانے کے بعد انگریزوں نے اہل ہند کے ساتھ عموماً اور مسلمانوں کے ساتھ خصوصاً کیسے کیسے ظلم وستم روا رکھے اور تاریخ عالم کے بے رحم ترین حکمرانوں کو بھی شرمندہ کر کے کس طرح امتیازی مقام حاصل کیا؟ اس کے ثبوت میں چند حق انسانیت اور وحشیانہ مظالم کے واقعات پیش کرتا ہوں۔

● جب مرزا الٰہی بخش نے مغل شہزادوں کو ہمایوں کے مقبرے سے گرفتار کروایا تو جنرل ہڈسن نے ان کے ساتھ کیا سلوک کیا۔ ملاحظہ فرمائیں: "شہزادے رتھ پر سوار اور سواروں کے حلقے میں چلے آرہے تھے۔ جیل خانہ کے

قریب پہنچے تو ہڈسن نے سامنے بلوا کر کپڑے اتروا کر پھر اسی رتھ پر سوار کیا اور اپنے ہاتھ سے تین تین گولیاں مقام قلب پر ماریں اور شرگ کو سنگین سے چیر دیا اور اسی طرح چھوتڑا کو والی میں جا کر نعشوں کو زمین پر ڈال دیا"۔ ۳۷

شہزادوں کے ساتھ یہ خالمانہ اور بہیمانہ سلوک روا رکھنے کی خود ہڈسن نے یہ وجہ بتائی تھی: "میں بے درد نہیں لیکن مجھے اعتراف ہے کہ ان بدبختوں (تین شہزادوں) کے وجود سے زمین کو پاک کر دینے کا موقع ہاتھ آنے پر مجھے خوشی حاصل ہوئی۔ میرا ارادہ یہ تھا کہ انہیں پھانسی پر لٹکاؤں گا لیکن جب حالات نے یہ صورت اختیار کر لی کہ وہ مریں گے یا ہم تو میرے پاس سوچنے کا وقت نہ تھا"۔ ۳۸

ہو سکتا ہے ہڈسن کا یہ بیان انگریز دنیا یا مورخ کے انصاف پسند حلقوں کو مطمئن کر گیا ہو لیکن اصل سوال تو اپنی جگہ پر علی حالہ قائم ہے۔ بتانا تو یہ تھا کہ شہزادوں کو یہ کس جرم کی سزا دی جا رہی تھی؟ تختہ و ہندوستان کے شاہی خاندان کو ختم کرنے کا برطانوی لٹیروں کو کہاں سے پرمٹ ملا تھا؟ کون سا ضابطۂ اخلاق انہیں اس سفاکی کی اجازت دے رہا تھا؟ شہزادے کون سی ناپاکی پھیلا رہے تھے جس کے پیش نظر ہڈسن جیسے بیکہار کو ان کے وجود سے زمین کو پاک کرنا پڑا۔ کیا انگریزوں کے پاس ان مظالم کے جواز کا کوئی ثبوت ہے؟

● ان کے علاوہ دیگر مغل شہزادوں کے ساتھ جو وحشیانہ سلوک روا رکھا گیا اس کی ایک جھلک ملاحظہ فرمایئے: "دلی کے آس پاس جتنے شہزادے ملے پکڑے گئے' ان کی تعداد انتیس (29) بتائی جاتی ہے۔ ان میں بوڑھے' نکمے' بیمار سب کے سب پھانسی میں لٹکا دیے گئے۔ سب سے زیادہ بوڑھا قیصر مرزا (ابن شاہ عالم ثانی) اکبر شاہ کا بھائی تھا اور مرزا مغل محمود شاہ' اکبر شاہ کا پوتا وہ بھی مارا گیا تھا۔ ان کی لاش پھانسی میں گولا لاغی بھی ہوئی تھی..... شہزادے بے تحاشہ کے ساتھ پھانسی پاتے تھے"۔ ۳۹

● پھانسی دینے سے پہلے شہزادوں کو تڑپانے کی غرض سے ان کے ہاتھ پیر باندھ دیے جاتے تھے۔ ان کو کرائی سے مشقت لی جاتی اور مارا پیٹا جاتا تھا۔ آخر اس سلوک کی وجہ کیا تھی اور کس جرم کی یہ پاداش تھی؟ جناب غلام رسول مہر کی زبانی شہزادوں کا یہ تصور تھا: "جن شہزادوں کو قید کی سزا دی گئی ان سے سر عام دستور کے مطابق مشقت لی جاتی تھی۔ وہ بیچارے مشقت کیا کر سکتے تھے؟ ان سے بیگی پھوائی جاتی تھی۔ یہیں نہ سکتے تو کوڑوں کی مار پڑتی۔ یہاں تک کہ وہ بیچارے چند روز میں مر جاتے۔ کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ اس طرح کتنے مرے؟ ان کا قصور اس کے سوا کیا تھا کہ بہادر شاہ کے خاندان سے تھے"۔ ۴۰

● کیا چشم فلک کبھی نے ایسے مناظر دیکھے ہوں گے کہ کسی قوم نے حکمران خاندان کو چن چن کر پھانسی پر لٹکایا

ہو۔ جب گدھے ان کی لاشوں کو نوچ نوچ کر کھا گئے ہوں تو ڈھانچے دریا میں پھنکوائے گئے ہوں۔ اگر کسی نے ایسا نہیں کیا تو نہ کسی انگریز نے مقدمہ ہندوستان میں شاہی خاندان کے افراد سے 1857ء میں یہ سلوک کر کے اپنی برتری کا لوہا منوایا۔ "وتانگ سادر" کرنے ان بہیمانہ مظالم پر یوں تبصرہ کیا ہے: "جب گدھ بکھوعدت تک ان کا گوشت نوچ چکے تو سڑے ہوئے جسموں کو کھینچ کر دریا میں ڈلوا دیا گیا۔ آہ زمانے تیرے انقلابات! شہنشاہ اکبر اعظم کی اولاد پر نماز جنازہ ادا کرنے اور انہیں آغوش زمین میں سلانے والا بھی کوئی نہ تھا"۔ [۲۲]

باشندگان دہلی پر قیامت خیز مناظر:

● سفلی فتنوں پر تو قلم کے پہرے اٹھا دیئے گئے لیکن جب محمد ہندوستان کے پایہ تخت دہلی میں انگریز فاتحانہ طور پر داخل ہوئے تو باشندگان دہلی پر جو قیامت برپا کی وہ مولوی ذکاء اللہ صاحب کی زبانی سنیے: "سپاہ شہر کشائے شہر میں قدم رکھتا تو اس کے سامنے جو مرد آتا اس کو وہ گولی مارتے۔ اس وقت دوست و دشمن، مجرم و غیر مجرم میں تمیز نہیں ہو سکتی تھی۔ اس میں پکے مذہب مسلمان کی تخصیص نہ تھی"۔ [۲۳]

● دہلی میں انگریزی سپاہ اور سکھوں کے پیش جب فاتحانہ انداز میں داخل ہو گئے تو پیچھے باشندوں کے ساتھ انہوں نے انسانی ہمدردی کا کہاں تک ثبوت دیا تھا۔ یہ جناب مہر صاحب کے لفظوں میں ملاحظہ ہو: "کرنل برن شہر کا فوجی گورنر مقرر ہوا۔ جس نے قطب الدین سوداگر کی کوٹھی میں اپنا مرکز بنایا۔ یہ کوٹھی چاندنی چوک میں تھی۔ شہر میں تھوڑی سی آبادی رہ گئی تھی۔ لشکریوں کے محلے مقرر ہو گئے جو بازاروں، گلیوں کے پیچ کے آباد تھے جہاں کسی گھر کو آباد پاتے، مردوں، عورتوں، بچوں سب کو پکڑ کر برن کے پاس لے آتے۔ اور جتنے بچھنے کے پیشہ ور مردوں کے سروں پر ہوتے۔ تلاش میں جو چیز قیمتی ہوتی نکال لی جاتی اور جس اسباب کو لوٹنے میں کوئی فریق تامل دے واپس دے کر لاہوری دروازے سے باہر نکال دیتے کہ جہاں چاہے چلے جائیں۔ اس طرح باقی شہر بھی خالی کرا لیا گیا"۔ [۲۴]

شاہجہان آباد (دہلی) کی بربادی:

19 ستمبر 1857ء کو دہلی کے لال قلعے پر انگریزوں کا قبضہ ہوا تھا۔ 24 ستمبر 1857ء کو جب رابرٹس کانپور جانے لگا تو اس نے دہلی کو بھی گھوم پھر کر دیکھا۔ شاہجہان آباد کی بربادی کا نقشہ رابرٹس نے یوں کھینچا تھا: "صبح کی ابتدائی روشنی میں دہلی سے کوچ کا وہ مرحلہ بڑا ہی دردناک تھا۔ لاہوری دروازہ سے نکل کر ہم چاندنی چوک میں سے

گزرے۔ دلی حقیقتاً شہر خموشاں معلوم ہوتا تھا۔ ہمارے اپنے گھوڑوں کے سموں کی آواز کے سوا کوئی آواز کسی سمت سے نہ آتی تھی۔ ایک بھی زندہ مخلوق ہماری نظر سے نہ گزری۔ ہر طرف نعشیں بکھری پڑی تھیں۔ ہر نعش پر وہ حالت طاری تھی جو موت کی کشمکش نے طاری کر دی تھی۔ ہر نعش تجزیہ و تحلیل کے مختلف مراحل میں تھی۔ ہم چپ چاپ چلے جا رہے تھے یا سمجھ لیجیے کہ بے ارادہ زیر لب باتیں کر رہے تھے تاکہ انسانیت کے ان دردناک باقیات کی استراحت میں خلل نہ پڑ جائے۔ جن مناظر سے ہماری آنکھیں دو چار ہوئیں وہ بڑے ہی خوفناک اور الجھا دینے والے تھے۔

کہیں کوئی کتا کسی نعش کا بڑا حصہ منھ میں دبوچ کر کھا رہا تھا۔ کہیں کوئی گدھ ہمارے قریب پہنچنے پر اپنی گھناؤنی غذا چھوڑ کر پھڑپھڑاتے پروں سے زور لگا کر اڑ جاتا تھا لیکن اس کا پیٹ اتنا بھر چکا تھا کہ اڑ نہ سکتا تھا۔ اکثر لاشوں میں مرے ہوئے زندہ معلوم ہوتے تھے۔ کسی کے ہاتھ اوپر اٹھے ہوئے تھے جیسے کسی کو اشارہ کر رہا ہو۔ دراصل یہ پورا منظر حد درجہ ہیبت ناک اور وحشت انگیز تھا کہ بیان میں نہیں آسکتا تھا۔ معلوم ہوتا ہے ہماری طرح گھوڑوں پر بھی خوف طاری تھا اس لیے وہ بھی بدک رہے تھے اور تھتھنے پھلا رہے تھے۔ پوری فضا نا قابل تصور حد تک بھیانک تھی جو بیحد مضر اور بیماری آور بدبو سے لبریز تھی"۔ [27]

مقامی باشندوں کے ساتھ یہ سلوک کرنے پر لوٹ مار کا جس طرح بازار گرم کیا گیا وہ میر صاحب کی زبانی سنیے:

"فتح کے ساتھ ہی فوج کو تین دن کے لیے لوٹ کی اجازت دی گئی تھی۔ یا سوء تفہم سمجھ نے لکھا ہے کہ اجازت نہ بھی دی جاتی تو پیدا اس حالت میں بھی بازار نہ رہتی۔ سکھوں اور دوسرے لوگوں کو معلوم ہوتا تھا کہ دلی میں اعلیٰ قیمتی سامان "جواہرات" سونے چاندی کے برتنوں اور روپے کے انبار کہاں لگے ہوئے ہیں..... شکاری کتوں کی طرح جھوٹی ڈال کر وہ کچی گلی اور بازار جا پہنچے۔ ایک دو آدمی گھر کے بھید دینے والے ساتھ ہو لیے۔ ہر مکان میں داخل ہوتے۔ ہر مندروں کی طرح آہستہ آہستہ دیواروں اور تختوں پر تھپکیاں مارتے" فرش پر پانی ڈالتے اور دیکھتے رہتے کہ کہاں جلد مرتا ہے۔ پھر عقاب کی آنکھ یا سرخ بندر ستانی کے کان یا شکاری کتے کی ناک سے کام لے کر سیدھے گڑھے یا تہ خانے یا زمین میں دبے ہوئے برتن نکال لیتے" جن میں ہر گھر بھرا پشتوں کی بچائی ہوئی پونجی موجود ہوتی"۔ [28]

دلی میں مسلمانوں اور مغلیہ خاندان سے تعلق رکھنے والوں کے ساتھ انگریزوں نے جو سلوک روا رکھا اس کا تصور بھی انتہائی دردناک اور وحشت انگیز ہے۔ سید کمال الدین حیدر نے اس کا انتہائی مدلل ذکر یوں کیا ہے: "ستائیس (27) ہزار اہل اسلام نے پھانسی پائی۔ سات دن برابر قتل عام رہا اس کا حساب نہیں۔ اپنے نزدیک گویا نسل تیموریہ کو

نہ رکھا" مٹا دیا۔ بچوں تک کو مار ڈالا۔ عورتوں سے جو سلوک کیا بیان سے باہر ہے۔ جس کے تصور سے بھی دل دہل جاتا ہے"۔ ۲۶

عبادت گاہوں کی بے حرمتی:

عبادت گاہیں ہر مذہب وملت کے نزدیک قابل احترام ہیں اور مساجد تو پھر مساجد ہیں لیکن انگریزوں نے نہ انسانی اور اخلاقی قدروں کو مدنظر رکھا اور نہ اپنے عیسائی ہونے کے دعوے کا کوئی پاس لحاظ کیا۔ مسلم کشی کے جذبے نے انہیں اتنا اندھا کر دیا تھا کہ دہلی کی مشہور و معروف جامع مسجد کو سکھ فوج کا ہیڈ کوارٹر مقرر کر دیا گیا۔ سکھوں نے بھی انسانی اور اخلاقی کسی زیادتی سے اس حرکت پر غور کرنے کی زحمت گوارا نہ کی بلکہ اس خانہ خدا میں وہ تاریخ اور شرمناک کام کیے جو ان کی قومی روایت کا ایک جزو بن کر رہ گئے۔

مولوی ذکاء اللہ لکھتے ہیں: "جامع مسجد جو شہر کی کل مساجد کی ناک تھی اس کو یوں تلخ بنایا کہ سکھ سپاہ کی بارک اس کو بنایا۔ اس میں بول و براز کرنے سے کچھ پرہیز انہوں نے نہیں کیا۔ سکھوں نے اپنے کڑاہ کے حلوے کے سرخ چنار کے پیڑ طوب چڑھائے۔ سور ذبح کر کے پکائے گئے۔ کتے جو انگریزوں کے ساتھ تھے وہ درگاہ شریف میں چرتے پھرتے تھے"۔ ۲۷

انگریزی اخبارات کی انتہا پسندی:

جب دہلی کے باشندوں کو خاک وخون میں ملا دیا، بچے کھچے افراد کو شہر سے بھگا دیا، اپنے نزدیک تمام خاندان کو مٹا دیا تو صرف دو چیزیں باقی رہ گئیں تھیں۔ ایک مغلوں کی آخری نشانی ضعیف العمر اور حرماں نصیب بادشاہ بہادر شاہ ظفر جو انگریزوں کی قید میں تھا اور دوسری چیز دہلی کی تو حد کہاں خالی جانتیں۔ ان کے بارے میں انگریزوں کا روزنامہ کرانیکل لاہور 7 اکتوبر 1857ء کی شہ سرخی میں یہ سوال کرتا ہے: "دہلی کو اب تک کیوں نہیں کیا گیا؟ بادشاہ اب تک کیوں زندہ ہے؟ اس کا جواب اختصار سے دے دینا چاہیے۔ شہر دہلی اور بادشاہ کا وجود دفتری حکومت کا مخزن ہے۔ دفتری حکومت نے ہمارے سالاروں کے ہاتھ باندھ دیے"۔ ۲۸

یہی مطالبہ لاہور کے دوسرے انگریزی اخبار "پنجابی" نے ماہ نومبر میں اپنی حکومت سے ان لفظوں میں کیا: "دہلی مسلمانوں کا سرچشمہ ہے، کیوں اب تک اسے زمین کے برابر نہیں کیا گیا؟ بادشاہ مسلمانوں کی عبث واعتقیدت کے بھڑکنے کا پرزور ہے، کیوں اب تک اسے پھانسی نہیں دی گئی یا گولی نہیں ماری گئی"؟ ۲۹

جن کے خون پسینے کی کمائی سے انگریز پھلے پھولے تھے۔ جن کی بہشت مایشت کی یونجی کو لوٹ کر انگلستان جیسے

غریب اور پسماندہ ملک کو صنعتی، مالدار اور ترقی یافتہ بنا چکے تھے۔ آزادی اور دولت چھین لینے اور ان کے مذاہب میں مداخلت کرنے پر ہی بس نہ کی بلکہ 1857ء کے انقلاب کی یاد اش اور آزادی چاہنے کے جرم میں وہ مظالم ان غریبوں پر ڈھائے کہ ان کے ذکر سے کلیجہ منہ کو آتا ہے۔

دیگر شہروں اور دیہات میں مظالم:

دہلی میں جو کچھ کیا اس کی جھلک پیش کی جا چکی ہے۔ باقی ملک میں، شہروں اور دیہات میں، اس بدنصیب ملک کے باشندوں سے کیسا سلوک کیا گیا ملاحظہ ہو: "نیل نے الہ آباد اور اس کے گرد و نواح میں ظلم و جور کی بھٹیاں دہکا رکھی تھیں۔ اس اثناء میں اس کی جنگ بھری ہیبت ناک کو سپہ سالار بنا دیا گیا اور یہ 30 جون کو الہ آباد پہنچ گیا۔ نیل جتنا کام انجام دے چکا تھا اس کی تفصیلات جان کیں نیز بتایا کہ ریناڈ کو ہر اول کے طور پر پیچھے وقت اس نے کیا کیا ہدایات دیں؟ ہیوے ایک نے ان تمام جدایات پر تحسین کا اظہار کرتے ہوئے ان کی تصدیق کر دی۔ گویا ظلم و جور اور بے پناہ تشدد محض نیل ہی کو پسند تھا بلکہ تمام اگرچہ جرنیل ایسے ہی طور طریقوں کو پسند کرتے تھے"۔ [۵۰]

ریناڈ جس کو کرنل نیل مذکور نے ہراول کے طور پر آگے بھیجا ہوا تھا۔ اس نے اہل ملک کے ساتھ اس قدر سنگین مظالم کے کہ کوئی با اخلاق آدمی ہرگز جرأت نہ کر سکتا تھا۔ مثلاً "دو روز میں چالیس آدمیوں کو پھانسیاں دی گئیں۔ بارہ آدمیوں کے ایک گروہ کو اس بنا پر موت کی سزا دی گئی کہ جب کالم کوچ کرتا ہوا ان کے پاس سے گزرا تو انہوں نے منہ پھیر رکھے تھے۔ ریناڈ جب پڑاؤ ڈالتا تو سامنے کے تمام دیہات کو آگ لگوا دیتا"۔ [۵۱]

کرنل نیل نے ایک مکان کے اندر فرش پر علیحدہ علیحدہ گائے اور سور کے خون کا چھڑکاؤ کروایا ہوا تھا۔ جو حریت پسند گرفتار ہو کر اس کے سامنے پیش کیا جاتا اسے پھانسی دینے سے پہلے یہ تعذیب دی جاتی کہ اگر مسلمان ہے تو اس مکان میں اپنے جسم سے سور کا خون زبان سے چاٹ کر فرش کو صاف کرے اور اگر قیدی ہندو ہے تو اس سے گائے کے خون والی جگہ کا ایک قطعہ اسی طرح صاف کروایا جاتا۔ جو انکار یا تامل و حجت کرتا تو درے لگتے اور انکار کی صورت میں درے مار مار کر اسے ختم کر دیا جاتا ورنہ صاف کرنے کے بعد پھانسی پر لٹکا دیا جاتا اور اس طرح موت سے پہلے چند منٹ زندہ رہنے کی مہلت مل جاتی۔

یہ طریقہ کار نیل نے 25 جولائی 1857ء کو جاری کیا تھا۔ اس طریقہ تعذیب کو نیل سن' جلد دوم ص: 300 سے یوں نقل کیا گیا ہے: "بریگیڈیر جنرل نیل کا عزم مصمم ہے کہ بے گناہوں کے خون کا ہر وہ ان

بدمعاشوں (حریت پسندوں) سے قبل از فیصلہ سزائے موت صاف کرایا اور دھلوایا جائے۔ جو آنکھ غدر میں سرگرم حصہ لینے کی بناپر گرفتار ہوں انھیں بحیثیت ذات اور درجۂ جرم کی بناپر اس کام کے لیے منتخب کیا جائے۔ ہر بدمعاش کو موت کی سزا کا حکم سن لینے کے بعد پہرے کے ساتھ حفاظت مکان میں لے جایا جائے گا اور مجبور کیا جائے گا کہ دھبوں کا ایک حصہ صاف کرے۔ یہ کام زیادہ سے زیادہ کراہت انگیز نہ بنا دینا چاہیے۔ اگر مجرم کام پورا نہ کرے تو فوجی کوتوال تازیانے لگوائے۔ اپنے حصے کا کام کر چکنے کے بعد مجرم کو پھانسی دے دی جائے۔ اس غرض سے پھانسی پاس ہی نصب کی جائے گی"۔ ۵۲

نیل نے اپنی اس تجویز پر دل کھول کر عمل کیا لیکن ہنری ہیولاک جسے نیل کی جگہ الہ آباد کے علاقے کا فوجی افسر مقرر کیا گیا تھا اس نے بھی 30 جون 1857ء سے جو سلسلۂ ہدایات یک دہند کے باشندوں کے ساتھ روا رکھا وہ ایک اگریز سول افسر کی زبانی "نیل من جلد دوم صفحہ ۲۷ سے یوں منقول ہے: "راستے کے بہت سے گاؤں جلا دیے گئے تھے اور انسان وہاں قطعاً نظر نہ آتا تھا۔ سڑک کے دونوں طرف دلدل تھی جلی ہوئی جھونپڑیوں کے سیاہ کھنڈ جنھیں موسم کے اثرات نے اور زیادہ بدوضع بنا دیا تھا۔ ایک بھی صدا نہ سنی جاتی تھی جو کسی انسان کے وجود کا پتہ دیتی یا معلوم ہو سکتا کہ آدمی کام کاج میں لگے ہوئے ہیں۔ ایسی صداؤں کی جگہ مینڈکوں کے ٹرانے کا شور تھا یا مکھیوں کی بھنبھناہٹ سنائی دیتی تھی یا بڑے بڑے درندے دیکھنے میں آتے تھے جو بھوک اور گرمی کے باعث پاگل ہو گئے تھے۔ پھر بیچ کے درختوں کی شاخوں پر بھی دفنائی گئی ہوئی نعشوں کی بدبو ہوا خراب کر رہی تھی جنھیں ہماری آنکھوں کے سامنے مکروہ سیارچے کھا رہے تھے۔ یہ سب چیزیں ہمارے مختلف حواس پر اثر انداز ہو رہی تھیں اور مل کر بربادی، تباہی اور رنج و ماتم کا ایسا سوقیہ تیار کر رہی تھیں جو میرے تزدیک موجود لوگوں میں سے کسی کو عمر بھر فراموش نہ ہوگا"۔ ۵۳

لیفٹیننٹ رابرٹس نے 21 جون 1857ء کو جملہ ہیڈ کوارٹر کے نام ایک خط انگلستان بھیجا۔ اس میں اپنی قوم کے مزاج اور خصوصاً ہندوستان کے باشندوں کو اذیت ناک سزائیں دینا اور توپ سے اڑانا جس فخریہ انداز میں لکھا وہ انگریزوں کی ذہنیت کی صحیح تصویر ہے۔ اس خط کا ایک اقتباس جناب غلام رسول مہر کے لفظوں میں ملاحظہ ہو:

"سزائے موت کی سب سے زیادہ موثر صورت یہ ہے کہ مجرم کو توپ سے اڑا دیا جائے۔ یہ بڑا ہی خوفناک نظارہ ہوتا ہے لیکن موجودہ وقت میں ہم احتیاط پر کاربند نہیں ہو سکتے..... ہمارا مقصد ان بدمعاش مسلمانوں پر یہ ظاہر کرنا ہے کہ خدا کی مدد سے انگریز اب بھی ہندوستان کے مالک رہیں گے"۔ ۵۴

جنگ آزادی میں انگریزی عدالتوں کے مظالم:

جو ظلم و ستم دہلی میں ڈھایا گیا اسی طرح دیگر شہروں اور دیہات میں غالب آنے کے بعد انتظام کی بھٹیاں گرم کی گئیں۔ ٹیل' ہیوے لاک اور لارنس کے جو مظالم عیان ہوئے' پورے ملک میں یہی کچھ کیا گیا۔ اس کے بعد فوجی عدالتیں بیچ کھیچ باشندوں کے لیے قائم کر دی گئیں۔ ان عدالتوں کا عدیم المثال انصاف بھی ملاحظہ ہو:

"ملزموں کو گرفتار کر کے مقدمات کی چھان بین کے لیے فوجی کمیشن کے سربراہ کے روبرو پیش کر دیا جاتا تھا۔ یہ کام بڑی تیزی سے ہوتا تھا۔ موت کے سوا کوئی سزا نہ تھی اور اثبات جرم کے سوا کسی مقدمے کا کوئی نتیجہ نہ نکلتا تھا۔ جن اصحاب کا کام ملزموں کے جرم کی چھان بین خاموشی کے چند اں روادار نہ تھے"۔ ۵۵

انگریزوں کا مقصد اس فوجی نظام عدل سے یہ تھا کہ بچے کھچے باشندوں کو مزید ایسی عبرت ناک سزائیں دی جائیں کہ بعد میں کوئی سر اٹھانے کا تصور بھی دل میں نہ لانے پائے۔ اکثر کو ماخوذ کر لینے کے بعد سزائے موت کی سزا ہی دی جاتی تھی۔ طریقہ ہائے اذیت ایسے وحشت ناک اور غیر انسانی تھے کہ بعض انگریز بھی ان پر اظہار ملامت کیے بغیر نہ رہ سکے۔

چنانچہ ٹامسن ص: ۲۷ سے ایک انگریز کا بیان یوں منقول ہے: "بلند دستانوں کے لیے تعذیبات" یہ مسلمانوں کو (پھانسی دینے سے پہلے) سواروں کے پیچھوں میں بیٹھا یا ان کے جسموں پر سواروں کی چربی ملتا و ران کے جسموں کو جلاتا یا ہندوؤں کو بھرشٹ ہونے پر مجبور کرنا" یہ تمام حرکات سراسر منگھڑت اور غیر سمجھی ہیں اور ہمارے لیے باعث بے عزتی ہیں۔ انجام کار یہ ہم پر معیوب بن کر گریں گی۔ یہ زہ دعائی اور مذہبی تعذیبات کے بعد یورپ والوں کو منہ دکھانے کے قابل (ہم) نہیں رہ سکیں"۔ ۵۶

فتح دہلی کے روداد بعد الا رذال رئیس نے دہلی میں فوجی گھاٹ دے کے نام ایک آرٹیکل لکھا جس کا ایک اقتباس ولیم میور کی کتاب جلد اول صفحہ ۴۳۹ سے یوں نقل کیا گیا ہے: "مجھے یقین ہے کہ ہم نے جس طریق پر بلا امتیاز تمام طبقوں کو لوٹا ہے اس کے لیے ہم پر ہمیشہ لعنت بھیجی جائے گی اور یہ فعل بالکل حق بجانب ہوگا۔ بہر حال دو مہینے کی لوٹ کو کافی سمجھنا چاہیے۔ میرے پاس اس بارے میں بھی سے بھی شکایتیں پہنچ رہی ہیں..... میں نے یہ بھی سنا ہے' اگر چہ یقین نہیں آتا کہ افسر باہر نکل نکل کر دیسی باشندوں کو بیدردی سے قتل کر رہے ہیں..... اگر ہمارے سامنے بلند اصول نہ بھی ہوں جب بھی عام مصلحتوں کا تقاضا یہی ہے کہ ہم اپنے ہم وطنوں کو اس قسم کی چیرہ دستیوں سے باز رکھیں۔ باغیوں اور قاتلوں کو پھانسی پر لٹکانے یا گولی سے اڑانے کے لیے مجھ سے زیادہ کوئی مستعد نہ ہوگا

لیکن ہمیں دوست اور دشمن میں امتیاز کرنا چاہیے۔ موجودہ صورت حال کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تمام طبقے ہمارے خلاف متحد ہو جائیں اور جنگ شروع ہو جائے' ملک آہستہ آہستہ ویرانی کی منزل پر پہنچ جائے پھر ہمارے لیے یہاں ٹھہرنا بھی ممکن نہ رہے"۔ ۵۷

سکھوں نے بھی انگریزوں کے دوش بدوش حریت پسندوں کو بلا امتیاز ہندو مسلم کے جسمانی اور روحانی اذیت پہنچانے' دونوں قوموں کو برٹش گورنمنٹ کی خوشنودی حاصل کرنے کی غرض سے تباہ کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی تھی۔ اس سلسلے میں ایک واقعہ پیش خدمت ہے جو موبرے تامسن نے ہنری کاٹن کو بتایا اور تامسن صفحہ 48 سے غلام رسول مہر نے اپنے لفظوں میں اسے یوں بیان کیا ہے: "اندھیرا ہو چکا تھا' ایک سکھ اردلی میرے خیمے میں آیا اور سلام کرنے کے بعد بولا کہ ہم نے قیدیوں سے جو سلوک کیا ہے' میں سمجھتا ہوں آپ اسے دیکھنا پسند کریں گے۔ مجھے (ہنری کاٹن کو) شبہ ہوا تو نہ اٹھا اور حوالات میں گیا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ بدبخت مسلمان آخری دموں پر ہیں۔ ان کی ٹخلیاں کسی ہوئی ہیں' کپڑے اترے ہوئے ہیں اور تانبے کے پیسے گرم کر کے ان کے جسموں کو سر سے پاؤں تک داغا جا چکا ہے۔ میں نے خود انہیں گولیوں سے ہلاک کر دیا تا کہ ان کی اذیتیں ختم ہوں"۔ ۵۸

سکھ وحشیت کا مظاہرہ ہندوؤں کے بارے میں ملاحظہ ہو کہ اجتالے میں کیا مظاہرہ کیا: "اجتالے کے اردگرد پہرے کھڑے کر دیے گئے تا کہ کوئی آدمی تھانے کی طرف نہ آنے پائے۔ دس دس کے جتھوں میں قیدیوں کو باہر لایا جاتا' ان کے نام اور پتے لکھے جاتے اور اس جگہ بھیج دیا جاتا جہاں سکھ سپاہی انہیں گولیاں مارنے کے لیے متعین تھے۔ کوپر نے خود لکھا ہے کہ انہیں قتل گاہ کی طرف بھیجا جاتا تو وہ غصے اور جوش کی حالت میں مجھ سے کہتے کہ ظہور الدین اور تمہارے ساتھ بھی یہی سلوک ہوگا۔ کبھی سکھوں کو للکارتے' کبھی گرنتھ کی مدد کے لیے پکارتے"۔ ۵۹

1857ء کی جنگ آزادی میں بعض انگریز افسروں نے جو بہیمیت اور درندگی کا ثبوت دیا اور اہل ملک کے ساتھ محض اس وجہ سے غیر انسانی برتاؤ کیا کہ انہوں نے آزادی حاصل کرنے کا تصور بھی کیوں کیا؟ انگریزوں کو دوسروں کے ملک پر قبضہ جما لینے' وہاں کی دولت لوٹنے' صنعتیں تباہ کرنے' اس کی دولت سے انگلستان کو صنعتی اور ترقی یافتہ بنانے کا اخلاقی اور انسانی حق حاصل تھا لیکن دیسی باشندوں کو کوئی حق نہیں تھا۔ جب ان کا ملک اجاڑا جا رہا تھا تو انہوں نے اُف کیوں کی؟ صنعتیں تباہ کی جا رہی تھیں تو کیوں بلبلائے؟

WWW.NAFSEISLAM.COM

عیسائی بنانے کی سرتوڑ کوشش کر کے اگر انگریزوں نے ان کے دلوں پر آرے چلائے تو دیسیوں کے منہ سے سسی کی آواز کیوں نکلی؟ یہ تھی تھوپہ ہندوستان میں بسنے والوں کے جرائم کی فرد۔ کیا انگریزوں کے نزدیک یہ جرم قابل معافی تھے؟ لیکن اخلاق اور انسانیت کی رو سے دیسی مجرم تھے یا انگریز؟ اہل خانہ اپنے گھر کو بچانا چاہتے تھے تو مجرم ٹھہرے لیکن ڈاکو اسی گھر کو نہ صرف متواتر لوٹنا چاہتے تھے بلکہ اس پر قبضہ جمائے رکھنے پر مصر تھے اور ایسا کرنا ان کی نظر میں نہ جرم تھا نہ عیب۔

ظالموں پر نوازشیں:

یہ المیہ نہیں تو اور کیا ہے کہ انگریزوں کے جن جرنلوں اور سرتوڑ فوجی افسروں نے زیادہ سے زیادہ درندگی کا ثبوت دیا اور سفاکی، وحشت اور بربریت کے اگلے پچھلے سب ریکارڈ 1857ء میں تھوپہ ہندوستان کے اندر توڑ دکھائے انہیں ہیرو قرار دیا گیا۔ انہیں اور ان کی اولاد کو پنشنوں اور جاگیروں سے نوازا گیا۔ انگلستان کی تاریخ میں ان تک انسانیت دشمن افراد کو ترقیاں کر کے دکھایا گیا۔ گویا پوری برطانوی قوم کی ذہنیت ڈاکوؤں جیسی اور ڈاکو نواز بن کر رہ گئی تھی۔

انگریزوں کی اسی ذہنیت اور 1857ء میں انہوں نے جس درندگی کا مظاہرہ کیا اس کے پیش نظر جناب غلام رسول مہر کیا یہ سوال کرتے اور باشندگان پاک و ہند کے ضمیر کو جھنجھوڑتے ہیں: "اب سوچیے کہ جس دل میں 1857ء کے واقعات محشر کی یاد تازہ ہوگی کیا اس میں انگریزوں کے لیے کسی بھی خوشگوار خیال کی گنجائش باقی رہے گی؟ شعلوں کو کون پھول سمجھتا ہے اور خارزار کو کون حریر و پرنیاں کا فرش قرار دیتا ہے؟ تاریخ قوموں کے اعمال کا سرچشمہ ہے۔ انگریز جب اس میں اپنے اعمال دیکھیں گے تو اس کے اوراق پر 1857ء کے خون ناحق کا رنگ جلا جلا نظر آئے گا۔ اس وقت ان کی عاقبت کیا ہوگی؟ وہ ٹیل، نکلسن، ہڈسن یا ان جیسے دوسرے لوگوں کے بارے میں کیا رائے قائم کریں گے؟ اس دنیا کا ہر ذرہ ذرہ پکار کر کہے گا کہ انگریزوں نے وہ حرکتیں کیں جو انسانیت ہی نہیں بلکہ جنگلی درندوں کے لیے بھی باعث ننگ تھیں"۔ [۲۰]

غلام رسول مہر کے مذکورہ بالا سوال اور وضاحت سے ہمیں پورا پورا اتفاق ہے۔ انگریزوں نے 1857ء میں حریت پسندوں اور خاموش رہنے والوں کے ساتھ بغیر کسی امتیاز کے مردوں، عورتوں اور بچوں کے اوپر مظالم کے پہاڑ ڈھائے، اندھا دھند گولیاں چلائیں، دیہات جلوائے، گولا باری لگا کر درختوں سے الٹے لٹکائے، سنار اور گائے کا خون فرش زمین سے چاٹ کر صاف کروایا، توپ سے اڑایا، اسباب لوٹنا، گھر بار سے

لگالا جائیداد یں ضبط کیں کالے پانی کی سزائیں دیں اور ایسے بے شمار طرق مظالم ایجاد کیے جن کے پیش نظر کوئی انصاف پسند انہیں پھول نہیں بلکہ شعلہ سمجھے پر مجبور ہوگا۔ ان کی ظاہری عنایات کو حریر و پرنیاں کا فرش نہیں بلکہ خارزاری قرار دے گا۔ خود بعض انگریز مورخوں اور انصاف پسند افسروں نے اپنی قوم کے ان مظالم کو نفرت و حقارت کی نظر سے دیکھا اور ان سے اپنی برأت کا اظہار کیا ہے۔

﴿حوالہ جات﴾

۱ غلام رسول مہر: ۱۸۵۷ء، ص: ۶۸
۲ ایضاً، ص: ۶۹
۳ محمد شفیع میاں: ۱۸۵۷ء، ص: ۱۹۵
۴ ایضاً، ص: ۲۹۷
۵ ایضاً، ص: ۳۰۲
۶ غلام رسول مہر: ۱۸۵۷ء، ص: ۱۲۱
۷ ایضاً، ص: ۳۱۰
۸ ایضاً، ص: ۲۵۸
۹ ایضاً، ص: ۲۵۹
۱۰ ایضاً، ص: ۲۵۸
۱۱ ایضاً، ص: ۲۵۸
۱۲ ایضاً، ص: ۲۸۲
۱۳ ایضاً، ص: ۳۲۲
۱۴ ایضاً، ص: ۳۱۹
۱۵ ایضاً، ص: ۲۷۴
۱۶ ایضاً، ص: ۲۷۰
۱۷ ایضاً، ص: ۲۷۱
۱۸ ایضاً، ص: ۲۷۳
۱۹ ایضاً، ص: ۲۸۲
۲۰ ایضاً، ص: ۳۲۵
۲۱ ایضاً، ص: ۳۲۷
۲۲ ذکاء اللہ مولوی، عروج عہد انگلشیہ، ص: ۶۳۰
۲۳ ایضاً، ص: ۲۹۲
۲۴ ایضاً، ص: ۲۹۷
۲۵ ایضاً، ص: ۱۹۸
۲۶ ایضاً، ص: ۱۹۹
۲۷ ایضاً، ص: ۳۳۰
۲۸ ایضاً، ص: ۳۳۳
۲۹ عبدالرشید ارشد: ہیں بڑے مسلمان، ص: ۸۸۱
۳۰ محمد شفیع میاں: ۱۸۵۷ء، ص: ۲۵۵
۳۱ غلام رسول مہر: ۱۸۵۷ء، ص: ۱۰۰
۳۲ ایضاً، ص: ۹۹
۳۳ محمد شفیع میاں: ۱۸۵۷ء، ص: ۲۰۳
۳۴ ایضاً، ص: ۱۹۸

WWW.NAFSEISLAM.COM

۳۵ ایضاً، ص:۱۸۶

۳۶ ایضاً، ص:۳۲۷

۳۷ غلام رسول مہر: ۱۸۵۷ء، ص:۱۵۳

۳۸ ایضاً، ص:۱۵۰

۳۹ عروج عہد انگلشیہ، ص:۷۰۸

۴۰ غلام رسول مہر: ۱۸۵۷ء، ص:۱۵۶

۴۱ وہاب ساور کر، طبع اول، ص:۲۸۰

۴۲ عروج عہد انگلشیہ، ص:۷۰۵

۴۳ غلام رسول مہر: ۱۸۵۷ء، ص:۱۶۱

۴۴ ایضاً، ص:۱۶۰

۴۵ ایضاً، ص:۱۶۲

۴۶ کمال الدین حیدر: قیصر التواریخ، جلد دوم، ص:۳۵۳

۴۷ عروج عہد انگلشیہ، ص:۷۱۹

۴۸ غلام رسول مہر: ۱۸۵۷ء، ص:۳۶۱

۴۹ ایضاً، ص:۳۶۲

۵۰ ایضاً، ص:۲۵۵

۵۱ ایضاً، ص:۲۵۶

۵۲ ایضاً، ص:۲۶۱

۵۳ ایضاً، ص:۲۵۹

۵۴ ایضاً، ص:۳۲۶

۵۵ ایضاً، ص:۱۷۳

۵۶ ایضاً، ص:۳۲۹

۵۷ ایضاً، ص:۱۷۲

۵۸ ایضاً، ص:۳۲۸

۵۹ ایضاً، ص:۳۳۹

۶۰ ایضاً، ص:۳۵۱

Nafse Islam
نفس اسلام
WWW.NAFSEISLAM.COM

خاندان غلاماں

غدارانِ وطن سے باغیانِ اسلام تک

محمد وحید نور

میر صادق و میر جعفر جیسے غداروں کا کردار تاریخ کے تقریباً ہر دور میں رہا ہے۔ جنگ آزادی 1857ء میں گوروں کی اچھل کود اور مظالم کے پس پردہ کچھ ایسے ہی عناصر تھے جو بظاہر تو ہندوستانی معلوم ہوتے تھے لیکن ان کی تمام تر وفاداریاں اور محبتیں برطانوی عاصبوں کے ساتھ تھیں۔ ایسی ہی عناصر خبیثہ میں سے ایک عنصر "خاندان غلاماں" بھی تھا۔ اس خاندان کے جدوں نے 1857ء اور اس سے قبل انگریزوں کی کاسہ لیسی اور خوشنودی کی خاطر "غدارانِ وطن" کا کردار ادا کر کے میر جعفر و میر صادق کو بھی شرما دیا۔ یہی وجہ ہے کہ شاعر مشرق علامہ محمد اقبال جیسے روشن دماغ اور جہاں دیدہ شخص کو بھی یہ کہنا پڑا کہ مرزا قادیانی انگریز کا خود کاشتہ پودا ہے۔ ذیل میں مرزا قادیانی کی اپنی تحریروں سے اس کے خاندان اور اس کی انگریز نوازی ملاحظہ فرمائیں۔

1849ء میں پنجاب پر قبضہ کے وقت کردار:

مارچ 1849ء میں انگریزوں نے پنجاب پر قبضہ کیا تو 2 ماہ بعد جون 1849ء میں مرزا قادیانی نے پنجاب کے مالیاتی کمشنر" ہے ایم رابنسن" کو عریضہ لکھا جس میں پنجاب کے الحاق کے موقع پر اس کے خاندان کی طرف سے کی گئی خدمات کے عوض مدد کی استدعا کی گئی تھی۔ 11 جون 1849ء کو مسٹر رابنسن نے جواب دیا کہ:

"میں نے تمہاری درخواست کا بغور جائزہ لیا ہے۔ جس نے مجھے تمہاری اور تمہارے خاندان کی ماضی کی خدمات اور حقوق یاد دلائے ہیں۔ مجھے بخوبی علم ہے کہ برطانوی حکومت کے وفادار لوگوں کے ساتھ کرم اور تمہارا خاندان یقیناً مخلص، وفادار اور ثابت قدم رہا ہے اور تمہارے حقوق واقعی قابل لحاظ ہیں۔ تمہیں ہر لحاظ سے پُر امید رہنا چاہیے کہ حکومت برطانیہ تمہارے خاندانی حقوق اور خدمات کو کبھی بھی فراموش نہیں کرے گی اور جب بھی کوئی سازگار موقع آیا ان کا خیال کیا جائے گا۔ تم بعہد سرکار انگریزی کے ہوا خواہ اور جانثار رہو کیونکہ اسی میں سرکار کی خوشنودی اور تمہاری بہبود ہے"۔[1]

جنگ آزادی 1857ء میں مسلمانوں سے غداری:

"57ء میں ستاون کے مفسدہ (جنگ آزادی) میں جب کہ بے تمیز لوگوں نے اپنی محسن گورنمنٹ (برطانیہ) کا مقابلہ کر کے ملک میں شور ڈال دیا تب میرے والد بزرگوار نے پچاس (50) گھوڑے اپنی گرہ سے خرید کر کے اور پچاس (50) سوار بہم پہنچا کر گورنمنٹ کی خدمت میں پیش کیے اور پھر ایک دفعہ چودہ (14) سوار سے خدمت گزاری کی اور انہی مخلصانہ خدمات کی وجہ سے وہ اس گورنمنٹ میں ہر دلعزیز ہو گئے۔ چنانچہ گورنر جنرل کے دربار میں عزت کے ساتھ ان کو کرسی ملتی تھی اور ہر ایک درجہ کے حکام انگریزی بڑی عزت اور لجاجت سے پیش آتے تھے" ۔ ج

نسل در نسل ملت فروشی:

"میں ایک ایسے خاندان سے ہوں کہ جو اس گورنمنٹ کا پکا خیر خواہ ہے۔ میرا والد مرزا غلام مرتضیٰ گورنمنٹ کی نظر میں ایک وفادار اور خیر خواہ آدمی تھا" جن کو دربار گورنری میں کرسی ملتی تھی اور جن کا ذکر مسٹر گریفن صاحب نے تاریخ رئیسان پنجاب میں کیا ہے اور 1857ء میں انہوں نے اپنی طاقت سے بڑھ کر سرکار انگریز کو مدد دی تھی یعنی پچاس سوار اور گھوڑے بہم پہنچا کر عین زمانہ غدر کے وقت سرکار انگریزی کو امداد میں دیے تھے..... پھر میرے والد صاحب کی وفات کے بعد میرا بڑا بھائی مرزا غلام قادر خدمات سرکاری میں مصروف رہا اور جب حملوں کے گزر پر مفسدوں کا سرکار انگریزی کی فوج سے مقابلہ ہوا تو وہ سرکار انگریزی کی طرف سے لڑائی میں شریک تھا"۔ ج

مرزا عبدالرحیم کے بقول 1857ء کی "خدمات":

"اس خاندان نے غدر 1857ء کے دوران بہت اچھی خدمات کیں۔ غلام مرتضیٰ نے بہت سے آدمی بھرتی کیے اور اس کا بیٹا غلام قادر جنرل نکلسن صاحب بہادر کی فوج میں اس وقت تھا جبکہ دہلی محصور تھا۔ جموں گھاٹ پر نمبر 48 نیٹو انفنٹری کے باغیوں کو جو سیالکوٹ سے بھاگے تھے تہ تیغ کیا تھا۔ جنرل نکلسن صاحب بہادر نے غلام قادر (بڑا بھائی مرزا قادیانی) کو ایک سند دی جس میں یہ لکھا ہے کہ 1857ء میں خاندان قادیاں ضلع گورداسپور کے تمام دوسرے خاندانوں سے زیادہ ملک حلال رہا"۔ ج

مرزا کے باپ کو انگریز کمشنر کا خط اور رقم کی ادائیگی:

جنگ آزادی کے بعد 20 ستمبر 1858ء کو کمشنر لاہور "رابرٹ کسٹ" کی جانب سے مرزا غلام احمد قادیانی

کے باپ مرزا غلام مرتضیٰ کو درج ذیل خط موصول ہوا:

"شروع مفسدہ (جنگ آزادی) سے آج تک آپ بدل ہوا خواہ سرکار رہے اور باعث خوشنودی سرکار ہوا لہٰذا جاگیر خواہی اور خیر نگالی خلعت مبلغ دو صد روپیہ سرکار سے آپ کو عطا ہوتا ہے اور حسب منشاء چٹھی چیف کمشنر بہادر نمبری 567 مورخہ 10 اگست 1858ء پروانہ ہذا باظہار خوشنودی سرکار اور نیک نامی و وفاداری بنام آپ کے لکھا جاتا ہے۔ مرقومہ تاریخ 20 ستمبر 1858ء"۔ ۵

مرزا کے خاندان کی بہبود انگریز کے قدموں:

عبدالرحیم درد قادیانی "ایک خط کا حوالہ دیتے ہوئے لکھتا ہے کہ "جنرل نکلسن نے اپنی موت سے ایک ماہ قبل اگست 1858ء کو مرزا غلام قادر کو لکھا" جیسا کہ تم نے اور تمہارے گھرانے نے عظیم ترین اخلاص اور وفاداری سے 1857ء کی بغاوت کچلنے میں تربیوں گھاٹ، میرٹھ اور دوسری جگہوں پر حکومت کی امداد کی ہے اور اپنے آپ کو حکومت کا مکمل وفادار ثابت کیا ہے اور اپنی جیب سے پچاس سواروں اور گھوڑوں سے حکومت کی امداد کی ہے لہٰذا تمہاری وفاداری اور بہادری کے اعتراف میں تمہیں یہ پروانہ جاری کیا ہے جسے تم سنبھال کر رکھنا۔ حکومت اور اس کے اہلکار ہمیشہ تمہاری خدمات، حقوق اور جو اخلاص تم نے حکومت کے بارے میں دکھلایا ہے" کا ہمیشہ خیال رکھیں گے۔ باغیوں کو کچلنے کے بعد میں تمہارے گھرانے کی بہبود کی طرف خیال کروں گا۔ میں نے گورداسپور کے اپنے کمشنر مسٹر لبت کو لکھا ہے جس میں تمہاری خدمات کی طرف اس کی توجہ مبذول کروائی ہے"۔ ۶

مرزا سیالکوٹ کچہری میں بطور منشی اور پادریوں سے تعلقات استوار:

مرزا غلام مرتضیٰ نے اپنے لڑکے بیٹے مرزا غلام قادیانی کو انگریز آقاؤں کی سفارش کی بدولت 1864ء میں سیالکوٹ کچہری میں ملازم کروادیا۔ یہاں مرزا صاحب نکلسن کی تم اور عیسائی پادریوں سے تعلقات استوار کرنے میں زیادہ مصروف رہے۔ یہاں تک کہ اسکاٹ لینڈ کے پادری اور انجیلی مشن کارکن "بٹلر ایم اے" سے مرزا بہت قریب ہو گیا۔

بقول مرزا بشیر الدین محمود "اس وقت پادریوں کا بڑا رعب تھا لیکن جب سیالکوٹ کا انچارج مشنری ولایت جانے لگا تو حضرت صاحب سے ملنے کے لیے خود کچہری آیا۔ اپنی کمشنر سے دیکھ کر اس کے استقبال کے لیے آیا اور دریافت کیا کہ آپ کس طرح تشریف لائے؟ کوئی کام ہو تو ارشاد فرمائیں۔ مگر اس نے کہا میں صرف آپ کے اس

نشی سے ملنے آیا ہوں۔ یہ ثبوت ہے اس امر کا کہ آپ کے مخالف بھی تسلیم کرتے تھے کہ یہ ایک ایسا جوہر ہے جو قابل قدر ہے"۔ ہے

حیرانگی کی بات ہے کہ ایک طرف تو پادری پورے برصغیر میں عیسائیت پھیلنے میں پر جوش طریقے سے مصروف تھے اور دن رات مناظرے ہو رہے تھے تو دوسری طرف مرزا قادیانی کے پاس کون سی کستوری لینے کے لیے عیسائی پادری اور انگلش جنس رکن کا جانا ہوا؟ ہے کوئی ذی فہم قادیانی جو اس "جوہر" کی تفصیل بیان فرمائے ؟؟؟

انگریزوں کا منظور نظر مرزا قادیانی:

1868ء میں ایک عربی محمد صالح ہندوستان آیا جو اسسٹنٹ کمشنر ایکٹ کی خلاف ورزی اور جاسوسی کے جرم میں گرفتار ہو گیا اور اس سے سیالکوٹ کچہری کے ڈپٹی کمشنر "برکھر" نے تفتیش شروع کی۔ اس کیس میں مرزا قادیانی کی خدمات بطور مترجم حاصل کی گئیں۔ ہے

محمد صالح سے تفتیشی سوال و جواب کے دوران مرزا قادیانی ہندوستان میں برطانوی حکومت کے جواز پر دلائل دیتا رہا اور اس کا دفاع کرتا رہا۔ مرزا کی اس شیطانی حرکت نے ڈپٹی کمشنر کے دل میں گھر کر لیا۔ برکھر اپنی کمشنر ہونے کے ساتھ ساتھ "فری میسن" بھی تھا۔

اس "ادائے دلبرانہ" کے کچھ عرصہ بعد ہی مرزا قادیانی بغیر کسی معقول وجہ کے 1868ء میں سیالکوٹ کچہری سے نشی کی ملازمت چھوڑ کر واپس چلا گیا۔ گویا کہ اسے منظوری کا اشارہ ہو چکا تھا اور وہ اگلے مرحلے میں شمولیت کے لیے یہاں سے روانہ ہوا۔ جس دن مرزا قادیانی سیالکوٹ سے قادیان روانہ ہوا تو اپنی کمشنر نے اس کے اعزاز میں تعطیل کر دی۔ (واہ رے قادیانی دجال! ان 1864ء تا 1868ء کے 4 سالوں میں مرزا نے کون سی ایسی خدمت سرانجام دی تھی کہ بوقت رخصت انگریز افسر نے تعطیل کیا تھا۔ پڑھ پڑھ)

انگریزوں کی جانب سے جنگ آزادی کی وجوہات پر غور:

1858ء تا 1870ء کے عرصہ میں انگریزوں نے جنگ آزادی کی وجوہات جاننے اور ان پر غور و فکر کر کے مستقبل کی حکمت عملی طے کرنے کا پلان بنایا۔

(ولیم ڈبلیو ہنٹر نے اپنی کتاب Our Indian Muslim (ہمارے ہندوستانی مسلمان) نامی کتاب میں برطانوی استعمار کے استحکام میں سب سے بڑی رکاوٹ جہاد کو قرار دیا۔ چنانچہ وہ لکھتا ہے کہ" جب تک مسلمانوں میں جہاد کا تصور اور روح باقی ہے اس وقت تک برطانوی حکومت ہندوستان میں مستحکم نہیں ہو سکتی"۔ !!

ہندوستانی مسلمانوں کی نفسیات جانچنے کے لیے وفد:

1869ء میں برطانوی پارلیمنٹ کے ارکان انتخابات کے ایڈیٹروں اور پادریوں پر مشتمل ایک وفد "سر ولیم" کی قیادت میں ہندوستان آیا تاکہ وہ اس بات کو جانچ سکے کہ ہندوستانی مسلمانوں کو کس طرح رام کیا جا سکتا ہے؟ ہندوستانی عوام اور بالخصوص مسلمانوں میں وفاداری کیسے پیدا کی جا سکتی ہے؟ یہ وفد ایک سال ہندوستان رہا۔ 1870ء میں اس وفد کی واپسی پر وائٹ ہال لندن میں اجلاس منعقد ہوا جس میں وفد کے سربراہ سر ولیم نے رپورٹ پیش کی کہ "مذہبی نقطہ نظر کی حیثیت سے مسلمان کسی دوسری قوم کی حکومت کے زیر سایہ نہیں رہ سکتے۔ ایسے حالات میں وہ جہاد کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔ ان کا یہ جذبہ کسی وقت بھی انہیں ہمارے خلاف ابھار سکتا ہے"۔ [1]

خود ساختہ نبی کی سفارش:

اسی وفد نے The Arrival of British empire in India (ہندوستان میں برطانوی سلطنت کی آمد) کے عنوان سے دو رپورٹیں دیں۔ جن میں سے ایک درج ذیل ہے۔

"ہندوستانی مسلمانوں کی اکثریت اپنے پیروں اور روحانی رہنماؤں کی اندھی تقلید کرتی ہے۔ اگر اس موقع پر ہمیں کوئی ایسا شخص مل جائے جو ظلی نبوت (حواری نبی) کا اعلان کر کے اپنے گرد پیروکاروں کو اکٹھا کرے لیکن اس مقصد کے لیے اس کو عوام کی مخالفت کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اس شخص کی نبوت کو حکومت کی سرپرستی میں پروان چڑھا کر برطانوی حکومت کے لیے مفید کام لیا جا سکتا ہے۔ ہم نے مقامی حکومتوں کو پہلے ہی ایسی ہدایات دی ہوئی ہیں کہ غداروں سے معاونت حاصل کی جائے" اس وقت مسیح غداری ہوئی تھی اور صور تحال اور تھی، لیکن اب ہم نے ہندوستان کے طول و عرض میں ایسے انتظامات کر لیے ہیں، ملک میں ہر طرف امن و امان ہے۔ ملک کی اندرونی بدامنی سے نمٹنے کے لیے ایسے وقتاً فوقتاً کیے جاتے ہیں جو ملک میں اندرونی بدامنی پیدا کریں گے"۔ [2]

تلاش:

برطانوی شرو فاخوں نے ہندوستان میں ایسے شخص کے انتخاب کے لیے ہدایات جاری کیں۔ پنجاب کے گورنر نے اس کام کی ڈیوٹی ڈپٹی کمشنر سیالکوٹ کے ذمہ لگائی۔ چنانچہ برطانوی معیار کے مطابق خود ساختہ نبی کی تلاش کا کام شروع ہوا۔ آخر کار قرعہ فال مرزا غلام قادیانی کے نام نکلا۔

بقول آغا شورش کشمیری "برطانوی ہند کی سنٹرل انٹیلی جنس کی روایت کے مطابق ڈپٹی کمشنر سیالکوٹ نے چار

اخلاص کو انٹرویو کے لیے طلب کیا۔ ان میں سے مرزا غلام احمد قادیانی نبوت کے لیے نامزد کیے گئے"۔ [۱۴]

مرزا قادیانی تو اس رپورٹ سے قبل ہی ڈپٹی کمشنر سیالکوٹ کے منظورِ نظر ہو چکا تھا۔ اسی لیے باقی تین اخلاص کیسے منتخب ہو سکتے تھے؟ ڈپٹی کمشنر مرزا قادیانی کے اسرار و رموز اور مہارت پادری بٹلر سے ملاقات اور محمد صالح سے تفتیش کے وقت اچھی طرح جان چکا تھا۔

1876ء میں مرزا کے باپ کی موت:

مرزا قادیانی کا باپ مرزا غلام مرتضیٰ 1876ء میں مرا تو اس کی اطلاع 29 جون 1876ء کو مرزا کے بھائی غلام قادر نے کمشنر مالیات جالندھر "ڈویژن" کو دی جس کا جواب اس نے یوں دیا "مشفق مہربان دوست مرزا غلام قادر حفظہ اللہ رئیس قادیان۔ آپ کا خط دو ماہ حال کا لکھا ہوا ملا۔ حضور اس جانب میں گزرا۔ مرزا غلام مرتضیٰ صاحب آپ کے والد کی وفات سے ہم کو بہت افسوس ہوا۔ مرزا غلام مرتضیٰ سرکار انگریز کا اچھا خیر خواہ اور وفادار رئیس تھا۔ ہم آپ کی خاندانی لحاظ سے اسی طرح عزت کریں گے جس طرح تمہارے باپ وفادار کی کی جاتی تھی۔ ہم کو کسی اچھے موقع کے نکلنے پر تمہارے خاندان کی بہتری اور بھائی کا خیال رہے گا"۔ [۱۵]

مرزا کا باپ انگریزوں کا نوڈی:

● والد صاحب مرحوم اس ملک کے معزز زمینداروں میں سے شمار کیے جاتے تھے۔ گورنری دربار میں ان کو کرسی ملتی تھی اور گورنمنٹ برطانیہ کے وہ سچے شکر گزار اور خیر خواہ تھے"۔ [۱۶]

● میرے والد صاحب مرحوم کی خدمات میں سے وہ خدمات کسی طور پر الگ نہیں ہو سکتیں جو وہ خلوص دل سے اس گورنمنٹ کی خیر خواہی میں بجا لائے۔ انہوں نے اپنی حیثیت اور مقدرت کے موافق ہمیشہ گورنمنٹ برطانیہ کی خدمت گزاری میں اپنی کی مختلف حالتوں اور ضرورتوں کے وقت وہ صدق اور وفاداری دکھلائی کہ جب تک انسان سچے دل اور تہہ دل سے کسی کا خیر خواہ نہ ہو ہرگز دکھلا نہیں سکتا"۔ [۱۷]

مرزا کے بڑے بھائی کی اطاعت انگریز:

● مرزا قادیانی کا بڑا بھائی مرزا غلام قادر 1883ء کو فوت ہوا تو مرزا نے اپنے بھائی کی جانب سے برطانوی سامراج کی مخلصانہ خدمت کے ضمن میں لکھا "اس عاجز کا بڑا بھائی مرزا غلام قادر جس مدت تک زندہ رہا اس نے بھی اپنے والد مرحوم کے قدم بقدم رکھا اور گورنمنٹ (برطانیہ) کی مخلصانہ خدمت میں بدل و جان مصروف رہا۔

پھر وہ بھی اس مسافر خانہ سے گزر گیا"۔ [18]

● انہوں (والد) نے میرے بھائی کو صرف گورنمنٹ کی خدمت گزاری کے لیے بعض لڑائیوں پر بھیجا اور ہر ایک باب میں گورنمنٹ کی خوشنودی حاصل کی اور اپنی تمام عمر نیک نامی کے ساتھ بسر کر کے اس ناپائیدار دنیا سے گئے"۔ [19]

ملکہ وکٹوریہ کی تحریک پر مرزا کی آمد:

"اے بابرکت قیصرہ ہند (ملکہ وکٹوریہ) تجھے یہ تیری عظمت اور نیک نامی مبارک ہو۔ خدا کی نگاہیں اس ملک پر ہیں۔ خدا کی رحمت کا ہاتھ اس ربانی کنبہ پر ہے جس میں تیرا باپ ہے۔ تیری ہی پاک نیتوں کی تحریک سے خدا نے مجھے بھیجا ہے تا کہ پرہیزگاری اور پاک اخلاق اور صلح کاری کی راہوں کو دوبارہ دنیا میں قائم کروں"۔ [20]

انگریز کا خود کاشتہ پودا:

"یہ التماس ہے کہ سرکار دولت مدار اپنے خاندان کی نسبت جس کو پچاس سال کی متواتر تجربہ سے ایک وفادار جاں نثار خاندان ثابت کر چکی اور جس کی نسبت گورنمنٹ عالیہ (برطانیہ) کے معزز حکام نے ہمیشہ مستحکم رائے سے اپنی تحریرات میں یہ گواہی دی ہے کہ وہ قدیم سے سرکار انگریزی کے خیر خواہ اور خدمت گزار ہیں۔ اس خود کاشتہ پودے کی نسبت نہایت جزم و احتیاط سے اور تحقیق و تدقیق سے کام لے اور اپنے ماتحت حکام کو اشارہ فرمائے کہ وہ بھی اس خاندان کی ثابت شدہ وفاداری اور اخلاص کا لحاظ رکھ کر مجھے اور میری جماعت کو عنایت و حمایت کی نظر سے دیکھیں"۔ [21]

مرزا کی مسیحیت کی حقیقت:

"اس (خدا تعالیٰ) نے اپنے قدیم وعدہ کے موافق جو مسیح موعود کے آنے کی نسبت تھا۔ آسمان سے مجھے بھیجا تا کہ میں اس مرد خدا کے رنگ میں ہو کر جو بروز اتم میں پیدا ہوا اور ناصرا میں پرورش پائی۔ حضور ملکہ معظمہ (وکٹوریہ) کے نیک اور بابرکت مقاصد کی اعانت میں مشغول ہوں۔ اس نے مجھے بے اختیار کتوں کے ساتھ چھوا اور اچھا مسیح بنایا تا کہ ملکہ معظمہ (وکٹوریہ) کے پاک اغراض کو خود آسمان سے مدد دے"۔ [22]

مرزا کے مذہب کا حصہ سلطنت برطانیہ کی اطاعت:

"سو میرا مذہب جس کو میں بار بار ظاہر کرتا ہوں یہی ہے کہ اسلام کے دو حصے ہیں۔ ایک یہ کہ خدا تعالیٰ کی

اطاعت کریں دوسرے اس سلطنت کی جس نے امن قائم کیا ہو جس نے ظالموں کے ہاتھ سے اپنے سایہ میں ہمیں پناہ دی ہو۔ سو وہ سلطنت برطانیہ ہے"۔ ۳۳

﴿مرزا قادیانی انگریزی مقاصد کی تکمیل میں﴾

درج بالا حوالہ جات مرزا قادیانی کے سینکڑوں ادبیات ظرافات میں سے چند ایک ہیں جن کا حاصل یہ ہے کہ 1857ء کے بعد انگریزوں نے حالات پر غور کرنا شروع کیا اور جلد ہی اس نتیجے پر پہنچے کہ جب تک مسلمانوں میں جذبہ جہاد موجود ہے ہم ان کو زیر نہیں کر سکتے۔ چنانچہ جذبہ جہاد کو ختم کرنے کے لیے حکم جہاد کو منسوخ کرنا ہوگا اور وہ اسی وقت ممکن ہو سکتا ہے جب قرآن کریم یا نبی علیہ السلام کے فرمان سے ثابت ہو۔ یہ دونوں صورتیں ناممکن نظر آئیں تو مسیلمہ کذاب کی تاریخ کو دیکھتے ہوئے ایک ایسے شخص کی تلاش کی گئی جو دعوی نبوت کرے اور اپنا حلقہ اثر بڑھائے یہاں تک کہ حکم جہاد کو منسوخ کر دیا۔ اس ناپاک مقصد کی تکمیل کے لیے انہیں قادیان کے معلل برلاس خاندان سے زیادہ اس وقت پورے ہندوستان میں کوئی دوسرا گھرانہ نظر نہ آیا چنانچہ مرزا قادیانی کو خاتمیت کا تاج پہنا کر میدان عمل میں اتار دیا گیا۔

دجال قادیان مرزا قادیانی نے شروع میں تو خود کو ایک عالم "مبلغ" خادم دین اور مناظر کے طور پر پیش کیا۔ جب اس کے گرد لوگ اکٹھا ہونا شروع ہو گئے تو اس نے کچھ کی چال چلتے ہوئے 1885ء میں مجدد وقت اور مصلح ہونے کا دعوی کیا۔ مرزا کے بقول تجدید دین کا منصب اسے مثیل مسیحا کی حیثیت سے دیا گیا ہے اور مثیل مسیح ایسا شخص ہوتا ہے جو سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کی طرح ہو۔

یکم دسمبر 1888ء کو مرزا نے اعلان کیا کہ اسے خدا نے بیعت اور جماعت بنانے کا حکم دیا ہے۔ چنانچہ اس نے 23 مارچ 1889ء کو اولہ عیانہ میں بیعت کی اور مخلص صادق مسلمان نے سب سے پہلے بیعت کی۔ اسی طرح اپنی جماعت کو آیت قرآنی ﴿ومبشرا برسول یاتی من بعدی اسمہ احمد﴾ میں ذکر کردہ "احمد" کی طرف دجل و تلبیس سے نسبت کر کے "احمدیہ جماعت" کے نام سے معنون کیا۔

1891ء تا 1901ء میں مرزا قادیانی نے مسیح موعود اور ظلی و بروزی نبی کی اصطلاح میں دعوی نبوت کیا اور 1901ء تا 1908ء کے دور میں لفظ نبی کے مکمل معنوں کو خود پر چسپاں کیا اور باقاعدہ وحی اور الہام کا دعوی کیا۔ پارٹیوں کے مجموعے مرزا قادیانی نے دعووں کی اس قدر بھرمار کی ہے کہ محتاط سے محتاط اندازے کے مطابق بھی اس لعین کے دعووں کی تعداد 50 سے 200 تک ہے۔

بلکہ اس سے دو سو صفحوں کے دفتر بیدار مرزا قادیانی کی تمام تحریروں اور ان ترانوں کا بنظر غائر مطالعہ کیا جائے تو اس کی تحریک یا جماعت کے دو بنیادی مقاصد سامنے آتے ہیں۔

❶ تنسیخ جہاد

❷ اطاعت برطانیہ

برطانوی گماشتوں کی اطاعت اور خوشنودی کے کئی حوالے آپ سابقہ صفحات میں پڑھ چکے ہیں یہاں مزید ذکر کی ضرورت نہیں البتہ تنسیخ جہاد کے متعلق مرزا کے چند تحریرات و ملفوظات ملاحظہ فرمائیں۔

انگریز کی اطاعت و ہمدردی اور ممانعت جہاد:

"پھر میں اپنے والد اور بھائی کی وفات کے بعد ایک گوشہ نشین آدمی تھا۔ تاہم ستر ہ برس سے سرکار انگریزی کی امداد اور تائید میں اپنی قلم سے کام لیتا ہوں۔ اس ستر ہ برس کی مدت میں جس قدر میں نے کتابیں تالیف کیں ان سب میں سرکار انگریزی کی اطاعت اور ہمدردی کے لیے لوگوں کو ترغیب دی اور جہاد کی ممانعت بارے میں نہایت موثر تقریریں لکھیں اور پھر میں نے ترین مصلحت سمجھ کر امر ممانعت جہاد کو عام ملکوں میں پھیلانے کے لیے عربی اور فارسی میں کتابیں تالیف کیں جن کی چھپوائی اور اشاعت پر ہزار ہا روپیہ خرچ ہوئے اور وہ تمام کتابیں عرب اور بلاد شام اور روم اور مصر اور بغداد اور افغانستان میں شائع کی گئیں۔ میں یقین رکھتا ہوں کہ کسی نہ کسی وقت ان کا اثر ہوگا۔ کیا اس قدر بڑی کامیابی اور اس قدر دور دراز مدت تک ایسے انسان سے ممکن ہے جو دل میں بغاوت کا ارادہ رکھتا ہو؟ پھر میں پوچھتا ہوں کہ جو کچھ میں نے سرکار انگریزی کی امداد اور حفظ امن اور جہاد کی خیالات کے روکنے کے لیے برابر ستر ہ سال تک پورے جوش سے پوری استقامت سے کام لیا۔ کیا اس کام کی اور اس خدمت نمایاں کی اور اس مدت دراز کی دوسرے مسلمانوں میں جو ہمارے مخالف ہیں کوئی نظیر ہے؟ اگر میں اپنے پیارا شاعت گورنمنٹ انگریزی کی سچی خیر خواہی سے نہیں کی تو مجھے ایسی کتابیں عرب اور بلاد شام اور روم وغیرہ بلاد اسلامیہ میں شائع کرنے سے کس سے انعام کی توقع تھی؟" ۲۳

مرزا کی ممانعت جہاد میں کتابیں:

"یہ سلسلہ ایک دو دن کا نہیں بلکہ برابر ستر ہ سال کا ہے اور اپنی کتابوں اور رسالوں کے جن جن مقامات میں میں نے یہ تحریریں لکھی ہیں ان کتابوں کے نام معہ ان کے نمبر صفحوں کے یہ ہیں' جن میں سرکار انگریز کی خیر خواہی اور اطاعت کا ذکر ہے۔

نمبر	نام کتاب	تاریخ طبع	نمبر صفحہ
1	براہین احمدیہ حصہ سوم	1882ء	الف سے ب تک (شروع کتاب)
2	براہین احمدیہ حصہ چہارم	1884ء	الف سے د تک
3	آریہ دھرم (نوٹس) ور بارہ توسیع دفعہ 298	22 ستمبر 1895ء	57 سے 64 تک آخر کتاب
4	التماس شامل آریہ دھرم ایضاً	22 ستمبر 1895ء	1 سے 4 تک آخر کتاب
5	درخواست شامل آریہ دھرم ایضاً	22 ستمبر 1895ء	69 سے 72 تک آخر کتاب
6	خلاصہ بارہ توسیع دفعہ 298	21 اکتوبر 1895ء	1 سے 8 تک
7	آئینہ کمالات اسلام	فروری 1893ء	17 سے 20 تک اور 511 سے 528
8	نور الحق حصہ اول (اعلان)	1311ھ	23 سے 54 تک
9	شہادۃ القرآن (کرامت کی تعریف کے واسطے)	22 ستمبر 1893ء	الف سے ج تک آخر کتاب
10	نور الحق حصہ دوم	1311ھ	49 سے 50 تک
11	سر الخلافہ	1312ھ	71 سے 73 تک
12	اتمام الحجہ	1311ھ	25 سے 27 تک
13	حمایۃ البشریٰ	1311ھ	39 سے 42 تک
14	تحفہ قیصریہ	25 مئی 1897ء	تمام کتاب
15	ملک بکی	نومبر 1895ء	153 سے 154 تک بالمقابل پیج
16	انجام اعظم	جنوری 1897ء	283 سے 284 تک آخر کتاب
17	سراج منیر	مئی 1897ء	صفحہ 74
18	تکمیل تبلیغ معہ شرائط بیعت	12 جنوری 1889ء	صفحہ 4 حاشیہ اور صفحہ 6
19	اشتہار واسطے قبولیت گورنمنٹ اور عام اطلاع کے لیے	27 فروری 1895ء	تمام اشتہار یکطرفہ
20	اشتہار دربارہ سفیر سلطان روم	24 مئی 1897ء	1 سے 3 تک

WWW.NAFSEISLAM.COM

21	اشتہار جلسہ احباب برجشن جوبلی	23 جون 1897ء	1 سے 4 تک
22	اشتہار جلسہ شکریہ جشن جوبلی حضرت قیصرہ	7 جون 1897ء	تمام اشتہار یک ورقی
23	اشتہار متعلق بزرگ	25 جون 1897ء	صفحہ 10
24	اشتہار لائق توجہ گورنمنٹ	10 دسمبر 1894ء	تمام اشتہار 1 سے 7 تک

مخالفت جہاد اور اطاعت انگریز پر مشتمل 50 الماریاں:

"میری عمر کا اکثر حصہ اس سلطنت انگریزی کی تائید اور حمایت میں گزرا ہے اور میں نے مخالفت جہاد اور انگریزی اطاعت کے بارے میں اس قدر کتابیں لکھی ہیں اور اشتہار شائع کیے ہیں کہ اگر وہ رسائل اور کتابوں کو تمام ممالک عرب اور مصر اور شام اور کابل اور روم تک پہنچا دیا جائے۔ میری ہمیشہ کوشش رہی ہے کہ مسلمان اس سلطنت کے بے غرض خواہ ہو جائیں اور مہدی خونی اور مسیح خونی کی بے اصل روایتیں اور جہاد کے جوش دلانے والے مسائل جو احمقوں کے دلوں کو خراب کرتے ہیں ان کے دلوں سے معدوم ہو جائیں"۔ [28]

برطانیہ جیسا امن وسکون نہ مکہ میں نہ مدینہ:

"یہ امن جو اس سلطنت کے زیر سایہ ہمیں حاصل ہے۔ نہ یہ امن مکہ معظمہ میں مل سکتا ہے نہ مدینہ میں اور نہ سلطان روم کے پایہ تخت قسطنطنیہ میں"۔ [29]

مرزا کو مہدی و مسیح ماننا جہاد کا انکار کرنا:

"میں یقین رکھتا ہوں کہ جیسے جیسے میرے مرید بڑھیں گے ویسے ویسے مسئلہ جہاد کے معتقد کم ہوتے جائیں گے کیونکہ مجھے مسیح اور مہدی مان لینا ہی مسئلہ جہاد کا انکار کرنا ہے"۔ [30]

گورنمنٹ برطانیہ پر خونی حرامی و بدکار ہونا:

"بعض احمق اور نادان سوال کرتے ہیں کہ اس گورنمنٹ سے جہاد کرنا درست ہے یا نہیں؟ سو یاد رہے کہ یہ سوال ان کا نہایت حماقت کا ہے کیونکہ جس کے احسانات کا شکر کرنا عین فرض اور واجب ہے اس سے جہاد کیسا؟ میں سچ سچ کہتا ہوں کہ محسن کی بدخواہی کرنا ایک حرامی اور بدکار آدمی کا کام ہے"۔ [31]

مذہبی جنگوں کا سخت مخالف:

"ہم ان تمام مذہبی جنگوں کے سخت مخالف ہیں جو جہاد کے طور پر تلوار سے کی جاتی ہیں"۔ [32]

WWW.NAFSEISLAM.COM

ممانعت جہاد:

"اب چھوڑ دو جہاد کا اے دوستو خیال
دیں کے لیے حرام ہے اب جنگ اور قتال
اب آگیا مسیح جو دیں کا امام ہے
دیں کی تمام جنگوں کا اب اختتام ہے
اب آسماں سے نور خدا کا نزول ہے
اب جنگ اور جہاد کا فتویٰ فضول ہے
دشمن ہے وہ خدا کا جو کرتا ہے اب جہاد
منکر نبی کا ہے جو یہ رکھتا ہے اعتقاد"[۳۲]

دجال قادیاں اور اس کی جماعت:

● "جو لوگ میرے ساتھ مریدی کا تعلق رکھتے ہیں وہ ایک ایسی جماعت تیار ہو جاتی ہے کہ جن کے دل اس گورنمنٹ کی سچی خیر خواہی سے لبالب ہیں۔ ان کی اخلاقی حالت اعلیٰ درجے پر ہے اور میں خیال کرتا ہوں کہ وہ تمام اس ملک کے لیے بڑی برکت ہیں اور گورنمنٹ کے لیے دلی جان نثار ہیں"۔[۳۳]

● "میرا گروہ ایک سچا خیر خواہ اس گورنمنٹ کا بن گیا ہے جو پنجاب اور ہندوستان میں اول درجہ پر جوش اطاعت رکھتے ہیں جس سے مجھے بہت خوشی ہوئی"۔[۳۴]

انگریز کا شتہ گرد انگریزی فرشتہ:

"ایک فرشتہ کو میں نے تین برس کے لڑکوں کی شکل میں دیکھا۔ صورت اس کی مثل انگریزوں کے تھی اور میز کرسی لگائے بیٹھا ہے۔ میں نے اس سے کہا کہ آپ بہت ہی خوبصورت ہیں۔ اس نے کہا کہ ہاں میں درستی ہوں"۔[۳۵]

مرزا قادیانی پر انگریزی "وحی":

● "I Love you, I am with You. yes I am happy. I Can, what I will do. We can, what we will do.God is coming by His army. He is with you to kill enemy. The days shall come when God shall

help you. Glory to be the Lord. God maker of earth and heaven.

ترجمہ: میں تم سے محبت کرتا ہوں۔ میں تمہارے ساتھ ہوں۔ ہاں میں خوش ہوں۔ زندگی دکھ کی (یعنی موجودہ زندگی تمہاری تکلیف کی زندگی ہے) میں تمہاری مدد کروں گا۔ میں کر سکتا ہوں جو چاہوں کام کر سکتے ہیں جو چاہیں گے۔ خدا تمہاری طرف ایک لشکر کے ساتھ چلا آتا ہے۔ وہ دشمن کو ہلاک کرنے کے لیے تمہارے ساتھ ہے۔ وہ دن آتے ہیں کہ خدا تمہاری مدد کرے گا۔ خدائے ذوالجلال آفریدگار زمین و آسمان"۔ [۵]

- "You must do what I told you.

تم کو وہ کرنا چاہیے جو میں نے فرمایا ہے۔

- Though all man should be angry but God is with you. He shall help you. Words of God cannot exchange.

اگر چہ تمہارے آدمی ناراض ہوں گے لیکن خدا تمہارے ساتھ ہوگا۔ وہ تمہاری مدد کرے گا۔ اللہ کی کلام بدل نہیں سکتی۔

- I shall help you.

میں تیری مدد کروں گا۔

- You have to go Amiritsar.

تمہیں امرتسر جانا ہوگا۔

- He halts in the Zilla Peshawar.

وہ ضلع پشاور میں قیام کرتا ہے"۔ [۶]

آپ خود ہی اپنی اداؤں پر غور کیجیے

ان معروضات کے بعد کسی بھی صحیح العقیدہ سنی مسلمان کو قادیانیوں کی اصلیت جاننے میں کوئی دشواری نہیں ہوگی۔ یہاں ہم نے مرزا قادیانی اور اس کے خاندان کے انگریزوں سے تعلقات اور خدمات کے متعلق گفتگو کی ہے نہ کہ عقائد کے متعلق۔ قادیانی کرم فرماؤں کو دعوت خاص ہے کہ وہ اپنے آقا کی ان عبارات کا بنظر غائر مطالعہ فرمائیں اور فیصلہ کریں کہ وہ خود کو جہنم کے کس گڑھے کی طرف دھکیل رہے ہیں۔ مرزا قادیانی اور اسی کے آباؤ واجداد انگریز کی جوتیاں چاٹتے رہے اور آج اس کی باقی ماندہ ذریت بھی اپنی مادر کے آغوش میں پل بھر رہی ہے۔ کم

وہیں ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاء کرام علیہم السلام کو ان کی زبان میں ہی وحی ہوئی لیکن مرزا اقادیانی کو کیا ہوا کہ اس کی زبان تو اردو ہے لیکن اسے نام نہاد "وحی" انگریزی میں آتی ہے۔ ناچاہتے ہوئے بھی ہمیں ماننا پڑے گا کہ انگریزی وحی بھیجنے والا بھی کوئی انگریز ہی ہوگا نہ کہ اللہ رب العزت۔ ویسے بھی جس قسم کی خرافات مرزا نے جان کی ہیں ایسی واہیات اور بازاری زبان اللہ رب العزت تو کجا کوئی شریف آدمی بھی استعمال نہیں کر سکتا۔ مرزائی مرزا کے اس فرمان کو بھی مدنظر رکھیں کہ "یہ بالکل غیر معقول اور بے ہودہ امر ہے کہ انسان کی اصل زبان تو کوئی ہو اور الہام اس کو کسی اور زبان میں ہو جس کو وہ سمجھ نہیں سکتا کیونکہ اس میں تکلیف مالا یطاق ہے"۔ ۳۷ "اور" میں (مرزا) انگریزی خوان نہیں ہوں اور بکلی اس زبان سے ناواقف ہوں"۔ ۳۸

(مصادر وحوالہ جات)

۱) کشف الغطاء، ص: 5

۲) شہادت القرآن، ص: 84

۳) کتاب البریہ، ص: 3، اشتہار مورخہ 20 ستمبر 1897ء

۴) حیات احمد (انگریزی)، عبدالرحیم درد قادیانی، ص: 14

۵) شہادت القرآن، ص: 9

۶) حیات احمد (انگریزی)، عبدالرحیم درد قادیانی، ص: 15

۷) الفضل قادیان، 24 اپریل 1934ء

۸) کہا جاتا ہے کہ اس کے پاس حرمین شریفین کے بعض مفتیان کرام کا فتویٰ تھا جس میں ہندوستان کو دارالحرب ثابت کیا گیا تھا۔ انگریز کے مخبروں نے آپ کے اختیار میں لے کر گرفتار کروا دیا اور آپ پر ایسٹر ریشن کی خلاف ورزی اور جاسوسی کے الزامات عائد کر دیے۔

۹) بعض نے "پارکنسن" بھی لکھا ہے۔

۱۰) مجدد اعظم، ڈاکٹر بشارت احمد قادیانی، ص: 42

۱۱) ہمارے ہندوستانی مسلمان، ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر

۱۲) رپورٹ، انڈیا آفس لائبریری لندن

۱۳) ایضاً

WWW.NAFSEISLAM.COM

۱۴) تحریک ختم نبوت، شورش کشمیری، ص: 23

۱۵) کشف الخطاء، ص: 5

۱۶) ارقم الاوہام، ص: 58

۱۷) شہادت القرآن، ص: 84

۱۸) ایضاً

۱۹) ایضاً

۲۰) ستارہ قیصرہ، ص: 15

۲۱) تبلیغ رسالت، ج: 7، ص: 19

۲۲) ستارہ قیصرہ، ص: 10

۲۳) شہادت القرآن، ص: 86

۲۴) کتاب البریہ، ص: 6 تا 8

۲۵) ایضاً، ص: 8-9

۲۶) تریاق القلوب، ص: 27-28

۲۷) ایضاً، ص: 28

۲۸) مجموعہ اشتہارات، ج: 3، ص: 19

۲۹) شہادت القرآن، ص: 84

۳۰) تریاق القلوب، ص: 30

۳۱) تحفہ گولڑویہ، طبع سوم: 42

۳۲) تبلیغ رسالت، ج: 6، ص: 65

۳۳) ستارہ قیصرہ، ص: 20

۳۴) تذکرہ، ص: 31

۳۵) حقیقت الوحی، ص: 303-304

۳۶) تذکرہ، مجموعہ الہامات، ص: 119 تا 121

۳۷) چشمہ معرفت، حصہ 2، ص: 209

۳۸) حقیقت الوحی، ص: 304

Nafse Islam
نفس اسلام
WWW.NAFSEISLAM.COM

برطانوی عہد میں اسلام اور عیسائیت کے درمیان مناظرے

محمد قطب الدین رضا مصباحی

جنگ آزادی سے ماقبل اور مابعد عیسائیت کی یلغار:

ہندوستانیوں کی بدقسمتی کہ انگریزوں نے اس ملک کے سیاہ وسفید پر قبضہ جمالیا اور سیاسی سطح پر کامیابی کے بعد مذہبی سطح پر تبلیغ شروع کردی۔ انگلستان سے بڑے بڑے پادری ہندوستان آئے اور بڑے زور وشور کے ساتھ عیسائیت کی تبلیغ میں منہمک ہوگئے۔ اس کے لیے ان کی ایک بڑی تحریک تھی جو بڑی تیزی کے ساتھ عیسائیت کے فروغ میں سرگرم تھی اور ان کا اصل نشانہ اسلام تھا۔ پادری مسلمانوں کے پاس پہنچ کر اپنے مذہب کی خوبیاں بیان کرتے اور اسلام کے بنیادی عقائد کو تنقید کا نشانہ بناتے۔ اس سلسلے میں انہوں نے کافی جوش وخروش کا مظاہرہ کیا اور سستے پمفلٹ کے کام کیے اور اپنے مذہب کو فروغ دینے کی خاطر کتابیں تصنیف کیں۔ پادری فردی طور پر بھی لوگوں تک پہنچ کر اپنے نظریات بیان کرتے اور اپنے پیغامات عام کرنے کے لیے دینی اجتماعات، جلسے جلوس بھی منعقد کراتے۔ گویا تبلیغ عیسائیت کی ایک لہر چل پڑی تھی اور ہر طرف ماحول گرم ہو چکا تھا۔ مذہبی حلقوں میں اس تحریک سے خوف وہراس کا ماحول پیدا ہو گیا تھا۔ حالات سے بیخبر علما کی خاموشی سے پادریوں نے ناجائز فائدہ اٹھایا اور کھلے عام اسلام کے خلاف بکنا شروع کردیا تھا۔

علماء اہلسنت کی چوکسی اور ذمہ داری:

یقیناوہ قیامت خیز ماحول تھا۔ مسلمان ایک طرف سیاسی سطح پر فرنگیوں کے ظلم وستم سے پریشان تھے اور دوسری طرف مذہبی دل آزاری نے ان کا چین وسکون غارت کر رکھا تھا۔ علمائے کرام کا ایک گروہ ملک سے فرنگی سامراج استبداد ختم کرنے میں کوشاں تھا تو دوسرا گروہ دین میں ان کی شرپسندیوں کے جواب میں مصروف تھا۔ ان علماء میں شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی، مولانا رحمت اللہ کیرانوی، حاجی امداد اللہ مہاجر مکی، ڈاکٹر وزیر خاں، مولانا فیض احمد بدایونی اور مولانا آل حسن سرفہرست ہیں۔

یہ حضرات نے اپنی ساری کوششیں رد عیسائیت میں صرف کیں۔ انہوں نے پادریوں کی پھیلائی ہوئی غلط

فہمیاں دور کرنے کے لیے رد عیسائیت پر کتابیں تحریر کیں اور ان کے اعتراضات کا جواب دیا۔ علمائے کرام نے عیسائیوں کے عقائد کا جائزہ لے کر ان کی قلعی کھول دی اور لوگوں کے سامنے حقائق پیش کر کے پادریوں کی پھیلائی ہوئی غلط فہمیوں کا ازالہ کیا۔ بعض جگہوں پر مجمع عام میں عیسائی پادریوں سے مناظرے بھی ہوئے۔

نہایت افسوس کی بات ہے کہ ان تبلیغی مناظروں کی طرف توجہ نہ دی گئی۔ اس وقت جو مناظرے ہوئے اور ان کی روداد یں چھپیں تو اسی روداد پر ہی اکتفا کیا گیا اور دوبارہ ان کی اشاعت اور مناظروں کی تفصیل جمع کرنے سے بے توجہی برتی گئی۔ بہت مشکل سے چند مناظروں کی تفصیل مل سکی ہے۔

﴿مناظروں پر ایک اجمالی نظر﴾

❶ پادری فنڈر سے مولانا آل حسن کا تحریری مناظرہ 22 جولائی 1844ء سے 2 فروری 1845ء تک جاری رہا۔

❷ مولانا رحمت اللہ کیرانوی اور پادری فنڈر کے درمیان ایک بڑے مجمع میں 10 اپریل 1845ء کو آگرہ میں ایک تاریخی مناظرہ ہوا۔ اس مناظرے میں مولانا رحمت اللہ کیرانوی کے معاون ڈاکٹر وزیر احمد خاں اور مولانا فیض احمد بدایونی تھے۔ عیسائیوں کو شکست دینے میں ان معاونین کا بھی خصوصی کردار رہا۔

❸ مولانا رحمت اللہ کیرانوی سے شکست کھانے کے بعد پادری فنڈر نے اپنی خفت مٹانے کے لیے ڈاکٹر وزیر خان سے تحریری مناظرہ شروع کیا جو 15 مئی 1854ء سے 17 اگست 1854ء تک جاری رہا۔

❹ مولانا اشرف علی نے پادریوں سے کئی مناظرے کیے۔ دسمبر 1891ء میں پادری کوئلہ ستھ سے حیدر آباد میں 8 فروری 1893ء میں پادری جے سموئل سے پونہ میں اور 8 مارچ 1894ء میں پادری ولیمس سے غازی پور میں یادگار مناظرے ہوئے۔ اکبر اپریل 1891ء میں وارنبٹ سے لے کر بے وقی کی جامع مسجد فتح پوری میں تحریف انجیل پر بے شمار دلائل پیش کیے کہ پادری لیڈر اسے اس کا اعتراف کرنا پڑا۔ مناظرہ ہی میں اس نے اپنا اعتراف تحریری شکل میں پیش کیا۔

﴿مولانا رحمت اللہ کیرانوی کا تاریخی و یادگار مناظرہ﴾

ان کے علاوہ بھی اسلام اور عیسائیت کے درمیان کافی مناظرے ہوئے۔ ان تمام مناظروں میں مولانا رحمت اللہ کیرانوی کا مناظرہ کافی مشہور ہوا اور اس کی شہرت دور دور تک پھیل گئی۔ یہ مناظرہ 10 اپریل 1854ء سے تین دنوں کے لیے آگرہ میں منعقد ہوا۔ مناظرے کے لیے پانچ موضوعات کا انتخاب ہوا تھا۔ ❶ پائبل میں کچھ احکام

منسوخ ہیں ❷ بائبل عہد قدیم وجدید میں تحریف واقع ہے ❸ عقیدۂ تثلیث ❹ نبی کریم ﷺ کی نبوت ❺ قرآن کی صداقت وحجت۔

مناظرے کا پہلا دن:

پہلے دن نسخ کے موضوع پر بحث شروع ہوئی اور طے شدہ امور کے مطابق مولانا کیرانوی نے بحث کا آغاز کیا۔ پہلے نسخ کی حقیقت کی وضاحت کی اور اس کے مفہوم ومعنی کی توضیح فرمائی پھر یہ عمومی پیش کیا کہ انجیل کے بعض احکام منسوخ ہیں اور بعض نہیں۔ اس پر دو مثالیں بھی بیان کیں کہ انجیل میں طلاق کی ممانعت کا حکم منسوخ ہے جبکہ انجیل مرقس باب 12 میں توحید کا حکم منسوخ نہیں۔

فنڈر نے کہا کہ انجیل کا کوئی حکم منسوخ نہیں ہو سکتا اور دلیل کے طور پر انجیل لوقا باب: 21 آیت: 33 میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا یہ ارشاد پیش کیا: "زمین وآسمان ٹل جائیں گے مگر میری بات ہرگز نہ ٹلے گی"۔

مولانا کیرانوی نے اس کا جواب دیتے ہوئے کہا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا یہ ارشاد ہر بات کے لیے نہیں بلکہ صرف اس باب یعنی اکیسویں کے لیے تھا۔ فنڈر نے اس پر اعتراض کیا کہ اس کے الفاظ تو عام ہیں۔

مولانا کیرانوی نے دوسرے حوالوں کی روشنی میں یہ بتایا کہ عیسائی پادریوں کا خود یہ اعتراف ہے کہ "میری باتیں" سے مراد اس باب میں ذکر کردہ باتیں ہیں۔ فنڈر سے اس کا جواب نہ بن پڑا تو انجیل کی صحت پر دوسری دلیل لاتے ہوئے پطرس کی یہ عبارت پیش کی: "کیوں کہ تم فانی تخم سے نہیں بلکہ غیر فانی سے خدا کے کلام کے وسیلے سے جو زندہ اور قائم ہے"۔ اس کی روشنی میں اس نے یہ دعویٰ کیا کہ کلام کے زندہ اور قائم ہونے کا مطلب یہی ہے کہ خدا کا کلام ہمیشہ رہے گا منسوخ نہیں ہو سکتا"۔

مولانا کیرانوی نے اس کے جواب میں توریت کی کتاب یسعیاہ کی یہ عبارت پیش کی: "گھاس مرجھاتی ہے، پھول کمھلاتا ہے پر ہمارے خدا کا کلام ابد تک قائم ہے"۔ اور فرمایا کہ اگر وہاں کلام کے زندہ اور قائم ہونے سے منسوخ نہ ہونا مراد ہے تو توریت کے بارے میں یہاں بھی یہی نظریہ رکھنا چاہیے جب کہ آپ خود اس کے بیشتر احکام منسوخ قرار دیتے ہیں۔ فنڈر کے لیے جب کوئی راہ نہ رہی تو بات بناتے ہوئے اس نے یوں کہا کہ اس وقت گفتگو صرف انجیل کے نسخ سے ہو رہی ہے توریت سے نہیں۔

بحث کی بحث کے بعد مولانا کیرانوی اور ڈاکٹر وزیر خان نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے کلام سے مزید کچھ مثالیں پیش کیں جن سے نسخ کا ثبوت فراہم ہوتا تھا۔ جس کے سبب فنڈر کو یہ تسلیم کرنا پڑا کہ انجیل کے احکام کا

منسوخ ہونا ممکن ہے لیکن اس نے انجیل میں اس کے وقوع کو تسلیم نہ کیا۔

مولانا کیرانوی نے اس موضوع پر بحث ختم کرتے ہوئے کہا کہ اس وقت امکان نسخ کا اعتراف ہی کافی ہے۔ اس کے وقوع کا اثبات سید عالم ﷺ کی رسالت کی بحث میں ہو جائے گا۔

اتنے پر نسخ کے موضوع پر بحث ختم ہو گئی اور دوسرے موضوع "تحریف" پر شروع ہوئی۔ مولانا رحمت اللہ کیرانوی نے فنڈر سے سب سے پہلے یہ پوچھا کہ کس طرح کی تحریف کے شواہد پیش کیے جائیں جو آپ تسلیم کر لیں۔ فنڈر کی طرف سے اس کا واضح جواب نہ ملنے پر آپ نے یہ سوال کیا کہ بائبل کی کتابوں کے بارے میں آپ کا اعتقاد کیا ہے؟ آیا یہ بائبل سے لے کر مکاشفہ تک ساری کتابوں کا ہر فقرہ اور ہر لفظ الہامی اور خدا کا کلام ہے یا نہیں؟ فنڈر نے کہا نہیں۔ ہر لفظ کے بارے میں تو نہیں کہا جا سکتا "بعض مقامات پر کتابت کی بھی غلطی ہے۔

مولانا کیرانوی نے کہا کہ کاتب کی غلطیوں سے اعراض کرتے ہوئے دوسرے جملوں اور الفاظ کے بارے میں میرا سوال ہے؟ اس پر فنڈر نے ایک ایک لفظ کے بارے میں کچھ کہنے سے انکار کر دیا تو مولانا کیرانوی نے مورخ یوسی بلس کے حوالے سے بتایا کہ جسٹس شہید نے بعض بشارتیں نقل کر کے یہ دعویٰ کیا تھا کہ بائبل کے عہد نامہ قدیم سے یہودیوں نے ان بشارتوں کو خارج کر دیا ہے۔ مولانا کیرانوی نے اپنی بات کی مزید پختگی کے لیے واضح اور تجزیہ بھی دکھایا۔ اس کی روشنی میں مولانا کیرانوی نے فنڈر سے جواب طلب کیا کہ جسٹس نے جو بشارتیں ذکر کیں اور یہودیوں پر ان کے مٹانے کا الزام لگایا وہ اس میں سچا ہے یا جھوٹا؟ اگر سچا ہو تو اس سے ہمارا دعویٰ تحریف ثابت ہو گیا اور اگر جھوٹا ہو تو آپ کا اتنا بڑا دعویٰ اپنی طرف سے باتیں گڑھ کر خدا کا کلام ثابت کرنے کے درپے ہے۔

پھر مولانا کیرانوی نے ہنری اور وسکاٹ کے حوالے سے ثابت فرمایا کہ آگسٹائن نے یہودیوں پر یہ الزام عائد کیا تھا کہ انہوں نے اکابر کی عمروں میں تحریف کی ہے اور عبرانی نسخوں کو بدل دیا ہے اور آگسٹائن کے اس نظریے سے دوسرے محققین کو بھی اتفاق تھا۔ فنڈر نے اس کا جواب دیا کہ ہنری اور وسکاٹ کے لکھنے سے کچھ نہیں ہوتا ان کے علاوہ بیسیوں لوگوں نے تفسیریں لکھی ہیں۔

مولانا رحمت اللہ کیرانوی نے فرمایا یہ ان دونوں کی اپنی رائے نہیں بلکہ جمہور کے متفقہ مذہب کا بیان ہے۔ فنڈر نے بائبل کی حقانیت پر دلیل لاتے ہوئے انجیل یوحنا میں مذکور حضرت یسوع مسیح کا ارشاد پیش کیا اور کہا کہ اس سے بڑھ کر کس کی شہادت ہو سکتی ہے؟

ڈاکٹر وزیر خاں نے بڑے لطیف پیرائے میں اس کا رد کر دیا کہ ابھی بائبل کی اصلیت ثابت ہی نہیں تو اس کی عبارت سے استدلال کیوں کر ہو سکتا ہے؟ اس پر فقیر نے کہا کہ ہم نے توریت کی حقانیت پر انجیل سے استدلال کیا' انجیل کو اگر آپ نہیں مانتے تو اس کی تحریف ثابت کریں۔ اس کے بعد ڈاکٹر وزیر خاں نے انجیل متی پڑھنا شروع کی اور کئی غلطیاں دکھا ڈالیں۔ فقیر نے یہ کہہ کر اپنی راہ نکالنی چاہی کہ غلطی اور تحریف میں فرق ہے۔ تحریف کا ثبوت اسی وقت ہو گا جب کوئی ایسی عبارت دکھائی جائے جو پرانے نسخوں میں نہ پائی جائے اور موجودہ نسخوں میں وہ موجود ہو۔

ڈاکٹر وزیر خاں نے جواب دیا کہ الہامی کتاب میں غلطی کی گنجائش نہیں ہوتی۔ اس میں جب غلطیاں موجود ہیں تو یقیناً وہ تحریف کے بعد آئی ہوں گی۔ پھر جو بات ڈاکٹر وزیر خاں نے پوچھا تھے تحریف ہونے کا ثبوت پیش کیا جس کے نتیجے میں فقیر نے اعتراف کیا کہ اس جگہ تحریف ہے اور یوں ہی ایک دو جگہوں پر بھی۔

مناظرے کا دوسرا دن:

پہلے دن کے مناظرے کی خبر دور دور تک پھیل چکی تھی جسے سن کر لوگ اس مناظرے کے مشاہدے کے لیے دوسرے دن کا شدت سے انتظار کرنے لگے۔ ہر کسی کے دل میں ایک شوق فراواں پایا جاتا تھا' یہی وجہ ہے کہ دوسرے دن ہر مذہب کے لوگ مسلم' ہندو' سکھ اور عیسائی کافی تعداد میں جمع ہو گئے۔

مناظرے کا آغاز فقیر نے اپنی تقریر سے کیا جس میں اس نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ سید عالم ﷺ کے عہد مبارک تک انجیل اپنی شکل میں محفوظ تھی اور قرآن کریم نے اس پر ایمان لانے کا بھی حکم دیا ہے۔ مولانا رحمت اللہ کیرانوی اور ڈاکٹر وزیر خاں نے تنقید طلب لہجے میں فقیر سے دلائل سے ان کی باتوں کا رد کر دیا اور یہ واضح فرمایا کہ جس قرآن میں اس پر ایمان لانے کا بیان ہے اسی قرآن میں اس کی تحریف کا ذکر بھی موجود ہے اور مزید شواہد کی روشنی میں بائبل کی تحریف کو ثابت فرمایا۔ ان ساری باتوں کا جواب فقیر کے پاس یہی تھا کہ ساری غلطیاں کاتب کے سہو کا نتیجہ ہیں۔ "متن" کی صحت پر اس کا کچھ اثر نہیں' وہ بالکل محفوظ ہے اور کسی طرح کی غلطی کی اس میں راہ نہیں۔

اس پر حاضرین نے فقیر سے وضاحت طلب کی کہ "متن" سے ان کی کیا مراد ہے؟ فقیر نے اس کا جواب دیا کہ جن عبارتوں میں تثلیث' الوہیت مسیح' کفارہ اور شفاعت کا بیان ہے وہ متن ہے۔

مولانا کیرانوی نے فقیر کی گرفت کرتے ہوئے کہا کہ جب اتنے سارے مقامات پر تحریف کا اعتراف کر چکے تو متن کی سلامتی پر کیا دلیل رہی؟ فقیر نے کہا کہ خاص متن کی تحریف پر کوئی دلیل نہیں۔ اس کی تحریف اسی وقت ثابت ہو گی جب اس کا کوئی ایسا پرانا نسخہ دکھائیں جس میں ان سب باتوں کا ذکر نہ ہو اور نئے نسخوں میں موجود ہو۔

مولانا کیرانوی نے دوٹوک اس کا جواب دیا کہ جب بعض مقامات کی تحریف آپ نے تسلیم کرلی تو اس سے کتاب کی ساری عبارتیں شک کے دائرے میں آگئیں۔ اب کسی خاص عبارت کو الہامی ثابت کرنے کے لیے دلیل کی ضرورت ہوگی۔

فریق نے کہا کہ بائبل کے جن مفسرین کی تحریروں سے تحریف ثابت کی گئی انہیں مفسرین نے متنیت اور دوسرے عقائد کو درست قرار دیا ہے اور انہیں تحریف سے محفوظ مانا ہے۔ اس پر مولانا کیرانوی نے فلذر سے اس بات کا اعتراف کرا لینے کے بعد کہ اس نے ابھی تفسیر کشاف اور بیضاوی کی عبارتیں حوالے میں پیش کی تھیں یہ دریافت کیا کہ انہیں کتابوں میں انجیل کا محرف ہونا، نعوذ باللہ کارسول عالم ﷺ کا رسول ہونا اور حضور ﷺ کے منکر کا کافر ہونا مذکور ہے تو کیا یہ باتیں بھی اسے تسلیم ہیں؟

فلذر نے ان باتوں کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تو مولانا کیرانوی نے فرمایا: اسی طرح ہم بھی بائبل کے مفسرین کی یہ بات تسلیم نہیں کرتے کہ بعض مقامات پر کھلی تحریف کے ہوتے ہوئے عقیدہ، متنیت وغیرہ بالکل سلامت ہو۔ تحریف کے اثبات میں ان مفسرین کے اقوال کا نقل محمل الزامی طور پر تھا۔ اس کا یہ معنی نہیں کہ ان کی ہر بات ہمیں تسلیم ہے۔

دونوں کے طویل بحث ومباحثہ اور بالکل واضح اور نمایاں دلائل سے بائبل کی تحریف ثابت کر دینے کے بعد بھی فلذر نے بائبل کے محرف اور ناقابل اعتبار ہونے کو تسلیم نہ کیا اور آخر تک اپنی ضد اور اصرار پر قائم رہا۔

مناظرے کے لیے تین دنوں کے وقت کی تعیین ہوئی تھی۔ اس لحاظ سے پانچ موضوعات منتخب ہوئے تھے مگر دونوں ہی کے بحث ومباحثہ سے پادری فلذر اتنا ہراساں ہوا کہ تیسرے دن مناظرے کے لیے آیا ہی نہیں۔ پھر بھی دونوں تک مولانا کیرانوی کی واضح برتری کی بنیاد پر حاضرین کو فلذر کی ہزیمت کا اندازہ ہو چکا تھا۔ فلذر کی اس شکست سے اس کی بڑھتی ہوئی تحریک پر کچھ دنوں کے لیے کافی گہرا اثر پڑا۔

انقلاب 1857ء کے علمبردار اہلسنت وجماعت

مولانا یٰسین اختر مصباحی

استاذ العلماء مولانا یٰسین اختر مصباحی کی شخصیت علمی حلقوں میں تعارف نہیں۔ آپ دار العلوم ازہر گجراتی دہلی کے بانی و مہتمم اور ماہنامہ کنز الایمان کے ارباب اختیار میں سے ہیں۔ تقریباً ایک عشرہ الجامعۃ الاشرفیہ مبارکپور میں تدریسی خدمات سرانجام دیں اور المجمع الاسلامی کے رکن رکین رہے۔ بھارت کے تقریباً ہر سنی جریدے میں آپ کی علمی نگارشات شائع ہوتی ہیں۔ آپ کی کئی علمی تاریخی اور تحقیقی کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں۔

انقلاب 1857ء پاک و ہند تاریخ کا ایک درخشاں یا خوں چکاں باب ہے۔ درخشاں اس طور پر ہے کہ قابض و غاصب انگریز حکمرانوں کے خلاف لاکھوں لوگ سر بکف ہو کر میدان جنگ میں نکل آئے اور دادِ شجاعت دیتے ہوئے انگریزوں کا عرصۂ حیات تنگ کر دیا اور خوں چکاں باب اس طرح ہے کہ کئی لاکھ لوگ انگریزوں کی وحشیانہ جارحیت اور درندگی کا شکار ہو کر اپنے جان و مال سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ اپنے وطن میں رہ کر بھی انہیں بے وطن کر دیا گیا اور ان کی مذہبی و قومی غیرت و حمیت اور عزت و آبرو پر حیرچ کو برسر عام ہوا اور ذلیل و خوار کر دیا گیا۔

جب انقلاب کا طوفان تھما اور حالات رفتہ رفتہ اعتدال پر آنے لگے تو اہل ہند کے سامنے سب سے بڑا سوال یہ تھا کہ وہ اپنے ایمان، اپنی تہذیب اور اپنی شناخت کے ساتھ کس طرح اپنی زندگی کے ایام پورے کریں؟ کس طرح اپنی زمین اور جائیداد کا تحفظ کریں اور اپنی معاشی و تجارتی امور کو کیسے بحال کریں؟

رہ گئی بات داستانِ انقلاب اور مصائب انقلاب کو تاریخی ریکارڈ کے طور پر ضبط تحریر میں لانے اور آنے والی نسل کو اس سے واقف و باخبر رکھنے کی تو اس کا کسے ہوش تھا اور کسے اتنی جرأت تھی کہ صحیح واقعات سپرد قلم کر کے انگریز کی مظالم اور بیجا دستیوں کو دعوت دے؟ تقریباً ساٹھ ستر سال تک یہی حالات رہے اور خونی نقوش ایک ایک کر کے مدھم اور محو ہوتے چلے گئے۔ انقلاب 1857ء کی عام تاریخ کا یہی حشر ہوا تاہم موجودہ ہند و پاک کے مخطوطہ خانوں اور پرانی لائبریریوں میں منتشر طور پر ایسے ہزاروں صفحات اب بھی محفوظ و موجود ہیں جو گردش ایام پر ماتم کر رہے ہیں اور اب تک ان اوراق و صفحات کا مطالعہ کر کے ایسے دلیلوں اور قرینوں کو منظر عام پر لانے کی کسی محقق

دو مورخ کو توفیق نہ مل سکی جو ہماری قومی و ملکی تاریخ کا گراں قدر سرمایہ اور بیش بہا اثاثہ ہیں۔

یہ حقیقت تاریخی شہادتوں سے ثابت اور واضح ہے کہ انگریزی سامراج استبداد سے اپنے ملک و وطن کو نجات اور آزادی دلانے میں علمائے کرام اور مسلمانانِ ہند ہی پیش پیش رہے ہیں۔ اس کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ انگریزوں نے مسلمانوں ہی کے ہاتھوں سے ہندوستان کی سلطنت و حکومت چھینی تھی اور وہی زندگی کے ہر میدان میں انگریزی ظلم و جبر کا شب و روز نشانہ بھی بن رہے تھے اور منظم طور پر ہر شعبۂ زندگی میں انہیں بے اثر بلکہ پس ماندہ بنانے کی مسلسل کوشش کی جاتی رہی۔ ایسے حالات میں فطری طور پر مسلمان مضطرب اور مشتعل ہوتے رہے جس کا نتیجہ انقلاب 1857ء کی شکل میں ظاہر ہوا۔

قومی طور پر انقلاب کے مستند حالات و واقعات کی تحقیق و ترتیب کی طرف مورخین نے کما حقہٗ پہلے توجہ دی اور نہ ہی اس وقت ان کی خاطر خواہ قدر ہوئی ہے۔ قائدینِ انقلاب مثلاً مولانا احمد اللہ شاہ مدراسی، مفتی صدرالدین آزردہ دہلوی، علامہ فضل حق خیرآبادی، مفتی عنایت احمد کاکوروی، مولانا سید کفایت علی کافی مرادآبادی، مولانا فیض احمد عثمانی بدایونی، مفتی مظہر کریم دریا آبادی وغیرہم نیز جنرل بخت خاں، فیروز شاہ وغیرہ کی انگریز مخالف سرگرمیوں اور قربانیوں کی تفصیلات سے آج بھی اہل وطن بڑی حد تک ناواقف ہیں بلکہ کئی ایک نامور سے ان کے کان بھی نا آشنا ہیں۔ بادشاہ ہونے کی وجہ سے آخری مغل حکمراں بہادر شاہ ظفر کا نام ضرور مشہور ہے مگر عام طور پر سرکاری ذرائع ابلاغ ان کا ذکر بھی برائی طور پر ہی کرتے ہیں۔

انقلاب 1857ء میں کہیں کہیں ہندوؤں کی شرکت کے باوجود عام طور پر قومی حیثیت سے ہندوؤں کے اندر وہ جوش و جذبہ مفقود تھا جس کی چنگاریاں مسلمانوں کے دلوں میں بھڑک رہی تھیں اور جگہ جگہ وہ انگریز سامراج سے ٹکرا رہے تھے۔ غالباً اسی وجہ سے ہندو مورخین کو تاریخ انقلاب سے وہ دلچسپی نہیں جو ہونی چاہیے۔ اسی طرح کمیونسٹ مورخین اس انقلاب کو محض مسلمانوں کی فرقہ پرستی کا نتیجہ قرار دیتے ہیں لہٰذا وہ اس کی پوری تاریخ کو اپنے ایک خاص نقطۂ نظر سے دیکھتے اور بیان کرتے ہیں اور علماء کے ذکر سے دانستہ اعراض کرتے ہیں۔

اپنی تاریخ کو مدون و مرتب کرنا ہر قوم و ملت کا خود اپنا فریضہ ہے جس سے غفلت و تساہل اس کی بے شعوری و بے عملی و نااہلی خیال کی جاتی ہے۔ دوسروں سے ایسی توقع اور اس پر انحصار فضول و عبث ہے کہ وہ آپ کی خدمات اور فضائل و کمالات کی تفصیلات بیان کریں اور آپ کے قائدے کے لیے کد و کاوش اور جاں سوزی کر کے آپ کی تاریخ مرتب کریں۔ ایسی صورت میں دوسروں کا شکوہ نہیں بلکہ اپنے اوپر جتنا بھی ماتم کیا جائے وہ کم ہے اور صحیح معنوں

میں یہ ماتم کا نہیں بلکہ اپنی فکر و تحقیق اور زبان و قلم کو تمیز لگانے کا مقام ہے۔ زندہ قوم کی یہی علامت ہے کہ اپنے ماضی کی تاریخ خود اپنے قلم سے رقم کرے اور حال کی اصلاح کے ساتھ ساتھ اپنے مستقبل کو روشن و تابناک بنائے۔

محض یہ نالہ و شیون اور آہ و فغاں کرنے کا کچھ حاصل نہیں کہ دوسروں نے ہمارے ساتھ متعصبانہ رویہ اختیار کرتے ہوئے ہماری تاریخ کے ساتھ انصاف نہیں کیا۔ کمال مردانگی تو یہ ہے کہ خود اپنے اندر ایسی طاقت و توانائی پیدا کی جائے کہ رحم طلب نظروں سے کسی دوسرے کی طرف دیکھنے کی کوئی ضرورت ہی پیش نہ آئے اور کسی دوسرے کے اندر یہ جرأت ہی پیدا نہ ہو سکے کہ وہ متعصبانہ رویہ کا ارتکاب اور اس کا اظہار کر سکے۔

انقلاب 1857ء میں نمایاں کردار ادا کرنے والے علمائے کرام میں حنفی تھے جن میں سے بعض کے اسمائے گرامی گزشتہ سطور میں درج کیے جا چکے ہیں۔ ان میں کوئی بھی وہابی غیر مقلد اور دیوبندی نہ تھا۔ غیر مقلدیت و دیوبندیت کی تخم ریزی شاہ اسماعیل دہلوی (متوفی 1831ء) کی رہوائے زمانہ کتاب "تقویۃ الایمان" کے ذریعہ ہوئی۔ اس منحوس کتاب نے ہندوستان کے سنی مسلمانوں کے گھر گھر میں افتراق و انتشار کی آگ لگادی جس کے شعلے آج بھی ہندو پاک اور بنگلہ دیش کی مسلم آبادیوں میں بلند ہو رہے ہیں۔ اس کتاب کو انگریزوں نے رائل ایشاٹک سوسائٹی کی طرف سے انگریزی زبان میں شائع کیا اور اس کے انگریزی وارد و نسخے ہزاروں لاکھوں کی تعداد میں مفت تقسیم کیے اور وہابیت کو گھر گھر پہنچانے کی کوشش کی۔ اس وہابیت کے مقلد گروہ کا نام دیوبندیت اور غیر مقلد گروپ کا نام اہل حدیث یا غیر مقلد ہے۔

مشہور غیر مقلد محدث میاں نذیر حسین دہلوی اور ان کے شاگرد خاص محمد حسین بٹالوی انگریزوں کے معتمد خاص تھے جو انقلاب 1857ء میں شریک علماء کو جاہل اور متشدد سمجھتے تھے۔ سید محمد میاں دیوبندی، مسعود عالم ندوی اور ڈاکٹر قیام الدین وغیرہ نے صراحت کی ہے کہ "حقیقت کا اعتراف کیا جائے تو یہ بھی ماننا پڑے گا کہ دہلوی اور شاہ اسماعیل دہلوی سے وابستہ جماعت نے بہ حیثیت جماعت انقلاب 1857ء میں کوئی حصہ نہیں لیا بلکہ مولانا لذکر دہلوی حضرات نے اس کی بھی صراحت کی ہے کہ اس انقلاب کو مذہبی اعتبار سے یہ جماعت ناپسند کرتی تھی۔ (ملاحظہ کیجیے ہندوستان میں پہلی اسلامی تحریک از مسعود عالم ندوی، علمائے ہند کا شاندار ماضی از سید محمد میاں دیوبندی، وہابی تحریک از ڈاکٹر قیام الدین احمد پٹنہ)

دیوبند سہارنپور کے اندر 1283ھ مطابق 1866ء میں حاجی سید عابد حسین قادری چشتی نے ایک چھوٹا سا مدرسہ قائم کیا جس پر آٹھ نو سال بعد مولوی قاسم نانوتوی قابض ہو گئے اور دار العلوم دیوبند کے نام سے وہ مدرسان

کی کوششوں میں مشہور ہوا۔ جس طرح یہ دعویٰ تاریخی کذب بیانی ہے کہ مولوی قاسم نانوتوی مدرسہ دیوبند کے بانی ہیں اسی طرح یہ دعویٰ بھی کذب بیانی کا ایک عبرت ناک نمونہ ہے کہ علمائے دیوبند نے انقلاب 1857ء میں کوئی حصہ لیا۔ اس دعویٰ کی تکذیب وتردید کی متعدد دلیل بنیادیں ہیں۔

❶ 1857ء کے آٹھ نو سال بعد مدرسہ دیوبند کی بنیاد پڑی تو ایسی صورت میں یہ کہنا کہ علمائے دیوبند نے جنگ آزادی 1857ء میں شرکت کی تھی اسے کذب بیانی اور سفید جھوٹ کے علاوہ اور کیا کہا جاسکتا ہے؟

❷ ایک ٹیڑھا جس میں حافظ ضامن جلال آبادی و رشید احمد گنگوہی و قاسم نانوتوی میں سے کوئی بھی دیوبند کا باشندہ نہیں تھا کیسے 1857ء یا 1866ء میں مفتوحہ دیوبند میں سکونت کی جاسکتی ہے۔

❸ اس دور میں دیوبند سے جو بھی کسی مسلکی و مذہبی گروہ کا وجود بھی نہیں تھا کہ یہ دعویٰ کیا جاسکے کہ اکابر علمائے دیوبند انقلاب 1857ء میں شریک تھے۔ جس ٹیڑھا کا ذکر علمائے دیوبند کرتے ہیں اور شاملی کی مجزب سے جس کا رشتہ جوڑتے ہیں وہ ٹیڑھا شیخ محمد اکرام اور ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہان پوری کی تحقیق کے مطابق ایسے آوارہ گردوں کے ساتھ ہولی تھی جو نہ تو جہاد کی نیت سے اور نہ انگریز مخالف کی حیثیت سے متعارف تھے بلکہ حالات کی سنگینی کا فائدہ اٹھا کر لوٹ مار کرنا جن کا مقصد اور مطمح نظر تھا۔

❹ جنگ شاملی قاضی عنایت علی اور ان کے زیر اثر مسلمانوں نے لڑی جس میں مذکورہ حضرات کی شرکت کا کوئی تاریخی ثبوت نہیں۔

❺ شاملی مظفر نگر اور سہارن پور کے سرکاری تاریخ ریکارڈ میں مذکورہ علماء میں سے کسی کے بارے میں اس کا کوئی ذکر نہیں کہ کسی انگریز حامی گروپ سے ان کی کوئی مجزب ہوئی ہو۔

❻ 1857ء کے کسی بھی دستاویز یا انگریز مورخ نے اپنی کسی چھوٹی بڑی تحریر میں باغی اور انقلابی کی حیثیت سے مذکورہ علماء میں سے کسی کا کوئی ذکر نہیں کیا ہے۔

❼ 1947ء سے چند سال پہلے 1950/1955ء کے آس پاس بداثبوت وسند کے یہ تاریخ گڑھنے کی کوشش کی گئی کہ علمائے دیوبند جنگ آزادی 1857ء میں شریک تھے۔

❽ سرکاری خوشنودی حاصل کرنے یا کسی رنجش کی بنا پر جس طرح اس زمانے میں عام طور پر کوئی بھی مخبر کسی بھی شخص کے خلاف کوئی جھوٹی خبر دے کر اسے گرفتار کرا دیتا اور پھر اسے کوئی سزا ہو جایا کرتی تھی۔ اسی طرح کی مخبری مولوی قاسم نانوتوی اور مولوی رشید احمد گنگوہی کے خلاف بھی کسی نے کی جس کا اعتراف واعلان مولوی عاشق الٰہی میرٹھی

نے تذکرۃ الرشید میں کیا ہے۔

غیر مقلدوں اور دیوبندیوں کے پیشوا سید احمد رائے بریلوی اور شاہ اسماعیل دہلوی بالاکوٹ میں 1831ء میں قبائلی مسلمانوں کے ہاتھوں قتل ہوئے تھے۔ ان دونوں نے نہ صرف یہ کہ انگریزوں کے خلاف کوئی فتویٰ دینے یا ان سے کوئی جنگ کرنا مناسب نہیں سمجھا بلکہ تحریراً و تقریراً انگریزوں کی خوشنودی حاصل کرنے کی کوشش کی اور انگریزوں کے دشمن سکھوں اور افغانی مسلمانوں سے جنگ کی۔

کوئی معمولی سے معمولی روایت کسی بھی مورخ کی ایسی نہیں جس سے یہ ثابت ہو سکے کہ انہوں نے انگریزوں سے کسی طرح کی مخاصمت کی ہو اور ان کے خلاف کسی طرح کا کوئی چھوٹا سا بیان یا ایسا کوئی اقدام کیا ہو جس کی بنیاد پر انہیں انگریز مخالف کہا جا سکے۔ خود ان کے حامی علماء و مورخین لکھتے ہیں کہ سندھ و پنجاب سے سرحد کی طرف فوجی قدمی کے وقت انگریزوں نے مختلف حیلوں اور تدبیروں سے ان کی مدد کی اور حوصلہ افزائی کی۔ (ملاحظہ کیجئے سوانح احمدی و حیات طیبہ وغیرہ)

تاریخ ذکاء اللہ کے مطابق علامہ فضل حق خیرآبادی نے شاہ جہانی جامع مسجد دہلی میں جب انگریزوں کے خلاف تقریر کی اور پھر جہاد کا فتویٰ جاری کیا تو دہلی میں نوے ہزار سپاہ جمع ہو گئی۔ اسی طرح جہاد کا ایک اور فتویٰ جاری ہوا جس پر مفتی صدر الدین آزردہ دہلوی کا بھی دستخط تھا۔ مولانا سید کفایت علی کافی مراد آبادی نے مراد آباد میں انگریزوں کے خلاف جہاد کا فتویٰ دیا اور آس پاس کی مختلف جگہوں میں اسے مشتہر کرنے کا فریضہ بھی انجام دیا۔ بدایوں میں مولانا فیض احمد عثمانی بدایونی نے جہاد کے لیے علماء کا بیان جاری کیا۔ متعدد مقامات پر اپنے اپنے طور پر علماء نے انگریزوں کے خلاف جہاد کی ترغیب و تحریک کی اور یہ سب کے سب علمائے اہل سنت تھے اور سواد اعظم اہل سنت کی قیادت و رہنمائی انہیں علمائے اہل سنت نے کی۔

WWW.NAFSEISLAM.COM

جنگ آزادی میں علمائے دیوبند کا کردار

مولانا محمد اویس نگرامی

مولانا محمد اویس نگرامی ہندوستان کے معروف عالمی اور ادیب چاند اشرفی مبارکپوری یوپی کے نائب ناظم و مدرس ہیں۔

ہندوستان کی جنگ آزادی کی ابتداء 1757ء سے ہوئی جو 1947ء میں تقسیم وطن پر اختتام کو پہنچی۔ اس 190 سالہ جنگ کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ اس کا پہلا دور 1757ء سے شروع ہو کر 1857ء پر ختم ہوا اور دوسرا دور جو دراصل تحریک آزادی کے نام سے معنون ہونا چاہیے 1885ء سے شروع ہو کر 1947ء میں آزادی پاک و ہند پر اختتام پذیر ہوا۔ پہلے دور میں باضابطہ میدان جنگ میں معرکہ آرائیاں ہوئیں۔ بے شمار لوگوں نے انگریزوں کے چنگل استبداد سے ملک کو آزاد کرانے کے لیے اپنی جانوں کو قربان کیا لیکن غداران وطن کی اعانت سے سات سمندر پار سے آنے والی سفید فام قوم کے بعد دیگرے ہر میدان میں کامیاب ہوتی چلی گئی۔

برصغیر میں انگریزوں کے خلاف جنگیں:

انگریزوں کے خلاف پہلی جنگ 1757ء میں پلاسی کے میدان میں لڑی گئی۔ دوسری جنگ 1764ء میں بکسر (بہار) میں وقوع پذیر ہوئی۔ تیسری جنگ علاقہ روہیل کھنڈ 1774ء میں لڑی گئی۔ چوتھی جنگ 1799ء میں سرنگاپٹم (جنوبی ہند) میں ہوئی۔ اس کے بعد 1801ء میں انگریزوں نے اودھ اور روہیل کھنڈ اور 1803ء میں بندیل کھنڈ اور دہلی کو اپنی شاطرانہ چالوں کے مطابق اپنے جال میں پھانس کر عملی طور پر پورے ملک پر اپنی حکومت قائم کر لی اور حقیقتاً برائے نام کچھ نواب اور راجا باقی رہ گئے لیکن اصل اقتدار انگریزوں کے ہاتھوں میں چلا گیا۔ یہاں تک کہ دہلی کا حکمراں بھی انگریزوں کا محتاج اور دار اور حکوم و فرماں بردار بنا دیا گیا۔ یہی وہ حالات تھے جن کی وجہ سے 1857ء کا ملک گیر انقلاب، قتام اور ہنگامہ ہوا اور مسلمانوں کی قوت فنا ہو گئی۔ انگریزوں کی چیرہ دستیاں بڑھ گئیں اور انگریز پورے ملک پر قبضہ کرنے کے بعد دہلی کے تخت و تاج کے مالک بن گئے۔

مسلمانوں میں مسلکی تقسیم:

1857ء تک برصغیر پاک و ہند اور بنگلہ دیش کا مسلمان دیوبندی اور بریلوی مسلک میں تقسیم نہیں ہوا تھا' نہ دیوبندی اور بریلوی نام سے کوئی جماعت عالم وجود میں آئی تھی۔ یہ مسلکی تقسیم ہندوستانی مسلمانوں میں انگریزوں کی غلامی کے بعد پیدا ہوئی۔ 1857ء کی جنگ مسلمان ہار گیا اور اس کے بعد 1866ء میں ایک عربی مدرسے کی بنیاد قصبہ دیوبند ضلع سہارن پور میں رکھی گئی جو بعد میں دارالعلوم دیوبند بن گیا اور یہاں کے فضلا اپنے کو دیوبندی کہنے اور لکھنے لگے۔ اس تاریخی حقیقت کے بعد اگر کوئی یہ دعویٰ کرے کہ 1857ء کی جنگ آزادی علمائے دیوبند نے لڑی ہے تو اس دعویٰ کو جھوٹ' غلط بیانی اور تاریخ کے چہرے پر سیاہی پوتنے کے سوا کوئی دوسرا نام نہیں دیا جا سکتا۔ آج کل کچھ خود ساختہ مورخ اور مصنف یہ ڈیل حرکت کر رہے ہیں اور لوگوں کو باور کرانے کی کوشش کر رہے ہیں کہ اصل جنگ آزادی علمائے دیوبند نے لڑی ہے۔ بدیہی طور پر یہ سوال سامنے آتا ہے کہ جب 1857ء کے 9 سال کے بعد مدرسہ دیوبند کا سنگ بنیاد رکھا گیا تو یہ جنگ آزادی علمائے دیوبند نے کیسے لڑی؟

جنگ آزادی میں علماء کا قائدانہ کردار:

یہ حقیقت ہے کہ 1857ء کی جنگ آزادی میں علماء نے قائدانہ رول ادا کیا جس کی وجہ سے علماء کی بڑی تعداد کو انگریزوں نے جوش انتقام میں مجبور رسیائے شور (کالا پانی) اور تختۂ دار پر چڑھانے کی سزا سے لے کر بے حسیانہ سزا بھی دی کہ ان میں سے بعض کو زندہ سوار کی کھال میں بھوسا بھر کے لٹکا دیا گیا۔ ایسی انسانیت سوز حرکت دنیا میں کسی قوم نے کسی قوم کے ساتھ نہیں کی ہے۔ انگریزوں کے اقتدار میں آنے کی یہ وہ سیاہ تاریخ ہے جو ہمیشہ کے لیے انگریز قوم کو داغ دار کرتی رہے گی۔

احناف و جماعت (بریلوی) ہی جنگ آزادی کے ہیرو:

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ 1857ء اور اس سے پہلے جن علماء نے حریت کا صور پھونکا اور انگریزوں کے خلاف جہاد کا فتویٰ دیا ان کا تعلق کس جماعت سے تھا؟ وہ دیوبندی تھے' بریلوی تھے یا کسی اور جماعت سے تعلق رکھتے تھے؟ یہ وضاحت پہلے کی جا چکی ہے کہ 1857ء کی جنگ کے خاتمے کے 9 سال بعد مدرسہ دیوبند عالم وجود میں آیا' اس لیے انہیں دیوبندی تو کہا ہی نہیں جا سکتا اور بریلوی کا لفظ بھی بہت بعد میں عوام و خواص میں ایک جماعت کی حیثیت سے متعارف ہوا اس لیے یہ بھی دعویٰ نہیں کیا جا سکتا کہ بریلوی جماعت نے جنگ آزادی لڑی البتہ یہ بات

WWW.NAFSEISLAM.COM

بر ملا کہی جا سکتی ہے کہ وہ عظیم الشان رفیع المرتبت علمائے کرام جنھوں نے جنگ آزادی میں اپنے خون کا ایک ایک قطرہ بلائے حریت کے لیے قربان کر دیا وہ جماعت اہل سنت سے تعلق رکھتے تھے اور انہیں کے پس رو ہم مسلک ہم عقیدہ ہم خیال بریلوی جماعت کے علمائے کرام ہی ہیں۔ اس لیے یہ دعویٰ قطعاً غلط نہ ہوگا کہ موجودہ بریلوی جماعت کے اسلاف نے ہی جنگ آزادی لڑی ہے اور انہوں نے ہی اس لڑائی میں خندہ پیشانی کے ساتھ تختۂ دار کو قبول کیا ہے۔ اس لیے آج جماعتی تقسیم کے بعد یہ دعویٰ بالکل برحق ہے کہ جنگ آزادی بریلوی جماعت نے ہی لڑی ہے۔

بریلوی جماعت ہی ان تمام علمائے حریت کو اپنے اسلاف میں شمار کرتی ہے جنھوں نے ایک صدی تک انگریزوں سے مقابلہ کیا اور جگہ جگہ اپنے مقدس خون سے تعلق آزادی اور تاریخ کا سنہرا مطالعہ روز روشن کی طرح اس حقیقت کو عیاں کر دیتا ہے کہ آج بھی تمام بریلوی علماء ان علمائے کرام کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے انہیں اپنے اسلاف میں شمار کرتے ہیں اور ان میں سے بیشتر کو اپنے اساتذہ، استاذ العلماء اساتذہ اور وی مرشد تسلیم کرتے ہیں۔ اس کے بر خلاف موجودہ علمائے دیوبند ان اسلاف کو اپنے اساتذہ و اکابر کے زمرے میں شمار کرنے کو تیار نہیں ہیں بلکہ ان کے خلاف زہر افشانی کرتے رہتے ہیں۔

شیخ المشائخ حضرت حاجی امداد اللہ کا مسلک؟

جن اکابر نے شیخ آزادی پر اپنے کو پروانہ وار نثار کیا وہ دیوبند کے اکابر میں شمار نہیں کیے جاتے وہ سب کے سب علماء بریلی کے پیشوا و رہنما اور مقتدا ہیں۔ اس سلسلہ بحث میں ایک اہم مشترک ہے جسے علمائے دیوبند اپنے اکابر میں ضرور شمار کرتے ہیں اور علمائے بریلی بھی ان کا بھرپور احترام کرتے ہیں۔ وہ نام شیخ المشائخ حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا ہے۔ اس لیے اس پر تفصیلی محاکمہ ضروری ہے کہ آخر حاجی صاحب مرحوم و مغفور کس جماعت کے بزرگ اور رہنما کے پیرو کہلائے جا سکتے ہیں اور کون سی جماعت نظریاتی اعتبار سے ان کے مسلک کی حامل اور ان کی تصنیفات میں درج نظریات کو مانے والی ہے۔

اس موقع پر پوری ذمہ داری سے یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ علمائے دیوبند ہزار کہیں کہ حاجی صاحب ہمارے بزرگ اور راہنما ہیں مگر ان کی یہ بات قابل تسلیم نہیں ہے کیوں کہ کسی بزرگ و راہنما سے وابستگی در اصل ان نظریات و عقائد کے تسلیم کرنے پر موقوف ہے جن کا اظہار انہوں نے اپنی کتابوں اور ملفوظات میں کیا ہے۔ اول اول اکابر دیوبند حاجی صاحب سے وابستگی کا اظہار کرتے رہے لیکن نظریاتی اختلاف کی بنا پر ان میں شدید اختلاف پیدا ہوتا گیا اور جب حاجی صاحب نے اپنی مشہور زمانہ کتاب "فیصلہ ہفت مسئلہ" لکھ کر ملک و بیرون ملک شائع کرائی تو

تمام علمائے دیوبند ان کے باغی اور دشمن ہو گئے۔ حد تو یہ ہے کہ حاجی صاحب کی کتابوں کی ہولی دیوبندی علماء نے جلائی اور ان کے نظریات سے کھلم کھلا اختلاف کرتے ہوئے نئی جماعت بنام "دیوبندی جماعت" کی بنیاد ڈالی۔

اس لیے برملا کہا جائے گا کہ علمائے دیوبند اور جماعت دیوبند کا حاجی امداد اللہ صاحب علیہ الرحمۃ سے عقیدت مندانہ نہیں بلکہ بامغیانہ تعلق ہے اور حاجی صاحب مرحوم و مغفور کو دیوبندی جماعت ہرگز اپنا رہنما نہیں کہہ سکتی ہے۔

یہی ایک نام ایسا تھا جو جنگ آزادی میں انگریز دشمنی میں صف اول میں نظر آتا ہے اور جب علمائے دیوبند ان سے الگ تھلگ ہو گئے تو اب دیوبندی جماعت کا پورا اسکنول مجاہدین آزادی سے خالی ہے۔ ایک بھی شخص 1858ء تک اس جماعت کا جنگ آزادی میں شامل نہیں ہوا۔ ان تمام لوگوں نے انگریزوں کی ہم نوائی کی اور ان غیر ملکیوں کے تسلط کے لیے ہر ممکن مدد کرتے رہے۔

اکابر دیوبند کا جنگ آزادی میں کردار؟

جب پوری دیوبندی جماعت جنگ آزادی میں صفر نمبر پر پہنچ گئی تو کچھ جعل سازوں نے تاریخ سازی کا بیڑا اٹھایا اور غلط بیانی اور دروغ گوئی کا بہادر بن کر اپنے دو معمولی اسلاف کو جنگ آزادی کا ہیرو ثابت کرنے کے لیے آنکھوں میں دھول جھونکنا شروع کر دیا ہے۔ اس کی تازہ مثال اتر پردیش کی حکومت کی جانب سے شائع ہونے والے اردو ماہنامہ نیا دور لکھنؤ کا وہ نمبر ہے جو 1857ء کی جنگ آزادی کے عنوان سے شائع ہوا ہے۔ اس کے ایک مضمون نگار فیصل احمد ندوی جنکل ندوۃ العلماء لکھنؤ نے رشید احمد گنگوہی اور قاسم نانوتوی صاحبان کو جنگ آزادی کا سورما ثابت کرنے کے لیے بالکل غلط طور پر یہ لکھا ہے کہ قاسم نانوتوی معرکہ جنگ میں نہ صرف شریک تھا بلکہ قیادت کا فریضہ انجام دیا تھا۔

فیصل احمد صاحب لکھتے ہیں: "مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی کو سپہ سالار افواج قرار دیا گیا۔ شاملی اس علاقے کا مرکزی میدان تھا وہاں تفصیل بھی تھی اور یہاں انگریز فوج بھی رہتے تھے۔ قرار پایا کہ شاملی کی طرف کوچ کر کے اس پر حملہ کیا جائے چنانچہ حملہ ہوئی۔ شاملی کے میدان میں جنگ ہوئی گئی۔ انگریز فوج سے مجاہدین کا سخت مقابلہ ہوا اور انجام کار مجاہدین کو غلبہ ہوا۔ مقامی حکام نے رپورٹوں میں ان انقلابی مجاہدین کے جوش و خروش سے بھرپور دلیرانہ حملوں کا حیرت سے تذکرہ کیا ہے۔ انگریز فوج نے پسپا ہو کر تھانہ بھون میں پناہ لی اور مجاہدین نے تین دن محاصرہ کے بعد تھانہ بھون کا دروازہ توڑ لیا اور اندر داخل ہوئے۔ دست بدست جنگ ہونے لگی اسی اثنا میں حضرت حافظ ضامن شہید ہوئے۔"

اب میں اس کے بعد ایک ایسی تاریخی دستاویز آپ کے سامنے پیش کرنا چاہتا ہوں جو دیوبندی جماعت کے مشہور و معتبر مصنف عاشق الٰہی میرٹھی کی نوشتہ اور شائع کردہ ہے۔ میرٹھی صاحب نے ایک تعارفی کتاب "تذکرۃ الرشید" کے نام سے لکھی جس کے حصہ اول کے حاشیہ میں قصبہ شاملی میں انگریزوں سے ہونے والی آویزش کا تفصیلی ذکر اس طور پر کیا ہے۔ "اصل قصہ یوں سنا تھا کہ قاضی سعادت علی خاں پسر نجابت علی خاں رئیس اعظم تھانہ بھون ضلع مظفر نگر کے دو بیٹے تھے۔ ان میں بڑے لڑکے عنایت علی خاں نے باپ کے مرنے پر ریاست کا کام سنبھال رکھا تھا۔ ان کے چھوٹے بیٹے عبدالرحیم خاں جو بڑے بھائی کو باپ کی جگہ سمجھتے تھے بالطمینان حسب خواہش جہاں جی چاہتا چلے جاتے اور امیرانہ زندگی بسر کیا کرتے تھے۔ حقیقت میں دونوں بھائی ایک دوسرے کے جاں نثار اور شیدا و عاشق زار تھے۔ اسی گھٹا ٹوپ ابر ظلمانی میں جب کہ کئی جگہ غدر اور دنگا کا آشیانہ بنا ہوا تھا عبدالرحیم خاں مع چند احباب کے سہارن پور گئے اور سرائے میں کسی دوست کے پاس ٹھہرے۔ زمین دارانہ قضیوں میں آدمی کے ناحق بتجیرے ہو جاتے ہیں چنانچہ ایک بنیا جس کو قدیم سے اس ریاست کے ساتھ عداوت تھی اتفاق سے وہاں مقیم تھا۔ اس نے زمانہ غدر کو غنیمت سمجھا اور قاضی صاحب انگریز سے جو باغیوں کی سرکوبی کے لیے حکم موت کا مجاز بنا کر انتظام ضلع سہارن پور میں معین کیا گیا تھا اجا تجربی کی کہ تھانہ کا رئیس بھی کپتی سے باغی ہو گیا ہے چنانچہ اس کا بھائی دہلی میں کمک بھیجنے کے لیے باغی فرقہ نے آیا اور کئی دن سے سرائے میں ٹھہرا ہوا ہے۔ ادھر یہ خبر سنی تجربی ہوئی اور ادھر گلی کوچوں میں دشمنوں نے اس افواہ کو پھیلایا۔ یہاں تک کہ ایک کارروست سرائے میں روانہ کیا گیا اور عبدالرحیم خاں مع ہمراہیان باحرام بغاوت جیل خانہ بھیج دیے گئے۔

زمانہ تھا اضطراب کا، فوراً کردہ گناہ جماعت کو پھانسی کا حکم ہو گیا اور اگلے دن قاضی عنایت علی خاں کو اپنے بھائی کے دنیا سے رحلت کی اطلاع ملی۔ اس خبر سے عنایت علی خاں پر رنج و غم کے پہاڑ ٹوٹ پڑے اور جوش حزن میں بھائی کے انتقام کا خیال پیدا ہو گیا۔ اتفاق سے چند فوجی سوار گھوڑوں کے کندھے پر کارتوس کی کئی جھنگیاں لدوائے سہارن پور سے کیرانہ کی طرف جا رہے تھے کہ قاضی صاحب کو اس کی اطلاع ہوئی اور یہ اپنے جنون میں مست چند رفقا اور رعایا کو ساتھ لے شیر علی کے باغ کی سمت سڑک پر جا پڑے اور جس وقت سوار سامنے سے گزرے ان کا اسباب لوٹ لیا۔ ایک سوار اسی جنگ میں زخمی ہو کر پہ سمت مشرق جنگل کو بھاگا مگر تھوڑے ہی فاصلے پر گھوڑے سے گر کر مر گیا۔ اس فساد کی خبر مظفر نگر پہنچی تو حاکم ضلع کی طرف سے تھانہ پر فوج کشی کا حکم ہو گیا جس پر عنایت علی خاں نے فساد کھلا کھلا بلند کیا۔ چنانچہ شاملی کی طرف انگریز فوج کے جانے کی جھوٹی خبر پا کر نقارہ بجایا گیا اور جتھہ کا جتھہ

تحصیل شاملی پہنچ جاؤ۔

جس وقت گورنمنٹ کو اہل کاران تحصیل کے مارے جانے اور خزانہ کے لوٹے جانے کی اطلاع ملی تو حاکم شاملی پہنچا اور چار طرف کے نقشوں اور قصبہ کی ویرانی و بربادی دیکھ کر غصہ سے تھرا اٹھا۔ آخر یہ کہہ کر کہ تھانہ بھون بھی اسی طرح مسمار کرا کر پھوڑوں گا مظفر نگر واپس ہو گیا۔ چند ماہ بعد جب کہ امن ہوا اور دہلی کے فتح ہو جانے کی خبر مشہور ہوئی تو قاضی صاحب کو اپنی جان کی فکر ہوئی' یہاں تک کہ تا نہ میں یہ خبر گرم ہوئی کہ علی الصباح انگریزی فوج یہاں پہنچنا چاہتی ہے۔ اس وحشت اثر اطلاع سے لوگوں کے توسے نیچے سے زمین نکل گئی اور بھاگنے کو سوجھی کہ جدھر منہ سمائے نکل جائیں۔ چنانچہ آدھی رات کے وقت قاضی صاحب نے مع چند معمر ابیان کے تھانہ بھون کو خیر باد کہا اور بہت نجیب آباد اور اتنے ہوئے اور وہاں سے نہ جانے کہاں گئے' کچھ پتہ نہ چلا۔

سنا گیا ہے کہ قاضی عنایت علی کو ہمارے انگریزی حضرات نے کارروائی سے منع کیا اور بھلی کی طرف سے بھی پیام پہنچایا گیا کہ تم فساد سے باز آجاؤ' اپنے بھائی کا صبر کرو' قتلعی سے یہ حرکت ہو گئی تو آرام الغلام سے باز آگئے تو تم کو تھانہ بھون کا نواب بنا دیا جائے گا مگر تقدیر کے مضبوط بندوں سے بھاگ جانا وقت سے باہر ہے۔ حق تعالیٰ کے علم میں جب اس گھرانے کی تباہی و بربادی دھم شدہ کی اسی طرح مقدر تھی تو قاضی عنایت علی کیا کہتے؟ صبح صادق اسود ہوئی تو وہ بے چارے اپنے ساتھ آئی۔ تھانہ بھون سرکاری فوج نے گھیر لیا گیا اور مشرقی جانب سے گولہ باری شروع ہو گئی۔ دن نکلتے پر فوج قصبہ میں داخل ہو گئی اور قتل و قتال اور لوٹ مار کا بازار گرم ہو گیا۔ رات کی تاریکی پھیلنے سے پہلے پہلے شہر پناہ کے چاروں دروازے کھول دیے گئے اور مکانات پر مٹی کا تیل ڈال کر آگ لگا دی گئی۔ خلاصہ یہ کہ رات کی تاریکی پھیلنے سے پہلے پہلے حاکم ضلع کا وعدوں پورا ہو گیا کہ "شاملی کی طرح تھانہ بھون کو مسمار کر دوں گا"۔ ع

مذکورہ بالا اختلاف کو مشورہ کہ "تذکرۃ الرشید" سے نقل کیا گیا ہے اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ علماء دیوبند کے اکابر قاسم نانوتوی اور رشید گنگوہی کا شاملی کی جنگ سے دور کا بھی واسطہ نہیں تھا اور اگر کسی طرح کا تعلق ثابت کرنے کی کوشش کی جائے گی تو مولوی عاشق الٰہی میرٹھی کی کتاب جھوٹ کا پلندہ اور اس کے مصنف کو بہت بڑا دروغ گو لیس و جھوٹا تسلیم کرنا پڑے گا' پھر تو سارا دفتر ردی کی ٹوکری میں ڈالنے کے لائق ہو جائے گا۔ اگر مولوی عاشق الٰہی میرٹھی کی تصنیف "تذکرۃ الرشید" کو جھوٹ سے الگ بھی کر دیا جائے تو بھی قاسم نانوتوی اور رشید احمد گنگوہی کو جنگ آزادی کا سپاہی ثابت نہیں کیا جا سکتا۔ کیوں کہ کسی مصری تاریخ میں ان حضرات کا اس حیثیت سے کوئی تذکرہ نہیں ہے۔

اس موقع پر یہ سوال ضرور پیدا ہوتا ہے کہ جب ان دونوں حضرات نے انگریزوں کے خلاف جنگ آزادی میں کوئی حصہ نہیں لیا تو آخر قاسم نانوتوی صاحب کی گرفتاری کس سلسلہ میں ہوئی تھی؟ جس میں خود انہوں نے بار بار اپنی صفائی میں یہ کہا ہے کہ شاملی کی جنگ یا کسی اور شورش میں میں نے کوئی حصہ نہیں لیا ہے۔ مجھ پر اس جنگ میں حصہ لینے کا الزام بالکل غلط لگایا گیا ہے اور ان کی یہ صفائی اتنی باوزن تھی کہ انگریز حکومت نے اسے پورے طور پر تسلیم کرتے ہوئے انہیں باعزت بری کر دیا۔ انگریزوں کی سمجھ میں دلائل سے یہ بات آگئی کہ وہ تو اپنے آدمی ہیں جو غلط فہمی کی وجہ سے گرفتار کر لیے گئے ہیں۔

ذرا سوچیے! حقائق کی روشنی میں یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ 1857ء کی جنگ آزادی میں موجودہ علمائے دیوبند کے اکابر نے قطعی کوئی حصہ نہیں لیا ہے، تو پھر ان حضرات نے جو اسلاف اس جماعت علماء اہل سنت کے اسلاف تھے اور آج بھی اسی نام سے جانے اور پہچانے جاتے ہیں انہوں نے خیر پوری جنگ آزادی انگریز حکومت پر چڑھے ہوئے دریائے شور (کالا پانی) کی سزا کاٹنی اور چکتے ہوئے جام شہادت نوش کرتے رہے۔ اس ناچیز کی تحقیق سے کوئی منصف انکار نہیں کر سکتا۔

جنگ آزادی کے بعد اکابر دیوبند کا کردار؟

البتہ جنگ آزادی کا دوسرا اور جو در اصل تحریک آزادی ہے۔ اس میں ذکر کی میدان کارزار گرم ہوا تو یہ حضرات پیش پیش جس کی ابتداء 1885ء سے ہوئی یہ جنگ 1947ء تک چلی۔ اس میں تحریک شروع ہونے کے 46 سال بعد بالکل علمائے دیوبند نے ضرور حصہ لیا جس کی ابتدا 1920-21ء سے ہوتی۔ مگر اس پورے ستاسی سالہ دور تحریک میں ان علمائے دیوبند نے کانگریس کا ساتھ دل اور اکرنے کے بجائے ہندوستان کے قومی لیڈر مسٹر گاندھی اور پنڈت جواہر لال نہرو کے بیان و کردار کی حقیقت سے شریک رہے ہیں اور انہیں کی "ہے" سے "ہے" ملاتے رہے ہیں اس لیے اس تحریک آزادی کا بھی انہیں قائد اور راہنما اقرار نہیں دیا جا سکتا۔

﴿حوالہ جات﴾

1 ماہنامہ نیا دور لکھنؤ 1857ء نمبر ص: 92-93

2 حاشیہ تذکرۃ الرشید جلد اول ص: 111-112

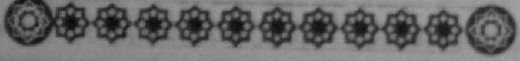

سید احمد رائے بریلوی اور شاہ اسماعیل دہلوی کے "جہاد" کی حقیقت

شکیل احمد مصباحی

ہندوستان پر انگریزوں کے تسلط کے نتیجے میں ہندوستانیوں کی جانب سے وقتاً فوقتاً ان کے خلاف بے چینی اور بغاوت کا ماحول پیدا ہوتا رہا۔ تا 1857ء میں ایک منظم پیمانے پر بھرپور لڑائی سے شروع ہو کر ہندوستان کے دیگر خطوں میں بھی پہنچ گیا۔ اس سلسلے میں ہندو قوموں کے ساتھ ساتھ عام مسلمانوں اور علمائے کرام کی کوششیں بھی مسلسل آزادی کے حصول تک جاری رہیں۔ متعصب تاریخ نگاروں نے جب ان حالات اور ماحول کا نقشہ اپنے طور پر پیش کیا تو حقائق کے ماتھے پر سیاہی پوت کر تعصب اور تنگ نظری سے کام لیتے ہوئے مسلمانوں کے کردار کو بالکل ختم کر دینے کا ناپاک جرم کیا۔

اس پہلو کا دوسرا رخ یہ سامنے آیا کہ سواد اعظم اہل سنت سے خارج علماء جنگ آزادی کا سارا کریڈٹ اپنے نام کرنے لگے اور علمائے اہل سنت کے متقدر مجاہدین آزادی کو انگریز نوازوں کی فہرست میں شمار کروانے لگے یا پھر اپنی جماعت کا فروغ کر علمائے اہل سنت کے عظیم کارناموں کے نشانات پر مٹی ڈالنے کی ناپاک جرأت ہی کر بیٹھے۔ اب ان حالات میں ضروری ہے کہ اصل واقعات سے قوم کو روشناس کروایا جائے اور بازار سیاست کے دلالوں کے سامنے حقیقی صورت حال پیش کر دی جائے تاکہ آج جو غدار وطن کا بدنما طوق اقتدار کے زور پر ہماری پیشانیوں پر مزید جارہا ہے اس کا بے بنیاد ہونا معلوم ہو جائے۔

سید احمد اور شاہ اسماعیل کے تعلق سے پروپیگنڈا کتب فکر مسلسل تحریر و تقریر کے ذریعہ یہ ذہن دینے کی کوشش کرتا رہا ہے کہ انگریزوں کے خلاف محاذ آرائی اور جہادی سرگرمیوں میں سارا رول ان ہی کا ہے اور انہوں نے ہی مسلمانوں کو انگریزوں کے خلاف جہاد کے لیے وہابی منظم کرنے کے بعد جنگیں کیں اور شہادت کے درجے پر فائز ہوئے جب کہ سچائی اس کے برعکس ہے۔ یہ دونوں اور ان کے حامی و متبعین انگریزوں کے وظیفہ خوار اور مکمل ہم نوا تھے۔ اس سلسلے میں خود انہی کے بے شمار شہادتیں موجود ہیں جن میں سے چند ایک ہدیہ قارئین ہیں۔

● سیاسی مصلحت کی بنا پر سید احمد صاحب نے اعلان کیا کہ سرکار انگریز سے ہمارا مقابلہ نہیں اور نہ ہمیں اس سے

کچھ خاصت ہے۔ ہم صرف سکھوں سے اپنے بھائیوں کا انتقام لیں گے۔ یہی وجہ تھی کہ حکام انگلشیہ بالکل باخبر نہ ہوئے اور شان کی تیاری میں مانع آئے۔ ۱۲

● اسی مفہوم کی عبارت دوسرے مقام پر یوں ہے: "سید صاحب کے پاس مجاہدین جمع ہونے لگے" سید صاحب نے مولانا شہید کے مشورے سے شیخ غلام علی رئیس الہ آباد کی معرفت لیفٹیننٹ گورنر ممالک مغربی شمال کی خدمت میں اطلاع دی کہ ہم لوگ سکھوں سے جہاد کرنے کی تیاری کرتے ہیں' سرکار کو تو اس میں کچھ اعتراض نہیں ہے۔ لیفٹیننٹ گورنر نے صاف لکھ دیا کہ ہماری عمل داری میں امن میں خلل نہ پڑے تو ہمیں آپ سے کچھ سروکار نہیں' نہ ہم ایسی تیاری میں مانع ہیں۔ یہ تمام یقین قوت صاف اس امر پر دلالت کرتے ہیں کہ جہاد صرف سکھوں سے مخصوص تھا سرکار انگریزی سے مسلمانوں کو ہرگز خاصت نہ تھی"۔ ۱۳

● اسی متعلق بعنوان تھا میری صاحب کی تحریر اس طرح ہے "سید صاحب کا انگریزی سرکار سے جہاد کرنے کا ہرگز ارادہ نہیں تھا' وہ اس وقت آزاد اعمل داری کو اپنی ہی عمل داری سمجھتے تھے۔ اس میں شک نہیں کہ سرکار انگریزی اس وقت سید صاحب کے خلاف ہوتی تو ہندوستان سے سید صاحب کو کچھ بھی مدد نہ ملتی مگر سرکار انگریزی اس وقت دل سے چاہتی تھی کہ سکھوں کا زور کم ہو"۔ ۱۴

● سر سید بھی ان واقعات کی طرف عنان قلم موڑتے ہوئے بالکل ملتی جلتی باتیں لکھتے ہیں' جس سے سید احمد رائے بریلوی اور شاہ اسماعیل دہلوی کے جہادی کارناموں کا سراغ پتا سانی لگایا جا سکتا ہے۔ "سید احمد صاحب نے پشاور پر سکھوں کا قبضہ ہونے کے بعد اپنے ان رفیقوں سے جو جہاد میں جان دینے پر آمادہ تھے' یہ کہا کہ تم جہاد کے لیے بیعت شروع کر دو' چنانچہ کئی سو آدمیوں نے اسی وقت بیعت کی اور یہ بات تحقیق ہے کہ جو شخص شیر سنگھ کے مقابلے میں لڑائی سے بھاگا تھا' اس میں صرف چار آدمی اپنے پیشوا سید احمد صاحب کی شہادت کے بعد مولوی عنایت علی اور ولایت علی سادق پٹنہ کے سردار ہوئے لیکن انہوں نے جہاد سے فرار اختیار کیا ہے میں کچھ کوشش نہیں کی۔ جب پنجاب پر گورنمنٹ انگریز کا تسلط ہوا تو مولوی عنایت علی اور ولایت علی مع اپنے اکثر رفیقوں کے 1847ء میں اپنے گھروں کو واپس بھیج دیے گئے۔ پس اس سے ہم کو یہ بات معلوم ہوگئی کہ خاص پٹنہ یا بنگالہ کے اور ملنوں سے بلکہ عموماً ہندوستان سے روپے اور آدمی اس وہابیت کے پہلے تین زمانوں میں ضرور سرحد کو بھیجے گئے تھے۔ لیکن میری رائے میں یہ بات بہت کھلی ہوئی ہے کہ ان میں سے کوئی آدمی انگریز گورنمنٹ پر حملہ کرنے کے واسطے ہرگز نہیں گیا تھا اور نہ ان سے یہ کام لیا گیا اور نہ تین زمانوں میں سے کسی کو اس کا کچھ خیال ہوا کہ ہندوستان کے مسلمانوں

کی نسبت بغاوت کی جانب مائل ہے۔" ۔ ج

● مزید شواہد کے لیے آگے کی عبارت بھی ملاحظہ کریں: "جب مولوی عنایت علی اور ولایت علی 1847ء کو ہندوستان لوٹ آئے تو اس وقت سید احمد صاحب کے چند دیرینہ کار سرحد پر باقی رہ گئے تھے اور یہ بات بھی صحیح ہے کہ ان دونوں نے پٹنہ اور اس کے قرب وجوار کے آدمیوں کو اس کی ترغیب دینے میں ہرگز کوتاہی نہیں کی کہ وہ جہاد میں شریک ہوں اور یہ اس کام کے واسطے روپیہ جمع کریں۔ چنانچہ وہ برابر بڑی سرگرمی سے کوشش کرتے رہے اور جس بات کا اب تک ان کو دل سے خیال تھا اس کا اظہار انہوں نے 1851ء میں اس طرح کیا ہے کہ وہ پھر ہندوستان سے سرحد کی جانب چلے گئے گرفتار کنندہ مظہر صاحب نے خیال کیا کہ یہ لوگ دوبارہ سرحد کو انگریزوں پر حملہ کرنے کی نیت سے گئے تھے اور انہوں نے بجائے سکھوں کے انگریزوں پر جہاد کیا تھا۔ حالانکہ جب ان لوگوں کو انگریزوں سے کسی طرح کی شکایت نہ تھی تو پھر ان کا ارادہ کسی طرح پر صحیح نہیں ہو سکتا۔" ۔ ح

● اس پر تحمل اور روشنی ڈالتے ہوئے سرسید کا رد اس قدر سرخ لکیر کھینچتا ہوا نظر آتا ہے جس سے سید احمد رائے بریلوی کا کردار پوری طرح لولہان نظر آتا ہے۔ "اور یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیے کہ یہ وہابی اپنے مذہب میں بڑے پکے اور نہایت سچے ہوتے ہیں۔ وہ اپنے اصول سے کسی حال میں منحرف نہیں ہوتے اور جن شخصوں کی نسبت میں یہ لکھ رہا ہوں وہ اپنے بال بچوں اور مال واسباب کو گورنمنٹ انگریزی کی حفاظت میں چھوڑ گئے تھے اور ان کے مذہب میں اپنے بال بچوں کے حاکموں پر حملہ کرنا نہایت ممنوع ہے۔ اس لحاظ سے اگر وہ انگریزوں سے لڑتے اور لڑائی میں مارے جاتے تو وہ بہشت کی خوشیوں اور شہادت کے رتبہ سے محروم ہو جاتے بلکہ اپنے مذہب میں گناہ گار خیال کیے جاتے"۔ ۔ خ

مذکورہ اقتباسات کی بنیاد پر ہم بلا خوف تردید سید احمد رائے بریلوی کو انگریز نوازوں کی پہلی فہرست اور باغیوں میں شمار کرنا نادرستی نہیں ہوگی ہے۔ اس میں کوئی جرم نہیں کہ انہیں انگریزوں کا کھلا ہوا معاون اور ناصر گردانا جائے جب کہ ان مشکلہ حال وفریاد کناں ماحول میں علمائے اہل سنت اپنے وطن کی آزادی کے لیے پوری طرح انگریزی افواج کے خلاف صف آرا ہو کر تحریر وتقریر کے ذریعہ عام ہندوستانیوں کو انگریزوں کے خلاف متحد کر رہے تھے جس کے نتیجے میں قید وبند کی صعوبتوں کے ساتھ جان ومال کے اتلاف کا شکار بنتے رہے۔

انگریز نوازی کے ایسے واقعات سے خود سید احمد کے مانے والوں ہی کی کتابیں شور محشر جیسا ماحول پیش کرتی ہیں اور بعد کے قسمین کی کھوٹی کہانیوں کا کھلا مذاق اڑاتی ہیں۔ سوانح احمدی، مخزن احمدی، اکمل حیات وغیرہ کی عبارتیں بھی

سید صاحب کے جہاد کو انگریز مخالف برسر پیکار طاقتوں کے خلاف بتاتی ہیں مگر اس جماعت کے شر پسندوں نے تاریخ نگاروں کی روایت پر فرنگی ظلم کرتے ہوئے تاریخ سازی کی ایسی طرح ایجاد کر دیا کہ جھوٹی شہیدی کا ڈھنڈورا پیٹنے والے اب جھوٹی تاریخ کا سبق بھی عام کریں گے۔ حالانکہ سید احمد کے عہد کے قریبی مورخین وہی باتیں لکھتے رہے جو علمائے اہل سنت بتاتے رہے ہیں مگر بعد کے مورخین نے اپنی جماعت کے اکابرین کا دامن بچانے دروغ گوئی سے تاریخ کے صفحات بانٹ دیے۔

● سید احمد کے جہادی پیلو کے سلسلے میں یہ اقتباس بھی کافی واضح ہے: "سرکار انگریز کو نظر اسلام ہے مگر مسلمانوں پر کوئی ظلم اور تعدی نہیں کرتی کفر شان و کفر الحاد مذہبی اور جہاد لازمی سے روکتی ہے۔ ہم ان کے ملک میں اطمینان کیتے ہیں اور ترویج مذہب کرتے ہیں۔ وہ کبھی مانع و حرام نہیں ہوتی بلکہ ہم پر کوئی ظلم و زیادتی کرتا ہے تو اس کو سزا دینے کو تیار ہے۔ پھر ہم سرکار انگریز پر کس سبب سے جہاد کریں اور اصول مذہب کے خلاف بلا وجہ طرفین کا خون گرا دیں"۔ [1]

● یہی بات دوسرے لفظوں میں نواب صدیق حسن بھوپالی نے ترجمان وہابیہ میں بھی لکھی ہے کہ: "حضرت شہید کا جہاد انگریزوں کے خلاف نہ تھا"۔ [2]

یہی حال شاہ اسماعیل کا بھی تاریخ کے صفحات پر نظر آتا ہے۔ خود وہابی نظریات کے حامل قلم کاروں اور ان کے عہد کے قریبی تذکرہ نگاروں نے ان کی انگریزوں سے قربت اور وفاداری کے تذکرے خاص دھام کو بانٹے ہیں۔ بلکہ حکایۃ یہ ہے کہ 1857ء کے وقت وہابی دیوبندی جماعت کا وجود ہی نہیں تھا۔ چنانچہ یہ کہنا کہ اکابر دیوبند نے جنگ آزادی میں حصہ دل دار کیا اور انگریزوں کے خلاف جہاد کا علم بلند کیا شدید ترین ناانصافی اور زیادتی ہے۔

اس کے برعکس علامہ فضل حق خیر آبادی، مولانا سید احمد فرنگی محلی، مولانا احمد اللہ شاہ مدراسی، مولانا وہاج الدین مراد آبادی، مولانا لیاقت علی الہ آبادی اور دوسرے علمائے کرام نے انگریزوں کے خلاف جہاد کا فتویٰ جاری کیا اور عام مسلمانان ہند کو بیدار کیا مگر علمائے سو کا یہ طبقہ پوری چابکدستی کے ساتھ انگریزی حمایت میں قولاً و عملاً سرگرم رہا جس کی گواہی خود اظہر من الشمس ہے۔

● کلکتہ کے جلسۂ عام میں جب ایک شخص نے شاہ اسماعیل سے پوچھا کہ انگریزوں کے خلاف آپ جہاد کا فتویٰ کیوں نہیں دیتے تو شاہ صاحب نے فرمایا: "ان پر جہاد کرنا کسی طرح واجب نہیں۔ ایک تو ان کی رعیت ہیں دوسرے مذہبی ارکان کے ادا کرنے میں وہ ذرا بھی دست درازی نہیں کرتے۔ ہمیں ان کی حکومت میں ہر طرح آزادی ہے بلکہ

ان پر کوئی حملہ آور ہو تو مسلمانوں پر فرض ہے کہ وہ اس سے لڑیں اور اپنی گورنمنٹ پر آنچ نہ آنے دیں"۔ ۹

● مرزا حیرت دہلوی کی یہ تحریر بھی ملاحظہ ہو: "مولوی اسماعیل صاحب نے اعلان کر رکھا تھا کہ انگریزی سرکار پر نہ جہاد ہی طور پر واجب ہے نہ ہمیں اس سے کچھ مخاصمت ہے"۔ ۱۰

● اس تعلق سرسید نے بھی انتہائی واضح الفاظ استعمال کر کے انگریز نوازی کی ساری پول کھول دی ہے کہ:

"اس زمانے میں مجاہدین کے پیشوا سید احمد صاحب تھے مگر وہ واعظ نہ تھے۔ واعظ مولوی محمد اسماعیل صاحب تھے جن کی نصیحتوں سے مسلمانوں کے دلوں میں ایک ایسا ولولہ خیز اثر پیدا ہوتا تھا جیسا کہ کسی بزرگ کی کرامت کا اثر ہوتا ہے۔ مگر اس واعظ نے اپنے زمانہ میں کبھی کوئی لفظ اپنی زبان سے ایسا نہ نکالا جس سے ان کے ہم مشربوں کی طبیعت ذرا بھی برافروختہ ہو۔ ایک مرتبہ کلکتہ میں مسلموں پر جہاد کرنے کا وعظ فرما رہے تھے۔ اثنائے وعظ میں کسی شخص نے ان سے دریافت کیا کہ تم انگریزوں پر جہاد کرنے کا وعظ کیوں نہیں کہتے، وہ بھی تو کافر ہیں؟ اس کے جواب میں مولوی اسماعیل دہلوی صاحب نے فرمایا کہ انگریزوں کے عہد میں مسلمانوں کو کچھ اذیت نہیں ہوتی اور چوں کہ ہم انگریزوں کی رعایا ہیں اس لیے ہم پر اپنے مذہب کی رو سے یہ بات فرض ہے کہ انگریزوں پر جہاد کرنے میں ہم کبھی شریک نہ ہوں"۔ ۱۱

یہ تمام شواہد سید احمد رائے بریلوی اور شاہ اسماعیل دہلوی کو انگریزوں کا ایجنٹ ثابت کرنے کے لیے کافی ہیں مگر جماعت دیانہ کو یہ سچائی کسی طور پر ہضم ہوتی نظر نہیں آتی اور وہ اپنے اس جرم پر پردہ ڈالنے کے لیے علمائے اہل سنت کی پاکباز، محب وطن اور انگریز دشمن شخصیات کو مورد الزام ٹھہراتے ہیں تاکہ ان کا مکروہ کردار عام لوگوں کے سامنے نہ آسکے۔

﴿حوالہ جات﴾

۱۔ حیات طیبہ، ص: 260
۲۔ ایضاً، ص: 523
۳۔ حیات سید احمد شہید، ص: 293
۴۔ مقالات سرسید، حصہ نہم، ص: 145
۵۔ ایضاً، ص: 147
۶۔ ایضاً، ص: 148
۷۔ حیات سید احمد شہید، ص: 171
۸۔ ترجمان وہابیہ، ص: 21-88
۹۔ حیات طیبہ، ص: 364
۱۰۔ ایضاً، ص: 201
۱۱۔ مقالات سرسید، حصہ نہم، ص: 141

WWW.NAFSEISLAM.COM

انقلاب 1857ء میں علمائے اہل سنت کا کردار

علامہ یٰسین اختر مصباحی

پیش نظر مضمون دراصل علامہ یٰسین اختر مصباحی کا ایک بیان ہے جو جامعہ اشرفیہ مبارک پور میں تحریری مقابلے کے اختتام پر ہوا۔ یاد رہے کہ اس تحریری مقابلے میں 576 افراد نے حصہ لیا تھا جو کہ خود ایک ریکارڈ ہے۔ اختتام مقابلہ پر انعامی تقریب سے علامہ مصباحی صاحب کا یہ تاریخی و تحقیقی خطاب دراصل ہمارے درخشاں ماضی کی جھلی کھاتے ہوئے مستقبل میں سنبھل کر عملی جد وجہد کرنے پر راغب کر رہا ہے۔ ملاحظہ فرمائیں

بنگال پر قبضہ:

تاریخ میں آپ نے ضرور پڑھا ہوگا کہ انگریز ہندوستان کے اندر شاہان مغلیہ کے زمانے میں تاجر کی حیثیت سے آئے لیکن رفتہ رفتہ کئی سو سال کی محنت کے بعد انہوں نے دہلی کے تخت وتاج پر قبضہ کر لیا۔ 1757ء میں ''بکسر'' کی سرزمین پر نواب سراج الدولہ اور انگریزوں کے درمیان جنگ ہوئی لیکن کچھ ہندوستانیوں ہی کی غداری سے نواب سراج الدولہ کو شکست سے دوچار ہونا پڑا اور انگریز پورے بنگال پر قابض ہو گئے۔ کیوں کہ اس تاریخ کا صرف سیاست اور حکومت سے ربط وتعلق نہیں ہے بلکہ مذہب، علم اور اخلاق ساری چیزیں متاثر ہوئی ہیں۔ انگریزوں کی حکومت ان کے قبضے اور ان کے اقتدار سے بھی یہ چیزیں کہیں متاثر اور کہیں مغلوب ہوئی ہیں۔

''شیر میسور'' سلطان ٹیپو کی شہادت:

ہندوستان کے شیر دل حکمراں سلطان ٹیپو کو انگریزوں نے اپنے کچھ ہندوستانی غداروں کی مدد سے 1799ء میں زیر کیا اور میدان جنگ میں اپنے قلعہ کے سامنے سلطان ٹیپو کو انگریزوں نے شہید کیا اور انہیں جب یقین ہو گیا کہ سلطان ٹیپو اس دنیا سے رخصت ہو چکا ہے تو انگریز کمانڈر نے کہا تھا کہ ''آج سے ہندوستان ہمارا ہے''۔ یعنی آج صرف سلطان ٹیپو ہی نے شکست نہیں کھائی ہے بلکہ ہندوستان نے شکست کھائی ہے اور ہمیں دہلی پر قبضہ کرنے سے کوئی روک نہیں سکتا۔ سلطان ٹیپو وہی شخص ہے جس کا یہ مقولہ آپ حضرات نے بارہا

سنا ہو گا کہ "شیر کی ایک دن کی زندگی گیدڑ کی بیڑار سالہ زندگی سے بہتر ہے"۔ یعنی جیو تو شیر کی طرح ورنہ گیدڑ جیسی زندگی نہ گزارو۔

بادشاہ وقت کے اختیارات:

1803ء میں انگریزوں نے دہلی پر مکمل قبضہ کر لیا لیکن اس وقت کے شاہ عالم کو فاتح انگریزوں نے محض ایک پنشن یافتہ سلطان کی حیثیت سے باقی رکھنا اپنے حق میں مفید سمجھا اور شاہ عالم کے اختیارات انگریزوں نے اتنے محدود کر دیے کہ کہا جاتا تھا اور تاریخوں میں یہ جملہ ملتا ہے کہ "سلطنت شاہ عالم از دلی تا پالم" پالم ہوائی اڈہ مشہور ہے۔ اس وقت شاہ عالم کی سلطنت و حکومت سمٹ کر دہلی سے پالم تک رہ گئی تھی اور باقی پورے ہندوستان پر عملاً انگریز حاکم ہو گئے۔

جنگ آزادی:

یہ قبضہ یہ تسلسل جاری رہا تا آنکہ مئی 1857ء میں امجد بہادر شاہ ظفر میرٹھ میں 10 مئی کو کچھ ہندوستانی فوجیوں نے بغاوت کی اور اس کے بعد دہلی سے لکھنؤ تک زبردست جنگ شروع ہوئی۔ تقریباً ساڑھے چار مہینے تک یہ جنگ ہوئی اور دلی میں اور اس کے بعد دہلی کے تخت پر برطانیہ کی مکمل حکومت قائم ہو گئی۔ 1857ء کی تاریخ کا خلاصہ یہ ہے اور یہی درحقیقت حقیقی جنگ آزادی ہے۔

بادشاہ وقت بہادر شاہ ظفر سنی حنفی حکمران:

بہادر شاہ ظفر ایسے سنی حنفی حکمران اور خوش عقیدہ مسلمان تھے کہ میلاد و قیام کے تعلق سے حضرت علامہ فضل رسول عثمانی بدایونی سے باضابطہ انہوں نے استفتاء کیا تھا اور علامہ فضل رسول بدایونی نے اس استفتاء کا جواب دیا جو "اکمل التاریخ" کی جلد دوم کے اندر مع مکمل سوال و جواب موجود ہے اسی طرح بہادر شاہ ظفر نے سلطان الہند حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیری علیہ الرحمۃ کی شان میں ایک بہت ہی شاندار اور بہت ہی ایمان افروز منقبت لکھی ہے۔ وہ منقبت پڑھ کر اور سن کر روح وجد میں آ جاتی ہے اور ایسا لگتا ہے کہ عہد حاضر کا کوئی سنی شاعر حضرت خواجہ غریب نواز علیہ الرحمۃ کی منقبت خوانی کر رہا ہو۔ بہادر شاہ ظفر آخری مغل حکمران تھے اور بزرگوں سے یہ بے پناہ عقیدت رکھتے تھے۔ سنی حنفی حکمران تھے۔ اعراس بزرگان دین میں شرکت کرتے تھے اور علماء اہل سنت سے ان کا رابطہ تھا۔ یہ ایک پہلو ہوا حکومت اور اقتدار کے لحاظ سے۔

دہلی کے صدر الصدور مفتی صدر الدین آزردہ سنی حنفی:

دہلی کے صدر الصدور حضرت علامہ فضل امام خیرآبادی جو حضرت علامہ فضل حق خیرآبادی کے والد محترم ہیں جن کی منطق کتاب "مرقات" کے نام سے معروف ہے اور مدارس کے اندر آپ پڑھتے ہیں۔ یہ دہلی کے صدر الصدور تھے اور ان کے بعد 1857ء سے بہت پہلے آپ کے شاگرد رشید حضرت مفتی صدر الدین آزردہ دہلوی صدر الصدور ہوئے اور ان کی صدارت کی پوری مدت تقریباً چودہ سال تک تھی یعنی چودہ سال تک دہلی کے صدر الصدور تھے۔ (1827ء سے 1857ء تک صدر امین وصدر الصدور دہلی' جون 1844ء میں دہلی کے صدر الصدور بنائے گئے تھے) ان کی حیثیت یہ تھی کہ دہلی کے سارے ادباء فضلاء اور شعراء ان کے دولت کدے پر آتے تھے۔ ان سے استفادہ کرتے تھے اور سارے اصحاب علم وفضل براہ راست ان سے وابستہ تھے۔

ان کا مسلک جاننے کے لیے آپ ان کی مشہور کتاب "منتهى المقال فى شرح حديث لا تشد الرحال" مطالعہ کریں۔ یہ آپ کی کتاب ہے جو آپ نے عربی فارسی میں لکھی ہے اور تقریباً 20 سال پہلے اس کا ترجمہ لاہور سے اردو میں شائع ہو چکا ہے۔ یہ کتاب میں نے خود پڑھی ہے جس کی تمہید میں آپ لکھتے ہیں کہ اس وقت ایک جماعت پیدا ہوگئی ہے جو ائمہ مجتہدین پر طعن وتشنیع کرتی ہے اور اولیائے امت کے خلاف انگشت نمائی کرتی ہے۔ اس سے سید حامد کا اشارہ آپ کا فرقہ وہابیہ کی طرف ہے۔ اس کے علاوہ دیگر مباحث کے اندر آپ نے واضح طور پر "ابن حزم ظاہری" اور "ابن تیمیہ حرانی" کا نام لے کر تنقید وہ مت کی ہے اور ان کے مسلک کی مذمت کی ہے۔ اس منتهى المقال پر حضرت علامہ فضل حق خیرآبادی کی تحریری تصدیق بھی موجود ہے۔

یہ حضرت آزردہ بڑے جلیل القدر اور عظیم عالم وفاضل تھے اور ان کا ذاتی کتب خانہ اس زمانے میں اتنا زبردست تھا کہ تین لاکھ (300000) روپے کی کتابیں اپنی آمدنی سے انہوں نے جمع کی تھیں جنہیں 1857ء کے انقلاب میں انگریزوں نے برباد کر دیا۔ پھر آپ نے جولائی 1857ء میں انگریزوں کے خلاف جو فتوائے جہاد جاری کیا تھا اس کی پاداش میں آپ کی ساری جائیداد ضبط ہوگئی۔ بعد میں مقدمہ چلا آپ لاہور چلے گئے پھر واپس دہلی آئے اور جتنی جائیداد غیر منقولہ تھی وہ سب کی سب ضبط ہوگئی۔

سیاسی حکومت واقتدار کے لحاظ سے اس وقت جو مرکز تھا وہ بھی سنی حنفی تھا اور اس زمانے کا جو صدر الصدور تھا وہ بھی سنی حنفی تھا۔ حضرت مفتی صدر الدین آزردہ اس وقت کے علماء کے مرجع تھے۔ دہلی سے آگرہ واودھ تک کے علماء حضرت مفتی صدر الدین آزردہ کو نہایت قدر ومنزلت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔

جنگجو قائد مولانا سید احمد اللہ شاہ مدراسی سنّی حنفی:

جنگی لحاظ سے سب سے زیادہ جس نے داد شجاعت دی اس کا نام ہے مولانا سید احمد اللہ شاہ مدراسی۔ سلطان ٹیپو کی فوج میں ان کے والد بہت بڑے عہدیدار اور اپنے علاقہ کے نواب تھے۔ میر قربان علی شاہ جے پوری ایک بزرگ تھے ان سے سلسلہ چشتیہ میں بیعت کی۔ پھر ان کے بعد یہ سلسلہ قادریہ میں محراب علی شاہ قلندری گوالیاری سے طالب ہوئے۔ انہوں نے روحانی بیعت کے ساتھ ساتھ یہ بھی بیعت لی کہ انگریزوں کے خلاف تم نے جہاد کرنا ہے اور انہیں تم نے اس ملک سے باہر نکالنا ہے۔ مولانا احمد اللہ شاہ مدراسی 1846ء میں دہلی آئے اور مفتی صدر الدین آزردہ سے ملاقات کی۔ انہوں نے مشورہ دیا کہ اس کام کے لیے سب سے بہتر جگہ آگرہ ہے۔ اس زمانے میں ممالک متحدہ اودھ و آگرہ کے نام سے پورا یوپی کا یہ علاقہ جانا جاتا تھا۔ آگرہ اس وقت صدر مقام تھا جیسے لکھنؤ اس وقت صدر مقام ہے۔

مفتی صدر الدین آزردہ نے مولانا انعام اللہ گوپامئوی اور وہاں کے امرا علماء اور رؤسا کے نام خط لکھا اور کہا کہ ممکن حد تک جتنی مدد ہو سکے آپ لوگ مدد کریں۔ وہاں مولانا احمد اللہ شاہ مدراسی نے بہت جم کر کام کیا۔ دینی و تبلیغی کام بھی کیا اور جہاد کے لیے بھی لوگوں کو آمادہ کیا۔ اس زمانے میں آگرہ کیونکہ مرکز تھا اس لیے بہت بڑے بڑے علماء اور شعراء وہاں پر جمع تھے۔ حضرت مولانا فیض احمد عثمانی بدایونی بھی وہاں پر تھے۔ حضرت غلام امام شہید جو بہت مشہور عاشق رسول اور نعت گو شاعر ہیں وہ بھی تھے۔ ڈاکٹر وزیر خاں اکبر آبادی، مولانا سید محمد قاسم دانا پوری اور اس طرح کے بہت سارے علماء تھے۔ ان سب کو آپ نے ہی آمادۂ جہاد کیا۔

مولانا فیض احمد عثمانی سنّی حنفی:

یہ سارے کے سارے علماء خالص سنی حنفی تھے اور حضرت مولانا فیض احمد عثمانی بدایونی تو علامہ فضل رسول بدایونی کے بھانجے ہیں۔ بھانجہ ہونے کے ساتھ ساتھ آپ اپنے نانا سے سلسلۂ عالیہ قادریہ برکاتیہ میں باضابطہ بیعت بھی ہیں اور ان کے نانا حضرت سید شاہ آل احمد اچھے میاں قادری برکاتی مارہروی علیہ الرحمۃ کے مرید و خلیفہ تھے۔ اس وقت آگرہ کے جو بھی ممتاز علماء تھے ان میں سے اکثر حضرات 1854ء میں آگرہ کے اندر جمع تھے۔

حافظ رحمت اللہ خاں روہیلہ سنّی حنفی:

1857ء میں جب دہلی کے اندر جنگ شروع ہوئی تو قیادت ان علمائے کرام نے کی اور جہاد کی روح پھونکنے

کی ذمہ داری ان بھی حضرات نے انجام دی۔ دہلی کے اندر ساڑھے چار ماہ کی جنگ ہوئی اس میں جنرل بخت خان روہیل اور علامہ فضل حق خیرآبادی وغیرہ نے قائدانہ کردار ادا کیا۔

1857ء کی پوری جنگ جو لڑی گئی وہ دہلی میں لڑی گئی اس کے بعد "روہیل کھنڈ" (بریلی وپیلی بھیت ومراد آباد وبدایوں وشاہجہاں پور وغیرہ) میں لڑی گئی اس کے بعد لکھنؤ میں لڑی گئی۔ دہلی کا پورا محاذ دہلی کے سنی علماء اور سپہ سالاروں نے سنبھالا اور ساری کمان ان کے ہاتھ میں تھی۔ اس کے بعد بریلی میں جو جنگ لڑی گئی خان بہادر خاں' حافظ رحمت خاں روہیلہ (شہید ومدفون بریلی) کے پوتے اور حافظ رحمت خاں روہیلہ صرف ایک سپہ سالار نہیں بلکہ سنی مفتی مجاہد اور متبع شریعت بھی تھے۔

عین حالت جنگ میں بھی حافظ رحمت خاں روہیلہ جماعت کے ساتھ نماز پڑھتے تھے اور ان کے یہ پوتے تھے خان بہادر خاں روہیلہ اور ان کے معاون مفتی تھے حضرت مفتی عنایت احمد کاکوروی' جن کی "تواریخ حبیب الہ" و"علم الصیغہ" وغیرہ آپ حضرات نے پڑھی ہوگی۔ علم الصیغہ اب بھی داخل مدارس ہے اس لیے آپ میں سے اکثر حضرات نے یہ کتاب پڑھی ہوگی۔ انگریزوں نے جرم بغاوت میں آپ کو "کالا پانی" کی سزا دی تھی۔

شہزادہ فیروز شاہ تمام سلاطین مغلیہ میں واحد معروف حاجی:

شہزادہ فیروز شاہ' بریلی کے اندر تھا جب حج سے واپس آیا اور آنکھی بات یہ ہے کہ تمام سلاطین مغلیہ اور ان کے شہزادوں میں صرف شہزادہ فیروز شاہ ایسا تھا جس نے حج کیا تھا۔ اس سے پہلے یا اس کے بعد کسی بھی معروف مغل شہزادہ نے حج نہیں کیا۔ اس دور کا شہزادہ فیروز شاہ مالوہ' اندور' آگرہ' متھرا اور دھولپور سے ہوتا ہوا دہلی پہنچا اس کے بعد بریلی میں اس نے پڑاؤ ڈالا۔ روہیل کھنڈ کا یہ علاقہ جو اس وقت ہے اس میں بریلی شامل ہے' مراد آباد شامل ہے' بدایوں شامل ہے اور شاہجہانپور شامل ہے۔ روہیلہ پٹھانوں کی اس زمانے میں آبادی زیادہ تھی اس لیے اس پورے علاقہ کو روہیل کھنڈ کہا جاتا ہے۔ آج بھی وہاں اس علاقہ میں سنیوں کی غالب اکثریت ہے۔ 1857ء میں تو شاید بایدکوئی وہابی اس علاقہ میں مشکل سے ملتا ہوگا۔ پیلی بھیت مرکز تھا جہاں کی جامع مسجد حافظ رحمت خاں روہیلہ کی بنوائی ہوئی ہے۔ آپ حضرات نے تاریخ میں یہ بھی پڑھا ہوگا کہ فقیہ اسلام امام احمد رضا بریلوی علیہ الرحمۃ بھی افغانی تھے۔ بھرپیچ خاں قبیلہ سے ان کا تعلق تھا اور اوپر جا کر روہیلہ سے ان کا رشتہ مل جاتا ہے۔

بریلی شریف کی مسجد بی بی جی:

"مسجد بی بی جی" جو بریلی شریف کے اندر ہے جہاں اس وقت مفتی اعظم ہند کا دار العلوم مظہر اسلام قائم ہے۔

امام احمد رضا بریلوی نے جب 1322ھ مطابق 1904ء میں منظر اسلام قائم کیا تو پہلے باضابطہ مدرسہ کی شکل میں تعلیم اسی مسجد بی بی جی بہاری پور میں شروع ہوئی۔ یہ مسجد بھی حافظ رحمت خاں روہیلہ کی بیوی یا بیٹی یا ان کی ماں کے نام سے موسوم ہے۔ انہوں نے اس کی تعمیر کروائی تھی اور ابھی تک اس کا نام مسجد بی بی جی ہی ہے۔

روہیل کھنڈ میں مجاہدین کو مفتی عنایت احمد کاکوروی اور مولانا شاہ رضا علی بریلوی کی سرپرستی:

روہیل کھنڈ کے علاقہ میں سب سے زبردست اور خون ریز جنگ ہوئی تھی اور یہاں جتنے بھی تھے سب کے سب سنی علمائے کرام تھے جن کی کمان میں جنگ آزادی لڑی گئی۔ حضرت مفتی عنایت احمد کاکوروی و حضرت مولانا شاہ رضا علی بریلوی کی سرپرستی و پشت پناہی بریلی کے مجاہدین کو حاصل تھی۔ امام احمد رضا بریلوی کے حقیقی دادا مولانا شاہ رضا علی بریلوی فن شاعری میں حضرت مفتی صدر الدین آزردہ دہلوی کے شاگرد تھے۔ مولانا رضا علی بریلوی کے ایک چہیتے اور بہادر شاگرد مولانا فخر الدین جو سندیلہ ہردوئی کے باشندے تھے وہ انگریزوں سے جنگ کرتے ہوئے بریلی میں شہید ہو گئے۔ درجنوں گھوڑے مولانا رضا علی بریلوی کے انگریزوں کے خلاف لڑنے والے مجاہدین کے لیے وقف تھے۔

قائد تحریک آزادی علامہ فضل حق خیرآبادی سنّی حنفی:

علامہ فضل حق خیرآبادی سے مولانا سید احمد اللہ شاہ مدراسی نے لکھنؤ میں ملاقات کی اور باضابطہ تفصیلی گفتگو ہوئی۔ اس کے بعد جنرل بخت خاں سے ملاقات ہوئی۔ بہادر شاہ ظفر سے اس کے بعد مشورے ہوئے اور اس کے بعد 1857ء کی جنگ دہلی سے لکھنؤ تک لڑی گئی اور اس جنگ کی قیادت علمائے اہل سنت نے کی۔

ان میں علامہ فضل حق خیرآبادی زیادہ مشہور ہیں۔ ان کے بارے میں آپ حضرات نے پڑھا بھی ہوگا اور علماء کی زبانی سنا بھی ہوگا۔ ان کی مشہور کتاب "تحقیق الفتوی فی ابطال الطغوی" اور "باغی ہندوستان" ہے۔ "امتناع النظیر" بھی علامہ کی ایک بے نظیر کتاب ہے۔ ان کتابوں سے ان کا مسلک اور ان کی عظمت دو جمع دو چار کی طرح واضح ہے۔ علامہ فضل حق خیرآبادی نے جامع مسجد دہلی میں انگریزی اقتدار کے خلاف تقریر کی اور جہاد کا فتویٰ دیا جس کے نتیجے میں دہلی کے اندر 90 ہزار مجاہدین جمع ہو گئے۔

بلبل چمنستان رسالت ﷺ مولانا کفایت علی کافی:

حضرت مولانا کفایت علی کافی مراد آبادی رحمۃ اللہ علیہ جلیل القدر عالم اور بہت زبردست مجاہد تھے۔ مراد آباد میں مجاہدین کی آپ نے قیادت کی اور 1858ء میں گرفتاری و نمائشی مقدمہ کے بعد آپ کو پھانسی کی سزا ہوئی۔ یہ

WWW.NAFSEISLAM.COM

اتنے بڑے عاشق رسول تھے کہ تحفۂ دار کی طرف آپ جس وقت جارہے اس وقت بھی آپ کے لبوں پر ترانۂ نعت جاری تھا اور یہ اشعار پڑھتے جاتے تھے۔

کوئی گل باقی رہے گا نے چمن رہ جائے گا
پر رسول اللہ کا دینِ حسن رہ جائے گا

ہم صفیرو! باغ میں ہے کوئی دم چہچہا
بلبلیں اڑ جائیں گی سونا چمن رہ جائے گا

اطلس و کمخواب کی پوشاک پر نازاں نہ ہو
اس تنِ بے جان پر خاکی کفن رہ جائے گا

جو پڑھے گا صاحبِ لولاک کے اوپر درود
آگ سے محفوظ اس کا تن بدن رہ جائے گا

سب فنا ہو جائیں گے کافی و لیکن حشر تک
نعتِ حضرت کا زبانوں پر سخن رہ جائے گا

مولانا کفایت علی کافی اتنے بڑے عاشق رسول ﷺ اور شاعر نعت تھے کہ تحفۂ دار پر جاتے ہوئے بھی نعت رسول گنگنا رہے تھے۔ پوری تاریخ اہل سنت اور علمائے اہل سنت کی قربانیوں سے بھری ہوئی ہے۔ صرف 1857ء کی نہیں بلکہ اس سے پہلے کی اور اس کے بعد کی بھی۔

ہماری ذمہ داری:

آپ حضرات اور ہم سب کی ذمہ داری ہے کہ صحیح تاریخ دنیا کے سامنے پیش کریں اور بتلائیں کہ ہندوستان کے مسلمانوں کی قیادت ہم سنیوں نے کی ہے اور ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے خون کے قطرات ہم سنیوں نے بہائے ہیں۔ میدان جنگ میں تیر و سنان کے مقابلے کی جب بھی ضرورت پیش آئی ہے تو ہم سنیوں نے اپنا سینہ پیش کیا ہے۔ اگر کوئی نام نہاد مورخ ہماری خدمات اور قربانیوں کو نظر انداز کرتا ہے تاریخ بدلتا ہے تاریخ کا چہرہ مسخ کرتا ہے تو یہ اس کی بدبختی ہے کہ تاریخ کے ساتھ وہ انصاف نہیں کر رہا ہے بلکہ تاریخ کے ساتھ ظلم کر رہا ہے۔

1857ء کی پوری تاریخ ہمارے علمائے اہل سنت کی قربانیوں سے بھری ہوئی ہے اور دہلی سے لے کر روہیل کھنڈ تک اور روہیل کھنڈ سے لے کر لکھنؤ تک اور اس کے بعد جب انگریز اپنے مکر و فریب کے ذریعہ مجاہدین پر

غالب آگئے اور مسلمانوں کو کچھ ہندوستانیوں کی غداری کی وجہ سے شکست و ناکامی سے دوچار ہونا پڑا تو اکثر مجاہدین اور علمائے کرام شاہجہاں پور میں جمع ہوئے اور قصبہ محمدی (شاہجہاں پور) میں ایک جگہ ہے وہاں باضابطہ ایک اسلامی حکومت قائم کی۔ مولانا فیض احمد بدایونی اور مولانا وزیر اکبر آبادی وغیرہ ارکان دولت و سلطنت منتخب ہوئے لیکن وہاں بھی بعض غداروں کی وجہ سے میدان ہاتھ سے نکل گیا اور اس کے بعد شہزادہ فیروز شاہ، جنرل بخت خاں و مولانا فیض احمد عثمانی بدایونی اور اس طرح کے بہت سارے حضرات یہاں سے نکل کر نیپال چلے گئے اور پھر اس کے بعد ان میں سے اکثر کے بارے میں معلوم نہیں ہو سکا کہ کب کیسے اور کہاں ان کا انتقال ہوا؟ البتہ مولانا احمد اللہ شاہ مدراسی "قصبہ محمدی" کے آس پاس دیہات بلند و سنگھ کے قریب وہ مجاہدی کی جنگ میں شہید ہوئے۔

شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی اور علامہ فضل امام خیرآبادی کے وارث و جانشین علماء و اسلاف:

ہندوستانی تاریخ کی یہ خون ریز جنگ علامہ فضل حق خیرآبادی، مفتی صدرالدین آزردہ دہلوی علامہ حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی و حضرت علامہ فضل امام خیرآبادی کی دینی قیادت میں اور مولانا سید احمد اللہ شاہ مدراسی و جنرل بخت خاں و شہزادہ فیروز شاہ و خان بہادر خاں روہیلہ کی فوجی کمان میں لڑی گئی اور یہ سب کے سب صحیح العقیدہ سنی تھے۔ ہمارا سلسلۂ ذکر و فکر اور سلسلۂ تعلیم خیرآبادی علماء سے اور حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی سے ملتا ہے اور مذکورہ حضرات بھی انہیں سے وابستہ تھے۔

مفتی صدرالدین آزردہ دہلوی، حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی اور علامہ فضل امام خیرآبادی کے شاگرد تھے۔ حضرت علامہ فضل حق خیرآبادی، شاہ عبدالعزیز اور اپنے والد دونوں کے شاگرد تھے۔ ہم اہل سنت اور اس وقت کے جو علمائے کرام ہیں ان کا سلسلۂ تلمذ بھی حدیث کا حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی سے ملتا ہے اور معقولات کا حضرت علامہ فضل حق خیرآبادی سے ملتا ہے۔ یہ سلسلہ جو اس وقت جاری ہوا درسی، علمی اور روحانی شکل میں اب بھی جاری ہے اور ہم اسی کے وارث اور جانشین ہیں۔

حقائق دنیا کے سامنے پیش کریں:

تقریباً دو سال کی تاریخ ایسی لکھی گئی ہے کہ علمائے اہل سنت کے کردار کو فراموش کرنے یا داغ دار بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔ اب ہمارا آپ کا فرض ہے کہ اس تاریخ کو درست کریں۔ سب سے پہلے تاریخ کو سمجھیں، سمجھنے پر بھی تحقیق کریں اور اس کے بعد اس تاریخ کو درست کریں اور دنیا کے سامنے پیش کریں کہ ہم یہ ہیں اور ہمارا یہ کام ہے۔

اس تاریخ کی شکل بگڑ جانے کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ ہمارے علمائے اہل سنت کیونکہ نہایت مخلص تھے اور ان کا ہر بھی کام ہوتا تھا دین کے لیے، علم کے لیے، اپنی قوم، ملک اور وطن کے لیے ہوتا تھا جسے نمایاں کرنا اس کی فضائل کرنا علمائے اہل سنت کا مطمع نظر نہیں تھا اس لیے جو کام کیا اس کے بعد بھول گئے اور عموماً اسے ضبط تحریر میں لانے کی ضرورت نہیں سمجھی۔

ان کے برعکس دیگر علماء کا نظریہ تھا کہ جو کام ہے تھوڑا بہت وہ تو ہے ہی، جو کام نہیں ہے وہ زیادہ سے زیادہ نمایاں کیا جائے پھر اس کو بھی اپنے کھاتے میں ڈال لیا جائے اور دنیا کے سامنے پیش کیا جائے۔ ہم نے یہ کارنامہ انجام دیا اور ہم نے یہ تیر مارا وغیرہ وغیرہ۔

اس وقت کے علماء اہل سنت کا اخلاص اور ان کا جذبہ بلیغ اور نیت صالح تھی۔ اللہ تعالیٰ کے یہاں اس کا اجر انہیں یقیناً ملے گا یا ملا ہوگا لیکن ہم کیونکہ وارث ہیں جانشین ہیں اس لیے آج کے حالات میں ہماری یہ ذمہ داری ہے کہ ہم اس حقیقی تاریخ کو دنیا کے سامنے پیش کریں۔

اس پہلو پر غور کریں کہ اب یہ کمی نہیں رہنی چاہیے اور اس تاریخ کی یہ کمی دور کرنا اور اسے درست کرنا ہماری ذمہ داری ہے۔ ہمارا کام اور فریضہ ہے کہ یہ احساس ذمہ داری ہم اپنے اندر پیدا کریں۔ شعور بیدار کریں اور جو کمی رہ گئی اس پر غیر ضروری تبصرہ اور تنقید کرنے کی بجائے اس کی کمی دور کرنے کی کوشش کریں۔ باپ سے یا کسی بڑے سے اگر کوئی کمی کوتاہی نظر آجاتی ہے تو اس کو جان نہیں کیا جاتا اور اس کی تشہیر نہیں کی جاتی۔ اپنے باپ یا بڑے کو مورد الزام نہیں ٹھہرایا جاتا ہے بلکہ اس کی کوتاہی پر اور لائق بھائی، سعادت مند وارث اور سعادت مند آدمی اپنی محنت سے دور کرتا ہے۔ اپنے باپ کا، اپنے بھائی کا اور اپنے بڑوں کا نام روشن کرتا ہے۔ یہی شیوہ ہمارا ہونا چاہیے۔

جن علمائے کرام کے نام میں نے آپ کے سامنے پیش کیے ہیں۔ مثلاً حضرت مفتی صدر الدین آزردہ دہلوی، حضرت علامہ فضل حق خیر آبادی، حضرت مفتی عنایت احمد کاکوروی، حضرت مولانا کفایت علی کافی مراد آبادی، مولانا فیض احمد بدایونی اور مولانا رحمت اللہ کیرانوی وغیرہ۔ ان کے حالات کہیں مختصر اور کہیں معمولی تفصیل کے ساتھ کتابوں میں ملتے ہیں۔ ان کے حالات کو ہمیں جاننا چاہیے اور اپنی تقریر و تحریر کے اندر ان کا ذکر بیان کرنا چاہیے۔

فاتح عیسائیت مولانا رحمت اللہ کیرانوی پر بہتان:

اب دوسروں کی تاریخ کی اور تاریخ کے ساتھ مذاق کرنے کا یہ انداز اور طریقہ ہے کہ ایک بزرگ عالم دین جو اس زمانے میں مجاہد آزادی بھی تھے مولانا رحمت اللہ کیرانوی جن کا ذکر ہو چکا ہے۔ 1857ء کے بعد جب

گرفتاری کا سلسلہ شروع ہوا تو آپ 1858ء میں مکہ مکرمہ کو ہجرت کر گئے۔ دار العلوم دیوبند 1866ء میں قائم ہوا جس کے قیام سے آپ 8 سال پہلے ہندوستان چھوڑ چکے تھے لیکن ایک عرب مورخ لکھتا ہے کہ مولانا رحمت اللہ کیرانوی دار العلوم دیوبند کے فاضل اور وہاں کے فارغ التحصیل تھے۔ جس ادارے کے قیام سے 8 سال پہلے مولانا رحمت اللہ کیرانوی ہندوستان چھوڑ چکے تھے اس کے بارے میں کہا جارہا تھا کہ دار العلوم دیوبند کے فارغ ہیں۔

مولانا رحمت اللہ کیرانوی وہ تھے کہ جب مصنف براہین قاطعہ خلیل احمد انبیٹھوی سہارن پوری اور حضرت مولانا غلام شبیر قصوری کے درمیان 1306ھ میں بہاولپور پنجاب کے اندر مناظرہ ہوا اور اس کی روداد "کشف تلبیس الوکیل عن اوهن الرشید والخلیل" کے نام سے شائع ہوئی تو طبع دوم کے اندر مولانا رحمت اللہ کیرانوی کی تحریری تصدیق موجود ہے۔ آپ حضرات بھی پڑھ سکتے ہیں۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ "جب تک رشید (یعنی رشید احمد گنگوہی) کو رشید (ہدایت یافتہ) کہتا تھا تو میرے بہت نار شد لگا"۔ ایسے سنی عالم کو بھی اپنا بنانے اور دار العلوم دیوبند کا فارغ بتانے میں ذرا بھی دریغ اور ذرا بھی تکلف اور جھجک محسوس نہیں کرتے۔ اس طرح سے پوری تاریخ کو کھنگالنے کی پوری تاریخ کو جانچنے کی پوری تاریخ کو صحیح طور پر پیش کرنے کی ضرورت ہے۔

وہابی مسلک ونظریے کے حامل افراد کا جنگ آزادی میں کردار:

تاریخی حقیقت کا ایک ناقابل تردید پہلو یہ ہے کہ رائل ایشیاٹک سوسائٹی لندن اور کلکتہ سے باترتیب 1825ء اور 1838ء میں انگریزی اور اردو میں چھپنے والی کتاب تقویۃ الایمان از شاہ اسماعیل دہلوی کے وہابی مسلک ونظریے سے وابستہ علماء کا مجموعی طور پر جنگ آزادی 1857ء سے دور دور تک کوئی تعلق نہیں آتا۔ یہ بات سر سید نے اپنی کتاب اسباب بغاوت ہند مطبوعہ 1858ء میں صراحت کے ساتھ تحریر کی ہے۔ اسی طرح حقائق سر سید حصہ شانزدہم کے حاشیہ میں صاف صاف لکھا ہوا ہے کہ انگریز کے خلاف جنگ میں حصہ لینے والے سب کے سب وہ علمائے کرام شامل تھے جو سید احمد رائے بریلوی اور شاہ اسماعیل دہلوی کے شدید ترین مسلکی مخالف تھے۔ آزادی ہند کے بعد لکھی گئی کتاب علمائے ہند کا شاندار ماضی حصہ چہارم میں شہید المسلمانی مورخ سید محمد میاں دیوبندی نے لکھا ہے کہ علمائے صادق پور پٹنہ تحقیقی طور پر جنگ آزادی سے بالکل الگ تھلگ رہے اور عبد الرحیم صادق پوری کی تحریر کے مطابق یہ لوگ 1857ء کے انقلاب کے مخالف تھے۔

جنگ آزادی کے سُنّی ادیب

اسد نظامی

جنگ آزادی کے سنی ادیبوں میں جانشین حضرت علامہ فضل حق خیرآبادی علیہ الرحمۃ کا مرکزی کردار رہا ہے۔ علامہ فضل حق کی شہرہ آفاق تصنیف "تحقیق الفتاویٰ فی ابطال الطغویٰ" اس کی تین دلیل ہے۔ اس مضمون کے ضمن میں علامہ کا ذکر خیر نہیں ہے لہٰذا ہم علامہ کی ادبی خدمات کا ذکر "علامہ کی تصنیفات" کے ضمن میں کریں گے۔

1857ء کی جنگ آزادی میں جہاں علماء و مشائخ اہل سنت نے فرنگی تسلط کے خلاف کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں وہیں سنی ادیب حضرات نے بھی برطانوی استعمار کے خلاف بذریعہ قلم جو بھرپور کردار انجام دیا ہے اسے ہرگز فراموش نہیں کیا جا سکتا۔

بھلا دیں نہیں آساں شہیدوں کے زمانے کو زمانہ چاہیے خونی نوشتوں کے مٹانے کو

ذیل میں چند ادباء کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔

● حضرت مولانا محمود الخیر انصاری قریشی شہید:

ملتان کے مشہور علمی خاندان قوم انصاری (جو کہ حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ کی اولاد میں سے ہے اور حضرت محمد بن قاسم کے ہم راہ اسلام لے کر ملتان میں قوم پذیر ہوا) کی مشہور و معروف علمی شخصیت حضرت علامہ قاضی محمود الخیر شاہ انصاری وہ شخصیت تھی جس نے اپنی خداداد صلاحیت کے پیش نظر اپنے مخصوص ادبی انداز میں برطانوی استعمار کے خلاف ہندوستانی مسلمانوں کو پیغام بیداری دیا۔ اس اہم موضوع پر دستی پاپر لیس سے اشتہار، پمفلٹ یا کتابچے شائع کرنے کا جو اہم فریضہ انجام دیا ان میں سے سر دست مختصر لفظوں میں "برطانوی استعمار کے نام" سے ایک اقتباس ہدیۂ ناظرین کیا جاتا ہے:

برادران اسلام! جب سے یہ برطانوی ہم پر مسلط ہونے کے خواب دیکھ رہے ہیں بلکہ صوبہ بنگال اور دیگر متعدد علاقوں پر بزور و دجل وسالوں کے مسلط ہو چکے ہیں' ایسا کرنے کا انہیں ہرگز حق نہیں تھا۔ کیوں کہ اگر نورجہانگیر کے دور حکومت میں بطور ایک مہمان کے آئے تھے بطور حاکم نہیں۔

اے برطانوی حکام! تم غاصب ہو۔ ہمارے ملک کے بعض حصوں پر تم نے جو قبضہ کر رکھا ہے وہ سراسر ناجائز ہے۔ بالآخر بالادستی ہمیں حاصل ہوگی اور تمہیں ایک نہ ایک دن اس ہندوستان سے بے نیل ومرام ہو کر واپس لوٹنا ہی پڑے گا۔!

مولانا محمد دم محمود الخیر شاہ شہید علیہ الرحمہ کی جرأت ملاحظہ فرمایئے کہ برطانوی سامراج کی پرواہ کیے بغیر باطل کے سامنے ڈٹ گئے اور باطل کے زعم کو پاش پاش کرنے کا تہیہ کر کے میدانِ عمل میں آگئے۔ جب اسی قسم کے جرأت مندانہ اقدام کی وجہ سے اشتہارات کا سلسلہ شروع ہوا تو انگریزوں نے ایڈورڈ نامی ایک شخص اور دیگر سپاہیوں کو بھیج کر خونی برج ملتان کے قریب ایک مسجد میں آپ کو شہید کرا دیا۔ تاریخ شہادت 22 رمضان المبارک ہے۔

☆☆☆☆

● حضرت قاضی پیر بخش جام پوری:

قصبہ جام پور ضلع ڈیرہ غازی خان میں پنجاب کا وہ عظیم ہیرو گزرا ہے جس نے دنیائے سنیت کی بہترین خدمت کی ہے۔ آپ حضرت مولانا فضل امام خیرآبادی و مفتی صدرالدین آزردہ دہلوی کے ممتاز تلامذہ میں سے تھے۔ آپ میں شعروشاعری کے ذوق کے ساتھ ادبی ذوق کا جذبہ بھی کافی تھا۔ آپ ضلع ڈیرہ غازی خان میں برطانویوں کے خلاف بے شمار دستی اشتہارات لکھ کر درودیوار پر رات کی تاریکی میں چسپاں کرتے تھے۔ چنانچہ آپ کی تحریر کا اقتباس بھی یہاں قارئین حضرات کی دل چسپی کے لیے درج کیا جاتا ہے:

میرے ہم وطن دوستو!

یہ برطانوی استعمار جو روز بروز اپنا پاؤں پھیلائے جا رہا ہے' سکھا شاہی سے بھی بدترین ہے۔ سکھ تو گرونانک کے پرستار تھے یہ گورے مشیٹ پرست ہیں جو کہ مسلمانوں کے لیے ہم قاتل سے ہرگز کم نہیں' لہٰذا اسے اپنے ناپاک منصوبوں میں ہرگز کامیاب نہ کیا جائے بلکہ جہاں تک ہو سکے ان عیسائیوں کی حوصلہ شکنی کی جائے تاکہ یہ لوگ ہم پر مسلط نہ ہو سکیں۔

فقط والسلام مع الاکرام

فقیر پیر بخش قریشی جام پوری ضلع ڈیرہ غازی خاں' پنجاب ۔

جب اس قسم کے دستی اشتہارات برطانوی حاشیہ برداروں کے توسط سے برطانوی حکام کی نظر سے گزرے تو رات کی تاریکی میں ملتان سے ایک فوجی دستہ بھیجا گیا۔ مولانا پیر بخش قریشی اپنے گھر میں تشریف فرما تھے برطانوی

فوج نے گولیوں کی بوچھاڑ سے آپ کو شہید کر دیا۔

☆☆☆☆

● جناب امانت علی خاں چشتی نظامی' پاک پتن شریف:

جناب امانت علی خاں چشتی شہید علیہ الرحمہ جو کہ حضرت مولانا عبدالرحمن دیبال پوری کی اولاد امجاد میں سے تھے اور حضرت مخدوم وارث خواجہ فرید الدین مسعود گنج شکر رحمۃ اللہ علیہ کے خاندان سے بہ سلسلۂ چشتیہ منسلک تھے۔ جب برطانوی رام راج کا چرچا ہوا تو آپ نے بھی منظرِ عام پر آکر برطانوی تسلط کے خلاف اپنی جدوجہد شروع کر دی۔

آپ بلند پائے کے عظیم ادیب تھے۔ آپ کی تحریروں سے یہ پتہ چلتا ہے کہ علم وادب میں آپ کا کس قدر ارفع واعلیٰ مقام تھا کہ جس کو سمجھنے کے لیے چشمِ عقل خیرگی کی حالت میں ہے۔ ذہن عاجز ہے کہ ایسی بلند ہستیوں کا خدا جانے کیا مقام ہوگا؟

آپ نے برطانوی راج کے خلاف جو تحریریں قوم کے سامنے پیش کیں ان میں سے صرف چند سطور حسب ذیل درج ہیں: برادرانِ اسلام! کہ ملک ماہند فرنگی تثلیث پرستان روز بروز حاوی می شدہ اند۔ ایں فرنگیاں می خواہند کہ بر ملکِ ہندوستان مسلط شدیم وحکم تثلیث پرستی نافذ کنیم واز قلوبِ مسلماناں جذبۂ جہاد را کالعدم قرار دادیم۔ ایں مذموم منصوبہ است لہٰذا باایں فرنگیانِ تثلیث پرستان جہاد کردن از حد ضروری است واز میدانِ جہاد فرار شدن وحاشیہ آرائی فرنگیان کردن ہرگز روا نیست۔

خادم درگاہ فرید

فقیر امانت علی چشتی' پاک پتن شریف' پنجاب

یکم محرم الحرام 1272ھ ۳ج

☆☆☆☆

● میاں فضل کریم بدایونی شہید:

آپ حضرت مولانا فیض احمد عثمانی بدایونی علیہ الرحمۃ کے ماموں زاد بھائی تھے۔ آپ حسب الامر حضرت مولانا فضل حق خیرآبادی علیہ الرحمہ برطانوی سامراج کے خلاف میدانِ علم وعمل میں نبرد آزما ہوئے۔ آپ جید عالمِ دین ہونے کے علاوہ ایک زبردست ادیب شہیر تھے۔ صاحب رسالہ ذوالقرنین بدایوں نے اس طرح لکھا

ہے: "حضرت مولانا میاں فضل کریم صاحب بدایونی شہید علیہ الرحمۃ نے ادبی رنگ میں جس طرح برطانوی ادیبوں کا مقابلہ کیا ہے اس کی سرزمین بدایوں میں نظیر نہیں ملتی۔ آپ زبردست ادیب شہید تھے۔ آپ نے قلم کے ذریعہ برطانوی سامراج کا مقابلہ کیا ہے۔ [4]

آخری عمر میں جب بدایوں پر انگریزوں نے حملہ کیا تو اس وقت آپ شمشیر بکف ہو کر میدانِ رزم گاہ میں صف آرا ہوئے اور اسی میدان میں جامِ شہادت نوش فرما گئے۔ یہ واقعہ 17 رمضان المبارک کو پیش آیا۔

☆☆☆☆

● حضرت مولانا امام بخش بہاول پوری شہید:

آپ مولانا محمد حسین کے ماموں زاد اور مولانا غلام رسول بہاول پوری کے عم زاد تھے۔ جب فرماں روایانِ بہاول پور نے انگریزوں کی خوشہ چینی کی اور مجاہدینِ آزادی کو صفحۂ ہستی سے ختم کرنا چاہا تو آپ تن تنہا نوابوں کے خلاف ڈٹ گئے۔ آپ نے چند ایک خطوط لکھے جس میں نوابانِ بہاول پور کی برطانوی حاشیہ آرائی پر اظہارِ افسوس کیا اور برطانوی سامراج کے خلاف اقدام اٹھانے کو عین اسلام قرار دیا تو بہاول پور کے حکمرانوں نے آپ کی غیرت کو چھیڑ نہ کیا بلکہ کسی سپاہی کو بھیج کر آپ کو شہید کرا دیا۔ [5]

آپ کی شہادت 17 محرم الحرام 1267ھ کو ہوئی۔ آپ کا مزار شریف حضرت مولانا غلام رسول چنگر کے مزار کے عقب میں بستی ملوک شاہ کے گورستان میں واقع ہے۔

☆☆☆☆

● جناب فضل محمود انصاری شہید ملتان:

جناب فضل محمود انصاری، حضرت حافظ محمد جمال اللہ چشتی نظامی ملتانی قدس سرہ العزیز کے مرید و خلیفہ تھے۔ آپ کو علم و ادب سے بے حد شغف تھا۔ آپ کے چند ایک انگریزوں کے خلاف باغیانہ خطوط ہماری نظر سے گزرے ہیں جو فارسی زبان میں ہیں۔ [6]

جب ملتان پر انگریزوں نے حملہ کیا تو آپ حضرت منشی غلام شہید ملتانی کے ہم راہ تھے۔ ملتان کے قلعہ پر مولانا فضل محمود انصاری انگریزوں کے ہاتھوں جامِ شہادت نوش فرما گئے۔ آپ کا مزار شریف موضع ڈومرہ ویراں غائب ملتان کے قریب گورستان میں موجود ہے۔ 17 ذی الحجہ 1267ھ تاریخِ وصال ہے۔

☆☆☆☆

● مولانا عبدالعزیز انصاری ثانی:

آپ حضرت مولانا عبدالعزیز انصاری کے پرپوتے اور ملتان کے باشندہ تھے۔ جب انگریزوں نے ملتان پر حملہ کیا تو آپ نے اپنے وعظ کے درمیان برطانویوں کے خلاف تقریریں کیں۔ آپ ممتاز ادیب اہل سنت اور حضرت خواجہ محمد سلیمان تونسوی علیہ الرحمہ کے مرید وخلیفہ تھے۔ آپ کی تحریروں سے آپ کی علمی اور ادبی فنی قابلیت واضح ہے۔ آپ انگریزوں کے ہاتھوں ملتان کے قلعہ پر شہید ہوگئے۔ تاریخ شہادت 17 ذی الحجہ 1267ھ ہے۔ ؎

☆☆☆☆

﴿حوالہ جات﴾

۱ جناب مولانا عبدالہادی صاحب، قلمی مخطوطہ، ص: 9، مملوکہ اسد نظامی

۲ جناب فضل عثمانی صاحب ڈیرہ غازی خاں، قلمی مخطوطہ، ص: 121، مملوکہ جناب قاضی فضل رسول جام پوری مرحوم

۳ جناب محمود علی صاحب پاک پتن شریف، تاریخ اجودھن، ص: 141، مطبوعہ رام پور

۴ مرزا احسان خاں بدایونی، رسالہ ذوالقرنین بدایوں، ص: 17، اپریل 1951ء

۵ حضرت مولانا عبدالمجید صاحب خیرپوری، قلمی مخطوطہ، ص: 241، مملوکہ اسد نظامی

۶ حضرت مولانا قاضی نور مصطفیٰ صاحب انصاری، تاریخ انصاریاں، قلمی مخطوطہ، ص: 609 مملوکہ اسد نظامی

۷ ایضاً

WWW.NAFSEISLAM.COM

جنگ آزادی کے سُنّی شعراء

اسد نظامی

1857ء کی جنگ آزادی میں جہاں علماء ومشائخ نے فرنگی تسلط کے خلاف اپنی مخلصانہ کوششیں کیں وہیں پر شعرائے اہل سنت نے بھی عوام میں شعور آزادی کو ابھارنے میں نمایاں حصہ لیا۔ اس نتیجے میں ان شعرائے اہل سنت کو روزن دیوار میں چنوایا گیا' کسی کو تختۂ دار پر کھنچوایا گیا' کسی کو توپ اور بندوق کی گولیوں کا نشانہ بنایا گیا اور کسی کو مجبوس زنداں کر دیا گیا۔ غرضیکہ اس ہول ناک دور میں کوئی سنی عالم' شیخ یا شاعر ایسا نہیں تھا جو برطانوی حکام اور افواج کی چیرہ دستیوں سے محفوظ رہا ہو۔ بر سبیل تذکرہ قارئین سے مختصر الفاظ میں ان شعرائے اہل سنت کا تعارف کرایا جارہا ہے جنھوں نے دنیا وما فیہا سے بے نیاز ہو کر علم سنیت کو بلند رکھنے کی ہر ممکن جدوجہد کی۔

● حضرت مولانا لیاقت علی الہ آبادی:

آپ علاقہ چائل ضلع الہ آباد کے باشندہ اور علمی خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ فن شاعری میں حضرت مولانا فضل حق خیرآبادی علیہ الرحمۃ کے ممتاز تلامذہ میں سے تھے۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد درس وتدریس میں مشغول رہے پھر جب حضرت مولانا فضل حق خیرآبادی نے انگریزوں کے خلاف فتوائے جہاد دیا تو آپ نے بھی درس وتدریس کو خیر باد کہہ کر فرنگی تسلط کے خلاف اعلان جہاد کر دیا۔

جب آپ نے اعلان جہاد فرمایا تو الہ آباد کی فوجی رجمنٹ نمبر 6 نے جس میں بیش تر حضرات مولانا صاحب کے مرید ومعتقد تھے' اعلان جہاد سنتے ہی فوج سے باغی ہو کر برضا ورغبت اختیار کر لی اور تمام کے تمام حضرات نے مولانا کی خدمت میں جمیع اسلحہ وہتھیار حاضر ہو کر حضرت کو اپنا امیر کارواں بنالیا۔

جب برطانوی کپتان الیگزینڈر پرچ نے فوج میں بغاوت دیکھی تو وہ کپتان راج گھاٹ کے قلعے میں قلعہ بند ہو گیا اور اپنے حامیوں سمیت قلعہ کے اندر سے گولہ باری شروع کر دی۔ مولانا اور آپ کے ساتھی قلعے کا محاصرہ کر کے اس میں داخل ہونے میں کامیاب ہو گئے جس میں رام چند توپچی اور کپتان الیگزینڈر پرچ اور انہیں جیسے برطانوی افواج کے فوجی جرنیل مارے گئے۔

حضرت مولانا لیاقت علی کی مجاہدانہ قیادت نے قلعہ فتح ہونے کے بعد الہ آباد میں جہاں جہاں بھی برطانوی فوج کے ہیڈ کوارٹر تھے ان سے مقابلہ کر کے سب کو جہنم واصل کر دیا۔ ڈاکٹر پرل کی کوٹھی، مسٹر لارڈ ٹیل کا ڈاک خانہ اور دیگر اہم مقامات کو ان مجاہدین نے تہس نہس کر دیا۔

حضرت مولانا نے بہادر شاہ ظفر کا علم برنگ سبز لے کر الہ آباد میں نصب کر دیا اور فرمان شریعت محمدیہ علیہ التحیۃ والثناء سنا کر شرعی قوانین کا اجرا کر دیا۔

6 جون 1858ء کو برطانوی پلٹن نے الہ آباد پر حملہ کر دیا جس میں تمام مجاہدین شہید ہو گئے اور مولانا کو زندہ گرفتار کر کے انڈمان بھیج دیا گیا۔ آپ ایک بہترین سپاہی کے علاوہ ایک لازوال شاعر بھی تھے۔ آپ کے دیوان سے پتہ چلتا ہے کہ آپ نے رزمیہ اشعار اور رباعیاں بھی لکھی ہیں:

جاتے کفن میں باندھ کے مقتل میں اے علی
ہم بھی بنیں گے جامِ شہادت بھرے ہوئے

☆☆☆☆

● مولانا رضی الدین خاں بدایونی شہید:

آپ علم و ادب میں حضرت مولانا امام بخش صہبائی شہید کے ممتاز تلامذہ میں سے تھے۔ آپ عربی و فارسی کے ایک بہترین عالم و محقق تھے۔ حضرت مولانا فیض احمد عثمانی بدایونی کے ساتھ مل کر برطانوی سامراج کے خلاف نواب بہادر خاں کی معیت میں بدایوں کی سرزمین پر ایک آزاد حکومت قائم کر دی جس میں نواب بہادر خاں کو مجاہدین آزادی کا سپہ کاروں بنا کر برطانوی حکام کے خلاف اپنی جدوجہد شروع کر دی۔ آپ کے قافلے نے برطانوی افواج پر بے شمار حملے کیے جن میں لاتعداد برطانوی سپاہیوں کو کیفر کردار تک پہنچایا گیا۔

جب مولانا صاحب کو انگریزوں نے گرفتار کر لیا تو انگریزوں میں کارمیکل نے آپ کو ہر چند کہا کہ آپ بغاوت میں حصہ لینے سے انکار کر دیں تو ہم آپ کو رہا کر دیں گے، مگر آپ نے گرج کر کہا کہ ہم آپ کو غاصب سمجھتے ہیں تو غاصب سے نجات پانا ہمارا اولین فریضہ ہے۔ ہم آخر دم تک آپ جیسے ظالم و جابر اور غاصبین کے خلاف ہر ممکن جہاد کریں گے۔

بقول صاحب "تاریخ بدایوں" کارمیکل نے آپ کو بغاوت کرنے کی پاداش میں بندوق کی گولی سے شہید کر دیا۔ مولانا رضی الدین بدایونی بڑے مخلص مسلمان تھے، مذہبی علوم و معارف سے آپ بخوبی واقف تھے۔ حریت فکر

و نظر کے ساتھ ساتھ فنونِ حرب و ضرب میں آپ کو مہارتِ تام حاصل تھی۔ جہاد کو آپ فرضِ عین جان کر انگریزی حکام سے برسرِ پیکار رہے۔

آپ ذوقِ شعر و سخن کے بھی بخوبی شناسا تھے۔ جب انگریزوں کے خلاف اپنا علمِ جہاد بلند کیا تو آپ نے رزمیہ اشعار کہے جس سے عوام میں برطانویوں کے خلاف یک لخت لاوا ابلا اور عوام برطانوی افواج کے خلاف میدانِ جہاد میں ان غاصبین کو تہ تیغ کر کے فی النار کرتے رہے۔ 21 اپریل 1859ء کو آپ نے شہادت کا مرتبہ حاصل کیا۔

☆☆☆☆

● مولانا مفتی صدرالدین آزردہ:

خطہ دہلی کے ارباب فکر و سخن و حلقۂ دانش کے شہنشاہ و نیر تاباں کہ جن کی علمی صلاحیت ایک مسلمہ حقیقت تھی اور اس کا اعتراف غالب و مومن و نیر و تاباں جیسے لوگ کرتے تھے۔ آپ کی قابلیت کے سبھی معترف نظر آتے ہیں۔ وہ بزمِ فکر و سخن تحسینِ تکمیل ہی نظر آتی جس بزم میں حضرت قبلہ مفتی صاحب شریک نہ ہوتے۔

جب مغلیہ خاندان کی حکومت سمٹ کر دہلی کے لال قلعے تک محدود ہو گئی اور برطانوی حکام تمام ملک پر اپنی عیاری کے بل بوتے پر محیط و مسلط ہو گئے تو بزم ہائے شعر و مجالسِ فکر و سخن آہستہ آہستہ سُونی ہوتی چلی گئیں۔ ارباب شعر و سخن کے قدر داں شہر ہے اور بہادر شاہ ظفر کی حکومت کا طنطنہ آخری ہچکی لے کر عدمیت کے عالم میں ڈوب گیا۔

اندریں حالات بزمِ فکر و سخن کا انعقاد ناممکن ہو گیا اور علمی و ادبی مجالسیں سُونی ہو گئیں۔ امتدادِ زمانہ نے فقدان کا تلاطم برپا کر دیا اور احباب منتشر ہو گئے۔ حضرت قبلہ مفتی صاحب پر انگریزوں کی مخالفت اور فتوائے جہاد پر دستخط کرنے کی پاداش میں ہر سمت سے ابتلا و آزمائش کے طوفانوں کے لاوے بہا اٹھے چنانچہ حضرت قبلہ مفتی صاحب خود ارشاد فرماتے ہیں:

آفت اس شہر پہ قلعے کی بدولت آئی
واں کے اعمال سے دہلی پہ بھی شامت آئی
روز موعود سے پہلے ہی قیامت آئی
کالے میرٹھ سے یہ کیا آئے کہ آفت آئی
گوش زد تھا جو فسانوں سے وہ آنکھوں دیکھا
جو سنا کرتے تھے کانوں سے وہ آنکھوں دیکھا

WWW.NAFSEISLAM.COM

قبلہ مفتی صاحب اس دور کی ابن الوقتی اور طوائف الملوکی پر نوحہ کرتے ہوئے بڑے رنج و قلق کے ساتھ اظہار خیال فرماتے ہیں:

غم بربادی دلی میں بجائے مے ناب
خون دل پیتے ہیں اب بادہ کشان دلی
زمزمے بھول گئے نغمہ طرازاں یکسر
ہے ہر اک نوحہ گر و مرثیہ خوان دلی

مولانا امام بخش صہبائی کی شہادت پر یہ شعر پڑھا

کیوں کر آزردہ نکل جائے نہ سودائی ہو
قتل اس طرح سے بے جرم جو صہبائی ہو

پھر ارشاد فرماتے ہیں

گو اسیری میں ہوں پر مثل اسیر قفسیر
نہ غم قید نہ پروائے رہائی مجھ کو

بقول صاحب حدائق الحنفیہ: "تمام جائیدادیں واملاک جو بھی تھیں سال کی ملازمت میں پیدا کی ہوئی تھی سرکار میں ضبط ہوگئی بلکہ جہاد کے فتویٰ کے اشتباہ میں چند ماہ نظر بند رہے"۔

برطانوی سامراج سے رزم و بزم میں مقابلہ کرنے میں آپ کا نمایاں ہاتھ رہا ہے۔ بعض لوگ آپ کی شخصیت کو مجروح کرنے کی سازش کے پیش نظر آپ کے فتوائے جہاد کو مشکوک قرار دیتے ہیں اور بالخیر کو بالجبر کا الزام لگا کر آپ پر انگریز پرستی کی تہمت لگانے میں مصروف نظر آتے ہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ

کور چشمان بازو خواہند

آپ کی عمر 81 سال کی تھی جبکہ آپ کا وصال شریف 24 ربیع الاول 1285ھ میں بہ عارضہ فالج کے ہوا۔

☆☆☆☆

● مولانا امام بخش صہبائی شہید:

آپ کا مولد قصبہ سرسہ تھا۔ آپ حضرت مخدوم جلال الدین قصبہ سرسہ چشتی علیہ الرحمۃ کی اولاد میں سے تھے۔ آپ کے والد ماجد کا اسم گرامی مولانا محمد بخش قصبہ سرسہ علیہ الرحمۃ تھا۔ آپ اردو، فارسی اور عربی علم و ادب پر مکمل

طور پر عبور رکھتے تھے اور آپ کی علمی قابلیت ایک مسلمہ امر تھی۔

سرسید احمد خاں علی گڑھی نے آپ کی ذات گرامی کے متعلق ان الفاظ میں اپنے خیال کا اظہار کیا ہے: "بریلوی مکتب فکر کے مشہور عالم دین مولانا امام بخش صاحب صہبائی جیسے محقق کا اگر ہم تذکرہ نہ کریں تو یہ سراسر بے انصافی ہوگی کہ جس نے دنیائے علوم وفنون میں اپنی عظمت وشرافت اور علوم ومعارف کا سکہ بٹھادیا۔ یہ بات صرف معاصرین میں نہیں بلکہ میرا خیال یہ ہے کہ ہوسکتا ہے کہ اس ہندوستان میں قیامت تک صہبائی جیسا شخص پیدا بھی نہ ہو"۔

حضرت علامہ صہبائی شہید کے متعلق یہ رائے صرف سرسید احمد خاں علی گڑھی کی ہی نہیں بلکہ آپ کے تمام معاصرین ادبا، فضلا، نقبا اور محققین علم وادب بھی آپ کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کرنے کا شرف حاصل کرنے کی سعادت سے بہرہ ور ہوتے رہے۔ زوال خاندان مغلیہ اور برطانوی مسلطین کے بعد علمی وادبی محافل روبہ زوال ہوگئیں اور افراتفری وابتری پھیلتی چلی گئی۔

چنانچہ شیخ محمد اسماعیل پانی پتی آپ کے متعلق رقم طراز ہیں: "دہلی میں جتنے اہل کمال اس وقت جمع تھے ان میں فارسی دانی اور علم وبلاغت میں کوئی شخص صہبائی سے بڑھا ہوا نہ تھا۔ غالبؔ، ذوقؔ، آزردہؔ، منیرؔ، شیفتہؔ، مومنؔ سب ادبائے عصر کو صہبائی کی فضیلت علمی کا اعتراف تھا"۔

علم وادب کی محفلوں میں گو آج کل غالبؔ کی علمیت کا چرچا ہے مگر افسوس ہے کہ غالب کے مداحین غالب کا تذکرہ کرتے وقت حضرت علامہ صہبائی جیسی شخصیت کو یکسر فراموش کر جاتے ہیں حالانکہ غالب جیسا شخص حضرت صہبائی کی علمی فقاہت کا نہ صرف معترف ہے بلکہ اپنے آپ کو ایک مقام پر علامہ کا شاگرد تصور کرتا ہے: "میں حضرت علامہ امام بخش صاحب صہبائی کی عظمت وعلمی فقاہت کا نہ صرف معترف ہوں بلکہ علوم ومعارف میں علامہ کا شاگرد بھی ہوں"۔

غالبؔ کے اعتراف سے بھی یہ بات مترشح ہے کہ علم وفضل میں علامہ صہبائی جیسا بحر ذخار کم از کم آپ کے معاصرین میں تو نہ تھا۔

جب حضرت علامہ نے انگریزی سامراج کے خلاف اپنی جدوجہد کا آغاز کیا اور اپنے علم وادب کی روشنی میں شعور آزادی کا جذبہ ابھارنے کی مساعی جمیلہ شروع کی تو برطانویوں نے آزادی کا علامہ صہبائی کا نعرہ ناپسندیدہ قرار دیا اور آپ کو گرفتار کر کے مسجد میں شہید کر دیا۔

بقول شیخ محمد اسماعیل پانی پتی: "جب دہلی میں 1857ء کا ہنگامہ شروع ہوا تو صہبائی خانہ نشین ہو کر بیٹھ گئے"

مگر زیادہ دیر تک کنج عزلت اور گوشۂ عافیت ان کو پناہ نہ دے سکا۔ 20 دسمبر 1857ء کو پانچ ماہ کے محاصرہ کے بعد انگریزوں نے دہلی فتح کر لیا جس کے بعد انگریز فوج نے دہلی کے مظلوم اور بے کس باشندوں پر وہ ظلم توڑے جن کی انتہا نہیں۔

مولانا صہبائی ایک دن محلّہ کی مسجد میں نماز فجر ادا کر رہے تھے کہ گورے مسجد میں گھس آئے اور سارے نمازیوں کے ساتھ ان کو اور ان کے دو بیٹوں کو گرفتار کر کے لے گئے، چلتے چلتے محلّہ کے 1400 آدمی پکڑے اور سب کو جمنا کے کنارے گولی ماردی"۔

حضرت علامہ کی علمی قابلیت کے تمام معاصرین نہ صرف معترف تھے بلکہ بعض تو خود کو علامہ صہبائی کا شاگرد وتلمیذ قرار دینے میں فخر وانبساط محسوس کرتے تھے۔ حضرت علامہ کی رزمیہ شاعری کا صرف ایک شعر ہمیں مل سکا ہے

دامن سے ڈھاک جیسے کوئی لے چلے چراغ
جاتے ہیں سوزِ عشق لیے یوں کفن میں ہم

حضرت علامہ صہبائی کی شہادت پر حضرت علامہ مولانا شاہ احمد رضا خاں بریلوی علیہ الرحمۃ نے چند شعر کہے وہ یہ ہیں:

ندانم کجا رفت ای نقش پاک — فلک برد یا ماند بر روے خاک
ندانم کسے داد او را کفن — دیا ماند چوں سایہ بر خاک تن
ندانم چہ کرد است با او سپہر — ز جامہ کفن کر دیا تاب مہر
نجانش نمودند او را نہاں — دیا مہ تقع شد سوے آسماں
کسے فاتحہ ہم برو خواندہ است — بہ عطر گلابی بر افشاندہ است
کدا مے گل و بلبل و بادِ دشت — نجانش بہ حسنِ عقیدت گزشت

☆☆☆☆

● مولانا اعجاز حسین سوز شہید:

مولانا اعجاز صاحب سوز شہید علامہ امام بخش صہبائی شہید علیہ الرحمۃ کے خواہر زادہ تھے۔ آپ نے تعلیم وتربیت اپنے ماموں علامہ صہبائی کی زیر نگرانی حاصل کی۔ جب برطانوی حکام غداروں کی غداری اور سازشیوں کی سازشوں کی بدولت برصغیر پاک وہند پر مسلط ہونے میں کامیاب ہو گئے تو وہ شخصیات جو برطانوی تسلط کے خلاف برسرِ پیکار

انگریزوں نے انتقامی کارروائیاں شروع کر دیں۔ انگریزی فوج کو اسے کوئی بھی ایسا شخص محفوظ نہ رہ سکا جو انگریزوں کے خلاف جہاد آزمار ہا ہو۔ جب مسجد میں حضرت سبھائی شہید صبح کی نماز ادا کر رہے تھے تو انگریزوں نے حضرت علامہ سبھائی کے ساتھ آپ کے بھانجے کو بھی دریا کے ساحل پر لے جا کر شہید کر دیا اور نعشیں دریا میں بہا دیں۔

☆☆☆☆

● منشی محمد اسماعیل منیر شکوہ آبادی:

جناب منشی محمد اسماعیل منیر ان شعرائے مجاہدین میں سے تھے جنہوں نے دنیا سے فرنگیت کے خلاف شعرائے اہل سنت کو جمع کر کے فرنگی تسلط کے خلاف ایک زبردست محاذ قائم کیا۔ آپ حضرت مولانا فضل حق خیر آبادی کے ممتاز تلامذہ اور حضرت مخدوم شاہ رضا علی مجاہد کبیر بریلوی کے عقیدت مندوں میں سے تھے۔ آپ کو برطانوی سامراج کے خلاف جدوجہد کرنے میں گہرا شغف رہا۔

آپ کے جد اعلیٰ جناب سید بہاؤالدین علی چشتی بدایات سلطان علاؤالدین خلجی شکوہ آباد میں تشریف فرما ہوئے اور جناب سید صاحب کے پوتے کے پڑپوتے جناب سید شرف الدین علی خاں کو شکوہ آباد اور فیروز آباد کی صوبہ داری بجانب سلطان محمد شاہ عطا ہوئی۔

سرزمین شکوہ آباد سے آپ دلی تشریف لے گئے اور جب آپ مومن کی محفلیں دیکھیں مگر آپ مطمئن نہ ہوئے۔ کچھ عرصے کے بعد جب حضرت علامہ فضل حق خیر آبادی علیہ الرحمۃ خیر آباد سے دلی میں تشریف فرما ہوئے تو آپ نے مولانا کی شاگردی اختیار کر لی۔ اس کے بعد دلی میں کوئی ایسی محفل شعر و ادب نہ تھی جس میں منیر کو شامل نہ کیا گیا ہو۔

منشی محمد اسماعیل صاحب منیر شکوہ آبادی مرحوم مولانا فضل حق خیر آبادی علیہ الرحمۃ کے ممتاز تلامذہ میں تھے۔ غالب، سبھائی، آزاد، صہبائی، بھی آپ کا بے حد احترام کرتے تھے۔ اہل شاعری میں آپ کا بہت بلند مقام تھا۔ سنی علماء و مشائخ نے آپ کا بے حد احترام کیا۔ حضرت مخدوم شاہ احمد سعید مجددی، حضرت خواجہ نظام الدین اورنگ آبادی، پنشی نظامی، حضرت مولانا سید محمد قاسم شاہ داناپوری، حضرت مولانا غلام امام شہید، حضرت مولانا مفتی کفایت علی کافی مراد آبادی جیسی شخصیتوں نے بھی آپ کی خدمات کو بے حد سراہا۔ جب حکومت مغلیہ کا آفتاب سلطنت غروب ہوا تو جہاں شعرائے اہل سنت نے برطانوی اسٹیبلشمنٹ کے خلاف متحدہ طور پر ایک زبردست محاذ بنایا اور پورے برصغیر میں فرنگی تسلط کے خلاف لوگوں کے جذبات میں ولولوں اور جرأت و ہمت پیدا کرنے کی ہر چند مساعی جمیلہ کیں وہیں پر حضرت منیر شکوہ آبادی کی خدمات جلیلہ کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

شہر باندہ پر جون 1857ء کے آخری عشرے میں برطانوی افواج نے چند غداروں کی سازش سے قبضہ کر لیا جس میں بے شمار مجاہدین آزادی جام شہادت نوش کر گئے مگر بعض مجاہدین اس فرنگی یلغار سے بچ نکلنے میں کامیاب ہو گئے جس میں باندہ کے وزیر اعظم جناب مرزا ولایت حسین خاں بھی شامل تھے۔ مرزا ولایت حسین باندہ سے نکل کر شکوہ آباد پہنچے اور رات کو جناب منیر کے یہاں قیام کیا۔ اس قیام کے دوران ایک فوجی دستہ تیار کیا جس میں شکوہ آباد اور فیروز آباد سے اسلحہ جمع کیا گیا۔ ان مجاہدین کو اسی مہیا شدہ اسلحہ سے لیس کر کے رائج گڑھ پر حملہ کر دیا جس میں برطانوی فوجی بدحواس ہو کر مقابلہ کیے بغیر فرار ہو گئے۔ اس کے بعد باندہ پر حملہ کر دیا گیا تو باندہ بھی فتح ہو گیا جس میں اسلامی نظام و استحکام کی خاطر ایک لائحہ عمل مرتب کیا گیا۔ جناب منیر صاحب نے باندہ کی فتح پر یہ تاریخی قطعہ تحریر فرمایا

سپاہ فوج بشکلہ باندہ رسید
ز حسن اتفاق نگہ برائے فساد
پئے بیان ظفر یافت نواب جا
دل اہل انصاف گردید شاد
بتیں گفت تاریخ نصرت منیر
خدا فتح عالی بہ نواب داد

برصغیر پاک و ہند پر زور مکاری و سازش برطانویوں نے اپنا تسلط قائم کرنے کے بعد ان مجاہدین آزادی میں سے کسی کو تختہ دار پر کھینچ لیا، کسی کو رہا کیے جنابر شہید کر کے ان کی لاشوں کو طلباء کے سپرد کر دیا، کسی کو سزا کے طور پر جزیرہ انڈمان بھیج دیا اور باقی ماندہ مجاہدین کا عرصہ حیات کا تا حیات تنگ کر دیا۔ غرض یہ کہ کوئی شخص بھی ان کے نشانہ جور و استبداد سے نہ بچ سکا۔ ان مجاہدین شہداء نے ان سطور میں جناب منیر بھی تھے جن پر برطانوی حکام نے بے تحاشا ظلم و ستم کو روا رکھا۔ اس کا تذکرہ خوشی صاحب اپنی کیات منیر میں فرماتے ہیں۔ آپ کو پاداش آزادی برصغیر پاک و ہند کے جزیرہ انڈمان میں سزا کے طور پر بھیج دیا گیا۔ آپ کے استاد مکرم مولانا فضل حق خیر آبادی بھی یہاں پہلے سے جیل کی قید و بند کاٹ رہے تھے۔ جب منشی صاحب نے حضرت مولانا فضل حق علیہ الرحمۃ کی یہ کیفیت دیکھی تو خون کے آنسو روتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں:

اشک زیخا ہوا بحر صفت جوش زن
غرق ہوا نیل میں یوسف گل پیرہن

محزنِ فضل و کمال ' عالمِ عالی مقام
ناقدِ تازی زبان فیض شناس سخن
مولوی بے نظیر ' فضل حق اسم شریف
دہلی تا لکھنؤ مشتہر و مؤتمن

جناب منشی صاحب سے بھی مشقت کرائی گئی اور دریں اثناء مولانا فضل حق کا انتقال ہوگیا۔ جب یہ خبر منشی صاحب کو ہوئی تو انگریزوں کے خلاف اپنا اظہار رنج وغم قلمبند کرتے ہوئے بصد افسوس کہتے ہیں

قید میں میں اور وہ ' رہتے تھے اک ہی جگہ
میں سمندر میں تھے غرقِ بحرِ محن
نصف صفحہ کیا ' سامنے ان کے رقم
ختم ہوا جب ' تھے وہ ہمدم گور و کفن

جب آپ کی سزا کی مدت پوری ہو چکی تو پھر آپ کو وطن واپس بھیج دیا گیا۔ تاریخ رہائی 28 محرم الحرام 1282ھ ہے۔ آپ کی رحلت 1297ھ میں ہوئی اور رام پور کے قدیم گورستان میں آپ کو سپرد خاک کیا گیا۔

☆☆☆☆

● مولانا فضل احمد اسیر دہلوی شہید:

آپ کو علم شاعری میں حضرت مخدوم مولانا مفتی سید کفایت علی کافی شہید سے شرف تلمذ حاصل تھا۔ آپ کو تمام معاصرین پر فوقیت حاصل تھی۔ جب تحریک آزادی کی ابتدا ہوئی تو آپ نے حسب الامر محترم استاذ کافی علیہ الرحمۃ دہلی میں حافظ رحمت خاں روہیلہ' مولانا فضل حق خیرآبادی اور دوسرے زعمائے اہل سنت کا ساتھ دیا۔

جب میجر جنرل بدسن نے مرزا الٰہی بخش کی مخبری سے بہادر شاہ ظفر اور اس کے بیٹوں کو گرفتار کیا تو آپ کو بھی ان کے ساتھ پابند سلاسل کر لیا گیا پھر دہلی سے باہر لے جا کر آپ کو گولیوں کی بوچھاڑ سے شہید کر دیا گیا۔

☆☆☆☆

● جناب میر حسین تسکین دہلوی شہید:

آپ کا خاندان حضرت محبوب الٰہی خواجہ نظام الدین علیہ الرحمۃ کے دربار مقدس پر مجاوری کرتا چلا آرہا تھا

کہ 1857ء کا ہولناک دور آ پہنچا۔ نتیجتاً آپ پر بھی بے حد اثر پڑا۔ آپ نے بالواسطہ اور بلاواسطہ حصہ لیا۔ جب مولانا فضل حق خیرآبادی کو گرفتار کر کے جزیرہ انڈمان بھیجنے کی سازش کی جارہی تھی تو آپ کو اس سازش کا علم ہوا تو آپ دربار شریف سے اٹھ کر دہلی کے قید خانے کے دروازے پر آئے تو وہاں پر میجر جنرل ہڈسن موجود تھا۔ اس میجر پر آپ نے تلوار سے حملہ کر دیا جس میں ہڈسن زخمی ہو گیا۔ بڑی مشکل سے آپ کو گرفتار کر لیا گیا مگر اس کے باوجود بھی 6 برطانوی فوجی مارے گئے۔ ایک ہفتے کے بعد آپ کو جیل خانے ہی میں شہید کر دیا گیا۔ آپ کا سن شہادت 1268ھ ہے۔

☆☆☆☆

● جناب محمد یعقوب علی آبادی چشتی شہید:

آپ دہلی کے کوچہ جیلان میں سکونت رکھتے تھے۔ جب غالب شیفتہ آزردہ اور صہبائی کی محفلیں سجتیں تو خصوصی طور پر آپ کو بھی مدعو کیا جاتا تھا۔ 1857ء کا ہولناک دور شروع ہوا تو آپ کو بھی انگریزوں نے گرفتار کر کے شہر سے باہر کسی درخت پر لٹکا دیا۔ آپ ان کے ظلم کی تاب نہ لاتے ہوئے شہید ہو گئے۔ آپ علم و ادب کے شاہکار تھے۔

☆☆☆☆

● سید برہان الدین آتشی دہلوی شہید:

آپ حضرت علامہ فضل حق خیرآبادی کے ممتاز تلامذہ میں سے تھے۔ حضرت علامہ بھی آپ کا بے حد احترام کرتے تھے کیونکہ آپ سید زادے تھے اور حضرت علامہ فاروقی النسب تھے۔

بقول صاحب تذکرہ شعرائے دہلی "آپ فن شعر میں قادر الکلام تھے۔" آپ تمام شعرائے دہلی کے سرگروہ فن وسخن کے علاوہ تاریخ گوئی و شمشیر شناسی میں بے پناہ دستگاہ رکھتے تھے"۔

سید برہان الدین برطانوی تسلط سے بے حد پریشان تھے جیسا کہ آپ نے برطانوی حکام کی چیرہ دستیوں کا تذکرہ اپنے اشعار میں کیا ہے۔

خزاں کے دن جو دیکھا کچھ نہیں جز خار گلشن میں
بتاتا باغباں رو رو یہاں غنچہ، یہاں گل تھا

آپ کی حق گوئی کی پاداش میں میجر جنرل ہڈسن نے گولیوں کی بوچھاڑ کر کے 17 اپریل 1858ء کو شہید کر دیا۔

☆☆☆☆

● رفیع الدین خاں رضوی لکھنوی شہید:

آپ مولانا امام بخش صہبائی شہید کے ممتاز تلامذہ میں سے تھے۔ آپ کا خاندان دہلی میں مدتوں سے آباد تھا۔ آپ نے علوم وفنون مراد آباد اور لکھنؤ سے حاصل کیے۔ آپ بلند پایہ ادیب و شاعر تھے۔ حضرت مولانا مفتی کفایت علی کافی کے ساتھ مل کر تحریک آزادی میں بھرپور حصہ لیا۔ تحریک آزادی کے مجاہدین میں شامل ہو کر اپنی رزمیہ شاعری سے لوگوں میں حریت پسندی کے جذبات پیدا کرنے کی مساعی جمیلہ فرمائی۔ اسی کی پاداش میں آپ کو گرفتار کر کے دہلی میں لا کر مراد آباد کے چوک حسن خاں میں گولیوں کی بوچھاڑ کر کے شہید کر دیا گیا۔ تاریخ شہادت 25 اپریل 1858ء ہے۔

ناتوانوں کے ستانے سے حذر کر ظالم
عرش بھی آہ سے مظلوم کی ہل جاتا ہے

☆☆☆☆

● مرزا محمد جان بیگ کشمیری شہید:

آپ کا خاندان وسط ایشیا کے کشمیر میں وارد ہوا۔ آپ نے کشمیر سے دہلی میں حضرت خواجہ میر درد دہلوی سے شرف تلمذ حاصل کیا پھر وہیں کشمیر جا کر انگریزوں کے خلاف تحریک شروع کی۔ بیجر جنرل بڈمن نے آپ کو گرفتار کیا اور دریائے توی کے ساحل پر آپ کو شہید کر کے نعش کو کھلے کھوے کر کے دریائے توی میں بہا دیا۔ 21 اپریل 1859ء کو آپ کی شہادت ہوئی۔

☆☆☆☆

● عبداللہ خاں خادم شہید:

آپ بریلی شریف کے باشندہ تھے۔ آپ نے جملہ علوم ومعارف حضرت مخدوم شاہ رضا علی بریلوی علیہ الرحمۃ سے حاصل کیے۔ آپ کو حضرت مولانا غلام امام شہید علیہ الرحمۃ سے بھی شرف تلمذ حاصل تھا۔ جب تحریک آزادی شروع ہوئی تو آپ نے بھی مولانا سید علی بلوی شہید کے ساتھ مل کر برطانوی افواج کے خلاف نفرت پھیلانے میں نمایاں حصہ لیا۔ آپ نے مجاہدین کی بے حد امداد کی مگر برطانوی دستوں کی تجربی کرنے کی بنا پر گرفتار کر لیے گئے۔ قید وبند کی حالت میں یہ قطعہ لکھا:

WWW.NAFSEISLAM.COM

تو گرفتار ہوں ' کچھ رسم مجھے یاد نہیں
اس لیے لب پہ مرے نالہ و فریاد نہیں
کس کو حال دل تنگیں میں سناؤں آخر
قیس صحرا میں نہیں ' کوہ میں فرہاد نہیں

آپ کو فتح بریلی کے بعد شہید کر دیا گیا اور تاریخ شہادت 17 جون ہے۔

☆☆☆☆

● امیر احمد مینائی:

آپ علم شاعری اور فن ادب کے مشہور شاہکار اور بالخصوص تحریک آزادی کے علم بردار تھے۔ آپ نے علم و ادب میں اپنا بہترین مقام پیدا کیا۔ آپ ایک محقق و شاعر اور ادیب آپ کے کارناموں سے بخوبی واقف ہیں۔ آپ لکھنؤ کے باشندہ تھے۔ فن شاعری میں آپ نے جناب امیر اللہ تسلی مفتخر علی خاں کی شاگردی اختیار کی۔ تسلی عقائد کے زبردست موید و موفق تھے۔ آپ کی خداداد قابلیت کا شہرہ ہوا حتو تمام پور کے نواب کلب علی خاں نے بھی آپ سے شرف تلمذ حاصل کیا۔ آپ نے تحریک آزادی میں حصہ لیا۔ بعض لوگوں نے آپ کو گرفتار کرانا چاہا تو آپ نے انہیں صاف جواب دے دیا۔

آپ بالواسطہ اور بلاواسطہ انگریزوں کے خلاف اپنی بھرپور جدوجہد کرتے رہے جس کی پاداش میں آپ کو پابند سلاسل کر دیا گیا۔ آپ نے جیل میں یہ شعر لکھے:

اللہ رے انقلاب جہان پلید کا
خون حسین تازہ ہے اب روز عید کا
مقتل ہے کم نہیں ہے قلم دوں ہمارا آشیاں
ہر کلک ہے گلوئے بریدہ شہید کا

آپ پر مختلف مصیبتوں کے پہاڑ ڈھائے گئے بالآخر جب انگریزوں نے دیکھا کہ اب امیر مینائی میں تاب جور و ستم باقی نہیں رہی تو انہوں نے آپ کو رہا کر دیا۔ رہائی کے بعد بھی آپ کی صحت اچھی نہ ہو سکی بلکہ نقاہت و بیماری کا عالم روز بروز بڑھتا چلا گیا۔ آپ کی وفات 1900ء میں لکھنؤ میں ہوئی۔

مولانا شاہ رضا علی رضا بریلوی:

مولانا شاہ رضا علی بریلی شریف کی وہ مشہور شخصیت جو فرنگی تسلط کے خلاف بے سروسامانی کے باوجود بھی برسرپیکار

رہی جس کی کاوشیں اسلامی خدمات اور دینی ترویج کے لیے وقف رہیں اور جس کی مجاہدانہ یلغار سے باطل بیدلرزاں کی طرح کانپتا دہائیتا رہا۔

آپ نہ صرف علوم وفنون کے معتبر عالم دین تھے بلکہ میدان خونچکاں میں تلوار کے دھنی بھی تھے۔ جب بریلی شریف میں برطانوی سامراج کے تسلط کی خوفناک آرائی ہوئی تو آپ نے بھی نہ صرف فتوائے جہاد کی تائید وتوثیق فرمائی بلکہ آپ نے بریلی کی سنی مساجد میں برطانوی سامراج کے مذموم عزائم سے بھی خبردار کیا۔

آپ کو علم وادب سے بھی بے حد شغف تھا۔ آپ فن شاعری میں حضرت مولانا مفتی صدر الدین آزردہ کے شاگردوں میں سے تھے۔ حضرت مولانا شاہ رضا علی صاحب کا ذوق ادبی اجتماعی عروج پر تھا۔ آپ نے ہزاروں کی تعداد میں ادبی ودینی اشعار بھی ارشاد فرمائے۔ حضرت مولانا شاہ رضا علی صاحب مجاہد کبیر ایک مقام پر فارسی زبان کی ریاعی ارشاد فرماتے ہیں:

عجب آنرا بر ہندوستاں بود
تسلط فرنگیاں بر مسلماں بود
رضا چہ گونہ رنج و قلق نباشد
فضائے خوبان ہا بر مسلماں بود

فرنگی تسلط کے خلاف آپ مسلسل اپنی جدوجہد کرتے رہے اور آپ فنون حرب میں مہارت تامہ رکھتے تھے۔ مولانا شاہ رضا کا وصال شریف 2 جمادی الاولیٰ 1286ھ کو ہوا۔

آپ کی رحلت کے بعد آپ کے فرزند ارجمند حضرت مخدوم العلماء وا لصلحاء مولانا شاہ فضل علی خاں اور آپ کے پوتے اعلیٰ حضرت مجدد مائۃ حاضرہ مولانا شاہ احمد رضا خاں بریلوی قدست سرہما کا تفصیل ذکر ہے۔

☆☆☆☆

● نور الدین محمد خاں انور شہید:

آپ نواب بدر الاسلام خاں بہادر کے نبیرہ اور نواب والا جاہ کے دربار سے وابستہ تھے۔ علوم شاعری میں جناب مفتی صدر الدین آزردہ اور مصطفیٰ خاں شیفتہ کے شاگردوں میں سے تھے۔ آپ پاسنگ کے باشندہ تھے۔ آپ نے برطانوی تسلط کے خلاف حصہ لیا جس کی پاداش میں آپ کے گھر پر گورا پلٹنوں نے رات کی تاریکی میں حملہ کر کے شہید کر دیا۔ آپ کا یہ شعر صاحب تذکرہ خیر آبادی نے نقل کیا ہے:

کہ رود برباد سوز و نالہ ہائے عندلیب
کل گریباں چاک آمد از ہوائے عندلیب

آپ کی تاریخ شہادت 17 صفر المظفر 1273ھ ہے۔ آپ کو پاپاموٴ کے گورستان میں سپرد خاک کیا گیا۔

☆☆☆☆

● سید منور علی شہید (آشفتہ شاہ جہاں آبادی):

آپ علم شاعری میں مفتی صدرالدین آزردہ علیہ الرحمۃ کے ممتاز تلامذہ میں سے اور شاہ جہاں آباد دہلی کے باشندہ تھے۔ جب جنگ آزادی کا دور شروع ہوا تو آپ بھی اس تحریک میں شامل ہو گئے اور باقاعدگی کے ساتھ حضرت مولانا فضل حق خیر آبادی جیسے مجاہدین اسلام کے ساتھ شریک ہو کر عوام کو برطانوی تسلط کے خلاف ابھارنے اور بے حد اکسانے پر اپنے آپ کو مامور کر لیا۔

جب لارڈ میٹکاف کو آپ کے متعلق یہ خبر ملی کہ سید صاحب علمائے حق اہل سنت وجماعت کے ساتھ مل کر انگریزوں کے خلاف سازش کرنے میں مصروف ہیں تو انگریزوں نے اپنا ایک مخبر بھیج کر آپ کو مسجد میں ہی جا کر شہید کر دیا۔ 14 جمادی الاولیٰ 1247ھ آپ کی تاریخ شہادت ہے۔

☆☆☆☆

● حافظ عبدالرحمٰن احسان دہلوی شہید:

آپ کو عبد عقلی ہی میں شاعری سے بے حد ذوق تھا۔ اسی ذوق کے پیش نظر آپ حضرت مولانا فضل حق خیر آبادی علیہ الرحمۃ کی خدمت میں حاضر ہو کر تسکین عقلی حاصل کرتے رہے۔

مرزا الیز دبخش اور شاہ عالم ثانی سے بھی آپ کے گہرے تعلقات تھے۔ جب مرزا الیز بخش جیسے سازشی غداروں کی وجہ سے میجر جنرل ہڈسن دہلی میں داخل ہوا تو سرزمین دہلی پر سب سے پہلا جو عالم جنرل ہڈسن کی بندوق کی گولی کا نشانہ بنا وہ حافظ عبدالرحمٰن احسان دہلوی علیہ الرحمۃ تھا۔ آپ کا یہ شعر جسے ایک مورخ نے نقل کیا ہے یہ ہے:

یہ ستانے سے مرے تجھ کو ہے حاصل ظالم
تجھے موذی کہے خلقت، مجھے ایذا پہنچے

آپ کی تاریخ شہادت 21 ربیع الاول 1277ھ ہے۔

☆☆☆☆

● مولانا مفتی سید کفایت علی کافی شہید:

خطہ مراد آباد سے حضرت مولانا مفتی سید کفایت علی کافی شہید جیسی شخصیت نے برطانوی استعمار کے خلاف مجاہدین آزادی کی حتی الامکان مدد کی۔ بہادر شاہ ظفر آپ کی علمی و حربی صلاحیتوں کا معترف تھا۔ بہادر شاہ ظفر کے علاوہ جنرل بخت خاں اور دوسرے زعمائے مجاہدین حضرات بھی برطانوی استعمار کے خلاف مفید مشورے اور تجاویز آپ سے حاصل کرتے۔

آپ کو برطانوی افواج نے تحریک آزادی میں حصہ لینے کی پاداش میں 6 رمضان المبارک 1274ھ کو گرفتار کیا اور 27 رمضان المبارک 1274ھ بروز جمعرات بوقت عصر روہو کی حالت میں برسر عام تختہ دار پر لٹکا دیا۔ جب آپ کو دار پر چڑھایا جا رہا تھا تو اس وقت آپ کی زبان مبارک پر یہ نغمہ اشعار تھے۔

کوئی گل باقی رہے گا نے چمن رہ جائے گا
بس رسول اللہ کا دین حسن رہ جائے گا
ہم صفیرو باغ میں ہے کوئی دم کا چہچہا
بلبلیں اڑ جائیں گی سونا چمن رہ جائے گا

فہرست کتب ورسائل متعلقہ جنگ آزادی 1857ء

محمد عالم مختار حق

محترم محمد عالم مختار حق صاحب معروف محقق اور کتاب دوست شخصیت کے مالک ہیں۔ آپ کے وسیع و عریض کتب خانے میں تقریباً ہر عنوان بالخصوص ہر گرانقدر علمی سرمایہ محفوظ ہے۔ جون 2007ء میں جب سہ ماہی مجلہ لاہور نے جنگ آزادی نمبر شائع کیا تو موصوف نے اپنے کتب خانے میں موجود جنگ آزادی کے متعلق کتب و رسائل کی فہرست سہ ماہی مجلہ میں شائع کی۔ یقیناً یہ فہرست جنگ آزادی کے متعلق چھپنے والے مواد کے بارے میں حتمی نہیں ہے لیکن ان احباب کے لیے بہت قیمتی ہے جو جنگ آزادی 1857ء کے متعلق جاننے کی جستجو رکھتے ہوں۔ محترم محمد عالم مختار حق صاحب اور مجلس ترقی ادب لاہور کے خصوصی شکریہ کے ساتھ فہرست حاضر خدمت ہے۔

نمبر	نام کتاب	مصنف / مؤلف	سنہ	صفحات
۱	تاریخ عروج عہد سلطنت انگلشیہ ہند	محمد ذکاء اللہ دہلوی	1904ء	۱۱۲۲
۲	بے چارے انگریز کی چٹھی (نمبر۲)	خواجہ حسن نظامی	1927ء	۶۳
۳	محاصرۂ دہلی کے خطوط (نمبر۳)	خواجہ حسن نظامی	1925ء	۳۲
۴	غالب کا روزنامچہ (نمبر۴)	خواجہ حسن نظامی	1924ء	۷۲
۵	مرزا غالب کا روزنامچہ	خواجہ حسن نظامی	1940ء	۷۲
۵	دہلی کی جان کنی (نمبر۸)	خواجہ حسن نظامی	1925ء	۱۰۰
۶	دہلی کا آخری سانس (نمبر۳)	خواجہ حسن نظامی	1925ء	۲۰۳
۷	بیگمات کے آنسو (نمبر۱)	خواجہ حسن نظامی	1952ء	۲۰۸
۸	غدر کے فرمان (نمبر۵)	خواجہ حسن نظامی	1944ء	۱۳۳

WWW.NAFSEISLAM.COM

۹	غدر دہلی کے اخبار (نمبر۶)	خواجہ حسن نظامی	1940ء	۴۳
۱۰	بہادر شاہ کا روزنامچہ (نمبر۱۰)	خواجہ حسن نظامی	1935ء	۱۹۲
۱۱	غدر کی صبح و شام (نمبر۹)	خواجہ حسن نظامی	1926ء	۲۷۲
۱۲	غدر کا نتیجہ نمبر (۱۲)	نواب غلام حسین خاں	1930ء	۷۲
۱۳	آخری شمع (نمبر۱۱)	مرزا فرحت اللہ بیگ	1940ء	۸۸
۱۴	سرکشی ضلع بجنور	سرسید احمد خاں	1962ء	۳۱۰
۱۵	جنگ آزادی 1857ء	خورشید مصطفیٰ رضوی	1960ء	۵۷۶
۱۶	جنگ آزادی 1857ء (اعیان و اشاعت)	محمد ایوب قادری	1976ء	۶۲۲
۱۷	1857ء پہلی جنگ آزادی	میاں محمد شفیع	2004ء	۳۲۷
۱۸	داستان غدر	راقم الحروف سید ظہیر الدین ظہیر دہلوی	1955ء	۳۲۰
۱۹	نوائے آزادی	مرتب: عبدالرزاق قریشی	1957ء	۳۹۹
۲۰	1857ء کے واقعات و سوانح	----------	1957ء	۸۴
۲۱	1857ء کا تاریخی روزنامچہ	مرتب: خلیق احمد نظامی	1958ء	۲۱۲
۲۲	محاربہ عظیم / تاریخ بغاوت ہند	پنڈت کھیتا لال	1916ء	۳۹۰
۲۳	اس گھر کو آگ لگ گئی (غداروں کے خطوط)	مرتب: سلیم قریشی، سید عاشور کاظمی	1993ء	۲۳۲
۲۴	بزم آخر (دہلی کے آخری بادشاہ کی طرح حاشیہ)	شمس الدین	1945ء	۱۲۶
۲۵	انقلاب 1857ء کی تصویر کا دوسرا رخ	شیخ حسام الدین	1947ء	۲۰۰
۲۶	من ستاون	(پنڈت) سندر لال	1957ء	۲۵۶
۲۷	اسباب بغاوت ہند	سرسید احمد خاں	1957ء	۲۰۸
۲۸	کمپنی کی حکومت ہندستان میں	باری (علیگ)	----------	۲۸۸
۲۹	فریاد دہلی معروف بہ انقلاب دہلی (مقدم)	نظامی بدایونی	1931ء	۱۲۲

۳۰	لکھنؤ اور جنگ آزادی	ادبی اکیڈمی لکھنؤ	----------	۱۳۶
۳۱	فغانِ دہلی (منظوم)	تفضل حسین خاں کوکب	1954ء	۲۰۷
۳۲	اودھ پر انگریزوں کا غاصبانہ قبضہ	مرزا علی اظہر برلاس	1984	۲۰۸
۳۳	غدر کی ماری شہزادیاں	علامہ راشد الخیری	1996ء	۱۰۳
۳۴	جنگ آزادی کے مسلم مجاہدین	شامن علی خاں	1991ء	۲۶۴
۳۵	مشاہیر جنگ آزادی (1857ء-1956ء)	مفتی انتظام اللہ شہابی		۳۰۰
۳۶	1857ء کے مجاہد شعرا	مولانا امداد صابری	1959ء	۳۰۸
۳۷	1857ء کے غدار شعرا	مولانا امداد صابری	1960ء	۱۷۴
۳۸	جنگ آزادی کے اردو شعرا (1857ء-1947ء)	محمود الرحمٰن	1986ء	۳۳۲
۳۹	فرنگیوں کا جال	مولانا امداد صابری	1949ء	۳۰۴
۴۰	مصائب غدر	ولیم ایڈورڈز	1885ء	۱۵۸
۴۱	انگریز کے باغی مسلمان (1857ء-1894ء)	جاں باز مرزا	1990ء	۲۸۸
۴۲	سرگذشتِ ایام غدر (خود نوشت آپ بیتی)	خان بہادر منشی محمد عنایت حسین خاں		۳۷
۴۳	باغی ہندوستان (الثورۃ الہندیہ)	علامہ فضل حق خیرآبادی مترجم: مولانا محمد عبدالشاہد خاں شروانی	1947ء	۳۷۶
۴۴	باغی ہندوستان (الثورۃ الہندیہ)	علامہ فضل حق خیرآبادی مترجم: مولانا محمد عبدالشاہد خاں شروانی	1974ء	۳۶۰
۴۵	بہادر شاہ ظفر	منشی امیر احمد علوی بی اے	1935ء	۱۵۲
۴۶	بہادر شاہ ظفر	اسلم پرویز	1986ء	۳۰۵
۴۷	بہادر شاہ ظفر کے شب و روز	ضیاء الدین لاہوری	2004ء	۲۱۳
۴۸	نوبت پنج روزہ یعنی وداع ظفر	علامہ راشد الخیری	1987ء	۱۵۸
۴۹	شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کا فتوائے دارالحرب	ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہانپوری	1995ء	۲۳

WWW.NAFSEISLAM.COM

۵۰	تحفہ صبر شہید (حضرت سید نثار علی)	ڈاکٹر عبدالغفور صدیقی	1961ء	۱۱۸
۵۱	تذکرہ حضرت حافظ محمد ضامن شہید	مولانا امداد صابری دہلوی	1982ء	۱۵۹
۵۲	تذکرہ کاتی شہید (مولانا کفایت علی کافی)	محمد صدیق قانی	1997ء	۵۲
۵۳	تذکرہ مدراسی شہید	محمد صدیق قانی	1998ء	۵۲
۵۴	نواب خان بہادر خاں شہید	سید مصطفیٰ بریلوی	1966ء	۲۲۳
۵۵	مولانا فیض احمد بدایونی	محمد ایوب قادری	1957ء	۴۰
۵۶	فضل حق خیرآبادی اور سنہ ستاون	حکیم محمود احمد برکاتی	1975ء	۱۲۸
۵۷	1857ء کے مجاہد	مولانا غلام رسول مہر	1957ء	۲۱۱
۵۸	1857ء	مولانا غلام رسول مہر	1957ء	
۵۹	تحریک آزادی میں اردو کا حصہ	ڈاکٹر معین الدین عقیل	1976ء	۱۰۱۴
۶۰	جنگ آزادی 1857ء کا مجاہد شاعر میر محمد اسماعیل حسین منیر شکوہ آبادی	ڈاکٹر توصیف تبسم	----------	۲۰۸

۷۱۔Einghteen Fifty Seven:by surendra Nath sen.The

۷۲۔Publications Division,Ministry of Information & Broadcasting,Govt of India, New Delhi,1957,P:466

۷۳۔1857-A Pictorial Presentation:The Publications Division-do.1957, P:70

۷۴۔Struggle for Freedom 1857: Pakistan Publications, Karachi-

1957,P:26

۷۵۔Trial of Ex-King of Delhi: Punjab Printing Press, Lahore,1870, P:329

WWW.NAFSEISLAM.COM

رسائل

۶۵	ماہنامہ نگار	لکھنؤ	جنوری 1930ء	بہادر شاہ ظفر نمبر	۱۵۲
۶۶	سہ ماہی العلم	کراچی	اپریل تا جون 1957ء	جنگ آزادی نمبر	۱۹۲
۶۷	ماہنامہ زینت	کراچی	مئی 1957ء	جنگ آزادی نمبر	۹۸
۶۸	ماہنامہ آج کل	دہلی	اگست 1957ء	جنگ آزادی نمبر	۱۳۲
۶۹	ماہنامہ گل خنداں	لاہور	جولائی 1962ء	1857ء نمبر	۲۷۲
۷۰	ماہنامہ الزبیر	بہاولپور	1970ء	تحریک آزادی نمبر	۲۶۸
۷۱	ماہنامہ ترجمان الاسلام	کراچی	جولائی 1975ء	جنگ آزادی نمبر	۲۵۶
۷۲	روزنامہ امروز	کراچی	17 مئی 1957ء	جنگ آزادی (صفحہ ۵ پہلا کالم)	۷۶
۷۳	ہفت روزہ اقدام	لاہور	12 مئی 1957ء	جنگ آزادی نمبر	۳۲
۷۴	ہفت روزہ عوام	کراچی	12 مئی 1957ء		۲۳
۷۵	ہفت روزہ الاعتصام	لاہور	24 مئی 1957ء	تحریک آزادی 1857ء نمبر	۳۲
۷۶	پندرہ روزہ استقلال	لاہور	15 مئی 1957ء	جدوجہد آزادی کی صد سالہ یاد	۲۰
۷۷	ہفت روزہ لیل ونہار	لاہور	12 مئی 1957ء	جنگ آزادی نمبر	۷۲
۷۸	ماہنامہ ماہِ نو	کراچی	مئی 1957ء	تحریک آزادی 1857ء نمبر	
۷۹	ہفت روزہ حریت	کراچی	19 مئی 1969ء	1857ء نمبر	
۸۰	ماہنامہ الشریعہ	مبارک پور	اگست و ستمبر 2008ء	انقلاب 1857 نمبر	۱۱۲

WWW.NAFSEISLAM.COM

افادۃ الافہام اور انوار الحق کے عظیم مصنف

شیخ الاسلام حضرت علامہ حافظ **محمد انوار اللہ** قادری چشتی

کی معرکۃ الآراء تصنیف

"انوار احمدی" کی 208 صفحات پر مشتمل تلخیص

ربیع النوری مبارک ساعتوں میں فدایانِ ختمِ نبوت کی فخریہ پیشکش

مقامِ مصطفیٰ ﷺ

- ایسی لاجواب تصنیف جس کا ہر مضمون قرآن و حدیث اور آثارِ صحابہ و اقوالِ فقہاء کے عین مطابق
- منصبِ رسالت ﷺ کی عظمت و تکریم پر نہایت اثر انگیز کتاب
- عشقِ رسالت ﷺ میں ڈوب کر اوصافِ نبوی ﷺ پر مستند بیان
- درسِ محبت و اخوت اور اتحاد و یگانگت کی دلکش دعوت
- تصنیف لطیف کا انتساب شیخ العالم حضرت علامہ الحاج مفتی محمد امین صاحب دامت برکاتہم العالیہ کی تعلیمات سے مزین
- تلخیص و تسہیل از: یکے از خدام حضرت علامہ ارشد القادری رحمۃ اللہ علیہ
- تعارفی کلمات از: مسعود ملت حضرت پروفیسر ڈاکٹر مسعود احمد رحمۃ اللہ علیہ

WWW.NAFSEISLAM.COM

فدایانِ ختمِ نبوت، جامع مسجد رحمۃ للعلمین ﷺ

مدینہ کالونی، ملتان روڈ، لاہور 0321-4370406

حصہ سوم

نظمیں و قطعات

WWW.NAFSEISLAM.COM

تضمین

بر نعت

امام احمد رضا بریلوی

فی فی سعید الفضلا بر حماں (صاحبزادہ علامہ فضل حق علیہ الرحمۃ)

وصفت ز بشر ہم نا ممکن ہستی ممنوع خدا جانا — سخن پایہ بپایہ کرت تسدن تو ہے ہم کمن بارے کیا جانا
کہتی ہے یہی چشم باطن' بھر لے تو تجھے بکتا جانا — لم یدانک نظیر کے ملی منظر مثل تو نہ شد پیدا جانا

تیرے راج کو تاج تورے سر پہ ہے تجھ کو شہ بحرا جانا

رحم اے شافع روز جزا' شد غرق عرق اجرم گنہ دل ما — من کو ان لوگ کا رنگ لگا بن چاہے نہ آپ ملیں نہ خدا
کرتا ہوں یہی دن رات دعا' اے ساقی باشرۂ کوثر آ — الصوح علا و البحر طفی' من لیکس بطغاں ہوش ربا

سنجھار میں ہوں بگڑی ہے ہوا موری نیا پار لگا جانا

من تیرہ نصیب سیاہ عمل' وارم ہر حقہ کا لا بخیل — نہ تو کام کی کس نہ کام کا قابل سو بے پتلو دھیر نہیں اک پل
اب تو چاہے تو مجھے کل نہ ہو سو بھی ہوئی پہ کہتے عمل — لک یلذ فی الوجہ الاجمل' خطا بالہ مدالف اوامل

تورے چرنن پہ پڑا کنڈل' رحمت کی بھون برسا جانا

تا چند کشم بہ فراق تو غم' تا کے خورد خوش سر شک دام — مہراج کا راج بڑا ہے جم جم' سدھ کا ہے بہار دلی قیم
میں بھرہ مشوق ہوں تیری قسم اب بھر لے اب لہوں پہ ہے دم — فاقلی عطش وسماک قم کرے سوئے پاک سلیم کرم

ہرن بارے ہرا بھرم ہوں بھرم اجھر بھی بھرا جانا

بگذشت بہ لہو و لعب صبا' ایام شباب بہ ہر بی — اب تیرے نیت کی لاگ لگی' یا بیٹھے پران گھس جاتی
جز ترے نہیں دنیا میں کوئی' جو روز وہاں جائے تسلی — یاشمس نظرت الی لیلی چہ بطیبہ ہی مرحبا کی

تورے جوت کی جھل جھل تک میں رہی' مری شب نے نہ دن ہو جانا

از گردش بخت دھائے فلک' ہمستم دراں داماں ایک — اب جات رہی تیرا کی کسک' نہ وہ ٹیس نہ تیر نہ دکھ نہ چبک
لیکن یہ عزا ہے اسی برس میں نہیں شک اس میں نہیں شک — بما قاطنی زیدی اجلک رتے برحمت ابدا لک

مورا جی را لرے ورک ورک' طیبہ سے ابھی نہ بلا جانا

یا شاہ خبر گیرامت ' زارم بارست غم فرقت — بجائے دل توری کان مت 'مورے سیس سوارے پیل کوست

حسرت ہے اگر تو یکی حسرت کہ ہیں بھول جائے مجھے قسمت — واھ آنسو بعتاب فعبت ' آں محمد حضور ہار کہت

جب یاد آوت موہے کر نہ پرت ' دردا وہ مدینے کا جانا

چہ کم شکر کرم تو اوا ' نہ دہن ، ادم نہ زباں ہلدا — وانا تو رائج بیعاد ے سوا ' محرماں کی بھی تسدان ہے بیدعا

ملے میں جو مجھ کو خدا ہے مرا ' واللہ میں کچھ کہہ نہیں سکتا — الروح فداک فزد حرفا ' یک شعلہ گر یزان منشا

سوراتن من دھن سب پھونک دیا ' یہ جان بھی پیارے جلا جانا

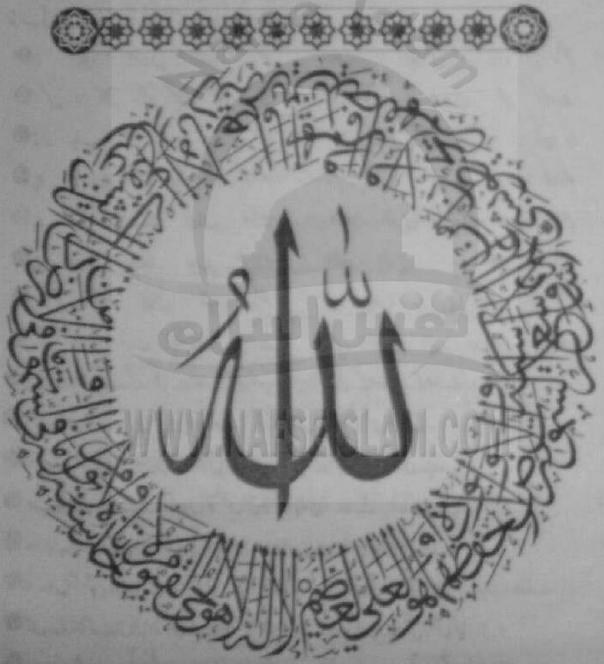

ہم از حق "فضل حق" را باز خواہم

مرزا اسد اللہ خاں غالب

مرزا اسد اللہ خاں غالب کلکتہ میں دہلی کے جن احباب کی یاد میں مضطرب رہتے تھے۔ ان کا ذکر مثنویات غالب کی ایک مثنوی "چراغ دیر" میں انہوں نے یوں کیا:

1. ز دہلی تا بروں آوردہ ہستم — بطوفان تجاغل دادہ رستم
2. کس از اہل وطن غمخوار من نیست — مرا در دہر چز آزادی وطن نیست
3. زار باب وطن جویم سر حن را — کہ رنگ و رونق اندر ایں نہ چمن را
4. چو خود را جلوہ سنج ناز خواہم — ہم از حق "فضل حق" را باز خواہم
5. چو حرز بازوئے ایماں نویسم — حسام الدین حیدر خان نویسم
6. چو پیمد قبائے جاں طرازم — امین الدین احمد خاں طرازم
7. گزشتم کز جہاں آباد رفتم — مرا یاراں را چرا از یاد رفتم
8. مگو داغ فراق بوستاں سوخت — نم نمبری ایں دوستاں سوخت

1. جب سے تقدیر نے مجھے دہلی سے نکالا ہے میں سرد سامانی بلا پروائی کے طوفان کے حوالے کر دیا۔
2. وطن والوں میں سے کوئی بھی میرا مددگار نہیں مگر یاد رہے میرا کوئی وطن ہی نہیں۔
3. اہل وطن میں تجھ آدمیوں کی تلاش ہے جن کے دم سے اس چمن کی بہار قائم ہے۔
4. جب میرا دل چاہتا ہے کہ تازگروں تو فضل حق (خیرآبادی) سے ملنے کی دعا کرتا ہوں۔
5. اور جب ایمان کے بازو کا تعویذ یاد کرتا ہوں تو حسام الدین حیدر خان کا نام لکھتا ہوں۔
6. اور روح کی قبا پہ بوٹا لگنے کی بہار آتی ہے تو امین الدین احمد خان کی ضرورت پڑتی ہے۔
7. میں نے مانا کہ جہاں آباد (دہلی) سے چلا آیا تھا میں ان (تینوں) کی یاد سے کیسے نکل گیا۔
8. یہ نہ کہو کہ وطن کی جدائی کا غم جلائے ڈالتا ہے دراصل ان دوستوں کی بے مروتی کے غم نے مار ڈالا۔

عربی قصیدہ

مولانا فیض الحسن سہارنپوری

مولانا فیض الحسن سہارنپوری نے علامہ کے مرثیہ میں تین قصیدے بزبان عربی کہے، مثلاً:

لم یغب فیضہ ولا غاب عنا

جسمہ الازہر الفتی العجیب

لا یغیب الندی الکریم الجواد

الفاضل البارع الادیب الاریب

کیف ینسی الفتی العطوف الرؤوف

الھین اللین الحبیب اللبیب

ینسی وکم لہ من خصال

ذکرھا مثل ربھا المحبوب

ربنا اغفر لہ وانت غفور

واستجب لی وانک المجیب

ربنا الم ذکرہ ما طمی البحر

وما ھب شمال وجنوب

ھذہ دعوۃٌ من القلب والقلبُ

کئیب ولا یخیبُ الکئیبُ[1]

---

[1] مجلۃ المجمع العربی الباکستانی، جلد: اول، شمارہ: ۳، ص ۳۵

وہ امام فلسفہ وہ نازشِ علم و سخن

امیر البیان سہروردی ملتان

وہ امام فلسفہ وہ نازشِ علم و سخن
جس نے زندہ کر دیا تھا قصۂ دار و رسن

موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ہنستا رہا
اللہ اللہ جنگِ آزادی کے نڈر کا بانکپن

زندگی اس کی سراپا سوز و سازِ عشق تھی
دانش و حکمت میں حاصل تھا اسے معراجِ فن

دیوِ استبداد اس سے لرزہ براندام تھا
اس کی شمشیر تھی لے کاٹتا تھا اہرمن

سامراجی طاقتوں کا توڑ کر زورِ جنوں
اس نے پیدا کی تھی آزادی کی ہر دل میں لگن

اس نے سمجھایا "نہیں ممکن نظیر مصطفیٰ"
گونجتا ہے آج تک یہ نعرۂ باطل شکن

کانپ اٹھا اس کے فتووں سے فرنگی سامراج
اس کے نعروں سے ہوئے بیدار شیرانِ وطن

WWW.NAFSEISLAM.COM

وہ خطیب حریت ' شعلہ نوا ' جوش آفریں
جامع دہلی کو گرماتا رہا جس کا سخن
اس کا وہ فرزند☆ فاضل اس کی سچی یادگار
عاشق میرعرب ' عبد خدائے ذوالمنن
ہند میں روشن کیا جس نے چراغ فلسفہ
پیکر علم و ہنر ' ظلمت میں شمع انجمن
آسمان اہل سنت کا درخشاں آفتاب
ہند کے ظلمت کدوں پر جو رہا جلوہ فگن
مرد حر ' غازی ' مجاہد ' حق پرست و فضل حق
تھا کتاب حریت کا بے گماں پہلا ورق

☆ علامہ محمد عبدالحق خیرآبادی علیہ الرحمۃ

وہ امام عاشقاں وہ صاحبِ روشن ضمیر

پروفیسر محمد اکرم رضا کوجرانوالہ

وہ امام عاشقاں وہ صاحبِ روشن ضمیر
برق تھا طوفان تھا سیماب تھا اس کا ضمیر

وہ جہانِ معرفت میں صورتِ شمعِ عمل
عظمتِ انسان تھا تاریخ میں اپنی نظیر

خاندانِ علم و عرفان کا تھا اک روشن چراغ
کاروانِ شوق کا راہِ صداقت کا امیر

اس جیالی و جرأت پر عدو حیران تھے
جگمگاتا ہی رہا ظلمت میں وہ بدرِ منیر

گاہ اک ارشاد اس کا کر گیا کارِ سپاہ
اور گئی فریاد اس کی سینۂ باطل کو چیر

ہر نئی منزل میں تھی آزادی کی پوشیدہ تڑپ
درمیانِ نور و ظلمت میں وہ نورانی سفیر

وہ برائے علم و اعتداد تھا پیغامِ موت
رہنمائی کے لیے اونچا رہا اس کا سریر

کب جھکا وہ ظلمتِ طاغوت کے آگے کبھی
کب ڈرا سکتے تھے اس کو فتنہ ہائے دار و گیر

اس کے ہر انداز میں مضمر تھی ملت کی بقا
شعلہ زن تھا شوکتِ اسلام میں اس کا ضمیر

دین و دنیا میں رہا وہ کامیاب و سرفراز
حامی و ناصر تھے احمدؐ مہربان رب قدیر

وہ ہر اک ترغیب اور لالچ کو ٹھکراتا رہا
وہ مجاہد رزمِ حق کا وہ فقیروں کا فقیر

اس کی ہمت اور جرأت کو رضا میرا سلام
رحمتیں اللہ کی ہوں اس کے مرقد پر مدام

WWW.NAFSEISLAM.COM

کربلا ہند میں وہ سید الاحرار حق

فضل حق! عکس محمد الف ثانی کی طرح
کار زار دہشت میں حق کی نشانی کی طرح
بانہ کامل کی طرح آیا ابھر کر سامنے
جنگ آزادی کا پرچم دست حق سے تھامنے
فضل حق ہے شہید رنگیں حریت
اس کا فتویٰ مستقل اک دستاویز حریت
عزم فاروقی تھا اس کے شعلہ آواز میں
ضرب یداللہ کا تھا سوز اس کے ساز میں
فکر الاوقات یہاں وہ غلیب وقت ہے
شہید زندگی ہے وہ حبیب وقت ہے
فضل حق یہ یاسر دین عامل قرآن ہے
اس کا گفتار ہمنوا شمشیر کی میزان ہے
وہ [illegible] حق
[illegible] حق
اس کے دل کے کوزے میں تھا ایک طوفان حیات
ظلمت شب میں شعاع بادبان حیات
کربلائے ہند میں وہ سید الاحرار حق!
کاروان حریت کا قافلہ سالار حق
وہ شہید جنگ آزادی! علمبردار حق
فضل حق کا نام ہے اک مستقل کردار حق

WWW.NAFSEISLAM.COM

شیخ الاسلام اب بھی ہے وہ مرشد صاحب دلاں
وہ مجاہد کی زباں ہے وہ شہادت کی اذاں

شمع آزادی میں ایماں کی حرارت کی طرح
زندہ و پائندہ ہے حق کی علامت کی طرح

اس کے فتوے اس کی جرأت اس کی عظمت کو سلام
اس کی قید و بند کو اس کی شہادت کو سلام

اس کا اعلان جہاد عامۂ باطل کے خلاف
کس قدر وہ لوگ تھا اور کس قدر تھا وہ شگاف

جنگ آزادی کے قالب میں جوانی آگئی
بجلیوں کی اک لپک سی ہر طرف لہرا گئی

اس کے اس فتوے سے بد کردار تک ہو گئے
سب منافق اور سب غدار تک ہو گئے

وہ مسلمانوں کے سازش! وہ فرنگی دوستی
اور مسلمانوں سے تھی ان کی وہ رنگی دوستی

کاش! کچھ حاتم نہ دیتے ساتھ اگر انگریز کا
بند میں ہوتا نظم ہوتا پھر نہ انگریز کا!

اک طرف تھی فعل حق کی حق کے نعرے پہ چوٹ
ہو رہی تھی جرأتیں اعلان آزادی پہ لوٹ

دوسری جانب تھا خود فرنگی دل میں مضمر
کون تھے؟ سوچو ذرا وہ "شہدائے بالاکوٹ"

وہ فرنگی پیشوائی کے لیے تھے محو جنگ
دیں حق کی تیغ بنائی کے لیے تھے محو جنگ

آہ! یہ تاریخی غلطی بھی خائن سے فرار

بسا اولیس الابصار اور "فرنگ کے آلہ کار"

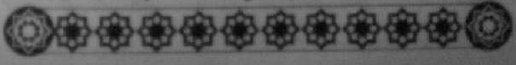

جیش فضل حق کی روحوں کو سلام زندگی

مدارس العربیہ فیروز پور کی مناسبت سے

وہ مجاہد! وہ سپہ سالار حق! وہ بخت تھاں
فضل حق کی داستاں میں ہے وہ جزو داستاں
فضل حق کی صف کے دیگر عالمان باخدا
وہ کفن بردوش غازی! وہ شہیدان وفا!
فضل حق کے سارے ساتھی تھے رضینا بالقضیٰ
رہگذار زیست پر ان مٹ ہیں ان کے نقش پا!
حق کے آگے جھکنے والے اور کہیں جھکتے نہیں
گامزن راہ وفا میں ہو لیے، وہ رکتے نہیں
جیش فضل حق کی روحوں کو سلام زندگی
ان کی مرگ حق پہ ہے قربان دوام زندگی

WWW.NAFSEISLAM.COM

سید عارف محمود مسعود رضوی گجرات

اے شہیدِ جنگِ آزادی تجھے میرا سلام

﴿قطعہ تاریخ وصال﴾

﴿گنجِ نایاب خاتم الحکماء﴾ 1278ھ

﴿قُطبُ المحققین خیرآبادی﴾ 1278ھ

﴿جوہر علما علامہ فضلِ حق شہید آزادی﴾ 1861ء

خاتم الحکما امام منطق و علم الکلام — اے شہیدِ جنگِ آزادی تجھے میرا سلام

قافلہ سالارِ آزادی تجھے کیوں نہ کہیں — گوشۂ تاریخ میں تابندہ تر ہے تیرا نام

قائدِ تحریکِ آزادی نہیں تیرے سوا کوئی نہیں — جانشینِ عظمتِ حق حضرتِ فضلِ امام

مشیت کے سب بُتوں کو کر کے تُو نے پاش پاش — ہند میں ختمِ نبوت کا کیا پیغام عام

خون سے سینچا ہے تو نے گلشنِ دینِ متیں — پیشوائے اہلِ سنت، مقتدائے خاص و عام

وہم تیرے کارناموں کی ہے شرق و غرب میں — پیش کرتے ہیں مجاہد تیری جرأت کو سلام

تیرے علم و فضل کے ہیں معترف اغیار بھی — ذات تھی بے مثل تیری، بے بدل تھا تو امام

حضرتِ غالبؔ کا تیرے خوشہ چینوں میں شمار — آج تک اہلِ نظر ہیں تیری حکمت کے غلام

آج بھی وہ لوگ تیرے نام سے مرعوب ہیں — پیشِ رو جن کے تیرے آگے رہے بے ننگ و نام

فضلِ حق شامل نہ ہو جب تک کسی کے حال میں — فضلِ حق" کا جان لے ممکن نہیں کوئی مقام

سالِ وصلِ فضلِ حق مہجورؔ سے بے ساختہ

"نیک خصلت، شیرافگن" کہہ گئے قدسی تمام

1861ء

☆☆☆☆☆

اللہ اللہ نبوت کو کس نے سمجھا کر دیا

شہید پاکستان کا پیغام

ڈاکٹر اشرف آصف جلالی

نہ سمجھو مجھ کو شکست خوردہ، جو بخشی حق نے ہے سرفرازی
دیا ہے میں نے لہو وطن کو، بنایا ملت نے مجھ کو غازی
جو پہنچا میں بارگاہ حق میں، لہو سے رنگین پیرہن میں
لگا یا سینے سے رحمتوں نے، ہوئے ہیں مجھ پہ نبی ﷺ بھی راضی
ہوگا دو عالم کے ہر نبی بھی تو ہوگا یہاں سویرا
نہیں یہ سامریکیوں کا ڈیرا، ہے اس کی مٹی میں تم نے تیاری
بتا دو تم ان ستم گروں کو، بدی سے بولے گا شتوں کو
تمہیں ہزیمت ہے زندگانی، نہیں میں نے مر کے بھی ہاری بازی
سنو وہ غربت پکارتی ہے، وہ اب بھی جذبے ابھارتی ہے
جو میرے موقف کو غلط مانیں، نہ آئیں مجھ پہ وہ ملتی تاشی
رضا کے افکار لے کے نکلو وطن کے فتنوں کو جڑ سے کچلو
تم اہلسنت کا جھنڈا تھامو، نہ دیکھو اوروں کے تری تازی
فساد ہرگز نہیں شریعت، شراب ہرگز نہیں ہے زمزم
[illegible]

WWW.NAFSEISLAM.COM

العاقب کا خاص نمبر اشاعت کے آخری مراحل میں تھا کہ
امام المکلمت والکلام حضرت علامہ فضل حق خیر آبادی اور شہید اسلام
حضرت مولانا ڈاکٹر سرفراز احمد نعیمی کے متعلق سرمایہ اہلسنت
حضرت مولانا ڈاکٹر محمد اشرف آصف جلالی صاحب کی یہ دو منقبتیں موصول ہوئیں۔
حضرت ڈاکٹر صاحب کے ارسال کردہ اس مواد کا اندراج فہرست میں نہیں ہے۔

فاتحِ دار و رسن

ڈاکٹر اشرف آصف جلالی

جنگِ آزادی کا ہیرو، رہبر و میں صف شکن
وہ امامِ فضلِ حق وہ فاتحِ دار و رسن

سامراجی قوتوں پر وہ جلالِ برقِ حق!
گلشنِ احرار پر وہ شبنم چرخِ کہن

سرزمینِ ہند میں ہے وہ آبشارِ معرفت
اب تلک سیراب جس سے ہو رہا ہے یہ چمن

خوابِ غفلت سے جگایا اس نے یوں ہندی مزاج
سرفروشی کی ادا پہ ہو گئے سب گامزن

مدرسہ و معرکہ میں اس کی یکساں سروری
وہ امامِ علم و حکمت و امامِ فکر و فن

جس کا پیچھا کالے پانی میں بھی نہ پانی ہوا
اس کی ہمت آج بھی ہے استقامت کی کرن

اٹھ رہی ہیں خاک میں وہ شجرِ آزادی اُگا
جس کے سائے میں سبھی اہلِ وطن

شیرِ آبادی سلسلہ سے جو پڑھا ہم نے سبق
اک ہتھیلی میں کتابیں اک ہتھیلی میں کفن

جس نے آصفؔ حق کی خاطر حق بیانی کو بُنا
آج بھی اس فضلِ حق سے ہے رواں اپنا سخن

WWW.NAFSEISLAM.COM

سید عارف محمود مجبور رضوی گجرات

قائد تحریک آزادی علامہ فضل حق خیرآبادی قدس سرہٗ

وہ کتاب حریت کا ایک عنوان جلی
نور کا مینار اس کا ہر قدم ہر عمل
قائد تحریک آزادی ہے تنہا بالیقیں
ناز اس کے علم پر دانائی و حکمت کرے
سطوت شاہی کو وہ لایا نہ خاطر میں کبھی
جب پڑی افتاد ملت پر تو اس طیور نے
جبر و استبداد اس سے لرزہ براندام تھے
جان پر اپنی جو کھیلا موت سے کھیلا گیا
ناز کا پالا وہ افسح العلما جامع کمالات
فتویٰ جب آزادی ملت کا اس نے لکھ دیا
برملا کہتا رہا وہ بارہا ڈنکے کی چوٹ
کالا پانی میں بھی جاری محفلیں علمی رہیں
وہ بہادر شہ ظفر کا اک مشیر خاص تھا
داد پاتے تھے سخن کی اس سے مومن اور منیر
اس کی تحریروں سے بادل چھٹ گئے تنقیص کے

کالا پانی جس نے فرنگی سلطنت میں کھلبلی
لفظ زن اس کی امامت کی چمن کی ہر کلی
روح آزادی ہے اس کی گود میں پوری پلی
رشک اس کی ذات پر کرتے ہیں اللہ کے ولی
لائق تقلید تھے اس کے لیے مولا علیؑ
پاؤں کی ٹھوکر پہ رکھ دی نوکری اچھی بھلی
ظلم کی جڑ وہ آندھی اس کی کاوش سے ٹلی
سر کٹانے کی روایت اس سے تازہ ہو چلی
کالا پانی بھی سہا اس کے لیے تنہا گئی
ہوگئی حد سے سوا مردان حر کی بے کلی
ہے یہی فتویٰ مرا ' رائے نہیں یہ دوغلی
چین سے بیٹھے کہاں اس کی طبیعت مَن چلی
بخت خاں کو بخت آور کر گیا حق کا ولی
شاعری غالب کی اس کی رائے سے پھولی پھلی
گمرہوں کی ہر تمنا خاک میں اس نے ملی

WWW.NAFSEISLAM.COM

☆☆

"اس نے سمجھایا نہیں ممکن نظیر مصطفیٰ"
ہے مثالی مصطفیٰ کی خوب خامہ سے ڈھلی

ہند میں ختم نبوت کا وہ پہلا تھا نقیب
جس کی تحریروں سے ہے ہر صنفِ مشیت جلی

آج بھی اس کے لہو سے یہ چمن شاداب ہے
اس کی ممنونِ کرم ہندوستاں کی ہر گلی

خاکِ خیرآباد تیری عظمتوں کے میں نثار
تیرے دامن میں ہے پوشیدہ جواہر کی ڈلی

☆☆☆

تیرے مرقد پر ہو فضلِ حق، رحمت کا نزول
ڈال دے میرے بھی کاسہ میں تدبر کی پلی

آج بھی مہجور اس کا فلسفہ تابندہ ہے
آج بھی منطق ہے لاگو اس کے سانچے کی ڈھلی

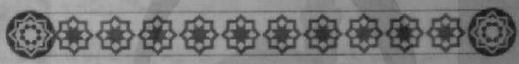

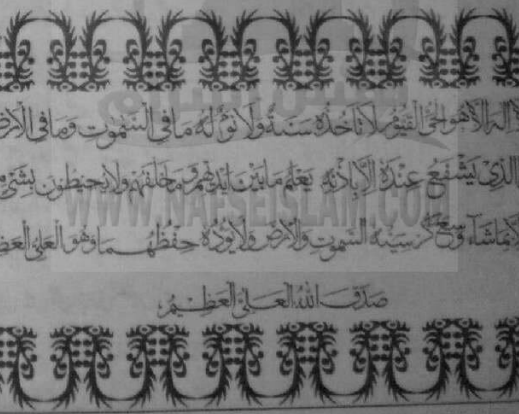
اللہ لا الہ الا ھو الحی القیوم لا تاخذہ سنۃ ولا نوم لہ ما فی السموت وما فی الارض
من ذا الذی یشفع عندہ الا باذنہ یعلم ما بین ایدیھم وما خلفھم ولا یحیطون بشیء من
علمہ الا بما شاء وسع کرسیہ السموت والارض ولا یؤدہ حفظھما وھو العلی العظیم
صدق اللہ العلی العظیم

☆رضی اللہ تعالیٰ عنہ ☆☆ ﷺ ☆☆☆ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

WWW.NAFSEISLAM.COM

امامِ لشکرِ احرار و اخیار

محمد عبدالقیوم طارق سلطانپوری

وہ سرخیلِ جہادِ حریت تھا — وہ جانبازانِ ملت کا تھا سردار
وہ سرکوبِ جنودِ اہلِ باطل — سپاہِ طالبانِ حق کا سالار
خطیبِ منبرِ حق و صداقت — نقیبِ کاروانِ جہد و ایثار
جواں مردی میں وہ اپنی مثال آپ — کھری للکار، بے باکانہ کردار
دلیری اور بے خوفی کا پیکر — حقیقت کے بیاں میں ننگی تلوار
نہ جھکا کلمۂ حق سے وہ پھر بھی — نظر کے سامنے تھا منظر دار
کیا بروقت اہلِ حق کو اُس نے — نصاریٰ کی خباثت سے خبردار
دیا فتویٰ، جہاد ان سے ہے واجب — یہ ہیں اسلام کے دشمن بد اطوار
یہ سچ ہے، میں نے وہ فتویٰ دیا تھا — عدالت میں کیا صاف اُس نے اقرار
مجسم خیر تھا، کیا شر سے رہتا — ہراساں کر سکے اس کو نہ اشرار
خدا کی کبریائی کا مبلغ — ثناخوانِ جمالِ شاہِ ابرار
ہو سب دینوں پہ غالب دینِ احمد — اسے اس کارِ حق سے تھا سروکار
درخشاں صورتِ ماہ اُس کی سیرت — مثالِ مہرِ روشن اس کا کردار
کلام و فلسفہ، معقول و منقول — علوم نادرہ کا گنجِ زخار
اُسے بخشا خدائے مہرباں نے — دماغ کتنہ زا و قلبِ بیدار

WWW.NAFSEISLAM.COM

رہا محبوس افسوس اندماں میں — نشانِ حریت وہ مردِ خوددار
اسیری میں بھی جو کچھ اُس نے لکھا — وہ اس کی ژرف بینی کا ہے شہکار
ادب کے شاہ پارے ہیں وہ بے شک — کیے موزوں وہاں اُس نے جو اشعار
ہے کیا روشن مقدر "کالا پانی" — جہاں اس کی بنی تربت پُرانوار
ہماری بامِ عظمت کا وہ بانی — ہمارے قصرِ آزادی کا معمار
رکھیں ہم محفلِ ملت میں روشن — عظیم اس مردِ حق کی شمع افکار
بہر حالت اُسے ہم یاد رکھیں — ضرورت ہے ہماری اس کا تذکار

سن وصل اس کا از روئے "ادب" ہے
"امامِ لشکرِ اَحرار و اَخیار"
1860+1 = 1861ء

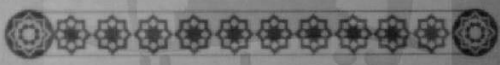

اللھم صل علی محمد وعلی آل محمد کما صلیت علی ابراھیم وعلی
آل ابراھیم انک حمید مجید اللھم بارک علی محمد وعلی آل محمد
کما بارکت علی ابراھیم وعلی آل ابراھیم انک حمید مجید

مادہائے تاریخ سال ولادت و وصال

محمد عبدالقیوم طارق سلطانپوری

مظہر حریت، قافلہ سالار مجدد آزادی، رئیس الاحرار، بحر العلوم والفنون

حضرت علامہ فضل حق خیرآبادی رحمۃ اللہ علیہ

سال ولادت 1797ء — 1212ھ

سال وصال 1861ء — 12 صفر 1278ھ

سال ولادت

جہاد و فاتحہ، ارشاد	آواز جسارت و عزیمت	چنار حرارت ایمان
1212ھ	1212ھ	1212ھ
بے بدل ہلوۂ شریعت و طریقت	کمال نجوم و فیض	پاسبان حرمت شریعت احمد
1797ء	1797ء	1797ء

سال وصال

موج الطاف محمد فضل حق	جہان صداقت و حریت	چراغ آن حبیب
1278ھ	1278ھ	1278ھ
مخزن غیرت حق	باد لاثانی فضل حق امروہی	مظہر حلیم و رضائے یزداں
1861ء	1861ء	1861ء
متاع فخر بلند	درفشاں تصویر	آب سیاہ کار روشن چراغ
1861ء	1861ء	1861ء

خوشہ رشید فراست

1861ء

قرآنی مادۂ تاریخ سال وصال

وبعث الله وبقه فاولئک هم الفائزون (النور)

1861ء

WWW.NAFSEISLAM.COM

قطعات وفات

مولانا محمد سعید حسرت

عربی محمد قطعۂ تاریخ:

قد توفی الاله فضل الحق ۔۔۔ عالما جیدا بلا ریب

ان نفاه الولاة من بلده ۔۔۔ بجفاء فلیس من عیب

قال تاریخه «ولا درکه ۔۔۔ فضلُ حق» هو اتف الغیب[1]

1278ھ

☆☆☆☆

فارسی میں یہ قطعۂ تاریخ کہا:

مولوی فضل حق چو رحلت کرد ۔۔۔ جنتی گشت نیست ریب مرا

گفت تاریخ "لادرکہ" فضل حق ۔۔۔ سروش غیب مرا[2]

1278ھ

☆☆☆☆

خان بہادر سید مسعود حسن مسعود نے یہ تاریخ وفات کہی:

باعمل تھے حضرت فضل حق ۔۔۔ کر دیا نیرنگ نے جینا محال

اہرمن کو لے گئی قید فرنگ ۔۔۔ ہو گیا آخر وہیں پر انتقال

سال ہے مسعود "بے ہادی ہند" ۔۔۔ فضل حق خیر آبادی باکمال[3]

79 ۔۔۔ 1940

1940 - 79

1861ء

[1] اقسطاس البلاغہ، ص: ۲۱۰ [2] ایضاً [3] عندلیب تواریخ، ص: ۱۱۰

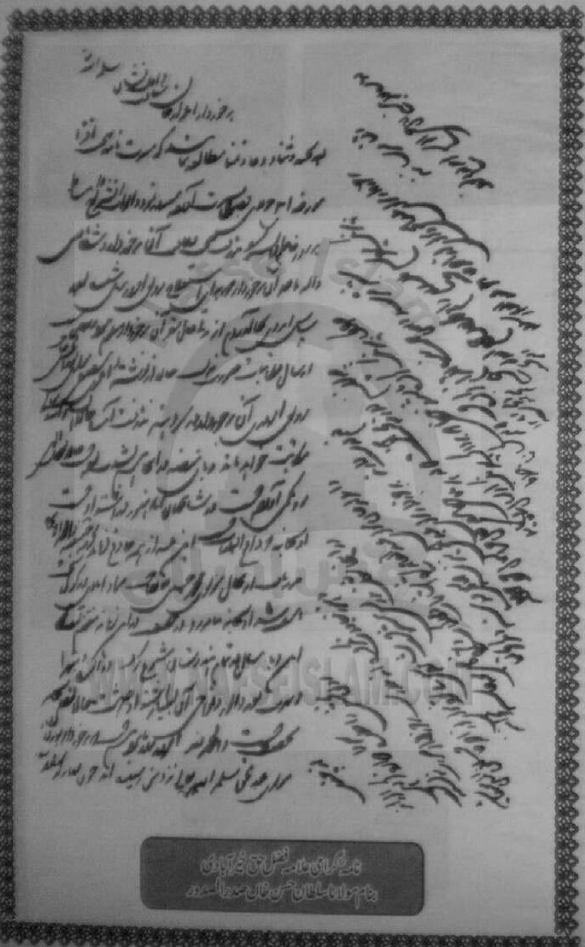

جزیرہ الظہران 1872ء

پنک آف دہلی 1857ء

دہلی میں جس جگہ جھنڈا لگتا تھا 1857ء

کشمیری گیٹ دہلی 1857ء

کالا پانی جیل

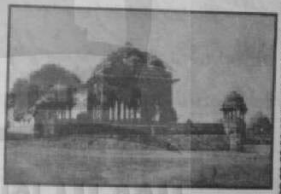

مسجد میرٹھ 1857ء

WWW.NAFSEISLAM.COM

دوست آں باشد کہ گیرد دست دوست
در پریشان حالی و درماندگی
دوست آنکہ گیرد دست دوست
در نماز و بندگی

بہادر شاہ ظفر کا آٹوگراف

اول تو سو سال چلا ہوا خاندان ہندوستان کی حکومت سے گرچہ اب تک دور ہے
شاہ جہاں کی حویلی
جنگ آزادی 1857ء کے بعد جہاں مرتب ہوا
انڈمان جیل
آخری مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر کا مقبرہ
مادر النساء بیگم کا مقبرہ
انڈمان جیل
جیل کا بیرونی دروازہ